رجسٹرڈ نمبر ل ۴۶۶

قیمت فی کاپی ۸ ر

خریداران "نگار" کے لئے ایک خاص رعایت

جو حضرات جنوری سنہ ۴۳ء کے نگار کا سالانہ وی پی وصول کرلیں گے یا اپنا چندہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے ان کو "مجموعہ استفسار و جواب" کی تیسری جلد جس کا حجم ۵۰۰ صفحات کا ہے اور جس میں ۲۰۰، علمی، ادبی، تاریخی و مذہبی استفسارات کا جواب دیا گیا ہے) بجائے تین روپیہ کے صرف ایک روپیہ میں (علاوہ محصول) ملسکے گی۔

اسی طرح اور بھی تمام خریداران نگار جن کا چندہ جنوری سنہ ۴۳ء کے بعد کسی اور مہینے میں ختم ہوتا ہے، اپنا سالانہ وی پی وصول کرنے یا چندہ بھیجنے پر اس رعایت سے فایدہ اُٹھا سکیں گے۔ اس طرح گویا یہ رعایت پورے ایک سال تک جاری رہے گی۔ لیکن یہ خیال رہے کہ حسب قواعد ڈاک مجموعہ استفسار کا وی۔پی نگار کے ساتھ نہیں جاسکتا۔

منیجر "نگار"

آیندہ جنوری کا "نگار" ریاض نمبر ہوگا

بزم اسیر و امیر کے آخری یادگار ریاض خیرآبادی (مرحوم) کی شاعری سے کون واقف نہیں، لیکن اس زندہ دل ہستی کے ادبِ اردو پر اور کتنے احسانات ہیں، اس سے کم لوگ آگاہ ہوں گے۔ نگار کے اس خاص نمبر میں آپ کو ریاض مرحوم کے لطایف شعر و سخن، انکے خود نوشت سوانح حیات، نثر نگاری کے معیاری نمونے، ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بسیط تبصرہ، انتخاب کلام اور اُن لطیف صحبتوں کا ذکر جو ریاض اور اُن کے زمانہ کے لئے مخصوص تھیں۔ سبھی کچھ ہوگا۔

اس کی ضخامت نگار کی ضخامت سے کم از کم تگنی ہوگی اور اگر کاغذ میسر آگیا تو شاید اس سے بھی زیادہ۔ سرورق بھی نفیس کاغذ کا ہوگا۔ اس نمبر کے خاص خاص لکھنے والے: پروفیسر امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی۔ پروفیسر فراق گورکھپوری، پروفیسر مجنوں گورکھپوری۔ پروفیسر سرور مسلم یونیورسٹی۔ پروفیسر اختر ارینوی۔ حضرت دل شاہجہاں پوری وغیرہ وغیرہ میں

غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول ڈاک ڈیڑھ روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن خریداران نگار کو حسب دستور یہ نمبر ان کے سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا۔

منیجر نگار

کچھ "نگار" کے متعلق

اس مہینے سے نگار کا حجم بڑھا دیا گیا ہے اور خط بھی واضح کر دیا گیا ہے اور جب کاغذ کی دشواری جاتی رہے گی تو نگار پھر اُسی کاغذ اور اُسی سطر پر شایع ہوگا جو جنگ سے پہلے تھا، سرورق بھی بہترین کاغذ کا علیحدہ لگایا جائے گا اور ضخامت اور زیادہ ہوجائے گی

منیجر نگار

نگار

جلد ۴۱	جنوری و فروری سنہ ۱۹۴۲ء	شمارہ ۱ و ۲

ملاحظات

1952

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کا نگار یقیناً دشوار کام تھا، لیکن جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کا نگار دشوار تر ثابت ہوا۔ اس میں صرف شاعروں سے واسطہ تھا، جنھیں قطعی طور پر ذمہ دارانہ احساس رکھنے والا انسان سمجھنا ان کی شاعرانہ عظمت کے منافی ہے، اور اس میں نقادان فن سے واسطہ پڑا، جن کے پڑھتے ہوئے احساس ذمہ داری کا کوئی عملی تجربہ مجھے حاصل نہ تھا۔

بہرحال ماضی کی دشواریاں کسی نہ کسی طرح ختم ہوگئیں، جن کا تعلق صرف میری ذات سے تھا اور اب میں ان دشواریوں کے خوشگوار نتیجہ کو پیش کر رہا ہوں جس سے صرف آپ متعلق ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے چار مقالے موصول ہوئے اور ان کو اسی ترتیب کے ساتھ شایع کیا جا رہا ہے جس ترتیب کے ساتھ وہ مجھے پہونچے۔ میں ممنون ہوں ان چاروں حضرات کا جنھوں نے اپنے وقت کا کافی حصہ صرف کرکے، میری درخواست کو قبول کیا امید ہے کہ آپ انھیں بہت غور سے پڑھیں گے۔

اخیر میں ایک بہت اہم مسئلہ میرا بھی ہے، اس کے پڑھنے نہ پڑھنے کا آپ کو اختیار ہے۔ کاغذ گراں نہیں، بلکہ نایاب ہوتا جا رہا ہے اور سوال اب اس کے خریدنے کا نہیں بلکہ بھیک مانگنے کا ہے، اسلئے آپ ہی بتائیے کہ اس دشوار منزل سے گزرنا کیونکر ممکن ہے۔ اگر رسالہ کی قیمت بڑھا دی جائے تو آپ منظور نہ کرینگے اور حجم بدستور رکھا جائے تو کاغذ والے اسے نہ مانیں گے۔ اس لئے صورت صرف ایک رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ حجم کم کرکے سطر گنجان اور خط باریک کر دیا جائے، چنانچہ اس ماہ کی اشاعت سے اس پر عمل شروع ہوگیا ہے۔ پہلے جتنا مضمون دو صفحوں پر آتا تھا، اب وہ ایک صفحہ میں کھپایا جاتا ہے اور اس طرح ۸۰ صفحات میں ۱۲۰ صفحات کا مواد آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جنگ کے ساتھ ساتھ ایک وقت وہ بھی آئے جب خط خوردبینی حد تک باریک کر دیا جائے اور چاول پر لکھی ہوئی "قل ہو اللہ" کی طرح آپ کو نگار بھی پڑھنا پڑے۔

اس اشاعت میں "جنوری اور فروری" دونوں ماہ کے رسالے شامل ہیں، اس لئے اب اس کے بعد آپ کو مارچ کا پرچہ شروع مارچ میں ملے گا۔

اس دوران میں آتش جنگ ہم سے بہت قریب ہوگئی ہے اور ہم اس کی لپٹ محسوس کرنے لگے ہیں، لیکن یہ وقت گھبرانے کا نہیں، بلکہ صبر و استقلال کے ساتھ مصائب کے مقابلہ کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے کا ہے۔ مارچ تک کیا ہونے والا ہے، کچھ خبر نہیں، لیکن امید ہے کہ نگار کی وساطت سے ہماری آپ کی ملاقات بہتر حالت میں ہوگی۔

سال نو مبارک!

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
بزم نگار	پروفیسر کلیم الدین احمد	۲
تبصرہ	پروفیسر سرور	۲۹
غزل اور عصر جدید	پروفیسر مجنوں	۳۷
اردو غزل	ڈاکٹر تاثیر	۵۴
تلخیص و تبصرہ	نیاز فتحپوری	۶۶ - ۸۰

بزم نگار

(پروفیسر کلیم الدین احمد۔ پٹنہ یونیورسٹی)

(۱)

موجودہ شعرائے متغزلین اور ان کی غزلوں کی ادبی اہمیت کی تنقید سے پہلے صنف غزل کے امکانات و حدود کی وضاحت ضروری ہے۔ غزل پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن کہیں اس کے امکانات و حدود کی تشفی بخش تشریح نہیں ملتی ہیں اس مسئلہ کے بعض اہم پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

انسان ہمیشہ انسان نہ تھا۔ اس نے ارتقا کی کتنی منزلیں طے کرکے مہذب انسان کا درجہ حاصل کیا ہے۔ ان منزلوں میں سے ایک منزل بربریت ہے۔ اس منزل سے انسان گزرتا ہے لیکن گزر نہیں جاتا۔ یعنی تہذیب کے زینہ پر پہونچ کر وہ بربریت سے نجات نہیں پاتا۔ کم از کم اسوقت تک اس نے بربریت سے نجات نہیں پائی ہے۔ موجودہ جنگ یوروپ اس کی روشن مثال ہے۔ بہرکیف، بربریت اور تہذیب میں مشرقین کا فرق ہے۔ اور اس فرق کی سمجھ بھی تہذیب کی ایک نشانی ہے۔

وحشی اپنے جذبات کے وجود کو ان کے وجود کی کافی وجہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ماہیت اور ان کے اسباب کو نہیں سمجھتا اور نہ ان کی غرض و غایت کو پہچانتا ہے احساسات و اعمال کو وہ غور و فکر پر ترجیح دیتا ہے۔ فطری خواہشوں کی تکمیل اس کی نظروں میں اصل زندگی ہے۔ زندگی کے زور اور بھراؤ کی وہ قدر کرتا ہے جوش کی شدت، جذبات کے ہیجان میں اسے مسرت ملتی ہے لیکن زندگی کے مقصد کا وہ سراغ نہیں لگاتا اور نہ زندگی کی "صورت" پر غور و فکر کرتا ہے۔ کمزوری اور کمی کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور جو چیزیں "معنویت کی حامل" ہیں انھیں وہ نہیں پہچانتا۔ مہذب انسان محض اپنے جذبات کے وجود کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ جذبات و احساسات کی تہذیب و تربیت کرتا ہے۔ ان کے اسباب اور ان کی غرض و غایت کو سمجھتا ہے۔ حسیات و اعمال پر وہ فہم کو ترجیح دیتا ہے۔ اپنی انفرادی زندگی اور حیات انسانی کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور دونوں کے تصور میں "صورت" کا حسن اسے جزئی حسن سے زیادہ محظوظ کرتا ہے اور جذباتی اور دماغی توازن کو اپنی زندگی کا مدعا قرار دیتا ہے۔ یہ بربریت اور تہذیب کا فرق آرٹ میں بھی نظر آتا ہے۔ وحشی اپنے آرٹ میں مواد کی زیادتی اور اس کی شوکت پر زور دیتا ہے۔ جزئیات کے حسن کو تو وہ سمجھ سکتا ہے لیکن "صورت" کے حسن اور تکمیل سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ مہذب آرٹ کی بنیاد فہم و ادراک پر ہے جو قدر و قیمت ہے ... پرجوش تجربات سے بلند تر ہیں وہ اپنے تجربات الگ تھلگ رہ کر دیکھتا ہے اور ان پر غور و فکر کرتا ہے اور وقتی طور پر وہ قارئین کو بھی اپنی بلند سطح پر لیجاتا ہے اور انھیں حسیات سے نجات دلا کر غور و فکر سے شناسا کرتا ہے۔

بربریت کی فطرت انسان میں اسوقت تک کارفرما ہے اور رہ رہ کر اسی طرح پردۂ تہذیب کے حلقوں کو توڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ اسی طرح بعض اصناف ادب میں بھی بربریت کا عنصر موجود ہے۔ وحشی و نیم وحشی صنفیں مختلف مشرقی و مغربی ادبوں میں پائی جاتی ہیں۔ غزل بھی ایک نیم وحشی صنف ادب ہے۔ حقیقت اس قدر بین ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہ ہوتی اگر اردو انشاپردازوں میں غور و فکر کی عادت عام ہوتی۔ غزل کی "صورت" ناقص ہے۔ وحشی اپنے آرٹ میں "صورت" اور اس کی تکمیل کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات و خیالات کی تربیت نہیں کرتا اور انھیں ترکیب دیکر ایک مناسب و موزوں صورت کی تخلیق بھی نہیں کرتا۔ اسے "صورت" کے حسن کا تصور محظوظ نہیں کرتا اور وہ اسے دوسرے عناصر سے الگ تصور نہیں کرسکتا۔ جزئیات یا مختلف عناصر کے حسن کو وہ الگ الگ دیکھتا ہے اور اسی جزئی حسن کے مشاہدہ میں وہ اس قدر منہمک ہوجاتا ہے کہ پھر اور کسی شے کی طرف اس کی توجہ منعطف نہیں ہوتی جزئیات کے حسن اور اس حسن کے احساس کو وہ کافی سمجھتا ہے۔ اسے یہ ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی کہ مختلف اجزا آپس میں ملکر ایک حسین، پیچیدہ اور مکمل نقش پیش کریں۔ غزل میں مختلف عناصر ترکیب پاکر مکمل صورت کی تخلیق نہیں کرتے۔ ہر شعر کی تاثیر سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ غزل کا

صوری حُسن ہمارے دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں بخشتا۔ اگر ہر شعر کو مکمل اور ایک مختصر نظم تسلیم کر لیا جائے تو بھی غزل میں صوری حُسن کا فقدان ہوگا اور غزل کی صورت ایک ایسے مجموعہ کی ہوگی جس میں مختلف نظمیں اکٹھا کی گئی ہوں۔ "نگار" کے صفحہ ۳۳ پر یہ پانچ شعر ملتے ہیں :۔

تکیہ کلام ہی سہی، رشک سے مر رہا ہوں میں ——— کیوں کہو بات بات پر "دیکھو بھلا سا نام ہے"

ادب لاکھ تھا پھر بھی اُس کی طرف ——— نظر میری اکثر بہکتی رہی،

قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر ابھی سُنا ——— رہنے دے محو لذت لذت ذوقِ خبر مجھے

جب کہا اس نے مدعا کہئے ——— سوچتے رہ گئے کہ کیا کہئے

جانتا ہوں کہ نشیمن نہیں باقی صیاد ——— پھر بھی اک لطف خلشِ حسرتِ پرواز میں ہے

یہ اشعار مختلف غزلوں سے چنے گئے ہیں، یہ ہموزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف نہیں لیکن ہر شعر کا مطلب صاف ظاہر ہے اور انھیں سمجھنے کے لئے غزل کے دوسرے اشعار سے واقفیت ضروری نہیں۔ یہ شعر کا مفہوم اور اس کے حُسن کا احساس غزل کی "صورت" پر مبنی نہیں۔ غزل میں صوری حُسن کا لعدم ہے اور "صورت" کا احساس ایک دھوکا ہے۔ اگر غزل میں یہ حُسن موجود ہوتا تو پھر یہ اشعار اس طرح غزل سے الگ نہیں کئے جا سکتے تھے اور اگر انھیں الگ کیا جاتا تو پھر ان کے حُسن کا زیادہ حصہ مفقود ہو جاتا۔ زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے نہ گنجایش۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ وہ "حُسنِ صورت" جو نظم، افسانہ، ڈرامہ وغیرہ کی لازمی صنفی خصوصیت ہے غزل میں موجود نہیں۔ غزل کے ہر شعر میں کسی مخصوص جذبہ یا خیال کا اظہار مد نظر ہوتا ہے۔ سارے احساسات و تصورات مرتب و مرکب ہو کر ایک نقش کامل کی شکل میں جلوہ گر نہیں ہوتے۔ اسی نقص کی وجہ سے ہر احساس یا خیال اور اس کا وجود، اس کا اظہار کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہی اس صنف کے نیم وحشی ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا احتمال ہے جسے رفع کر دینا مناسب ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر غزل گو شاعر بھی نیم وحشی ہے۔ ممکن ہے کہ غزل گو شاعر نے اپنے جذبات کی تربیت و تہذیب کی ہو اور وہ جذباتی و دماغی توازن کا حامل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنی انفرادی زندگی اور حیات انسانی کا مقصد اور ان کی انتہا سمجھنے کی کوشش کی ہو یعنی بہت ممکن ہے کہ وہ مہذب ہو لیکن جب وہ صنف غزل میں اس کے مخصوص،، وصات کو قایم رکھتے ہوئے طبع آزما ہوگا تو نتیجہ ایک نیم وحشی کارنامہ ہوگا۔ غزل اس الزام سے اسی وقت بری ہوگی جب یہ غزل باقی نہ رہے بلکہ نظم کی صورت اختیار کرے۔

غزل سے قطع نظر، اگر ہر شعر کو ایک مکمل نظم تصور کیا جائے تو شعر پر بھی نیم وحشی صنف شاعری ہونے کا الزام عائد ہوگا۔ شاعر کی قوت حاسہ مختلف اثرات قبول کرتی اور انھیں ترتیب و ترکیب دیتی رہتی ہے۔ لیکن شعر مفرد کے مختصر پیانہ میں کسی پیچیدہ جذباتی یا تخئیلی تجربے کے سمانے کی گنجایش نہیں۔ شعر میں کسی ایک جذبہ یا خیال یا جزئی مشاہدہ کی ترجمانی البتہ ممکن ہے، لیکن ان کی ابتدا، ان کی غرض و غایت، ان کا دوسرے جذبات، خیالات، و مشاہدات سے تعلق، یہ سب چیزیں ایک شعر میں سما نہیں سکتیں۔ وحشی اپنے وقتی جذبے کے وجود، اس کے احساس اور اس کی تسکین کو کافی تصور کرتا ہے۔ اسے ماضی و استقبال کی اسوقت مطلق فکر نہیں رہتی۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ وقتی جذبہ اس کی انفرادی زندگی کی تکمیل میں ممد یا مخل ہوگا۔ وہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں کرتا اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کی تسکین سے دوسروں کو نفع یا نقصان پہونچے گا۔ جس طرح وہ اپنی زندگی میں ہر خواہش کو عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح وہ اپنے ہر شعر میں کسی وقتی احساس کی ترجمانی کرتا ہے اور اس ترجمانی سے اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔ یہی وقتی تسکین اس کی جمالیاتی کاوشوں کا مقصد ہوتی ہے۔ وہ نہ غور و فکر کرتا ہے اور نہ غور و فکر اس کے بس کی بات ہوتی ہے۔ وہ محض ایک اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر اس سے فوری نجات [illegible] ہے اور یہ نجات وہ صورت شعر میں حاصل کرتا ہے۔ انسان جب ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے اور بربریت کی قلمرو سے گزر کر تہذیب کی سرحدمیں قدم رکھتا ہے تو وہ وحشیانہ عناصر سے کنارہ کش ہو جاتا ہے یا انھیں عناصر میں تغیر و تبدل کر کے اپنی مہذب زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ وہ نئی زندگی کی نئی ضرورتوں کے لئے نئے ساز و سامان کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ یہ وحشیانہ عناصر یکقلم ناپید نہیں ہو جاتے اور وہ تہذیب کے زینوں پر پہونچ کر بھی ان سے کام لے سکتا ہے اور ان سے محدود قسم کا لطف اُٹھا سکتا ہے اور ایسا لطف جو اس کی دماغی و جذباتی ہستی کو کامل تشفی نہیں بخشتا۔ یہ تشفی اسے نظم سے حاصل ہوتی ہو نظم میں فوری اضطراری کیفیت یا جزئی مشاہدہ کی ترجمانی نہیں ہوتی۔ جس تجربہ کا بیان ہوتا ہے وہ قیمتی اہم اور پیچیدہ ہوتا ہے اور اس کی ترجمانی میں غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے۔

بہرکیف، اگر شعر مفرد کو نظم کی طرح مکمل سمجھا جائے اور اس کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا مصرف بنایا جائے تو یہ بھی ایک نیم وحشی صنف شاعری ہوگا اور کسی تہذیب یافتہ دماغ کو اس سے پوری تسکین نہیں مل سکے گی مثلاً:

ادب لاکھ تھا پھر بھی ان کی طرف
نظر میری اکثر بھٹکتی رہی

اس شعر میں محض ایک واقعہ کا بیان ہے - ادب کے باوجود بھی شاعر "ان کو" دیکھتا رہا - اگر یہ شعر کسی ایسے شخص کے سامنے پڑھا جائے جس کے ذہن میں دنیائے تغزل کا پہلے سے کوئی نقشہ موجود نہیں تو اسے اس شعر کا مفہوم سمجھ میں مطلق نہ آئے گا - ادب تھا تو کیوں تھا اور کس شخص کا تھا؟ اگر "ادب لاکھ تھا" تو پھر نظر کیوں بھٹکتی رہی؟ اگر نظر بھٹکتی رہی تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس نامکمل اور بظاہر غیر متعلق واقعہ کے بیان سے شاعر کا کیا مدعا ہے؟ اس قسم کے سوالات اس کے دماغ میں آسکتے ہیں - اس شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے دنیائے تغزل سے واقفیت ضروری ہے - اُردو غزلیں اور جو خیالات ان میں ملتے ہیں وہ ہمارے شعور میں اس شعر یا کسی شعر کی عقبی زمین کی حیثیت رکھتے ہیں - اگر یہ عقبی زمین موجود ہے تو پھر شعر کا مفہوم نہایت آسانی سے سمجھ میں آجائے گا - شاعر کسی پروالہ و شیدا تھا وہ معشوق کا ادب کیا کرتا تھا - ایک روز کسی جگہ کسی محفل میں وہ معشوق کے دیدار سے شادکام ہوا - اسے پاسِ ادب تو بہت تھا لیکن عشق کے ہاتھوں مجبور! وہ بار بار معشوق کے حُسن سے اپنی آنکھوں کو بہرہ ور کرتا رہا - اس سے بے ادبی مقصود نہ تھی - نظر کا بھٹکنا عشق کے زور اور حسنِ یار کی کشش کا نتیجہ تھا - اس تشریح سے یہ مطلب نہیں کہ کسی شعر کا مفہوم سمجھنے میں دیر ہوتی ہے یا اس کے لئے غیر معمولی ادراک یا بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے - نہیں، عقبی زمین ہمارے شعور میں موجود ہے اس لئے مطلب فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے - لیکن پھر بھی پوری تسکین نہیں ہوتی - اس شعر میں گویا ایک غیر متعلق واقعہ کی ترجمانی کی گئی ہے - شعر کی "صورت" ناقص اور تکمیل کی محتاج ہے - "صورت" کے ساتھ ساتھ نفس واقعہ یا تجربہ بھی تکمیل کا محتاج ہے - اسے دوسرے تجربوں کے ساتھ ترکیب دیکر کسی حسین، قیمتی اور پیچیدہ نقش کی تخلیق نہیں کی گئی ہے - اس شعر سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی شاعر کی جذباتی دنیا میں کیا اہمیت ہے اور اس نئے تجربے نے موجودہ تجربوں کی ترکیب و ترتیب میں کیا تغیر و تبدل کیا - یہاں صرف ایک اضطراری کیفیت کا بیان ہے جس کی غرض و غایت سے شاعر کو کوئی بحث نہیں - اس لئے شعر مفرد بھی نیم وحشی صنف شاعری ہے -

(۲)

غزل اور شعر مفرد نیم وحشی صنف شاعری ہونے کی وجہ سے کسی تہذیب یافتہ دماغ کو کامل تسکین نہیں بخشتے - اس کا سبب غزل کی پراگندگی اور شعر مفرد کی تنگ دامانی اور دونوں میں تکمیل کا فقدان ہے - اب دیکھنا یہ ہے کہ شعر و غزل کے امکانات کیا ہیں اور ان میں کس قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت ہے - شعر و غزل میں پہلے صرف حُسن و عشق کی جلوہ گری تھی لیکن اب حُسن و عشق کے علاوہ بھی موضوعات داخلِ غزل کئے جاتے ہیں - لیکن پھر بھی "معیارِ تغزل" سننے میں آجاتا ہے اور اس معیار کا تعلق عموماً اسلوب بیان سے ہوتا ہے - مضمون اور اسلوب بیان میں ناگزیر ربط ہے - اگر مضمون کا دائرہ وسیع ہوگا تو پھر اسلوب بیان بھی نت نئی شکلیں اختیار کرے گا - لیکن مضامین غزل میں کچھ زیادہ تغیر ابھی تک نہیں ہوا ہے - وہی پُرانے خیالات کچھ نئے رنگ میں جلوہ گر ہیں - "بزم نگار" پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچ جائے گی - جب نئے مضامین داخلِ غزل کئے جاتے ہیں تو عموماً تنوع مضامین کو کافی سمجھکر فنی اُصول سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے - بہرکیف، اب شعر مفرد کے امکانات کو لیجئے - ہر قسم کے تصورات، جذبات، مشاہدات، واقعات موضوعِ شعر ہو سکتے ہیں - شرط یہ ہے کہ انھیں تخئیلی تجربہ کی شکل میں تبدیل کیا گیا ہو - اس نقطۂ نظر سے شعر کے حدود وغیر محدود ہیں - اس کے حدود وہ انسانی تجربات کے حدود و تحدید ہیں - یہ ضرور ہے کہ شعر میں تجربات کے ٹکڑے نظر آتے ہیں لیکن یہ ٹکڑے بے قیمت نہیں ہوتے - اشعار میں انسانی تجربات کا جزئی بیان ممکن ہے اور اس بیان سے ہم محظوظ بھی ہو سکتے ہیں - لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ اشعار صحیح معنوں میں اشعار ہوں اور محض لفظی رد و بدل کا کرشمہ نہ ہوں یعنی ان میں ذاتی یا تخئیلی تجربات کا بیان ہو - اشعار میں اصلیت کا وجود ضروری ہے - خیالات بلند، جذبات پر جوش، مشاہدات دلچسپ ہوں لیکن اگر وہ رگ و پے میں محسوس نہیں کئے گئے ہیں تو پھر وہ کامیاب اشعار کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہو سکتے - ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اشعار میں "احساس بلند و لطیف" کی کارفرمائی ہے تو پھر ان سے مخصوص و محدود قسم کا سرور حاصل ہو سکتا ہے - میں نے غالب کے اشعار کی خصوصیت کے سلسلہ میں لکھا تھا: - "اگر دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کوئی شخص نظارہ کرے تو اکثر سطح دریا پر اسے سکون نظر آئے گا پھر اگر وہ ایک پتھر کا ٹکڑا اُٹھا کر پھینک مارے تو سطح دریا پر ایک لہر نمودار ہوگی، یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرے گی - لہروں کا دائرہ بڑھتا جائے گا - ایک بھنور

کی کیفیت نمایاں ہوگی اور یہ لہریں پھیلتے پھیلتے نظر سے غائب ہو جائیں گی" شعر سے ہمارے دل و دماغ میں اسی قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن جس نے اس نظارہ کا مشاہدہ کیا ہے اس نے یہ بھی ضرور محسوس کیا ہوگا کہ اس نظارے میں کچھ کمی ہے جسے وہ محسوس تو کرتا ہے لیکن جس کی بظاہر اسے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر وہ غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ یہ نظارہ نامکمل، غیر متعلق اور بے معنی تھا اور اسی وجہ سے اسے کامل آسودگی نہیں ہوئی تھی اشعار میں بھی ہم غیر شعوری طور پر یہی کمی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح اُس نظارہ سے ہم وقتی طور پر محظوظ ہوئے تھے اسی طرح اشعار سے بھی ہم مسرور و محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شعر میں انسانی تجربات کا جزئی بیان ہے تو چند اشعار میں ان کا مکمل بیان ممکن ہے۔ لیکن یہ اشعار اگر انھوں نے صورت نظم نہیں اختیار کی ہے، یہ کسی تجربے کے مکمل بیان پر قادر نہیں۔ اگر کوئی شخص موٹر یا ریل پر کسی حسین و نظر فریب جگہ سے گزر جائے تو اس کے دماغ میں اس جگہ کے فطری مناظر کی مکمل تصویر مرتب نہیں ہو سکتی۔ چند جزئیات البتہ اس کے ذہن میں محفوظ رہیں گی اور اس جگہ کے فطری حُسن کا ایک مبہم و غیر متعین نقش بھی حافظہ پر ثبت ہو سکتا ہے۔ بجنسہ یہی کیفیت ہوگی اگر ہم چند اشعار پڑھیں وہ صورت غزل میں ہوں یا مختلف غزلوں سے منتخب ہوئے ہوں نتیجہ واحد ہے۔ کسی ملک کے دیکھنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم اس کے مختلف حصوں سے تیزی کے ساتھ گزر جائیں۔ اس کام کے لئے صرفِ وقت، غور و فکر، مفصل مشاہدہ، مختلف حصوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ پھر اس ملک کا دوسرے ملکوں سے تقابل، یہ سب چیزیں ضروری ہیں۔

اب ذرا غزل کو لیجئے۔ یہ اپنی موجودہ شکل میں مبتذل سی صنعت معلوم ہوتی ہے۔ یہ متفق علیہ ہے کہ غزل میں مختلف اشعار مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں ("نگار"، صفحہ ۸۱):۔

(۱)

میری وحشت بھی تماشا ہوگئی — جو ادھر گزرا کھڑا دیکھا کیا،

آج ہی آج تجھ کو آنا ہے — کل خدا جانے میں ہوا نہ ہوا

مزہ لیں گے ہم دیکھ کر تیری آنکھیں — انھیں خوب تو نامہ بر دیکھ لینا

(۲)

یہ رنگ گلاب کی کلی کا — نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا

بلبل کی بہار رس نہ پوچھو — منہ چومتی ہے کلی کلی کا

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی — یاد آگیا روٹھنا کسی کا

پہلی مثال میں تین شعر مختلف غزلوں سے انتخاب کئے گئے ہیں۔ بحریں، قوافی، ردیفیں سب جداگانہ ہیں۔ دوسری مثال میں تینوں شعر ایک ہی غزل سے ہیں اور چونکہ بحر ایک ہے اس لئے انھیں پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ہم وزن، ہم قافیہ، ہم ردیف ہونے سے ان کے شعری حُسن میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیعت غزل کی اس قدر خوگر ہو گئی ہے کہ یہ چاہتی ہے کہ اشعار غزل ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں اور اسے پہلے تین شعر پڑھنے میں دقت محسوس ہوگی۔ اسی افتادِ طبیعت کی وجہ سے مطلع و مقطع کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلی مثال کے اشعار ویسے ہی موثر ہو سکتے ہیں جیسے دوسری مثال کے۔ ممکن ہے کہ احساس ترنم کو کچھ صدمہ پہونچے لیکن ترنم بجائے خود قابل قدر نہیں۔ اس کا حُسن اشعار کے معنوی و لفظی حسن سے وابستہ ہے۔ بہرکیف، اگر چند اشعار کو اکٹھا کرکے انھیں غزل سے تعبیر کیا جائے تو کوئی حقیقی فرق نہ ہوگا۔ یعنی لفظ غزل محض ایک نشان ہے۔ جس کا اطلاق چند اشعار کے مجموعہ پر ہو سکتا ہے اور اگر ان اشعار کا ہم وزن، ہم قافیہ، ہم ردیف ہونا لازمی نہ سمجھا جائے تو پھر غزل کے ایک نقص کو رفع کیا جا سکتا ہے یعنی بھرتی کے اشعار اور قافیہ پیمائی سے کس حد تک نجات مل سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی بے ربطی کا عنصر غزل سے رفع نہ ہوگا۔ غزل کا یہ نقص آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ غزل گو شعراء نے دو ناکامیاب ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ مربوط و مسلسل غزل اور قطعہ لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے یہ دونوں صورتیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ ان اسباب کی تشریح یہاں ضروری نہیں۔ "صورت" نتیجہ ہے ہمارے طرزِ احساس کا اور جب تک یہ نہ بدلے اس وقت تک "صورت" میں کامیاب تغیر ممکن نہیں۔ تہذیب یافتہ انسان اپنی نئی زندگی کی جذباتی اور دماغی ضرورتوں سے مجبور ہوکر "حسن صورت" کی تلاش کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی اور اپنے آرٹ میں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب تک وہ اسے حاصل نہیں کر لیتا اسے تشفی نہیں ہوتی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اُردو شعراء کو اس "حسن صورت" کی تلاش ہے تو پھر وہ بہ آسانی اس تلاش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ بیش قیمت، پیچیدہ، مکمل تجربے رکھتے ہیں، اگر وہ مختلف

احساسات و تصورات و نقوش کو ترکیب دیکر ایک نقش کامل بنانے کی قدرت رکھتے ہیں تو وہ غزل ہی میں بغیر سطحی تغیر کے اپنی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں۔ اس حالت میں اشعارِ غزل ایک دوسرے سے بے نیاز نہ ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کے محتاج، غزل میں ارتقائے جذبات و خیالات کا وجود ہوگا اور شاعر کا مطلب سمجھنے کے لئے پوری غزل کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ لیکن غزل کی روایتی عقیمی زمین میں پراگندگی اس قدر مستحکم ہو گئی ہے کہ شاید ایک معمولی شاعر غزل کی روایتی صورت کو قایم رکھتے ہوئے کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر مطلع و مقطع کی قید اُٹھا دی جائے تو یہ صحیح راستہ میں پہلا قدم ہوگا۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ مختلف ترکیبیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ غزل میں قوافی کا التزام مثنوی کے طرز پر ہو، جسے انگریزی میں کپلٹ کہتے ہیں۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ قوافی کی ترکیب شاعر کے مذاق صحیح پر چھوڑ دی جائے۔ وہ جذبات و تصورات، ترنم، فن کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے قوافی کی ترتیب کی طرف متوجہ ہوگا اور مختلف غزلوں میں مختلف ترتیب نظر آئے گی۔ نتیجہ "حسن صورت" ہو اور اس "صورت" میں ارتقائے جذبات و خیالات کا مکمل اظہار ہو، اس نتیجہ کے حصول کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

(۴)

"بزم نگار" میں منتخب اشعار ہیں نہ کہ منتخب غزلیں۔ چند اشعار کے مجموعہ کا نام غزل ہے۔ اس لئے غزلوں کے انتخاب سے کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوتا، بہرکیف اشعار کی جانچ آسان نہیں۔ عروض و زبان کی خامی پر، اگر نقاد کو عروض و زبان کا علم ہے، آسانی سے گرفت کی جا سکتی ہے۔ پُرانی تنقید کی بنیاد عروض و زبان کی خامی کے انکشاف پر قایم ہوئی تھی۔ پُرانی تنقید اب بھی نظر آ جاتی ہے لیکن اب یہ احساس ہو چلا ہے کہ اُصول عروض، قواعد زبان الہامی نہیں اور نئی ضرورتیں ان اُصول و قواعد میں تغیر و تبدل پیدا کر سکتی ہیں اور جس طرح حیات میں اُصول ارتقا کی کارفرمائی ہے اسی طرح ان اُصول و قواعد میں بھی ارتقاء کی گنجایش موجود ہے۔ اگر وقتی طور پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اشعار میں اُصول عروض و قواعد زبان کی پابندی کی گئی ہے، تو پھر پرانے رنگ کے نقاد کے لئے اچھے اور برے اشعار کی تمیز مشکل ہوگی اور اگر اسے اچھے بُرے کے فرق کا احساس ہے تو بھی وہ اس فرق کے احساس اور اس احساس کے سبب کو کامیابی کے ساتھ بیان کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ کیونکہ ان اُصول و قواعد کے علاوہ وہ اور کسی معیار سے آشنا نہیں۔ اس نے شاعری کی ماہیت، اس کے اغراض و مقاصد سے شناسائی حاصل نہیں کی ہے۔ اس نے شاعری کی جانچ پرتال کے لئے صاف و متعین معیار بہم نہیں پہونچائے ہیں اس لئے وہ اپنی پسند و ناپسند کا اظہار "سبحان اللہ" یا "استغفر اللہ" جیسے مبہم و غیر متعین الفاظ سے کرتا ہے۔ اگر اسے یہ پسند و ناپسند کے اظہار کا طریقہ پسند نہیں ہوتا تو وہ کچھ زیادہ ہمت کرتا ہے اور الفاظ کے در و بست بندش کی چستی، محاورات کی خوبی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور حُسن الفاظ کو شعر کی کامیابی کی دلیل سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی الفاظ سے گزر کر معانی پر بھی نظر ڈالتا ہے اور نازک خیالی یا پسندیدہ اخلاقی یا فلسفیانہ مضامین کی تعریف میں رطب اللسان ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں حسین الفاظ یا بلند خیال کی موجودگی کسی شعر کی خوبی کی دلیل نہیں۔ شعر میں کسی ذاتی یا تخیلی تجربہ کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اگر اس تجربہ نے شاعر کے دل و دماغ میں تلاطم خیزی کی ہے، اگر یہ تجربہ قیمتی ہے اگر اس کا اظہار حسین ترین الفاظ و موزوں ترین بحر میں کیا گیا ہے تو شعر کامیاب ہوگا ورنہ ناکامیاب۔ حُسن الفاظ یا ترنم بحر کے متعلق آسانی سے رائے زنی کی جا سکتی ہے اور عموماً لفظی خوبصورتی اور ترنم کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ تجربہ کی اصلیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہے اس لئے اس طرف توجہ کم ہوتی ہے اور شاید اس طرف توجہ کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جاتی۔ زیادہ تر اُردو شاعری کے مروجہ جذبات و خیالات کو سطحی تغیر کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اس لئے اصلیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ محض اسلوب بیان کی جانچ کے بعد شعر کی کامیابی یا ناکامیابی کے متعلق فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ شعر کا پیمانہ اس قدر مختصر ہے کہ اس کے پرکھنے کے لئے غیر معمولی باریک بین نظر کی ضرورت ہوتی ہے نظم میں اگر کوئی کمی ہوتی ہے، اگر تجربہ یا اس کی ترجمانی میں کوئی نقص رہ جاتا ہے تو اس کا پتہ نسبتاً آسانی مل سکتا ہے لیکن اچھے بُرے اشعار کی تمیز حساس طبیعت اور باریک بین نظر ہی کر سکتی ہے مثلاً یہ پانچ شعر غالباً کامیاب سمجھے جائیں گے۔

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے — میں سراپا دل ہوں دل میرا سراپا درد ہے — (ناطق لکھنوی)

عدو سے وعدہ کیا وعدہ کر کے ٹال گئے — چلو وہ اب بھی بہت بات کو سنبھال گئے — (ناطق گلاوٹھی)

نکھر آئی نکھار آئی سنور آئی سنوار آئی — گلوں کی زندگی لے کر گلستاں میں بہار آئی — (نوح ناروی)

اِدھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا — پھر ان کی طرف اک نظر دیکھ لینا — (اثر لکھنوی)

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا — تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا — (بیخود دہلوی)

جہاں تک زبان، نشست الفاظ، صفائی، چستی، روانی کا تعلق ہے سب ہی اچھے شعر سمجھے جاسکتے ہیں لیکن اگر قالب سے قطع نظر کرکے روحِ شاعری کی طرف توجہ مبذول کی جائے تو پھر ان شعروں کی اچھائی اس آسانی سے تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً پہلے شعر کو لیجئے۔ شاعر اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہے کہ دردِ عشق نے اسے سراپا درد بنا دیا ہے۔ اگر اس نے واقعی یہ کیفیت محسوس کی ہوتی تو یہ شعر تاثیر سے لبریز ہوتا۔ لیکن اس میں مطلق اثر نہیں کیونکہ اصلیت نہیں اور ہر حساس طبیعت فوراً معلوم کرلیتی ہے کہ شاعر نے محض چند الفاظ کو تصنع سے کام لیکر اکٹھا کر دیا ہے لیکن اس کا دل درد آشنا نہیں یعنی الفاظ کے قالب میں روحِ جذبات کی مطلق جلوہ گری نہیں۔ اگر نقاد کی طبیعت سریع الحس اور نگاہ باریک بیں ہے۔ اگر وہ شاعری کے کامیاب نمونوں سے واقف ہے تو پھر اسے اس شعر کی ناکامیابی کے متعلق فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ یہی فیصلہ وہ بغیر کسی تاخیر کے دوسرے شعر کے متعلق بھی صادر کرے گا۔ اس شعر میں تو کسی قسم کی خوبی نہیں اور اگر یہی شاعری ہے تو پھر اس سے جس قدر جلد کنارہ کشی کی جائے بہتر ہے۔ ایک مبتذل مضمون کو مبتذل پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور بس۔ اس قسم کے اشعار دنیائے تغزل میں بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ تیسرے شعر میں حسنِ الفاظ کچھ زیادہ جاگزیں ہے۔ مضمون تو وہی پرانا گل و بہار کا قصہ ہے۔ پہلے شعر میں مضمون داخلی تھا یہاں خارجی ہے لیکن جس طرح پہلے شعر میں ذاتی احساس کی کمی تھی، اس شعر میں ذاتی مشاہدہ کی کمی ہے۔ اگر اردو غزلوں کے مضامین سے واقفیت ہے تو پھر گل و بہار کے ذکر کے لئے کسی ذاتی مشاہدہ کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی۔ بہرکیف پہلا مصرعہ :- "نکھر آئی نکھار آئی سنور آئی سنوار آئی" کسی مشاعرے میں خراجِ تحسین وصول ضرور کرے گا لیکن اس شعر میں شعریت کا مطلق وجود نہیں۔ یہ محض لفظی بازیگری کا نتیجہ ہے، وہی لفظی بازیگری جسے آجکل شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کی لفظی شعبدہ بازی کا نتیجہ اثر لکھنوی کا یہ شعر ہے :-

ادھر دیکھ لینا اُدھر دیکھ لینا پھر ان کی طرف اک نظر دیکھ لینا

اس میں بھی اگر کوئی خوبی ہے تو لفظی۔ حسنِ الفاظ بھی ایک حسن ہے اور اس سے دماغ محظوظ ہو سکتا ہے لیکن جو حظ اس میں دماغ کو ملتا ہے وہ نہایت ہی محدود قسم کا ہے اور اس کا اثر دیرپا بھی نہیں ہوتا۔ پھر جب اسی حسن کو اصل مدعا قرار دیا جائے تو طبیعت بہت جلد اُکتا جائے گی۔ بیخود دہلوی کے شعر میں اثر لکھنوی کے شعر کی طرح ایک تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ تصویر بظاہر زیادہ موثر ہے۔ اس کے عناصر شمع، مزار، گریۂ معشوق روایتی ہیں اور روایتی طور پر اکٹھا کئے گئے ہیں۔ تصویر تو مرتب ہوگئی ہے لیکن جیتی جاگتی، دل میں گھر کرنے والی مطلق نہیں کیونکہ اس نے شاعر کے دل و دماغ میں کسی قسم کا ہیجان نہیں پیدا کیا ہے۔ غرضکہ یہ پانچوں شعر ناکامیاب ہیں اور جسے مذاقِ صحیح و لطیف ہے وہ ان سے محظوظ نہ ہوگا۔ اشعار کو جانچنے کے لئے عام قارئین کو چاہئے کہ وہ اساتذہ کے بہترین کلام سے واقفیت رکھیں ان کے بہترین کلام کو یاد رکھیں اور ہر نئے شعر کو ان اشعار کی ترازو پر تولیں۔

شاعر زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے اور یہ مشاہدہ ہر شاعر اپنے مخصوص رنگ میں کرتا ہے اور اس مشاہدہ سے وہ مخصوص نتائج اخذ کرتا ہے۔ کچھ ضرور نہیں کہ یہ نتائج فلسفہ کی صورت اختیار کریں لیکن ہر شاعر کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے اور جو وہ اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اس کا عکس اس کی شاعری میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی نظموں میں ربط پیدا ہو جاتا ہے اور یہ نظمیں ایک ہی رشتہ میں منسلک ہو جاتی ہیں۔ عموماً اردو غزل گو شعرا کا کوئی خاص ذاتی نقطۂ نظر نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں کا ذاتی مطالعہ نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو بھی وہ کسی نقطۂ نظر کے حامل نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ غزل کی پراگندہ سامانی کی وجہ سے اگر وہ زندگی کے متعلق مربوط و مسلسل خیالات بھی رکھتے تو ان خیالات کے انکشاف میں انھیں دقت محسوس ہوتی اور یہ خیالات کچھ اس طرح منتشر ہو جاتے کہ انھیں ایک رشتہ میں پرونا ممکن نہ سہی نہایت دشوار تو ضرور ہو جاتا۔ شعرائے متغزلین تو عموماً اپنے دماغ سے کام لینا گناہ سمجھتے ہیں۔ وہ زندگی کا بغور مطالعہ نہیں کرتے اور اکثر اس کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ پھر دنیائے تغزل سامنے ہے، اس دنیا میں انھیں وافر خیالات ملتے ہیں وہ ان خیالات کو اپنی مشترک جاگیر سمجھتے ہیں اور انھیں خیالات کو بہ ادنیٰ تغیر اپنے اشعار میں بھرتے ہیں۔ انسان تساہل پسند واقع ہوا ہے۔ اگر اسے کوئی آسان راستہ نظر آتا ہے تو پھر وہ کسی دشوار گزار رستہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ شعرا اس اصول پر عمل کرتے ہیں۔ "بزم نگار" میں زیادہ شعرا اسی قسم کے ہیں وہی پرانا راگ الاپتے ہیں۔ کچھ شعرا اس اُفتادِ طبیعت سے متنفر ہیں۔ وہ اپنے دماغ سے کام لیتے ہیں اپنے ادراک کو محض بیکار نہیں سمجھتے وہ زندگی یا خارجی دنیا یا اپنی داخلی کیفیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور انھیں موضوعِ شعر بناتے ہیں۔ ایسے شعرا کی تعداد کم ہے۔ ان میں بھی اکثر مخصوص نقطۂ نظر نہیں رکھتے۔ وہ غور و فکر سے کام لیتے تو ہیں لیکن غور و فکر کے نتائج کو کسی سلسلہ میں منسلک نہیں کرتے اور یہ نتائج اس قدر متضاد ہوتے ہیں کہ شاید وہ ایک سلسلہ میں منسلک بھی نہیں ہو سکتے۔ کچھ تو طبیعت کی افتاد سے اور کچھ صنفِ غزل کی خامیوں کی وجہ سے وہ زندگی کی حقیقتوں کا مطالعہ نہیں کرتے بلکہ

نکتوں، جزئی چیزوں پر غور و فکر کرتے ہیں اور انھیں جزئی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ان جزئیات میں کوئی ربط نہیں ہوتا اور اکثر یہ جزئیات متضاد بھی ہوتی ہیں اگر یہ نقص حائل نہیں ہوتا، اگر وہ زندگی کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعہ کے بعد کسی خاص نتیجہ پر پہونچتے ہیں تو بھی وہ اپنے خیالات کو مسلسل پیرایہ میں بیان نہیں کر سکتے۔

(۴)

"بزم نگار" کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے نیاز صاحب فرماتے ہیں " یہ امر مسلم ہے کہ سخن گو ہونا اور چیز ہے اور سخن فہم ہونا دوسری۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک شاعر خوش فکر ہو اور خوش فہم نہ ہو"۔ یہ اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن پس پردہ ایک حقیقت ہے جو اس سے زیادہ اہم ہے۔ ادب، شاعری، فنونِ لطیفہ کی ماہیت سے عوام بالکل ناواقف ہیں اور شعراء و ادبا بھی عموماً اس سے ناواقف ہی ہوتے ہیں۔ ایک شاعر کامیاب نظمیں لکھ سکتا ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ شاعری کی ماہیت سے آگاہ نہ ہو۔ خصوصاً اُردو شعرا نے کبھی عہدِ حاضر سے پہلے اپنے فن کی اصلیت و اہمیت، اس کی خصوصیتیں، جو انسانی ضرورتیں اس سے پوری ہوتی ہیں، اس کا انسان کی انفرادی اور سماجی زندگی سے تعلق۔ ان موضوعات پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور موجودہ شعرا بھی ان موضوعات کی اہمیت اور ان کے صحیح جواب سے آگاہ نہیں۔ اُردو ادب ابھی تو خیر ہے اور اُردو میں تنقید کا فن تو اور بھی نیا ہے۔ اُردو نقاد ان مسایل کی طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن ان کے متعلق کہیں تشفی بخش معلومات نہیں ملتیں۔ عدم واقفیت کی وجہ سے وہ اکثر عجیب غلط فہمیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ادب میں انفرادی کاوش اور ماحول کے اثر کی جلوہ گری ہوتی ہے ماحول سے مراد محض خارجی دنیا نہیں۔ ذہنی ماحول زیادہ اہم ہے۔ ہر زمانہ میں مختلف دماغی تحریکیں ہوتی ہیں جو فلسفہ، سائنس، مذہب، اخلاق وغیرہ کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب اپنے زمانہ کے ذہنی و خارجی ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور یہ اثر کسی عہد کے مختلف شعراء کو ہم رنگ بناتا ہے۔ اس لئے کسی شاعر کے کارنامہ کو سمجھنے کے لئے اس کے ماحول کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ لیکن شاعر چند انفرادی خصوصیات کا بھی حامل ہوتا ہے اور وہ ماحول سے خاص طور پر متاثر ہوتا ہے اور اسے انفرادی رنگ میں منعکس کرتا ہے۔ ماحول کے اثر کی طرح انفرادی خصوصیات بھی ادب یا شاعری میں نظر آتی ہیں۔ روایتی نقاد انفرادی خصوصیات پر زور دیتے تھے، آجکل ماحول کی اہمیت کی طرف صرف توجہ ہی مبذول نہیں کی جاتی بلکہ شاعر یا ادیب کو محض ماحول کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ یہ دونوں نقطۂ نظر صحت سے بعید ہیں۔

جس طرح شعراء اپنے فن کے متعلق کافی غور و فکر سے کام نہیں لیتے، اسی طرح وہ فن تنقید، اس کے اصول سے بھی واقفیت بہم نہیں پہونچاتے تخلیق و تنقید میں جو ناگزیر تعلق ہے اس سے وہ ناواقف ہیں۔ تخلیق شعر میں تنقید کی کارفرمائی لازمی ہے لیکن اُردو شعرا میں یہ کارفرمائی تحت شعور میں واقع ہوتی ہے اس لئے وہ شعوری طور پر اس سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتے۔ اُردو شعرا عموماً اچھے نقاد نہیں ہوتے بلکہ وہ نقد کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اس لئے اچھے بُرے شعر کی پہچان وہ عوام سے زیادہ نہیں کر سکتے۔ جو شعر ان کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں، جن اشعار میں انھیں زبان کی خوبیاں نظر آتی ہیں یا جن اشعار میں نازک خیالی یا فلسفہ کی جھلک ہوتی ہے، وہ انھیں پسند آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی پسند و ناپسند کا اظہار مبہم پیرایہ میں کرتے ہیں، اور اشعار کو اصولِ تنقید کی ترازو پر نہیں تول سکتے۔ اس لئے کسی شاعر کے لئے شعر فہمی ضروری نہیں۔ اور اس کی رائے اپنے یا دوسروں کے کلام پر محض اس لئے قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتی کہ وہ شاعر ہے اور اس میں اچھے بُرے کی پہچان عام قارئین سے زیادہ ہوگی۔ ہاں اگر اس نے اپنے تخلیقی اوصاف کی طرح اپنے تنقیدی اوصاف کو بھی ترقی دی ہے یعنی وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہے تو اس کی رائے اہم ہوگی۔ اور غالباً شاعر ہی اگر وہ اپنے امکانات کو ترقی دے تو بہترین نقاد ہو سکتا ہے۔ "بزم نگار" میں شاید ہی ایسے شاعر نظر آئیں گے جو قابلِ تحسین تنقیدی اوصاف رکھتے ہیں۔ بہرکیف، کسی شاعر کے انتخاب اور کسی غیر شاعر کے انتخاب میں کوئی خاص فرق نہ ہوگا۔ اگر شاعر نقاد بھی ہے تو اس کا انتخاب اچھا ہوگا۔ اگر وہ نقاد نہیں تو پھر غیر شاعر نقاد کا انتخاب شاعر کے انتخاب سے بہتر ہوگا۔ لیکن یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اگر شاعر اپنے کلام کا انتخاب خود کرے تو غالباً یہ بہترین انتخاب ہوگا کیونکہ وہ اپنے کلام کے محاسن و معائب سے کسی دوسرے شخص کی بہ نسبت زیادہ واقف ہوگا۔ لیکن یہ امید موہوم ہے۔ دوسرے کے کلام کے متعلق کوئی شاعر صحیح رائے قایم کرے تو یہ بعید از قیاس نہیں لیکن اپنے کلام کے متعلق وہ غالباً صحیح رائے قایم کرنے سے مجبور ہوگا۔ اپنا سارا کلام اسے اچھا نظر آئے گا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو اپنی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ہر شخص اپنی اولاد سے محبت رکھتا ہے اور اسے دوسروں کی اولاد سے بہتر سمجھتا ہے۔ شعرا بھی اپنی معنوی اولاد سے فطری طور پر محبت رکھتے

ہیں اور اسے دوسروں کی اولادِ معنوی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ "بزمِ نگار" میں اس حقیقت کا بیّن ثبوت نظر آتا ہے۔ بعض شعراء نے ایسے ایسے اشعار چنے ہیں جنھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خصوصاً حسرت موہانی کا انتخاب کلام مطلق تشفی بخش نہیں۔ حسرت موہانی موجودہ شعرائے متغزلین میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں لیکن شعر فہمی کی نمایاں کمی معلوم ہوتی ہے۔ سرسری نظر سے دیکھنے پر ان کے انتخاب کے پہلے دو صفحوں میں یہ اشعار ملتے ہیں:

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزو سپاس کا — جبکہ صفات یار میں دخل نہ ہو قیاس کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا — تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا
محفلِ یار کی رہ جائے گی آدھی رونق — ناز کو اس نے اگر انجمن آرا نہ کیا
کچھ بھی ہیں راہ تمنا میں سپاٹ دن نہیں — کہ ناز جلوہ کرے تیری خوش خرامی کا
اس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن ان کا — خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا
بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

ان اشعار میں کہیں آورد ہے، تو کہیں مضمون عامیانہ، طرزِ بیان میں بھی کوئی خوبی نہیں، کوئی انفرادی رنگ نہیں۔ زیادہ اشعار اسی قسم کے ہیں اور جو کامیاب ہیں وہ بھی حسرت کے بہترین اشعار میں نہیں۔ جو غزل مجھے پہلے یاد آتی ہے اس کا مطلع ہے:۔

رنگ تیری شفقِ جمالی کا — اک نمونہ ہے بے مثالی کا

اس غزل کے اشعار منتخب کلام کے بیشتر اشعار سے اچھے ہیں۔ جگر، جلیل اور فراق نے خاص طور پر اچھا انتخاب کیا ہے۔ باقی شعراء کے انتخاب بھی ایک حد تک کامیاب ہیں۔ لیکن اچھے برے انتخاب سے مختلف شعراء کی شعر فہمی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اپنے شعر سبھی کو اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں غیر جانبدار نقاد کی طرح پرکھنا ممکن نہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو پھر شعراء پر گوئی سے پرہیز کرتے اور ضخیم دیوانوں کے بدلے مختصر و منتخب دیوان شایع کرتے۔ بہرکیف اگر ہر شاعر اپنے کلام کے انتخاب کے بدلے دوسرے شعراء کے کلام سے منتخب اشعار پیش کرتا اور انتخاب کے ساتھ وجہ انتخاب بھی واضح کر دیتا تو اس وقت اس کی شعر فہمی، اسکی تنقیدی صلاحیت معرضِ بحث ہو سکتی تھی اور کوئی فیصلہ کن رائے کا اظہار ممکن ہو سکتا تھا۔

جو شعراء شریک بزم ہیں انھیں میں نے پانچ گروپ میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے گروپ میں وہ شعراء داخل ہیں جو غزلیں تو کہتے ہیں لیکن جنھیں نظم سے زیادہ مناسبت ہے۔ نظم کے صحیح مفہوم سے اُردو شعراء اور نقاد بہت کم واقف ہیں۔ وہ چند مربوط و مسلسل اشعار کو نظم سمجھ لیتے ہیں۔ ہر نظم میں کسی مخصوص تجربہ کا وجود ضروری ہے۔ اُردو شعراء کو عموماً کسی ذاتی یا تخیلی تجربہ کا بیان مدنظر نہیں ہوتا۔ نظم میں جذبات و خیالات کی ابتدا، ترقی اور انتہا ہوتی ہے۔ اُردو نظموں میں ارتقائے جذبات و خیالات کا وجود نہیں ہوتا نظم میں ایک مصرعہ دوسرے مصرعہ سے ایک شعر دوسرے شعر سے پیوست ہوتا ہے، اُردو نظموں کے مختلف مصرعوں یا شعروں میں کوئی ناگزیر ربط نہیں ہوتا۔ نظمیں تو اُردو میں بہت ملتی ہیں لیکن شاید ہی کوئی نظم صحیح معنوں میں نظم کہی جا سکتی ہے۔ بہرکیف جو شعراء نظمیں لکھتے ہیں ان کی طبیعت وسعت کی خوگر ہو جاتی ہے اور وہ مربوط و مسلسل اشعار لکھنا پسند کرتے ہیں اس لئے غزل کی پراگندگی یا شعر مفرد کا مختصر پیمانہ انھیں پسند نہیں ہوتا اور اگر وہ غزل کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو وہ ایک قسم کی رکاوٹ محسوس کرتے ہیں انھیں غیر شعوری طور پر اظہارِ خیال میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ وسعت پسند طبیعت اسی تنگی سے گھبرانے لگتی ہے اور وہ اپنے اشعار میں فشارِ قبر کی کیفیت پاتے ہیں۔ انھیں خود بھی کامل تشفی نہیں ہوتی اور نہ ان کے اشعار سے قارئین کو کامل تشفی ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ شعوری طور پر انھیں ان چیزوں کا احساس نہ ہو اور وہ اپنی غزلوں اور اپنے اشعار کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں لیکن اگر وہ غور و فکر سے کام لیں تو انھیں یہ حقیقت نظر آ جائے گی۔ بہرکیف نقاد کو اس قسم کی کمی ان کی غزلوں میں محسوس ہوتی ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ ایسے شعراء غزل کی طرف مائل ہی کیوں ہوتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل پسند عام ہے اور عوام کسی شاعر کو شاعر ہی نہیں سمجھتے جب تک وہ غزلیں نہ لکھے۔ عوام میں شہرت حاصل کرنے کے لئے وہ بھی غزلیں لکھنے لگتے ہیں اور اکثر نتیجہ محض تضیع اوقات ہے یا غزلوں کی فراوانی میں مزید غزلوں کا اضافہ۔

پہلا گروپ — اس گروپ میں میں نے نو شعرا کو داخل کیا ہے :- احسان دانش، علی اختر اختر، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، تلوک چند محروم، اختر پیرزادی، آنند نرائن ملا، روش صدیقی۔ اس گروپ میں تین شاعر تو ایسے ہیں جنھیں بھول کر بھی غزل کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ غزل کے لئے نہیں پیدا ہوئے تھے اور ان کی غزلوں میں غزلیت مطلق نہیں۔ ان میں پہلا نام تلوک چند محروم کا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں "غزل میرا موضوع نہیں اگرچہ کچھ غزلیں لکھی ضرور ہیں" اس سے بہتر مختصر لیکن جامع تنقید ان کی غزلوں پر ممکن نہیں۔ محروم کہنہ مشق شاعر ہیں اس لئے وہ غزلیں بھی لکھ لیتے ہیں اور غزلوں میں پختگی پائی جاتی ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان کی غزلیں ایک شاعرانہ مشق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ محروم کی آواز بلند آہنگ ہے اور اس میں زور بھی پایا جاتا ہے مثلاً پہلے چار شعر ملاحظہ ہوں :-

اے ہمرہانِ دشتِ محبت! بڑھے چلو	اپنا تو پائے شوق، سلاسل میں رہ گیا
اے دل یہ کیا فسردگی آغازِ عشق میں	گل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہو گیا
ہو دورِ غم کہ عہدِ خوشی، دونوں ایک ہیں	دونوں گزشتنی ہیں، خزاں گیا، بہار گیا
سمجھ میں آیا نہ رازِ صنعت ذرا بھی صورتگرِ ازل کا	بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

صاف ظاہر ہے کہ محروم کی آواز بلند اور کسی حد تک کرخت ہے۔ نرمی اور لوچ کی نمایاں کمی ہے، شیرینی کا نام و نشان بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ محروم شاعر نہیں خطیب ہیں۔ اپنے جذبات کا سیدھے سادھے پیرایہ میں بیان نہیں کرتے بلکہ کسی کو مخاطب کرکے پیغامِ عمل دیتے ہیں یا کسی معلم کے لہجہ میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں یا اپنی گشتگی کی کمی کا اعتراف کرتے ہیں۔ پہلے شعر میں ہمرہان دشت محبت سے مخاطبت ہے تو دوسرے شعر میں اپنے دل سے تخاطب ہے۔ بقیہ دو شعر میں بظاہر کسی سے مخاطبت نہیں لیکن لہجہ کہہ دیتا ہے کہ شاعر خلوتِ خیال میں دل کا ترجمان نہیں بلکہ کسی بزم میں خطیبانہ انداز میں مائلِ گفتگو ہے۔ یہی رنگ ہر جگہ ملتا ہے۔ زورِ کلام میسر ہے لیکن جوش پر دسترس نہیں۔ یہ اردو شعرا کی عام کمزوری ہے۔ خصوصاً عصرِ حاضر کی نظمیں اس نقص سے بھری پڑی ہیں۔ بلند آہنگ آواز، رعب دار الفاظ، بندشوں کی پختگی ان چیزوں سے جوش کی کمی پوری کی جاتی ہے یا ان کے وجود کو جوش کا وجود سمجھا جاتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ بہت ممکن ہے آواز نرم اور دھیمی ہو، الفاظ صاف و سادہ ہوں لیکن شعر جوش سے لبریز ہو۔ محروم کے اشعار میں جوش کی نمایاں کمی ہے۔ جوش کی کمی کے ساتھ اصلیت کی بھی کمی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان جذبات و خیالات نے (جنھیں وہ داخلِ شعر کرتے ہیں) ان کے دل و دماغ میں کچھ بھی ہیجان پیدا نہیں کیا ہے۔ ان کے تصور نے محروم کے تخیل میں کچھ بھی تلاطم خیزی نہیں کی اس لئے ان اشعار میں تاثیر بالکل نہیں۔ ان اشعار کی پختگی، محروم کی کہنہ مشقی کی تعریف ممکن ہے لیکن ان کے اشعار دنیائے تغزل میں کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے۔ ان میں ایک قسم کی خشکی بھی ہے جس سے اثر اور زیادہ ناخوشگوار ہو جاتا ہے۔ تین شعر اور سن لیجئے :-

پھر بہار آئی، ہوا پھر گرم بازارِ جنوں	شوق کے پھولوں میں پھر تلنے لگے خارِ جنوں
اہلِ دنیا کی تگ و دو دیکھکر دیوانہ وار	ساری دنیا مجھکو آتی ہے نظر دارِ جنوں
تجھپہ وحشت کا اثر محروم پھر ہونے لگا	پھر ترے اشعار میں پاتے ہیں آثارِ جنوں

یہ ہے محروم کا رنگ۔ ان شعروں میں کوئی خوبی نہیں، کوئی انفرادی خصوصیت نہیں، ہر پڑھا لکھا شخص اس قسم کے اشعار موزوں کر سکتا ہے۔

محروم کی طرح جوش ملیح آبادی بھی غزل کے لئے نہیں بنائے گئے تھے۔ جوش اور سیماب نے عصرِ حاضر میں غزل کے روایتی رنگ کے خلاف جدوجہد کی اور غزل میں نئی وسعتیں پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ سیماب کی طرح ان کی بھی ایک حد تک تاریخی اہمیت ہے لیکن یہ بھی دنیائے تغزل میں کوئی مخصوص مرتبہ نہیں رکھتے۔ جوش بھی محروم کی طرح بلکہ محروم سے زیادہ زور کے قائل ہیں اور زور کو جوش کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کی آواز بھی بلند آہنگ ہے۔ غزل گو شعرا میں شاید ہی کسی کو اس قدر بلند آہنگ آواز میسر ہو۔ اس بلند آہنگی کے ساتھ ترکیبیں اور بندشیں بھی رعب دار ہوتی ہیں جن سے سامعہ مرعوب ہو جاتا ہے اور غزل کے بدلے قصیدہ کی فضا پیدا ہو جاتی ہے :-

صبح، بالیں پہ یہ کہتا ہوا غمخوار آیا	اٹھ، کہ فریادرسِ عاشقِ بیمار آیا
للہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبوح	حکمِ آزادیِ مرغانِ گرفتار آیا

اے نظر! شکر بجالا کہ کھلی زلفِ دراز — اے صدف! آنکھ اُٹھا ابر گہر بار آیا

خوش ہو اے گوش! کہ جبریلِ ترنم چہکا — مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

ان اشعار میں غزلیت بالکل نہیں لیکن غزلیت کے فقدان سے کوئی نقصان نہ ہوتا اگر غزلیت کے بدلے شاعر کسی اور اہم چیز کو داخل شعر کیا ہوتا لیکن ان اشعار میں محض الفاظ اور بندشوں کے ذریعہ قارئین کے سامعہ کو مرعوب کیا گیا ہے۔ خصوصاً آخری دو شعر میں متوازن الفاظ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ملاحظہ ہو "اے نظر! - اے صدف!"، "شکر بجالا - آنکھ اُٹھا"، "زلف دراز - ابر گہر بار"، "خوش ہو اے گوش! - مژدہ اے چشم!"، "جبریل ترنم - پیغمبر انوار"، "چہکا - آیا" اس لفظی کاوش کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جوش کے الفاظ سے قارئین ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان اشعار میں پرجوش جذبات یا بلند گہرے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اگر الفاظ سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو مضمون نہایت معمولی نظر آئے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جوش ہمیشہ اسی قسم کے مبتذل اشعار لکھتے ہیں لیکن ان اشعار میں ان کے مخصوص نقائص اور حد درجہ صاف واضح نظر آتے ہیں۔ زور اور ایک خاص رنگ کے الفاظ کی جستجو کو وہ اصل شاعری سمجھتے ہیں، اکثر ان کے ساتھ کچھ معنی آفرینی کی طرف بھی توجہ مبذول ہوتی ہے لیکن اس سے بھی کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا۔ وہ "خیال بندی" کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ کامیاب شاعری کے اس بھید سے واقف نہیں:۔ "جو دل پہ گزرے کھینچے اس کی صفحہ پر تصویر"۔ جو دل پہ گزرتی ہے اس کی وہ عکاسی نہیں کرتے۔ اُردو شعرا اپنی قوت حاسہ سے صحیح کام نہیں لیتے۔ وہ اسے زیادہ تیز و حساس نہیں بناتے۔ وہ رنگین و بوقلموں تجربات سے بہرہ ور نہیں ہوتے وہ ذاتی یا تخیلی تجربوں کے بدلے محض مصنوعی جذبات و خیالات پیش کرتے ہیں۔ جوش کے اشعار میں ہر شے مصنوعی اور غیر فطری معلوم ہوتی ہے۔ وہ محروم کی طرح خشک نہیں، ان کے الفاظ میں اکثر شادابی نظر آتی ہے۔ وہ عموماً بے رنگ نہیں خوش رنگ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ کامیاب نہیں ہوتے:۔

(۱)

اُٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر — گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر

وہ چہکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں — گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر

سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے — خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر

علم کھول کر جوش بدمستیوں کے — جہاں داریاں کر جہاں بانیاں کر

(۲)

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے — اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے

میرا صدموں میں مسکرا دینا — بدتر از صد ہزار ماتم ہے

دیکھ، وہ دل نہ توڑ او ظالم — راز کونین کا جو محرم ہے

یاد ان کی بہت نہیں آتی — شاید اب دل کی زندگی کم ہے

خون دل کی ہر ایک بوند میں جوش — وسعتِ عرصۂ دو عالم ہے

دو مختلف رنگ کی مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن دونوں ناکامیاب ہیں۔ پہلی مثال سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو الفاظ پر قدرت ہے اور اس کی بندشوں میں روانی ہے لیکن یہ اشعار قارئین کے دماغ میں کسی قسم کے نقوش نہیں چھوڑ جاتے۔ نہ کوئی تصویر ہی پیش کی گئی ہیں اور نہ مخصوص جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس لئے ان اشعار سے سامعہ کسی حد تک محظوظ ہو تو ہو دماغ بالکل محظوظ نہیں ہوتا۔ دوسری مثال میں رنگ دوسرا ہے۔ مضامین اس قسم کے ہیں کہ میر کے اشعار میں یہ تیر و نشتر سے کم نہ ہوتے، لیکن جوش کے اشعار میں یہ سرد و بیجان ہیں کیونکہ ان میں گرمی جذبات نہیں۔ مضامین صرف مضامین ہونے کی حیثیت سے باندھے گئے ہیں۔ انھیں احساسات کی صورت میں نہیں تبدیل کیا گیا ہے:۔

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے — اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے

اس شعر میں وہ کیفیت کہاں جو میر کے اشعار میں ملتی ہے:۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

میرؔ اور ہر اچھا شاعر، آپ بیتی بیان کرتا ہے یا پربیتی کو اپنے دل میں جوش کے ساتھ محسوس کرتا ہے، دونوں صورتوں میں اصلیت کا وجود ہوتا ہے اور اس وجہ سے اشعار میں قیامت کی تاثیر مستور ہو جاتی ہے۔ جوشؔ کے اشعار میں تاثیر مطلق نہیں اس لئے وہ دل میں جاگزیں نہیں ہوتے۔

محرومؔ و جوشؔ کی غزلوں سے کہیں زیادہ ناکامیاب احسانؔ دانش کی غزلیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا غزلیں کہنا غلطی ہے۔ احسانؔ دانش "غزلیں" لکھ کر اُردو غزل پر ظلم کرتے ہیں۔ احسانؔ دانش اور شعراء سے نسبتاً کم عمر ہیں لیکن وہ الفاظ پر کافی قدرت رکھتے ہیں، ان کی بندشیں پختہ اور محکم ہوتی ہیں لیکن اسے کیا کہئے کہ اثر مطلق نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوت حاسہ سلب کر لی گئی ہے، نہ وہ خود محسوس کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو محسوس کرا سکتے ہیں۔ ان کے اشعار پڑھ کر دل گھبرانے لگتا ہے۔ ایسی فضا ہے کہ سانس لینے میں مشکل ہوتی ہے اور اگر زیادہ دیر ٹھہرا جائے تو پھر سانس کے رک جانے کا اندیشہ ہے:-

وہ سو کر اُٹھ رہے ہیں اللہ اللہ کیا نظارا ہے
قیامت نے ابھی کروٹ بدل کر سر اُبھارا ہے

جوانی نے اُسے اس خوش مذاقی سے سنوارا ہے
نہ عرضِ شوق کی جرأت، نہ ضبطِ غم کا یارا ہے

سحر ہوتے ہی وہ اس طرح شرما کر سدھارا ہے
کہ مجھکو عمر بھر اب رنجِ محرومی گوارا ہے

کہاں صحرا نوردی اور کہاں دیدار کی حسرت
مری دیوانگی تیرے تغافل کا اشارا ہے

معطر سانس، چہرہ اشکِ گل، مستی بھری آنکھیں
جوانی ہے کہ اک سیلاب رنگ و بو کا دھارا ہے

تمھاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے،

ستم کو کیا ستم سمجھوں جفا کو کیا جفا جانوں؟
وہی جورِ آشنا جب زندگانی کا سہارا ہے

ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ
مجھے اے ناخدا کس گھاٹ تو نے لا اُتارا ہے

وفا کی آرزو لغزش ہے اک خوش اعتقادی کی
مجھے احسانؔ اکثر دوستوں نے مل کے مارا ہے

اس غزل کو پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھاری گول پتھر لڑھکتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اس کی رفتار نہ تو رکتی ہے نہ تیز ہوتی ہے۔ ایک ہی رفتار سے یہ پتھر چلا جاتا ہے اور اس کے راستے سے ہٹ جانا دانشمندی ہے۔ استعارہ سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو گا کہ اس غزل میں قافیہ پیمائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ الفاظ بجائے خود اہمیت رکھتے ہیں یہ محض اظہار جذبات و خیالات کا ذریعہ نہیں۔ یہ احسانؔ دانش کا مخصوص نقص ہے۔ وہ الفاظ سے کھیلتے ہیں، الفاظ کو جس طرح جی چاہتا ہے جوڑ دیتے ہیں۔ انھیں استعارہ و تشبیہ سے خاص شغف ہے، اور وہ اپنے مشاہدہ کے ثبوت میں متعدد تصویریں پیش کیا کرتے ہیں۔ اکثر ان الفاظ کے معانی، استعارہ کے موقع و محل، تصویروں کے تناسب و توازن کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے:-

تمھاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے

"کتاب غم کا دیباچہ" میں استعارے کا استعمال ہے لیکن اس استعارے میں اور دوسرے مصرع کے مضمون میں کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح:
"ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ" میں محض لفاظی ہے۔ غرضکہ احسانؔ دانش میں "احساس بلند و لطیف" کی کمی ہے اور وہ الفاظ و نقوش کے استعمال میں بھی غور و فکر سے کام نہیں لیتے اس لئے وہ اور کسی فن میں کامیاب ہوں تو ہوں فنِ غزل میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اسی گروپ میں چار شاعر ہیں علی اخترؔ اختر، اخترؔ شیرانی، روشؔن صدیقی، افسرؔ میرٹھی۔ ایسے ہیں جنھیں بظاہر غزل سے کچھ زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے ان کے شعروں میں وہ کرختگی، خشکی، بلند آہنگی نہیں جو محرومؔ، جوشؔ، احسانؔ کے شعروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کے شعروں میں ایک قسم کی تازگی، جوانی کی اُمنگ ہے اور زبان میں سبکی اور روانی ہے لیکن افسرؔ کے سوا اور کسی کا ایک مخصوص رنگ نہیں۔ ان کے اشعار میں تفرقہ مشکل ہے۔ ان میں بہت کچھ مشابہت ہے اور یہ مشابہت انفرادی خصوصیت پر محیط ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی اخترؔ اختر، اخترؔ شیرانی، روشؔن صدیقی کی شخصیتیں اس پایہ کی نہیں کہ یہ اپنا اپنا مخصوص نقش اشعار پر ثبت کر دیں، ان کی نظمیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں لیکن ان کے اشعار میں امتیازی فرق نہیں۔ اس کے علاوہ یہ شعراء کسی انفرادی نقطۂ نظر کے حامل نہیں، ان کے تجربات کسی خاص رنگ میں رنگے ہوئے نہیں ہیں، اس لئے ان کے تخیل کسی شتر بے مہار کی طرح جس طرف جی چاہتا ہے چل پڑتے ہیں۔ روایتی شاعر ہونا یہ پسند نہیں کرتے۔ چاہتے تو ہیں کہ اپنی شخصیت کو روایتی شعر گوئی سے آلودہ نہ ہونے دیں اور اپنے اشعار میں انفرادیت سے کام لیں، لیکن انکی کوششیں

کامیاب نہیں۔ اختر شیرانی کے اشعار خصوصاً بہت زیادہ سطحی ہیں اور ان میں جوانی کی تر و تازگی، جوانی کی امنگوں، جوانی کے جلد گزر جانے والے جوش وخروش سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے:-

محبت کے اقرار سے شرم کب تک ؟ کبھی سامنا ہو تو مجبور کر دوں !
ترے دل کو ملنے کی خود آرزو ہو ! تجھے اس قدر، غم سے رنجور کر دوں !
نہیں زندگی کو وفا ورنہ اختر محبت سے دنیا کو معمور کر دوں،

فتنۂ غم جگائے جا، حشرِ ستم اٹھائے جا! نیچی نظر کئے ہوئے بام پہ مسکرائے جا !
دل مرا سر بسر گداز، تیری حیا عدوئے راز! مجھسے بھی ضبطِ غم نہ ہو، تو بھی نظر چرائے جا !
دورِ جہاں سے ساقیا! سرد ہوا ہے دل مرا برف و شراب کی جگہ، برق و شرر پلائے جا !
سایۂ ابر ہے شباب حاصلِ زندگی خراب ! عمر ہے مختصر تو ہو، عمرِ طرب بڑھائے جا !

جذبات سطحی اور نوخیز ہیں، ان میں گہرائی اور جوش کا وجود نہیں۔ خیالات جذبات سے زیادہ سطحی ہیں۔ اختر شیرانی غالباً غور و فکر سے کام نہیں لیتے علی اختر اختر میں غور و فکر کی عادت کچھ زیادہ ہے، لیکن [illegible] نوخیز اور خام ہیں اسی طرح علی اختر اختر کے خیالات بھی نوخیز اور خام ہیں۔ ان کا دماغ غائر و محیط نہیں "

حریم کعبہ
مجھم ۲

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ — پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں
وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی — دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں
جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ جاؤ جاؤ — جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

فرسودہ مضامین کا فرسودہ بیان ہے۔ نہ حسنِ الفاظ ہے اور نہ حُسنِ معانی۔ اس قسم کے اشعار سے کسی طرح کا لطف و سرور ممکن نہیں۔ حفیظ کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے:۔

ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے — پھر دیکھ لیا اس نے شرارت کی نظر سے
یہ ہوا، یہ ابر، یہ سبزہ حفیظؔ — آج پینے میں کمی اچھی نہیں
لحاظ خاطر احباب دیرینہ ہے اسے زاہد — چلوں کیا سوئے مسجد راہ میں میخانہ آتا ہے
گوارا ہے دوامی تلخ کامی — کسی میٹھی زباں والے نے مارا

ان شعروں میں بھی خیالات مبتذل، بیش پا اُفتادہ ہیں اور بیان میں بھی کوئی حُسن، جدت، انوکھا پن نہیں۔ خصوصاً چوتھے شعر کی رعایتِ لفظی تو نہایت پست مذاق کی خبر دیتی ہے۔ اگر ہمت بلند ہوئی اور فکر نے رسائی کی تو اس قسم کے اشعار موزوں کئے:۔

ہم ہی سو بھی نہ کوئی مار... — ا۔ہم نہ تمھیں بھلا سکے
" بھلا سکے
اسکے

معانی اپنی
سکے

اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری ، یارانِ بے خبر نے اسے فن بنا دیا

لیکن کسی حد تک انھوں نے بھی شاعری کو ایک فن بنا دیا ہے۔ اگر وہ "اظہارِ دردِ دل" سے زیادہ کام لیتے، اپنے ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے اور اگر تجربات نہ تھے تو انھیں حاصل کرتے تو پھر ایک امتیازی شان حاصل کر سکتے تھے۔ اُردو شعرا بو قلموں تجربات کے حامل نہیں ہوتے اور نہ وہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں اسی وجہ سے اگر صلاحیت موجود بھی ہوتی ہے تو بھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ انند نرائن ملّا میں بھی اسی قسم کی کمی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ نظمیں اور غزلیں دونوں لکھتے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ اپنی ساری دماغی کسی ایک پر صرف کریں کیونکہ وہ دو مختلف میدانوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ غزل میں وہ ایسے اشعار کہتے ہیں؛

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی | سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائگاں کبھی
آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار | گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہ لطف | پھرتوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

اس مقام سے آگے وہ نہیں پہونچ سکتے۔ اور اس مقام کے حدود ظاہر ہیں۔

(۶)

دوسرا گروپ ۔ دوسرے گروپ میں میں نے گیارہ شعرا کا شمار کیا ہے: ۔ کیفی، ناطق گلاؤٹھوی، امید امیٹھوی، دل شاہجہاں پوری، آسی، تاجور، بیخود، ساحر، سیماب، وحشت، یگانہ ۔ اس گروپ میں نئے اور پرانے رنگ کے شعرا داخل ہیں۔ سب مشاق ہیں اور مختلف مضامین کو صفائی، زور اور پختگی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں۔ انھیں کہنہ مشق اور قادرالکلام کہا جا سکتا ہے۔ کم و بیش، یہ کامیابی کے ساتھ قافیہ پیمائی، جسے عموماً شاعری سمجھا جاتا ہے، کے نمونے پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ان میں یہ جوہر نہیں کہ یہ اساتذہ، غالب، ذوق و مومن کی طرح اپنی اپنی مخصوص جگہیں ایوانِ تغزل میں بنالیں۔ یہ سب صاحب طرز نہیں۔ سیماب کے علاوہ سبھوں میں قوت ایجاد کی نمایاں کمی ہے۔ طرز بیان خشک، سادہ، بے رنگ ہے۔ یہ الفاظ سے زیادہ معانی پر زور دیتے ہیں اور محض الفاظ کی اُلٹ پھیر میں اپنا وقت صرف نہیں کرتے۔ اس لئے اشعار سطحی نہیں معلوم ہوتے لیکن ان کے دماغ "محشرِ خیال" نہیں۔ یہ سودا یا غالب کی معنی آفرینی سے بے بہرہ ہیں۔ یہ نئے نئے خیالات و تصورات پر قدرت نہیں رکھتے اور نہ اسلوب بیان ہی ایسا ہے جو دل میں اثر کرے۔ ان کی آنکھیں بھی وا نہیں اور یہ مشاہدہ عالم، کسی انفرادی مطالعہ فطرت کا ثبوت اپنے اشعار میں پیش نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے دل و دماغ حساس و مبصر نہیں۔ یہ خود جوش کے ساتھ اپنے خیالات و جذبات کو محسوس نہیں کرتے اس لئے قارئین پر بھی کچھ زیادہ اثر نہیں ڈال سکتے ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں جنھیں غزل گوئی کی طرف متوجہ نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس قسم کی پہلی مثال امید امیٹھوی کی ہے۔ اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ انھیں شعر گوئی سے کوئی فطری لگاؤ نہیں۔ بہت سے شعرا ایسے ہوتے ہیں جو شعر کسی میلان ذہنی سے مجبور ہو کر نہیں کہتے وہ ایسے تجربات سے بہرہ ور نہیں ہوتے جن کا اظہار ناگزیر ہو۔ وہ اس لئے شعر کہتے ہیں کہ دوسرے شعر کہتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی بحرِ سخن، میں 'شناوری' کریں گے۔ امید امیٹھوی اسی قسم کے شعرا میں داخل ہیں:۔

سیکڑوں قصّے ہوس کے ہوگئے مقبولِ عام | داستانِ اہلِ درد اب عرض کے قابل نہیں
میں نے مانا دوستی کا ماحصل ہے دشمنی | تیری اُلفت تو وہ شے ہے جس کا کچھ حاصل نہیں
ہستی عاشق حجاب جلوۂ معشوق ہے | یہ جو اُٹھ جائے تو پردہ پھر کوئی حائل نہیں
حُسن بے پروا دماغ امتحاں رکھتا نہیں، | فیصلہ عشق و ہوس کا ورنہ کچھ مشکل نہیں
اس نگاہ لطف ہی سے کیوں نہ چل کر پوچھئے | کون سی ہے وہ خطا جو عفو کے قابل نہیں

اس قسم کے اشعار ہر وہ پڑھا لکھا شخص جس کی طبع موزوں ہے یا جسے عروض سے کچھ واقفیت ہے بہ آسانی موزوں کر سکتا ہے

دوسری مثال پنڈت امرناتھ ساحر کی ہے۔ ان کا مخصوص نقص یہ ہے کہ کہنہ مشقی کے باوجود ان کے کلام کا کوئی خاص رنگ نہیں۔ خیالات و تصورات میں ناہمواری ہے اور یہ ناہمواری طرز ادا میں بھی نمایاں ہو کر نہایت ناخوشگوار اثر پیدا کرتی ہے۔ ایک طرف تو وہ اس قدر پیش پا اُفتادہ، عامیانہ خیالات کو فرسودہ رنگ میں پیش کرتے ہیں:۔

چشم و دل نزع میں ہیں محو تماشائے جمال — حشر کیا اور ہے اس سے کوئی بہتر اپنا

چمن میں آتش رخسار گل سے آگ لگی — نہ آشیانۂ بلبل بچا نہ دام رہا

اُلفت آئینہ رویاں آخراب بس کر کہیں — دیکھتے ہی دیکھتے محو تماشا ہو گیا

اے پری رو ترے دیوانے کا ایماں کیا ہے — اک نگاہِ غلط انداز پہ قرباں ہونا

دوسری جانب وہ متین خیالات کو سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں :-

گویا زبان حال تھی ساحرؔ خموش تھا — یہ سعئی ضبط تھی وہ تقاضائے ہوش تھا

مٹایا ہے خودی نے نقش پندار خودی دل سے — رہا باقی نہ کچھ نام و نشاں قطرہ کا دریا میں،

ازل سے دل ہے محو ناز وقف خود فراموشی — جو بیخود ہو وہ کیا جانے جفا کیا ہے وفا کیا ہے

لیکن وہ کسی رنگ میں بھی کامیاب نہیں ۔

امیدؔ و ساحرؔ سے کچھ زیادہ کامیاب "شاعری" کیفیؔ، ناطقؔ گلاؤٹھوی، دلؔ شاہجہاں پوری، آسیؔ الدنی اور بیخودؔ کے کلام میں ملتی ہے۔ لیکن یہ شعرا بھی کوئی خاص مرتبہ نہیں رکھتے۔ آسیؔ الدنی اور امیدؔ امیٹھوی اور ساحرؔ کی شاعری میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے مضامین کی دنیا کچھ وسیع معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے تنوع زیادہ ہے اور بیان میں زور اور بندشوں میں چستی اور الفاظ میں روانی بھی کچھ زیادہ ہے۔ لیکن اشعار پھر بھی شعریت سے مبرا ہیں۔ آسیؔ الدنی شاعر نہیں "شعرگو" ہیں اور غالباً اسی لفظ کا دوسرے شعراء پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ جہاں سے اُٹھا کے دیکھئے آسیؔ الدنی کے اشعار پھیکے، بیرنگ، نثر سے قریب معلوم ہوتے ہیں :-

خوش نوا یان چمن مٹ نہیں سکتے صیاد — چار مٹ جائیں گے تو چار نمایاں ہوں گے

موجد طرز ہے ہر وحشئی آشفتہ مزاج — سو کے سو طرح کے دامان و گریباں ہوں گے

غنچے بے حس ہیں یہ انداز جنوں کیا جانیں — وقت آئے گا تو ہم چاک گریباں ہوں گے

ہر جگہ یہی عالم ہے۔ دلؔ شاہجہاں پوری کے اشعار بھی اسی قسم کے ہیں۔ یہ امیرؔ مینائی کے شاگرد ہیں۔ ان کا طرز امیرؔ مینائی کے طرز سے ملتا جلتا ہے۔ الفاظ بندشیں مضامین سب امیرؔ مینائی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ لیکن امیرؔ مینائی کی خشکی بھی موجود ہے۔ دلؔ شاہجہاں پوری کہتے ہیں :- "جذبات کی رنگ پسند خاطر رہا۔ تصنع سے ہمیشہ احتراز کیا" لیکن ان کے اشعار میں جذبات کی فراوانی نہیں۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر کی طبیعت حساس واقع ہوئی ہے اور اس کے دل و دماغ بوقلموں رنگین تجربات و تصورات سے بہرہ در ہیں۔ طرز ادا میں آورد صاف نمایاں ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں لیکن آورد کو آمد میں تبدیل نہیں کرتے۔ انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ پسند بھی وہی اشعار ہوتے ہیں جن میں آورد کا وجود ہوتا ہے :-

اثر عشق سے ہوں صورت شمع خاموش — یہ مرقع ہے مری حسرت گویائی کا

چمن دہر میں ہر پھول رہا پیش نظر — کھینچتا تھا ہمیں نقشہ تری رعنائی کا

نظر آتی ہے مجھے حسن کی دنیا بے حس — کس کو افسانہ سناؤں شب تنہائی کا

بارہا ڈوب کے ابھرا مرے دل سے نشتر — راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

کیا سنائیں سرگزشت زندگیٔ پر الم — آشیاں اب تو قفس ہے اس سے پہلے دام تھا

درحقیقت مضطرب دل کے لئے وہ موت تھی — اصطلاحِ عام میں تسکین جس کا نام تھا

یاد ہے اب تک وہ کیف انگیزیٔ جوش بہار — شاخ گل تھی دست ساقی ہر گل تر جام تھا

اشعار میں ثقالت ہے جس کی وجہ بندش الفاظ ہے :- "صورت شمع خاموش"، "سرگزشت زندگی پر الم"، "کیف انگیزی جوش بہار"۔ معانی اور بندشوں میں ابتذال سے پرہیز ہے اور دونوں میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں لیکن کامیاب شاعری ممکن نہیں۔

یہی ابتذال سے پرہیز اور غور و فکر کی کارفرمائی کیفی اور ناطق گلاؤٹھوی کے اشعار کی بھی خصوصیت ہے۔ لیکن کیفی کے اشعار، دل شاہجہاں پوری اور ناطق گلاؤٹھوی کے اشعار سے زیادہ خشک ہیں اور ان میں بیرنگی اور نثریت بھی ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:-

حُسن عشق میں ہے یا عشق حُسن میں مضمر　　　جوہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں

عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی　　　حسن لنترانی کی رہ نہ سکا چادر میں،

فرط سوز اُلفت میں دیکھ کر سکوں دل کا　　　بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں

چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت سے　　　پاؤں میں جو چکر تھا آرہا ہے وہ سر میں

ہوں وہ رند یا صوفی مست اسکی دُھن میں ہیں　　　جانے کتنے میخانے بھر دئے ہیں کوثر میں

چوتھا شعر نیت خیالی کا نمونہ ہے گر یہ الفاظ اس پر پردہ کئے ہوئے ہیں لیکن اور چار شعروں میں کیفی کی جملہ خصوصیتیں موجود ہیں۔ یہ کبھی از خود رفتہ نہیں ہو جاتے ہمیشہ اپنے دامن کو سنبھالے ہوئے رہتے ہیں اور کبھی اس لغزش پا کے مرتکب نہیں ہوتے، جس پر سیکڑوں ہوشیاریاں قربان ہیں کبھی کبھی ایسے اشعار بھی قلم سے نکل جاتے ہیں:-

اک خواب کا خیال ہے دُنیا کہیں جسے　　　ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے

خمیازہ ہے کرشمہ پرستیٔ دہر کا　　　اہل زمانہ عالم عقبےٰ کہیں جسے

برہمن حجاب ہے خود رفتگی حُسن　　　اک شان بیخودی ہے زلیخا کہیں جسے

ناطق گلاؤٹھوی کے متعلق کچھ کہنے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجایش۔ ان چار شعروں سے ان کے رنگ کا پتہ مل سکتا ہے:-

وہ گئے ہمت گئی رخصت شکیبائی ہوئی　　　رفتہ رفتہ اپنی دُنیا ہی گئی آئی ہوئی،

اپنی رسوائی کا غم تھا جب نہیں وہ دن گئے　　　ابتو یہ غم ہے کہ ایسی پھر نہ رسوائی ہوئی

جانتے ہیں یہ کہ پہچانا نہیں کوئی ہمیں،　　　یہ نہیں معلوم کس کس سے شناسائی ہوئی

کیا کہا میں اور تمنا عشرت گمگشتہ کی　　　وہ مری سو بار کی کھوئی ہوئی پائی ہوئی

بیخود دہلوی کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کی اُستادی مسلم ہے۔ ہر قسم کے مضمون کو بلا تکلف نظم کر سکتے ہیں لیکن مضامین اور اسلوب بیان دونوں روایتی ہیں اور ان کی حیثیت "اُستاد فن" کی ہے شاعر کی نہیں:-

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا،　　　تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دل مرحوم کے لئے　　　کمبخت نامراد لڑکپن کا یار تھا،

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور ہے　　　مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمھاری زبان میں　　　تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں　　　نقش قدم کسی کا سر رہگزار تھا

اسوقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق　　　تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

اس گروپ کے تین شاعروں کے متعلق مفصل اظہار خیال کی ضرورت نہیں، تاجور نجیب آبادی اور وحشت کلکتوی پڑھے لکھے شاعر ہیں جو اپنی غزلوں میں اپنی قابلیت سے ناجایز کام نہیں لیتے لیکن جن کی قابلیت کی وجہ سے غزلوں میں ایک ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ تاجور نجیب آبادی کے الفاظ میں خاص رکھ رکھاؤ ہے اور وحشت کلکتوی کی بندشیں جاذب نظر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز نہیں۔ یہی حال یگانہ چنگیزی کی شاعری کا بھی ہے انھوں نے چند مخصوص وجہوں کے سبب سے صحت زبان، لطف محاورہ کی طرف زیادہ توجہ کی اور اس میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی۔ ان کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زور، شگفتگی اور رابطہ ہے۔ قنوطیت کا نام و نشان نہیں۔ ان کا لہجہ بلند ہے لیکن آواز خوش آیند ہے:-

قفس میں ہوئے مستانہ بھی آئی دردسر ہو کر — نوید نا گہاں پہونچی ہے مرگ منتظر ہو کر
نگاہِ شوق سے کیا گئی گلوں کا دل دھڑکتا ہے — مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامال نظر ہو کر
کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت ہے — پڑے ہیں منزل فانوس پر بے بال و پر ہو کر
عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو — لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر
دیارِ بیخودی میں امتیاز روز و شب معلوم — بلا آئی ہے بدمستوں پہ شام بے سحر ہو کر
نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے — ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام بے سحر ہو کر

ان اشعار سے سامعہ اور دماغ پر خوشگوار اثر ہوتا ہے لیکن یہ اثر گہرا نہیں ہوتا۔ یہ فوراً مٹ جاتا ہے۔ ان شعروں میں وہ تاثیر نہیں جو دل کی گہرائی گیر ہو جائے۔ انمیں وہ لہجہ نہیں جو ابدیت کی نشانی ہے، جو میر، غالب، مومن کے کلام میں موجود ہے۔

اس گروپ میں اب صرف سیماب اکبرآبادی کا ذکر باقی ہے۔ سیماب اکبرآبادی کی اہمیت تاریخی ہے، سیماب ان شاعروں میں ہیں جو صرف غزلیں نہیں لکھتے بلکہ اپنے فن اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ موجودہ زمانہ میں غزلگوئی پستی کے غار میں گر گئی ہے۔ پُرانے خیالات کی بدولت تکرار شاعری سمجھی جانے لگی ہے، اس لئے انھوں نے غزل میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مضامین کی دنیا محدود تھی، اسے وسیع کیا اور طرز ادا میں بھی ابتذال اور فرسودگی سے بچ کر متانت، سنجیدگی، شوکت، ادبی شان پیدا کی۔ اس لئے موجودہ دور تغزل کا مؤرخ، جدید رنگ تغزل کی داغ بیل ڈالنے والوں میں انھیں شمار کرے گا۔ لیکن سیماب اکبرآبادی اکثر معنی آفرینی محض کو شاعری سمجھ لیتے ہیں اور اسی طرح "احساس بلند لطیف" کی ترجمانی کے بدلے طرز ادا میں، شوکت، ادبی شان اور ایک امتیازی رنگ پیدا کرلینا کافی سمجھتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ شاعری کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے، اس لئے اپنے دامن کو عوام پسندی کی گرد سے آلودہ نہیں ہونے دیتے :-

دینا مجھے فریب نوید حیات تم، — جب لوگ جا رہے ہوں جنازہ لئے ہوئے
تو اپنی بزم ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ! — آیا کہاں سے تیری تمنا لئے ہوئے
اس خاکدان عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ — ذرے پڑے ہیں وسعت صحرا لئے ہوئے
تھی کثرت جمال سے تاریک بزم دہر — آنا پڑا چراغ تمنا لئے ہوئے
کیوں ہنسی تو اسے اجل، فانی اگر سمجھا مجھے — ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے!
ہے حصول آرزو کا راز ترک آرزو — میں نے دُنیا چھوڑ دی تو مل گئی دُنیا مجھے
تھک کے سویا ہوں یہ اپنے اضطراب شوق سے — جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے
صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دئے — آ گیا تھا شام غم اک نیند کا جھونکا مجھے
دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا سے میں اُٹھ جاؤنگا — دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دُنیا مجھے

ان دو مثالوں سے سیماب اکبرآبادی کی خصوصیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے، یہ مشاق شاعر ہیں اور ان شعروں سے مشاقی صاف ظاہر ہوتی ہے، لیکن مشاقی کے ساتھ بھی سیماب صاحب طرز نہیں۔ ان کا کوئی خاص انفرادی رنگ نہیں۔ مثلاً ان شعروں کو لیجئے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سب ایک ہی شاعر کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہیں :-

میں غافل ہو کے دانستہ خراب بزم ہستی ہوں — سمجھتا ہوں کہ یہ محفل نہیں ہے خواب محفل ہے
ذرا کھل کر پکار اے صورِ مجذوبانِ اُلفت کو — یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں
وہ جس سے سمجھ جائے روداد مرے غم کی — ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھدینا
سرِ محفل نہ کیوں کھل کر بہوں میں — ان آنکھوں کی عنایت ہو رہی ہے
اس طرح مجھے ستا رہے رہو — جیسے میرا خدا نہیں ہے

اس سرسری تنقید سے یہ نتیجہ مترشح ہوتا ہے کہ اس گروپ میں جتنے شعراء میں نے داخل کئے ہیں وہ کم وبیش مشاق ہیں۔ وہ معانی کو شاعری کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور لفظی الٹ پھیر کو حاصل شاعری نہیں سمجھتے۔ کم وبیش سب ہی غور وفکر سے کام لیتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے اشعار سطحی نہیں معلوم ہوتے۔ اشعار میں سنجیدگی اور متانت ہے لیکن جذبات کی گرمی نہیں، ان میں سے کسی نے بھی پائیدار مرتبہ حاصل نہیں کیا ہے اور غالباً نصف صدی کے گزر جانے کے بعد کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ سیماب کا نام شاید تاریخ غزل میں نظر آجائے۔

(۷)

تیسرا گروپ:- تیسرے گروپ میں پانچ شعراء داخل ہیں:- نوح ناروی، ثاقب لکھنوی، ناطق لکھنوی، اثر لکھنوی، آزاد انصاری۔ اس گروپ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ معانی سے زیادہ الفاظ پر زور دیتے ہیں۔ معنی آفرینی، نازک خیالی سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ان کی ساری توجہ الفاظ سے وابستہ ہے۔ یہ لفظی الٹ پھیر کو اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ معانی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں، حسن الفاظ، لطف زبان، محاوروں کی برجستگی، یہ چیزیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ عمیق خیالات، پرجوش جذبات، لطیف، باریک و زندہ احساس یہ چیزیں عنقا ہیں۔ ان کے اشعار میں ایک مخصوص سبکی اور روانی ہے۔ جیسے پانی سطح زمین پر بہ آسانی پھیل جائے۔ لیکن اس پانی میں گہرائی نہیں اور سطح زمین صاف نظر آتی ہے اور یہ زمین وہی ہے جس سے ہم واقف ہیں۔ ان شعراء کی ساری پونجی الفاظ پر منحصر ہے اس لئے ان کے شعروں کی تنقید میں بھی الفاظ ہی کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے۔ لفظی حسن کی وجہ سے یہ اشعار سریع الاثر ہوتے ہیں اور سطحی نظر کو فوراً جذب کر لیتے ہیں اور مشاعروں میں خراج تحسین وصول کرتے ہیں۔ اس گروپ کے دو شاعر، ثاقب و ناطق، مفصل ذکر کے مستحق نہیں۔ یہ ایک مخصوص و معلوم طرز میں شاعری یا قافیہ پیمائی کرتے ہیں اور اس طرز میں انفرادی شان بھی پیدا نہیں کرتے۔ ناطق:-

ہر ذرہ کائنات ہے اک کائنات کا ـــــ موصوف کل صفات ہے ہر جزء صفات کا
گل پیرہن گریباں بلبل مرید نالہ ـــــ میری معاشرت کا شہرہ چمن چمن ہے
شاہراہِ عام سے رسوائے منزل نہ کر ـــــ کچھ نئی راہیں نکال اے رہنما میرے لئے
دل کے ٹکڑے جلوہ زار روئے جانانہ بنے ـــــ آئینہ جب ٹوٹ جائے آئینہ خانہ بنے
اک فریب حسرت دیدار تھا جلوہ ترا ـــــ نور سمجھے تھے جسے وہ بھی حجاب نور تھا

ثاقب:-

دیار دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا ـــــ وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا
بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا ـــــ مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے
جب زلف دیکھ لی ہے تو چہرہ بھی دیکھ لوں ـــــ گردش نہیں ہے کیا مرے لیل و نہار کو
پھر اور کس طرح سے اجڑے مکاں کو سجاتا ـــــ قصر لحد میں آکر تصویر ہو گیا ہوں
آگ یہ کیسی لگی ہے سینۂ دلگیر میں ـــــ چھالے آتے ہیں نظر آئینہ تقدیر میں

یہ اشعار بلا تخصیص پیش کئے گئے ہیں۔ اگر ناطق کے شعروں کو ثاقب کے دیوان یا ثاقب کے شعروں کو ناطق کے دیوان میں داخل کر دیا جائے تو قارئین کو ذرا بھی یہ احساس نہ ہوگا کہ کسی دوسرے شاعر کا کلام داخل دیوان کیا گیا ہے یا اگر ان شعروں کو عمر، زید، بکر کی طرف منسوب کیا جائے تو بھی کسی کو مجال انکار نہیں۔

اثر کے اشعار میں لطف زبان زیادہ ہے۔ قدیم رنگ تغزل سے سرمو تجاوز نہیں کرتے اور اس رنگ کو انہماک کے ساتھ برتتے ہیں۔ وہی حسن و عشق کی داستان ہے، وہی حسرت دیدار، شوق گناہ، وحشت، دیوانگی، میخواری، فریاد و فغاں، گل و بلبل، صیاد، گلشن، اسیری، نشیمن کا قصہ ہے:-

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں ـــــ جیسے کچھ اختیار ہے اپنا
حیا شیوۂ حسن، ادب شرط الفت ـــــ ملے بھی تو آپس میں پردا رہیگا
کیا حسرت دیدار ہے ہر بار یہ سمجھا ـــــ گویا کبھی دیدار میسر نہ ہوا تھا

شوق بڑھتا گیا گناہوں کا لذت انفعال نے مارا
یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی ہمارے جوش جنوں کا وہی زمانہ تھا
ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا
صیاد نے چھیڑا وہیں افسانۂ گلشن جب قصد اسیروں نے کیا ترک فغاں کا

ظاہر ہے کہ اکثر روایتی شاعروں میں ہیں۔ مروجہ خیالات و مضامین کی تکرار کرتے ہیں۔ نئے ڈھانچ میں وہی " اگلے برس کی تیلیاں " ہیں۔ اسلوب بیان پر مضامین سے زیادہ توجہ ہے اور اس اسلوب میں ظاہری حسن موجود ہے۔ زبان صاف، شستہ، رواں، چست، شاداب، نکھری ہوئی ہے۔ یہی زبان کی خوبی قارئین کی توجہ کو کھینچ لیتی ہے۔ اگر کوئی تاثیر بھی ہے تو وہی جو حسین الفاظ کے حسین استعمال کا نتیجہ ہوتی ہے یعنی یہ تاثیر اسی قسم کی ہے جو گلزار نسیم میں ملتی ہے اور جس کا دائرہ نہایت محدود ہے۔

نوح ناروی اور آزاد انصاری بھی الفاظ سے کھیلتے ہیں اور اسی "کھیل" کو شاعری سمجھتے ہیں۔ عموماً شعرائے دہلی معانی پر زیادہ زور دیتے ہیں اور لفظی اُلٹ پھیر سے پرہیز کرتے ہیں لیکن نوح ناروی اور آزاد انصاری اسی شغل میں منہمک نظر آتے ہیں۔ آزاد انصاری اپنی سادگی کے باوجود بھی کثرت سے رعایت لفظی کا استعمال کرتے ہیں اور اکثر نتیجہ اس قدر مضحک ہوتا ہے :۔

زلفوں والو ! یہ اندھیر دُہرے دُہرے کالے ناگ

تعجب ہے کہ یہ شعر انھوں نے اپنے انتخاب میں کس طرح داخل کیا۔ رعایت لفظی کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

اچانک نزولِ بلا ہو گیا، یکایک ترا سامنا ہو گیا،
یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گماں نہ تھا
سمجھتا ہوں کہ تم بیداد گر ہو مگر پھر داد لینی ہے تمھیں سے
حق بنا، باطل بنا، ناقص بنا، کامل بنا جو بنا نا ہو بنا لیکن کسی قابل بنا
یہ کیف بارشوں کی یہ ہستی سحاب کی توفیق ہو تو نہر بہا دوں شراب کی

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ الفاظ کی تکرار میں ایک خاص لطف محسوس کرتے ہیں :

تم اور دل آزادیِ اربابِ محبت ارباب محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا
شاد کر ہم غم زدوں کو شاد کر یاد کر حق ہائے خدمت یاد کر
خیالِ نگاہِ محبت عبث کہ تاب نگاہِ محبت کہاں
ارمانِ التفات دل دوستاں درست شایانِ التفات دل دوستاں کہاں

"ارباب محبت" ، "شاد کر" ، "نگاہ محبت" ، "التفات دل دوستاں" کی تکرار ظاہر ہے۔ اسی قسم کی مثالیں ہر جگہ آزاد انصاری کی غزلوں میں نظر آتی ہیں اس تکرار سے قارئین محظوظ بھی ہوتے ہیں لیکن اکثر تکرار اصل مدعا ہو جاتی ہے اور اس سے کسی خاص اثر کی تخلیق مدنظر نہیں ہوتی یا یہ کسی پُرجوش جذبے کے ماتحت عمل میں نہیں آتی۔ بہرکیف آزاد انصاری نہایت سادگی سے کام لیتے ہیں، جب ان کی توجہ الفاظ میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی ہے تو ان کی سطحیت گہرائی سے بدل جاتی ہے اور قارئین کی توجہ الفاظ کو چھوڑ کر معانی کی طرف رجوع کرتی ہے :۔

اگر اس قدر قریب نہ آ کہ تماشا محال ہو جائے
اعتبارات سے بالا ہو جا اعتبارات میں کیا رکھا ہے
بے خبر کار خبر مشکل نہیں بے خبر ہو جا، خبر ہو جائے گی
ترا بار گراں مہربانی کون اُٹھا سکتا ترا نا مہرباں ہونا کمال مہربانی ہے

نوح ناروی کے شعروں میں اتنی بھی گہرائی نہیں ملتی۔ یہ داغ کا تتبع کرتے ہیں، زبان کی روانی، چستی، برجستگی، شگفتگی موجود ہے لیکن اس میں یہ اپنے اُستاد سے بہت پیچھے ہیں۔

دکھائے پانچ عالم اک پیامِ شوق نے مجھ کو ——— اُلجھنا، روٹھنا، لڑنا، بگڑنا، دور ہو جانا

کیوں کر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھئے ——— سب مجھ سے پوچھئے یہ مصیبت نہ پوچھئے

ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا ——— جہاں بیٹھے گھٹا اُٹھی جہاں پہونچے بہار آئی

آپ ہیں ہم ہیں مے ہے ساقی ہے ——— یہ بھی اک امر اتفاقی ہے

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد ——— ملی زندگی مجھ کو مرنے کے بعد

جو اس قسم کی "شاعری" پسند کرتے ہیں انھیں نوح ناروی کے کلام میں کافی لطف و سرور حاصل ہو سکتا ہے۔

اس گروپ کے شاعروں کو میں لفظی بازیگر تصور کرتا ہوں۔ یہ لفظوں کی مدد سے حیرت انگیز کرشمے دکھاتے ہیں، جن سے ظاہر بیں نظر فریب میں آجاتی ہے اور ان بازیگروں کی چابکدستی سے مرعوب و متحیر ہو جاتی ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے سے اس چابکدستی کا بھید کھل جاتا ہے۔

(۸)

چوتھا گروپ:۔ اب تین شاعروں کی باری ہے:۔ جگر، آرزو اور جلیل۔ یہ بھی قدیم رنگِ تغزل کے علمبردار ہیں لیکن کسی حد تک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تینوں شعراء غزل کے محدود میدان میں خوش نظر آتے ہیں، اس کی تنگی سے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ غالباً انھیں اس تنگی کا احساس بھی نہیں۔ مضامین غزل اور اسلوب بیان میں بھی یہ کوئی انقلاب برپا نہیں کرتے اور نہ کسی انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اپنے اپنے رنگ میں یہ مروجہ خیالات و جذبات کو چمکاتے ہیں اور پرانی باتوں کو نئے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ زبان پر کامل قدرت ہے اور اسی کے استعمال میں انفرادیت سے کام لیتے ہیں۔ اور اسی انفرادی استعمال کی وجہ سے انھوں نے اپنے لئے ایک نہایت ہی محدود لیکن مخصوص جگہ بنالی ہے۔

جگر مرادآبادی نئے اور پرانے رنگِ تغزل دونوں میں طبع آزما ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ان کی اہمیت زیادہ نہیں کم ہو جاتی ہے، ایک طرف تو یہ رنگ ہے:۔

ترے بیان میں قاصد کچھ اشتباہ نہیں ——— جز ایں قدر، کہ یہ فرمودۂ نگاہ نہیں

جو ساز کہ خود نغمۂ حرماں تھا اسی کو ——— اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

ہر حقیقت کو بہ اندازِ تماشا دیکھا ——— خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کم دیکھا

حسن بے حسن بے اماں عقدہ کرائے غم نہاں ——— پھر یہ نگاہ دل کہاں پردہ اگر اُٹھا دیا

سوز تمام چاہئے رنگِ دوام چاہئے ——— شمع تہِ مزار ہو، شمع سرِ مزار کیا

اور دوسری جانب یہ عالم:۔

آنکھوں کا تھا قصور نہ دل کا قصور تھا ——— آیا جو میرے سامنے میرا غرور تھا

ہم سے پوچھو تو عشق کی بھی نگاہ ——— سخت کافر نگاہ ہوتی ہے

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل، ——— رائگاں سعیِ التفات گئی،

کوچۂ عشق میں نکل آیا، ——— جس کو خانہ خراب ہونا تھا

مجھ ناتوان عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا ——— دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

تعجب ہوتا ہے کہ ایک ہی شاعر نے ایسے دو مختلف رنگ کیوں اختیار کئے۔ جگر کا اپنا رنگ ان دونوں کے بیچ میں واقع ہوا ہے اور جب وہ قصداً نئے یا پرانے رنگ میں طبع آزما نہیں ہوتے تو کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے کامیاب اشعار میں (اور ان کی تعداد نسبتاً کم ہے) آمد، روانی، بیساختگی اور توازن کا وجود ہے لیکن بظاہر یہ خوبیاں ان کے سارے اشعار میں نظر آتی ہیں اس لئے سطحی نظر ان کے کامیاب و ناکامیاب اشعار میں تمیز نہیں کرتی اور سبھوں کو برابر کامیاب تصور کرتی ہے۔ مثلاً ان شعروں پر شاعروں میں ضرور "سبحان اللہ" کی صدا بلند ہوگی:۔

اللہ اللہ رے ہستیِ شاعر — قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا — منھ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

تو نے جس اشک پہ نظر ڈالی — جوش کھا کر وہی شراب ہوا

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر — لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی

لیکن ان شعروں میں حقیقی تاثیر نہیں وہ تاثیر جو اس شعر میں موجود ہے :-

کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے — وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

مضمون نیا نہیں لیکن اسلوبِ بیان نے اسے نیا اور پُر اثر بنا دیا ہے۔

جلیل مانک پوری، قدیم و جدید رنگِ تغزل کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ یہ اپنے رنگ سے واسطہ رکھتے ہیں اور یہ رنگ قدیم رنگِ تغزل کی یادگار ہے۔ نیاز صاحب فرماتے ہیں :- "جناب جلیل کے یہاں، سلاستِ بیان کا یہ عالم ہے گویا ایک نرم و سبک رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے ..... جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ نہ کوئی مضمون آفرینی ہے نہ فکر و خیال کی بلندی لیکن ان کے کلام کی سادگی، روانی، بے تکلفی اور خیالات کا سلجھا ہوا ہونا اس گلاب کا سا حسن ہے جس کے قبا کو گل بوٹے کی ضرورت نہیں" یہ تعریف اپنی جگہ پر موزوں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے بہتر تعریف ممکن بھی نہیں۔ تعجب ہے تو اس پر کہ دورِ حاضر کی نئی تحریکوں سے یہ متاثر نہ ہوئے اور اپنی ساری توجہ غزل پر صرف کر دی۔ تاسف ہے کہ جلیل نے اپنی نظر ماضی پر رکھی اور کبھی مستقبل و حال کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ ان کی شاعری کی جڑیں ماضی کی زمین میں پیوستہ ہیں اس کی شاخیں ماضی کی فضا میں جھومتی ہیں اور اس کے پھولوں میں بھی عہدِ رفتہ کی خوشبو ہے اس لئے ان کے کلام سے کامل تشفی حاصل نہیں ہوتی :-

او آنکھ چُرا کے جانے والے — ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

مزے سے تابیوں کے آ رہے ہیں — وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

آپ اور سوگ مرا کیا کہنا — دیکھئے لب پہ ہنسی آئی ہے

مار ڈالا مسکرا کر ناز سے — ہاں مری جاں پھر اسی انداز سے

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے — نگہِ شوق پردہ در بھی ہے

میرے آنے کی تو بندش ہے مگر — کیا کریں گے میں اگر یاد آیا

دیکھا! یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ جلیل ان کوششوں سے باخبر ہیں جو غزل میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے عمل میں آئی ہیں۔ ان کی شاعری بیسویں صدی کی فضا میں سانس نہیں لیتی۔ زبان سے ظاہر ہوتا ہے کہ داغ و امیر اپنا اثر ڈال چکے ہیں۔ زبان سے قطع نظر یہ شاعری میر و مومن کی شاعری کی فضا میں سانس لے سکتی ہے۔

آرزو لکھنوی کا مقام جلیل و جگر کے بعد ہے۔ یہ بھی کہنہ مشق ہیں اور "صحتِ زبان و بیان کے لحاظ سے استنادی حیثیت رکھتے ہیں" ان کے شعروں میں مجاز کی رنگینی جگر کا جوش و ولولہ نہیں اور نہ جلیل کی تازگی ہے۔ لیکن ان کے سادہ شعروں میں بھی اکثر اثر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ انھیں دنیا دبھرے مضامین پسند اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے ہمعصروں میں یہ حسرت و فانی سے قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے مرتبہ تک نہیں پہونچے۔ مضامین کی یکرنگی سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے خیالات کی دُنیا نہایت تنگ ہے :

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا — اب ہاتھ ملے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

لطفِ بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار — دل کیا اُجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا،

کیا سوزِ محبت میں جفا ضبط نے کی ہے — در بند ہے اور چار طرف آگ لگی ہے

دبائے بیٹھا ہوں سینے میں راکھ کا اک ڈھیر — نہ دل ہے اب نہ جلے دل کی آہ کا شعلہ

آگ دل میں لگی نہ ہو جب تک — آنکھ اشکوں سے تر نہیں ہوتی

اے سانس نہ آ کہ دل میں ہے غم — ٹیس اُٹھی ہے جب ہوا لگی ہے
سب تو خیر ان کی حال پُرسی پر — دل امنڈ آیا اشک بھر آئے

یہ چند مثالیں تھیں۔ ان سے اُفتادِ طبیعت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ انھیں شیون و فریاد سے خاص موانست ہے لیکن یہ موانست فطری کم اور اختیاری زیادہ ہے۔ شیون و فریاد کرنا اُردو شعرا کا محبوب شیوہ ہے اور آرزو لکھنوی بھی اس روایتی طریقہ کے پیرو ہیں لیکن مضامین کا انتخاب صرف تقلید کا نتیجہ نہیں انھیں اس قسم کے مضامین سے کچھ فطری موانست بھی ہے اور اسی وجہ سے ان کے اشعار میں تاثیر نظر آجاتی ہے اور اسی تاثیر کی وجہ سے میں نے انھیں اس گروپ میں جگہ دی ہے ورنہ ان کی جگہ بھی دوسرے گروپ میں ہوتی۔

(۹)

پانچواں گروپ :- آخری گروپ میں وہ تین شاعر ہیں جنھیں میں حقیقی معنوں میں شاعر سمجھتا ہوں، حسرتؔ، فانیؔ اور فراقؔ۔ یہ غزل کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور غزل کے محدود میدان میں خوش و قانع ہیں۔ غزل کے نقائص و حدود واضح کئے جا چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں وہ نقائص و حدود موجود ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں غزل اپنے محدود محاسن کھو چکی تھی، یہ محض رسمی اور تقلیدی چیز ہو کر رہ گئی تھی۔ ان شعرا نے غزل کے کھوئے ہوئے محاسن کو پھر حاصل کیا، اسے منحوگی، ابتذال تقلید سے نجات دلا کر اسے اصلیت، حقیقت، تاثیر سے مزین کیا۔ یہ شعراء اپنے دل کی ترجمانی کرتے ہیں، اسی لئے ان کے شعروں میں تاثیر ہے۔ ان کے اشعار دل سے نکلے ہیں اسی لئے دلوں میں گھر کرتے ہیں۔ ان کے دل درد آشنا ہیں اس لئے جو شیون و فریاد ان کے شعروں میں ہے وہ رسمی نہیں۔ اس کی بنا حقیقت پر ہے لیکن ان کی قوت حاسہ بیسویں صدی کے ماحول سے متاثر نہیں ہوئی ہے۔ ان کی شاعری بغیر کسی تغیر و تبدل کے میرؔ و مومنؔ کی فضا میں سانس لے سکتی ہے یہ ضرور ہے کہ بنیادی جذبات کبھی بدلتے نہیں لیکن قوت حاسہ مختلف زمانہ میں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور ترجمانیٔ جذبات میں قوت حاسہ کا تغیر، ماحول کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً ان شعروں کو لیجئے :-

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — ابتو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا
دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
سُن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لیکر کوئی غافل ہو گیا،
"اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ — کیا کروگے وہ اگر یاد آیا"
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تو نے تو خیر بے وفائی کی
یونہی فراقؔ نے عمر بسر کی — کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

ان شعروں میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ عصرِ حاضر کی پیداوار ہیں۔ مضامین اور اظہارِ مضامین دونوں موجودہ ماحول، موجودہ فضا، موجودہ قوت حاسہ سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جو جذبات غزل میں داخل کئے جاتے ہیں وہ بنیادی ہیں۔ یہ ہر زمانہ میں سطحی تغیرات کے باوجود بھی یکساں رہے اس لئے ان کے اظہار میں بھی کسی مقامی اور کسی خاص زمانہ و ماحول کے اثر کا وجود ضروری نہیں۔ لیکن شاعری اور شاعر خلا میں زندہ نہیں رکھ سکتے۔ شاعر اپنے انفرادی حس کے ساتھ بھی ایک حد تک اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، اس لئے اس کی شاعری بھی ماحول کی رنگ آمیزی سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

حسرتؔ، موجودہ شعرائے متغزلین میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ بظاہر ان کے اشعار اور دوسرے شعرا کے اشعار میں کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا:-

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا — تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا،
ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریِ دل، — التفات ان کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا
محفلِ یار کی رہ جائے گی آدھی رونق — ناز کو اس نے اگر انجمن آرا نہ کیا

وہی کوچۂ یار، گرفتاریِ دل اور ناز کی انجمن آرائی کا قصہ ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہاں فضا سراسر مختلف ہے اور پرانی داستان نئی طرح میں جلوہ گر ہے۔ یہاں الفاظ کی بے مزہ اُلٹ پھیر نہیں، یہاں فرسودہ مضامین کی خشک و بے لطف تکرار نہیں بلکہ سیدھے سادھے الفاظ میں صفائی، اختصار اور

کامیابی کے ساتھ، زندہ اور لطیف احساسات کا بیان ہے:

حُسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا ــــ کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

جو سمجھ نہ کرے شانِ توجہ پیدا ــــ دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی ــــ دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

ان شعروں میں اصلیت کی صاف جلوہ گری ہے، یہی ان کی تاثیر کا سبب ہے۔ دوسرے شعرا زیادہ کاوش، زیادہ تکلف و تصنع، شاید زیادہ غور و فکر سے بھی کام لیتے ہیں لیکن وہ حسرت کی طرح کامیاب نہیں ہوتے، حسرت کی طبیعت حساس واقع ہوئی اور دل سوز و گداز عشق سے آشنا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی شاعری کی ایک مخصوص فضا ہے جو الفاظ و مضامین سے وابستہ نہیں الفاظ و مضامین معمولی ہیں، دوسرے بھی ان الفاظ و مضامین پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کے شعر کسی انفرادی فضا میں سانس نہیں لیتے۔ حسرت کی شاعری کی جان یہ انفرادی فضا ہے جو ان کے شعروں میں جان ڈال دیتی ہے اور مردہ الفاظ و خیالات زندہ اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ جس کی طبیعت حساس، جس کی نظر باریک بیں ہے وہ اس فضا اور اس کی فسوں کاری سے فوراً واقف ہو جاتا ہے اور یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کسی زندہ اور زندگی بخشنے والی دُنیا میں جا پہنچا ہے:-

تاثیرِ برقِ حُسن جو ان کے سخن میں تھی، ــــ اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب ــــ آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

اک رنگ التفات بھی اس بے رُخی میں تھا ــــ اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار ــــ خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا، ورنہ آج کل، ــــ کیفیت بہار کی شدت چمن میں تھی

معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق ــــ وہ بات پیار کی جو ہنوز اس دہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی ــــ جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

اسی غزل میں حسرت نے اپنی مخصوص فضا پیدا کی ہے۔ یہ دو شعر:

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار ــــ خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی ــــ جو روشنی کہ شام سوادِ وطن میں تھی

مضمون کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں پہلے شعر میں مضمون معمولی ہی نہیں عامیانہ بھی ہے۔ اگر کوئی دوسرا شاعر اس کا ترجمان ہوتا تو ترجمانی میں ابتذال کا وجود ممکن تھا۔ دوسرے شعر میں کسی غربت نصیب کے احساس کی ترجمانی ہے اور صاف ظاہر ہے کہ یہ احساس ذاتی ہے، اس میں اصلیت موجود ہے۔ دوسرا شعر مضمون کے لحاظ سے پہلے شعر سے بلند ہے اور اس میں کسی قسم کے ابتذال کا احتمال نہیں۔ لیکن دونوں شعر کی فضا ایک ہے اور اس فضا کی ایک خصوصیت گداز ہے۔ پہلے شعر میں، جہاں تک مضمون کا تعلق ہے، غمگینی کا وجود نہیں لیکن پھر بھی اثر غم فزا ہوتا ہے۔

مخصوص فضا کی طرح حسرت کی ایک مخصوص "آواز" بھی ہے۔ ان کا لہجہ دوسروں کے لہجوں سے یکقلم مختلف ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ایک شعر کو سُن کر یہ کہنا ممکن نہ ہو کہ یہ حسرت کی آواز ہے لیکن کسی ایک غزل کے دو تین شعر سن کر جسے مذاق صحیح ہے وہ کہہ اُٹھے گا کہ یہ حسرت کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے۔ ان کی آواز مترنم ہے۔ انکے لہجہ میں نرمی اور بے ساختگی ہے لیکن یہ چیزیں اور شعرا میں بھی مل سکتی ہیں۔ حسرت کے لہجہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کبھی بلند و پست نہیں ہوتا۔ وہ سامعہ کو مرعوب کرنے کے لئے اپنی آواز بلند نہیں کرتے، اسی طرح وہ سرگوشیاں بھی نہیں کرتے۔ ان کی آواز عموماً اسی سطح پر ہوتی ہے جو ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ جذبات پرجوش ہوں لیکن وہ اپنے لہجہ کو بلند آہنگ نہیں ہونے دیتے کیونکہ انھیں اپنے جذبات پر کامل اختیار ہے۔ لہجہ کی یکسانی سے کوئی بُرا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اس کی یکسانی کے باوجود اس میں باریک ہلکے ہلکے تغیرات ہوتے رہتے ہیں، یہ تغیرات اسی قسم کے ہیں جو عام بول چال میں ہوتے ہیں:—

چھپ کے اس نے جو خود نمائی کی ــــ انتہا تھی یہ دلربائی کی،

دام سے ان کے چھوٹنا تو کہاں — یاں ہوس بھی نہیں رہائی کی
ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش — صلح میں شان ہے لڑائی کی

ترے درد کو جس سے نسبت نہیں ہے — وہ راحت مصیبت ہے راحت نہیں ہے
ترے غم کی دُنیا میں اے جانِ عالم — کوئی روح محرومِ راحت نہیں ہے
مجھے گرمِ نظارہ دیکھا تو ہنس کر — وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے

دیکھا! یہ ہے حسرت کی آواز۔ اشعار کو بار بار پڑھئے۔ لہجہ بظاہر یکساں اور عام بول چال کی سطح پر ہے لیکن ساتھ ساتھ اس میں ہلکی تبدیلیاں بھی ہیں۔ مثلاً دوسرے، پانچویں اور آخری اشعار میں لہجہ مختلف ہے لیکن یہ اختلافات اس قدر شدید نہیں کہ اس لہجہ کی یک رنگی میں خلل انداز ہوں۔

فانی بدایونی کے کلام میں دو قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ ایک طرف وہ غالب کے زیرِ اثر فلسفیانہ خیالات کو نظم کرتے ہیں اور دوسری جانب جذبات نگاری پر اپنا شعار قرار دیتے ہیں۔ معنی آفرینی ارادی ہے اور جذبات نگاری فطری، اس لئے جذبات نگاری میں وہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ یہاں ان کی جذبات نگاری کے متعلق کچھ لکھا جائے گا۔ وہ کہتے ہیں:۔

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں — جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

اس "نرالی بستی" کا بیان ان کی شاعری کی بنیاد ہے۔ فانی کی لغت میں زندگی اور غم مترادف الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "غمِ جاوداں" ان کی زندگی ہے۔ انھیں دکھا ہوا دل عنایت ہوا ہے۔ وہ اسی زندگی، اسی غمِ جاوداں، اسی دکھے ہوئے دل کی تشریح کرتے ہیں۔ اور اپنی زندگی میں زندگی انسان کو منعکس دیکھتے ہیں اسی لئے ان کی دُنیا غم سے مملو نظر آتی ہے اور اس دُنیا میں مسرت کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ یہ دُنیا وسیع نہیں تنگ ہے لیکن اپنے حدود میں کافی پُراثر بھی ہے وہ کہتے ہیں:۔

"یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی — وجودِ دردِ مسلم علاج نامعلوم"

وہ ایک مصرعہ میں اپنے خیالات کو قلمبند کر دیتے ہیں: "وجودِ دردِ مسلم علاج نامعلوم" یہ ہے زندگی کی حقیقت اور اسی حقیقت کو وہ موثر پیرایہ میں اپنے شعروں میں بیان کرتے ہیں:۔

پچھتائیں گے آپ دل کو لیکر — کمبخت غم آشنا بہت ہے
طول رودادِ غم معاذ اللہ — عمر گزری ہے مختصر کرتے
ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا — ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے
"زندگی یادِ دوست ہے یعنی — زندگی ہے تو غم میں گزرے گی
فانی امیدِ مرگ نے بھی دیدیا جواب — جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی
کس غم میں ہے اے رہرو غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے — یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں

یہ اشعار بلا تخصیص پیش کئے گئے ہیں بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں جنھیں غم و الم میں ایک خاص مسرت ملتی ہے، جو غمِ زندگی سے گریز نہیں کرتے بلکہ غمِ زندگی کا خیر مقدم کرتے ہیں، جو انبساط و سرور سے واقف نہیں ہوتے اور نہ واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا دلچسپ مشغلہ "غم کی جستجو" ہے۔ فانی اسی قسم کی طبیعت رکھتے ہیں۔ وہ صرف وجودِ درد اور درد کے لاعلاج ہونے کو تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ اس حقیقت کا علم انھیں مسرت بخشتا ہے اور وہ ھل من مزید کی صدا لگاتے ہیں:

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا — ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

فانی زخمِ دل کی دوا نہیں چاہتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں زخمِ دل نہ بھر جائے۔ گویا زخمِ دل نہیں بلکہ اس کا علاج انھیں بُرا معلوم ہوتا ہے۔ وہ تلقین کرتے ہیں:۔

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر — ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

وجودِ غم کو تسلیم کرنا، غم سے گریز نہ کرنا، غم کو ہمت کے ساتھ برداشت کرنا، یہ چیزیں لائقِ تحسین ہیں اور یہ شعر کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی ہیں، لیکن قصداً "غم کی جستجو" کرنا، سمجھ بوجھ کر بے قراری کو اپنا شعار قرار دینا لائقِ تحسین نہیں۔ اس سے شاعر کا طبعی رجحان ظاہر ہوتا ہے اور یہ رجحان شاعری میں طاقت کے بدلے کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔ فانی کے کلام میں بھی اس رجحان کا نتیجہ کمزوری ہے اور اس مسلسل شیون و فریاد سے ناخوشگوار اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

فراق گورکھپوری ان چند پڑھے لکھے شعرا میں ہیں جو مغربی ادب سے بھی واقف ہیں۔ یہ صرف شاعر ہی نہیں نقاد بھی ہیں اور اپنی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور فن شاعری پر بھی غور و فکر کرتے ہیں اور اس غور و فکر میں مغربی خیالات سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ مغربی ادب سے واقفیت کے بعد بھی وہ غزل کی خامیوں کو محسوس نہیں کرتے اور اپنے احساسات کو صورتِ نظم میں جلوہ نہیں کرتے۔ اگر دوسرے اُردو شعرا غزل کو شاعری کی تکمیل سمجھیں تو چنداں مضایقہ نہیں لیکن فراق کی یہ بے خبری باعثِ استعجاب و تاسف ہے۔

فراق اپنی شاعری کی ایک خصوصیت اتحادِ ضدین بتاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے اور یہ صفت انھیں موجودہ شعرا میں امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے:-

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

دل دُکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے مگر — ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

عشق کے اضطراب میں پہلے یہ نرمیاں نہ تھیں — سوزِ نہاں کی شکل میں کون یہ مسکرا دیا

دوسری خصوصیت جس کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اجتماعِ ضدین ہے۔ اس کی بھی مثالیں ہر جگہ نظر آتی ہے:-

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دُنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل — کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

لیکن اکثر فراق اجتماعِ ضدین کو ایک دلچسپ کھیل سمجھکر اس میں منہمک ہو جاتے ہیں:-

تیری رنگینیٔ طبیعت سے — عشق کی سادگی بھی دور نہیں

شامِ ہجراں سُنا گئی اکثر — خامشی بھی کہانیاں تیری

حسرت و فانی کی طرح فراق کا دل بھی زخمی ہے، اس لئے ان کی آواز بھی درد بھری ہے لیکن وہ بھی حسرت کی طرح کبھی آواز بلند نہیں کرتے، چیخ پکار سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنی درد بھری داستان کو نرم، دھیمی، شیریں آواز میں بیان کرتے ہیں، درد کی شدت میں بھی وہ اپنی آواز پر کامل اختیار رکھتے ہیں اور اسے بلند آہنگ نہیں ہونے دیتے۔ وہ امیر مینائی کی لے میں ٹھہراؤ اور بہاؤ کا امتزاج پاتے ہیں۔ یہ امتزاج امیر مینائی کی لے میں تو موجود نہیں لیکن فراق کی لے میں بدرجۂ اتم موجود ہے:-

تیرے چھونے سے بھی دُکھے جو — کون اس دل کی پھانس نکالے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تو نے تو خیر بے وفائی کی

بعد مدت کے تیرے ہجر میں پھر — آج بیٹھا ہوں دل کو سمجھانے

زندگی اے دوست غم کا نام ہے — یہ تو شاید شکوۂ بیجا نہیں،

ابھی فکرِ علاجِ عشق نہ کر — ابھی کچھ دن یہ درد سہنے دے

دل میں کچھ غم ہے کچھ سرور بھی ہے — کوئی نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

نیاز صاحب، فراق کی انفرادی خصوصیت کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:- "وہ شعر نہیں کہتا، زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے"۔ بات یہ ہے کہ نوجوان شعرا مغربی ادب اور مغربی تنقید سے واقف ہو گئے ہیں۔ وہ خصوصاً آرنلڈ کے اس مقولے سے کہ "شاعری زندگی کی تنقید ہے" بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ فراق بھی غالباً اس سے متاثر ہوئے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر اسے علمی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں "زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرے" ملتے ہیں:-

ابھی فطرت سے ہوتا ہے نمایاں شان انسانی — ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

تجھے دنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش — تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

خیال کو بے اثر نہ جانو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں — کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

احساس بس احساس ہے یہ غم یہ خوشی کیا — اے عشق تجھے کار اہم اور ہی کچھ ہے

رہِ حیات کی منزلوں میں وہ فرق ناز و نیاز بھی — کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

سکوت ہوش کو مرکز بنا محبّت کا — جنوں کا غلغلہ نزدیک و دور ہونے دے

لیکن فراق محض اس تنقید کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ تنقید قیمتی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں "شاعرانہ حُسن و شاعرانہ صداقت" موجود نہ ہو۔ اس کے علاوہ فراق کے خیالات میں اکثر خامی نظر آتی ہے مثلاً:۔

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش — تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

بغیر دُنیا کو سمجھے ہوئے دُنیا کو بدل دینے کا رمان کسی طرح بھی لائق تحسین نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کی وجہ آج ہر شخص بغیر سمجھے بوجھے انقلاب! انقلاب! کی صدا بلند کرنے لگتا ہے۔ اس کا سبب غالباً فطری رومانیت ہے اور اسی رومانیت کی وجہ سے غالباً اس قسم کے "کچے"، شعروں کے "مرتکب" ہوتے ہیں:۔

جب دیکھو اس کو، ہے یہ عالم — اک انگڑائی آئی ہوئی سی،

آ نہ گئی، آ نہ گئی تیری یاد — چھا نہ گئیں چھا نہ گئیں بدلیاں

اب فضا میں وہ اک کسک سی نہیں — مٹ چلی ہیں نشانیاں تیری،

آج تو کفر عشق بول اُٹھا — آج تو بول اُٹھے ہیں بُت خانے

ذکر عشق خموش ہوا ہے — وقت سہانا اب آیا ہے،

(۱۰)

ہندوستان میں شعر کہنے والے تو بہت ہیں لیکن شاعروں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہر پڑھا لکھا جو عروض سے واقف ہے یا ہر موزوں طبع شعر کہہ سکتا ہے۔ اس آسانی کی وجہ سے ہندوستان میں شعرائے متغزلین کی تعداد بیشمار ہے۔ "بزم نگار" میں صرف وہی شعرا ہیں جنھوں نے اپنے لئے دُنیائے غزل گوئی میں کوئی نہ کوئی مخصوص جگہ بنا لی ہے اور جن کی غزلیں زبان کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ لیکن اس سرسری تنقید سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ان اکتیس شعرا میں صرف پانچ ایسے ہیں جنھیں شاعروں کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ غزل خود کوئی بلند صنف شاعری نہیں۔ اگر اس کی بقا کی ضرورت سمجھی جائے تو کم از کم اس کے معیار کو بلند رکھنا چاہیئے، تاکہ ہر کس و ناکس غزل گو شعرا کی فہرست میں داخل نہ ہو سکے۔ اور یہ معیار صرف زبان کی صحت و عدم صحت پر مبنی نہ ہو۔ جو چیز اچھے اشعار کو بُرے اشعار سے ممیز کرتی ہے وہ اصلیت ہے اور اس اصلیت کی پہچان عوام کے لئے آسان نہیں بہترین اساتذہ کے بہترین اشعار سے واقفیت، اگر اس واقفیت میں ادراک کا بھی دخل ہے، قوت حاسہ کی تربیت کر سکتی ہے اور اسے تیز و حساس بنا کر اسے اچھے بُرے میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ جنھیں شعر و شاعری سے شغف ہے انھیں چاہیئے کہ وہ اس طرح اپنی قوت حاسہ کی تربیت کریں اور ذوق صحیح و لطیف پیدا کریں۔

(نگار) پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب نے مقالہ نہایت محنت سے لکھا ہے اور کسی شاعر کو اپنی

رائے سے محروم نہیں رکھا۔ ابتدا میں انھوں نے غزل کی مخالفت میں کافی زوردار بحث کی ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ مدعا اس بات کا فیصلہ کرنا نہ تھا کہ غزل گوئی کوئی معقول مشغلہ ہے یا نامعقول، بلکہ مقصود صرف یہ تھا کہ جن شعراء نے اپنا کلام انتخاب کیا ہے وہ تغزل کے نقطۂ نظر سے کس مرتبہ کے شاعر ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کی یہ حرکت وحشیانہ ہے یا غیر وحشیانہ، اور جس چیز کو تغزل سمجھا جاتا ہے وہ ہماری موجودہ ضروریات زندگی کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

نقاد کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر آرٹ پر رائے زنی کرے۔ اگر کلیم صاحب نقاش ہوتے اور میں اُن کے سامنے کوئی عریاں تصویر رائے زنی کے لئے پیش کرتا، تو کیا ان کا یہ فرض تھا کہ وہ پہلے عُریانی کی مذمت پر لکچر دیتے۔

بہرحال میں کلیم صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے ہر شاعر کے متعلق اپنی بے لاگ رائے پیش کردی اور یہی میری خواہش تھی۔

اِنھوں نے، حسرت، فانی اور فراق کو حقیقی معنے میں شاعر مانا ہے، باقی شعراء کے متعلق جو رائے انھوں نے دی ہے وہ کسی جگہ دوسرے نقادوں سے مختلف ہے اور کہیں موافق بہرحال انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہ حیثیت مجموعی ایک ایسے "محتسب" کی رائے نہیں ہے جسے ہم " درونِ خانہ چہ کار" کہکر نظرانداز کرسکیں!

غزل اور عصرِ جدید

(پروفیسر مجنوں گورکھپوری۔ سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور)

ایک مبصر کی رائے ہے کہ شاعری جدید دنیا کے لئے بہت کم اہمیت رکھتی ہے اور آجکل کی انسانیت کو شاعری کی کچھ زیادہ پروا نہیں ہے۔ اس کی تردید میں دستے کے دستے اشعار کے پیش کئے جاسکتے ہیں جو اسوقت بھی دُنیا کے ہر گوشہ میں آئے دن رنگے جارہے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پچھلے پچیس تیس برس کے اندر شاعری کا ایک انبار لگ گیا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ علامت اس بات کی ہے کہ ابھی دُنیا میں شاعری کا جوہر اور شاعری کا مذاق دونوں موجود ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ گزشتہ چوتھائی صدی میں دُنیا نے جو شاعری پیدا کی ہے اس کا زیادہ حصہ ایسا ہے جو کسی گلدستہ کے مؤلف کے لئے تو یقیناً دلچسپی کی چیز ہوگا مگر کسی مبصر کو اس میں کوئی نئی یا مستقل لذت مل سکتی اور نہ کوئی عامی ہی اس سے دیر تک لطف اُٹھا سکتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے شاعری کا نقص نہیں ثابت ہوتا بلکہ یہ دلیل صرف اس امر کی ہے کہ اسوقت زندگی میں جو نئی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ ہم کو بُری طرح پراگندہ اور بدحواس کئے ہوئے ہیں اور ہم کو اب اتنی فرصت نہیں کہ ہم کسی "کاروبارِ شوق" میں بھی اطمینان و فراغت کے ساتھ چند لمحے گزار سکیں اور اپنے "ذوقِ نظارۂ جمال" کا ثبوت دے سکیں۔ یہ غلط نہیں ہے مگر یہی ساری حقیقت بھی نہیں ہے۔ ہم کو اپنے دور کے ادبی اختراعات بالخصوص اکتسابات شعری سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ اس کا ایک سبب تو یقیناً یہی ہے کہ: "فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی"

لیکن اس کے علاوہ بھی ایک سبب ہے جو زیادہ اہم اور زیادہ اصلی ہے۔ ایک طرف تو ہماری شاعری نے پُرانے روایات اور تصورات اور پُرانے معیار کو بیکار یا ناکافی سمجھ کر ترک کر دینے کی ضرورت محسوس کرلی ہے دوسری طرف ابھی وہ کماحقہ زمانہ کے میلانات اور مطالبات سے موانست اور مطابقت پیدا نہیں کرسکی ہے۔

سعی وعمل کی سطح پر تو ہم زندگی کی نئی کروٹوں کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتے ہیں اور نئے ماحول سے ہماری عملی اور خارجی زندگی نسبتاً زیادہ سہولت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ لیکن فکر و تخئیل کی سطح پر ماضی کا بھوت غیر محسوس طور پر زیادہ عرصہ تک ہم سے لپٹا رہتا ہے اور قدیم روایات و صور رہ رہ کر اور بھیس بدل بدل کر اپنا لڑکھڑاتا ہوا تسلط جمانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ہم کو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ نتیجہ وہ تناقض اور انتشار ہے جو کسی نئے دور میں ہماری عملی زندگی اور خیالی زندگی کے درمیان عرصہ تک قایم رہتا ہے اور ہماری مجموعی زندگی میں طرح طرح کی پیچیدگی پیدا کرتا رہتا ہے۔ زیادہ تر یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری اس وقت یا تو ہم کو مس ہی نہیں کرتی اور اگر مس کرتی ہے تو ہم اس سے ناآسودہ رہ جاتے ہیں۔ قدامت پرست طبقہ اس سے اس لئے بے پروا ہے کہ وہ اس کے [illegible] معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ نئی روشنی والے اس سے اس لئے غیر مطمئن ہیں کہ وہ نئی زندگی کی نئی تحریکوں سے خاطر خواہ ہم آہنگ نہیں ہیں۔

اُردو شاعری میں نئے میلانات کی ابتدا حالی اور آزاد کے زمانے سے ہوتی ہے اور انھیں دو بزرگوں نے جدید اُردو شاعری کی داغ بیل ڈالی اور جو لوگ کہ اُردو شاعری کو یکلم بے مایہ سمجھتے ہیں ان کو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ حالی اور آزاد کے گروہ نے جس نظم جدید کی بنیاد رکھی وہ اس وقت سے لیکر اب تک مسلسل اور ہموار ترقی کرتی رہی ہے اور مواد اور اسالیب دونوں کے اعتبار سے اندر نئی وسعتیں پیدا کرتی گئی ہے۔ حالی، آزاد اور اسمٰعیل کے بعد اقبال، چکبست اور سرور جہان آبادی اور ان کے بعد نظم نگاروں کا موجودہ گروہ جس میں جوش کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اُردو نظم بڑی ثابت قدمی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی ہے اور زندگی کے نئے میلانات اور نئے امکانات کو اپنے اندر سموتی گئی ہے۔

لیکن یہ دعویٰ اُردو شاعری کی صرف اس صنف کے متعلق کیا جاسکتا ہے جس کو نظم کا نام دیکر غزل سے الگ کر دیا گیا ہے۔ اُردو غزل میں اتنے تنوعات پیدا نہیں ہوسکے اور وہ اب تک زندگی کی نئی وسعتوں اور نئے امکانات کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ نہیں ہوسکی ہے جس قدر کہ ہونا چاہیے تھا۔ جدید غزل اور قدیم غزل میں جو فرق ہے وہ زیادہ تر لہجہ اور انداز کا ہے معنوی اعتبار سے اُردو کی نئی غزل اور پُرانی غزل میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔ جدید اُردو غزل نے ہماری شاعری میں اسلوبی وسعتیں کافی پیدا کی ہیں اور کچھ نئے نفسیاتی اشارے بھی دئے ہیں لیکن مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتک ہماری غزل کا عام آہنگ وہی "عیشِ غم" (Luxury of sorrow) ہے جو پُرانی غزل کا آہنگ تھا اور جو عشق اور عشقیہ شاعری کی تخئیل چلی آرہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج تک اُردو غزل زندگی کی نئی سمتوں سے مانوس نہیں ہوسکی ہے۔ اس وقت غزل کا سب سے بڑا انقلابی ادیب یا شاعر غزل کے میدان میں آتا ہے تو عجیب قسم کی مخلوق معلوم ہونے لگتا ہے اور بہت ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی اس والہانہ انداز سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہے جسکو "متغزلانہ ربودگی" (-ly abandon end) کہنا چاہیے۔ یہ انداز کیفیت سے خالی نہیں اور زندگی میں اس کی بھی ضرورت ہے اور رہے گی لیکن یہی سب کچھ نہیں ہے۔

غزل کی ترکیب اور اس کی صورت پر غور کیجئے تو اس کی امکانی وسعتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے، غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہوتا ہے اور تنہا ایک پورے مضمون پر حاوی ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اگر ہم چاہیں تو اختصار کے ساتھ اشاروں کی صورت میں ایک غزل میں اتنے مختلف الاصل اور مختلف النوع مضامین ادا کر سکتے ہیں جتنے کہ اس میں اشعار ہیں۔ پھر کیوں ہر شعر عشق اور متعلقات عشق ہی کی دھن میں کہا جائے؟ کیوں نہ ان اشعار کو زندگی کے اور میلانات اور مسایل کا بھی حامل بنایا جائے غزل سے بڑھکر حفظ شاعری کی کوئی اور صنف نہیں اور غزل کے اشعار میں زندگی کی اہم باتوں کو مقولات کی صورت میں پیش کر کے حیات انسانی کی بہت بڑی خدمت کی جاسکتی ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کونسی گھڑی تھی جب پہلے پہل غزل کی لغت مقرر ہوئی کہ آج تک غزل کا مفہوم عورت سے بات کرنا سمجھا جارہا ہے۔

میں غزل کے مخالفوں میں سے نہیں ہوں۔ اور نہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو یہ رٹ لگا رہے ہیں کہ غزل جو کچھ ہم کو دے سکتی تھی دے چکی۔ اب وہ بیکار ہو گئی اور اب اس کا دور نہیں ہے کہ میں غزل اور تغزل کو شاعری کا مرادف سمجھتا ہوں اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ کسی طویل نظم کے صرف وہ اشعار بلا محنت واراد ہ کے یاد ہو جاتے ہیں جن میں غزلیت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ تغزل فطرت انسانی کا وہ تقاضا ہے۔ جو ہمیشہ پورا ہوتا رہے گا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

میرے کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ غزل نے ہم کو کچھ نہیں دیا۔ اس نے ہم کو بہت کچھ دیا اور اس سے ہمارے ادب میں بہت بڑا اضافہ ہوا۔ اس کا ایک سطحی ثبوت یہ ہے کہ جتنے اشعار ضرب الامثال ہو کر خاص و عام کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں ان میں کم سے کم نچانوے فیصدی غزل ہی کے اشعار ہیں۔ یہ کوئی معمولی اکتساب نہیں ہے۔ یہ غزل کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو صرف اپنی بنا پر غزل کو غیر فانی بنائے رہے گی یعنی اس کے ہر شعر میں یاد رہ جانے کی طبعی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اُردو شاعری کو جو روایات اور جو رموز و کنایات ملے ہیں وہ غزل ہی کی بدولت ملے ہیں۔ غزل نے ہماری شاعری کی تربیت اور تہذیب میں جو حصہ لیا ہے وہ شاعری کی کسی اور صنف نے نہیں لیا اور دے سکتی تھی۔ یہ غزل ہی کا کام تھا کہ سیکڑوں انفرادی تصورات کو رموز تمثیلات بنا کر ان میں ایسی کائناتی وسعت پیدا کر دی کہ آج "گل و بلبل" اور "سرو و قمری" کی اصطلاحیں اپنے لغوی معنوی کے تنگ دایرہ سے نکل کر ساری زندگی پر حاوی ہو جانے کے قابل ہو گئی ہیں۔ اور "بادہ و ساغر" میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" میں بھی اُن سے کام لیا جاسکے۔ یہ وہ لوگ خصوصیت کے ساتھ سُن رکھیں جو بغیر سوچے سمجھے یہ کہا کرتے ہیں اُردو غزل میں سوا "گل و بلبل" اور "بادہ و ساغر" کے دھرا ہی کیا ہے۔ اُردو غزل میں "گل و بلبل" اور "بادہ و ساغر" ہی کے طفیل میں وہ رموز و کنایات ملتے ہیں جن کو ٹی۔ ایس ایلیٹ (T. S. Eliot) "ملزومات خارجی" (Objective correlatives.) کہتا ہے۔ غزل نے اُردو شاعری میں وہ بلیغ مجازیت (Symbolism) اور وہ آفاقی تمثیلیت (Universal allegorism.) پیدا کی ہے جس کی مثال کسی دوسری زبان کی شاعری مشکل ہی سے پیش کر سکتی ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُردو غزل کی چند کوتاہیوں کو بھی نظر میں رکھنا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نے اپنے تصورات اور تاثرات اپنی محاکات [illegible] بہت محدود رکھا جس کی وجہ سے اس کے اسالیب و روایات میں ایک تھکا دینے والی یکسانی پیدا ہو گئی ہے اور ان میں

تنوع کا امکان کم رہ گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اُردو غزل کی فضا میں نہ صرف انحطاط بلکہ جمود کے آثار محسوس ہونے لگے ہیں۔ غزل میں دوسری کمی یہ ہے کہ جہاں تک موضوع اور مواد کا تعلق ہے وہ ابتک سماجی شعور اور عام انسانی زندگی کے احساس سے خالی رہی ہے تیسری ناگوار مگر ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اُردو غزل میں وہ کس بل نہیں ہے جو متقدمین کی غزلوں میں ملتا ہے اور وہ کچھ بیجان سی ہو رہی ہے۔

یہاں تک تو اُردو غزل سے کلی حیثیت سے بحث تھی۔ اب ہم اپنے دور کے غزل گو شعراء پر فرداً فرداً نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ صحیح اندازہ ہو سکے کہ اُردو غزل اس وقت کس مقام پر ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟ اس کے لئے ہم کو ان شعراء کے دائرہ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں جو ابھی زندہ ہیں اور غزل کہہ رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ گزشتہ سال نگار نے اپنا سالنامہ موجودہ اُردو غزل گو شاعروں کے کلام کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اپنی نوعیت کا نہ صرف نیا سالنامہ ہے بلکہ اب تک اس قسم کا کوئی گلدستہ بھی نہیں شایع ہوا ہے۔ شاعروں نے اپنے کلام کا خود انتخاب کر کے اپنے مختصر حالات زندگی کے ساتھ بھیجا ہے جس سے شاعر کے کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی ایک ہلکی سی جھلک بھی ہم کو مل جاتی ہے۔ شاعر کے اندر تنقید و انتخاب کی قوت اتنی قوی اور شدید نہیں ہوتی جتنی کہ تخئیل و تخلیق کی قوت ہوتی ہے اور وہ عموماً اشعار کا انتخاب کرتے ہوئے چوک جاتا ہے۔ خاصکر خود اپنے کلام کا انتخاب کرتے وقت تو وہ طرح طرح کے دھوکوں میں پڑ جاتا ہے۔ "نگار" کے اس سالنامہ میں بھی جا بجا یہ چوک نظر آتی ہے لیکن اس سے سالنامہ کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور ہم اس کو سامنے رکھکر اطمینان کے ساتھ عصری اُردو غزل پر رائے دے سکتے ہیں۔

حسرت :- اُردو میں اسوقت جتنے شعراء غزل کہہ رہے ہیں ان میں سب سے پہلے جس کا نام ذہن میں آتا ہے وہ حسرت موہانی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے حسرت سے زیادہ عمر والے اور زیادہ مشق رکھنے والے غزل گو بھی ابھی زندہ ہیں۔ یہ سچ ہے۔ لیکن حسرت اور دوسرے بڑے شعراء میں فرق یہ ہے کہ حسرت نہ صرف ایک قدیم روایت عظمیٰ کی آخری بڑی یادگار ہیں بلکہ اُردو غزل میں برائے نام جو کچھ نئی تحریک کے آثار پائے جاتے ہیں ان کے موجد یہی ہیں۔ اُردو غزل کی نئی نسل کی ابتدا حسرت ہی سے ہوتی ہے۔ حسرت اُردو غزل کی تاریخ میں قدیم و جدید کے درمیان ایک عبوری حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے اگر ان کا مقابلہ انگریزی کے مشہور شاعر رابرٹ برجز (Robert Bridges) سے کیا جائے تو بہت مناسب ہوگا۔ لیکن ان کی شاعری میں اس انحطاط اور تزلزل یا تذبذب کی کوئی علامت نہیں ملتی جو عبوری دور کی لازمی علامت ہوتی ہے اور جس سے کسی عبوری شخصیت کا کوئی کارنامہ خالی نہیں ہوتا۔

حسرت کی شاعری جسوقت شروع ہوئی اسوقت امیر اور داغ ہر طرف چھائے ہوئے تھے اور گوشہ گوشہ میں انھیں کی تقلید ہو رہی تھی۔ اُردو غزل میں کوئی نیا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہماری غزل اپنے تمام بہترین امکانات بر روئے کار لا چکی ہے اور اب اس میں صرف انحطاط کا امکان باقی ہے۔ اسی اثنا میں حسرت کی آواز کان میں پڑتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُردو غزل میں کہیں سے زندگی کی نئی لہر آ گئی ہے جس نے اس کے اندر نئی توانائیاں پیدا کر دی ہیں۔

حسرت کے تغزل کو متعین کرنا اور اس کو کوئی ایک نام دینا بہت دشوار ہے اس لئے کہ وہ "بسیار شیوہا است بتاں راکہ نام نیست" کے عنوان کی چیز ہے نیاز صاحب کا یہ کہنا اس لحاظ سے بہت صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستان" میں اس وقت حسرت ہی وہ شاعر ہے جس کے کلام کی داد سوا خاموشی اور کسی طرح نہیں دیجا سکتی"

بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ حسرت جدید اُردو غزل کے امام ہیں اور نئے دور کے نئے رجحانات کا صحیح شعور رکھتے ہیں اُنھوں نے اپنے نفس شعری کی تربیت ان انبیائے غزل کے مطالعہ سے کی۔ ہے جن کی بدولت آج اُردو غزل اُردو غزل ہوئی ہے۔ حسرت کے کلام میں ان کی اپنی فطری اُپج کے ساتھ قدماء کے بہترین عناصر نے مل کر ایک عجیب مکمل اور پختہ آہنگ پیدا کر دیا ہے جس کا دوبارہ تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود تسلیم کے واسطے سے خاندان مومن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ صرف ظاہری اور رسمی بات ہے۔ ان کے کلام میں میر، مصحفی، جرأت اور مومن کے رنگ کا یکساں امتزاج ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ حسرت نے اُن اساتذہ کے رنگ میں علحدہ علحدہ غزلیں کہی ہیں یا ایک ہی غزل میں ان میں سے ہر ایک کے رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ حسرت نے دو چار غزلیں علحدہ سے بھی متقدمین بالخصوص مصحفی اور جرأت کے رنگ میں کہی ہیں اور اُن کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی نکل آئیں گے، جن پر میر یا مصحفی یا جرأت یا مومن کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ لیکن میں جو بات کہہ رہا تھا وہ یہ تھی کہ میر، مصحفی، جرأت اور مومن کا رنگ حسرت کے اپنے رنگ کے ساتھ مل کر ان کے تغزل کی

کیمیا دی ترکیب بن گیا ہے۔

لیکن حسرت کو تقلیدی شاعر سمجھنا بڑی فاش غلطی ہوگی۔ اُن کا انتخابی تغزل (Eclectic Lyricism.) اپنے عنوان کی ایک بالکل نئی چیز ہے جو نہ تقلید سے پیدا ہو سکتی اور نہ جس کی تقلید کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نسل کا ہر غزل گو شاعری شعوری یا غیر شعوری طور پر حسرت سے متاثر ضرور ہوا ہے لیکن کوئی ان کی تقلید نہیں کر سکا ہے۔

حسرت کی غزلوں کو پڑھکر جو مجموعی اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کو نفس مطمئنہ کی قوت حاصل ہے جو اس کو کسی حال میں بھی پراگندہ اور پریشانی نہیں ہونے دیتی۔ یہ ان کی شاعری اور ان کی شخصیت دونوں کی خصوصیت ہے۔ یہ اشعار پڑھئے اور پھر اُن سے جو اثر باقی رہ جائے اس پر غور کیجئے

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر — ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا
تم جفا کار تھے کرم نہ کیا — میں وفادار تھا خفا نہ ہوا

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی — ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں
حال کھل جائے گا بیتابیِ دل کا حسرت — بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں — آپ کی یاد کے سوا نہ رہا
آرزو تیری برقرار رہے — دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا
راہ و رسم وفا وہ بھول گئے — اب ہمیں بھی کوئی گلا نہ رہا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت — ان سے ملکر بھی نہ اظہار تمنا کرنا
یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم — یا مگر ان کی محبت کا نتیجہ ہے یہی

سب سے شوخی ہے انکھیں سے حیا — اے فریب نگاہِ یار یہ کیا
کسی پر مٹ کے رہ جاتا ہے حسرت — ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے
حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا — آئین اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا،

ان اشعار سے یہ اثر ہوتا ہے کہ نہیں کہ شاعر شعور حسن و عشق کی تمام منزلیں طے کئے ہوئے بیٹھا ہے اور اب اس کے اندر ایک عارفانہ بے نیازی پیدا ہو گئی ہے۔ ضبط و توازن۔ اعتماد و اطمینان۔ سنجیدہ اور بے شکن تیور۔ بیک وقت تعلق اور بے تعلقی کا احساس جس کو تصوف یا ترک کی مجہولیت سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ جو انسانی درک و بصیرت کی صحیح آخری بلندی ہے۔ یہ ہیں وہ نقش جو حسرت کی غزلیں ہر اس شخص پر چھوڑ جاتی ہیں جس کے اندر غزل کا مہذب مذاق موجود ہے اور جو صرف اپنے مطالعہ کی وسعت اور کثرت کے زور سے شاعری کا مبصر نہیں بنا ہے۔

آخر میں جو بات حسرت کے بارے میں یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ اُردو غزل گوئی کی تاریخ میں حسرت پہلے شاعر ہیں جن کا کلام غزل کے تمام خصوصیات و لوازم کا حامل ہوتے ہوئے بھی یاس انگیز نہیں ہوتا۔ ان کے مسلک کو کسی طرح قنوطیت (Pessimism.) نہیں کہہ سکتے اگرچہ ان کے اشعار میں نہایت پختہ اور بلیغ قسم کا سوز و گداز ہوتا ہے جو اکثر میر کے لب و لہجہ سے ملجاتا ہے۔ حسرت کی شاعری اس منزل کی چیز ہے جہاں رنج اور خوشی بچوں کی اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں آنکھوں میں آنسو آتے آتے چہرے پر ایک مسکراہٹ آجاتی ہے اور مسکراتے مسکراتے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہونچ کر احساسات میں ادراک کا عنصر داخل ہو جاتا ہے اور ہماری ہر کیفیت کو ایک بصیرت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ شکسپیر کی آخری تمثیلیں اسی منزل کی چیزیں ہیں جن کو نہ آپ المیہ کہہ سکتے نہ نشاطیہ۔ اور جن کا آخری اثر ایک اشک آلود تبسم ہی ہو سکتا ہے۔

حسرت میں ایک ہی عیب ہے جو بعض کو بہت بڑا عیب نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ حسرت ہر قسم اور ہر سطح کے شعر کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ در اصل اس وسعت مذاق خلوص نیت اور فراخ دلی کا نتیجہ ہے جس سے نہ صرف حسرت کی شاعری بلکہ ان کی ساری شخصیت کا خمیر ہوا ہے۔ لیکن اس سے ان کو نقصان بھی پہونچا ہے

ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو معلوم ہوتا ہے صرف اس لئے کہا گیا ہے کہ قافیہ ردیف ہاتھ آگیا اور شاعر کو خیال ہوا کہ لاؤ یہ بھی کہہ ڈالو لیکن اسکو نہ شاعر کی شخصیت سے کوئی لگاؤ ہے اور نہ اس پر کسی سنجیدہ تنقید کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے چنانچہ "کامرانی تجھے مبارک ہو" والی غزل جس کا ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے مضمون میں خاکہ اُڑایا ہے اسی عنوان کی چیز ہے۔ دیوان حسرت میں اس قبیل کے اشعار بھی کافی تعداد میں ملیں گے اگر کوئی ایسے ہی اشعار کا انتخاب کرنا چاہے اور انھیں پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھنا چاہے۔ لیکن ایسی تنقید شاعر کی غلط نمایندگی کرے گی اس لئے توقع نہ ہوگی۔

خود حسرت نے "نگار" کے سالنامہ میں اپنے کلام کا جو انتخاب دیا ہے وہ یا تو یونہی روا روی میں کر دیا گیا ہے یا حسرت کی اسی فراخدلی اور وسعت مذاق کا کرشمہ ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ انتخاب شاعر کے کلام کا صحیح انتخاب نہیں ہے۔

اُردو غزل کو نئی سمتوں سے آشنا کرنے میں عزیز۔ محشر۔ صفی اور ثاقب نے شروع میں جو حصہ لیا ہے اس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان چاروں نے لکھنؤ کی فضا میں پرورش پائی اور لکھنوی عناصر سے جن میں مرثیت کا عنصر یقیناً غالب رہا ان کا خمیر ہوا۔ عزیز اس جذباتی مدرسہ کے بانی ہیں جسکو اگر اُردو غزل کا گورستانی مدرسہ (Churchyard School.) کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور اس اعتبار سے عزیز کسی قدیم یا اپنے ہمعصر شاعر کے مقلد نظر نہیں آتے۔ ان کی شاعری کو مجموعی طور پر "موت کا راگ" کہہ سکتے ہیں۔ بیمار محبت اور اس کا آخری سکراتی عالم انکی شاعری کا عام موضوع ہے جو سرتا سر ماتمی اور رقتی شاعری ہے۔ یہ یقیناً مرثیہ کا فضائی اثر ہے جو غیر شعوری طور پر غزل میں سرایت کر گیا ہے۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عزیز کی شاعری دراصل زمانہ کی وہ نئی کروٹ تھی جس کو ردعمل کہتے ہیں تو اُس کی اہمیت کا قایل ہونا پڑتا ہے اُردو غزل میں امیر اور داغ کی سرکردگی میں جو سستے قسم کی خوش باشی اور لذت پرستی پیدا ہو گئی تھی وہ لکھنؤ اور دلّی سے نکل کر چاروں طرف پھیل چکی تھی اور اس کی لے اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اب اس کے خلاف بغاوت ایک فطری تحریک تھی۔ عزیز کی شاعری بھی بغاوت تھی۔ عزیز نے اُردو غزل کو از سرِ نو مہذب اور سنجیدہ بنانے کی کوشش کی اور ابتذال اور سوقیت سے ہٹا کر اُس کی سطح کو پھر بلند کر دیا۔

عزیز سے اُردو غزل کو جو نئے اسالیب اور نئے آہنگ ملے ہیں وہ اپنی نوعیت کے پہلے اضافے ہیں اور ان کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکے گا۔ انھوں نے غزل میں جو معنوی وسعتیں پیدا کی ہیں وہ بھی یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ان کی غزلیں پڑھتے وقت ایسا احساس ہوتا ہے جیسے کسی جنازہ کے اُٹھنے اور روانہ ہونے میں ناقابل برداشت حد تک دیر ہو رہی ہو۔

محشر بھی اسی مدرسہ کے شاعر ہیں لیکن ان کا ماتمی لب و لہجہ کچھ زیادہ دھما ہوا ہے۔ اگرچہ بہ حیثیت ایک موثر اور محرک قوت کے وہ عزیز کے مقام سے نیچے رہ جاتے ہیں۔

عزیز کی ماتمی دھن کو جو بے اختیار ہو چلی تھی جس نے سنبھال لیا وہ صفی اور ثاقب ہیں۔ صفی نے اپنے ماتمی انداز پر ضبط و خودداری کا پردہ ڈالا اور سوگ میں فکر و تامل کا میلان پیدا کیا اور غزل کی زبان اور اسلوب کی تہذیب و تحسین میں تو اُن کا حصہ عزیز سے بھی زیادہ ہے۔

ثاقب :- ثاقب کی غزلگوئی "مدرسہ عزیزیہ" سے کچھ اور زیادہ الگ ہو گئی ہے۔ ان کے کلام میں نہ وہ والہانہ بے اختیاری ہے نہ جذبات کی وہ گرمی جو صفی اور ان کے دوسرے معاصرین کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ لیکن حسن و عشق اور ان کے روایتی ملزومات کے پردہ میں ہم کو ایسے اشارات ملجاتے ہیں کہ ہم ٹھیر کر خاموش سوچنے لگجاتے ہیں۔ ثاقب کو حسن و عشق کا شاعر سمجھنا غلطی ہے۔ حسن و عشق کو اُنھوں نے زندگی کی تمثیل بنایا ہے اور اُنکی شاعری کا موضوع زندگی کے حادثات ہیں۔

ایک جداگانہ مدرسہ کے بانی اور نئے اسالیب و صور کے باقی یا مبلغ ہونے کی حیثیت سے عزیز اور صفی کا جو مرتبہ بھی ہو یا کامل فن ہونے کے اعتبار سے وہ ثاقب سے جس قدر بھی فائق ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ثاقب کی غزلوں سے ہمارے اندر پہلی بار یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اب نئے دور کی نئی نفسیات شروع ہو رہی ہے۔ ثاقب کی شاعری بھی اپنے اکثر ہمعصروں کی شاعری کی طرح غم کی شاعری ہے۔ لیکن اس کے تیور دیکھ کر ہمارے اندر ایک تازہ توانائی اور جسارت پیدا ہو جاتی ہے اور ہم نہ صرف اس قابل ہو جاتے ہیں کہ برداشت کر لیجائیں بلکہ اپنے اندر سنجیدہ ضد اور بغاوت کا ایک خفیف ارتعاش بھی

محسوس کرنے لگتے ہیں۔

ضبط، خودداری اور ایک گہرے قسم کی متانت اور ایک بے نیاز انداز، یہ ہیں وہ خصوصیات جو ثاقب کے کلام کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ مندرجۂ ذیل اشعار اِدھر اُدھر سے ملاحظہ ہوں :-

یہ گوارا نہ کیا دل نے کہ مانگوں تو ملے ۔۔۔ ورنہ ساقی کو پلانے میں کچھ انکار نہ تھا
جمال شمع کسی کو کسی کو جلوۂ گل ۔۔۔ وہ ایک میں ہوں جسے کوئی خونبہا نہ ملا
سر چڑھایا میں نے چُن چُن کر خس و خاشاک کو ۔۔۔ باغ کے تنکے تھے وہ جن کا نشیمن نام تھا
چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سُن لیں ۔۔۔ اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ جائیں گے محفل سے
یہ آشیانۂ ستم چمن میں ہو تو خوب ہو ۔۔۔ یہ جی میں ہے کہ اُڑوں قفس تو اپنا ہو چکا
شہیدِ غم کی لاش پر نہ سر جُھکا کے روئیے ۔۔۔ وہ آنسوؤں کو کیا کرے جو منہ لہو سے دھو چکا
بزمِ رنگیں میں تری ذکرِ غم آیا تو سہی ۔۔۔ خوش رہے چھیڑنے والا میرے افسانے کا
بہت سی عمر مٹا کر جسے بنایا تھا ۔۔۔ مکاں وہ جل گیا تھوڑی سی روشنی کے لئے
تمام بزم میں چھایا ہوا ہے سناٹا ۔۔۔ چھیڑا تھا قصۂ دل ان کی دلگی کے لئے
شب غم آ گئی جلنے کا پھر پیغام آتا ہے ۔۔۔ لباس آتشیں پہنے چراغ شام آتا ہے

ثاقب کی شاعری شدت کیف سے خالی ہے اور یہ ہونا تھا اس لئے کہ جب انسان کے اندر خود اپنے کیف کی آگاہی پیدا ہونے لگے تو کیف کی شدت گھٹنے لگتی ہے۔ ثاقب کو "شعورِ کیف" کا شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور ان کے کلام میں شدید کیفیتوں کی تلاش بے محل سی ہوگی۔

آرزو :- آرزو لکھنوی کو بھی اسی جماعت کا شاعر سمجھنا چاہئے۔ وہ جلال لکھنوی کے شاگرد ہیں اور جلال اور تعشق دونوں سے کافی حد تک متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعوں "فغانِ آرزو" اور "سریلی بانسری" سے عوام روشناس ہو چکے ہیں اور ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ماہر فن کار (Artist) ہیں۔ وہ نہ صرف زبان اور محاورہ پر قابو رکھتے ہیں بلکہ عروض کے رموز و نکات سے بھی واقف ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ شعر میں آہنگ کیسے پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کا کوئی شعر شاید ہی ایسا ہو جو محض اپنے ترنم سے اپنی طرف متوجہ نہ کرے اور یہ ترنم ایک تمثیلی کیفیت (Dramatic Quality) اپنے اندر رکھتا ہے۔

جہاں تک زبان اور بیان کے مجموعی انداز کا تعلق ہے آرزو لکھنوی دلی کے دبستانِ غزل سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ خیالات و جذبات میں بھی وہی خلوص اور سادگی محسوس ہوتی ہے جس کو ہم دلی کے متقدمین سے منسوب کرتے آئے ہیں۔ یہ شاید جلال کی شاگردی کا اثر ہے۔ مگر ان کے یہاں سوز و گداز مرثیت کی دُھن لئے ہوئے ہیں اور لکھنؤ کے دبستانِ تغزل کا ترکہ ہے۔

اُردو غزل میں آرزو لکھنوی نے جو اسلوبی اضافے کئے ہیں وہ مستقل قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ خاصکر "سریلی بانسری" لکھ کر تو انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان اپنے جذبات و واردات کو ایسی زبان میں ظاہر کر سکتا ہے جو عامیانہ ہوئے بغیر لغوی اور منطقی حد تک عام فہم ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ زبان اور یہ اسلوب اس قابل نہیں کہ اس میں زندگی سے متعلق گہرے خیالات ادا کئے جا سکیں۔ مگر پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرزو لکھنوی افکار کے شاعر نہیں ہیں اور نہ ان کا طرز مفکرانہ شاعری کے لئے بنا ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے عام جذباتی نفسیات و محاکات کا تعلق ہے اس طرز سے زیادہ دلنشین اور عوام سے قریب طرز مشکل ہی سے تصور میں آسکتا ہے۔

بہرحال میرا خیال ہے کہ آرزو لکھنوی کی شاعری اور خصوصیت کے ساتھ ان کی "سُریلی بانسری" اُردو شاعری کے اسالیب میں ایک نئے سمت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس قابل ہے کہ اس کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

رہنے دو تسلی تم اپنی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا ۔۔۔ اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

کھاکے چرکے ہنسو یہ بات ہے اور — آرزو جی ہی جانتا ہوگا،
جو سینے میں دل ہے تو بارِ محبت — اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑے گا
وحشتؔ ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے — اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دیکر
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
نہ اس کو پوچھو کہ کس لئے تھا یہ رو کے ہنسنا ہنس کے رونا — اک ان کہی دکھ بھری کہانی دکھا دی تم کو الٹ پلٹ کر
کہہ کے یہ اور کچھ کہا نہ گیا — کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے
معمہ بن گیا رازِ محبت آرزو یوں بھی — وہ مجھ سے پوچھتے جھجکے مجھے کہتے حجاب آیا
چاہت کی یہ بات ہے اُلٹی مت اُلٹی رونا اُلٹا — جتنا سوسو جی اوداُمڈے یونہ رکے ندی بہہ جائے
جسے آرزو کوئی تاکے نہ چھینے — مجھے راج گدی ہے وہ مرگ چھالا
تارا ٹوٹتے دیکھا سب نے یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی — کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

اسی دور اور کم و بیش اسی مجلس سے تعلق رکھنے والے ہم کو چند ایسے شعراء بھی نظر آتے ہیں جو اپنی اپنی جگہ ایک زبردست قوت کے مالک ہیں اور کامل فن کہے جانے کے مستحق ہیں اور ایسا ہی کہے بھی جاتے ہیں۔ لیکن جو کسی طرح بھی ایسی قوت نہیں جو مستقبل کی تعمیر میں کوئی حصہ لے سکیں یعنی جن کی شاعری کسی زاویہ سے بھی میلاناتی (Tendentious) نہیں ہے۔

بیخود۔ نوحؔ:۔ مثال کے طور پر بیخود دہلوی یا نوحؔ ناروی کو لے لیجئے۔ دونوں داغؔ کے شاگرد ہیں اور اپنی محفل کے چشم و چراغ بھی ہیں اور اس کی آخری بڑی یادگار بھی۔ ان لوگوں کی کہنہ مشقی اور اُستادانہ مہارت کا بہرحال اعتراف کرنا پڑے گا۔ زبان اور محاورہ اور روزمرہ کا لطف اُٹھانا ہو تو اب بھی انھیں بزرگوں کے کلام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اب ہمارے لطف اور لذت کا میلان اور معیار ہی بدل گیا ہے اور ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو یہ احساس ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ یہ ایک ایسی آواز کے آخری ارتعاشات ہیں جسکو رُکے ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے۔
یہی حال ان لوگوں کے کلام کا ہے جو امیرؔ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور لکھنؤ کے روایتی دبستان کے آخری نام لیوا کہے جا سکتے ہیں۔

جلیلؔ:۔ جلیلؔ، غزل کے روایتی آہنگ کے اُستاد ہیں۔ نکھری ہوئی زبان اور نرم اور رچی ہوئی موسیقیت اُن کے کلام کی وہ ممتاز خصوصیت ہے، جس نے ان کو اس قدر مقبول عام بنا رکھا ہے۔

دلؔ:۔ دلؔ شاہجہاں پوری کے وہاں دبستان امیرؔ کی بعض عام نمایاں خصوصیات کے علاوہ ایک خاص دردمندی اور دل گداختگی بھی ہے جو متانت اور وقار لئے ہوئے ہے اور خالص ان کی اپنی چیز معلوم ہوتی ہے۔

ساحرؔ:۔ امرناتھ ساحرؔ، پُرانے کہنے والوں میں اپنا ایک خاص رنگ رکھتے ہیں۔ وہ زبان اور اسلوب میں دلّی کے مدرسہ سے متاثر ہیں۔ اور متصوفانہ تغزل کے روایتی تصور کی کامیاب نمائندگی کرتے ہیں۔

کیفیؔ:۔ دتاتریہ کیفیؔ کا کلام متجرانہ ہوتا ہے۔ وہ اُردو زبان کے ساتھ وہ اُنس رکھتے ہیں جو ایک محقق زبان کے لئے لازمی ہے۔ ان کے اشعار میں کیفیت کا وہ غلبہ کہیں نہیں ملتا جو شاعری کی اصل روح ہوتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شاعر سے زیادہ فاضل کہے جانے کے مستحق ہیں۔ مشاعروں کی صدارت اب بہت سستی ہو گئی ہے۔ ہر کس و ناکس اب مشاعرہ کا صدر بنا دیا جاتا ہے اور اب " شیوۂ اہلِ نظر" کی آبرو جا چکی ہے ورنہ مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ دتاتریہ کیفیؔ شاعری سے زیادہ مشاعروں کی صدارت کے لئے مناسب اور موزوں ہیں۔

وحشتؔ:۔ وحشتؔ کلکتوی باوجود قدیم اور روایتی دبستان کے شاعر ہونے کے اپنے کلام میں ایک انفرادی لہجہ کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی کا لطیف عنصر ایک خاص چیز ہے جو غزل کے مزاج کو قائم رکھتے ہوئے شاعر کے کلام کو عام سطح سے کچھ بلند کر دیتا ہے ان کو خود اعتراف ہے کہ وہ غالبؔ کا تتبع کرتے رہے ہیں جس کو مولانا حالیؔ نے محسوس کیا اور مانا ہے۔

وحشت کی شاعری کی سب سے زیادہ محسوس اور نمایاں خصوصیت جذبات کا نہایت رچا ہوا توازن اور انداز بیان کا عارفانہ ضبط اور سنجیدگی ہے لیکن یہ لوگ اپنی اپنی جگہ جو حیثیت بھی رکھتے ہوں اس سے انکار نہیں جا سکتا کہ یہ ہیں ایک گزرے ہوئے زمانہ کی یادگار اور اب فسانہ ہو چلے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ہم کو چند ایسے شعراء بھی نظر آتے ہیں جو قدیم دور سے وابستہ تو ہیں لیکن جو اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اشعار میں جدید دور کی علامتیں آجائیں اور وہ آگئی ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی شاعری کا محرک اصل زندگی نہیں ہے بلکہ شاعری یعنی اساتذہ کا کلام ہے اس لئے ان کے الہامات شعری میں مطالعہ کے ارتعاشات صاف محسوس ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ باوجود اس کے کہ اچھے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن کسی خاص انفرادیت کے مالک نہیں ہیں۔

آسی :۔ عبدالباری آسی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ آسی نہ جانے کیوں لکھنوی مشہور ہوگئے جو وہ نہ پیدائش کے اعتبار سے ہیں نہ اپنے میلانات کے اعتبار سے۔ وہ بہت وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ متقدمین اور متاخرین میں سے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کا کلام آسی کی نظر سے نہ گزرا ہو اور جس سے انھوں نے خذ ما صفا کے قاعدے سے فایدہ نہ اٹھایا ہو۔ لیکن ان کی شاعری کا مجموعی آہنگ دبستان دلی سے کافی قریب ہے۔ نیاز صاحب نے اُن کی شاعری کے لئے دامن دار کی اصطلاح استعمال کی۔ میری رائے میں آسی کی شاعری کے لئے اس سے زیادہ جامع لفظ نہیں مل سکتا۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ ایک اچھی خاصی جماعت اپنے شاگردوں کی بھی رکھتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ مضامین اور اسالیب دونوں کے اعتبار سے جو انتخابی اور تقلیدی تنوع ان کے وہاں پایا جاتا ہے اس نے اُن کی شاعری کے دامن کو واقعی پھیلا دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ سپردگی اور خود رفتگی نہیں ملتی جو تغزل کی اصل جان ہوتی ہے۔ مگر بھی ایک ٹھیری اور سنبھلی ہوئی دردمندی ان کے اشعار میں ملتی ہے جو بے تاثیر نہیں ہوتی۔ آسی نہ صرف شاعر ہیں بلکہ سخن شناس بھی ہیں اور اچھی تنقیدی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اثر :۔ مرزا جعفر علی خاں اثر اس گروہ میں سب سے ممتاز شخصیت ہیں۔ ان کے مذاق شعری کی تربیت اساتذہ کے کلام کے بہترین عناصر سے ہوئی ہے وہ شاگرد تو عزیز کے ہیں لیکن اساتذہ میں میر اور آتش سے بہت متاثر ہیں وہ نقاد بھی ہیں اور ان کا تنقیدی توازن شیفتہ کی یاد تازہ کرتا ہے اور وہی توازن اور ٹھیراؤ ان کے کلام کی بھی جان ہے۔ اُن کے اشعار میں نہ کہیں سستی قسم کی جذبات نگاری ہے اور نہ چھچھورے انداز کی معاملہ بندی الفاظ کا صحیح اور برمحل استعمال۔ محاوروں اور فقروں کی برجستگی اور بے ساختگی۔ تخیل کی بلندی اور لب و لہجہ کی متانت یہ ہیں وہ خصوصیات جو ان کی شاعری کو ممتاز کئے ہوئے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اثر کے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جو پتے ہوئے ذوق جمال کا پتہ نہ دیتی ہو۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ان کی شاعری میں اس محویت کا احساس نہیں ہوتا جو دوسروں کو بھی محو کر لے۔ ان کی شاعری فطری شاعری ہوتے ہوئے بھی کتابی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ ان کے اشعار سے دل پر وہ اثر ہوتا ہے جو گزرے ہوئے زمانے کی دھندلی یادوں سے ہوتا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار قابل ملاحظہ ہیں:۔

وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار　　　چراغ لحد جھلملانے لگا

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی　　　کچھ انھیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھے

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے　　　آنسوؤں پہ یہ رنگ تب آیا

فریاد کا شنوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں　　　کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائے گا

آج کچھ مہربان ہے صیاد　　　کیا نشیمن بھی ہو گیا برباد

پھر ہم کہاں کہاں تم جی بھر کے دیکھنے دو　　　اللہ کتنی مدت ہم تم جدا رہے ہیں

وہ خمار آلودہ آنکھیں دیکھ کر　　　موج مے لینے لگی انگڑائیاں

زندگی اور زندگی کی یادگار　　　پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیاں

ظہور عشق حقیقت طراز تھا ورنہ　　　یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہو

یہ جلد جلد بدلتا ہوا زمانہ ہے　　　کہ آج ہے جو حقیقت وہ کل فسانہ ہو

نہ جانے بات یہ کیا ہے تمھیں جب دور سے دیکھا — مری نظروں میں دنیا بھر حسین معلوم ہوتی ہے

چل گیا اس نگاہ کا جادو — کھ گئے دل کی بات کیا کہئے

سیماب :- سیماب اکبرآبادی جدید اُردو غزل کی مجلس میں ایک ایسی ہستی ہیں جو عمر اور تعلیم و تربیت اور ذاتی مناسبت مزاج کے اعتبار سے ایک گزرے ہوئے دور سے وابستہ ہیں لیکن جو نئے دور کے نئے میلانات کا ایک پرتشنج احساس رکھتے ہیں۔ اور جدید اسلوب کے اشعار کہنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اشعار جدید غزل میں بڑے مزے سے کھپ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے کلام میں کہنگی اور فرسودگی تو نہیں آنے پاتی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانے کے تیور پہچان کر زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور قدم ٹھیک نہیں پڑ رہے ہیں۔

ان کا کلام کسی انفرادی خصوصیت کا حامل نہیں۔ ان کے رسمی شاگردوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو مگر جدید نسل پر ان کا کوئی کارگر اور مستقل اثر نہیں ہوا ہے۔ وہ خود بڑے مشاق شاعر ہیں۔ اور شعر کہنے میں ان کو مطلق کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ ان کے وہاں کافی تعداد اچھے اشعار کی نکل آتی ہے مگر ان میں کسی خاص جمالیاتی بصیرت یا وجدانی تاثر کا پتہ نہیں چلتا۔

آزاد :- آزاد انصاری نے حالی کی شاگردی سے متاثر ہو کر اُردو غزل میں ایک بالکل نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی تھی۔ مگر چونکہ ان کی شاعری اس "لطیف جنون" سے بالکل خالی ہے جس کے بغیر اب تک غزل غزل نہیں ہو سکی ہے اس لئے کوئی ان کی تقلید کی طرف مائل نہ ہو سکا۔

بہرحال وہ خود اپنے رنگ کے بڑے قادر الکلام غزل گو ہیں۔ الفاظ اور فقروں کی تکرار سے جس جس طرح انھوں نے اشعار میں لطف اور معنی بڑھائے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔

آزاد اپنے رنگ کے اکیلے شاعر ہیں اگر ان کے وہاں شدت کیف یا کوئی مفکرانہ بصیرت بھی ہوتی تو آج وہ جدید اُردو غزل میں بڑی زبردست قوت ثابت ہوتے۔ مگر شاید ان کا یہ اسلوب کسی قسم کی گہرائی یا شدت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

فانی :- حسرت اور عزیز کے بعد جس شاعر نے جدید اُردو غزل کا رخ متعین کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے وہ فانی بدایونی ہیں جو ابھی چند ہفتوں کی بات ہے زندوں کی محفل میں شریک تھے۔ فانی رسمی طور پر شاید کسی کے شاگرد نہیں ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جو خود اپنی فطری اپج کو اپنا رہبر بناتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کا آہنگ تغزل عزیز لکھنوی کے آہنگ سے ایک حد تک مماثلت رکھتا ہے لیکن فانی کے وہاں جو سوز و گداز ملتا ہے اُسے مرثیت سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے جو عزیز کے وہاں ساری فضا پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ فانی کی غزلوں میں اُداسی ہوتی تو ضرور ہے مگر یہ اُداسی گہری اور پرتامل ہوتی ہے۔

غالب کے بعد اگر اقبال سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیا جائے تو اُردو غزل میں فانی پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں شروع سے آخر تک حکیمانہ بصیرت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے وہاں جذبات و واردات فکر و تامل کے احاطہ سے گزر کر ہم تک پہونچتے ہیں اور ان کی دردمندی ہم کو کسی حکیم یا عارف کی دردمندی معلوم ہوتی ہے۔ فانی کے تغزل کو ہم میر اور غالب کا ایک کامیاب امتزاج کہہ سکتے ہیں۔

فانی کا مقابلہ انگریزی کے مشہور یاس انگیز شاعر اے۔ ای ہاؤسمین (A. E. Houseman) سے کیا جا سکتا ہے۔ فانی کی غزلوں میں جو حزن و یاس ہے وہ ایک مابعد الطبیعیاتی تصور ہے اور ان کی قنوطیت ایک حکیمانہ توازن لئے ہوئے ہے۔ عزیز یا اُردو کے کسی دوسرے مشہور یاس انگیز غزل گو سے اگر فانی کا موازنہ کیا جائے تو فانی کے لہجہ میں ہم کو ایک مردانہ تحمل اور ایک خودداری نہ بے نیازی کا بھی احساس ہوگا جو دوسروں کے وہاں قریب قریب مفقود ہے۔

فانی کی شاعری میں ادراک و فکر کی جو بلند آہنگی ہے وہ یقیناً جدید اُردو غزل کے لئے ایک نئی وسعت تھی اور ایک خاصے عرصہ تک اُردو غزل کی نئی نسل اس نئی جولانگاہ کا جائزہ لیتی رہی۔

باوجود اس کے کہ فانی ایک مفکر شاعر ہیں اور دقت نظر اور فلسفیانہ تعمق ان کی شاعری کی عام امتیازی خصوصیت ہے لیکن ان کی زبان اور ان کے اسلوب میں کہیں سے وہ پیچیدگی یا غرابت محسوس نہیں ہوتی جو عموماً ایسی شاعری میں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہے۔ فانی کی زبان سنجیدہ اور پرتامل ہوتے ہوئے بھی نہایت پاکیزہ اور دلنشیں ہوتی ہے۔ اگر کہیں انھوں نے کچھ اسلوب میں جدتیں پیدا بھی کی ہیں تو ان میں کوئی اجنبیت کا احساس آنے نہیں دیا ہے۔ الفاظ

کا انتخاب اور ان کی ترتیب فانی کے وہاں اس قدر خوش آہنگ ہوتی ہے کہ شعر کے معنوی اشارات کی طرف ذہن بعد کو منتقل ہوتا ہے۔ پہلے اس کا پر سوز ترنم ہی ہم کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

فانی کی شاعری میں جو سب سے بڑی کمی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے موضوع کا دائرہ تنگ ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو پر نظر نہیں ڈالتے۔ محبت۔ موت اور تاریکی کا احساس اس طرح ان کی شاعری کائنات پر چھایا ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے زندگی اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ اس سے ان کی شاعری میں ایک تھکا دینے والی یکسانی پیدا ہوگئی ہے۔

فانی کی شاعری کا مجموعی اثر ایک قسم کی غنودگی ہے مگر یہ غنودگی ہے بڑی بلیغ اور پُر کیف۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی آشیاں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ میرا آشاں نہ تھا

تو نے کرم کیا تو بعنوانِ رنجِ زیست
غم بھی مجھے دیا تو غمِ جاوداں نہ تھا

مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

وہ نامراد اجل بزمِ یاس میں بھی نہیں
یہاں بھی فانیِ آوارہ کا پتا نہ ملا

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار رہیں ہم

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دلِ ناتواں نہیں ملتا

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

ہم ہیں اور عزمِ آشیاں یعنی
رہ گئی دور طاقتِ پرواز

ہے کہ فانی نہیں ہے کیا کہئے
راز ہے بے نیاز محرمِ راز

ہر خردہ نگاہ غلط جلوہ خود فریب
عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

کس کی کشتی تہِ گرداب فنا آپہونچی
شورِ لبیک جو فانی لبِ ساحل سے اٹھا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانا چاہا

سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار
نہ موجِ بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

نہیں معلوم راہِ شوق میں بھی ہے کوئی منزل
جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے

محشر میں صبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

بہار نذرِ تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہیدِ تبسم ہوئی بہار ہوئی

اسی زمانہ میں اصغر گونڈوی کی شاعری کا شہرہ ہونے لگا اور ایک عرصہ تک اہل ذوق کی زبانوں پر اصغر ہی کا نام رہا۔ اصغر نے اردو شاعری میں ایک بالکل نئی لے چھیڑی جو تھی تو تصوف کے عنوان کی چیز مگر جس کو رواجی تصوف سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اصغر نے انسانی زندگی کے مرکز اور اسکی سطح کو بدل دیا۔ ان کے اشعار پڑھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زمین نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور اب فضائے بسیط میں اڑی چلی جا رہی ہے۔

اصغر نے اُردو غزل میں نئی لطافتیں پیدا کیں۔ اور اس میں فکر و تامل کے لئے ایک بالکل نئی سمت نکالی۔ ان کے اسالیب نے بھی اُردو غزل میں نئے باب کھولے۔ وہ ہم کو انگریزی کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کی یاد دلاتے ہیں۔ ان کے کلام میں وہی ماورائی (Transcendtal .) کیفیت شروع سے آخر تک چھائی ہوئی ملتی ہے جس سے ورڈسورتھ کی شاعری ممتاز ہے۔ اُن کی شاعری اُردو میں ایک ایسا نیا میلان ہے جو قدیم اور جدید شعراء میں کسی کے وہاں نہیں ملتا۔ قدیم غزل کے اسالیب و صور انھوں نے استعمال ضرور کئے ہیں مگر ان سے اُنھوں نے بالکل نئے نمونے بنائے ہیں۔

اصغر کے کلام میں انسانی دلچسپیاں سرے سے مفقود ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی پر ایک ماورائی نظر ڈالی ہے۔ جس نے اس زندگی کو ایک سحابی چیز بنا کر رکھدیا ہے۔ انسانی فطرت کا وہ اہم اور ہمہ گیر عنصر جس کو شعور جنسی کہتے ہیں اصغر کے وہاں نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو اپنی اصلیت سے بیگانہ نظر آتا ہے۔ اس نے انکی شاعری کو کچھ سونی سی بنا رکھا ہے۔

اصغر کے اشعار پڑھتے وقت ہم ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے ہم پر کوئی تنویم کا عمل کر رہا ہو اور ہم پر غشی سی چھا رہی ہو اور ہر ٹھوس چیز ہمارے سامنے تحلیل ہوتی جا رہی ہو۔

جگر:۔ اصغر کے ساتھ ہی جگر مرادآبادی کی آواز بھی بلند ہوئی اور ہماری غزل کی ساری فضا میں اس طرح گونج اُٹھی کہ ابتک اس کی جگہ کوئی دوسری آواز لے ہی نہیں سکی ہے۔ جگر کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں ملکر ایک داستان (Legand .) بن گئی ہے اور، باوجود اس کے کہ وہ کسی کو اپنا شاگرد نہیں بناتے اسوقت سارے ہندوستان میں غزل میں نوجوان طبقہ سب سے زیادہ اُنھیں کی تتبع کرتا نظر آتا ہے۔ وہ جدید اُردو غزل میں ایک مستقل خطرہ ہیں جگر کثر غزل گو شاعر ہیں اور حسن و عشق کے احساس سے علٰحدہ ہو کر انھوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ان کے کلام میں بیشتر وہ ربودگی پائی جاتی ہے جس کو تغزل کا اصلی جوہر بتایا گیا ہے اور ان کی زبان اور انداز بیان میں جو بے اختیاری ہوتی ہے وہ ان کی اپنی چیز ہے اور اُردو غزل میں بالکل نیا عنوان ہے۔ عشقیہ زندگی کے واردات و معاملات کی نزاکتوں کو جدید نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے بیان کرنے میں وہ اکثر قابل رشک حد تک کامیاب رہتے ہیں۔

لیکن جگر کے وہاں التباسات اتنے ہیں کہ ہم غزل کی طرف سے اندیشہ ناک ہو جاتے ہیں۔ اُن کی ساری شاعری ہیجان اور عصبی بے اختیاری کی شاعری ہے جس پر واہواہ کیفیت کا دھوکا ہوتا ہے۔ جگر میں ایک زبردست صلاحیت یہ ہے کہ وہ چند سطحی تاثرات اور ظاہری خصوصیات میں ہم کو مبہوت کر لیتے ہیں اور گہرائیوں میں جانے سے باز رکھتے ہیں۔ اسی لئے میں نے ان کو ایک خطرہ بتایا ہے۔ لیکن جو لوگ ٹھیر کر اور اپنے کو روک کر غور کرنے کے خوگر ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ جگر کی شاعری ایک ایسا ہیجان ہے۔ جو صرف ہماری جلد میں پیدا ہوتا ہے اور بات کی بات میں ختم ہو جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

بیٹھے ہیں بزم دوست میں گم شدگان حسن دوست
عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

وہ کچھ سہی نہ سہی پھر بھی زاہد ناداں
بڑے بڑوں سے محبت میں کافری نہ ہوئی

صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہدینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

~~ہم کہیں آتے ہیں [illegible] بہلانے [illegible]~~
~~اسی میخانہ کی مٹی اسی میخانے میں،~~

~~حرم و دیر میں [illegible] کا ٹھکانا ہی نہ تھا~~
وہ تو یہ کہئے اماں مل گئی میخانے میں

اگر تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل
رائگاں سعیٔ التفات گئی

سحر ہونیکو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے
خوشی منجملۂ اسباب ماتم ہوتی جاتی ہے

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

شکن کاش پڑ جائے اپنی جبیں پہ
پشیماں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی،
کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

وہ ان کی بے رخی وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی   بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

جنونِ محبت یہاں تک تو پہونچا   کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا   منھ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

وہ رند ہوں کہ اُلٹ دی جب آستیں میں نے   دکھا دئے حرم و دیر سب یہیں میں نے

تو بھی اب سامنے آئے تو لٹا دوں تجھکو   تیری غیرت کی قسم اپنی حمیت کی قسم

ہائے یہ مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں   عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں   جہاں آرزو تھرا رہا ہے

فکرِ منزل ہے نہ ہوش جادۂ منزل مجھے   جا رہا ہوں جس طرف لیجا رہا ہے دل مجھے

عشق کی قسمت محروم الٰہی توبہ   یادِ جاناں بھی فراموش ہوئی جاتی ہے

اُردو غزل میں اس وقت ایسوں کا بھی ایک گروہ نظر آتا ہے جو دراصل نظم نگار ہیں اور نظم کی دنیا میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے ہیں، لیکن جنھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور غزل گویوں کی محفل میں بھی شریک رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں جوشؔ ملیح آبادی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

جوشؔ :۔ جوشؔ اپنی طبعی مناسبت کے اعتبار سے نظم نگار شاعر ہیں۔ لیکن انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور اچھی غزلیں کہی ہیں۔ اگرچہ وہ خود شاید غزل کو اپنے کارنامہ کا کوئی اہم جزو نہیں سمجھتے۔

جدید اُردو نظم میں جوشؔ اس حیثیت کے مالک ہو چکے ہیں جس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اُن کی نظمیں جدید میلانات سے معمور ہوتی ہیں اور عصری تشنجات کی بہت صحیح تابندگی کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کو بجا طور پر انقلابی شاعری کہا جا رہا ہے جو انقلاب و ترقی کے مطالبات سے بہت اچھی طرح ہم آہنگ ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ نے اقبالؔ کی جگہ لے لی ہے اور ترقی کی سمت اقبالؔ سے زیادہ فراخ حوصلگی، بلند آہنگی اور جسارت کے ساتھ قدم بڑھا رہے ہیں۔

لیکن یہاں ہم کو ان کی نظم نگاری سے بحث نہیں ہے۔ غزل میں بھی وہ اپنی نئی جولانیاں دکھاتے ہیں اور ان کے اشعار میں یہاں بھی ولولۂ شباب کی تازگی اور بالیدگی محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میدان میں وہ بھی عشق و حسن کے موضوع سے علٰحدہ ہو کر کم کہتے ہیں۔ کہیں کہیں زندگی کے اور مسایل کی طرف بھی اشارے ہیں۔

وہی رندی اور سرمستی اور وہی عاشق و معشوق کے واردات و معاملات جو اب تک غزل کے عام موضوع رہے ہیں عموماً جوشؔ کی غزلوں میں بھی ملیں گے البتہ ان میں جوانی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوشؔ کی غزلوں میں وہ زور اور تندی کا وہ خروش نہیں ملتا جو انکی نظموں کو اس قدر ممتاز کئے ہوئے ہے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:۔

ارض و سماں کو ساغر و پیمانہ کر دیا   رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی   آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا

فراغِ روزِ مسرت سے ڈھونڈنے والے   شبوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا

آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین   شغلِ پارینۂ اربابِ نظر تازہ کریں

ہنوز شہریاریاں رہین کبر و ناز میں   مآلِ تاج و تخت کی کہانیاں سنائے جا

رخِ نگارِ زندگی نقاب در نقاب ہے   نہ ہوگا ختم سلسلہ مگر نقاب اُٹھائے جا

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے   سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

ہاں آسمان اپنی بلندی سے ہوشیار   لے سر اُٹھا رہے ہیں کسی آستاں سے ہم

شباب رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں — ندیم عہد شوق کی کہانیاں سنائے جا
سمجھ گا اس کا درد کون شورش کائنات میں — تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں
پتہ منزل کا ہم کو تو ملا جوشؔ — بغاوت کر کے میر کارواں سے

ان اشعار سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جوشؔ نے غزل میں بھی چند نئے اسلوبی امکانات پیدا کئے ہیں۔ وہ اکثر ایسے الفاظ اور فقرے استعمال کر کے اشعار کی معنوی وسعت بڑھا دیتے ہیں جن کا استعمال ابتک روایتی غزل میں غیر فصیح نہیں تو خلاف وضع ضرور سمجھا جاتا رہا ہے۔

نظم نگار غزل گو شاعروں میں حفیظؔ جالندھری اور اختر شیرانی بھی قابل لحاظ حیثیت رکھتے ہیں۔ حفیظؔ کو چونکہ موسیقی سے فطری مناسبت ہے اسلئے وہ نظم لکھیں یا غزل ان کے وہاں بہرصورت ایک ہلکے قسم کا تغزل ملے گا جو ہموار ہوگا۔ مگر جس میں تصور سے زیادہ غنا کا عنصر غالب رہے گا۔ حفیظؔ کا موضوع شاعری شباب اور عشق کا ایک رومانی تصور ہے جو محدود اور سطحی ہے مگر جس کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں اس مقام کی چیزیں ہیں جہاں جوانی دیوانی ہوتی ہے۔

حفیظؔ: - حفیظؔ نے اُردو غزل اور اُردو نظم دونوں میں جو اسلوبی جدتیں کی ہیں وہ اپنی غنائی کیفیت کی وجہ سے اس قدر دلکش ہیں کہ ان کو قبول کر لینے میں کبھی کسی کو پس و پیش نہ ہوگا۔ اُن کے یہ نئے شعریات اُردو شاعری میں یقیناً اضافے ہیں۔

اختر: - اختر شیرانی بھی اسی عنوان کے شاعر ہیں مگر بہ حیثیت حُسن کار (Aesthete) کے وہ نہ صرف حفیظؔ جالندھری سے بلکہ اس دبستان کے اکثر شعراء سے فائق ہیں ان کی جمالیاتی بصیرت یقیناً زیادہ رچی ہوئی ہے اور بڑی نازک بلاغت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اختر شیرانی کے وہاں بھی جوانی کے بے اختیار جذبات کے سوا کچھ نہیں ہوتا ان کی نظمیں اور غزلیں بھی ان کے جنون شباب کا راز بری طرح فاش کرتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی جوانی کی رعنائیوں کو خود برداشت نہیں کر سکتا۔ رومانیت اور موسیقیت ان کی شاعری کی بھی نمایاں خصوصیتیں ہیں مگر اُن کے وہاں ایک سچے قسم کا گداز ایک بلند قسم کی المناکی بھی ہوتی ہے جو حفیظؔ کے وہاں نہیں ہے۔ اختر شیرانی کی نظموں اور غزلوں میں کوئی معنوی فرق نہیں ہوتا اس لئے کہ دونوں کی جان سلمیٰ ہوتی ہے۔ اختر کے اسلوب اور ان کی زبان میں جدت اور بے ساختہ پن کے باوجود پختگی ہوتی ہے جو ان کے اشعار کی دلکشی کو بڑھا دیتی ہے۔

علی اختر: - علی اختر اختر ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں ہم کو ایک نئے انداز کا فلسفیانہ تعمق ملتا ہے اور ان کی شاعری تاملات (Meditations) کے لئے بنی ہے۔ وہ بھی نظمیں اور غزلیں دونوں کہتے ہیں۔ ہر چند کہ بصائر اور تاملات غزل میں بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن اختر نظموں میں زیادہ اپنی شخصیت شعری کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ غزلوں میں وہ کچھ بند ہونے لگتے ہیں اور کمزور پڑ جاتے ہیں۔

ملا: - آنند نراین ملاؔ نظم اور غزل دونوں میں ایک کامیاب معیار قائم کئے ہوئے ہیں۔ جذبات کا توازن اور زبان کی سنجیدگی اور سلاست ان کی وہ نمایاں خصوصیتیں ہیں جو کبھی کبھی چکبست کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں ایک نہایت صالح اور پاکیزہ قسم کا ذوق تغزل پایا جاتا ہے جو ان کی نظموں کی بھی جان ہوتا ہے۔ موضوع اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے وہ اُن نظم نگار غزل گو شاعروں سے بالکل الگ ہیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

افسر: - افسر میرٹھی اُن لوگوں میں سے ہیں جو جدید اُردو غزل اور جدید اُردو نظم دونوں میں ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے اور اس کے لئے بہت سی آزادیاں حاصل کیں۔ نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن بجائے خود وہ کسی شدید کیف یا شدید قوت کی مالک نہیں ہے۔ افسر کی اہمیت بھی اسلوبی اجتہادات پر مبنی ہے۔

روشؔ۔ احسانؔ: - روشؔ اور احسانؔ دانش کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خالص نظم نگار شاعر ہیں اور غزلیں کہہ کر اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں میری رائے یہ ہے کہ ان لوگوں کو غزل کے میدان میں آنا ہی نہیں چاہئے۔

میں نے قصداً اب تک دو نہایت اہم غزل گو شاعروں کا ذکر روک رکھا تھا اس لئے کہ انھیں پر میں اپنا یہ تذکرہ ختم کرنا چاہتا تھا۔

یاسؔ و فراقؔ: - میری مراد مرزا یاسؔ یگانہ اور فراقؔ گورکھپوری سے ہے۔ دونوں نے اُردو غزل میں نئی بصیرتیں پیدا کی ہیں اور مزید نئی بصیرتوں کے امکانات کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ دونوں جدید دور کی جدید نفسیات کے شاعر ہیں۔

یاس اردو غزل میں پہلے شخص ہیں جن کی شاعری میں وہ کس بل محسوس ہوتا ہے جس کو ہم صحیح اور توانا زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی میں کسی موقع پر کہہ چکا ہوں کہ یاس پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رُخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ غزل کو جو اب تک صرف حسن و عشق کی شاعری سمجھی جاتی رہی ہے یاس نے زندگی کی شاعری بنایا اور انسان اور کائنات کی ہستی کے رموز و اشارات کو اپنی غزلوں کا موضوع قرار دیا۔ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ ان کے دیوان حسن و عشق سے متعلق اشعار نہیں ملتے۔ ملتے ہیں مگر ان میں بھی حسن و عشق کا احساس عام اور عالمگیر زندگی کے احساس میں سمویا اور کھویا ہوا ہوتا ہے۔

یاس اس کشاکش اور تصادم کا احساس ہمارے اندر بڑی سہولت اور کامیابی کے ساتھ پیدا کر دیتے ہیں جو زندگی کا اصل راز ہے اور جس کا احساس عصر جدید کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ مگر یاس احسان سے ہم کو زیر بار نہیں کرتے، ان کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت مردانہ عزم اور اعتماد ہے۔

یاس، آتش اور غالب کا ایک نہایت صحت بخش امتزاج ہیں۔ ان کے کلام میں جو گمبھیر قسم کی مردانگی ہے وہ آتش کی یاد دلاتی ہے اور جو مفکرانہ بلاغت اور عارفانہ آگاہی ہے وہ غالب کے رنگ کی چیز ہے۔ مگر یاس مقلد کسی کے نہیں ہیں۔ انھوں نے غزل میں واقعی بت شکنی کی ہے۔ اور روایتی موضوعات اور اسالیب دونوں سے انحراف کر کے ہم کو غزل کی امکانی وسعتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ پھر چونکہ یاس نے اپنے اور ہمعصر اور ہم چشم شعرا کی طرح زبان کو کبھی توڑا مروڑا نہیں بلکہ ایک واقفکارانہ اعتماد اور ایک ماہرانہ وثوق کے ساتھ قاعدہ اور ضابطے کے ساتھ اجتہادات کئے اس لئے کٹر سے کٹر زبان کا نقاد بھی ان کے اکتسابات کو بدعت نہ کہہ سکا اور اسالیب اور موضوعات دونوں میں ان کے اجتہادات تسلیم کر لئے گئے۔ یاس کے وہاں ماضی کے بہترین عناصر پائے جاتے ہیں مگر وہ مستقبل کی تعمیر میں کام لے رہے ہیں۔ یاس اُن لوگوں میں سے ہیں جن کے کلام کی رہنمائی میں غزل کی ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو سکتی ہے جو اس قابل ہو کر زندگی کے نئے میلانات اور نئے مطالبات سے عہدہ برآ ہو سکے۔ لیکن ہم کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یاس کا کلام اب منظر عام پر بہت کم آتا ہے۔ معلوم نہیں کہتے ہی کم ہیں یا کہتے ہیں اور اشاعت سے روکے رہتے ہیں۔ وجہ جو کچھ بھی ہو مگر یہ بات ہے قابل افسوس۔

آخر میں ایک بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ یاس کی غزلوں میں زندگی کی جو قوت ہم کو ملتی ہے اور جد و جہد کا جو احساس ہمارے اندر پیدا کرتے ہیں اسکو ان کے ذاتی مزاج کے اس عنصر سے زیادہ تعلق نہیں ہے جو ایک عرصہ تک ان کے چنگیزی معرکوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ بلکہ جب کبھی اور جہاں کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ چنگیزی عنصر ان کی شاعری میں داخل ہو گیا ہے تو بجائے قوت و جبروت کے خشونت اور کرختگی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔

یاس کیا ہے اور ان کے اشعار کا کیا اثر ہوتا ہے ؟ - اس کا ان چند اشعار سے کیجئے :-

رفتارِ زندگی میں سکوں آئے کیا مجال — طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا — خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد — سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور — اس آجکل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

آندھیاں رکیں کیونکر زلزلے تھمیں کیونکر — کارگاہِ فطرت پاسبانیِ رب کیا

بہارِ زندگی ناداں بہارِ جاوداں کیوں ہو — یہ دنیا ہے تو سرگردش وہی آرام جاں کیوں ہو

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے — مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے — جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا

ہزار ہاتھ اسی جانب ہے منزلِ مقصود — دلیلِ راہ کا غم کیا ملا ملا نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور — گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

امید و بیم نے مارا ہمیں دوراہے پر — کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

زمانے کی ہوا بدلی نگاہِ آشنا بدلی
اُٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمع سحر ہو کر

کارگاہِ دُنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

ہمیشہ منتظرِ انقلاب رہتے ہیں
مزاجداں ہیں جو ہنگامہ زارِ فطرت کے

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزلِ کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر
ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

وبالِ رنگ و بو سے چھوٹتے ہی پر نکالیں گے
گرانبار بہار آخر سبکدوشِ خزاں ہو کر

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جاتا دھواں ہو کر

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

موجِ ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو
دُنیائے گرد و باد کی نشو و نما نہ ہو

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے
آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گُل کھلائیگی
قفس سے چھوٹ کر سر پر اُٹھالیں گے گلستاں کو

لپٹی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے

یاسؔ کی شاعری ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ زندگی ایک جدلیاتی حقیقت اور تصادم اور پیکار اس کی نمو اور بالیدگی کے لئے ضروری ہے۔

فراقؔ:— فراقؔ کی شاعری کا عنوان بدلا ہوا ہے۔ زندگی کے نئے میلانات نے ہماری نفسیات میں جو اہم پیچیدگیاں پیدا کی ہیں اور زندگی کی جو جدلیاتی لہریں ہمارے اندر اُبھر رہی ہیں اُن کو بلیغ اور سنجیدہ اشاروں میں ہم تک پہونچا دینا فراقؔ کی ایک بہت عام خصوصیت ہے۔ جو معنوی تہیں ہم کو فراقؔ کی غزلوں میں ملتی ہیں وہ عموماً دوسرے اُردو شاعروں کے وہاں نہیں ملتیں کبھی کبھی تو ان کے دو مصرعوں میں اتنی تہہ اور گہرائیاں ہوتی ہیں کہ معنی یاب سے معنی یاب طبیعت اندیشہ ناک ہونے لگتی ہے کہ تھاہ کہیں ملیگی بھی یا نہیں۔

فراقؔ کی شاعری میں حیات اور کائنات کے ساتھ ایک شدید اور گہری یگانگت کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں زندگی اور عشق دونوں ایک آہنگ ہو کر ظاہر ہوتے ہیں اور ایک متبرک اور قابل احترام حقیقت بن جاتے ہیں۔ فراقؔ کے وہاں ہجر اور محرومی اور تنہائی کا شدید احساس ملے گا۔ لیکن اس سے ہمارے اندر صرف تلخی نہیں پیدا ہوتی اور نہ ہم محبت اور زندگی سے بیزار ہوتے۔ اُن کی تلخی میں یہ احساس بھی شامل ہوتا ہے کہ زندگی ایک قابل قدر چیز ہے اور اس کی تلخی بھی اس کی قدر کا ایک لازمی اور اہم جزو ہے۔

فراقؔ بھی ہمارے اندر زندگی کی جدلیت کا تیز شعور پیدا کرتے ہیں لیکن وہ یاسؔ کی طرح زندگی کا صرف جبروتی رُخ نہیں پیش کرتے۔ وہ حُسن اور قوت کو ایک مزاج بنا دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری میں ہم کو وہ نرمیاں ملتی ہیں جو یاسؔ کے وہاں نہیں ہیں اور جو قوت کے انتہائی احساس کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ فراقؔ کی شاعری میں ایک عنصر ہم کو ایسا ملتا ہے جو بیک وقت ذاتی اور غیر ذاتی ہوتا ہے اور ہم کو غم اور خوشی اور اس قسم کے دوسرے نجی احساسات کی سطح سے اُبھار کر ہماری فکر و نظر کو بلند اور ہمہ گیر بنا دیتی ہیں۔ اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ اپنے ہمعصر شعراء سے بہت ممتاز نظر آتے ہیں۔ وہ جب کسی لمحہ یا کسی موقع یا کسی حالت سے متاثر ہوتے ہیں تو وہ تاثیر ایک آفاقی تاثر اور ایک کائناتی احساس بن جاتا ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں ایک مسکن اور صحت بخش قوت آگئی ہے جو اس وقت کسی دوسرے اُردو غزلگو کے وہاں نہیں ملتی۔

فراقؔ کے اسلوب میں بھی ایک ایسی پختہ گھلاوٹ ہے جو بالکل اُن کی اپنی چیز ہے اور جو ان کے کسی معاصر کے کلام میں نہیں ہے۔ اُن کے اشعار کی ایک سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اُن کا آہنگ (Rhythm) ہے جو شاعر کی شخصیت شعری کا آئینہ ہے۔ جس بحر اور جس زمین میں بھی

وہ شعر کہیں گے اُن کا آہنگ ممتاز رہے گا اور یہ آہنگ محض صوتی نہیں ہوتا بلکہ شعر کے معنی ہی سے پیدا ہوتا ہے اور پھر معنی ہی کا جزو بن کر اس کی بلاغت کو بڑھا دیتا ہے۔

فراق سے ہم کو صرف ایک بات کہنا ہے وہ یہ کہ غزل میں اُتنے اشعار نہ کہا کریں جتنے کہ اکثر وہ کہہ جاتے ہیں۔ غزل یوں بھی طویل اچھی نہیں ہوتی۔ پھر اُنکی شاعری جس عنوان اور جس نوعیت کی ہوتی ہے اس کا اور بھی مطالبہ یہ ہے کہ وہ غزل میں شعروں کی تعداد اتنی نہ رکھا کریں۔

اب فراق کے کچھ اشعار نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں :-

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل　　کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے　　بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط　　آج دکھتے ہیں حُسن کے شانے

اُسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں　　کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

اس سے زیادہ اور کیا اب کوئی نامراد ہو　　آج نظر سے گر چلیں عشق کی کامرانیاں

ابھی فطرت سے ہونا ہے نمایاں شانِ انسانی　　ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

قفس سے چھوٹ کے وطن کا سُراغ بھی نہ ملا　　وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا،

ہجر میں پچھلے پہر کا عالم　　تاروں کو نیند آئی ہوئی سی

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　تو نے تو خیر بے وفائی کی

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا　　خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

رموزِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا　　میں چُپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں

فراق زیرِ چرخ کچھ چمک بھی ہو دھواں بھی ہو　　کہ جیسے اُٹھ رہی ہو وہ نگاہِ سرگیں کہیں

نگاہِ یار کچھ ایسی پھری ہجراں نصیبوں سے　　کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

تیری رنگینیِ طبیعت سے　　عشق کی سادگی بھی دور نہیں

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش　　تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

ترے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا　　میں سوچتا تھا کوئی میرا غمگسار نہیں

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں　　دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

یہ کیا دُنیا ہے اے دل شیخ کوئی برہمن کوئی　　بتاتا ہی نہیں اہلِ محبت کا وطن کوئی

دیارِ عشق آیا کفر و ایماں کی حدیں چھوٹیں　　یہیں سے اور پیدا کر خدا و اہرمن کوئی

اے رازِ جہاں بتانے والے　　اک اور جہانِ راز بھی ہے

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں　　منزل نہ کر حدودِ دنیا بنی نہیں

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو　　بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا　　کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

ہزار بار ادھر سے زمانہ گزرا ہے،　　نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

غرضکہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست　　وہ تیری یاد میں ہو یا تجھے بھلانے میں

ان اشعار میں جو لطیف اور دردرس فرزانگی ہے وہ ہم کو شاذ و نادر ہی کسی دوسرے شاعر کے وہاں ملسکتی ہے فراق کے اکثر اشعار پڑھتے وقت ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ ہمارے پاؤں زمین پر جمے ہوئے ہیں اور ہمارے ہاتھ ستاروں تک پہونچے ہوئے ہیں۔

یہ ہے ہماری موجودہ غزل گوئی کا اکتساب۔ گنتی کے دو ایک شاعروں اور بعض شعرا کے کچھ اشعار سے قطع نظر کرلیں تو ماننا پڑتا ہے کہ اردو غزل ابھی اسی خواب و خیال کی دنیا کا جایزہ لینے میں لگی ہوئی ہے جہاں پہلے پہل اس کو ڈالا گیا تھا۔ اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ غزل کے آیندہ امکانات بالکل رک گئے ہیں۔ لیکن نہ ایسا ہے اور نہ ہونا چاہئے۔ اگر نظم میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زندگی کی نئی سمتوں سے آشنا اور اس کے نئے میلانات اور نئی قدروں سے ہم آہنگ ہوسکے تو کوئی وجہ نہیں کہ غزل بدلتی ہوئی دنیا کے بدلتے ہوئے معیاروں اور نئی قدروں کے ساتھ موانست نہ پیدا کرسکے۔ اگر اجتماعی اور آفاقی زندگی کی وسعت اور انسانیت کی ہمہ گیری نظم کے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں ہے تو غزل کے لئے بھی نہ ہونا چاہئے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل چھوٹی سے چھوٹی نظم ہوتا اور سالماتی (Atomic) توانائی اپنے اندر رکھتا ہے جو بڑے کام کی چیز ہے اور جس سے بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔

ہم نے ابھی غزل کے اُن امکانات کی طرف توجہ نہیں کی ہے جن کی ایک جھلک اقبالؔ ہم کو دکھا گئے ہیں۔ اقبالؔ کی غزلیں بھی اسی قدر میلاناتی (Ten-dentians) ہوتی ہیں جس قدر کہ اُن کی نظمیں اور ان میں بھی حیاتِ انسانی کے متنوع پہلو اور کائنات کے مختلف زاویے ہم کو اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح کہ ان کی نظموں میں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق جو حکیمانہ اور مبصرانہ اشارے اقبالؔ کی غزلوں میں ملتے ہیں وہ ہمارا دل بڑھانے اور ہم کو نئے اجتہادات پر آمادہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میری مراد اقبالؔ کے صرف ان اشعار سے ہے جن کو خدا اور مذہب اور نظامِ ملی سے تعلق نہیں ہے۔ اقبالؔ کی غزلوں کو اگر ہم دھیان میں رکھیں اور یاسؔ اور فراقؔ کے کلام سے صحیح بصیرتیں حاصل کرتے رہیں تو ہمارے درمیان ایسے غزل گویوں کا پیدا ہونا ناممکن نہیں جو غزل کو زندگی کی نئی سمتوں اور نئی پیچیدگیوں سے مانوس کرکے نئے راستہ پر لگادیں اور اس کو موجودہ جمود اور پستی سے بچالیں۔ غزل کو اگر زندہ رہنا ہے تو اس کو یقیناً اجتہاد سے کام لینا پڑے گا اور روز بروز بدلتی اور پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی ہوئی دنیا کی باہم متضاد ضرورتوں پر محیط ہوکر ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہوگا۔ ورنہ ہمارا تغزل زندگی سے بیگانہ رہ جائے گا اور خود زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکے گا۔

(**نگار**) پروفیسر "مجنوں" نے باوجود اس کے کہ اُن کے پاس وقت و اطمینان دونوں کی کمی تھی، انھوں نے محض میری خاطر سے یہ بسیط مقالہ سپردِ قلم کیا، جس کا میں بہت ممنون ہوں۔ مجنوںؔ صاحب اپنی نقادانہ اہلیت و سخن فہمی کے لحاظ سے ملک میں کافی اعتبار رکھتے ہیں، اس لئے اُن کی رائے خاص وزن رکھتی ہے، گو کہیں کہیں اُن کی حیثیت ایک نرم مُتحمن کی سی ہوگئی ہے۔

اُردو غزل

ڈاکٹر تاثیر - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی (کینٹب)

"نگار" بابت جنوری فروری ۱۹۴۱ء پیشِ نظر ہے +

نقادانِ غزل کے لئے یہ مجموعہ استنادی حیثیت رکھے گا +

شعراء کے خود نوشت حالات خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہیں - اکیس شعرا کا تذکرہ ہے - ان میں سے پانچ ہندو ہیں - تین حضرات نے حالات ہم نہیں پہونچائے باقی تیئس رہ گئے - ان کی ایک مشترک صفت قابلِ توجہ ہے -

(۱) آرزو لکھنوی - "جدِ اعلیٰ ہرات کے رہنے والے تھے"

(۲) اختر شیرانی - "الافغانی"

(۳) امید امیٹھوی - "مورثِ اعلیٰ ... ولایت غزنی سے ... ہندوستان آئے"

(۴) تاجور - "درانی افغانی"

(۵) ثاقب - "وطن طبرستان +" "مولد آگرہ"

(۶) جوش - "بزرگ کابل سے آئے - اکثر افراد اس خاندان کے سلطنت اودھ میں اعلےٰ عہدوں پر مامور رہے"

(۷) خاقی - "اصلی وطن کابل"

(۸) ناطق - "مورثِ اعلیٰ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تشریف لائے"

(۹) ناطق لکھنوی - "جدِ اعلیٰ ... بغداد سے ہندوستان آئے"

(۱۰) یگانہ - "چنگیزی"

(۱۱) آزاد - "سلسلہ حضرت ایوب انصاری تک پہونچتا ہے"

ان گیارہ حضرات نے تو وضاحت اور التزام سے اپنا "غیر وطنی" ہونا ظاہر کیا ہے - باقی بزرگوں کے متعلق چند معلومات توجہ طلب ہیں :-

(ا) اثر لکھنوی - "اسلاف خاندانِ شاہی سے متوسل تھے"

(ب) جلیل - "نظام دکن کے اُستاد ..... شاہزادگان اور صاحبزادگان بھی حسبِ حکمِ سرکار .... کلام دکھاتے ہیں"

(ج) جگر - "مورثِ اعلےٰ ..... شاہجہاں کے اُستاد"

(د) حفیظ - "میرا خاندان دو سو برس پہلے چوہان راجپوت کہلاتا تھا ..... سورج بنسی ہونے کا غرور"

(ھ) فراق - "میرے بزرگوں کو پانچ گاؤں شیر شاہ کے دئے ہوئے" ہیں +

(و) کیفی - "بزرگ ... فرخ سیر ... کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہو گئے"

(ز) ساحر - "رنجیت سنگھ ... اور ان کے جانشینوں کے مشہور راجہ دینا ناتھ آپ ہی کے خاندان کے ایک معزز رکن تھے - آپ رائے بہادر ... رئیس دہلی

کے خلعت اکبر ہیں۔"

یہ اٹھارہ حضرات رئیسوں، نوابوں، اور بادشاہوں سے خاندانی تعلقات رکھتے ہیں۔ شاید تین چار اور بھی اسی قسم کی روایات نسبی کے حامل ہوں گے۔ اور اس امر کو شعوری طور پر وجہ فخر سمجھتے ہوں گے + باقی ماندہ شعراء میں سے چند ایک ضرور طبقۂ امراء کی طرزِ خیال اور سماجی روایات کو پسند کرتے ہوں گے + (کبھی حسرت کو کبھی جگر کو کبھی کسی اور کو شاید اسی رعایت سے "رئیس المتغزلین" کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔۔۔ نادانستہ طور پر سہی!) ایک شاعر تو یہ کہکر کہ "جدید اُردو ادب کی تعمیر کرنے والے ۸۰ فیصدی میرے شاگرد ہیں" مطمئن نہیں ہوا اور جب تک "ذاتی سرمایہ تیس ہزار" کا بتا نہیں لیا چین نہیں آیا۔ ان حضرت نے صوبجاتی نفاق کو بھی بھڑکانا چاہا ہے!۔۔ رئیسوں، نوابوں کے درباریوں کی طرح + غرض بیشتر متغزلین حضرات کا مزاجی رشتہ طبقۂ رؤسا سے ہے +

میں یہ توضیحات تمدیح یا تنقیص کی غرض سے نہیں کر رہا۔۔ ایک جاذب توجہ حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے ان شعراء میں سے جو نظم گو بھی ہیں۔ یعنی احسان دانش، اختر شیرانی، جوش، حفیظ، سیماب، تلوک چند، ملا، افسر میرٹھی، کسی نے بھی اپنے رئیسی تعلقات کا خود ذکر نہیں کیا۔ (حفیظ بھی کہتا ہے کہ یہ "غرور میری ذات تک پہونچا اور ختم ہو گیا") + غزل گو کہنگی پسند ہیں۔ اور نظم گو روایات کے بندھن سے آزاد معلوم ہوتے ہیں + کیا یہ افتادِ طبیعت خود غزل اور نظم کی صنف سے متعلق تو نہیں؟ (واضح رہے کہ "غیر وطنی" ہونا۔۔۔۔ "ولایتی" ہونا۔۔۔۔ موجبِ فخر سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ "افغان" اور "مغل"، حاکم اقوام تھیں۔ ان کے عمائد "ولایتی" تھے۔ اب صورتِ حالات مختلف ہے۔ مگر وہ افتخار کی روایت موجود ہے۔ آج کل "ولایت" سے مراد یورپ ہے اور "ولایت رفتہ" ہونا وجہ ناز ہے +) ان اکتیس شعراء میں سے کوئی بھی (آنند نرائن ملا اور فراق کے علاوہ) بی۔اے سے آگے نہیں بڑھا + پانچ (اثر، حسرت، فانی، محروم، افسر) بی۔اے پاس ہیں + اور ان ساتوں میں سے غالباً فقط فانی اور اثر نظم نہیں کہتے۔ حسرت نے بھی بہت کم نظمیں کہی ہیں +

نظم گو شعراء انگریزی سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اختر۔ جوش۔ حفیظ۔ سیماب۔ کیفی۔ روش۔ علی اختر۔ محروم۔ ملا۔ افسر۔ یعنی احسان کے علاوہ سب کے سب! خالص غزل گو شعراء کی اکثریت انگریزی تعلیم سے بے بہرا ہے!۔۔ پرانی رئیسی روایات سے وابستگی اور نئی تعلیم سے بے تعلقی۔۔ یہ ہے عام متغزلین کے ذہنی پس منظر کا ایک نمایاں پہلو!۔۔

مدیرِ "نگار" نے ان شعراء کو "دورِ غزل گوئی کی آخری نشانیاں" کہا ہے + غزل سے ان کی مراد "غزبِ حُسن و عشق والی غزل" ہے + تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ حُسن و عشق کا بازار سرد پڑ گیا ہے۔ یا یہ کہ "غزل" بحیثیت ایک صنفِ سخن حسن و عشق کے محرکات کے اظہار کے لئے بیکار ہو گئی ہے؟

مگر مجھے یہ استدلال کچھ ایسا قابلِ قبول معلوم نہیں ہوتا +

"غزل" سے مراد یا تو محض "یک قافیہ" کلام ہے۔ مگر قصائد اور نظمیں بھی یک قافیہ ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں +

یا "غزل" سے مراد حُسن و عشق کے مضامین ہیں۔ اور یہ غزل اور نظم میں مشترک ہیں + یا ان دونوں کا امتزاج یعنی یک قافیہ عشقیہ کلام۔۔ یہ قصائد کی تشبیب میں اور نظموں میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور پھر مروجہ غزل میں غیر عشقیہ مضامین بھی ہوتے ہیں +

میری رائے میں "غزل" کے لئے یک قافیہ ہونا ضروری ہے۔ یہ فنی وصف ہے اور اس کا دوسرا بنیادی وصف یہ ہے کہ مختلف اشعار میں منطقی تسلسل نہ پایا جائے۔ اشعار متفرق ہوں۔۔ مضمون کے اعتبار سے۔۔ جب تسلسل ہوتا ہے تو ہم صراحت سے اسے مسلسل غزل یا قطعہ وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ گویا غزل کے لئے تسلسل غیر معمولی ہے!۔ غزل کی ساخت میں یگانگت (برائے بحر و قافیہ) ہوتی ہے۔ اور مضمون متفرق ہوتے ہیں!۔

کیا یہ اوصاف ہماری تمام شاعرانہ ضروریات کے منافی ہیں۔ اور لازمی طور پر فنا پذیر ہیں؟

یک قافیہ اشعار دُنیا کی شاعری میں ہر دور میں کہے گئے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ آیندہ یہ انتظام بے کار ہو جائے + حسن و عشق کے مضامین کی عالمگیری بھی مسلمہ ہے فطرتِ انسانی حُسن و عشق سے وابستہ رہی ہے۔ اور رہے گی + اشعار میں منطقی تسلسل کا ہونا بھی کسی طرح طبعِ انسانی کے منافی نہیں۔ ہمارے احساسات اور جذبات کی رو عموماً غیر مسلسل اور غیر منطقی ہوتی ہے۔ اس لئے عدم تسلسل عین مطابق فطرتِ انسانی ہے۔ آج کل تو نثر میں بھی (بالخصوص فسانوں میں) شعورِ انسانی کا اظہار اس طرح کیا جاتا ہے کہ خیالات آگے پیچھے چلے آتے ہیں + کبھی ماضی۔ کبھی حال کبھی مستقبل میں اُچٹتے ہوئے سے!۔۔ (Tomas Joyce)

اس انداز کا امام تھا اور شاید ہی کوئی جدید صنف ہو جس پر اس کا اثر نہ ہو۔ تو پھر یک قافیہ مگر غیر مسلسل اشعار یعنی غزل کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف مٹنے والی ہے!—

حقیقت یہ ہے کہ غزل مٹ نہیں رہی بلکہ جس نہج کی غزل داغ کے وقت تک مروج تھی وہ مٹ رہی ہے۔ (داغ کے وقت تک بھی غزل کے دو واضح طریق تھے۔ نقاد دلّی اور لکھنؤ سکول کا نام دیکر ان میں امتیاز کرتے ہیں) + اس کی وجہ ظاہر ہے +

ہماری غزل درباروں کی پیداوار تھی۔ بجھے ہوئے نوابوں اور مٹے ہوئے رئیسوں کے درباروں کی!— اس میں اسی قسم کے تاثرات کا اظہار ہوتا تھا جو اس فضا میں پنپ سکتے تھے +

نواب صاحب کا دربار ہے۔ درباریوں کے جتھے ہیں جو توڑ جوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ اور نواب کی توجہ، شاعر ہو یا کوئی اور پروردۂ سرکار ہو۔ ان لوگوں کی زندگی اور موت کا باعث ہے + نواب مطلق العنان ہے۔ جسے چاہا نوازا جسے چاہا ختم کر دیا— اور اس کے ہاں باریابی تک ایک مشکل مہم ہے۔ دروازے پر دربان ہیں!—

یہ نواب کے دربار کا نقشہ ہماری "غزل" کا سرمایۂ حیات تھا۔ غزل کا بھی اور غزل گو کا بھی—

چنانچہ شعرا کا معشوق بھی نواب تھا۔ وہی "رقیب" وہی "دربان" ہے۔ وہی مطلق العنان، متلون المزاج شخص!—

ادب اور فن کی سرپرستی انھیں درباروں میں ممکن تھی عوام اس قابل نہ تھے کہ شعرا کی قدر کر سکیں۔ یا ان کو زندہ رکھ سکیں— طباعت اور عام تعلیم کا دائرہ بہت مختصر تھا + (خواندگی چند مقررہ کتابوں تک محدود تھی) +

اس دربار میں شاعر کی حیثیت بہت ادنیٰ تھی— اس کی جنس محض تفریح کا سامان بن سکتی تھی۔ چنانچہ غزل میں شاعر ہمیشہ بدنصیب، اور نامراد عاشق ہوتا تھا— اور بوالہوس رقیب کامیاب!— ہوس، دنیاداری، افادی کاروبار ایک طرف اور عشق، ادب، رومانی تحریکات دوسری جانب!— ظاہر ہے کہ نواب کے دربار میں افادی قدریں زیادہ بلند مرتبہ تھیں اور ادب و فن محض تفریحی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر شاعر تفریحی دائرے سے باہر جانا چاہتا تو نامقبول ہوتا تھا +

یہ ہلکی پھلکی تفریحی غزل کی شاعری۔ درباری فضا میں کامیاب ہوئی— چلتے ہوئے فقرے۔ اچھلتے ہوئے خیالات۔ پھبتی، طعن، ہوسکاری!— یہ تھا درباری غزل کا سرمایہ +

مگر جب یہ دور بدلا۔ جب رئیسی نظام ٹوٹنے لگا۔ تو غزل نے بھی پلٹا کھایا— خود رئیسوں اور نوابوں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ساہوکار، تاجر، کارخانہ دار، متوسط طبقے کے لوگ، صاحب امر ہوئے اور پرانے حاکم نواب دیوالیہ ہونے لگے + طاقت کا توازن بدلا— اور اس میں کئی "دربار" اُلٹ گئے! نوابوں نے اپنے اخراجات کا بجٹ بنانا شروع کیا۔ اور سب سے۔ پہلے سب سے زیادہ غیر ضروری مد یعنی شعرا اور صناع خارج ہوئے + درباروں کے ساتھ درباری شاعری بھی مٹنے لگی +

اس پر ستم یہ ہوا کہ نئے فرمانروا بدیشی تھے۔ ان کی زبان۔ ان کا ادب۔ ان کی معاشرت بالکل مختلف تھی + اور جب انھوں نے سیاسی استقامت کے بعد یہاں کے ادب کی طرف توجہ کی تو شاعری کے پہلے دربار میں جو لاہور میں منعقد ہوا "نظم" ظہور پذیر ہوئی + — انگریزی شاعری کے "مضامین" اُردو میں نظم ہونے لگے +

مگر غزل مٹی نہیں۔ کیونکہ اس کی روایات بہت گہری تھیں اور اس کی بنیادیں فطرتِ انسانی میں پیوست تھیں +

واضح رہے کہ غالب جو اس نئے دور میں سب سے زیادہ مقبول تھا— وہ درباری غزل سے طبعاً بغاوت کر چکا تھا۔ صاف صاف کہتا تھا ؎

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غرض شاعر درباروں سے خارج ہو کر آزاد ہو گئے— نوابوں سے دور ہو کر وہ عام فطرتِ انسانی اور جذبات کے نزدیک آ گئے +

چنانچہ حسرت کا تصورِ عشق نوابی نہیں— انسانی ہے!—

اس طرح "غزل" کو ایک نئی زندگی حاصل ہو گئی— گو یہ زندگی ایک نہایت معین اور محدود دائرے میں محصور ہے +

ہمارے موجودہ متغزلین میں فقط جلیل کا تعلق "دربار" سے ہے۔ اور یہ "دربار" بھی پرانی قسم کا دربار نہیں۔ اصلاح شدہ دربار ہے!— لیکن ہے درباری۔ اور حالات کے بدلنے کے باوجود ذہنی روایات وہی پرانی ہیں— اس قسم کی غزل یقیناً ختم ہو رہی ہے۔ مدیر نگار کا یہ کہنا کہ جلیل اسوقت اپنے رنگ کے تنہا لکھنے والے ہیں"

بالکل بجا ہے۔ اور یہ قول کہ "جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ، نہ کوئی مضمون آفرینی نہ فکر و خیال کی بلندی" میرے اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ کامیاب درباری شاعری لازماً تفریحی ہوتی تھی۔ ایسی کہ دماغ پر آنچ آئے نہ دل میں پیچ و تاب پیدا ہو + لفظوں، محاوروں کا اُلٹ پھیر۔ "روانی بے تکلفی" ۔ واہ، واہ، کیا روزمرہ ہے کیا ٹکسالی قافیہ ہے۔ ردیف زندہ کر دی ہے! ۔ یہ زبان، یہ محاورے تو اظہارِ خیالات کے ذرایع ہیں۔ مگر جب کوئی سماج زوال پذیر ہوتی ہے تو ذرایع مقصد بن جاتے ہیں اور جب کوئی آرٹ (شاعری یا ادب) زوال آمادہ ہو تو ذریعۂ اظہار بذاتِ خود مقصدِ اظہار ہو جاتا ہے + جب "خیال و فکر کی بلندی" نہ ہو تو پھر الفاظ، اور محاوروں کی "روانی" اور "بے تکلفی" ہی رہ جاتی ہے۔ شاعری میں کچھ جوہر ہوا تو "فن برائے تفنن" ہو گیا اور محض مہارت ہوئی تو "فن برائے فن" !۔

حسرت نے اس پُرانی درباری غزل سے آزاد ہو کر ایک نئے دور کی ابتدا کی ۔ اس کا عشق خلوص و نیاز کا آئینہ دار ہے۔ عالمگیر ہوتے ہوئے ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے + یہ نہیں کہ وہ محض روحانی ہوائی تعلقات کو بیان کرتا ہے اور محسوسات کو ہوسناکی سمجھتا ہے + اس کا مخاطب ایک انسان ہے۔ انسان کی لطیف ترین جنس، عورت! ۔ وہی عورت جو دل، دماغ، بدن، روح، ہر قوتِ انسانی پر چھا جاتی ہے۔ اور اپنی نزاکت اور بے بسی کے باوجود سطوت و جبروت کا مجسمہ ہوتی ہے، جس کے سامنے ہوس، ہوس رہتے ہوئے، عشق بن جاتی ہے اور مجاز کا ایک پہلو حقیقت! ۔ ؎

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی　　روبرو ان کے مگر آنکھ اُٹھائی نہ گئی

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا　　جستجو کی کوئی تمہید اُٹھائی نہ گئی

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں　　کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

یہ کوئی نادیدہ خیالی تصور نہیں۔ "ان" کا نام و نشان بھی ہے جستجو کا امکان بھی ہے! ۔ حسرت نے عشقیہ شاعری میں محسوسات کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ جو اختر شیرانی جیسے شبابی بلوغتی شاعروں کا مخصوص مضمون بن گیا ہے۔ معشوق ایک معین "شخص" ہے۔ جس کا حواسِ ظاہری سے شعور کیا جا سکتا ہے۔

؎ پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں　　یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

؎ محبوبی و رنگینی ہیں جزوِ بدن تیری　　سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

؎ محتاج بوئے عطر نہ تھا جسم خوب یار　　خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی

؎ رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

اس پیکرِ رنگ و بو کے اثرات بھی حسی ہیں ؎ - اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی !۔

شدتِ خلوص۔ موضوعِ عشق کا تعین، جذبات کی انفرادیت ۔ یہ ہیں اس نئی غزل کے اوصافِ خصوصی۔ منجملہ اور اوصاف کے ۔ اور جب تک انسان اپنی فطرت پر قایم ہے۔ غزل کے یہ اوصاف شاعری سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہر دور کے بنیادی حقایق مختلف ہوتے ہیں۔ اور انسانی ذہن کی توجہ پہلو بدلتی رہتی ہے + راگ تو اپنی اپنی جگہ سب اچھے ہیں مگر بے وقت کی راگنی ناگوار گزرتی ہے + اگر ملک پر ایک خونخوار غنیم حملہ آور ہو تو اسوقت بانسری کا نغمہ اگر جاذبِ توجہ ہو گیا تو تمام قوم ہلاک ہو جائے گی + نہیں تو وہ بگل کی آواز میں فنا ہو جائے گا اور قوم اپنی توجہ اپنی مدافعت کی طرف مبذول کر سکے گی!

اقبال، حافظ کی شاعری کا منکر نہ تھا۔ وہ اس کی ساحری کا ایسا معتقد تھا کہ اسے ڈر تھا کہیں تمام قوم ان دلکش نغموں کے اثر سے مبہوت اور بے کار نہ ہو جائے اور ایسی حالت میں جب ملکی ضروریات، حقائقِ حاضرہ، اس بات کے مقتضی ہیں کہ ہر جوان کے ہاتھ میں تلوار ہو۔ کہیں یہ نہ ہو کہ بانکے سپاہی بانسری سنبھالے محوِ رقص ہو جائیں +

اقبال، حافظ کو بہترین غزل گو سمجھتا تھا ۔ اور موجودہ دور کی غزل کا اندازہ فرقِ مراتب وہی حافظ کا سا ہے!۔

ہمارے "ترقی پسند مصنف" اس معاملہ میں اقبال کے پیرو ہیں ۔ اختلاف اگر ہے تو بنیادی حقایق کی توضیح اور تعین میں ہے ۔ شاعری کا نظریہ مختلف نہیں!

آج، جب دُنیا ایک خونخوار جنگ کا تختۂ مشق بنی ہوئی، جب آزادی اور زندگی کے بنیادی اصول معرضِ خطر میں ہیں ۔ مشرق و مغرب، ہر دو جانب سے ایک خون کا سیلاب ہماری طرف اُمڈتا ہوا چلا آ رہا ہے + جسمِ انسانی کے لختے، چیتھڑے، پنڈلیاں، انتڑیوں میں اُلجھے ہوئے پھیپھڑے، عورتوں بچوں، نوجوانوں، بوڑھوں کی لاشیں، شکستہ کشتی کے تختوں کی طرح ہوکی لہروں میں اُبھرتے ڈوبتے دکھائی دے رہے ہیں۔ کھوپڑیوں کے انبار، لاشوں کے مینار، قدم قدم پر استوار ہو رہے ہیں

اس وقت اس قسم کے اشعار سے

عشق پر بھی چھاگئیں رعنائیاں　　اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں　　(آرزو)

فصلِ بہار ذوقِ نظر عالمِ شباب　　اب کیا خبر رہا ہے کہ ایمان نہیں رہا　　(آسی)

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو　　تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ　　(احسان دانش)

جب میں نے سُنا ہے نام ان کا　　دل پر اک چوٹ سی لگی ہے　　(علی اختر)

کون آیا مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ　　زلف برہم کئے با چشم حجاب آلودہ　　(اختر شیرانی)

آپ کل گزرے ہیں جس رہگذر سے پہلے　　وہیں بیٹھا ہے کوئی جاکے سحر سے پہلے　　(امید امیٹھوی)

کیا آگ لگائے کوئی نالے کے اثر کو　　پہلو میں وہ بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے سر کو　　(بیخود)

ملامت کرو ان کو ضد پر تمھاری　　نہیں بھی اگر چاہتا چاہتا ہوں　　(تاجور)

(غرض الف بے تے سے ی تک یہی حال ہے) — ایسے اشعار ایسے سنگین دور میں کسی ہوشمند انسان کو بھلا کس طرح قابلِ توجہ معلوم ہو سکتے ہیں! وہی نیرو والی بات ہوئی کہ روم جل رہا ہے اور حضرت سارنگی بجا رہے ہیں! —

میں نے جنگ کا نام اس لئے لیا ہے کہ یہ دورِ حاضر کی ایک بین حقیقت ہے + یوں ہندوستان میں صلح کا زمانہ بھی جنگ سے کم ہولناک نہیں — اوندھا کر دینے والا افلاس، اور ہمت شکن سیاسی ادبار — یہ کیا کم مصیبتیں ہیں + مگر ہمارے شاعر ہیں کہ طبلہ بجائے جاتے ہیں + ہم وطن سانس توڑ رہے ہیں کہ ان کی سُر تال کا حساب قایم ہے! شاید اس لئے کہ ان کی اکثریت رئیسی روایات کی حامل ہے +

مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ حالات قایم رہیں - اچھے دن بھی تو آسکتے ہیں - جب ان شعراء کا کلام کام آئے گا + اور یہ بھی کہ جری سپاہی بھی ہر وقت باوردی نہیں رہتے - سستاتے بھی ہیں اور سستانے کے وقت لوریاں سننا چاہتے ہیں + اور پھر یہ بھی کہ جو کمبخت مصیبت سے تنگ آکر ہمت ہار دے آخر اسے بھی کوئی جائے قرار درکار ہوگی!

میں اس وقت ان مختلف نظریات کا محاکمہ کرنا نہیں چاہتا - افادی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کی یہ اُلجھن ایک الگ سلسلۂ مضامین کی محتاج ہے + یہاں اجمالی طور پر اتنا کہنا کافی ہے کہ نظم گو شعراء کے لئے حقائقِ حیات کی تلاش شاید زیادہ اہم ہے - کیونکہ ان کی ہر ایک نظم ایک مستقل اور مسلسل نقطۂ نظر کی ترجمان ہوتی ہے - مگر غزل گو تو چلتی پھرتی دُنیا کا آدمی ہے - ہرجائی ہوتا ہے - وہ زندگی کو بیک وقت مختلف پہلوؤں سے دیکھتا ہے - اس کو جانچنے کا معیار یہ ہوگا - کہ اس کا عام جذباتی اور فکری رجحان کیا ہے اور کیا یہ رجحان سطحی ہے یا ایک گہرے خلوص کا نتیجہ ہے - ہم عام زندگی میں بھی تو یہی کرتے ہیں - دوستوں اور عام انسانوں کو بھی اسی طرح جانچتے ہیں! میں یہ نہیں کہتا کہ شاعری ہمیشہ ایک واضح تنقیدِ حیات ہوتی ہے - مگر یہ ضروری ہے کہ نظم ہو یا غزل اس سے شاعر کا ایک واضح شعری کردار نمایاں ہوتا ہے - نقاد کا کام اس شعری کردار کی پرکھ ہے - اور یہ پرکھ زندگی کی بنیادی اقدار سے تعلق رکھتی ہے +

قدیم درباری غزل میں نہ انفرادیت تھی نہ خلوص - اس لئے اس کے نقاد محض وضع قطع کو دیکھتے بھالتے تھے - درباروں میں انسانوں کی جانچ بھی کچھ اسی طرح ہوتی تھی - اور آج بھی سوسائٹی کے مہذب چائے نوش، حلقوں میں انسان درزی کے سلے ہوئے سوٹ کی کاٹ اور چائے کی پیالی پیش کرنے یا اُٹھانے کی روش سے قابلِ قبول یا مردود قرار دیا جاتا ہے + مگر جب انسانوں کے باہمی تعلقات فطرت کے جذبات بروئے کار لائیں، جب معاشقہ نہیں عشق کیا جائے، کیا نہ کیا جائے بلکہ ہو جائے، تو پھر معیاری اقدار بھی گہری ہو جاتی ہیں "مہذب" لوگوں میں بھی +

دلّی سکول اور لکھنؤ سکول کا فرق بھی یہی ہے - اُردو شاعری کی روایات اس وقت قایم ہوئیں جب دلّی کا شاہی دربار بے طاقت ہو چکا تھا - نوابوں نے جا بجا نقلی دربار قایم کر رکھے تھے، شاعری، گنگے اور نجوم کی طرح رئیسانہ کھیل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی - ان نقلی درباروں میں سب سے زیادہ باثروت لکھنؤ کی نوابی تھی - خوش بے فکر مذہب تک سب "اندر سبھا" کی طرح مشغلے تھے - تھکے ہوئے مفلوج احساس کو برانگیختہ کرنے کے مختلف ذریعے! — چونکہ دلّی کے دربار میں ابھی فارسی ہی کا زور تھا اس لئے وہاں اُردو شاعری ان مسموم اثرات سے کچھ بچی رہی اور پھر چونکہ آسے دن کی طوائف الملوکی نے تصوف کا بازار گرم کر رکھا تھا - اس نے شعراء کی

طبیعت میں کچھ کچھ تفکر اور عمیق خیالی کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اور کچھ کچھ انفرادیت کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ لکھنؤ کی طرح تصنع کی یکسانیت نہیں تھی۔ (لکھنؤ میں واقعیت زیادہ تھی اور دلی میں موہومیت!) مگر خود میر تقی کو پورب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ اور دلی اور لکھنؤ ایک ہو گئے۔ ناسخ لکھنؤ میں اور جگت استاد نصیر دلی میں ایک ہی بولی بولتے تھے! ۔ اُردو غزل ہموار ہو کر رہ گئی۔ (فارسی غزل نے بھی مطلق العنان سلاطین کے دربار میں پرورش پائی۔ اور جس قدر وہ طرز حکومت منضبط تھی اسی قدر اس دور کی غزل بھی با وقار تھی۔ دلی سکول کی غزل کو ایرانی روایت کی قربت نے ایک حد تک سنبھالے رکھا) غالب میں رئیسانہ شان اور طبعی رجحان نے ایک معین انفرادیت کا انداز پیدا کر دیا تھا۔ مگر جب غدر نے رئیسی نظام کو پاش پاش کر دیا تو شعراء کو ایسا جھٹکا لگا کہ جس میں جو کچھ تھا۔ بہت نمایاں ہو کر ظاہر ہونے لگا۔ رامپور اور حیدر آباد نے درباری نظام کو کچھ سہارا دیا۔ اور داغ کا تفنن اور امیر کا فن کچھ دیر فروغ پاتا رہا۔ مگر سماج پلٹا کھا چکی تھی اور یہ بچے کھچے طوفان کو روک نہ سکے۔

مگر پرانی سماجی روایات صدیوں تک اثر انداز رہتی ہیں۔ حالی وغیرہ نے نئے حقایق کا جایزہ لینا شروع کیا مگر مسدس کے مرثیاتی انداز کے علاوہ وہ شاعری کو کچھ اور نہ دے سکے۔ ملک بہت تیزی سے بدل رہا تھا۔ اور ایک نیا نظام تعمیر ہو رہا تھا۔ یہاں وہاں سیاسی تحریکوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور نئی امیدیں بندھ رہی تھیں۔ چنانچہ اقبال کا "شکوہ" "مسدس" حالی کے انداز میں ہے۔ وضع میں اور مرثیہ خوانی میں بھی۔ مگر "نیا شوالہ" اور خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام ایک تعمیری طرزِ خیال کے حامل ہیں۔ غزل بھی ان رجحانات سے اثر پذیر ہوئی۔ عاجزانہ لہجے کی جگہ صحت مند اور باتمکین فطرتی جذبات لینے لگے۔ شاعر دوبارہ انسان بن گیا۔ دلی سکول اور غالب کی روایات کا احیاء ہونے لگا۔ اور ان پرانی روایات کے ساتھ ساتھ ایک نئے قسم کی انفرادیت رونما ہونے لگی۔ اس روش کا عروج حسرت کے کلام میں نظر آتا ہے۔ مگر جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ انفرادی عشق اور خلوص کی شاعری حقائق وقت سے بہت دور رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسوقت اکثر نئے شاعر نظم گو ہیں۔ مگر غزل کے ایک نئے دور کا آغاز اقبال کی بالِ جبریل سے ہوتا ہے۔ اقبال کے ایمان کی حدت نے بارد اور مجرد خیالات کو جذبات کی سی گرمی عطا کر دی۔ راسخ یقین نے فلسفہ کو شاعری کا رتبہ بخش دیا ہے ؎

یہ کون غزل خواں ہے پر سوز و نشاط انگیز — اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں انگیز

اس لئے یہ کہنا کہ غزل مر گئی یا مرنے والی ہے کچھ ایسا معقول قیاس نہیں۔ لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اقبال کی غزل یک قافیہ اور غیر مسلسل ہونے کے باوجود معنوی یکانگت رکھتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نظمیہ غزل ہے۔ متفرق اشعار، مختلف مضامین، ایک واضح نظام خیال کے ماتحت تنوع کے باوجود متناقض نہیں۔

کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

نگار کے متغزلین (اُستادوں کے علاوہ کہ ان کا انداز وہی میراثی روایتی "فن برائے فن" کا ہے) حالی اور اقبال کے درمیانی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ دور تاریخی طور پر بہت "انقلابی" ہے۔ اس "انقلابی" فضا کا ہی یہ اثر تھا کہ غزلیں کہنے والے نظمیں کہنے لگے۔ اور شعراء محض درباری آرائش کا سامان اور رئیسوں کی محفل کا دل بہلاوا نہ رہے۔ ذمہ دار لوگوں کی طرح زندگی کے بنیادی تجربات سے متاثر ہونے لگے! بسا اوقات ان کی شاعری خطابت ہی کر رہ جاتی ہے۔ مگر یہ اور بحث ہے۔ غزل گو اس طوفان حوادث سے گھبرا کر اور زیادہ اندر کی طرف سمٹ گئے۔ گہری گہری خندقیں کھود کر محصور ہو گئے۔ انفرادیت اور نازک تجزیاتِ نفسی، مذ فتحی دھندے ہیں۔ جن کے سہارے متغزلین سماجی حقائق سے جان بچانا چاہتے ہیں۔ مگر اس دُنیا میں ایسا طلسماتی خلد کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ جس میں باہر کی ہوا نہ پہونچ سکے۔ خارجی اور داخلی دُنیا کو سیسہ بند دیواروں سے الگ الگ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ان متغزلین کے کلام کو دیکھئے۔ جو سب سے زیادہ قدامت پسند "اُستاد" ہیں ان پر بھی اِس انقلابی دور کا اثر موجود ہے۔ جس طرح ان کی شاعری سطحی ہے اسی طرح یہ اثر بھی محض لفظوں تک محدود ہے۔ یہ لوگ اپنے وقت کے ضمیر سے ناآگاہ ہیں۔ اس لئے ان کا ضمیر وقت کے اثرات سے آزاد ہے۔

آسی کو لیجئے۔ مانے ہوئے اُستاد ہیں۔ "میرے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک ہے" اور ان کی شاعری کا نہج یہ ہے کہ انھوں نے "شاعری کے مختلف مشاقوں اور مختلف اسکولوں کا اتباع کیا۔ ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں۔ بعدہٗ ..... حالی کے رنگ میں شعر کہے۔ ایک زمانہ میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا۔ ایک زمانے میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں ایک محاورہ نظم ہونا چاہیئے ..... کلام، غزل، نظم، قصیدہ ..... تمام اصناف سخن میں بہت کافی ہے" غرض چار دن اور چھاپے ہوئے ہیں۔

مگر دیکھئے، اصل انقلاب تو نہیں مگر "انقلاب زندہ باد" کا یہ نیا نعرہ اس طرح گلی گلی کوچے کوچے گونجا ہے کہ اس کہنہ مشق اُستاد کے اپنے انتخاب کردہ

اشعار کے چند صفحوں میں بھی "انقلاب" کا لفظ بار بار آیا ہے ؎

جب چمن میں کچھ انقلاب ہوا ـــــ اک نہ اک آشیاں خراب ہوا

مجھے احساس کم تھا ورنہ دو ہنڈ گلوں میں ـــــ مری ہر سانس کے ہمراہ مجھ میں انقلاب آیا

حیرت آبادِ وفا میں لاکھ آئے انقلاب ـــــ جو مرا دل تھا وہ اب آئینہ وارِ ناز ہے

ہو چکا تھا روشناس واقعات انقلاب ـــــ میں نے ہر آغاز کو سمجھا کہ انجام آگیا

ٹھہر گیا اسی مرکز پہ انقلاب آسی ـــــ شکست دل کی صدا بن کے رہ گیا ہوں میں

خدا جانے اب دل کہاں جا کے ٹھہرے ـــــ بڑے انقلابات سے ہو رہے ہیں !-

آسی سے عمر اور اُستادی کی شہرت میں کہیں بڑھکر میرزا ثاقب لکھنوی ہیں۔ یوں سے بہتر سال کی عمر ہے + اس لئے ان کے اشعار میں نئے فیشن کے رواجی لفظ نسبتاً کم ہیں + یہ "انقلاب" شاید ان کے انتخاب میں بھی دو تین بار آگیا ہے !-

لفظی اثرات پر زیادہ بحث بیکار ہے۔ اس دور کی اہم خصوصیت شعراء کی دروں بینی ہے۔ جس کی بڑی وجہ تلخ حقایق سے چشم پوشی اور جس کا ایک نتیجہ احساسات و جذبات کا خوردبینی تجزیہ ہے !۔ خودنگری کم اور خودبینی زیادہ !۔ شاعر نظر اُٹھا کر نہیں بلکہ نظر جھکا کر نافِ حیات پر نہیں بلکہ اپنی ناف پر ٹکٹکی جمائے رکھتا ہے !

اس تجزیاتی انداز کا ایک مظہر "سا"، اور "سی" کے الفاظ کا رواج ہے۔ گویا شاعر بار بار ایک کیفیت کو جانچ رہا ہے۔ تول رہا ہے + انداز ہ کرتا ہے اور چھوڑ دیتا ہے۔ پھر پرکھتا ہے اور مماثلت کو بھی مشابہت سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ جانتا ہے کہ ہر تجربہ، ہر کیفیت اپنے محل پر یکتا ہے۔ اس لئے تشبیہ تام کا استعمال اگر ناروا نہیں تو بے محل ضرور ہے اور یہ بھی نہیں تو اسے نا تسلی بخش کہنا بڑی حد تک جایز ہے۔ بہر صورت پوری طرح تسلی بخش نہیں + یہ "اگر مگر" یہ ڈگمگایا ہوا خیال، خودبینی اور بے یقینی، دورِ حاضر کی نمایاں خصوصیت ہے + حالاتِ زندگی ہی کچھ اس طرح کے ہیں۔ ہندوستان میں پرانا رئیسی نظام ٹوٹ رہا ہے۔ زراعتی زندگی ختم ہو رہی ہے۔ اور صنعتی دور کا آغاز ہے۔ سڑک پر بیل گاڑی اور موٹر کا تصادم اور اوپر ہوائی جہاز غرا رہے ہیں۔ اور خود یورپ کی سطوت خونریز جنگوں میں مبتلا ہے۔ طرابلس کی جنگ کے بعد بلقان کی لڑائی، اور پھر گزشتہ جنگِ عظیم۔ عالمگیر بدحالی کے بعد ابی سینیا کی تباہی، اسپین کی خانہ جنگی، چین، جاپان کی مسلسل پیکار اور اس پر موجودہ ہولناک جنگ، خود اپنے ملک میں خلافت اور کانگریس کی معرکہ آرائیاں، ہندو مسلم آویزش، سامراجیہ کی گرفت، بے کاری اور ایک انقلابی اشتراکی نظام کی ابتدا ـــ کوئی نظر جائے تو کس حالت پر ؟ ـــ

اس ایک "سا"، "سی" کے استعمال ہی سے اس ذہنی حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے[1] ـــ

ـــ[ان الفاظ کا فیشن اس قدر ہے کہ آسی "بڑے انقلابات" کے ساتھ بھی "سے" کو برت رہے ہیں] ـــ

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے سا اور سی پر بنیاد رکھ کر جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ممکن ہے فلسفیانہ ہو لیکن محققانہ اور شاعرانہ تو قطعاً نہیں ہے۔ ان لفظوں کا استعمال، چین و جاپان کی لڑائی، بلقان کی جنگ، اسپین کی خانہ برانداز شورش اور موٹروں اور طیاروں کے وجود سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس سے تو شاید ڈاکٹر صاحب کو بھی انکار نہ ہو گا کہ میر و درد کے عہد میں بھی ان الفاظ کا رواج تھا، درانحالیکہ اس وقت کسی انقلابی یا اشتراکی نظام کی تحریک نہ پائی جاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب اسے تذبذب اور حقایق کی طرف سے چشم پوشی کا نتیجہ بتاتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعرانہ اندازِ بیان میں اس سے زیادہ ایقان کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی، میر اگر کسی کی نیم باز آنکھوں میں "ساری مستی شراب کی سی" پاتا ہے تو اس کے معنے یہ نہیں کہ "شراب کی مستی" اس سے زیادہ ہے، بلکہ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ شراب میں اگر مستی ہو سکتی ہے تو اتنی ہی ! لفظ سی اور سا سے شاعروں نے کسی جگہ ایقان و اذعان کا کام لیا ہے جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا اور کبھی بیان میں "طیفی" اشاروں کی مدد سے حسن پیدا کرنے کا۔ اگر ڈاکٹر صاحب کو نقاشی سے کچھ لگاؤ ہے تو انھوں نے دیکھا ہو گا کہ ایک نقاش اپنے نقش میں کہیں کہیں ایسے ہلکے سائے بھی رکھ دیتا ہے، جو پس منظر اور نقش دونوں کو اُبھارنے میں مدد دیتے ہیں۔ شاعری میں سا اور سی بھی بالکل اسی قسم کی چیز ہے اور بعض اوقات لطیف جذبات کو لطیف انداز میں ظاہر کرنے کے لئے انکا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ڈاکٹر صاحب "لطفِ زبان" کے اس پہلو سے ناواقف ہیں، لیکن چونکہ وہ "حقایق" سے زیادہ گرویدہ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ ان "دقایق" کو پسند نہ فرماتے ہوں۔

نیاز

فانی، فراق اور ملا کو لیجئے۔ بی۔اے۔ ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تک پڑھے ہوئے ہیں ع " نہ مشرقی ہیں نہ مغربی ہیں عجیب سانچے میں ڈھل رہے ہیں "
فانی کی عمر تریسٹھ سال کی ہے۔ مگر اس کی یاسیت اور متذبذب خیالی اس کی اپنی زندگی اور حالات حاضرہ کے عین مطابق ہے ؎

درپیش ہے پھر مسئلۂ طاقتِ دیدار

(پہلا مصرعہ غالب کے طرز میں ہے) اور دوسرا مصرعہ ؎

پھر کچھ نگہِ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی

(داغ کے انداز میں ہے) داغ اور غالب کا یہ امتزاج ہمارے متغزلین کی عام روش ہے + دوسرا شعر ہے:-

اک عالم دل ہے یہی دنیا یہی فردوس — ہر شئے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

اور ع — دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

داغ نے بھی ایک اسی قسم کی غزل لکھی ہے۔ ع

آنکھوں میں کچھ ملال سا دل میں کچھ احتمال سا

مگر اس نے حسبِ عادت ظاہری احساسات پر اکتفا کیا ہے +

فراق کی عمر پینتالیس سال کی ہے + چند مصرعے ہیں ع

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

ع — تاروں کو نیند آئی ہوئی سی

ع — اک انگڑائی آئی ہوئی سی

ع — حُسن افسردہ سا تھا اور عشق کو حیرت نہ تھی

ع — بچی بچی سی وہ نظر ملی ملی سی وہ نظر

ع — آسمانوں کو بھی جیسے آرہی ہو نیند سی

آنند نرائن ملا کی عمر چالیس ہے + مدتوں انگریزی شعر کہتے رہے ہیں + کہتے ہیں ؎

تھا ہی کیا آنسو میں حرفِ التجا ہونے کے بعد — تا بہ دامن آئی اک بے رنگ سی پانی کی بوند

چند مصرعے ہیں ؎ آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی یادگار! — ع تفل سا اک زباں پہ تھا آنکھ میں کچھ نمی سی تھی +

گویا کھل کے رو بھی نہیں سکتے + قدم قدم پر رکاوٹ اور احتیاط ہے۔ داغ اور فانی کے یہاں یہ حالت معشوق کی ہے۔ اور فانی عشق سے بیزار کیونکہ اس کے نزدیک شاید عشق کا جذبہ ہی ایک یقینی حقیقت ہو سکتا ہے)۔ باقی سب کچھ واہمہ اور نیستی ہے۔ جو مشاہدات ہیں ان کو بے یقینی سے دیکھتا ہے + فراق نے معشوق سے گزر کر عاشق کو بھی شرم، احتیاط اور ضبط میں شریک کر لیا ہے۔ اور ملا نے عاشق کو معشوق بنا دیا ہے + یہاں تک کہ ؎

مجھے یہ ڈر کہیں کچھ کہہ نہ دے نظر میری — انھیں کل کر پیام نظر زباں پہ نہیں

یعنی معشوق تقاضائے بے باکی کر رہا ہے اور عاشق ڈر رہا ہے!۔ اور یہ کہ ع — وہ تو اُٹھا چکا نقاب ہم نہ نظر اُٹھا سکے +

لیکن جہاں ملا اندرونی جذبات کے متعلق اس قدر منفعل ہے وہاں حقائقِ حیات کے متعلق کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کرتا ہے + تلافی کے لئے اسوقت ملا کی نظمیں معرضِ بحث میں نہیں۔ اُن میں یہ اثبات زیادہ قوی ہے + مگر غزل میں بھی دیکھئے۔ کس طرح ڈانٹ کر کہتے ہیں ؎

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے — تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

جواب دہی کی بجائے جرح بازی (ملا وکیل بھی تو ہیں) شروع کر دی ہے!۔ اقبال کا انداز (... جہاں تیرا ہے یا میرا) بھی نہ وہاں بے باکی کا سبب عقیدت کا جوش ہے۔ اور یہاں بے اطمینانی اور انکار کے جھکولے!۔

ترى ہستى كے منكر ہوتے جاتے ہيں خدا والے	سنبھال اپنى خدائى كو ارے او آسماں والے !
يا يہى كہدے كہ راحت ترى قسمت ميں نہيں	يا جو دينا ہے تو دے آج قيامت ميں نہيں

(يہاں بھى لہجہ وہى "ارے او" كا ہے - گو مضمون خيامى ہے!) خدا سے گزر كر مذہب كے متعلق كہا ہے ؎

تجھے مذہب مٹانا ہى پڑے گا روئے ہستى سے	ترے ہاتھوں بہت توہينِ آدم ہوتى جاتى ہے[1]

اس روحانى الحاد كے پيشكار جوشؔ اور نيازؔ ہيں - اور ان شراروں كو كالجوں كى بے تعليمى ہوا دے رہى ہے! يقينى الحاد كے لئے مثبت تعليم[2] دركار ہے! —— اور يقينى اعتقاد[3] كے لئے بھى! —

آجكل نئے لوگ عموماً اسى قسم كے خيالات ركھتے ہيں + فرقہ وارى كا احياء تو محض اقتصادى اور سياسى حالات كى وجہ سے ہو رہا ہے ورنہ بقول اقبالؔ - ع

ہوسِ منزلِ ليلےٰ نہ تو دارى و نہ من ! — يہ "نا محكمى" اس زمانہ كى پيداوار ہے +

فراقؔ اور مجازؔ ابھى ناپختہ ہيں - مگر (شايد اسى لئے) وہ پختہ كاروں سے زيادہ نئى پود كے صحيح ترجمان ہيں - ان ميں ہضم و تحليل كم ہے - رائج تاثرات كو زيادہ شخصى مداخلت كے بغير اُگل ديتے ہيں +

نگارؔ كے اس گلدستے ميں چار پختہ كار شاعر ايسے ہيں جنھيں معاصرين ميں بوجوہ نماياں امتياز اور قبولِ عام و خاص حاصل ہے + حسرتؔ - جوشؔ، حفيظؔ اور جگرؔ ! — [ميرے نزديك اثرؔ كى مہذب غزل موجودہ دور ميں ايك بالكل الگ حيثيت ركھتى ہے - مگر اسے قبولِ عام حاصل نہيں - ہو بھى نہيں سكتا + اسكے جائزے كے لئے ايك مستقل مضمون دركار ہوگا-]

جوشؔ كى نظم اس كى غزل پر اس قدر حاوى ہو گئى ہے كہ اب اسے متغزلين ميں شمار كرنا شايد مناسب نہ ہوگا۔ جوشؔ كا شاعرانہ ارتقا ہمارے دور كے خيالات كى ايك مكمل تاريخ ہے! اس كا جائزہ يہاں بے محل ہوگا +

حفيظؔ كا سب سے بڑا معركہ اس كے گيت ہيں اور اس كى وہ نظميں جن ميں اس نے فنى تجربات كچھ ايسى سادگى اور يك نظرى سے كئے ہيں - كہ ہمارے نہايت ہى جديد شعرا بھى اس سے اثر پذير ہو رہے ہيں - ان ميں سے ايك لكھتا ہے كہ "حفيظؔ نے جو فنى تجربات بحر اور ہيئت كے لحاظ سے كئے ان كا اثر بڑھ كر نہ صرف مختلف نئى صورتوں ميں ظاہر ہوا بلكہ آزاد نظم كى حد تك جا پہونچا" + اور اب وہ عرصہ سے "شاہنامہ اسلام" لكھ رہا ہے! - مگر اس كى غزل اب تك زندہ ہے + اور اُردو ادب ميں ايك ممتاز حيثيت ركھتى ہے +

حفيظؔ كى غزل ميں سادگى اور خلوص تو ہے مگر انفراديت كم ہے - وہ واضح اور شخصى تجربات كا اظہار ضرور كرتا ہے - مگر اس كى واردات عام تجربات سے مختلف نہيں - مگر اس كى يہ عاميت عالمگير ہے اور اس كى سبك روى مترنم ہے! —

ہم ہى ميں تھى نہ كوئى بات ياد نہ تم كو آسكے	تم نے ہميں بھلا ديا ہم نہ تمھيں بھلا سكے
ہوش ميں آچكے تھے ہم جوش ميں آچكے تھے ہم	بزم كا رنگ ديكھ كر سر نہ مگر اُٹھا سكے
رونقِ بزم بن گئے لب پہ حكايتيں رہيں	دل ميں شكايتيں رہيں لب نہ مگر ہلا سكے
اہلِ زباں تو ہيں بہت كوئى نہيں ہے اہلِ دل	كون ترى طرح حفيظؔ درد كے گيت گا سكے

"ہوش ميں آچكے تھے ہم جوش ميں آچكے تھے ہم" + پے بہ پے ہم آہنگ الفاظ ہيں اور "لب پہ حكايتيں رہيں" + "دل ميں شكايتيں رہيں" نہ دولخت

---

[1] ات سے انكار كى يہ مثال صحيح ہے - اگر مذہب واقعى "حقايق حيات" ميں داخل ہے تو پھر كفر و اسلام كى تميز كيوں اور اگر مذہب سے مراد صرف اسلام ہے تو صرف اسكو كى وجہ؟ (نياز)

[2] — مثبت تعليم كيا؟ غالباً وہ تعليم جو ٹھوس حقيقتوں كے علم پر مبنى ہو - ليكن سوال يہ ہے كہ ٹھوس حقيقت كسے كہتے ہيں - مذہب كو يا انكارِ مذہب كو؟ يہ سكتى ہے كہ جب مذہب كى ابتدا ہوئى تو انسان كا كيا حال تھا اور جب اس نے مذہب سے انكار كيا تو اس كا ذہنى ارتقا كس قدر پختہ ہو چلا تھا - (نياز)

[3] اعتقاد نام ہے روايت پر يقين لانے كا اور يقين كا تعلق صرف درايت سے ہے، روايت سے نہيں - (نياز)

بھی ہیں اور پیوستہ بھی! مطلع کس قدر ہلکا پھلکا ہے اور نیازمندانہ خلوص سے لبریز! — محض لفظی الٹ پھیر نہیں + مقطع میں اپنے متعلق وہی کہا ہے جو میں نے کہنا چاہا ہے + ساری غزل میں ایک واردداتی کیفیت ہے اور ایک موضوع ذہنی سے خطاب! سہلِ ممتنع کلام ہے! —

حسرت کی جذباتی طبیعت پر حقایق وقت نے ایسا گہرا اثر کیا کہ وہ شدتِ احساس کی وجہ سے خاموش ہو کر رہ گیا۔ اس کی غزل اس کے ان تاثرات کے اظہار کی کفیل نہ ہو سکی اور نظم کے لئے اس میں مناسب تسلسل اور افکار کی یک جہتی نہ تھی۔ یہ اس کے غزلیہ خلوص کا ایک خارجی ثبوت ہے کہ اس نے شدت سے کہی ہوئی وارداتوں کو کھوکھلے الفاظ میں دہرانے سے انکار کر دیا ہے +

جگر خالص غزل گو ہے اور اسے اس پر ناز بھی ہے۔ جگر خود کہتا ہے کہ "حسن و عشق ہی میری زندگی ہے"۔ مولانا سلیمان ندوی "شعلۂ طور" کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ "جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں۔ وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں۔ اور یہ کہ جگر کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق ہے" +

جگر کی شاعری میں انفرادی واردات اور تجربات بہت کم ہیں۔ اس کا شاعرانہ معشوق نادیدہ ہے۔ اور جہاں کہیں معمولی واردات ہیں ان میں داغ کا سا عامیانہ پن ہے اور وہ جو "رئیس زادہ ہے داغ آپ کا غلام نہیں" میں "عشق کو ذلیل و رسوا صورت میں" پیش کرنے سے انحراف ہے وہ جگر میں بھی ہے۔ مگر جگر نے داغ کی طرح حسن کو "رسوا" نہیں کیا + حسن و عشق کے تعلقات کو فطرتی سطح پر رکھا ہے — مگر جگر کا عشق عموماً عشقبازی ہو کر رہ جاتا ہے +

اُف یہ تیغ آزمائیاں توبہ — تیری نازک کلائیاں توبہ
آستینوں کا وہ چڑھا لینا — گوری گوری کلائیاں توبہ
نظروں نظروں میں سرگزشتِ فراق — دونوں جانب دہائیاں توبہ
پھر وہی چشم مست و جام بدست — پھر وہی نغمہ زائیاں توبہ

بقولِ جگر یہ غزل ان کی "زندگی معاشقہ کے ایک اہم واقعہ سے متعلق ہے"۔ مگر اس واردات میں وہ داغ سے آگے نہیں بڑھ سکے "آہ"، "توبہ"، "اُف" قسم کے الفاظ سے شخصی احساس کی شدت ظاہر ہوتی ہو تو ہو۔ شاعرانہ احساس کا خلوص ثابت نہیں ہوتا۔ اور محض شدتِ احساس کسی ذاتی یا شاعرانہ تجربہ کو عمیق نہیں بنا سکتی + لیکن اس قسم کے اشعار بھی اس کے ہاں بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی واردات کی سطحیت عموماً نظر انداز کی جاتی ہے اور اس کے "نادیدہ" معشوق ہی کو دیدنی قرار دیا جاتا ہے + اور نیک پاک لوگ داغ کو "بازاری" مگر جگر کو روحانیت کا آرزومند گردانتے ہیں + تو پھر جگر کی غزل کی اس قدر دھوم کیوں ہے؟ — اس کی بڑی وجہ جگر کی "مستی" ہے۔ ذاتی مستی اور شاعرانہ مستی! — جگر کہتا ہے "میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے"۔ اور جگر کی زندگی جہاں رند مشرب لوگوں کے لئے مدافعت کا ذریعہ ہے وہاں آرزو کشتہ محروموں کو تمثیلی لذت کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ نوجوان اسے "بغاوت" سمجھتے ہیں اور بے مزہ زندگی گزارنے والے اسے "رومان" تصور کرتے ہیں! — غرض جگر ایک جیتا جاگتا فسانہ بن کر رہ گیا ہے۔ اور ناکردہ کار لوگ اس کی رندانہ زندگی میں معقول طریقے سے شریک ہو کر اپنے جھوٹتے ہیں! اور اس کے پرستار اس کی موجودہ "خشک" زندگی کو "شاعرانہ توبہ" کہکر دل کو تسلی دے لیتے ہیں! اس کی شاعرانہ مستی کی بنیادی وجہ بھی وہی عشقیہ تجربات کی کمی ہے۔ اسے عشق کی تلاش ہے اور وہ اپنی محرومی سے کبھی کبھی کراہتا بھی ہے — "آپ میرے کلام میں.... بہت ہی نازک سی موجِ درد ضرور محسوس کریں گے"۔ مگر یہی محرومی اسے "خوگرِ جمال" نہیں ہونے دیتی اور اس کی مستی کو افسردگی سے بچا لیتی ہے + اس طرح اس کے کلام میں ایک قسم کی تندی پائی جاتی ہے۔ اور ایک قسم کی منفی طہارت بھی! یہ مستی کامرانی یا کامرانی کی امید کی مستی نہیں + نشاط انگیز مستی نہیں، اندوہ ربا نشہ ہے +

جگر کے معرکے کے اشعار عموماً عشق کے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے عشقیہ واردات کا تجزیہ کرتا رہتا ہے + اس نے ایک طرح کا فلسفۂ عشق وضع کر لیا ہے جو مضمحل مزاجوں کے لئے فلسفۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی کے حقایق کے متعلق کسی قسم کی تلخ تبدیلی کئے بغیر خوش اوقات لوگ ذاتی جذبات کی آغوش میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اور اپنی پرانی اقدار پر نہ فقط قانع رہتے ہیں بلکہ ان شخصی عشقیہ اقدار کو نئی اقدار سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں + اس نے حقائق حیات کی مختلف اقدار کو جانچنے کی بجائے حقائق ہی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ حقایق غیر حقیقی ہیں۔ اصلی حقایق تو محض شخصی جذبات کی اُچھل کود ہے! — اور یہ اُچھل کود اصلِ حیات ہے! —

زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہے عشق — موت ہے موت اگر رقص نہیں جوشش نہیں

ساری غزل دیکھئے۔ حُسن وعشق کے متعلق کلئے مرتب کئے گئے ہیں۔ دونوں کو آمنے سامنے نہیں کیا۔ کوئی تجربہ بیان نہیں کیا ؎

حُسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حُسن — کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں
عشق اگر حسن کے جلووں کا ہے مرہونِ کرم — حُسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

کہیں اپنا اندازہ کیا ہے۔ ہوش کو بے ہوشی قرار دیا ہے ؎

رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انھیں ہوش نہیں — میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں
کون سا جلوہ یہاں آتے ہی بے ہوش نہیں — دل مرا دل ہے کوئی ساغرِ سرجوش نہیں
اپنے ہی حُسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں — میرے آغوش کو اب حسرتِ آغوش نہیں

اور تجربات کی بجائے ان کی یادیں ہیں ؎

کبھی ان مدبھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام — آج تک ہوش نہیں ہوش نہیں ہوش نہیں!
مٹ چکے ذہن سے سب یادِ گزشتہ کے نقوش — پھر بھی اک چیز ہے ایسی کہ فراموش نہیں
مل کے اک بار گیا ہے کوئی جس دن سے جگر — مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

یا تجربات کی تلاش ؎

پاؤں اُٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف — مجھ کو یہ وہم ہے جیسے مرا آغوش نہیں

غرض غزلوں کی غزلیں اسی طرح کی ہیں — واردات کم، تاثرات اور انتقادات زیادہ! — چونکہ یہ انتقاد جذبات کے متعلق ہے اس لئے اس میں تجردخیالی کی برودت نہیں آتی۔ اور سننے والے کو ایک قسم کا احساسِ برتری ہوتا ہے۔ جیسے وہ بلندی سے ایک طوفان کا نظارہ کررہا ہو +

جگر کی مقبولیت کی ایک اور وجہ اس کا ترنم ہے۔ وہ بار بار چلبلی بحروں میں لکھتا ہے اور مضامین رقص وسرود کے ساتھ، رقص وسرود کا آہنگ بھی قائم کردیتا ہے اس سات ساڑھے سات صفحے کے انتخاب میں کوئی ڈیڑھ پونے دو سو اشعار ہوں گے + ان میں سے پچیس فیصدی، ایک چوتھائی کے قریب اشعار دو تین بحروں میں ہوں گے + بیشتر غزلوں میں متفاعلن۔ مفاعلن اور فعولن کے ارکان، یعنی متوالی حرکات کے الفاظ ہیں۔ چودہ پندرہ اشعار تو۔ فعولن فعولن فعولن فعولن ہی کے وزن پر ہیں!

ع جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں + ع وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے + ع ذرا پھر تو ارشاد فرمایئے گا + ع وہ کچھ اور ہے مہربانی نہیں ہے +
ع ٹھہرنے جو دے اضطرابِ محبت + ع کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں + ع زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا +

اس کی لغت (لفظوں کے انتخاب) میں بھی وہی پیچ بچاؤ ہے جو اس کی شاعری میں ہے۔ جس طرح وہ عام واردات سے جی بچاکر تنقیدِ عشق کرتا ہے۔ اسی طرح وہ الفاظ میں بھی بازار اور مکتب کا فرق ملحوظ رکھتا ہے۔ مگر دورِ حاضر کے عام شعراء کا یہی اندازِ گفتگو ہے۔ جگر نے کوئی نیا اسلوبِ بیان نہیں نکالا!۔

جگر درحقیقت "کالج والوں" کا شاعر ہے۔ کہ جنھیں آزادی سے زیادہ آزاد مغربی کی حسرت ہے!۔ مگر یہ جگر کا قصور نہیں + جگر کے مشرب میں ریاکاری و پندار نہیں" + ہاں اس کے بہت سے پرستار اپنی ریاکاری کو اس کی شاعری میں چھپا کر ناکردہ گناہوں کی حسرت نکالتے ہیں +

جگر کا ممتاز وصف یہ ہے کہ اس نے اُردو غزل میں ایک ہمہ گیر رندانہ فضا پیدا کردی ہے + مٹھی میں لیجئے تو یہ سمندر کی جھاگ ہے۔ اور جو نظارہ بازی پر اکتفا کیجئے تو یہ ایک طلسماتی غبارہ ہے۔ جو لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتا رہتا ہے!

ع نشہ بشادابیِ رنگ وسازہا مستِ طرب!

[جگر کا قابلِ توجہ کلام وہ چند غزلیں ہیں جو اس کے دیوان کی اشاعت کے بعد مختلف رسایل میں شائع ہوئی ہیں + اور یہ پرکیف غزلیں اُردو غزل میں ایک واضح حیثیت رکھتی ہیں۔ شعلۂ طور بڑی حد تک مایوس کن ہے۔ اور اس میں "بھرتی" کی کثرت ہے!]—

(نگار) ڈاکٹر تاثیر نے علیحدہ علیحدہ ہر شاعر پر رائے زنی نہیں کی اور شاید اس لئے کہ ان میں سے اکثر ان کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ انھوں نے صرف چار

نگار

ایک غلطی کی تصحیح

پچھلے پرچہ میں صفحہ ۷۶، سطر ۱۲ پر آرزو صاحب کا شعر غلط نقل ہو گیا۔
اس کی جگہ یہ شعر ہونا چاہئے تھا:۔

بے سہاروں کا سہارا کچھ نہ پوچھ　　سوتے ہیں ہاتھ اک سرہانے دھر کے ہم

چندہ کی صراحت

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بوجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۴۱	فہرست مضامین مارچ ۱۹۴۲ء	شمار ۳

ملاحظات		۱	مکتوبات نیاز	۱۲
تخئیل و محاکاۃ	معجز سہسوانی	۵	وقت کی باتیں	۲۰
محمودی رسم خط	محمود علی خاں بی اے	۸	معلومات عامہ	۲۹
شادی کی رسمیں اور اُنکی عمرانی اہمیت	خواجہ احمد فاروقی بی اے	۱۴	باب الاستفسار	۳۱
اب سے ساٹھ سال بعد		۱۷	مطبوعات موصولہ	۳۳
پٹرول اور موجودہ تمدن	صدر الدین عظیم	۱۹	منظومات — مرزا جعفر علی خاں اثر، پروفیسر شور، پروفیسر فراق، تمکین سرمست	۳۶

ملاحظات

واقعۂ قرطاس

~~اس سے اعمقہ ہیں جو اس وقت ملک کی روشنیوں کے صلاح باعث نزاع بنا ہوا ہے~~، بلکہ موجودہ جنگ میں کاغذ کی گرانی اور نایابی نازک صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔

غالباً کم حضرات کو معلوم ہوگا کہ وہ کاغذ جو اکثر و بیشتر اخبارات و رسایل میں استعمال ہوتا ہے اُسے "نیوز پرنٹ" (News Print) کہتے ہیں اور یہ کاغذ پہلے ناروے سے آتا تھا۔ جب جرمنی نے ناروے پر قبضہ کر لیا تو یہ کاغذ کناڈا سے آنے لگا مگر اس کی قیمت بہت بڑھ گئی اور ملنا بھی دشوار ہو گیا۔

ان حالات کے زیر اثر ہندوستان کے اخبار نویسوں نے مرکزی حکومت کو متوجہ کیا اور بڑی مشکل سے یہ طے پایا کہ حکومت، کاغذ کا راشن مقرر کر کے لائسنس جاری کرے اور اس لائسنس کے ذریعہ سے اخبارات کاغذ حاصل کریں۔ اسی کے ساتھ ہندوستان میں چار پانچ کاغذ فروش کمپنیاں بھی نامزد کر دی گئیں تاکہ وہ اخبارات و رسایل جو براہ راست کناڈا سے کاغذ حاصل نہیں کر سکتے ان کمپنیوں کو اپنی طرف سے نامزد کر دیں اور یہ کاغذ فراہم کریں۔

یہ انتظام بظاہر بہت مناسب معلوم ہوتا ہے، لیکن اس پر عملدرآمد ہونے میں اتنی دیر ہوئی اور دفتری کارروائیوں نے اتنا وقت لے لیا کہ بہت سے اخبارات و رسایل ابتک اس سے فایدہ نہیں اُٹھا سکے اور اُن شکایتوں کی وجہ سے جو کاغذ فروشوں کی طرف سے پیدا ہو رہی ہیں، شاید آیندہ بھی کوئی فایدہ نہ حاصل ہو سکے گا۔ بہرحال جب صورت یہ پیدا ہو گئی تو نگار کے لئے بھی حصول کاغذ کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا اور باوجود اس کے کہ انتہائی کمی کے بعد صرف ۲۵ رم ماہوار کاغذ طلب کیا گیا، حکومت نے صرف ۲۰ رم ماہوار کا لائسنس جاری کیا ہر چند ماہوار پانچ رم کی کمی بھی کم نہ تھی، لیکن حالات کو دیکھ کر اسی کو غنیمت سمجھا گیا اور جس کمپنی کو ہم نے نامزد کیا تھا اس سے راشن کے مطابق کاغذ طلب کیا گیا، لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی

جب اس نے کہا کہ وہ آیندہ جون تک دس رم ماہوار سے زیادہ کاغذ نہیں دے سکتی اور جون کے بعد کے لئے وہ کوئی وعدہ نہیں کر سکتی کیونکہ کناڈا سے کاغذ پہونچتے رہنے کا کوئی یقین نہیں ہے ظاہر ہے کہ دس ریم ماہوار کسی طرح ہمارے لئے کافی نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ اس برے وقت کے خیال سے ہم نے لڑائی شروع ہوتے ہی کئی سو ریم کاغذ اسٹاک کر لیا تھا، جس میں سے اب بھی کچھ محفوظ ہے، اس لئے اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی تھیں، ایک یہ کہ نگار میں کوئی اور دبیز، چکنا کاغذ لگایا جائے یا پھر دس رم ماہوار کے راشن اور اُس اسٹاک کو سامنے رکھ کر جو ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے حجم کم کر دیا جائے۔ صورت اول پر عمل کرنے کے معنی یہ تھے کہ دو سو روپیہ ماہوار کا زاید خرچ برداشت کیا جاتا اور یہ ممکن نہ تھا۔ اس لئے دوسری صورت اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ نگار کا حجم نصف کر دیا گیا اور جب تک کاغذ راشن کے مطابق ہم کو نہ ملے گا، یہی حجم رہے گا

اس صورت میں قدرتاً آپ کو یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ جب حجم کم ہوا ہے تو رسالہ کی قیمت میں بھی کمی ہونا چاہئے، لیکن آپ کا یہ خیال کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ نگار کا مسطر اتنا گنجان اور خط اس قدر باریک کر دیا گیا ہے کہ ۴۰ صفحات میں پورے ۸۰ صفحات کا مواد آپ کو ملے گا اور اس طرح جہاں تک مضامین کا تعلق ہے نگار کا حجم وہی ۸۰ صفحات کا باقی رہا جو لڑائی سے پہلے تھا اور آپ کو پانچ روپیہ سالانہ میں مطالعہ کا اتنا ہی سامان بہم پہونچا جو پہلے ملتا تھا

امید ہے کہ قارئین نگار ہماری ان دشواریوں کا خیال کر کے اس عارضی انتظام کو گوارا فرمائیں گے اور موجودہ مسطر کی باریک و گنجان تحریر کے پڑھنے میں انھیں جو دقت ہوگی، اُسے ہماری مجبوریوں کا لحاظ کر کے کسی نہ کسی طرح گوارا کر لیں اور برداشت کر لیں گے

سنگاپور کے بعد؟

موجودہ جنگ میں اس وقت تک تین نقصانات اتنے بڑے ہوئے ہیں کہ ان کی تلافی آسان نہیں۔ ایک، پچھلے اگست میں جرمن حملہ روکنے کے لئے روس کا دریائے ڈنیپر کے بند کو توڑ دینا، دوسرے سنگاپور کا برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جانا اور تیسرے جاپانی قبضہ سے پہلے ہی پلمبانگ کے ذخایر پٹرول میں آگ لگا دینا۔ ان نقصانات کا اندازہ روپیہ آنہ پائی میں کیا جائے یا سیاسی حیثیت سے دونوں طرح ان کی اہمیت بڑی زبردست ہے۔ دریائے ڈنیپر کا بند طیار کرنے میں روس نے اتنی دولت، اتنی محنت اور اتنا وقت صرف کیا تھا کہ اگر ہم ان کی مجموعی قیمت کا اندازہ لگائیں تو اس سے شاید کئی سلطنتیں خریدی جا سکتی ہیں، اسی طرح سنگاپور کی قلعہ بندیوں میں جتنا روپیہ اور جتنی ذہانت برطانیہ نے صرف کی تھی وہ بھی تمام برطانوی مستعمرات کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی اور پلمبانگ میں جتنا پٹرول ضایع کیا گیا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آج تک شاید ہی کسی حکومت نے اتنی بڑی دولت کو اپنے ہاتھ سے برباد کیا ہو جتنا ڈچ حکومت نے

اب دوسری حیثیت سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دریائے ڈنیپر کا بند ٹوٹنے کے بعد روس کا خوشگوار اقتصادی و زرعی مستقبل کم از کم ۲۵ سال زیادہ دور ہوگیا، پلمبانگ کے ذخایر پٹرول ضایع ہو جانے سے بحر پاسفک میں اتحادیوں کی بحری قوت کا ایک بڑا چشمۂ حیات خشک ہوگیا اور سنگاپور کے سقوط نے مشرق بعید کی جنگ میں سخت خطرناک پیچیدگیاں پیدا کر دیں

اس میں شک نہیں کہ ملایا پر جاپانی قبضہ ہو جانے سے سنگاپور کی مدافعانہ اور جارحانہ دونوں حیثیتیں بہت گر گئی تھیں اور اگر جاپانی فوجیں وہاں داخل نہ ہوتیں تو بھی برطانیہ اب اس بحری مرکز سے کوئی فایدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ تاہم یہ واقعہ لڑائی کے مستقبل پر غیر معمولی اثر ڈالنے والا ہے اور اس لئے اب سنگاپور اور ملایا کی ناکامی پر واویلا مچانے کی جگہ ہمیں جنگ کے مستقبل پر غور کرنا چاہئے۔ جو خطرہ آنے والا تھا وہ آچکا، لیکن جو آیندہ آنے والے ہیں وہ ابھی نہیں آئے ہیں اور انھیں کے مقابلہ کی فکر ہم کو کرنا چاہئے

سنگاپور کے سقوط کے بعد قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جاپان اب کیا کرے گا۔ اس سلسلہ میں ہمارے سامنے سب سے پہلے ہندوستان کا سوال آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ برما میں اس کا اقدام جاری ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو چین اور ہندوستان کے درمیان جو سلسلۂ اتحاد قایم ہے اس کو کافی صدمہ پہونچے گا، لیکن حملۂ ہندوستان کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے حملہ و دفاع کے اُن دونوں پہلوؤں کو سمجھ لینا ضروری ہے، جن کا تعلق سنگاپور سے تھا

سب سے پہلے حملہ کے پہلو کو لیجئے کیونکہ سنگاپور معہ اپنے بحری اڈے کے (تنہا جزیرۂ سنگاپور یا اس کی قلعہ بندیاں نہیں) جاپان پر حملہ کرنے کے لئے بہ نسبت دفاعی کام لینے کے بہت زیادہ اہم مقام تھا۔ غربی جنوبی پاسفک میں جاپان کے حملوں کی بنیاد اس کی بحری طاقت پر قایم ہے اور جب تک پاسفک کے اس حصہ میں اس کی بحری قوت زبردست ہے وہ ہر مقام پر جہاں حملہ کرنا چاہے اپنی فوجیں اور سامان جنگ بہ آسانی پہونچا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جاپان کے اس بحری تفوق کو کمزور کرنے کی صرف ایک یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اتحادی اُس سے زیادہ بحری بیڑوں سے کام لیں۔ لیکن بحری بیڑوں سے کام لینا منحصر ہے اس بات پر کہ اُن کے قیام ان کی مرمت اور ایندھن کی فراہمی کا معقول انتظام ہو اور مشرق میں سنگاپور ہی ایسا بحری اڈا تھا جہاں ایک درجۂ اول کے بیڑے کو یہ تمام آسانیاں حاصل ہو سکتی تھیں

پھر چونکہ سنگاپور ہاتھ سے نکل گیا ہے اس لئے اتحادیوں کو مجبوراً چھوٹے چھوٹے اور دور دور واقع ہونے والے اڈوں سے کام لینا پڑے گا اور اس کا اثر اتحادیوں کی جارحانہ

کارروائیوں پر پڑنا یقینی ہے۔ اگر سنگاپور ہاتھ سے نہ جاتا تو یہاں سے جاپان کی بحری نقل و حرکت کو آسانی سے روکا جاسکتا تھا، لیکن اب حملہ کے لئے اسوقت کا انتظار کرنا پڑیگا، جب کوئی دوسرا موزوں بحری اڈا ہاتھ آجائے اور اسی لئے ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ سنگاپور کے نکل جانے نے لڑائی کو زیادہ طویل کردیا ہے

اب آپ دفاعی پہلو کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ سنگاپور، برطانیہ کا سب سے پہلا خط دفاع تھا اور اس کے نہ رہنے سے برما، آسٹریلیا، لنکا اور ہندوستان سب کی پوزیشن خطرہ سے قریب ہوگئی ہے، لیکن زیادہ مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ آیئے، اس وقت ہندوستان ہی کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ اگر جاپان نے اس پر حملہ کردیا تو ہم اپنا دفاع کیونکر کریں گے

ہندوستان پر جاپانی حملہ کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، یا تو وہ خشکی سے براہ برما حملہ کرے یا براہ ملایا جہازوں کے ذریعہ سے خلیج بنگال تک پہونچے ۔۔۔ پہلے بحری حملہ کو لیجئے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے بڑی زبردست فوج درکار ہوگی اور اس فوج کی نقل و حرکت اور اس کے لئے رسد و سامان جنگ پہونچانے کے لئے جاپان کو اپنے بہت سے جہازوں سے کام لینا پڑے گا اور اس کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ سنگاپور کی مرمت کرکے اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ بحری بیڑوں کا محفوظ اڈا بن سکے اور دوسرے یہ کہ جاپان اپنے بڑے بڑے جہاز دوسرے مقامات سے ہٹاکر اس طرف لاسکے۔ اور یہ دونوں باتیں آسان نہیں۔ سنگاپور کی مسماریاں ایسی معمولی نہیں ہیں کہ انھیں اس قدر جلد درست کیا جاسکے۔ اگر جاپان نے بہت عجلت سے کام لیا تو بھی درجۂ اول کا بحری اڈا بنانے کے لئے مہینوں درکار ہوں گے، رہا بڑے بڑے جہازوں کو دوسرے مقامات سے ہٹاکر ہندوستان کی طرف لانا، سو یہ بھی اس وقت تک آسان نہیں جب تک امریکہ کا بیڑا پاسفک میں موجود ہے۔ لیکن اگر ان دونوں باتوں کو نظر انداز کردیا جائے تو بھی اتحادیوں کی موجودہ دفاعی پوزیشن بری نہیں ہے۔ کیونکہ جاوا اور سماترا پر ابھی تک جاپانی قبضہ نہیں ہوا اور جب تک یہ اتحادیوں کے پاس ہیں، آبنائے ملاکا سے جاپانی جہازوں کا گزر کر ہندوستان، برما یا لنکا پہونچنا آسان نہیں۔ ہر چند ان جزیروں میں اتحادیوں کی اتنی فوج نہیں ہے کہ وہ جاپان کی ٹیڑی دل فوج کا مقابلہ کرسکے، لیکن وہ اس کی راہ میں حایل ہوکر اتحادیوں کو وقت سے فایدہ اٹھانے کا موقعہ ضرور دیسکتی ہیں

اسی کے ساتھ یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ بحر ہند اور خلیج بنگال میں بھی برطانیہ کی بحری قوت اتنی موجود ہے کہ وہ یہاں جاپانی جہازوں کی نقل و حرکت کو روک سکتی ہے۔ اسلئے ہندوستان پر کسی زبردست باقاعدہ بحری حملہ کا امکان اس وقت بہت ضعیف ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اس کی آبدوز کشتیاں اور اس کے ہوائی جہاز ہندوستان کے آس پاس نہ آسکیں گے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ سلسلۂ رسل و رسایل منقطع کرنے، لوگوں میں بے چینی پھیلانے اور برطانوی بیڑوں کو کسی دوسری طرف توجہ کرنے سے روکنے کے لئے وہ ہندوستان کے بعض ساحلی مقامات مثلاً کلکتہ و مدراس وغیرہ پر بمباری کی کوشش کرے گا، کیونکہ اگر اس کے طیارہ بردار جہاز بحر ہند یا خلیج بنگال میں نہ آسکے، تو بھی اس نوع کے حملوں کو کسی طرح نہیں روکا جاسکتا خواہ بحری قوت کسی کی کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو

کسی ملک پر حملہ ہونے کی صورت میں، سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود اس ملک کے ذرایع کیا اور کتنے ہیں اور دوسرے یہ کہ اسے باہر سے کمک پہونچ سکتی ہے یا نہیں۔ اور ان دونوں باتوں کو دیکھتے ہوئے ہندوستان کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اول تو وہ خود اتنا بڑا ملک ہے کہ جاپان کے مقابلہ میں، چین سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر ضرور عسکری قوت فراہم کرسکتا ہے اور بیرونی کمک کے متعلق بھی اسے پورا اطمینان ہے کیونکہ برطانیہ اور امریکہ بحر روم کی طرف سے ہر طرح کی مدد فراہم کرسکتے ہیں اور جاپان ان کی راہ میں حایل نہیں ہوسکتا

اس میں شک نہیں کہ بحر پاسفک میں جاپان نے ۷ دسمبر سے اسوقت تک غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ان کامیابیوں پر جنگ کا فیصلہ ہونا ممکن نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ وہ عرصہ سے بحر پاسفک میں جنگ کی طیاریاں کررہا تھا اور اتحادیوں کی طیاریاں اس کے مقابلہ میں بہت کم تھیں۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جسوقت امریکہ اور برطانیہ نے اپنی طیاریاں پوری کرنے کے بعد بحر پاسفک میں اس کو چیلنج دیا تو مقابلہ آسان نہ ہوگا

یہ درست ہے کہ سنگاپور کے واقعہ نے وقت کے سوال کو اتحادیوں کے لئے اور زیادہ اہم بنا دیا ہے اور اس لئے ہم کو اگر کوئی نقصان پہونچا ہے تو صرف اتنا کہ نتیجہ کا انتظار ہم کو زیادہ عرصہ تک کرنا پڑے گا اور انتظار کی گھڑیاں سخت ہوتی ہی ہیں۔

روس کا محاذ جنگ

جاڑوں کے آغاز میں روس کے محاذ پر جو تبدیلی پیدا ہوئی تھی، اس کا سلسلہ برابر جاری ہے اور جرمن فوجیں برابر پیچھے ہٹتی جارہی ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ تغیر صرف اس وجہ سے پیدا ہوا کہ روس اپنی طیاریاں مکمل کرچکا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ شدید برفباری اس کا سبب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ روس نے جس پامردی کے ساتھ جرمن فوجوں کا مقابلہ کیا اور جس ہمت و ولولہ کے ساتھ اس نے اپنی طیاریاں جاری رکھیں، اس سے یہ تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ باوصف ناکامیوں کے وہ اپنے ذرایع اتحادیوں کے ذرایع سے پوری طرح فایدہ اٹھانے کا اہل ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دہاں کے محاذ جنگ پر دفعتاً اتنی تبدیلی

پیدا کردینے میں شدید سردی اور برفباری بھی بڑی حد تک شامل تھی اور اب کہ سردیاں ختم ہو رہی ہیں، اس میں تغیر ضرور رونما ہوگا، جیساکہ ہٹلر کی تازہ ترین تقریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

سردیوں سے پہلے جرمن فوجیں، اوکرائن، سفید روس اور کریمیا کے علاقہ پر قابض ہوکر ایک طرف بحر آزوف تک پہونچ گئی تھیں اور دوسری طرف ماسکو اور لینن گراڈ کی دیواروں تک اُن کی توپوں کی آواز پہونچنے لگی تھی، لیکن سردیوں کے آغاز کے بعد ہی جرمن اقدام کمزور ہوگیا اور روس نے جارحانہ کارروائی شروع کردی

اس وقت تک روس کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہ اس لحاظ سے ضرور قابل ذکر ہے کہ اس نے جرمن سیلاب کو روک کر شدید خطروں سے نجات حاصل کرلی ہے لیکن نازسی جماعت کے قدموں سے ابھی تک وہ اپنی زمین کو پاک نہیں کرسکا

اوکرائن، کریمیا اور سفید روس کے علاقہ میں جتنے اہم مقامات پر جرمن قبضہ ہوچکا تھا، وہ ابتک بدستور قایم ہے اور ماسکو کی طرف اسمولنسک بھی ابھی تک روسیوں کے ہاتھ نہیں آیا۔ اسی طرح لینن گراڈ کا محاصرہ بھی بدستور قایم ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جرمنی موسم بہار کے حملہ کے لئے تازہ فوجیں فراہم کر رہا ہے، بلکہ ان میں سے بعض فوجیں روس کے مقابلہ پر بھیجی بھی جارہی ہیں، اس لئے یہ امید رکھنا کہ آیندہ بھی روس کا نقشۂ جنگ یہی رہے گا، صحیح نہیں۔ چند روز میں دیکھ... جرمنی کا حملہ روس پر پھر شروع ہوگا اور دنیا کی توجہ بیک وقت مشرق و مغرب دونوں طرف مبذول ہوجائے گی

ہرچند جرمنی کو اب وہ آسانیاں حاصل نہ ہوں گی جو اس سے پہلے حاصل تھیں، کیونکہ روس کو جاڑوں میں اپنی طیاریاں مکمل کرنے کا بھی موقعہ ملگیا ہے اور اسوقت تک اُسے جرمن فوجوں کی لڑائی کا تجربہ بھی ہوچکا ہے، تاہم نازسی خطرہ سے روس کو نجات فی الحال ممکن نہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ سرما تک کوئی تازہ پیچیدگی جنگ کے نقشہ میں کوئی اہم تبدیلی پیدا نہ کردے گی

مغرب میں بحر اٹلانٹک، بحر روم، افریقہ، جبرالٹر، انگلش چینل اور مشرق میں ہندوستان، آسٹریلیا سب کے سب خطرہ میں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ روس کے محاذ کے علاوہ کسی اور تازہ محاذ پر بھی جنگ شروع ہوجائے

افریقہ میں اب بھی لڑائی جاری ہے اور پلہ جرمنی کی طرف کا بھاری ہے، اس لئے برطانیہ ادھر سے اپنی توجہ نہیں ہٹا سکتا۔ اسی طرح انگلش چینل پر جو تازہ حملہ جرمنی نے کیا تھا، وہ بھی اس کا مقتضی ہے کہ سواحل انگلستان کو اور زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ بحر اٹلانٹک سے جرمنی کے تین جہازوں کا بھاگ کر محفوظ نکل آنا ایسا معمولی واقعہ نہیں کہ اس سمندر کی طرف سے اتحادی غافل ہوجائیں، اور سنگاپور پر جاپانی قبضہ ہوجانے کی وجہ سے ہندوستان اور آسٹریلیا کی طرف سے جو خطرے پیدا ہوگئے ہیں وہ بھی پوشیدہ نہیں، اس لئے ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ اتحادی اپنی ساری توجہ صرف روس کی طرف مبذول کرسکیں گے اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے، ہم روسی محاذ کے متعلق بہت زیادہ امیدیں قایم نہیں کرسکتے۔ البتہ اگر امریکہ کی طیاریاں اس حد تک مکمل ہوگئیں کہ وہ اٹلانٹک اور پاسفک میں اپنے بحری بیڑے کافی تعداد میں پہونچا سکا، تو برطانیہ کی بحری قوت پر جو غیر معمولی دباؤ اسوقت پڑ رہا ہے، وہ یقیناً ہلکا ہوجائے گا اور اُس وقت حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا ہوسکے گی

تخئیل و محاکاۃ

فن شعر و شاعری پر اُردو زبان میں آج تک جو کتابیں یا دیوانوں کے مقدمے اور تبصرے لکھے گئے ہیں ان سب میں تخئیل و محاکاۃ کی بحث اور تعریف مخصوص الفاظ اور خاص عبارتوں میں بیان کی گئی ہے۔ نیز ادبی و علمی رسایل و اخبارات میں کبھی کبھی اس کے متعلق مضامین نظر سے گزرے ہیں مصنفین کتب اور مضمون نگار اہل قلم نے جہاں شاعری کے مبحث پر قلم اُٹھایا ہے اور شعر کی تعریف کی ہے وہاں تخئیل و محاکاۃ کا بیان بھی ان کو لازمی طور پر کرنا پڑا ہے۔ غالباً اُردو میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ بسط و تفصیل کے ساتھ اس بحث کو مولانا شبلی علیہ الرحمۃ نے شعر العجم کی چوتھی جلد میں لکھا ہے اس کے بعد صناد یدعجم اور شعر الہند وغیرہ میں شعر العجم کی تحقیق کو چراغ راہ بنا کر اسی کی روشنی میں اشعار پر نقد و انتقاد کیا ہے اور اس تقلید جامد کا سر رشتہ کہیں ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اگر کچھ بھی تحقیق سے کام لیا جاتا تو شعر العجم کے غلط مبحث کی گتھیاں سلجھ جانے کی امید ہو سکتی تھی۔

مولانا شبلی مرحوم سیر و تاریخ و ادب میں قابل قدر تصنیفات کے مالک تھے ان کے طرز تحریر کا حُسن ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں شعر العجم ان کے مذاق سلیم کا دلچسپ کارنامہ ہے اہل ذوق نے اس سے فوائد حاصل کئے ہیں لیکن مولانا نے تخئیل و محاکات کے مبحث کو ایک عقدۂ لانیحل بنا دیا ہے کہیں ان کو شعر کے اجزا بتاتے ہیں اور کہیں اُن کو شعر کی دو صنفیں ثابت کرتے ہیں اور کہیں تخئیل کو عیوب شعر میں شمار کرتے ہیں اور پھر ان کے مواقع استعمال جُدا جُدا بتاتے ہیں۔ شعر الہند میں شعرا کے کلام کو اسی معیار پر پرکھا ہے اور تخئیل کو ایک ناقابل عفو گناہ سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان سہو و خطا سے بری نہیں ہو سکتا سچ ہے "الصّارم قد ینبو والجواد قد یکبو"۔ بربنائے تقلید و حُسن ظن تخئیل و محاکاۃ کی غلط تعبیر عام ذہنوں میں راسخ ہوگئی ہے اور اب تک میرے علم میں کسی نے اس بحث میں محققانہ نظر سے کام نہیں لیا اس لئے شعر العجم کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھ کو اس مبحث پر قلم اُٹھانا پڑا اور اس سے مقصود صرف عام غلط فہمی کا ازالہ اور تقلید کی خرابی کو رفع کرنا ہے۔ چونکہ عام کجروی کا منشا صرف تخئیل، محاکات، اور تخئیل کی تعریف صحیح معلوم نہ ہونا ہے اس لئے ہم انھی الفاظ کا صحیح مفہوم بیان کرکے اغلاط عامّہ کی توضیح کرتے ہیں۔

تخیل : جو محسوسات و مدرکات انسان کے خیال میں موجود ہیں قوت متخیلۂ دماغی ان میں تصرف کرتی ہے۔ مختلف اشیا کو جمع کرکے طرح طرح کی صورتوں میں ترکیب دیتی ہے اور کبھی مجتمع اشیا کو منتشر کرتی ہے۔ کبھی ان کی ہیئت و صورت بدل دیتی ہے کبھی قلب ماہیت کرکے حقیقت شے کو متغیر کر دیتی ہے انھی تصرفات دماغی کو تخیل کہتے ہیں اور یہ قوت تمام افراد انسانی میں یکساں نہیں ہوتی کسی میں کم کسی میں زیادہ پائی جاتی ہے لیکن اس کے اختراعات و تصرفات غیر محدود اور لا انتہا ہیں ایک شاعر نے قوت متخیلہ کی اسی حالت کو پیش نظر رکھ کر کیا خوب کہا ہے :

صد سال میتواں سخن از زلف یار گفت	دربند آں مباش کہ مضموں نماندہ است

یہاں صد سال سے غیر محدود زمانہ مراد ہے۔ غیر ذی روح کو ذی روح غیر ناطق کو ناطق معدوم کو موجود غیر ممکن کو ممکن بنا دینا تخیل کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ محاکات اور تخئیل سب اسی کے افعال ہیں۔

محاکاۃ : باب مفاعلہ کا مصدر ہے اس کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کی نقل اتارنا اور چند چیزوں میں مشابہت قایم کرنا ہیں۔ اسی کو تشبیہ و تصویر کہتے ہیں قوت متخیلہ جب اپنے محسوسات میں چند چیزوں کو باہم متشابہ پاتی ہے اور ان کو ایک سلک میں منسلک کر دیتی ہے تو اُن کو متحد ثابت کرتی یا قریب باتحاد پہونچا دیتی اور ایک کا حکم دوسرے پر لگاتی ہے اس کا نام محاکاۃ ہے۔ شاعر اس کو تشبیہ استعارہ، کنایہ وغیرہ میں دکھاتا ہے۔

تخئیل : باب تفعیل کا مصدر ہے اس کے معنی ہیں کسی کے دل میں کوئی خیال غیر واقعی پیدا کرنا اسی کو ایہام کہتے ہیں۔ شاعر جہاں کسی غائب یا غیر ذی روح یا غیر ناطق سے خطاب کرتا ہے تو سامع کو اس شے کے حاضر یا ذی روح یا ناطق ہونے کا تخیل ہو جاتا ہے اور یہ تخئیل سامع کے ذہن میں بعض موقعوں پر یقین کا مرتبہ پیدا کر لیتا ہے۔ تخئیل اگرچہ ایک فریب و مغالطہ کی صورت ہے لیکن سامع کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہوتا اور اس سے طبیعت کو لازمی طور پر انقباض و انبساط ہوتا ہے۔ جب کلام میں بذریعہ محاکات کوئی تخئیل پیدا کی جاتی ہے تو اس کو شعر کہتے ہیں صرف محاکاۃ یا صرف تخئیل کا نام شعر نہیں ہے بلکہ یہ دونوں شعر کے جزو لاینفک ہیں جن کا وجود ہر حال میں شعر کے لئے ضروری ہے۔

تخئیل شاعرانہ محاکاۃ کے ذریعہ ہوا کرتی ہے یعنی تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور استعارہ تخئیلیہ تخئیل کا قوی سبب ہوتے ہیں یعنی سامع کا خیال مشبہ یا مستعار لہ سے مشبہ بہ یا مستعار منہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ نقل کو اصل سمجھ کر اصل کا فایدہ نقل سے حاصل کرتا ہے۔

بانسری، ستار، ہارمونیم وغیرہ میں سازندہ جب محاکاۃ سے کام لیتا ہے یعنی موزوں کلمات کے مشابہ نغمات ادا کرتا ہے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خوش گلو انسان گا رہا ہے۔ یہاں بھی محاکات تخئیل تک پہونچا دیتی ہے اور نقل پر اصل کا گمان حد یقین تک پہونچ جاتا ہے لیکن یہ خود شعر نہیں بلکہ شعر یا کلام کی محاکات ہے۔ ارسطو نے کتاب الشعرا میں لکھا ہے: "والاقاویل الشعریۃ ھی الاقاویل المخیلۃ"۔ یعنی اقوال شاعرانہ ہی کا نام اقوال مخیلہ ہے۔ ارسطو اسی کو کہیں محاکاۃ کہتا ہے اور کہیں تخئیل۔ کیونکہ محاکاۃ موجب تخئیل ہوتی ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے ارسطو کا مطلب نہیں سمجھا اور شعر العجم میں اس پر اعتراض کر دیا۔

بعض سطحی نظر اردو مصنفین نے تحقیق سے چشم پوشی کر کے مطلقاً تخئیل او رشعرا کی خیال بندی و دقت آفرینی کو تخئیل اور محض حکایت و واقعہ نگاری کو محاکاۃ سمجھا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی غلطی ہے جو شعر العجم کی بحث تخئیل و محاکاۃ کی تقلید سے رونما ہوئی ہے۔ شعر العجم جلد ۴ بحث تخئیل و محاکاۃ کی عبارت ذیل پر نظر کرنا چاہئے:

"ارسطو کے نزدیک یہ چیز (شعر) محاکات یعنی مصوری ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں اگر کسی شعر میں تخئیل ہو اور محاکاۃ نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کئے جاتے ہیں...... حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخئیل ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا"

مولانا نے اس کے بعد دوسرے مقام پر اپنے خیال کی مزید توضیح فرمائی ہے اور شعر کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:-

"تخئیل اور محاکاۃ اگرچہ دونوں شاعری کے عنصر ہیں لیکن بلحاظ اکثر دونوں کے استعمال کے موقعے الگ الگ ہیں۔ یہ سخت غلطی ہے کہ ایک کے بجائے دوسرے کا استعمال کیا جائے مثلاً مناظر قدرت کا بیان محاکات میں داخل ہے۔ مثلاً اگر بہار، خزاں، باغ، سبزہ، مرغزار، آب رواں کا بیان کیا جائے تو محاکات سے کام لینا چاہئے یعنی اس طرح بیان کرنا چاہئے کہ ان چیزوں کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ متاخرین کی سخت غلطی جس سے ان کی شاعری بالکل برباد ہو گئی یہ ہے کہ وہ ان موقعوں پر محاکات کے بجائے تخئیل سے کام لیتے ہیں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخئیل اور محاکات کا صحیح مفہوم مولانا کے ذہن میں نہ تھا ورنہ یہ نہ لکھتے کہ "ان چیزوں کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے" کیونکہ اسی کو تخئیل کہتے ہیں اور محاکات کسی حالت میں اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔ محاکاۃ اور تخئیل کے موقعے الگ الگ سمجھنا اور ان کے باہم تفریق کرنا ایک نغمہ خارج از آہنگ ہے۔ منشا غلط یہی ہے کہ تخئیل کو دور از کار تخئیل اور محاکاۃ کو تخئیل سے جدا مان لیا ہے طرہ یہ کہ تخئیل و محاکاۃ کو شاعری کا عنصر بھی تسلیم کیا اور پھر کل یا مجموعہ کو اپنے اجزا سے مستغنی بھی ثابت کیا۔ آپ نے تمام بحث میں فرضی، ذہنی، خیالی اور غیر ممکن و معدوم اشیا کی محاکاۃ کو تخئیل سمجھ کر اس کو عیب قرار دیا ہے اور درحقیقت یہ محاکاۃ کی بے اعتدالی ہے اسی طرح صرف حکایت و وقوع کوئی کو محاکاۃ بتا کر اس کو تخئیل سے (بزعم خود) خالی سمجھا ہے اور درحقیقت کوئی محاکاۃ تخئیل سے خالی نہیں ہوتی۔ بنائے فاسد علی الفاسد کے مثالیہ اشعار جو اپنے دعوے کے ثبوت میں درج کئے ہیں وہ دعوے کے خلاف شہادت دیتے ہیں خالص محاکات کی مثال میں اشعار ذیل پیش کئے ہیں ؎

نرمک نرمک نسیم زیر گلاں میخزد عنجب ایں می کمد عارض آں می مزد

سنبل ایں می کشد گردن اں میگزد گہ بچمن می چمد گہ بسمن می وزد

گاہ بشاخ درخت گہ بلب جو بیار

مولانا کے خیال میں یہ محاکات ہے جس میں تخئیل کا نشان نہیں۔ لیکن ایک سطحی نظر انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ شاعر نے ایک عاشق و معشوق کے باہمی اختلاط کا نقشہ کھینچا ہے نسیم کو عاشق اور گل کو معشوق بنا دیا ہے اور ان کے افعال و حرکات صاف بتاتے ہیں کہ یہ انسانی خواص ہیں۔ کیا یہ ایک زبردست تخئیل نہیں ہے اور کیا سامع کا ذہن اس کی طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ انسانوں کے حرکات ہیں۔ اسی طرح خالص تخئیل کی مثال میں یہ شعر لکھا ہے:

فروتنی ست دلیل رسیدگان کمال کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

شاعر نے فروتنی کو دلیل کمال بتایا ہے اور اس کے ثبوت میں منزل پر پہونچ کر سوار کا پیادہ ہو جانا پیش کیا ہے۔ یعنی منزل پر پہونچنے کو کمال سے تشبیہ دی ہے اور پیادہ پائی کو فروتنی سے یہ تمثیل بعینہ محاکاۃ اور نقل مطابق اصل ہے مصرعۂ ثانی میں حرف تشبیہ چوں بھی موجود ہے۔ مولانا نے خود بھی لکھا ہے کہ "محاکاۃ کا بڑا آلہ تشبیہ ہے" پھر خدا جانے شعر مذکور کو محاکاۃ سے کیوں خالی بتایا۔ اسی طرح ؎

بنوعے آتش گل درگرفت است کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

اس شعر میں آتش گل کو جو محض استعارہ تھا شاعر نے حقیقت قرار دیکر بلبل کو پانی میں آشیانہ بنانے کے لئے مجبور کر دیا یہ بالکل محاکاۃ ہے لیکن غیر معتدل اور دور از کار لیکن آتش گل کی تخئیل اس محاکاۃ کی محتاج تھی۔ اس کو محاکاۃ سے خالی کون کہہ سکتا ہے۔ شعر العجم اور اس کی مقلد شعر الہند دونوں نے محاکاۃ کی بے اعتدالی یعنی ذہنی و معدوم و غیر ممکن اشیاء کی محاکات کو تخئیل کہکر شعراء کے اشعار کو معیوب ٹھہرایا ہے اور اسی کو حسن و قبح اشعار کا معیار قرار دیا ہے اگر تخئیل و محاکاۃ کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہوتا تو ایسی غلطی ناممکن تھی۔ تخئیل و محاکاۃ میں تفریق نا جائز تھی

نہ شعر محاکاتی و تخئیلی کی تقسیم ہوتی۔ تعریفات میں مجمل و مبہم الفاظ سے کام نہیں چلتا۔ محاکاۃ کو صرف تصویر کشی و بیان واقعہ سے تعبیر کرنے اور تخئیل کو رنگ بھرنے اور موقلم کو جنبش کہہ دینے سے تخئیل و محاکاۃ کی تعریف مطلق نہیں ہوسکتی اُردو مصنفین کو جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں وہ انھی بے معنی و مہمل الفاظ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اہل قلم نے بے سمجھے بوجھے انھی الفاظ میں محاکاۃ و تخئیل کی تعریف بیان کی اور جس شعر میں دقت آفرینی و نازک خیالی کی جھلک دیکھی اس کو تخئیلی شعر کہدیا اور جس میں واقعہ نگاری نظر آئی اس کو محاکاتی شعر سمجھا۔ اصناف سخن میں غزل قصیدہ مثنوی کو محاکاتی شاعری کا میدان بتایا گیا اور اس میں تخئیل کو بدترین عیب سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ شعر کی صحیح تعریف بھی کوئی نہیں بیان کرسکتا نہ اس کو خطابت و مصوری اور فلسفہ سے ممیز کرسکتا ہے۔ اہل قلم شعر کی تعریف میں جذبات کا لفظ لازمی طور پر ذکر کرتے ہیں چنانچہ شعر العجم میں بھی شعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں"

معلوم نہیں جذبات سے کیا مراد ہے اور شعر کی تعریف اس کے ذریعہ سے کیونکر ہوگئی۔ ایک خطیب ایک فلسفی بلکہ ہر ایک علم و فن کا عالم اپنی تقریر و تحریر الفاظ میں ادا کرتا ہے اور سب میں جذبات شامل ہوتے ہیں بعض حضرات نے زیادہ غائر نظر سے اس کو یوں رنگین و دلکش بنایا ہے۔ کہ "جذبات و احساسات جب برانگیختہ ہوتے ہیں اسوقت اضطراری طور پر جو کلام موزوں انسان کی زبان پر جاری ہوتا ہے اس کلام شعر ہے" یہ بھی بالکل مہمل بات ہے۔ شعر اختیاری چیز ہے نہ کہ اضطراری۔ اور موزوں کلام کا بے اختیار سرزد ہونا بھی ایک ذہنی و فرضی بات ہے۔

اگر محاکاۃ و تخئیل کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہو تو شعر کی تعریف یہی ہونا چاہئے کہ "جس کلام میں تخئیل و محاکاۃ ہو وہ شعر ہے" مصوری سے بھی امتیاز ہوگیا کیونکہ تصویر میں الفاظ اور کلام نہیں ہیں۔ سائنس یا فلسفہ چونکہ دلائل یقینی پر مبنی ہوتے ہیں اُن میں مغالطہ و فریب نہیں ہوتا اس لئے وہ بھی شعر سے خارج ہیں کیونکہ تخئیل ایک فریب ہے اور وہ شعر کا عنصر ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے ع "چوں اکذب اوست احسن او"۔ خطابت میں لوگوں کے مسلمات و مشہورات سے کام لیا جاتا ہے خطیب بجائے تخئیل و محاکات کے دلائل خطابیہ اور قومی یا ذہنی و مذہبی مسلمات کو اپنے دعووں کی شہادت میں پیش کرکے ترغیب و ترہیب کا فرض ادا کرتا ہے لیکن شاعر کے مقدمات کا ذریعہ محض تخئیل و محاکاۃ پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ بالکل بے حقیقت و غیر واقعی تخیلات ہیں۔ جو لوگ شعر کی صحیح تعریف سے ناآشنا ہیں وہ ان مباحث کی تفصیل میں ورق کے ورق سیاہ کر ڈالتے ہیں اور پھر بھی حقیقت منکشف نہیں ہوتی۔

شعر العجم کا یہ فقرہ کہ "خطابت مخاطبین و سامعین پر اثر دکھاتی ہے اور شعر خود شاعر کے نفس پر" عجیب و غریب دعوے ہے گویا شعر سے سامعین کے جذبات میں تلاطم نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا اثر شاعر ہی تک محدود رہتا ہے۔ یہ حقیقت کے خلاف اور غرض شعر کے بالکل منافی ہے۔ شعر کی تاثیر کے یہ معنی ہیں کہ سامع کے جذبات کو بھڑکا دے۔ عرب کے ایک نقاد کا قول ہے کہ "اشعر الناس من انت فی شعرہٖ"۔ یعنی بڑا شاعر وہی ہے جس کے شعر میں سامع ہمہ تن محو ہو جائے۔

ارسطو نے کتاب الشعر میں محاکاۃ شاعرانہ کے محاسن و معائب دونوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ اُردو کی بدقسمتی سے ہمارے مصنفین و ارباب قلم نے محاکاۃ کے عیوب کو تخئیل کی بے اعتدالیاں بتایا۔ یہ غلطی بھی محاکاۃ و تخئیل کے معنی نہ جاننے کے باعث ظہور میں آئی ہے۔ کتاب الشعر سے چند عمدہ محاکاۃ کے انواع یہاں لکھے جاتے ہیں لیکن ہم نے بطور توضیح مثالوں کا بھی اضافہ کردیا ہے۔

(۱) محسوسات کی محاکاۃ محسوسات سے کیجائے تو بہتر ہے مثلاً ستاروں کی ایک خاص شکل کو تشبیہ کی بنا پر سرطان (کیکڑا) کہا جاتا ہے۔ آنکھ کو نرگس زلف کو سنبل کہنا اسی قبیل سے ہے۔

(۲) امور عقلیہ و ذہنیہ کی محاکات بھی امور محسوسہ سے ہونا چاہئے جیسے قید محبت، طوق احساں، دام فریب وغیرہ لیکن اس میں ایک خاص مناسبت ہونا چاہئے۔ دام مسرت، ساغر محرومی ٹھیک نہیں ہے

(۳) جمادات کو ناطق تسلیم کرکے درخت پتھر زمین آسمان وغیرہ سے خطاب کرنا۔ ع "اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسی داری"۔ اب محاکات غیر مقبول پر بھی نظر کیجئے،

(۱) کسی موجود شئے کو ایک غیر ممکن و ممتنع الوجود سے تشبیہ دینا محاکات کی بے اعتدالی ہے لیکن وہ محاکات جو غلو کا ذب میں سوفسطائی شعرا کرتے ہیں مقبول محاکات ہے مثلاً ؎

در عدم ہم ز عشق شورے ہست   گل گریباں دریدہ می آید

(۲) ایسی سادہ واقعہ نگاری جو صرف یقین و تصدیق کا فایدہ دیتی ہے محاکاۃ غیر مقبول ہے البتہ اگر معانی شعریہ اس میں شامل ہوں تو وہ مستحسن ہے۔ اسی وجہ سے قصص و مثنویات شاعرانہ داخل شعر ہیں اور محض تاریخ شعر سے خارج ہے۔

(۳) اصل شے میں تحریف پیدا کرنا مثلاً دو کان کے بجائے کسی کے تین کان ثابت کرنا۔ محاکاۃ نامقبول ہے۔ اسی طرح ایسے الفاظ میں محاکاۃ کرنا جو محتمل الضدین ہوں۔ یعنی دو معنی ایسے ہوں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں مدح اور ذم دونوں پر دلالت ہو۔ مثلاً کیوان (زحل) نحس ستارہ ہے لیکن اوج و رفعت میں بھی ضرب المثل ہے۔

چونکہ تخئیل ہر محاکاۃ کو لازم ہے اس لئے تخئیل کے متعلق حسن و قبح کی کوئی بحث نہیں ہوسکتی۔ نقل پر اصل کا گمان ہونا بلکہ نقل کو اصل کی طرح مخاطب کے ذہن میں اُتار دینا اور اس کو اصل باور کرانا تخئیل ہے اور سامع کا فریب میں آکر نقل کو اصل سمجھنا اور اس سے متاثر ہونا تخئیل کی قوت کا نتیجہ ہے اسی کو تاثیر شعر کہتے ہیں۔

معجز سہسوانی

محمودی رسمِ خط

(محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم-اے کے تبصرے کا جواب)

مارچ ۱۹۴۱ء کے نگار میں مولوی محمود علی خاں صاحب نے اُردو رسم خط پر اُصولی گفتگو کرتے ہوئے اپنا ایجاد کیا ہوا ایک نیا رسم خط پیش کیا تھا جس پر ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۱ء کے نگار میں جناب محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم-اے کا ایک اختلافی تبصرہ شایع ہوا۔ اب مولوی محمود علی خاں صاحب نے ان اعتراضات سے بحث کی ہے جو شروانی صاحب کی طرف سے ان کے رسم خط پر وارد کئے گئے ہیں۔ اُردو رسم خط کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگ اس طرف توجہ نہیں کرتے۔ ایک زمانہ آنے والا ہے جب اُردو داں طبقہ مجبور ہوگا کہ وہ موجودہ رسم خط کو بدلے لیکن شاید یہ زمانہ وہ ہوگا جب وقت گزر چکا ہوگا۔

ضرورت ہے کہ اُردو داں طبقہ کے تمام اہل فکر و بصیرت اس طرف توجہ کریں اور اگر انھیں محمودی رسم خط میں کسی تغیر و تبدیل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اسے ظاہر کریں۔ یہ خالص علمی مسئلہ ہے جو آپس کی بحث و گفتگو ہی کے بعد خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے اور جس میں ذاتیات کو دخل دینے کی مطلق ضرورت نہیں۔ نیاز

ستمبر ۱۹۴۱ء اور اکتوبر ۱۹۴۱ء کے رسالہ نگار میں محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم-اے کے مضمون کی دو قسطیں میری نظر سے گزریں، مضمون خاصہ طویل ہے اور بقول اڈیٹر نگار "فاضلانہ" بھی ہے، مگر بقول اڈیٹر موصوف "کاش اس کا اندازِ بیان زیادہ سلجھا ہوا ہوتا"، تو مجھے اس سے استفادہ کرنے کا اور زیادہ موقعہ ملتا، بہر حال مقالہ نگار کا فاضلانہ مضمون جس کے لکھنے میں اُنھوں نے بڑی کاوش کی ہے نہ در قابلِ داد ہے، خاصکر اس لحاظ سے کہ اُس کی وجہ سے اُردو رسم خط میں کسی مفید انقلاب کے پیدا ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لئے جاتا رہا، جزاک اللہ!

مجھے شریف صاحب سے یہ شکایت ضرور ہے کہ اُنھیں میرے ایجاد کئے ہوئے رسم خط میں کہیں بھی کوئی خوبی یا آسانی نظر نہیں آئی بلکہ اُن کی کوشش یہی رہی کہ اس پر جتنے زیادہ سے زیادہ اعتراضات ہو سکیں وہ کئے جائیں، چنانچہ انھوں نے رسم خط کے لفظ اور محمودی رسم خط کے نام ہی سے اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا، یہ اعتراضات بالکل اُسی قسم کے ہیں جس طرح کہ عربی قواعد کی ایک کتاب میں میری نظر سے گزرے۔

اعتراض - بداں گفت اعلم چرا نگفت

جواب - زیرا کہ کتاب بہ فارسی است

اعتراض - باز اسعدک اللہ تعالیٰ چرا گفت

جواب - زیرا کہ دعا بہ عربی مستجاب است

مصنف نے کتاب کی ابتدا اس عبارت سے کی تھی "بداں اسعدک اللہ تعالیٰ" غریب بس اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ حاشیے پر سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی، اسی طرح سرسید مرحوم نے جب قرآن شریف کی تفسیر لکھی تو ایک مولوی صاحب نے ابتدا ہی سے اعتراضات کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے لکھا کہ سرسید نے سلف صالحین کے خلاف بسم اللہ کا ترجمہ با محاورہ اُردو میں لکھ دیا ہے حالانکہ ہمارے بزرگ یوں لکھتے ہوئے چلے آئے ہیں کہ "شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ کے جو ہے بڑا مہربان نہایت رحم والا"

مجھے ہندوستان کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی اکثریت پر افسوس ہے کہ اُن کا جمود اُن کو زندگی کے کسی شعبے میں بھی ایک انچ آگے بڑھنے نہیں دیتا، اور زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہر مفید تجویز کی مخالفت میں پرانے خیال کے مقابلے زیادہ انگریزی داں طبقہ زیادہ پیش پیش نظر آتا ہے، دوسری چیزوں پر بحث کرنے کا تو یہ موقعہ نہیں، صرف رسم خط کے مسئلے کو لیجئے کہ وہ ایک عرصے سے ان بزرگوں کا میدان کارزار بنا ہوا ہے، اور آج تک کسی مفید نتیجے تک پہونچنے میں کامیابی نہیں ہوئی اور نہ آیندہ اس کی توقع ہے، دُنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی مگر یہ ہیں کہ ابھی تک لکیر کے پتھر

سر مار رہے ہیں، دوسری طرف دیکھئے کہ محض ٹائپ کی آسانی کی وجہ سے ہندی مطبوعات کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اُس کے اثر سے ہندی زبان اور ہندو تہذیب روز افزوں ترقی پر ہے اور ہماری آنکھیں ان تمام چیزوں سے بند ہیں اور ابھی تک ہم نے یہی طے نہیں کیا ہے کہ نستعلیق ہی قایم رکھا جائے، نسخ اختیار کر لیا جائے، دیوناگری یا رومن میں اُردو لکھی جائے یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے۔ اور کوئی بات طے بھی کیونکر ہو جب کہ ہمارے اختلافات کا یہ عالم ہے کہ کبھی تو ص۔ ث۔ ظ اور ذ کے حذف کر دینے سے اسلام خطرے میں آ جاتا ہے، کبھی رسم خط بدلنے سے ماضی سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے، کبھی ٹائپ کو رواج دینے سے یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ لیتھو پریس والوں کو بڑا نقصان پہونچے گا اور تمام کاتب بیکار ہو جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

اِن تمام خطرات میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز خطرہ رشتۂ ماضی کے منقطع ہونے کا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک رسم الخط ہی وہ رشتہ ہے جو ہم سب کو خیر القرون سے مربوط کئے ہوئے ہے اور اس کے علاوہ کسی اور رشتہ کی ضرورت ہی نہیں، آلِ رسول، صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے خلف الصدق ہونے کے لئے صرف رسم الخط ہی کافی ہے، حالانکہ ان کو یہی نہیں معلوم کہ جس خط میں صحابہ عربی لکھتے تھے وہ ہمارے مروجہ خط سے اس درجہ مختلف تھا کہ ہم اُس میں لکھی ہوئی عبارت ہرگز نہیں پڑھ سکتے، اس خط میں نہ نقطے تھے اور نہ دائرے جن کے حذف کر دینے کا ہمارے شریف صاحب کو بڑا صدمہ ہے۔

رسم خط ہی پر منحصر نہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی ایک مسئلہ پر متفق ہونے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی اور اختلافات کی کثرت سے ذہنیت اس درجہ فاسد ہو چکی ہے کہ کسی قسم کی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ قدرت ایک ایسی ہستی کو پیدا نہ کر دے جو اپنی ذاتی طاقت سے ان تمام اختلافات کو کچل کر سب کو راہ راست پر لگا دے۔ در اصل ہمارے ہندوستان کو بھی ایک مصطفٰے کمال کی ضرورت ہے جو ان کرم خوردہ دماغوں کے بوسیدہ خیالات کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی طاقت سے اصلاحات نافذ کر دے۔ ملک کو ایک انسان کی ضرورت ہے نہ کہ صدہا انسان نما حیوانات کی　　　"کز مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید"

ترکی میں جب رسم خط بدلنے کا خیال پیدا ہوا تو وہاں بھی قدیم ذہنیت نے مخالفت شروع کر دی، کچھ لوگوں نے "ماضی سے رشتہ منقطع ہونے"، عالم اسلامی سے تعلق قایم نہ رہنے اور "آج تک کا کل ذخیرۂ کتب بیکار ہو جانے" کا خطرہ ظاہر کیا۔ بعض نے کہا کہ عربی الفاظ کو ترکی تلفظ کے مطابق لکھنا جائز نہیں کیونکہ "ترکی کے مسلح کو عربی کی حدود میں قدم رکھنے کا حق نہیں ہے"، علماء نے بھی اسے ناجائز قرار دیا، اور سب سے بڑی مصیبت یہ پیش آئی کہ ث، ص، ظ اور ذ کے اُڑا دینے سے اسلام خطرے میں آ گیا اور ہمزہ وصل اور لام تعریف کے حذف کر دینے سے سیبویہ، ابن حاجب اور ملا جامی کی ارواحِ طیبہ کو صدمہ پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوا، اور یہ تمام باتیں قرب قیامت کی علامتیں سمجھی گئیں، مگر مردرسے مصطفٰے کمال کہ اُس نے کسی ایک احمق کی نہ سنی اور ایک دم رسم خط کو بدل کر ترکی زبان کو رومن حروف میں لکھنے کا حکم دیدیا، اس انقلاب کے بعض اہم اور مفید نتائج یہ نکلے:

۱- ترکی زبان ترکی تلفظ کے عین مطابق لکھی جانے لگی، خواہ اصل ترکی کے الفاظ ہوں یا عربی اور فارسی وغیرہ سے مستعار لئے گئے ہوں اور اس طرح پر املا میں غلطی واقع ہونے کا امکان تقریبًا نوے فیصدی باقی نہیں رہا۔

۲- کسی لفظ میں کوئی حرف صحیح یا حرف علت زائد نہیں لکھا جاتا بلکہ جو حرف بھی ہوتا ہے وہ اپنی مقررہ آواز دیتا ہے اور اس لحاظ سے ترکی کا موجودہ رسم خط انگریزی، جرمن اور فرنچ وغیرہ سے زیادہ مکمل اور باقاعدہ ہے۔

۳- اُردو کی طرح پہلے ترکی بھی بغیر زیر زبر اور پیش کے لکھی جاتی تھی اور نگاہ عادی ہو جانے کی وجہ سے تصویر دیکھ کر لفظ کی مجموعی عبارت صحیح پڑھ لی جاتی تھی، لیکن رسم خط میں اس قسم کے بنیادی نقائص پائے جانے سے ایک مبتدی بچے، ایک بالغ انسان اور غیر اہل زبان کو اس کے سیکھنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی اور اشکال حروف کی کثرت اور س اور ص وغیرہ کا جھگڑا اس پر مزید تھا۔ انقلاب کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی، مبتدی ہو یا منتہی، اہل زبان ہو یا غیر اہل زبان، تھوڑی سی مشق کے بعد صحیح عبارت پڑھنے لگتا ہے۔

۴- قدیم رسم خط میں سادے زبر زیر اور پیش کی علامتیں تھیں اور وہ بھی اُردو کی طرح عام طور پر نہیں لگائی جاتی تھیں، چونکہ ترکی زبان میں حرکات کی مرکب آوازیں بھی ہیں اسلئے مشکل الفاظ پر زبر زیر اور پیش لگا دینے کے باوجود اُن کا صحیح پڑھنا ممکن نہ تھا۔ لیکن اب یہ کمی پوری کر دی گئی، ہر لفظ حروف علت کے ساتھ جو حرکات کا کام دیتے ہیں لکھا جاتا ہے، اور مفرد و مرکب آوازوں کے ظاہر کرنے کے لئے رومن حروف علت کسی علامت یا بغیر کسی علامت کے اس طرح لکھے جاتے ہیں:

a ، â ، ı ، i ، î ، e ، o ، ö ، u ، ü

(a) فتحہ اور الف (â) کھنچے ہوئے الف، بغیر نقطے والی (ı) کسرۂ معروف (i) یائے معروف (î) یائے معروف ذرا کھنچی ہوئی، (e) زبر اور زیر کی درمیانی آواز (o) واوِ مجہول اور ضمۂ مجہول (ö) ضمۂ مجہول مائل بہ یائے مجہول (u) ضمۂ معروف اور واوِ معروف (ü) ضمۂ معروف مائل بہ یائے معروف کا کام دیتا ہے۔

ج کی آواز کے لئے C چ کے لئے Ç اور ش کے لئے Ş اور ژ کے لئے J س، ص، ث کی بجائے صرف S ز، ذ، ظ اور ض کی جگہ Z ت، ط کی جگہ T ق اور ک کی جگہ K رکھا گیا، خ کا تلفظ موجودہ ترکی میں نہیں ہے اس لئے ہ، ح، خ کی بجائے صرف H سے کام لیا گیا۔ اس رسم خط کی علامات زیادہ تر انگریزی رسم خط سے اخذ کی گئی ہیں۔

ذیل میں ہم مثال کے طور پر چند عربی اور فارسی الفاظ ترکی اخبارات سے نقل کرکے لکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ترکوں نے اپنے تلفظ اور کتابت کو کس طرح مطابق کر دیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اب بھی ترکی میں عربی الفاظ کس کثرت سے استعمال ہوتے ہیں:

مخابر (muhabir)	مدہش (müthiş)	حکومت (hukümet)
اہمیت (ehemmiyet)	بلدیہ (belediye)	مساعدہ (müsaade)
منازع فیہ (münaziünfih)	تشبث (teşebbüs)	تضاد (tezat)
چونکہ (çünkü)	خیلے (hayli)	ہنوز (henüz)

میں نے اس موقعہ پر ترکی رسم خط کے متعلق بظاہر کچھ غیر ضروری تفصیل سے کام لیا ہے لیکن اگر آپ غور کریں تو محمد شریف خاں صاحب شروانی کے بہت سے اعتراضات اس تفصیل کو پڑھ لینے کے بعد خود بخود رفع ہو جاتے ہیں، کیونکہ ایک طرف تو فاضل معترض کے لفظی اعتراضات ہیں اور دوسری طرف مصطفیٰ کمال کے تاریخی کارنامے کے عملی نتائج۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

اب میں اصل موضوع کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو کے موجودہ رسم خط میں اصلاح کی ضرورت ہے، خواہ موجودہ حروف اور اُن کی شکلوں میں کچھ اصلاحی تغیر کر دیا جائے، خواہ کوئی دوسرا رسم خط اختیار کیا جائے، دیوناگری حروف کا اختیار کرنا تو میرے نزدیک خودکشی کا مترادف ہے۔ رومن حروف کے اختیار کرنے میں اگرچہ یہ فائدہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی ہر قوم جو رومن حروف سے آشنا ہے مجبوراً اُردو پڑھنے لگے گی اور اس طرح پر اُردو کی اشاعت بڑھ جائے گی، لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے مخصوص حالات کی بنا پر اس میں بڑی مشکلات پیش آئیں گی، لہٰذا بہتر صورت یہی ہے کہ موجودہ رسم خط ہی میں ایسی اصلاح کر دی جائے کہ وہ آسانی کے اعتبار سے کسی طرح رومن اور ہندی سے کم نہ ہو۔ اس صورت میں چیز بھی اپنی رہے گی اور رشتۂ ماضی بھی منقطع نہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے یہی آخری صورت اختیار کی اور ایسا رسم خط ایجاد کر کے پیش کر دیا جس میں نہ تو نئے سرے سے حروف شناسی کی ضرورت ہے اور نہ اُس میں ترکیبی مشکلات اور اشکال کی کثرت ہے، اور سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ حرکات جزو حروف ہو جانے سے غلط پڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اب رہے اعتراضات تو دُنیا کی ہر چیز پر صدہا اعتراض ہو سکتے ہیں۔ اور اُن کے صدہا جوابات بھی دیئے جا سکتے ہیں۔

محمد شریف خاں صاحب شروانی نے جو اعتراضات کئے ہیں اُن کے جوابات نہایت تفصیل سے دیئے جا سکتے ہیں لیکن میں اس کو غیر ضروری سمجھتا ہوں اور صرف مختصر جوابات لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسم خط اگرچہ حقیقت میں "وہ معین حروف ہیں جن میں تصرف کرنے سے اس کی کتابت غلط ہو جاتی ہے" لیکن اب عام طور پر اُردو میں "صنعت کتابت" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا اصطلاح پر جھگڑنا بے معنی ہے۔

میرے ایجاد کردہ رسم خط کا "خط قومی" نام رکھنا فاضل معترض کے "حدود اختیار" سے باہر ہے اس کا نام محمودی رسم خط ہے اور یہی رہے گا۔

میں نے لکھا تھا: (۱) اُردو حروف کا پیچیدہ اختلاف (۲) خط کی ترکیبی صورت (۳) حرکات کا محض سیاق عبارت سے پڑھا جانا، موجودہ رسم خط کے خاص خاص نقائص ہیں، ان کے علاوہ اور بھی نقائص ہیں جن کو میں نے "وغیرہ وغیرہ" کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔ اس پر شریف صاحب لکھتے ہیں "وغیرہ وغیرہ سے جو نقائص مراد ہیں وہ تو سوچنے سے ذہن میں نہیں آتے"۔ شریف صاحب اگر ذرا غور سے کام لیتے اور ذرا زیادہ سوچتے تو اور نقائص بھی اُن کے ذہن میں آجاتے، مثلاً (۴) نستعلیق کے باریک جوڑوں کا تھوڑے عرصے کے بعد ٹائپ میں ٹوٹ جانا۔ (۵) حرفوں کا ایک دوسرے پر سوار ہونا، اور یہی وہ ایسی خرابیاں ہیں جو اس خط کو ٹائپ میں منتقل ہونے سے مانع ہیں، اور اسی بنا پر حیدر آباد کا بنایا ہوا نستعلیق کا ٹائپ باوجود لاکھوں روپیہ صرف کرنے کے کامیاب نہ ہو سکا۔

شریف صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اس میں عقل کام نہیں کرتی کہ حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو خط کے ٹائپ منتقل ہونے سے کیا لگاؤ ہے"، شریف صاحب کو یہاں یا تو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے یا انھوں نے دیدہ و دانستہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے، میرے مضمون کی عبارت یہ ہے: "اشکال کا پیچیدہ اختلاف اور اُن کی کثرت، خط کی ترکیبی صورت، یہ ایسی مشکلات ہیں جن کی وجہ سے اُن کی موجودہ صورت ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کو بغیر زیری عبارت کے صحیح پڑھ سکتے ہیں، بچوں کے پڑھانے میں زیادہ

وقت صرف ہوتا ہے، غیر زبان والے اُسے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتے......" اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ میں نے حرکات کے قیاس اور سیاق عبارت سے پڑھے جانے کو صرف ٹائپ میں منتقل نہ ہونے کا سبب قرار دیا ہے یا ایک طرف چند اسباب اور ایک طرف اُن کے نتائج لکھ دئے ہیں۔

شریف صاحب فرماتے ہیں "خط نسخ میں بھی وہی پیچیدہ و کثیر اشکال ہیں لیکن اس کا ٹائپ اندرون و بیرون ہند کام دے رہا ہے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے دلائل پیش کرنا بدیہیات سے انکار ہے" مجھے افسوس ہے کہ شریف صاحب نے میری عبارت غور سے نہیں پڑھی میرا یہ دعوےٰ صرف نستعلیق سے متعلق ہے کہ وہ ٹائپ میں منتقل نہیں ہو سکتا، اور یہ بجائے خود درست ہے، اور اس سے انکار کرنا البتہ بدیہیات سے انکار ہے، رہا نسخ تو اس کے متعلق میں نے اپنے مضمون میں کچھ نہیں لکھا، لیکن اب یہ کہتا ہوں کہ نسخ اگرچہ ٹائپ میں منتقل ہو گیا ہے مگر اُس میں دوسرے نقائص بدستور پائے جاتے ہیں، یعنی اشکال کی کثرت اور عبارت کا سیاق کلام سے صحیح پڑھنا۔ مکمل رسم خط وہی ہے کہ جس زبان کا وہ رسم خط ہو اُس کی تمام آوازوں کے لئے اُس میں علامتیں موجود ہوں اُس میں زیر زبر پیش کو علاحدہ سے لگانے کی ضرورت نہ ہو اور جہاں تک ہو سکے حرف تہجی کی شکلیں کم سے کم اور ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہوں ورنہ کثرت اشکال کی اگر پرواہ نہ کی جائے تو چینی خط پر کیوں اعتراض ہوتا ہے جس میں سرے سے حروف تہجی ہی نہیں بالکل ہر چیز اور ہر مفہوم کے لئے ایک علحدہ شکل ہے، اور ٹائپ تو اُس کا بھی بن گیا ہے۔

حیدرآباد کے "بعض" اہل ہمت کے مساعی "یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں" ایک صاحب کے اعلان کرنے سے اگر کوئی عملی نتیجہ برآمد ہوتا تو اُسے "منصۂ ظہور" پر آجانا چاہئے تھا کیونکہ کوئی مفید چیز بغیر رواج پائے نہیں رہ سکتی، مگر ایسا ہوا نہیں، اور مشکل بدستور باقی ہے۔

آگے چل کر معترض صاحب فرماتے ہیں: "اگر نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہو چکی ہے تو اُس سے قریب تر خط نسخ ہے یا یہ خط قومی (رسم خط محمودی)" شریف صاحب یہ تو واقعہ ہے کہ نستعلیق کے رواج سے ہمیشہ کے لئے مایوسی ہے، اب رہی یہ بات کہ نسخ کو اختیار کیا جائے یا کسی جدید رسم خط کو تو اس کا فیصلہ مستقبل خود کر دے گا۔

ستبدی لک الایام ماکنت جاہلا و یاتیک بالاخبار من لم تزود۔

عنقریب زمانہ وہ (چیزیں) تمہارے سامنے پیش کر دے گا جن کو تم نہیں جانتے۔ اور تمہارے پاس خبریں لیکر وہ (قاصد یعنی زمانہ) آئیگا جس کو تم نے زاد سفر نہیں دیا ہے۔

میں نے لکھا تھا کہ "بالغوں کی تعلیم اس خط کے ذریعہ سے تو کسی طرح ممکن نہیں" فاضل معترض فرماتے ہیں حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ "اس کے ذریعہ سے ان کی تعلیم ہو رہی ہے" "ممکن" کے لفظ سے میرا مطلب امکان منطقی نہیں ہے۔ اس لئے کہ موجودہ رسم خط سے بھی زیادہ مشکل اگر کوئی رسم خط ہو تو اُس کے ذریعے سے بھی بالغوں کی تعلیم ہو سکتی ہے مگر سوال تو دشواری اور آسانی کا ہے۔ جس کا جواب آگے چل کر معترض صاحب خود دے دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "اس کا التزام اصل خط پر عائد نہیں ہوتا، اس کی مستعمل صورت پر ہوتا ہے۔"

بندہ نواز! یہی تو میں کہتا ہوں کہ اصل حروف کی شکلیں قایم رکھی جائیں اور مستعمل صورت بدل دی جائے، بجائے ترکیبی صورت قایم رکھنے کے حروف الگ الگ کر دئے جائیں اور حرکات کو حروف کا جزو بنا دیا جائے جیسا کہ محمودی رسم خط میں کیا گیا ہے۔

شریف صاحب فرماتے ہیں کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے ڈھالنے میں تقریباً اتنی ہی سہولت ہوگی جتنی رقوم حسابی کے ڈھالنے میں اور ٹکڑوں کی تعداد بھی خاص طور پر کم ہوگی" شریف صاحب کو محمودی رسم خط میں صرف یہی ایک آسانی نظر آئی اگرچہ اُس کو بھی "تقریباً" کا لفظ بڑھا دینے سے اُنھوں نے کچھ مشکل کر دیا، خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک آسانی کے تو قائل ہوئے مگر اسی سلسلۂ عبارت میں تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن اس نفع سے زیادہ نقصان ہے،

۱۔ حسن خط تو بالکل مفقود ہو جائے گا،

۲۔ پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی۔"

شریف صاحب! اگر حسن خط کے یہی معنی ہیں کہ ایک خوشنویس اطمینان سے بیٹھ کر نوک پلک سے درست ایک قطعہ یا ایک عبارت زیب دیوار کرنے کے لئے لکھ دے تو اس کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہاں تو رونا یہ ہے کہ اگر کاتب صاحب کو اچھا ناشتہ مل گیا اور بیوی اُن کی سے لڑائی نہیں ہوئی تو انھوں نے ایک آدھ صفحہ ذرا اچھا لکھ دیا، اور اگر بھوکے آگئے، بیوی سے لڑے یا تنخواہ وقت پر نہیں ملی تو جیسا بنا ویسا گھسیٹ دیا اور اگر بیمار پڑ گئے، یا نوکری چھوڑ کر چل دئے تو اُن کے قائم مقام نے اپنے مخصوص انداز میں دوسری طرح لکھنا شروع کر دیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا ضروری ہے کہ حسن خط کا وہی معیار ہو جو جناب کی نظروں میں ہے۔ پھر یہ رائے کس بنا پر قایم کر لی گئی کہ محمودی رسم خط حسین نہیں ہے حالانکہ آپ نے اُس کا سب سے پہلا نمونہ اور وہ بھی نستعلیق کے کاتب کا لکھا ہوا ملاحظہ فرمایا ہے، جس کی کرسی تک درست نہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آپ ایک شخص سے رومن حروف آڑے ٹیڑھے قلم سے لکھوالیں پھر یہ فرمائیں کہ رومن حروف میں حسن نہیں پایا جاتا، ماشاء اللہ کیا طریقۂ استدلال ہے۔

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "پڑھنے کی آسانی گھٹ جائے گی" یہ اعتراض تو سراسر غلط ہے، خط کے حروف مرکب کرنے یا مفرد رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ تجربہ تو اس کے خلاف شہادت دیتا ہے، انگلستان میں اس کے متعلق عملی تجربے کئے گئے، ایک اسکول میں ابتدا سے بچوں کو بجائے انگریزی کے مرکب خط تحریر کے رومن کے علٰحدہ علٰحدہ حروف کے ذریعہ لکھنے پڑھنے کی مشق کرائی گئی، پھر مقابلہ میں دیکھا گیا تو وہ مرکب حروف لکھنے والوں سے زیادہ تیزی سے لکھنے اور پڑھنے کے قابل ثابت ہوئے۔

بات یہ ہے کہ خط کے حروف مفرد ہوں یا مرکب الفاظ تصویروں کا کام دیتے ہیں، اور نظریں عادی ہو جانے سے اُن کی مجموعی صورت پر نظر پڑتی ہے اور فوراً انسان لفظ کو پڑھ لیتا ہے لہٰذا یہ خصوصیت صرف آپ کے مرکب خط کی نہیں ہے، لمبے سے لمبے انگریزی لفظ کی تصویر بار بار پڑھنے سے ذہن میں جم جاتی ہے اور اُس کو انسان آسانی سے پڑھ لیتا ہے، اور اگر آپ کا ایمان راسخ یہی ہے کہ مرکب نسخ یا نستعلیق میں پڑھنے کی آسانی زیادہ رہے تو پھر آیئے انگریزی بھی اس خط میں لکھنا شروع کر دیں اور انگریزوں کو بھی یہی مشورہ دیں۔

شریف صاحب کو محمودی رسم خط میں دائروں کے حذف کرنے پر بڑا غصہ آیا ہے اور وہ فرماتے ہیں "موجودہ خط کے مقابلے میں یہ جدت بہت بھونڈی ہے .... دائرے اور کششوں کے ساتھ حرف ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتا ہے، اور یہ ہمیشہ اُس کے اختتام کی خبر دیتے ہیں"۔

شریف صاحب معاف فرمائیں یہ جدت تو بھونڈی نہیں بلکہ جناب کا اعتراض نہایت بھونڈا ہے اس لئے کہ اگر ہر لفظ کے اختتام پر دائرے، یا کشش کا وجود لازمی ہوتا تو یہ مصلحت بھی سمجھ میں آتی۔ اس کے علاوہ دنیا کے اور خطوں میں الفاظ کے آخر میں دائرے یا کشش کا وجود نہیں ہے لیکن پھر بھی الفاظ ایک دوسرے کے درمیان فاصلہ چھوڑ دینے سے علٰحدہ علٰحدہ رہتے ہیں۔۔۔ حروف کے ساتھ حرکات کو ملا کر اُن کا جزو لازمی قرار دینا ہی محمودی رسم خط کی سب سے بڑی خوبی ہے اور افسوس ہے کہ یہی فاضل محترم محمد شریف خاں صاحب شروانی ایم اے کی سمجھ میں نہیں آئی، ارے صاحب یہی تو وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عبارت کو غلط پڑھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ جب انسان ابتدا ہی سے حروف کو بشمول حرکات پہچان لے گا تو پھر غلط کیونکر پڑھ سکتا ہے، اب رہا یہ امر کہ موجودہ رسم خط میں علامات اعراب ہی کو قرآن شریف کی کتابت کی طرح کیوں نہ استعمال کریں، تو ایسا کرنے سے اول تو وہ مصلحت حاصل نہیں ہوتی کہ حروف اعراب کے ساتھ ایک بسیط شکل کی طرح ذہن میں نقش ہو جائیں، دوسرے، عام طور پر ایسا کرنا ممکن یا کم از کم سہل العمل نہیں ہے اور اس میں اعراب کے غلط لگ جانے اور چھوٹ جانے کا احتمال بھی ہر وقت غالب رہتا ہے اور اسی طوالت کی وجہ سے عربی زبان جس میں اعراب کے بدل جانے سے معنے بھی بدل جاتے ہیں، عام طور پر بغیر اعراب کے لکھی جاتی ہے۔

ہمزۂ وصل اور لام تعریف کے حذف کرنے یا قایم رکھنے کے متعلق میری رائے یہی ہے کہ اُردو کے جدید رسم خط میں وہی حروف لکھے جائیں جو بولے جاتے ہیں، اور اگر کوئی حرف بولنے سے حذف ہو جاتا ہے تو اُسے لکھنے سے بھی حذف کر دینا چاہئے، جیسا کہ ترکی کے موجودہ رسم خط میں کیا گیا ہے۔ اب رہا حرف تعریف کے معدوم ہو جانے کا ماتم تو اس کا حق آپ کو نہیں پہونچتا بلکہ عربوں کو پہونچتا ہے اور وہ بھی اُس صورت میں جبکہ عربی کا رسم خط زیر بحث ہو اور اُس میں حرف تعریف کو اُڑا دینے کی تجویز پیش کی جائے۔ اُردو زبان میں اُس کے قایم رکھنے یا حذف کر دینے سے عبارت کے مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح کہ س۔ ص اور ث کے یکساں تلفظ کرنے سے اُردو میں کوئی معنوی فرق نہیں ہوتا۔

واؤ مخلوط کے متعلق یہ کہنا ٹھیک ہے کہ بوا اور ہوا وغیرہ میں واؤ یقیناً مفتوح ہے لیکن ایسے الفاظ میں واؤ کا تلفظ نصف ہوتا ہے اور پہلے حرف کے ساتھ کچھ ملا ہوا سا معلوم ہوتا ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام واؤ مخلوط رکھا گیا، نام رکھنے کے لئے تھوڑی سی مناسبت کافی ہوتی ہے، اس پر لڑنے کی کیا ضرورت ہے، آپ چاہیں تو اس واؤ کا نام آدھا واؤ رکھ سکتے ہیں، لیکن شریف صاحب کا یہ کہنا کہ دراصل یہ ہمزہ ہے بالکل غلط ہے اس لئے کہ ایسے الفاظ بولتے وقت ہمزہ کا تلفظ پیدا نہیں ہوتا۔ یہی حال یائے مخلوط کا ہے لہٰذا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

ہائے مخلوط پر فاضل معترض نے اصطلاحات کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر بڑے زور شور کا حملہ کیا ہے، اس کے متعلق میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دراصل اُردو میں ہندی کی طرح ایک بھ اور ایک پھ، ایک تھ اور ایک چھ وغیرہ کی علٰحدہ علٰحدہ شکلیں ہونی چاہئے تھیں لیکن محض اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے دو حرفوں کو ملا کر کام چلایا گیا ہے، اب رہی اس کے متعلق آپ کی علمی تحقیقات تو میں اس کو غیر ضروری خیال کرتا ہوں۔

شریف صاحب نے کسی موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ میں تو اس (محمودی رسم خط) کو نستعلیق کی مدد سے پڑھ سکا، گویا آپ کا نہ پڑھ سکنا اس بات کی قطعی دلیل ہو گئی کہ اس خط کے ذریعہ سے پڑھنا نستعلیق سے زیادہ مشکل ہے، واہ صاحب کیا بات کہی، جس رسم خط کو آپ نے پہلی مرتبہ دیکھا ہو اور پھر اُس کے ساتھ آپ کو "ہمدردی" بھی نہ ہو اُس میں آپ آسانی سے پڑھ سکتے ہیں یا اُس خط کو جس سے آپ کی نظریں، اور آپ کا حافظہ عرصے سے عادی ہو گیا ہے، سوال تو یہ ہے کہ محمودی رسم خط جس میں غلط پڑھنے کا امکان نہیں، جس میں اعراب جزو حروف بنا دئے گئے ہیں جس میں ہر حرف کی ایک ہی شکل ہے اور ہر حرف علٰحدہ لکھا جاتا ہے اور حروف کے سرے وہی ہیں جو موجودہ حروف کے ہیں، اصولاً اُس کو آسان ہونا چاہئے یا موجودہ رسم خط کو جس کے نقائص تفصیل سے اوپر بیان کئے جا چکے ہیں۔ اب غالباً آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ جب نظریں اس خط سے عادی ہو جائیں گی تو موجودہ خط کے مقابلہ میں اس میں بہت زیادہ سہولت ہوگی

اور اہم خط کا مقصد یہی ہے۔

محمد شریف خاں صاحب کے مضمون کا سب سے زیادہ مہمل حصہ وہ ہے جو انھوں نے اُردو کی حرکات اور یائے معروف و مجہول اور واؤ معروف و مجہول اور ہائے مخلوط کی تحقیقات کے لئے وقف کیا ہے حرکات کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

"زبان اُردو کی حرکات پر اب تک کسی نے توجہ نہیں کی قواعد کی سب کتابیں اس سے خالی ہیں اس سے جو کچھ میں بیان کروں گا وہ بالکل نئی بات ہے" پھر آگے چل کر زبر کی دو قسمیں فتحہ مستقیم اور فتحہ مائل، اور زیر اور پیش کی بھی دو دو قسمیں معروف و مجہول قرار دی ہیں، اس لئے اب بجائے تین کے چھ حرکتیں ہو گئیں، پھر آپ نے "زبان کی صحیح ترجمان کے لئے" ہر ایک کے علٰحدہ "نام اور نشان" کی ضرورت محسوس کی ہے، اس ایجادِ بندہ کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ ایسی حرکتوں سے کیا فایدہ' اول تو ان کے تلفظ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے جس کے لئے نئی علامتیں مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئے اور اسی وجہ سے متقدمین نے بھی اس کو غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ زیر زبر اور پیش کی تین علٰحدہ علٰحدہ علامتیں لگانا ہی کیا کچھ کم طوالت نہیں ہے کہ اس پر تین مزید غیر ضروری علامتوں کا اضافہ کیا جائے۔

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ "اس تقریر سے واضح ہے کہ معروف و مجہول واؤ اور یا کی اصطلاحیں سراسر لغو ہیں" میں کہتا ہوں کہ آپ اپنی تحقیق سے کچھ بھی ثابت کریں، فرق کمیت کا ہو یا کیفیت کا، معروف و مجہول کی آوازیں واؤ اور یے سے پہلے حرف کی حرکت کی کیفیت اور نوعیت پر منحصر مانی جائیں یا واؤ اور یے کے تلفظ میں معروف و مجہول کی مختلف آوازوں کا وجود سمجھا جائے نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، واؤ اور یے معروف و مجہول کے فرقِ تلفظ کو ہر ایک محسوس کرتا ہے اور امتیاز کے لئے معروف و مجہول کی مختلف آوازوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ علامتیں رکھی گئی ہیں، یا صورت کا فرق قایم رکھا گیا ہے، اب اس مصیبت برپا کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر حقیقت میں یہ تنازع للبقا کا کوئی اہم مسئلہ ہے تو وہ میرے موضوع میں کوئی خرابی نہیں ڈالتا، میں نے تو اُردو لکھنے کا ایک نیا طریقہ نکالا ہے اور جس طرح پہلے سے معروف و مجہول کی اصطلاحیں اور علامتیں پائی جاتی ہیں، میں نے اپنے رسم خط میں بھی اُن کے لئے علٰحدہ علٰحدہ نشانات رکھے ہیں۔

اس کے بعد شریف صاحب نے تازہ دم ہو کر ہائے مخلوط اور ہائے مخلوط پر خامہ فرسائی فرمائی ہے اور اس ذیل میں خدا جانے کیا کیا لکھ گئے ہیں جو کہیں تو سمجھ میں آتا ہے اور کہیں نہیں آتا۔ اس بحث کے جوابات کی طرف میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں لہذا اب اس پر وقت ضایع کرنا وقت کا مجرمانہ اسراف ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے جو رسم خط پیش کیا ہے اس کے متعلق میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ اس میں اصلاح کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یا اس میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو وہ پوری نہیں کیجا سکتی، یا اس کے حروف کی شکلوں میں کسی قسم کے اصلاحی تغیر کرنے کی گنجایش نہیں، میں نے تو چند خاص اُصول کے پیشِ نظر یہ تجویز پیش کی ہے اور وہ اُصول میرے خیال میں بجائے خود صحیح اور درست ہیں، بلحاظ آسانی اور تکمیل کے اُردو کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا رسم خط نہیں ہو سکتا۔

محمود علی خاں بی-اے

نگار کے پچھلے پرچے

سنہ ۲۶ء: جنوری ۱۰ر - سنہ ۲۷ء: اگست ۸ر - سنہ ۲۹ء: مئی ۸ر - سنہ ۳۱ء: جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ، ستمبر ۱۰ر - اکتوبر ۱۲ر - نومبر دسمبر ۸ر فی پرچہ - سنہ ۳۲ء: جنوری ۱۲ر - فروری ۱۲ر - مارچ ۱۰ر - سنہ ۳۳ء: فروری ۱۰ر - سنہ ۳۴ء: فروری تا دسمبر ۱۰ر فی پرچہ - سنہ ۳۶ء: دسمبر ۱۰ر فی پرچہ - سنہ ۳۷ء: فروری ۱۰ر، مارچ تا اگست ۱۲ر فی پرچہ، اکتوبر ۱۰ر فی پرچہ - سنہ ۳۸ء: فروری ۶ر - اپریل ۱۰ر - مئی تا دسمبر ۱۰ر فی پرچہ سنہ ۳۹ء: فروری تا جولائی ۸ر فی پرچہ - اکتوبر، نومبر ۱۲ر فی پرچہ، اگست تا دسمبر ۱۰ر فی پرچہ - سنہ ۴۰ء: فروری تا مئی ۶ر فی پرچہ جون ۱۲ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۶ر فی پرچہ -

منیجر نگار لکھنؤ

شادی کی رسمیں اور اُنکی عمرانی اہمیت

شادی محض ایجاب وقبول کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے بعد بھی چند رسمیں ادا کرنا ضروری ہوتی ہیں جن کا سلسلہ ہر سوسائٹی میں قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ہرچند کہ یہ رسمیں تکمیل شادی کے لئے ناگزیر نہیں ہیں لیکن سوسائٹی کا زور اور دباؤ لوگوں کو اُن کی ادائگی پر مجبور کرتا ہے۔

عمرانی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے اِن رسوم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو تعلقاتِ صحیحہ کا علم ہوجائے۔ بقول مس برن کے اِن رسوم میں یہ شہرت ہی کا عنصر ہے جو جائز اور ناجائز رشتوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے اور اس کا اہتمام صرف مہذب ہی لوگوں میں نہیں ہے بلکہ غیر مہذب لوگ بھی اس کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ قومیں جو تہذیب وتمدن سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں اُن میں قبیلہ کا سب سے بڑا آدمی شادی (جائز جنسی تعلقات) کا اعلان کرتا ہے۔ مسلمانوں میں دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ رومیوں میں شادی کے وقت پورے دس گواہوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ٹیوٹانی ملکوں میں اب تک بعض بعض جگہ یہ رسم ہے کہ دولہا دلہن گواہوں کے سامنے ایک چادر کے اندر لیٹتے ہیں اور جب تک یہ منظر وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں شادی مکمل نہیں ہوتی۔ مشرقی افریقہ کی بنتو قوم میں دُولہا دُلہن کی 'پہلی خلوت' جلوت ہی ہوتی ہے۔ اور اِس موقع پر قبیلہ کی عورتوں اور لڑکیوں کی موجودگی ازبس ضروری سمجھی جاتی ہے۔ شادی کے موقع پر دعوتوں اور ضیافتوں کا ایک مقصد (مسرت اور اتحاد سے قطع نظر) یہ بھی ہے کہ اس طرح شادی کا زیادہ سے زیادہ اعلان کیا جائے۔

شادی فریقین کے ایتلاف واتحاد کی مظہر ہے اسی وجہ سے بعض ملکوں میں دلہن کا ہاتھ دولہا کے ہاتھ میں دیدیا جاتا ہے۔ بلغاریہ، پرتگال، پولستان اور ہندوستان کے بعض حصوں میں محض ہاتھ کے ملانے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں ہاتھوں کو باندھ دیا جاتا ہے۔ یوپی کے بعض شہروں میں دونوں کے دامن میں گرہ لگا دیجاتی ہے۔ برطانوی مشرقی افریقہ میں دونوں کلائیوں پر کسی پودے کی ٹہنی باندھ دیجاتی ہے۔ شاید انگوٹھی کی رسم کا بھی ابتدائی مفہوم یہی ہوگا۔ عہد متوسط کے درمیان یورپ میں انگوٹھیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ جو بہت سے توہمات وابستہ ہیں وہ اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ یہ اتحاد کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اسکاٹستان کے شمالی مشرقی اضلاع میں لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی عورت انگوٹھی کھو دے گی تو وہ اپنے محبوب شوہر سے بھی محروم ہوجائے گی۔

ایک اور عام رسم دولہا دولھن کے ساتھ کھانے کی ہے جو مہذب اور غیر مہذب دونوں میں یکساں طور پر مروج ہے۔ ہندوستان اور یونان میں ایک ہی رکابی یا پتہ میں کھانے کی رسم بہت قدیم ہے۔ اِن مواقع پر یورپ میں بھی ایک چمچے سے کھانے یا ایک ہی چیز میں شرکت کرنے یا ایک ہی پلیٹ میں شامل ہونے کی رسم اب تک جاری ہے۔ سوئیڈن میں بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر لڑکا لڑکی ساتھ کھائیں گے تو ان میں محبت پیدا ہوجائے گی۔ مسلمانوں میں بھی میاں بیوی کا ساتھ کھانا مستحسن ہے۔ کھانے کے علاوہ ساتھ پینے کی بھی رسم ہے۔ چین میں تعلقاتِ زناشوئی سے قبل دولھا دولھن شراب یا شہد پیتے ہیں اور اس کا قاعدہ یہ ہے کہ دونوں کے پیالے ایک سُرخ ڈوری سے باندھ دئے جاتے ہیں۔ دولھا اپنے پیالہ میں سے پینے کے بعد دولھن کو دیدیتا ہے اور دُولھن اپنا جھوٹا پیالہ دولھا کو دیدیتی ہے اور یہ عمل کئی بار دہرایا جاتا ہے۔ جاپان میں یہ تبادلہ کی رسم نو مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ یہودیوں اور روس، اطالیہ، ناروے اور اسکاٹستان کے باشندوں میں بھی ساتھ پینے کی رسم پائی جاتی ہے۔

بعض ملکوں میں شادی کے موقع پر انڈے، شیشہ کی چیزیں یا مٹی کے برتن توڑے جاتے ہیں۔ پروفیسر وسٹر مارک اور دوسرے محققین کا یہ خیال ہے اس سے نفاذ کی سہولت مقصود ہوتی ہے۔ یوبرگ میں یہ قاعدہ ہے کہ دولھا دلہن جب موخر الذکر کے مکان سے رخصت ہوتے ہیں تو دولھا کے سر پر ایک پلیٹ توڑی جاتی ہے۔ سافلڈ (Seafeld) میں دولہا شراب کے گلاس کو خود سر کے پیچھے پھینک کر توڑ دیتا ہے۔ اگر کسی اتفاق سے نہ ٹوٹے تو اسے بڑا برا خیال کیا جاتا ہے۔ جرمنی میں بھی بعض بعض جگہ یہ رسم موجود ہے وہاں چینی کے برتن دلہن کے مکان کے سامنے توڑے جاتے ہیں اور اُن کا جتنا بڑا ڈھیر ہوگا اتنی ہی یہ خوش نصیبی کی علامت سمجھی جائے گی۔ یہودیوں میں آج تک شادی کے موقع پر شیشے توڑے جاتے ہیں۔

متذکرۂ بالا رسم کے صحیح معنی آج تک نہیں معلوم ہوسکے لیکن بعض ملکوں کی رسمیں وسٹر مارک کے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ سربی قوم میں یہ رسم ہے کہ خاندان کا بزرگ آدھی رات کے وقت دلہن کو دولہا کے کمرے میں پہونچا دیتا ہے اور کمرہ باہر سے بند کر دیتا ہے، اس کے بعد فریقین کے لئے جام صحت پی کر اسے دروازہ پر توڑ دیتا ہے جو اختتام دوشیزگی کا اعلان ہوتا ہے۔ پروفیسر وسٹر مارک لکھتا ہے کہ وسط مراکش کے (Aithyusi) لوگوں میں یہ قاعدہ ہے کہ دلہن اپنے نئے گھر کو گھوڑی پر سوار ہو کر جاتی ہے اور اپنے سامنے ایک بید کا ٹکڑا رکھتی ہے جلوس کے ارکان اس بید کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ جب میں نے دریافت کیا کہ تم لوگوں نے یہ کیوں کیا تو انھوں نے جواب دیا "اس لئے کہ دولھا کو بھی پہلی شب میں ایسی ہی فتحیابی نصیب ہو" شادی کے

موقعوں پر سرخ رنگ کا استعمال بھی اسی غرض سے ہوتا ہے کینٹن کے چینی مسہری سے سرخ کاغذ کی دھجیاں باندھ دیتے ہیں اور اُن پر اس قسم کا کوئی دعائیہ جملہ لکھ دیتے ہیں کہ "خدا کرے تمھارے ہزاروں بچے اور پوتے ہوں" ہندوستان اور افغانستان میں عموماً عروسی کپڑے سرخ ہوتے ہیں۔

عام طور پر شادی وہی کامیاب سمجھی جاتی ہے جس میں بچے پیدا ہوں اولاد نرینہ اور بھی خوش نصیبی کی علامت سمجھی جاتی ہے چنانچہ بعض رسمیں محض انھیں مقاصد کے لئے ادا کی جاتی ہیں۔ مراکش میں یہ قاعدہ ہے کہ دولھا کی ماں اپنے بیٹے کے پُرانے کپڑوں کی گٹھری اس طرح لے کر نکلتی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ ایک چھوٹے بچے کو کھلا رہی ہے یا کبھی کبھی دولہن کی ماں ایک پلنے میں لٹا دی جاتی ہے اور اسے بالکل اس طرح ہلایا جاتا ہے جیسے ایک شیر خوار بچے کو ہلا کر سلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دلہن اپنی سسرال کو گھوڑی پر بیٹھ کر جاتی ہے مادہ جانور کا انتخاب اس بات کی طرف کنایہ ہے کہ اُس کے بہت سے بچے ہوں اور اس کی گود ہمیشہ بھری رہے۔ کبھی کبھی دُلہن کے پیچھے ایک بچہ بٹھا دیا جاتا ہے اس سے اولاد نرینہ کی تمنا مقصود ہوتی ہے۔ سویڈن کے بعض حصوں میں رخصتی سے ایک روز قبل دُلہن کے پاس ایک بچہ سلایا جاتا ہے تاکہ پہلوٹی کا بچہ لڑکا ہی ہو۔ قدیم ہندوستان میں بھی دُلہن کی سسرال میں قدم رکھتے ہی ایک بچہ بطور نیک شگون کے گود میں رکھ دیا جاتا تھا۔

بعض ملکوں میں دولھا دلھن پر اناج یا پھل پھینکنے کا رواج ہے۔ قدیم یونان میں دلھن پر سسرال کے اندر کھجوریں اور انجیر وغیرہ کی بارش کی جاتی تھی۔ روم میں بھی کسی گری دار میوے کی بکھیر ہوتی تھی۔ فرانس کے بعض اضلاع میں گیہوں نچھاور کیا جاتا تھا۔ انگلستان میں بھی سترھویں صدی تک دولہن کے اوپر گیہوں برسائے جاتے تھے مین ہارٹ (Mannhardt) لکھتا ہے کہ یہ رسمیں دراصل اسی تعلق کا پرتو ہیں جو انسان اور پھل یا بیج پیدا کرنے والے پودوں کے درمیان پایا جاتا ہے یا نتیجہ ہیں اُس مماثلت کا جو نطفہ اور بعض اعضائے جسمانی میں پائی جاتی ہے۔ بعض محققین یہ کہتے ہیں کہ ان رسموں سے محض "بارآوری" مقصود ہے لیکن فی الحقیقت ان رسموں میں کئی مقاصد آ کر اس طرح مل گئے ہیں کہ اُن کو الگ کرنا مشکل ہے۔ بعض وقت ان سے خوشحالی اور بارآوری مقصود ہوتی ہے اور بعض وقت دولھا یا دُلہن کو "نظر بد" سے بچانا اصل مدعا ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک میں ان رسموں کے مختلف سبب بتلائے جاتے ہیں۔ اس سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا اصلی مقصد فراموش کیا جا چکا ہے اور بعد میں مختلف قسم کے معنے پہنا دئے گئے ہیں۔

بعض ملکوں میں شادی کے موقع پر انڈے کا بھی کسی نہ کسی طرح استعمال ضرور ہوتا ہے۔ مراکش کا یہودی دولھا، دُلہن پر کچا انڈا پھینکتا ہے اس سے ایک محقق کے نزدیک اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس کی بیوی کو وضع حمل میں آسانی ہو۔

روس کے یہودی دُلھن کے آگے صرف انڈا رکھ دیتے ہیں اور اس سے مدعا یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ جس طرح مرغی کو انڈا دینے میں دشواری نہیں ہوتی ایسے ہی خدا اس کی منزل کو بھی آسان کرے۔ اس کے علاوہ انڈا کثرت اولاد کی نشانی ہے۔ سویڈن میں دُلہن کے تسمے کھلے رہتے ہیں تاکہ جس آسانی سے وہ جوتا اُتار سکتی ہے ایسے ہی ولادت میں بھی سہولت ہو۔

مرد نے عورت پر اپنا ذاتی تفوق قایم رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے چنانچہ بعض ملکوں میں اس قسم کی رسمیں ہیں جو اس جذبۂ حکمرانی کی غمازی کرتی ہیں۔ کروشیا میں دولہا، دلہن کے آہستہ آہستہ کے لگاتا ہے اور اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آیندہ وہ حاکم ہے اور بیوی محکوم۔ روس میں دُلہن کا باپ ایک نیا کوڑا لیکر آہستہ آہستہ اسے مارتا ہے اور کہتا ہے کہ "یہ میں نے تجھے آخری بار مارا ہے اب کبھی نہ ماروں گا" اس کے بعد وہ دولہا کو کوڑا دیکر اپنے اختیارات اُسے سونپ دیتا ہے۔ ہنگری کی سلاف قوم میں یہ دستور ہے کہ دولھا دُلھن کو تین دفعہ پیٹتا ہے اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دُلہن اپنے پچھلے دوستوں کو بھول جائے اور آیندہ سے شوہر کو اپنا مالک اور آقا سمجھے۔

بعض رسمیں اس کشمکش کی آئینہ دار ہیں جو دولہا دُلہن کے درمیان ایک دوسرے پر غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جرمنی کے بعض علاقوں میں جب پادری دونوں فریق کے ہاتھ ملاتا ہے اسوقت دولھا دُلھن دونوں اپنا ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بعض وقت یہ بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پادری مرد کا ہاتھ اوپر رکھ کر فیصلہ کر دیتا ہے۔ روس میں دولہا دُلہن دونوں کو جام شراب پیش کیا جاتا ہے اور دونوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے چند قطرے دوسرے گلاس میں ڈالدیں۔ جو اس کوشش میں پہلے کامیاب ہو جاتا ہے وہی اُنکے عقیدہ کے مطابق ازدواجی زندگی میں بااثر اور بااختیار رہتا ہے۔ مراکش کے بعض اضلاع میں دُلہن مینڈھے پر (جو شوہر کا قایم مقام ہوتا ہے) سوار کی جاتی ہے اور وہ بیٹھنے سے قبل اسکے گلے میں ایک طوق یا ہار ڈالدیتی ہے جس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ شوہر مطیع و فرمانبردار رہے۔ اس کے بعد مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے اور جب اس کی انتڑیاں نکال دی جاتی ہیں تو دلہن اس پر اپنا پیر رکھ دیتی ہے۔ اس ملک میں یہ رسم بھی ہے کہ جب دولھا حجلۂ عروسی میں داخل ہوتا ہے تو دُلہن اُس پر اپنا سلیپر اُٹھا کر پھینکتی ہے اور کبھی کبھی اُسے باقاعدہ پیٹتی ہے اگر وہ فریاد کرنے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بیوی کا غلام رہے گا۔ اسی قسم کی رسمیں ہندوستان کے بھی بعض حصوں میں پائی جاتی ہیں۔

دولہا دُلھن کو آسیب سے بچانے کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگوں کا عام طور پر یہ خیال تھا کہ ان دونوں کو نظر لگ سکتی ہے اور اُن پر بھوت پریت کا بھی اثر ہو سکتا ہے اسلئے بعض رسمیں ایسی وضع کی گئیں جن کا مقصد محض تحفظ ذاتی ہے۔ روس میں تمام دروازے کھڑکیاں اور روشن دان بند کر دئے جاتے ہیں تاکہ اُن پر جادو اور سحر کا اثر نہ ہو۔ شادی کے موقع

پر تو ہیں اور بندوقیں اسی مصلحت کی بنا پر چھوڑی جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بھوت پریت شور و غل اور آگ وغیرہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ مراکش میں دلہن جس جانور پر سوار ہو کر آتی اس کے سامنے بہت زور سے باجہ بجایا جاتا ہے اور دلہن کے قریب توپیں داغی جاتی ہیں کہ وہ دھوئیں سے ڈھک جاتی ہے۔ کبھی کبھی خاص اُس کے کمرہ میں کوئی پٹاخہ چھوڑا جاتا ہے تاکہ وہ جن اور پری کے اثر سے پاک ہو جائے۔ سلاو قوم کے لوگ، جب دولہا دلہن خلوت میں ہوتے ہیں تو حجلۂ عروسی کے باہر خوب شور و غوغا کرتے ہیں۔ بعض قوموں کا یہ عقیدہ ہے کہ ارواح خبیثہ لوہے سے ڈرتی ہیں اسلئے دولہا دلہن اپنے پاس لوہے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور رکھتے ہیں۔ عیسائی ملکوں میں کچھ دیر کے لئے دلہن کے اوپر تلواروں کی صلیب بنا دی جاتی ہے۔ پروفیسر ویسٹر مارک کا خیال ہے کہ ان مواقع پر غسل کرنے اور مہندی لگانے کی رسمیں بھی حفظ ماتقدم کے طور پر ادا کی جاتی ہیں اور انکا مقصد اصلی محض احتیاطی یا طہارتی ہے۔ پروفیسر موصوف کے نزدیک مہندی خیر و برکت کی نشانی ہے۔ شادی کے موقعوں پر روشنی کا اہتمام بھی اُس کے نزدیک زیادہ تر اسی وجہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ بھوت پریت روشنی سے ڈرتے ہیں اور تاریکی میں خوش رہتے ہیں۔ اُن کے ڈرانے کے لئے تمام محفل کو بقعۂ نور بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوؤں میں دولہا دلہن کے سر پر چراغ کو گھمایا جاتا ہے۔ چین میں دلہن تیز اور روشن آگ کو پھلانگتی ہے۔ جرمنی میں دلہن تین مرتبہ تیز آگ کے گرد طواف کرتی ہے۔ بعض یورپی ملکوں میں اسے کلیسا کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ یہ سب رسمیں دافع آسیب خیال کی جاتی ہیں۔ من آرٹ کہتا ہے کہ دولہا دلہن کو پیٹنے کی رسم بھی دراصل خراب اثرات رفع کرنے کی غرض سے ہی عمل میں آئی ہے تاکہ ارواح خبیثہ بچوں کے پیدا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ ارواح خبیثہ کو دھوکا دینے کے لئے دلہن، دولہا کا اور دولہا، دلہن کا لباس پہن لیتا ہے۔ تمام لوگوں میں یہ رسم آج تک موجود ہے۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ کوس میں بھی اسی قسم کی رسم رائج تھی۔ اسپارٹا میں جب دلہن حجلۂ عروسی میں شوہر کا انتظار کرتی تھی تو اس کو مردانہ کپڑے اور جوتے پہنا دئے جاتے تھے۔ مراکش کے اجنبی دیہاتوں میں دلہن کے مونچھیں لگا دی جاتی ہیں۔ ڈنمارک کے بعض مواضعات میں دولہا دلہن ایک دوسرے کے کپڑے پہن کر آنکھ مچولی کی مشق کرتے ہیں۔

پروفیسر ویسٹر مارک کہتا ہے کہ ان تمام رسموں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صرف بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہیں۔ ممکن ہے ان میں کچھ اور بھی مقاصد شامل ہوں۔ کرالے (Crawley) کا خیال ہے کہ جانبین ایک دوسرے کا لباس جنسی ڈر اور خوف کم کرنے کی غرض سے پہن لیتے ہیں اس طرح وہ "من و تو" کا فرق مٹا کر معاشرت کو آسان کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا ڈر کم و بیش دونوں فریق کو ہوتا ہے۔ بعض قوموں میں بھوت پریت کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹ موٹ کی دلہن یا جھوٹ موٹ کا دولہا بنا دیا جاتا ہے۔ یہ رسم سلاف، ایسٹونانی اور رومانی لوگوں میں رائج ہے۔ بوہیریا میں ایک ریش دار آدمی کو دلہن کے کپڑے پہنا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں مصنوعی شادی کا بڑا رواج ہے۔ شمالی ہند میں پیڑوں سے شادی کی جاتی ہے اور اس سے مقصود عموماً آسیب یا "نظر بد" سے بچانا ہوتا ہے کبھی کبھی ایک گھڑے کو مرد کے کپڑے پہنا دئے جاتے ہیں۔ اور لڑکی کی شادی اس سے کر دی جاتی ہے بعد میں یہی تمام رسمیں "اصلی" موقع پر بھی دہرائی جاتی ہیں۔ مصر میں جب دولہا رخصتی سے پہلے مسجد کو جاتا ہے تو اس کے دو ساتھی اُسی کے سے کپڑے پہنے رہتے ہیں اور دولہا اُن کے بیچ میں ہوتا ہے۔ انگلستان کے بعض حصوں میں اسی قسم کی رسم دلہن کے لئے رائج ہے۔ اسکی ساتھ والیاں بالکل ویسا ہی لباس پہنتی ہیں کہ دلہن میں اور اُن میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتی ہے بعض جگہ ساتھ والوں کو بغیر کھلیس بدلے ہی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ شٹ لینڈ میں دولہا کا ساتھی، دولہا کے ساتھ سوتا ہے۔ بعض قوموں میں دلہن کے ساتھی، شب زفاف میں بھی موجود رہتے ہیں۔

پروفیسر ویسٹر مارک کہتا ہے کہ دلہن کے چہرہ کو ڈھکنے کا آغاز بھی آسیب کے ڈر سے ہوا ہے۔ مراکش کے اطراف و جوانب میں خود دلہن کی نظر کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ اپنی آنکھ اُس وقت تک بند رکھتی ہے جب تک کہ دولہا کو نہ دیکھ لے۔ ہندوستان قدیم میں دولہا، دلہن کی "نگاہ فتنہ انگیز" سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ عہد عتیق میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دولہا دلہن پر آفت آسمان اور زمین دونوں طرف سے آ سکتی ہے۔ اسی وجہ سے سلاف قوم میں دولہا اپنے سر کو ہر وقت ڈھکے رہتا ہے اور سریانی دلہنیں اپنی کلاہ عروسی رات کو بھی نہیں اُتارتی ہیں۔ غالباً اسی سبب سے بعض ملکوں میں خصوصاً ویلس، چین وغیرہ میں دلہن زمین پر پیر نہیں اُتارتی ہے اسے دولہا یا کوئی اور شخص گود میں لیکر پلنگ تک پہونچا دیتا ہے۔ موخر الذکر رسم میں ممکن ہے حجاب دوشیزگی کو بھی دخل ہو جو نئے گھر کے اندر چلنے میں مانع آتا ہے لیکن ویلس۔ اسکاٹ لینڈ، اور چین کے بعض حصوں میں دلہن کا زمین پر قدم رکھنا قطعی طور پر منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بعض قوموں میں دولہا دلہن کو آسیب سے نجات، خاموشی، کم خوراکی، فاقہ کشی یا کچھ دنوں کی "پرہیزگاری" سے ملسکتی ہے۔ جرمنی، اور سوئزرلینڈ اور فرانس کے بعض اضلاع میں شادی کے بعد تین راتوں تک زفاف کی نوبت نہیں آتی۔ یورپی ملکوں میں اس رسم کی ترویج میں عیسائیت نے بھی مدد دی ہے۔ لیکن یہ رسم قدیم ہے اور عیسائیت سے پہلے سے رائج ہے۔ اس "رسم اجتناب" کا ایک ابتدائی سبب جنسی حجاب بھی ہو سکتا ہے جو فریقین میں اکثر پایا جاتا ہے۔ لیکن پروفیسر ویسٹر مارک اسکی قوی تر وجہ توہم پرستی قرار دیتا ہے۔ اولڈن برگ کہتا ہے کہ "ویدک عہد میں لوگوں کو یہ ڈر تھا کہ ہم بستری کے وقت کہیں ارواح خبیثہ عورت کے جسم میں داخل نہ ہو جائیں اور اسے حاملہ نہ کر دیں لیکن یہ بے وقوف روحیں پرہیزگاری کے دام فریب میں آ جاتی ہیں اور پھر اس جانب توجہ نہیں کرتیں"۔

ہر ملک و ہر رسم بڑی پرانی شئی ہے ہر ملک کی ازدواجی رسموں پر ایک مبسوط کتاب طیار ہو سکتی ہے۔ لیکن اوپر کی چند سطروں میں مختصراً ان رسوم کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جن میں انسان کی زندگی کے خط و خال نمایاں ہیں۔ یہ جو اس کی مختلف کیفیات و جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کے عہد طفولیت میں، جبکہ اسکی دلچسپیاں محدود تھیں، یہ رسمیں بڑی اہم اور نشاط انگیز سمجھی جاتی تھیں لیکن نئی روشنی نے عہد ماضی کی بہت سی یادگاریں مٹا دی ہیں۔ چنانچہ آج یہ تو خورشید نے ان ازدواجی رسموں کو بھی درس فنا دیا ہے۔ یہ جہاں باقی ہیں وہاں بھی اُن پر نزع کی سی کیفیت طاری ہے اس لئے کہ موجودہ انسان کی گونا گوں زندگی اس درجہ وسیع، ہنگامہ خیز اور حقیقت پسند ہو گئی ہے کہ اسکے پاس ان چیزوں کے لئے وقت نہیں ہے۔ رہا نشاط زندگی کا سوال سو اُسکے لئے اُس نے پہلے سے زیادہ دلکش طریقے ایجاد کر لئے ہیں اور مستی اور خوش عیشی کا یہ عالم ہے کہ "نازد بفلک و حکم بر ستارہ کنم" کی روایتیں حقیقت بنکر اُسکے سامنے آگئی ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی-اے

اب سے ساٹھ سال بعد

آنے والی نئی دُنیا!

آنے والی نئی دُنیا سائنس کی کن ترقیوں کی حامل ہوگی؟ ۱۹۴۲ء سے لیکر ۲۰۰۰ء تک فطرت کے کتنے نئے رازوں سے ہم واقف ہوچکے ہوں گے اور اس واقفیت کو ہم اپنی مادی اور ذہنی زندگی کی تعمیر میں کس حد تک استعمال کرچکے ہوں گے؟ یہ وہ سوال ہیں جن کے جواب کو معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

مستقبل جس کا خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا جارہا ہے بہت زیادہ دور نہیں ہے اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان پیدا ہونے والے بہت سے انسان اس نئی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگر عصر حاضر کے رجحانات اور محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو مستقبل کے متعلق دو باتیں قطعی طور پر واضح ہوجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال ہماری تمدنی زندگی کی بہتری کے لئے ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ ۲۰۰۰ء کے بعد جو زندگی ہم بسر کریں گے اس کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہوگا۔

اسوقت تک سائنس کی تمام ترقی محض انفرادی کوششوں کا نتیجہ رہی ہے۔ حکومت نے ان کوششوں میں ارتباط پیدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومتوں نے تخریبی ایجادات کی ہمت افزائی ضرور کی ہے لیکن ایجادات کی ہمت افزائی کو علمی ترقی نہیں کہا جاسکتا۔ دُنیا کے وہ تمام سائنسداں جو جرنیں استعماری سیاست سے الگ رہے ہیں اور جنھوں نے انسانی تخریب کے لئے اپنے ذہن ودماغ کو وقف کرنے سے انکار کیا، وہ ہمیشہ مصیبت وافلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔ جرمنی سے عصر حاضر کے سب سے بڑے مفکر آئنسٹائن کا اخراج اس بیان کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اسوقت تک حکومت نے اپنی دولت انھیں کوششوں کے لئے وقف کی ہے جن کا مقصود ہمارے تمدن کی تخریب ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ حکومتوں نے سائنس کی ترقی کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی بلکہ انھوں نے سائنس کی کوششوں کو برباد کرانے کے لئے خود سائنس کو استعمال کرنے کی ترکیب ضرور اختیار کی۔ مگر آنے والی سائنس کی نئی دنیا غالباً ایسی نہ ہوگی۔ کیونکہ اسکے خلاف سائنس کی دنیا میں احتجاج کی بنیاد شروع ہوگئی ہے اور ہوسکتا ہے کہ حکومتوں کو ایک خاص محکمہ "وزارت مفکرین" کے نام سے قایم کرنا پڑے۔ اس وزارت کے اراکین وہ ہوں گے جو سائنس، صنعت اور ایجادات کی مختلف شاخوں کے ممتاز افراد ہوں گے۔ یہ وزارت اُن تمام افراد کی کوششوں میں جو اب تک ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر کام کرتے ہیں، ارتباط پیدا کرسکے گی اور اس طرح وقت ومحنت کا بیکار استعمال ناممکن ہوجائے گا۔ موجدین کی سرکاری امداد بھی ہوسکے گی جو عصر حاضر میں صرف روس میں ممکن ہوسکی ہے اور امریکہ میں میلان انسٹیٹوٹ نامی جماعت بھی اس سلسلہ میں ایک حد تک مصروف عمل ہے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جماعتوں کی رفتار کا انحصار محض منظم ذہنی قوت پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سائنس کی ترقی کا یہ نیا نظام، انسانی حیات کو بہتر بنانے کا دوسرا نام ہوگا۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، مستقبل کے نظام میں دو باتیں یقینی پائی جائیں گی۔ ایک یہ کہ سائنس کا استعمال حیات انسانی کی بہتری کے لئے ہوگا اور دوسرے یہ کہ تمدن انسانی کا تعلق جمہوری تنظیم سے ہوجائے گا۔ کیونکہ جس "وزارت مفکرین" کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وہ اسی وقت کام کرسکے گی جب سیاسی طور پر ہم اپنے موجودہ نظام حکومت میں بنیادی تبدیلی کریں اسلئے ہماری آیندہ زندگی بلاشبہ ایک جمہوری تنظیم سے وابستہ ہوگی اور اس جمہوری تنظیم اور موجودہ پارلیمنٹری نظام حکومت میں بڑا فرق ہوگا۔ آج دنیا کے اُن تمام ممالک میں جہاں پارلیمنٹری نظام پوری طرح سے جاگزیں ہوچکا ہے، ہر بالغ رائے دے سکتا ہے اور پارلیمنٹ کے انتخاب میں کھڑا ہوسکتا ہے، گویا پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے علم اور تجربہ کی کوئی قید نہیں اور نہ صحیح نمایندگی کا معیار علمی ارتقاء سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے آج ایک شخص خود کو کسی خاص مفاد کا محافظ بتلاکر پارلیمنٹ کا ممبر بن جاتا ہے اور پھر اس منصب کو نہایت غلط طریقے سے استعمال کرتا ہے مگر آیندہ جو جمہوری تنظیم قایم ہوگی اس کی پارلیمنٹ کے اراکین مختلف پیشوں، شعبوں اور تحریکوں کے نمایندوں کی حیثیت سے منتخب ہوں گے اور ہر پیشہ کے لئے ایک خاص امتحان کا پاس کیا جانا لازمی قرار دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ انتخابات بھی مختلف طبقوں کی تناسب آبادی کے لحاظ سے ہوں گے اور خاص مسئلہ میں رائے

دہندگان کی رائے معلوم کرنے کے لئے رائے دینے والوں کو بھی پارلیمنٹ میں طلب کیا جاسکے گا۔ بہرحال آنے والی نئی دنیا سائنس کی تنظیم اور نظامِ حکومت کے لحاظ سے بالکل دوسری چیز ہوگی لیکن چند چیزیں اس وقت کی بھی باقی رہیں گی کیونکہ وہ ہمارے تمدن کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ ان چیزوں میں کتابیں اور سائکلیں شامل ہیں۔ طباعت کی حرفت میں کسی بہت بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ہے اور نہ دنیا کے علمی ورثہ کو محفوظ رکھنے کا اس سے بہتر ذریعہ معلوم ہوسکا ہے اس لئے کتابوں کا بدستور رہنا ظاہر ہے۔ اسی طرح بائیسکل میں بھی تفصیلی تبدیلیوں کے علاوہ کسی بنیادی تبدیلی کا امکان نہیں۔ موٹر کار کی موجودہ شکل البتہ باقی نہ رہے گی۔ اگر موٹر کار کو کسی اندرونی انجن کے ذریعہ چلانا ممکن ہوسکا تو وہ انجن بہت ہی مختصر ہوگا اور ڈیزل کے اصول سے چلے گا۔ کیونکہ پٹرول سے جو قوت پیدا ہوتی ہے اس کا ۸۰ فیصدی حصہ موجودہ انجنوں میں ضایع ہوجاتا ہے۔ ہلکے، چھوٹے مگر زیادہ طاقتور انجنوں کو ابھی سے پسند کیا جانے لگا ہے۔ مثال کے طور پر ہوائی جہازوں کے انجن کو لیجئے جو ہزاروں گھوڑوں کی طاقت رکھنے کے باوجود بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ ہمارے انجینیروں اور موجدوں نے کم سامان سے زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول ممکن بنا دیا ہے۔ دوسری خاص چیز یہ ہوگی کہ لاسلکی سے آواز کی طرح، طاقت کا نشر بھی عام ہوجائے گا۔ جب ریڈیو سیٹ فضا سے آواز حاصل کرسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ موٹر کار بھی فضا سے نشر شدہ طاقت جذب کرنے کے بعد نہ چل سکے۔ بلاشبہ اس وقت تک فضا میں نشر شدہ طاقت کا حصول جرم ہے۔ چنانچہ ایک ریڈیو اسٹیشن سے نشر شدہ طاقت حاصل کرکے مکان میں روشنی کرنے کے الزام میں جرمنی اور انگلستان دونوں جگہوں بعض لوگوں کو سزائیں دی جاچکی ہیں۔ مگر یہ جرم کب تک جرم رہے گا اور کیا اس کا جرم رہنا ہماری آئندہ ترقی کے منافی نہ ہوگا؟ ایک ریڈیو اسٹیشن کے آلۂ نشر سے طاقت بہت ہی تھوڑی سی مقدار میں نشر ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ محض ایک ملک یعنی انگلستان ہی میں ۹۰ لاکھ ریڈیو سیٹ چلاسکتی ہے اور اگر مقدارِ طاقت کا معین کرنے والا پیمانہ بلاکسی روک کے اپنی پوری قوت سے کھول دیا جائے تو یہ طاقت برتنوں کو اُلٹ دینے اور دروازوں کو بھڑ بھڑادینے کے لئے کافی ہوگی۔ فضا میں طاقت کے بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں۔ ہمیں اُن سے فایدہ اُٹھانا چاہئے۔ اس لئے "فضائی طاقت" کا استعمال لازمی ہوگا نہ صرف موٹر کاروں کو چلانے کے لئے بلکہ دوسرے کاموں کے لئے بھی۔

جس طرح فضا سے طاقت کا حصول ضروری ہوگا اسی طرح فضا میں طاقت کا نشر بھی انتہائی ضروری ہوگا۔ چنانچہ موجودہ صدی کے خاتمہ پر کوئلہ کانوں سے کھود کر طاقت کے مرکزوں اور اسٹیشنوں کو روانہ نہ کیا جائے گا بلکہ کانوں ہی میں کوئلہ کو طاقت میں تبدیل کردیا جائے گا اور وہیں سے (اس طاقت کو) استعمال ہونے والے مقامات پر پہنچا دیا جائے گا جیسے کہ آج پانی اور بجلی کو روانہ کیا جاتا ہے۔

بجلی کا استعمال بھی آیندہ بہت عام ہوجائے گا اور گیس کی جگہ لے لیگا۔ اسی طرح سے پانی کی فراہمی کا موجودہ طریقہ بھی بدل جائے گا کیونکہ اس جنگ میں یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ دشمن کا ہوائی جہاز پانی کے ذخیروں کو اسی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتا ہے جیسے دریاؤں، نہروں وغیرہ کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ملک کی آب رسانی کے پورے نقشہ سے واقف ہونے کے بعد دشمن اُس ملک کو بیدست وپا کرسکتا ہے لہٰذا آیندہ آبرسانی کے ذخایر سب زمین دوز ہوں گے۔ فنِ تعمیر بھی بنیادی طور پر بہت بدل جائے گا۔ ایک بڑی اینٹ پر دوسری چھوٹی اینٹ رکھنے کا وہ طریقہ جو اُس زمانہ سے رائج ہے جب حضرت سلیمان کے معابد اور بخت نصر کے شہر کی تعمیر ہوئی تھی، ترک ہوجائے گا۔ عمارتوں کے پورے پورے ڈھانچے کھڑے کردئے جائیں گے اور ان میں کنکریٹ پلادیا جائیگا اور اس طرح ہر عمارت پہلے سے طے شدہ نقشے کے مطابق ڈھل سکے گی اور عمارتوں میں ایک مرکزی مقام سے حرارت پہونچائی جائے گی۔

ذرایع نقل وحمل بھی آیندہ بہت وسیع ہوجائیں گے۔ آج بھی بحرِ اوقیانوس ہوائی جہازوں سے روزانہ پار کیا جاتا ہے۔ آج بھی دُنیا بھر میں ہزاروں فضائی مستقر تعمیر ہوچکے ہیں اور موجودہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد یہ مستقر دُنیا کو فضائی راستہ سے ایک رشتہ سے وابستہ کردیں گے۔ فضائی سفر سے وقت پر فتح حاصل ہورہی ہے۔ وقت پر فتح پانا، فاصلہ پر فتح پانے کے مرادف ہے۔ دُنیا کے مختلف مقامات کا فاصلہ اس طرح سے کم ہوتا چلا جارہا ہے اور جس آسانی کے ساتھ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکیں گے، وہاں کے لوگوں سے مل جُل سکیں گے اتنی ہی زیادہ امن کی بنیاد پائدار ہوگی۔ فضائی سفر کے لئے موجودہ جنگ نے تربیت یافتہ ہوابازوں کی بہت بڑی تعداد مہیا کردی ہے چنانچہ آج بھی دس میل بلندی پر جاکر جہاں تیز رفتاری کا حصول بہت زیادہ آسان ہوجاتا ہے، سفر کرنے کے لئے خاص طیاروں کی تعمیر شروع ہوگئی ہے۔ دس میل اوپر فضا کا حصہ (Stratosphere) کہلاتا ہے اور موجودہ صدی کے خاتمہ سے پہلے ہی ہمارا وہاں پہونچنا روز کا معمول ہوجائیگا۔ آیندہ بجلی سے چلنے والی ریلیں مسافروں کے لئے استعمال نہ ہوں گی بلکہ محض اسباب وسامان کے نقل وحمل کے لئے وقف ہوں گی، اس لئے سڑکوں کی تعمیر وغیرہ کے متعلق ایک خاص حکمت عملی کو اختیار کرنا پڑے گا جس میں "حفاظت" اور سرعت "رفتار" دونوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ یعنے راستے ایسے ہوں گے جو رفتار میں اضافہ کا باعث بھی ہوں گے اور جان ومال کے نقصان کا بھی اُن پر کم اندیشہ ہوگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ باربرداری اور سواری کی گاڑیوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور موجودہ صدی کے ختم ہونے سے قبل تک ہر فرد کے پاس کم از کم اُن ممالک میں جو صنعتی ترقیوں سے مالامال ہوچکے ہیں، ایک ایک موٹر کار یقینی ہوگی۔ تفریحی شغل بھی اس اُصول سے نہیں بچ سکیں گے۔ چنانچہ ٹیلی ویژن کے ذریعے ہم دنیا کی چیزوں کو سننے کے علاوہ ہر ہر کو دیکھ بھی سکیں گے۔ تمام سائنسداں فطری طاقت کے عظیم ترین خزینہ یعنی سورج سے حصول طاقت کے طریقوں کا برابر تجربہ کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ بہت ممکن ہے کہ آج سے پچاس برس بعد کوئی ایسا آلہ ایجاد ہوجائے جو کوئلہ کی کمی اور تیل کی فراہمی کے تمام مسائل کو حل کردے اور ہم سورج سے ساری طاقت حاصل کرلیا کریں۔۔۔ ہماری غذا بھی بدل جائے گی! حیاتین (Vitamins) اور پروٹین (Proteins) کے متعلق ہماری معلومات جوں جوں ترقی کرتی جائے گی ثقیل اور بیکار غذاؤں کو ترک کرتے جائیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ ہم غذائی جوہروں کی گولیوں اور ٹکیوں کو کھاکر زندگی بسر کرنے لگیں اور ایک نئے حیاتی ارتقاء (Biological evolution) کا دور شروع ہوجائے۔

پٹرول اور موجودہ تمدن

استنباط و صناعت کے طریقے اور طبعی و ماہیتی تحقیقات

پٹرولیم (پٹرول) لاطینی لفظ ہے جو (Petra) اور (Oleum) سے ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں "پتھر کا تیل"۔ اسے پتھر کا تیل اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اکثر چٹانوں اور پتھروں کے بیچ میں پایا جاتا ہے اور عام تیلوں کی طرح ایک سیال مادہ ہے۔ اس کا علم آج سے نہیں بلکہ دُنیا کو اسوقت سے ہے جبکہ تاریخ نے آنکھ بھی نہیں کھولی تھی، قدیم مصری، چینی اور جاپانی اس سے واقف تھے مگر اس کی حقیقی معرفت اور اس سے عظیم الشان نفع اندوزی موجودہ عصر کے انکشافات کا نتیجہ ہے۔ اسکو صاف کرنے کی ابتدا سنہ ۱۸۲۵ء میں سب سے پہلے باکو کے اندر ہوئی اور ولایات متحدہ امریکہ میں جہاں آج پٹرول سے بیشمار دولت حاصل کی جاتی ہے وہاں اس صناعت کی ابتدا سنہ ۱۸۵۹ء میں ہوئی جسے صرف ۸۱ سال ہوتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ یہ موجودہ دور کا جدید ترین انکشاف ہے مگر اس نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ اگر کوئی شے اپنی اہمیت و عظمت میں اس کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ لوہا ہے آج ہماری ضرورتوں میں اس کی حیثیت کا یہ حال ہے کہ اس کے بغیر دُنیا کا کوئی جاندار ابھی ایک رات چین کی زندگی بسر نہیں کر سکتا اور اگر یہ نہ حاصل ہو سکے تو موٹروں، ہوائی جہازوں، انجنوں اور نہ معلوم کتنے آلات اور مشینوں کی ساری گردش و حرکت پل بھر میں ختم ہو جائے۔ آجکل تو پٹرول کا استعمال آہستہ آہستہ اور زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا جا رہا ہے، ولایات متحدہ کے اکثر کارخانوں میں اب پٹرول ہی استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح روس کے ریلوے انجنوں میں کوئلے کے بجائے پٹرول استعمال کرتے ہیں۔ پٹرول کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم میں فرانس کے وزیر اعظم کلیمنسو نے ولسن پریزیڈنٹ جمہوریہ امریکہ سے، جب پٹرول کی درخواست کی تھی تو کہا تھا کہ "پٹرول کا ہر قطرہ قطرہ خون کے برابر ہے"۔

پٹرولی منطقوں کا انکشاف پٹرول کی زمینوں کا آسانی کے ساتھ پتہ لگا لینا بہت مشکل ہے، ایک سیال مادہ ہے اور کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا بلکہ ہمیشہ اِدھر اُدھر متحرک رہتا ہے، دوسرے یہ کہ کبھی تو یہ طبقات ارض کے جدید طبقوں میں پایا جاتا ہے اور کبھی پُرانے طبقوں میں اسی طرح کبھی جھاڑی دار ٹیلوں میں پایا جاتا ہے اور کبھی چٹیل میدانوں میں، جس کی وجہ سے اس کی زمینوں کا حقیقی اور قطعی علم حاصل کرنا بڑی حد تک ناممکن ہے۔

پٹرول میں شور پانی اور گیس کا بہت کافی میل ہوتا ہے اور شاید یہی دونوں اجزاء ہیں جو اسے سطح زمین تک لے آتے ہیں بعض دفعہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جہاں پٹرول نکلنے کی توقع ہوتی ہے تو وہاں محض شور پانی یا گیس نکلکر رہ جاتی ہے، اسی لئے پٹرول کی طلب ایک قسم کا جُوا ہے۔ چنانچہ بارہا دیکھا گیا کہ پٹرولی منطقوں کی جستجو، کنوؤں کی کھدائی اور طرح طرح کی مشقتیں اُٹھانے کے بعد ہاتھ نہ آیا۔

پٹرول کے کنویں کھودتے وقت پہلے برج نا جرثقیل کے قسم کا ایک آلہ کھڑا کر لیا جاتا ہے جسے ([illegible]) کہتے ہیں اس کی بلندی تقریباً ۹۰ قدم ہوتی ہے اس میں پہیئے کی طرح کی ایک چیز لگی رہتی ہے جس پر سے ایک موٹی رسّی گزرتی ہے، اس رسّی کے ایک طرف سوراخ کرنے والا ایک زبردست فولادی آلہ بندھا رہتا ہے اور رسّی کا دوسرا حصّہ ایک دھانی انجن سے متصل ہوتا ہے جو اس کو برابر اُٹھاتا اور گراتا رہتا ہے۔ یونہی مسلسل کوششوں کے بعد جا کر کوئیں تیار ہوتے ہیں، بعض دفعہ تو ایسا بھی دیکھا گیا کہ زمینوں کی سختی اور تیل کے نچلے طبقوں میں ہونے کی وجہ سے اس کھودائی کا سلسلہ بہت طویل مدتوں تک جاری رہتا ہے اور کنوئیں بہت گہرے ہو جاتے ہیں چنانچہ مصری میدان کے کنوئیں ۲۸۰۰ فٹ گہرے ہیں، اور امریکہ کے میدانوں میں تو پٹرول ۴۰۰۰ فٹ کی گہرائی سے برآمد ہوتا ہے۔ اسی طرح یونان میں بھی پٹرول ۲۰۰۰ فٹ پر پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اتنی مسافت زمین کی گہرائی میں بہت زیادہ دہشت انگیز ہے۔

پٹرول کے چشمے اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ پٹرول کی زمینوں میں تیز قسم کے گیس کا مادہ بہت کافی موجود ہوتا ہے اسی لئے بعض دفعہ پتھروں کو تراشتے وقت گیس کی قوت

سے بڑے بڑے چشمے اُبل پڑتے ہیں چنانچہ ۱۸۷۳ء میں باکو کے پٹرولی علاقہ کے اندر ایک بہت بڑا چشمہ پھوٹ نکلا تھا جس سے تیل اور ریت وغیرہ کے اجزاء بڑی تیزی کے ساتھ اوپر کو بلند ہوئے اور اسی کے ساتھ ایک عجیب و غریب اور خوفناک قسم کی آواز بھی پیدا ہوئی جو وہاں سے میلوں کی دوری پر سُنی گئی اس چشمے کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اس کا فوارہ تقریباً ۲۰۰ فٹ کی بلندی تک پہونچتا تھا اور اس کی قوت سے بہتا ناآگ (..........) بھی اکھڑ گیا تھا مگر چونکہ یہ کام ایک چھوٹی سی ارمنی کمپنی نے شروع کیا تھا اس لئے وہ تیل کے اس عظیم الشان خزانہ سے استفادہ نہ کرسکی۔

ایسا ہی ایک واقعہ مصر میں بھی ہوا تھا، وہاں بھی ۱۹۱۴ء میں ایک چشمہ اُبل پڑا تھا جس سے تقریباً چار سو ٹن روزانہ پٹرول خارج ہوتا تھا لیکن یہ سارا تیل راستے کے ٹیلوں کو طے کرتا ہوا بہہ کر بحر متوسط میں گر جاتا تھا۔ اس کے روکنے کے لئے بہت کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

خام پٹرول

خام پٹرول چونکہ لیس دار اور متعدد مواد کا امتزاج ہوتا ہے، اس لئے وہ روشنی کے استعمال کے قابل نہیں ہوتا اور اسے صرف ریلوے انجنوں اور جہازوں میں کبھی کبھی استعمال کرتے۔ بعض پٹرول تو سیاہ اور بہت زیادہ بھاری اور لیس دار ہوتا ہے اور بعض سبگینی رنگ کا قدرے سیال اور بنزین (Benzine) اور کیروسین (Kerosene) کا مجموعہ ہوتا ہے اور یہ اختلاف مختلف ممالک کی زمینوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ ایک کنوئیں میں بھی بلحاظ عمق یہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

پٹرول مختلف کیمیائی مرکبات سے مخلوط مانا جاتا ہے اور یہ مرکباتی اجزا خود دو عنصر ہیڈروجن اور کاربن سے مرکب ہوتے ہیں جنھیں کیمیائی اصطلاح میں ہیڈروکاربنس (Hydrocarbons) کہتے ہیں مگر ان میں گندھک، نائٹروجن اور آکسیجن کے اجزا بھی کچھ مقدار میں شامل ہوتے ہیں۔ پٹرول کو کیمیاوی لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ وہ پٹرول جس کا بنیادی جز پیرافین (Paraffin) ہوتا ہے اس میں اسفلٹ (Asphalt) کا حصہ کم ہوتا ہے اور ہائڈروجن اور کاربن کے مرکبات بہت کافی حد تک موجود ہوتے ہیں، اس سے جو تیل نکلتا ہے وہ سب سے قیمتی تیل مانا جاتا ہے۔

۲۔ وہ پٹرول جس کا بنیادی جز نفتھین ہوتا ہے۔

۳۔ وہ پٹرول جو مذکورۂ بالا دونوں اجزاء اصلیہ سے مخلوط ہوتا ہے۔

پٹرول کی صفائی

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں خام پٹرول جبکہ وہ زمین سے نکالا جاتا ہے، استعمال کے قابل نہیں ہوتا اس لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اسے دوسری ترکیبوں اور مشینوں سے صاف کیا جائے اور بنزین اور کیروسین جیسے پٹرولی مواد کے اجزاء اصلیہ اور جوہر کو اور دوسرے مخلوط اجزاء سے الگ کر کے نکالا جائے۔

پٹرول کی صفائی کے کارخانے میدانوں سے دور سواحل پر تعمیر کئے جاتے ہیں، جہاں خام پٹرول نلوں کے ذریعہ پہونچایا جاتا ہے۔ یہ نل کنوؤں کے منھ پر لگے ہوتے ہیں۔ ان نلوں کی لمبائی کہیں میلوں تک پہونچ جاتی ہے چنانچہ مصری میدان کے نل ۱۵۰ کیلومیٹر لمبے پھیلے ہوئے ہیں۔ ولایات متحدہ کے میدانوں میں یہ نل ..... امیل تک چلا جاتا ہے جن سے روزانہ ..... اپیپا (Barrel) تیل گزرتا ہے۔

پٹرول کے صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسے مخروطی شکل کے کنٹروں میں بھر لیتے ہیں جن میں ہر ایک ....۵ یا ....۹ گیلن کا ہوتا ہے۔ ان کنٹروں میں نالیاں لگی رہتی ہیں جن میں پٹرول کا جوہر گرم ہو کر بھاپ کی شکل میں منتقل ہونے لگتا ہے۔ یہ نالیاں آگے چل کر بہت زیادہ ٹھنڈے پانی سے گزرتی ہیں جہاں پہونچ کر پٹرولی بھاپ سردی کی وجہ سے رقیق مادے کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور اس کے بعد یہ رقیق پٹرولی مادہ الگ الگ ڈبوں میں آگرتا ہے جہاں پھر اسے تیزاب اور کاسٹک سوڈا وغیرہ سے صاف کرتے ہیں۔

پٹرول کو جن مختلف درجات حرارت میں رقیق اور صاف کیا جاتا ہے ان درجوں کے اختلاف کے لحاظ سے پٹرول کی بھی مختلف قسمیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ۴۰ اور ۷۰ ڈگری حرارت میں جو پٹرول صاف ہوتا ہے اس سے ایک بہت رقیق تیل نکلتا ہے جسے پٹرول کا جوہر کہتے ہیں، یہ جراحی اور سرجری وغیرہ کے کاموں میں اعضا کو شل کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ جو ۷۰ اور ۹۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے، اس سے گیسولین (Gasoline) نکلتا ہے۔

۳۔ جو ۸۰ اور ۱۲۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے اس سے بنزین (Benzine) خارج ہوتا ہے۔ گیسولین اور بنزین دونوں موٹروں اور ہوائی جہازوں کے انجنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ نیز اس سے گوند اور ربر گھلایا جاتا ہے۔

۴۔ جو ۱۲۰ اور ۱۵۰ ڈگری حرارت میں صاف کیا جاتا ہے، اس سے جو سیال مادہ نکلتا ہے اسے نفتھا کہتے ہیں۔

۵- جو ۱۵۰ اور ۳۰۰ ڈگری حرارت میں صاف جاتا ہے، اس سے کیروسین تیل طیار ہوتا ہے۔

۶- اور ۳۰۰ ڈگری حرارت سے جو اجزاء مجتمع ہوتے ہیں ان سے بعض جلانے کے تیل اور وسیلین وغیرہ طیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد جو باقی رہتا ہے وہ کوئلہ کا ایک رقیق مادہ ہوتا ہے جو سڑکوں کی تعمیر میں کام آتا ہے۔

سوئز میں جو کارخانہ ہے وہ محض پٹرول سے بنزین اور کیروسین نکالتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ مازوٹ (Mazout) یا جلانے کے تیل کے نام سے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ سوئز کا کارخانہ روزانہ جتنا پٹرول صاف کرتا ہے اس کی مجموعی تعداد ۱۰۰۰ ٹن ہے جس میں سے نصف یعنی ۵۰۰ ٹن مازوٹ کا حصہ ہوتا ہے اور بقیہ ۲۵۰ ٹن بنزین اور ۲۵۰ ٹن کیروسین کا۔ ولایات متحدہ میں تقریباً صفائی کے ۲۶۰ کارخانے ہیں جن میں لاکھوں پیپے تیل روزانہ تیار ہوتا ہے۔

پہلے پٹرول کی قسموں میں کیروسین کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، آج چونکہ موٹروں اور طیاروں کی حیرت انگیز کثرت ہوتی جا رہی ہے اس لئے گیسولین اور بنزین کی طلب بہت زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔

پٹرول اور جدید علمی تحقیقات

باوجود ان تمام کامیابیوں کے پٹرول کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چنانچہ مشہور امریکی کروڑپتی جان روکفلر نے نصف ملین ڈالر صرف اس لئے دئے ہیں کہ پٹرول کے متعلق علمی تحقیقات کو ترقی دیجائے۔ اس کے لئے کمیٹیاں اور کانفرنسیں قایم کی گئی ہیں تاکہ اس موضوع پر علمی و کیمیاوی اور طبقاتی تحقیق کی جائے اور اس سلسلہ میں وہ یہاں تک پہونچ چکے ہیں کہ انھوں نے پٹرول سے متعدد قسم کے عرق (Al-cohols) طیار کئے ہیں جن سے تیزاب، ربڑ اور دوسرے مختلف مرکبات بنا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم مسٹر مورس کے ایک بیان کی تلخیص پیش کرتے ہیں تاکہ پٹرول سے جو توقعات دنیا نے قایم کی ہیں ان کی ہلکی سی جھلک سامنے آسکے۔ لکھتے ہیں :-

" خیال کرو کہ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی ہے، فضا نہایت خوشگوار ہے، اس وقت تمہارا دل چاہتا ہے کہ تم موٹر پر سوار ہو کر تفریح کے لئے کہیں سیر کو جاؤ، تم جا کر موٹر کے انجن کو دیکھتے ہو تو اس میں تمھیں تھوڑا سا تیل نظر آتا ہے لیکن تمھیں یہ توقع ہے کہ یہ کافی ہوگا، کیونکہ محض ایک گیلن تیل میلوں کی مسافت طے کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر تم پہیے کے تیل کی طرف ملتفت ہوتے ہو جو پہیوں پر صفائی کے لئے لگایا جاتا ہے، تو تم اسے بھی حسب منشا کافی پاتے ہو حالانکہ بہت دنوں سے تم نے اس پر دوسرا روغن نہیں چڑھایا ہے، اس کے بعد تم موٹر کی پالش کو دیکھتے ہو تو اسے بھی سمجھتے ہو کہ یہ بھی درست ہے۔ لیکن کیا تم کچھ سمجھے اس کا اصل راز پٹرول ہے! اسی طرح تم پہیے کے ٹائر پر نظر ڈالتے ہو تو اس کے ربڑ کو بھی بالکل صحیح و سالم پاتے ہو حالانکہ یہ لاتعداد میلوں کی مسافت طے کر چکا ہے، اس کا بھی راز پٹرول ہے! اس کے بعد تم اس کے گدوں پر ٹیک لگاتے ہو تو اسے بھی باوجود اس کے کہ وہ پُرانا ہو چکا ہے، کافی آرامدہ اور نرم پاتے ہو، اس کی بھی اصلیت پٹرول ہے!

ان چیزوں سے قطع نظر پھر تم موٹر میں کہیں کہیں کچھ چربی سی چیز لگی دیکھتے ہو تو اسے اپنے ہاتھوں سے رگڑ دیتے ہو جس سے وہ تمھارے ہاتھ میں لگ جاتی ہے، اب تم اسے دھونا چاہتے ہو تو اس کے لئے تمھیں سب سے بہتر وہی صابون ملتا ہے جو پٹرول کے ذریعہ سے طیار کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد تم موٹر اسٹارٹ کرتے ہو، کچھ دور پر جا کر ایک وادی کے موڑ سے تمھاری موٹر گزرتی ہے، تم وہاں پر دیکھتے ہو کہ اس موڑ کو وسیع کرنے کے لئے مزدور بڑے بڑے پتھروں کو اُکھاڑنے میں مصروف ہیں مگر اس میں انھیں کامیابی نہیں ہو رہی ہے بالآخر پٹرول نکالنے والی کلوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح آگے چل کر ایک کارخانہ نظر آتا ہے جو زمین کی کھاد طیار کرتا ہے، اس میں بھی ہیڈروجن پایا جاتا ہے جو پٹرول سے بنتا ہے۔ پھر جب دیر تک تم سیر کر لیتے ہو تو تمھیں کچھ تھکان سی محسوس ہوتی ہے، تم موٹر روک کر ایک دواخانے کے پاس اُتر پڑتے ہو اور سکون بخش دوا مانگتے ہو تو تمھیں ایک بیحد خوش مزہ چیز ملتی ہے، لیکن اس میں بھی پٹرول کا امتزاج ہے، اس کے بعد تم وہاں کی مختلف چیزوں اور عرقوں اور دواؤں پر نگاہ ڈالتے ہو تو ہر چیز میں پٹرول کا امتزاج نظر آتا ہے "

اسی طرح سے فاضل موصوف نے ایک بہت ہی تفصیلی منظر پیش کر کے ثابت کیا تھا کہ دنیا کے تمدن میں پٹرول نے کتنا عظیم الشان درجہ حاصل کر لیا ہے جس سے ایک سکنڈ کیلئے الگ ہونا ممکن نہیں۔

پٹرول کی اصلیت

علماء کیمیا پٹرول کا اصل مادہ دریافت کرنے میں پوری سرگرمی سے منہمک ہیں، پتھر کے کوئلہ کے بارے میں تو سب کا اتفاق ہے کہ اس کی اصلیت نباتات ہیں جو طبقات ارض کے تہ بہ تہ جم جانے کی وجہ سے اندر دب کر رہ گئے اور جب ہزارہا سال تک حرارت سے دوچار ہوتے رہے تو کوئلہ کی شکل میں متبدل ہو گئے۔ لیکن پٹرول کی اصلیت اور اس کی کیفیت و پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں دو اہم رائیں پیش کی جاتی ہیں، ایک یہ کہ پٹرول کی اصلیت معدنی مادّہ

...ر دوسرے یہ کہ وہ عضوی اور حیوانی مادّوں سے بنا ہے۔

جو لوگ پٹرول کی اصلیت حیوانی و نباتاتی مادّے قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ قدیم طبقات ارض میں بہت سے حیوانی مادے جمع ہو گئے تھے جنھوں نے حرارت پاکر وہی شکل اختیار کر لی جو نباتی مادّوں کی کوئلہ بنتے وقت ہو جاتی ہے، اس کے بعد جب انھیں اور مزید حرارت ملی تو ان سے پگھل کر پٹرول اور پٹرول کی مخلوط گیسیں خارج ہونے لگیں، ان کی اس رائے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ پتھر کے کوئلہ کو بھی مزید حرارت پہونچانے سے خام پٹرول نکل سکتا ہے۔ مگر جو لوگ اسے معدنی مادّوں سے خارج ملتے ہیں وہ اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ بہت سے ایسے طبقات ارض سے بھی پٹرول برآمد ہوتا ہے جہاں حیوانی مادہ نہ تھا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ پٹرول دھاتوں اور معدنی مادوں سے مخلوط ہے۔

پٹرول قوت کی حیثیت سے

اس وقت پٹرول سے قوت پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے اور دنیا کی ۲۲ فیصدی قوتیں پٹرول سے پیدا کی جاتی ہیں اور ۷۰ فیصدی پتھر کے کوئلے سے پٹرول کا زیادہ تر استعمال موٹروں، طیاروں اور جہازوں میں ہوتا ہے، اب موٹروں کو لیجئے کہ جن میں بنزین کا استعمال ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں موٹروں کی کل تعداد ۲۴۵۸۹۲۶۴۹ کے قریب تھی۔

لوگوں کا خیال ہے کہ آیندہ چلکر موٹروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جائے گا یہاں تک کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں موٹروں کی تعداد ۵۰ ملین ہو جائے گی جس کے لئے ۱۹۱۳۳ ملین گیلن تیل چاہئے اور سنہ ۱۹۲۵ء میں جتنا گیسولین اور بنزین طیار ہوا اس کی مقدار محض ۹۱۶۰ ملین گیلن تھی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زمین کے اندر اتنے مادے موجود ہیں جو آیندہ عالم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کر سکیں؟ اس کے متعلق علماء کا خیال ہے کہ زمین میں کوئلہ کی اتنی مقدار موجود ہے جو ہزاروں سال کے لئے کافی ہوگی باقی رہا پٹرول تو اس کے بارے میں کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک بہت بڑا اقتصادی سوال ہے جس کے حل کرنے میں علماء ہمہ تن مصروف ہیں بعض کا خیال ہے کہ خام نباتاتی مادّوں سے ایک سیال مادہ طیار کیا جا سکتا ہے جو پٹرول کا کام دے سکے چنانچہ انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ الکوحل اور بعض نباتاتی تیلوں میں پٹرول اور بنزین جیسے مادوں کا امتزاج کرکے انھیں پٹرول کی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے مگر ابھی تک کوئی ایسی راہ نہیں نکلتی ہے جس سے اس طریقہ کو کام میں لایا جا سکے۔ اس کے علاوہ پٹرول طیار کرنے کے اور طریقے بھی ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ روغنی مٹی کو جو ایک خاص قسم کی ہوتی ہے کوئلہ کی طرح پگھلا کر ایک سیال مادّہ بنایا جائے جو ایک طرح کا پٹرول ہو سکتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پتھر کے کوئلہ کو جو ایک منجمد آتشیں مادہ ہے پگھلا کر سیال مادہ بنایا جائے۔

برگیوس کی ترکیب

مشہور جرمنی عالم برگیوس (Bergius) کا خیال ہے کہ پٹرول میں کاربن اور ہیڈروجن کی نسبت ۸ : ا کی ہے اور پتھر کوئلہ میں ان کی ۱۸ : ا کی نسبت ہے لہذا کوئلہ کو پٹرول بنانے کے لئے اس میں ہیڈروجن کی زیادتی کرنی پڑے گی۔

ان کے اس پوری ترکیب کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے پتھر کوئلہ کو بہت باریک کر لیتے ہیں اور پھر کسی تیل میں رکھدیتے ہیں اور اس کے بعد ہیڈروجن گیس کے ۴۵۰ ڈگری حرارت میں اسپر کیمیائی عمل کرتے ہیں جس سے اس کوئلہ کا اکثر حصہ پٹرول ہو جاتا ہے، اس طریقہ سے برگیوس نے تقریباً کوئلہ کی متعدد قسموں کو پٹرول میں تحویل کر لیا ہے اور اس کے لئے جرمنی میں ایک کارخانہ بھی قایم کیا ہے، اس ترکیب سے جو تیل طیار ہوتا ہے اس میں ۳۰ فیصدی گیسولین اور ۳۰ فیصدی مازوٹ اور ۳۰ فیصدی وہ تیل ہوتے ہیں جو پالش وغیرہ کے کاموں میں آتے ہیں مگر اس ترکیب کا اب تک تجارتی اُصول پر تجربہ نہیں کیا گیا۔ اس ترکیب کو ایجاد کرنے میں برگیوس نے سالہا سال صرف کئے ہیں اور اس کے لئے ایک عظیم الشان کمپنی نے ان کی بڑی بڑی امدادیں بھی کیں

فاسچر کی ترکیب

دوسری ترکیب بھی ایک دوسرے جرمنی محقق فرانز فاسچر (Franz Fischer) کے اختراع کا نتیجہ ہے، یہ اپنے طریقہ میں گزشتہ ترکیب سے مختلف ہے مگر نتیجہ کے لحاظ سے دونوں متحد ہیں، ترکیب یہ ہے کہ وہ پہلے کوئلہ کو گرم کرتے ہیں اور پھر بھاپ کے ذریعہ اسے گیس کی شکل میں بدل لیتے ہیں اور اس کے بعد اسے لوہے، کوبلٹ (Cobalt) اور کروم (Chrome) وغیرہ دھاتوں کے خام اور فاسد اجزا سے گزارتے ہیں جس سے وہ قیمتی گیس پٹرول کی شکل میں تحویل ہو جاتی ہے۔

(صدر الدین عظیم)

وقت کی باتیں

جاپان کے آلات حرب

اس لڑائی میں سب سے بڑی غلطی جمہوریتوں نے یہ کی کہ دشمنوں کی قوت کا صحیح اندازہ نہ کر سکیں۔ جرمنی کی بابت تو خیر انھیں کچھ اندازہ تھا بھی، لیکن جاپان کے متعلق وہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ چین نے اس کی قوت کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

جاپانی حکومت نے ہمیشہ اپنی قوت کو چھپایا اور اسے ایک سخت راز کی صورت میں رکھا۔ دوسرے ممالک کے لوگ وہاں پہونچکر بھی کوئی صحیح اندازہ جاپان کی قوت کا نہ کر سکتے تھے کیونکہ زبان، صورت اور وضع کے اختلاف کی وجہ سے وہ الگ پہچان لئے جاتے تھے اور ان کی نقل و حرکت کی سخت دیکھ بھال ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ اطلاعات انھیں ملیں وہ حکومت ہی کے ذریعہ سے ملیں اور وہ خود کوئی تحقیق چل پھر کر نہ کر سکے۔

نازی جماعت کے عروج کے وقت ہی سے، جاپان، جرمنی سے بہت متاثر تھا، اور اپنی فوجی تنظیم کے لئے اس نے جرمنی ہی سے آدمی بلائے اور جب وہ محوری مرکز میں شامل ہو گیا تو اس نے بحر پاسفک کی جنگ کے لئے بڑی زبردست طیاریاں شروع کر دیں اور پچھلی جنگ میں جرمنی کے جو جزائر بحر پاسفک میں اس کے ہاتھ آئے تھے، ان کو بحری اڈوں میں تبدیل کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۱ء تک اس کی بحری قوت امریکہ کی پاسفک قوت کے برابر ہو گئی۔

جاپان کے چودہ بڑے جنگی جہازوں میں سے چار بالکل نئی قسم کے ہیں جو ۴۳، ۴۴ ہزار ٹن کے ہیں اور جن میں سے ہر ایک پر ۱۶ انچ دہانے کی بارہ بارہ توپیں نصب ہیں۔ ان کے علاوہ جاپان کے پاس چار آہن پوش جہاز بھی ہیں جو بہت قوی ہیں اور ۲۲ ہلکے کروزر بھی۔ ان کے علاوہ آٹھ طیارہ بردار جہاز اور ۱۰۰ سے زیادہ آبدوز کشتیاں بھی ہیں۔

تعداد کے لحاظ سے یقیناً برطانیہ اور امریکہ کی بحری قوت زیادہ ہے، لیکن جاپان کی قوت بھی ایسی نہیں کہ اسے ہیچ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ اس نے بحری قوت کے ساتھ اپنی فضائی و بری طاقت کو بھی بہت بڑھا لیا ہے۔

یوروپ کی پچھلی جنگ نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ بغیر فضائی قوت کے بحری قوت بیکار ہے، اس لئے جرمنی نے سب سے زیادہ توجہ اسی طرف صرف کی اور اس کی تقلید جاپان نے بھی کی۔ ہر چند جاپان کے سامنے بعض اقتصادی مشکلات بھی تھیں اور ہوائی جہازوں کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی اس کے یہاں کم پائی جاتی ہیں، لیکن اس نے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کر کے اپنی ہوائی طاقت کو کافی حد تک بڑھا لیا۔

امریکی ماہرین کا بیان ہے کہ ۱۹۴۱ء میں جاپان کے پاس پانچ ہزار اول قسم کے طیارے موجود تھے اور سالانہ آٹھ ہزار طیارے وہ بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ جاپان نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہ ۱۹۴۲ء تک ۳۰ ہزار طیارے بنائے گا۔ گو ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس دھاتوں کی بہت کمی ہے، تاہم سال رواں میں اس کی ہوائی قوت یقیناً پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی۔ — بحر پاسفک میں لڑائی شروع ہونے سے پہلے امریکہ اور برطانیہ کے اخباروں نے لکھنا شروع کیا کہ جاپان کے پاس اگر ہوائی جہاز کافی تعداد میں ہوں بھی تو کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہاں کے جہاز ران ناقص ہیں اور ان کے سر و گردن اور آنکھوں کی فطری ساخت انھیں قدرتاً اچھا ہوا باز نہیں بنا سکتی، لیکن فوراً بعد ہی ایک اور امریکی ماہر نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ جاپانی ہوا باز بہترین قسم کے ہوا باز ہیں اور امریکی و برطانوی ہوا بازوں کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ عرصہ تک پرواز کر سکتے ہیں اور ان کا نشانہ بھی نہایت اچھا ہے۔

جاپانی جہاز کچھ تو امریکی وضع کے ہیں اور کچھ جرمن وضع کے۔ ان میں ۴۰ فی صدی (Fighters) ۳۰ فی صدی بم برسانے والے اور ۱۰ فی صدی بار بردار۔ بمبار جہاز دو دو انجن کے ہیں اور دو ہزار پونڈ وزن کے بم لیکر ۱۵۰۰ میل تک بغیر دم لئے پرواز کر سکتے ہیں — دوسرے آلات حرب میں بھی، جاپان کسی سے پیچھے نہیں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اسکے پاس

سپاہیوں کی تعداد کتنی ہے - جاپانی فوج بہت بڑی ہے جو چین کی لڑائی کے بعد سے برابر بڑھ رہی ہے چونکہ جاپان کی آبادی بہت زیادہ ہے، اس لئے سپاہیوں کی اس کے پاس کمی نہیں اور چین کے میدانوں میں ان کی فوجی تربیت کا بھی کافی موقعہ مل گیا ہے ـــ اس میں شک نہیں کہ جاپان اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہے لیکن اس نے ان مشکلات کو اس طرح دور کیا ہے کہ ملک بھر میں جنگجویانہ جذبات پیدا کر کے سب کو لڑنے بھڑنے پر آمادہ کر دیا ہے اور نازی جماعت کی طرح لڑائی کو مذہب بنا لیا ہے، چنانچہ آج جاپان میں لاکھوں آدمی میدان جنگ میں ہیں اور لاکھوں فوجی کارخانوں میں کام کر رہے ہیں - لیکن باوجود ان تمام باتوں کے وہ وقت کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور زیادہ عرصہ تک لڑتے رہنے کی تاب اس میں نہیں ہے -

جنگی جہاز کی عظمت!

آجکل آپ روز سنتے ہوں گے کہ فلاں جہاز فلاں سمندر میں ڈوب گیا اور آپ اس کو نہایت معمولی بات سمجھتے ہوں گے لیکن اگر آپ کو ایک جنگی جہاز (Battle - ship) کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو تو آپ سمجھیں کہ در اصل کسی ایک بڑے جہاز کا ڈوب جانا، قوم کے ایک بازو کا ٹوٹ جانا ہے. آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ ایک جہاز کی تعمیر سے چوبیس قسم کی مختلف تجارتیں متعلق ہوتی ہیں اور اگر جہازوں کی تمام قسموں کو سامنے رکھ کر اندازہ لگایا جائے تو نہ صرف سپاہی کی حیثیت بلکہ اقتصادی حیثیت سے بھی اعداد و شمار کی اتنی طویل فہرست بن سکتی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو سوچ بھی نہیں سکتے - مثلاً آپ صرف طیارہ بردار جہاز اور کروزر (آہن پوش) ہی کو لے لیجئے کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے علی الترتیب دو ہزار اور پندرہ سو نقشے طیار کرنے پڑتے ہیں -

تعمیر کی ابتدا سے لیکر سمندر تک پہونچنے میں ایک جنگی جہاز کو ۴۱ مہینے کا زمانہ چاہئے یعنی اگر غیر معمولی عجلت سے کام نہ لیا جائے تو وہ جہاز جس کی تعمیر ۱۹۴۱ء میں شروع ہوئی ہو ۱۹۴۴ء میں اپنے فرائض انجام دینے کے قابل ہو گا - پورا ایک سال تو ڈیزائن یا نمونہ کی طیاری میں صرف ہو جاتا ہے، اس کے بعد چار مہینے نقشوں کے لئے چاہئے اور تین مہینے لاگت کا تخمینہ کرنے کے لئے - اس کے بعد ۱۵ مہینے تعمیر میں صرف ہوتے ہیں اور چھ مہینے اس کی جانچ اور عملۂ جہاز کی تربیت میں -

۴۵ ہزار ٹن کے جہاز کی تعمیر میں ۸ گھنٹے روزانہ کام کرنے کی صورت میں ۴۹ لاکھ آدمیوں کی محنت صرف ہوتی ہے اور یہ صرف گودی کے اندر اندر کا حال ہے - گودی سے باہر نکلنے کے بعد جو محنت اس پر صرف ہوتی ہے اس کو بھی اگر اس میں شامل کر لیا جائے تو شمار ۹۵ لاکھ آدمیوں تک پہونچتا ہے - چھوٹے جہازوں کی تعمیر میں یقیناً کم زمانہ صرف ہوتا ہے لیکن نہ اتنا کم کہ سالوں کا کام مہینوں میں ختم ہو سکے، چنانچہ ایک ۱۶ ہزار ٹن کے تباہ کن جہاز کی تعمیر میں بھی پورے ۳۰ مہینے اور گیارہ لاکھ آدمیوں کی محنت صرف ہوتی ہے -

جہازوں کی تعمیر میں جلدی کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی جہاز کی تعمیر ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرے جہاز کا کام شروع کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ متعدد مقامات پر کارخانے قایم کئے جائیں، لیکن چونکہ یہ کارخانے سمندر کے کنارے ہی قایم ہو سکتے ہیں اور ساحل کا ہر حصہ قیام کارخانہ کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا اس لئے جگہ کا سوال بھی بجائے خود بہت مشکل ہے -

امریکہ میں جہاز سازی کی صنعت دو حصوں میں منقسم ہے، ایک سرکاری اور دوسرے پرائیویٹ یعنی امریکہ کی حکومت خود بھی جہاز تعمیر کراتی ہے اور دوسرے کارخانوں سے خریدتی بھی ہے، لیکن سنہ ۳۹ء اور سنہ ۴۰ء میں جہاز سازی کا کام اتنا پھیل گیا کہ حکومت کو خود اپنے لئے بھی اور تاجروں کے لئے بھی اپنے صرف سے نئی نئی گودیاں بنوانا پڑیں تاکہ وہاں بھی کام ہو سکے -

اس صنعت کی تکمیل اس بات پر منحصر ہے کہ تمام ضروری سامان صحیح وقت اور جگہ پر پہونچ جائے اور اسی لئے حکومت کو بھی بہت سے بیرونی ٹھیکہ داروں سے کام لینا پڑتا ہے، ورنہ اگر کوئی ایک چیز بھی مقررہ وقت پر نہ پہونچے تو سارا کام دفعتاً بند ہو جائے اور وقت کے اس نقصان کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں لیکن باوجود تمام احتیاط کے تاخیر ہوتی ہی ہے - جہاز کا بالائی حصہ جسے برج کہنا چاہئے، بہت ہی پیچیدہ اور مشکل کام ہے - کیونکہ اس کا وزن ۰۰ ۱۵ ٹن ہوتا ہے اور اس کے مختلف حصوں کو اتنی بلندی تک لیجانا آسان کام نہیں -

ایک جنگی جہاز ۲۰ یا ۱۰ فیصدی تعمیر ختم ہونے کے بعد ہی پانی میں ڈالدیا جاتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو ۴۰ یا ۴۵ فیصدی تعمیر ہونے کے بعد ہی اسے سمندر میں لے جاتے ہیں - یہاں اُسے آہن پوش کیا جاتا ہے، برج طیار کئے جاتے ہیں، اور توپیں وغیرہ نصب کی جاتی ہیں ـــ اس صنعت میں تجربہ کار کام کرنے والوں کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور جوں جوں جہاز کی تعمیر ختم کے قریب ہوتی ہے اچھا کام کرنے والوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی ہے ـــ امریکہ سنہ ۴۷ء تک بحر پاسفک اور بحر اٹلانٹک میں اپنی قوت کو جس حد تک بڑھانا چاہتا ہے وہ ۳۵ بڑے جنگی جہاز، ۲۰ طیارہ بردار جہاز، ۸۸ کروزر، ۳۷۸ تباہ کن جہاز اور ۱۸۰ آبدوزوں تک پہونچتی ہے - یہ تو بظاہر بہت معمولی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن آئیے یہ اندازہ لگائیں کہ اس پر صرف کتنا ہو گا ـــ ایک بڑے جنگی جہاز ۷ کروڑ ڈالر (ڈالر ساڑھے تین روپیہ کا سمجھئے) میں طیار ہوتا ہے - ایک کروزر ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر میں - ایک طیارہ بردار جہاز ۲ کروڑ ۰۰ لاکھ ڈالر میں - ایک تباہ کن جہاز ۵۸ لاکھ ڈالر میں اور ایک آبدوز ۴۵ لاکھ ڈالر میں - اب آپ ان رقموں کو علی الترتیب ۳۵ - ۲۰ - ۸۸ - ۳۷۸ اور ۱۸۰ سے ضرب دیکر جمع کیجئے اور جو نتیجہ اس سے حاصل ہو اس کو پھر ۳½ سے ضرب دیکر روپیہ بنائیے، اگر ریاضی کے اعداد آپ کا ساتھ دے سکیں -

معلومات عامہ

مکڑی اور جنگ

تاریخ انسانی میں مکڑی بارہا مفید ثابت ہو چکی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج بھی وہ اپنے اس اہم کردار کو ادا کر رہی ہے۔ موجودہ زمانہ کی اہم ایجاد (Periscope) ہے جس کی مدد سے آبدوز کشتیوں اور ٹینکوں میں بیٹھنے والے باہر کی چیزیں دیکھتے ہیں، اس میں ایک شیشہ ہوتا ہے جس میں آنکھ لگا کر تمام چیزیں دیکھی جاتی ہیں۔ یہ شیشہ عمودی اور افقی لکیروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ان لکیروں کو قطعی طور پر صحیح ہونا چاہئے کیونکہ شیشہ کی یہی وہ لکیریں ہوتی ہیں جن سے رخ اور فاصلہ کا پتہ چلتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان لکیروں کو اتنا باریک بھی ہونا چاہئے کہ ان سے چیزوں کے دکھائی دینے میں کوئی فرق نہ پڑے۔ عام انسانی سر کا بال بھی اس کام کے لئے بہت موٹا ہوتا ہے۔ لیکن مکڑی کے جالے کا تار جو ایک انچ کے $\frac{1}{5000}$ سے لیکر $\frac{1}{12000}$ انچ تک باریک ہوتا ہے اس کام کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر مکڑی کے جالے کا تار اتنا باریک نہ ہو تو بھی اُسے اتنے باریک حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی اس کے استعمال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

مکڑی کا جالا ایک دوسری آلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ آلہ (Theodite) ہے، آلہ پیمائش کے کاموں میں زاویوں کے ناپنے کے کام آتا ہے۔ فیکٹریوں اور ہوائی اڈوں کے لئے زمینوں کے ناپنے اور انھیں مختلف نقشوں کے مطابق علحدہ بانٹنے کا کام اُسوقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک (اس آلہ) کا استعمال نہ ہو۔

ایک مرتبہ مکڑی کے جالے کی وسعت معلوم ہو جانے کے بعد جس کا معلوم ہونا بہت ضروری ہوتا ہے، جالے کو ایک بے رنگ اور شفاف وارنش کے ذریعہ سے دیکھنے والے شیشہ پر لگا دیا جاتا ہے اور پھر یہ جالا شدید ترین موسمی تغیرات اور درجہ حرارت کے اتار چڑھاؤ کا بھی اثر نہیں قبول کرتا۔ اس خصوصیت میں دنیا کی اور کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ مضبوط بھی بہت ہوتا ہے۔ چنانچہ جالے کے تاروں کو اگر ایک ایسے دائرہ میں بٹ کر بنایا جائے جس کا قطر $\frac{1}{10}$ انچ ہو تو اسی لمبائی کے کسی دوسرے تار سے سو گنا زیادہ مضبوط ثابت ہوگا۔ مگر سائنس کے کاموں میں پُرانے جالوں کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے جالے منتخب کئے جاتے ہیں جنھیں بڑے بڑے مکڑوں نے تانا ہے۔

جالوں کے حصول میں بھی بڑی جد و جہد کی جاتی ہے۔ مکڑیوں کو پکڑ کر ہلکے ہلنے والے تختوں پر رکھدیا جاتا ہے اور ان کی مسلسل نگرانی ہوتی ہے کیونکہ اگر وہ ذرا بھی متوحش یا پریشان ہوتی ہیں تو فوراً کسی جگہ چھپ جانا پسند کرتی ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بہترین ماحول کی موجودگی کے باوجود مکڑیاں اپنا کام بند کر دیتی ہیں اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی ہڑتال کرنا سیکھ گئی ہیں۔ اس حرفت میں مکڑیوں کو کبھی مارا نہیں جاتا۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک مکڑی ۵ سے ۱۰ انچ تک کسی لمبائی کا تار اپنے جالے میں تان دیتی ہے تو اسے فوراً رہا کر دیا جاتا ہے۔ ان جالوں کو بہت احتیاط کے ساتھ لکڑیوں پر جمع کیا جاتا ہے۔ حرارت، برودت، اور حرکت سے انھیں بالکل دور رکھا جاتا ہے اور انھیں پھر اسوقت تک نہیں چھوا جاتا ہے جبکہ اُن کے استعمال کا وقت نہیں آتا۔ شمالی انگلستان میں ایک کارخانہ اسی کام کو کر رہا ہے۔ اُس کے مال گودام میں ہزاروں جالے بھرے ہیں۔

دستی تحریر سے ذہانت کا پتہ

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جنگ نے سیکڑوں طرح کی ضروریات پیدا کر دی ہیں۔ برطانیہ میں بھی یہ ضروریات پیدا ہو رہی ہیں اور انھیں حل کرنے کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں۔ آئے دن برطانیہ اور دوسرے ممالک میں ہزاروں آدمی سیکڑوں قسم کی خدمات بجالانے کے لئے بھرتی کئے جا رہے ہیں، لیکن اس قسم کی عام بھرتی کا سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ کوئی آدمی کسی ایسے کام کے لئے نہ بھرتی کر لیا جائے جس کا وہ اہل نہ ثابت ہو۔ چنانچہ تیز رفتاری کے ساتھ مسئلوں کو حل کرنا، اور دوسرے تمام وہ نفسیاتی طریقے استعمال ہو رہے ہیں جن سے آدمی کی دماغی اہلیت کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ لندن کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر مائیکل فورڈہم (Michael Fordham) نے ایک اور طریقۂ آزمائش پیش کیا ہے یعنی دستی تحریر کا تجزیہ۔ یہ طریقہ کوئی نیا نہیں ہے۔ جرمن دس یا پندرہ سال سے اس طریقہ کو استعمال کر رہا ہے اور ذمہ دارانہ کام سرانجام دینے کی اہلیت معلوم کرنے کے لئے لوگوں کا یہ بہت اچھا ذریعۂ آزمائش ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ ہٹلر کے خاص سفری ہوائی جہاز کا ہواباز ای دستی تحریر کی آزمائش کے بعد ملازم رکھا گیا تھا۔

برطانیہ میں بھی بچّوں کی رہبری کرنے والے، اور تجارت کرنے والے چند اداروں نے اس نفسیاتی طریقہ کو اختیار کیا ہے۔ خود ڈاکٹر فورڈہم نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں

اس طریقہ کی کامیابی کے بہت سے تجربات بیان کئے ہیں - اس طریقہ کا سب سے بڑا فایدہ یہ بتایا گیا ہے کہ ایک شخص کی بنیادی اور پوشیدہ اہلیت اس سے بہت جلد معلوم ہو جاتی ہے اور چند وہ خصوصیات جو یوں آسانی سے معلوم نہیں ہو سکتیں آزمایشوں سے فوراً معلوم ہو جاتی ہیں -

لکھ پتی لوگوں کی مصیبت

۳۰ ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی رکھنے والے شخص کو انگلستان میں لکھ پتی سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی صحیح کیونکہ ۳۰ ہزار پونڈ کا مطلب ۴ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ سمجھنا چاہئے - اس طرح سے انگلستان میں ۲۴۰۰ لکھ پتی شخص موجود ہیں - امریکہ میں ۴۰۰۰ لکھ پتی ہیں مگر وہاں لکھ پتی کا لفظ فیاضی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور دس لاکھ ڈالر رکھنے والا شخص بھی لکھ پتی کہلاتا ہے -

ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ لارڈ نفیلڈ (Nuffield) سر جان الرمین (Sir John Ellerman) لیڈی لوئس ماؤنٹ بیٹن (Lady Louis Mountbatten) مس ڈاروتھی پیگٹ (Miss Dorothy Paget) برطانوی لکھ پتی ہر وقت جنت میں رہتے ہوں گے اور انھیں دُنیا کا بہترین اطمینان نصیب ہو گا - مگر یہ صحیح نہیں ہے - ان میں سے اکثر بڑے بڑے اخراجات کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کتنے ملازم رکھتے ہیں -

ٹیکسوں نے ان تمام لکھ پتی لوگوں کو بہت دبا رکھا ہے - شاید انگلستان کا سب سے بڑا دولتمند شخص سر جان الرمین ہے - اس شخص کی عمر ابھی ۳۲ سال کی ہے مگر انھوں نے اپنے باپ سے جو جہازراں کمپنی کے سب سے بڑے مالک تھے، ایک کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ ورثہ میں پایا تھا - اس کے بعد سے انھوں نے اس زبردست رقم میں بہت بڑا اضافہ بھی کیا ہے - مگر جنگ کے زمانہ میں ٹیکسوں کے ذریعہ سے دولت کا بہت بڑا حصہ کھینچ لیا جاتا ہے - انگلستان کے جن لوگوں کی آمدنی ایک لاکھ پونڈ یعنی تیرہ، چودہ لاکھ روپیہ سالانہ کی ہے، اُن کی تعداد ۸۰ سے کچھ زائد ہے - مگر ان بڑے بڑے لوگوں کا بھی یہ حال ہے کہ ٹیکسوں کی ادائگی کے بعد اُن کے پاس اُن کے ہر پونڈ میں سے اُن کے لئے ایک شلنگ سے بھی کم رقم بچتی ہے - چنانچہ ان بڑے بڑے ٹیکسوں کی وجہ سے عام طور پر امیر لوگ بھی نسبتاً غریب ہو گئے ہیں - مثال کے طور پر مسٹر چرچل کو دس ہزار پونڈ کی سالانہ تنخواہ ملتی ہے - مگر وہ ٹیکسوں میں ۶۸۳۲ پونڈ ادا کر دیتے ہیں - اُن کے پاس ۳۰۰۰ پونڈ سے کچھ ہی زاید رقم بچتی ہے - اگر برطانوی قوم یہ چاہے کہ مسٹر چرچل اپنی "دس ہزار سالانہ بلا ٹیکس" کی تنخواہ سے لطف اندوز ہو سکیں تو ایسے برطانوی وزیر اعظم کی ۶۶۹۹۰ پونڈ سالانہ کی تنخواہ منظور کرنا پڑے گی کیونکہ اسی صورت میں ٹیکس کی وصولیابی کے بعد مسٹر چرچل کو دس ہزار پونڈ سالانہ کی بچت ہو گی -

بڑے بڑے مالی اداروں سے ایسے لوگ بھی متعلق ہیں جو عالمگیر شہرت کے مالک ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خود کروڑ پتی یا لکھ پتی نہیں ہیں - چنانچہ انگلستان کے ایک لارڈ ۲۰ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں - ان کمپنیوں کا مجموعی سرمایہ دس کروڑ پونڈ یعنی ایک ارب ۵۰ کروڑ روپئے کے قریب ہے - مگر وہ خود لکھ پتی نہیں ہے اور معمولی حالت سے رہتے ہیں - یہی حالت بنک آف انگلینڈ کے گورنر مسٹر مانٹیگ نارمن کی ہے - مگر برطانیہ کے بڑے لوگ کنجوس نہیں ہیں - لارڈ نفیلڈ نے آکسفورڈ یونیورسٹی اور طبی درسگاہوں کو لاکھوں پونڈ دئے ہیں - اسی طرح سے والٹر ولس (Walter Wills) نامی مشہور انگریز مخیر نے برسٹل یونیورسٹی کو ۲۵ ہزار پونڈ دئے تھے تاکہ وہاں ایک نیا شعبۂ تحقیقات کھولا جاسکے - اس شعبہ کے لئے مشہور امریکن کروڑ پتی نے ۵۰ ہزار پونڈ دئے تھے - مگر بڑے بڑے ٹیکسوں کی وجہ سے اس قسم کی امدادی رقوم میں بہت زیادہ کمی ہو جائے گی - اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کا جنگی قرضہ ابتک دس لاکھ پونڈ ہو گیا ہے لیکن باوجود اس رقم سے اتنی آمدنی نہیں ہو گی جو ان ٹیکسوں کا بدل ہو سکے - ایک بہت امیر انگریز کی جو ابتک غیر شادی شدہ ہے ڈیڑھ لاکھ پونڈ سالانہ کی آمدنی ہے مگر اسے ٹیکسوں میں ۱۴۲۹۲۴ پونڈ ادا کرنا پڑتے ہیں - جنگ کے بعد ڈاکخانہ میں اس کی محض ۶۰ پونڈ کی رقم بطور قرض کے واجب الادا رہ جائے گی -

برما روڈ اور چین کی دوسری سڑکیں

جنگ کے زمانہ میں سامان جنگ کی فراہمی سے زیادہ اس سامان کے لانے لیجانے اور فوجوں کی بروقت نقل و حرکت کا سوال سامنے آتا ہے اور اسکے لئے نہ صرف ریلوے بلکہ سڑکوں کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ موجودہ جنگ میں اور بہت سے اہم مسایل کے ساتھ سڑکوں کی تعمیر و درستی کا مسئلہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے — اکتوبر ۱۹۳۸ء میں جب جاپان نے چین کی ناکہ بندی کی تو چین نے ایک لاکھ ستر ہزار قلیوں اور دو ہزار انجینروں کی مدد سے وہ سڑک طیار کی جو برما روڈ کہلاتی ہے اور چونگ کنگ (چین کے پایۂ تخت) سے لاشیو (برما) تک ایک ہزار میل لمبی ہے - اس سڑک کی حفاظت کے لئے چینی سپاہی مامور کئے گئے اور اس سڑک کے ذریعہ سے لڑائی اور رسد کا سامان چین کو پہونچتا رہا اور پہونچتا ہے - درمیان میں تین مہینے کے لئے یہ سڑک برطانوی حکومت نے بند کر دی تھی تاکہ جاپان کسی طرح مایل بہ امن و سکون ہو جائے، لیکن جب اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تو یہ سڑک پھر کھول دی گئی — اس سڑک کے علاوہ چین نے ایک سڑک اور طیار کی جو ۷۰۰ میل لمبی ہے اور چونگ کنگ سے ماسکو تک جاتی ہے - اس سڑک میں سو میل کا ایک ایسا ٹکڑا ہے جسے صرف عورتوں نے بنایا ہے اس حال میں کہ بچے ان کی پیٹھ پر بندھے تھے اور صرف اُبلی ہوئی ترکاری کھا کر زندگی بسر کرتی تھیں — ایک تیسری سڑک اور بھی ہے جو چونگ کنگ کو انڈو چائنا سے ملاتی ہے اور اسکی لمبائی ۱۳۷۱ میل ہے - یہ سڑک بہت خطرناک ہے یعنی دریاؤں کی طغیانی کی وجہ سے اکثر تہ آب ہو جاتی ہے اور کنارے کے پہاڑوں سے چٹانیں گر گر کر راستہ روک دیتی ہیں لیکن چینی فوجیں برابر اسے صاف کرتی رہتی ہیں اور باوجود اس کے جاپانی بم گرا گرا کر اس کو توڑتے رہتے ہیں چینی اس کو درست حالت میں رکھنے کی پوری کوشش کرتے رہتے ہیں - اب کہ جاپان کا انڈو چائنا پر قبضہ ہو گیا ہے، یہ سڑک زیادہ کام نہ دیگی اور اگر برما انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو برما روڈ بھی غالباً بیکار ہو جائے، لیکن وہ سڑک جو ماسکو تک جاتی ہے، وہ قایم رہے گی اور چین کو سامان جنگ اُس راستے سے پہونچتا رہے گا -

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(جناب سید سجاد علی میرزا - سہارن پور)

اکتوبر ۱۹۴۱ء کے نگار میں جہاں تک آپ نے مومن کے مشکل اشعار کا حل میرے اشعار کے جواب میں کیا تھا، اس سے آگے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں - از راہ کرم توجہ فرمایئے - میں چاہتا ہوں، اسی طرح آہستہ آہستہ یہ شرح مکمل ہو جائے - اشعار حسب ذیل ہیں :-

(۱) اور ہی رنگ آج ہے عارض گلعذار کا — خون دل اپنا تھا مگر گونۂ رخ طراز میں
"گونۂ رخ طراز" کیا ؟

(۲) کیوں نہ آدھی رات تک جاگے وہ جب کا دھیان ہو — آ ہوئے نیمخواب میں نرگس نیم باز میں
پہلا مصرع غلط معلوم ہوتا ہے - شعر کا مطلب بھی تحریر فرمایئے

(۳) بن ترے بزم سور میں ہیں یقیں مثیں کہ ہے — نفخ صور کا اثر نغمۂ نے نواز میں
"بزم سور" کیا ؟

(۴) اُن سے اب التفات کی غیر کو ہیں شکایتیں — سن کے مرا مبالغہ منت احتراز میں
اس شعر کا مفہوم بالکل سمجھ میں نہیں آیا -

(۵) پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہ ہو کہیں — ہوتی ہیں ہائے ہائے عیاں جان نہفتہ راز میں
شعر کا مفہوم مطلوب ہے اور "جان نہفتہ راز" کیا ؟

(۶) منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — آشنا رہا ہجر عدو رکہ ہجراں کا غم نہیں

(۷) سیدھا نہ کر دیا ہو مرے ذوق قتل نے — قاتل کے آگے گردن اغیار خم نہیں

(۸) غیرت کی جا ہے رام نزاکت ہوا وہ شوخ — وحشت کا جو قفس کیونکہ نہ ہو مجھ سے رم نہیں

(۹) کیا خوش ہیں کوئے غیر میں کر نقش پا نہ ہو — وہ خوش خرام جا تا ہوں کہ ثابت قدم نہ ہو

(۱۰) جانا حرام ہجر بتاں میں تو کیا گناہ — پیر مغاں شراب ہے شیشہ میں کم نہیں

(۱۱) بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں — ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں

(۱۲) بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا — مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

(۱۳) ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

(۱۴) عاشق کشی ہی شیوہ اگر بوالہوس سہی — آخر کچھ اپنی جان کے دشمن تو ہم نہیں

(۱۵) تلخی خسرو ہو شیریں کام شادی مرگ کیا — جانکنی ہے انتقام کوہکن کی فکر میں

(۱۶) دیکھ عشق لالہ رو سے داغ دل کیا کیا کھلے — جان بر گلچیں کو تاراج چمن کی فکر میں

(۱۷) خاک میں وہ تپش نہیں خلا میں وہ خلش نہیں — کیوں نہ ہمیں زیادہ ہو جوش جنوں بہار میں

(۱۸) مرگ ہے انتہائے عشق یاں ہی ابتدائے شوق — زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

(۱۹) مانے نہ مانے منع تپشہائے دل کروں — میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

(۲۰) مرتا ہوں کس عذاب سے ہے وقت جی میں ہے — اس دم دعا برائے تمنائے دل کروں

(۲۱) جان دریغ نہ ہے اس آفت جاں کو معاملہ — بس کب تک انتظار تقاضائے دل کروں

(۲۲) وہ علم الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں — ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

(۲۳) محضر قتل ہے مکتوب گنہگاروں کا — سر قاصد کو وہ غصہ سے قلم کرتے ہیں

(۲۴) اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدا کے ساتھ — جنس میں تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں

(۲۵) کشتۂ یار ہوں اس رشک کہ تم بھی جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

(نگار) - ۱ - "گونۂ رخ طراز" سے مراد "گلگونۂ رخ طراز" ہے، یعنی وہ غازہ جو چہرہ میں حسن و دلکشی پیدا کر دیتا ہے -

۲ - پہلا مصرعہ تقطیع سے گرتا ہے - بجائے کیوں کے کیونکر پڑھئے - آہوئے نیمخواب اور نرگس نیم باز ایک ہی چیز ہے، یعنی معشوق کی نیم باز آنکھیں - مطلب واضح ہے -

۳ - بزم سور، یعنی بزم عیش و نشاط -

۴ - مجھ سے محبوب نے احتراز شروع کیا تو میں نے اس پر اظہار شکر کیا، غیر نے یہ سمجھ کر کہ شاید معشوق کا احتراز ہی کام کی بات ہوئی خود بھی التفات یار سے بیزار ہو کر اس کی شکایتیں شروع کر دیں -

- "جانِ نہفتہ راز" - یعنی وہ جان جس کا راز پوشیدہ ہے - شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی جان دینے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس سے کسی پردہ نشیں کے عشق کی پردہ دری نہ ہو - (جان نہفتہ راز میں بے حجابی اسی وقت ہوگی جب وہ نکلے گی)

۶ - مومن نے مکرِ شاعرانہ سے کام لیا ہے - محبوب سے کہتا ہے کہ میں تم سے اتنا دور رہتا ہوں کہ ہجراں میرے لئے غم کی چیز نہیں، اس لئے اگر واقعی مجھے ستانا چاہتے ہو تو مجھ سے ملو کیونکہ ستم کی بہتر صورت یہی ہے -

۷ - اغیار میرے شوقِ قتل کو دیکھ کر ہمت ہار گئے اور اس لئے اب قاتل کے آگے ان کی گردن جھکی ہوئی نظر نہیں آتی -

دوسرے مصرعہ سے یہ مفہوم بھی اظہار ہوتا ہے کہ اغیار محبوب کی اطاعت سے باہر ہو گئے ہیں - (گردن خم کرنا، اطاعت قبول کرنے کو بھی کہتے ہیں)

۸ - یہ دیکھ کر کہ محبوب فرطِ نزاکت کی وجہ سے اب مجھ سے گریز نہیں کرتا، مجھے وحشت ہوتی ہے کیونکہ جب مجھ سے احتراز نہیں تو ظاہر ہے، غیروں سے بھی نہ ہوگا -

۹ - اگر کوئے غیر میں محبوب کا نقش پا نظر نہیں آیا تو خوشی کی بات نہیں، کیونکہ جانتا ہوں وہ کسی بات میں ثابت قدم نہیں ہے اور ہو سکتا ہے وہ کسی اور جگہ پہنچا ہو یا یہ کہ غیر کے پاس آنے جانے لگے

۱۰ - اگر ہجرِ یار میں شراب کو میں نے حرام جانا تو کیا گناہ کیا - اگر شراب زہر ہوتی تو البتہ اس عالم میں اُسے پی جاتا -

۱۱ - چونکہ ہنگام وصل کسی بے اتفاقی کا حال دشمن سے نہ سُنا تھا، اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ وصل میں رنج و الم نہیں ہوتا، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور محبوب وصل میں بھی ہم سے مکدر ہی رہا

۱۲ - اگر دشمن کو بے خطا پامال کیا تو تم اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں اپنے انجام سے ڈر کر ترکِ محبت کر دوں گا -

۱۳ - ناصح نے مومن سے کہا کہ تم جور و ستم برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے اس لئے محبت ترک کر دو - اس کے جواب میں مومن کہتا ہے کہ شاید اس لئے میں تیری باتیں برداشت نہیں کر سکتا - (گویا بالفاظ دیگر ناصح کی نصیحت کو انتہائی جور و ستم ظاہر کیا گیا ہے)

۱۴ - اگر وہ سچے عاشقوں ہی کو ہلاک کرتا ہے تو پھر ہم بھی ہوس پرستی اختیار کریں گے، کیونکہ ہم بھی تو اپنی جان کے دشمن نہیں ہیں -

۱۵ - اگر خسرو، اپنے رقیب کوہکن کی موت پر فرطِ خوشی سے مر نہیں گیا بلکہ بے چین ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اُس سے کوہکن کا انتقام لیا جا رہا ہے -

۱۶ - یہ دیکھ کر کہ گلچیں تاراجِ چمن کی فکر میں ہے، میرے داغِ دل تازہ ہوئے، کیونکہ مجھے یہ وہم پیدا ہوا کہیں وہ اُس لالہ رو کی محبت میں نہ مبتلا ہوا اور اسی لئے پھولوں کو توڑ رہا ہو کہ یہ اس سے مشابہ ہیں -

۱۷ - بہار میں جوشِ جنوں بڑھ جانے کی شاعرانہ تاویل کی ہے کہ میں تو صرف خلش اور تپش کا شایق ہوں چونکہ بہار میں ان چیزوں کی کمی ہو جاتی ہے اس لئے مرا جوشِ جنوں بڑھ جاتا ہے

۱۸ - رنجش بار بار کی وجہ سے عشق کی انتہا نہ ہو سکی اور اس لئے جان بچ گئی، ورنہ ظاہر ہے کہ عشق کی انتہا میں مرنا ہی پڑتا -

۱۹ - تماشا کرنا یعنی نمایش کرنا - مطلب یہ کہ میں غیر تو ہوں نہیں کہ دل کی بیتابیوں کی نمایش کرتا پھروں، اس لئے میرا فرض یہی ہے کہ میں تپشِ دل نہ ظاہر ہونے دوں -

۲۰ - مشہور ہے کہ جانکنی کی تلخی کے وقت ایک ساعت قبولِ دُعا کی بھی آتی ہے، اس لئے مومن کہتا ہے کہ میں جس تکلیف سے جان دے رہا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید قبولِ دعا کا وقت یہی ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ تمنائے دل پوری ہونے کی دعا کروں -

۲۱ - میں کب تک اس کا انتظار کروں کہ وہ دل کا تقاضہ کرے اور دل دیکر جان کو مصیبت میں ڈالے، آخر کار جان دینا ہی ہے اس لئے کیوں نہ اس سے پہلے ہی اس جھگڑے کو ختم کر دوں -

۲۲ - "علی الرغمِ عدو" یعنی دشمن کی ضد میں - یعنی محض دشمن کی ضد میں مجھ پر لطف ہونا بڑا ستم ہے -

۲۳ - ہم نے قاصد کے ذریعہ خط بھیجا تو معشوق نے اس جُرم میں اسے قتل کر دیا - گویا ہم گنہگاروں کا مکتوب ہی محضرِ قتل تھا جس سے فتوائے قتل حاصل کیا گیا -

۲۴ "بیع سلم" اس بیع کو کہتے ہیں جس میں خریدار فروخت شدہ شے پر فوراً قابض نہ ہو سکے - مطلب یہ کہ دل کا سودا ابھی گویا "بیع سلم" کا سا ہے کہ مالک تو اس کا ہو جاتا ہے کوئی اور لیکن وہ بیچنے والے کے پاس ہی رہتا ہے -

۲۵ - وہ میری موت کا غم نہیں کرتے بلکہ وہ اس رشک میں مبتلا ہیں کہ مومن تو کشتۂ یار ہوا اور وہ نہ ہو سکے -

مطبوعات موصولہ

فردوس تخیل مجموعہ ہے مرحومہ زاہدہ خاتون شروانی کی منظومات کا، جنھوں نے اب سے ۲۵ سال پہلے، ہماری شاعری کی دُنیا میں اپنی نظموں سے ہلچل سی ڈالدی تھی یہ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی صاحبزادی تھیں اور انھیں کی تربیت میں انھوں نے علوم مشرقی سے استفادہ کیا تھا۔ ذوقِ ادب بھی انھیں باپ کی طرف سے ملا تھا اور فکر و خیال کی پاکیزگی بھی خاندانی ورثہ تھی۔

ایک عورت کا کلام محض اس وجہ سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ عورت کا ہے، چہ جائیکہ وہ واقعی خوب و پاکیزہ بھی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب مرحومہ کی نظمیں اول اول سامنے آئیں تو لوگ حیران رہ گئے اور پھر تو "ز۔ خ۔ ش" نے ایسی رومانی فضا پیدا کردی کہ ادبی صحبتوں میں اکثر یہی چرچا نظر آنے لگا۔

مرحومہ نے ۲۸ سال کی عمر میں شادی سے قبل ہی وفات پائی لیکن ان کی شاعری کی عمر ۱۰ سال سے زیادہ نہ تھی اور اس قلیل مدت میں جو کچھ اور جتنا کچھ انھوں نے کہا وہ ان کی غیر معمولی ذہانت اور سنجیدہ غور و فکر کا ثبوت ہے۔

اس مجموعہ میں تقریباً ۱۲۵ نظمیں ہیں جو تین ادوار میں تقسیم کی گئی ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرحومہ کے کلام میں اول ہی کافی پختگی پائی جاتی تھی جو رفتہ رفتہ تیسرے دور میں زیادہ دلنشین ہوگئی تھی مرحومہ کی بعض فارسی نظمیں بھی اس میں شامل ہیں، جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان میں بھی کتنی اچھی دستگاہ رکھتی تھیں۔

افسوس ہے کہ اسوقت تک اس مجموعہ کے بالاستیعاب مطالعہ کی سعادت ہم کو حاصل نہیں ہوئی، لیکن سرسری نگاہ کا فیصلہ یہی ہے کہ طبقۂ نسواں میں زاہدہ خاتون شروانی کی سی شاعرہ ہمارے زمانہ میں کوئی پیدا نہیں ہوئی۔

دار الاشاعت پنجاب نے اسکی اشاعت میں بھی نہایت اہتمام سے کام لیا ہے۔ نہایت چکنا آرٹ پیپر، بہترین طباعت و کتابت، مرصع سرورق، خوبصورت جلد۔ اور قیمت صرف ۸؍

منٹو کے افسانے مجموعہ ہے سعادت حسن صاحب منٹو کے ۲۶ افسانوں کا جسے مکتبۂ اُردو لاہور نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ منٹو پنجاب کے مشہور افسانہ نویس و ڈرامہ نگار ہیں ان کے افسانے مختلف رسایل میں شایع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہجو و تضحیک بھی ایک نوع کا اعتراف خوبی ہے تو "دین و دنیا" نے اسوقت تک منٹو کے افسانوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ کافی ثبوت ان افسانوں کی خوبی کا ہے۔

منٹو ترقی پسند حلقہ کے ممبر ہیں اور باوجود اس کے کہ اب تک یہ متحقق نہیں ہوسکا کہ یہ جماعت لٹریچر میں کیا انقلاب و ترقی چاہتی ہے، ہم کو افسانوں کی تراش و خراش میں یقیناً بہت سی اچھوتی باتیں نظر آتی ہیں اور نفسیاتی تجزیہ اور پلاٹ کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی ہم ان افسانوں کو پڑھکر ایسا محسوس کرتے ہیں کہ لٹریچر کا یہ دور یقیناً پہلے دور سے بالکل علحدہ ہے جس میں تمثیل کم لیکن فکر و تخیل زیادہ ہے۔ ان افسانوں میں نیا قانون، ہتک، شغل اور شرابی خصوصیت کے ساتھ نہایت خوب ہیں۔ قیمت ۲؍ اور ملنے کا پتہ: مکتبۂ اُردو لاہور۔

نئے زاویے مجموعہ ہے مختلف حضرات کے مضامین نثر و نظم کا، جو سب کے سب ترقی پسند جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے تمام افسانوں اور منظومات سے ہمیں اُن جدید رجحانات کا پتہ چلتا ہے، جنھوں نے ہمارے زمانہ کی کتاب فکر و احساس کا بالکل نیا ورق اُلٹ دیا ہے۔ اس سے قبل ہمارے لٹریچر میں واقعیت بھی شاعری اور ادب لطیف کا رنگ لئے ہوئے تھی، لیکن اب شاعری اور ادب لطیف میں بھی زیادہ تر مادی واقعیت اور تلخ حقیقت سے بحث کی جاتی ہے اور نئے زاویے میں جتنے افسانے اور منظومات شایع کئے گئے ہیں وہ سب اسی نئی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

نظم نگاروں میں جوش، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجاز، احسان دانش اور افسانوں میں منٹو، حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی اور احمد علی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس مجموعہ میں غالباً "آخری لفظ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجلد نسخہ کی قیمت تین روپیہ، غیر مجلد کی دو روپیہ آٹھ آنے اور ملنے کا پتہ مکتبۂ اُردو لاہور۔

ماورا جناب ن۔ م راشد کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر قافیہ و ردیف کی پابندی سے معرا اور مفہوم کے اعتبار سے بالکل نئے زمانہ کی چیزیں ہیں، جن کے سمجھنے کے لئے خاص سمجھ پیدا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہمارے لٹریچر میں بھی زبردست انقلاب پیدا ہو رہا ہے، لیکن چونکہ ابھی تک ہم عبوری یا برزخی دور سے نہیں گزر چکے ہیں، بنابریں ہر چیز (Chaotic) حالت میں ہے اور اسی لئے راشد صاحب اور اسی نوع کے انقلابی شاعروں کے کلام میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بظاہر الفاظ خوبصورت، خیالات کا میلان بلند، لیکن طرز ادا الجھی ہوئی اور جا بجا جدت پسندی ثقیل و ناگوار!

راشد صاحب کی شاعری انگلستان کے ایک نوجوان شاعر ولیم ایمپسن (William Empson) سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس کا قول بھی یہی ہے کہ نظمیں پیچیدہ اور مبہم سی ہونی چاہئیں کیونکہ اس طرح ہم کو ان کے سمجھنے کے لئے ذہانت سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ میں جو اسوقت (Futurism) آرٹ کا ہنگامہ بپا ہے اُسی سے وہاں کی بھی شاعری متاثر ہو رہی ہے اور اسی کی صدائے بازگشت ہندوستان میں بھی کہیں کہیں سننے میں آجاتی ہے۔ بہرحال راشد صاحب کی شاعری یقیناً بالکل نئی چیز ہے لیکن شاید اس کا تعمیری دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ زمانہ کے بعد اس میں پختگی پیدا ہو کر وہ "پہیلیوں" سے گزر کر ایسی "حکایت حال" میں تبدیل ہو جائے جو عام انسانوں کی سمجھ سے باہر نہ ہو۔

یہ مجموعہ بھی مکتبۂ اردو لاہور سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

روٹھی رانی منشی پریم چند مرحوم کا ایک طویل فسانہ ہے جو سرزمین راٹھواڑے کے راجستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت جو کچھ ہو لیکن افسانوی حیثیت سے اس کی خوبی مسلّم ہے۔ منشی پریم چند زیادہ تر دیہات کے معاشرتی افسانے لکھا کرتے تھے، لیکن اس میں وہ راجاؤں کی خواص تک پہونچ گئے ہیں اور آخیر میں رانیوں کے ستی ہونے کے دلدوز واقعہ پر اس افسانہ کو ختم کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس داستان کی ساری خوبی یہ ہے کہ باوجود صد درجہ رومانیت کے انداز بیان کا تاریخی رنگ بھی اس میں کافی پایا جاتا ہے اور کیرکٹروں کی کثرت کے باوجود پلاٹ زیادہ الجھنے نہیں دیا۔ قیمت بارہ آنے ہے۔ ملنے کا پتہ لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔

کربلا منشی پریم چند مرحوم کا ڈرامہ ہے، جس میں انھوں نے کربلا کے مشہور واقعہ کو پیش کرتے ہوئے، یزید اور حسین کے کردار کو ابھارا ہے۔ اس ڈرامہ کی بنیاد جن واقعات و حالات پر قایم ہے وہ زیادہ تر "ذکر الشہادتین" وغیرہ معمولی قسم کی کتابوں سے حاصل کئے گئے ہیں، اس لئے مبالغہ سے خالی نہیں۔ لیکن ایک فسانہ یا ڈرامہ کی تعمیر کے لئے ضروری تھا کہ اگر اس قسم کا لٹریچر پہلے سے موجود نہ ہوتا، تو ڈرامہ نگار کو خود اپنی طرف سے "زیب داستان" کے لئے اس نوع کے زواید اضافہ کرنا پڑتے۔

میری رائے میں اس قسم کے واقعات جنھوں نے ایک جماعت کے بالکل دو ٹکڑے کر دئے ہیں، ڈراما یا افسانے کی صورت میں کبھی نہ آنا چاہئے، کیونکہ ان سے اور زیادہ الجھنوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن پریم چند صاحب چونکہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے وہ محسوس نہ کر سکتے تھے کہ انھوں نے یہ کوئی اچھا اقدام نہیں کیا ہے۔ اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ فدک اور جمل کے قصوں کو فراموش اور ایک دل ہو جانے کی صورتیں پیدا کی جائیں، نہ کہ ان میں رنگ آمیزی کر کے جذبات کو اور مشتعل کیا جائے۔ ڈرامہ کے لحاظ سے بھی یہ چیز اچھی نہیں، کیونکہ تمثیل کے لئے جن چست و مختصر فقروں کی ضرورت ہے اُن سے یہ کتاب محروم ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور۔

ایک معلم کی زندگی عبد الغفار صاحب مدہولی، جامعۂ ملیہ دہلی کے مدرسۂ ابتدائی کے مدرس ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں انھیں کی لکھی ہوئی ہے جس میں انھوں نے اپنی اکیس سال کی جامعی زندگی کو شروع سے اسوقت تک قلمبند کیا ہے۔ عبد الغفار صاحب نے شروع سے جامعۂ ملیہ ہی میں تعلیم پائی اور یہیں اب وہ عرصہ سے مدرس کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنی متعلمانہ و معلمانہ دونوں زندگیوں کا حال اس قدر دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ اس کے پڑھنے میں ایک افسانہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ رہا کتاب کا افادی پہلو سو میں سمجھتا ہوں کہ اردو میں "فن تعلیم" پر شاید ہی کوئی ایسی مفید کتاب اتنے دلچسپ طریقہ سے لکھی گئی ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جامعۂ ملیہ کا نظام تعلیم کتنا پاکیزہ و بلند ہے اور وہاں بچوں کی سیرت کتنی استوار بنیاد پر تعمیر کی جاتی ہے۔ عبد الغفار صاحب شروع ہی سے جامعہ ملیہ کا عشق لیکر حیدرآباد سے آئے تھے اور اب بھی ایک مخلص عاشق کی طرح وہاں کام کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب نہ صرف بچوں کو پڑھائی جائے بلکہ ان کے والدین و اساتذہ کے مطالعہ سے بھی گزرے، تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ صحیح تعلیم و تربیت کا حقیقی راستہ کیا ہے۔ قیمت ہر جلد کی ڈھائی روپیہ ہے، جو اس کی طباعت، کتابت، کاغذ اور جلد کی خوشنمائی کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

نغمۂ زندگی مجموعہ ہے جناب سید فضل احمد کریم فضلی بی۔ اے (آکسن) آئی۔ سی۔ ایس (بنگال) کی غزلوں اور نظموں کا جو کلکتہ کی مشہور فلم ساز کمپنی "فضلی برادران لمیٹڈ" کے روح رواں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں لوگوں کا رجحان غزل میں "معمہ گوئی" کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ فضلی صاحب زمانۂ حال

یں اتنی کی چیز نکلے۔ " وذٰلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء ! " کہا جاتا ہے کہ پچھلے زمانہ کی شاعری میں ایہام کا عیب بہت تھا، لیکن اب اس سے نہ رہا ہام کا عیب نکل گیا فضلی صاحب کا یہ مجموعہ اس عیب سے بالکل پاک ہے۔

ان کے کلام میں اک سہل گفتگو کی سی سادگی و روانی پائی جاتی ہے اور ہم اسے بجا طور پر سہل ممتنع کہہ سکتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ رنگِ گلستاں، یہ عمر گریزاں	کہوں کیا الٰہی کہ کیا چاہتا ہوں،
کبھی کچھ سوچ کر رونا، کبھی کچھ سوچکر ہنسنا	خدا ہی جانے کیا دل میں مریضِ غم کے پنہاں تھا
خفا وہ کیا ہوئے، عالم خفا ہے	سبھی نہ دیکھو وہی کچھ کہہ رہا ہے

اس مجموعہ میں جو نظمیں ہیں، ان کی زبان کی شستگی و رنگی کا بھی یہی حال ہے۔ یہ مجموعہ نہایت نفیس آرٹ پیپر پر پیروتی ٹائپ میں چھاپا گیا ہے اور جلد و طباعت کی پاکیزگی کو دیکھکر دیوانِ غالب کا برلن والا نسخہ سامنے آجاتا ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ : - دفتر انجمن ترقی اُردو، دہلی ۔

داستان تاریخ اُردو مولوی حامد حسن قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کی تالیف ہے، جسے لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ نے شایع کیا ہے۔ اس موضوع پر اسوقت متعدد کتابیں ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولوی حامد حسن صاحب کی یہ تالیف اپنی جامعیت و حسنِ ترتیب کے لحاظ سے خاص امتیاز کی مالک ہے۔ ابتدا میں اُردو زبان کی اصلیت اور اس کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے، اب سے دو سو سال قبل تک کی اُردو شاعری کا ذکر کر کے اس حصہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد نثر نگاری کے جو دور قایم کر کے مشاہیر نثر نگار حضرات کے حالات اور ان کی تصانیف کے اقتباسات درج کر کے ان پر تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ باوجود اختصار کے اتنی تحقیق و کاوش کا حامل ہے کہ مجھے تو یہ کتاب تاریخ نثر اُردو کی اچھی خاصی سائکلوپیڈیا معلوم ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کو البتہ انھوں نے نہیں لیا، نہایت سرسری اس سے گذر گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب کافی ضخیم ہوگئی تھی لیکن اگر دورِ حاضر کو شامل کر کے یہ کتاب پچاس ۸۵ صفحات کے ... اسفحات کی ہو جاتی تو زیادہ حرج نہ تھا، بہرحال کتاب بہت مفید ہے اور اُردو کے ہر ادیب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ بھی بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے۔

مولانا محمد علی کے یوروپ کے سفر پروفیسر محمد سرور صاحب جامعہ ملیہ دہلی نے تمام ان مقالات و مکتوبات کو جو مولانا محمد علی مرحوم نے اپنی مغربی سیاحتوں کے متعلق لکھے تھے یکجا کر دیا ہے۔ ۱۸۹۸ء سے لیکر ۱۹۳۰ء تک جتنی بار انھوں نے ولایت کا سفر کیا ہے، ان سب کا ذکر اس مجموعہ میں پایا جاتا ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم جن خصوصیات کے انسان تھے اُن کو سمجھنے کے لئے ان مقالات و مکاتیب کا مطالعہ ضروری ہے اور پروفیسر محمد سرور صاحب ان کی شیرازہ بندی کر کے یقیناً بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔ اس کی قیمت ۱۲؍ ہے اور ملنے کا پتہ کتاب خانہ پنجاب۔ لاہور۔

آج کا مصر پروفیسر محمد حسن (اعظم گڈھی) جو جامعۂ ازہر قاہرہ میں عربی تعلیم حاصل کرنے گئے تھے اور اب فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہیں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ رخصت لیکر ہندوستان آئے تھے۔ وہیں اُن کے ایک دوست عبدالسلام صاحب خورشید نے اُن سے مصر کے متعلق تازہ حالات حاصل کئے اور ایک جگہ قلمبند کر لیا۔ یہ کتاب انھیں معلومات کی شیرازہ بندی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصر سیاسی و اقتصادی حالات کے متعلق اس سے زیادہ تعبیر و صحیح ذریعہ ہماری معلومات کا اور کوئی نہیں ہو سکتا اس لئے جو حضرات مصر کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

یہ کتاب اُردو اکاڈیمی لاہور نے شایع کی ہے اور خاص اہتمام کے ساتھ شایع کی ہے۔

حرفِ ناتمام منشی مہاراج بہادر برق دہلوی مرحوم کی غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ برق مرحوم، دہلی کے نہایت خوشگو شعرا میں تھے اور نظم و غزل دونوں خوب کہتے تھے۔ اس مجموعہ میں ۳۰ نظمیں اور تقریباً ۵۰ صفحات انتخاب غزلیات کے ہیں۔ لیکن کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوقِ غزلگوئی زیادہ پاکیزہ تھا۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے بہت سوچ سمجھ کر کہتے تھے اور فارسی ترکیبوں کو بہت سلیقہ کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں:

بہارِ خندۂ گل دیدنی ہے باغِ عالم میں	تماشا ہوگیا غنچہ کا شیرازہ بکھر جانا
ہمہ تن گوش ہوں سننے کو نوا ہائے دروں	کونسا نغمہ ہے جو تارِ رگِ جاں میں نہیں
رہے گا کس کا حصہ بیشتر میرے مٹانے میں	یہ باہم فیصلہ پہلے زمین و آسماں کر لیں

اس دیوان کی قیمت ۱۲؍ ہے اور ملنے کا پتہ جناب طالب بی۔ اے۔ چاوڑی بازار۔ گلی تباشان۔ دہلی۔

مقام محمود مولانا عبدالمالک آروی کے تاریخی، ادبی، اور انتقادی مقالات کا مجموعہ ہے جسے فیروز طاق بستاں آرہ نے شایع کیا ہے، اس مجموعہ میں تیرہ مقالے ہیں جنمیں سے پانچ نگار میں شایع ہوئے تھے اور باقی آٹھ دوسرے رسایل و جراید میں۔ مولانا عبدالمالک کا فضل و کمال نگار کے حلقہ میں اس قدر متعارف ہوچکا ہے کہ اُن کے مقالات کے متعلق کوئی رائے زنی تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ ضرورت تھی کہ ان منتشر اوراق علم و ادب کو ایک شیرازہ سے منسلک کردیا جاتا اور اس لئے ادارۂ طاق بستاں کا ہمیں شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس نے اس مفید کتاب کی اشاعت سے ہماری زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ طاق بستاں آرہ

قابیل انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی تمثیل کا ترجمہ ہے جناب مجنوں گورکھپوری کے قلم سے، جس کو دیکھ کر غالب کا مصرعہ۔ "ذکر اس پریوش کا اور پھر بیان اپنا"۔ یاد آجاتا ہے۔ اس تمثیل میں موت کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شیطان کے کردار کے ذریعہ سے ایک بلند انتقادی چیز پیش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری ادبیات میں اس نوع کے لٹریچر کا اضافہ بڑا مفید اضافہ ہے۔ قیمت ۱۲ہ ہے اور ملنے کا پتہ:۔ ایوان اشاعت، گورکھپور۔

نگار نامہ درج مکاتیب کا دوسرا حصہ ہے، جسے جناب ساغر نظامی نے ایشیا کے خاص نمبر کی جگہ شایع کیا ہے، اس سے پہلے ایک مجموعہ اور شایع ہوچکا ہے۔ اس میں اور بہت سے حضرات کے خطوط ہیں، جو پہلے مجموعہ میں شایع ہونے سے رہ گئے تھے۔ یہ گلدستہ ادارۂ ادبی مرکز میرٹھ سے ملسکتا ہے۔

ناکام جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی، دہلی کے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو بجا طور پر دہلی کی زبان جاننے والے کہے جاسکتے ہیں۔ یہ کتاب انھیں کے فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ نہ کوئی فسانہ ہے، نہ اصطلاحی حیثیت سے کوئی انتقادی تصنیف۔ لیکن اس کی ادبیت اور گہری ادبیت میں فسانہ و انتقاد دونوں شامل ہیں قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ: مصنف کا نام اور مٹیا محل دہلی۔

سلیس اُردو انجمن ترقی اُردو حیدرآباد نے نثر و نظم کا یہ مجموعہ "سلیس اُردو" کے نام سے شایع کرکے بتایا ہے کہ اب ہمیں اس قسم کی زبان کی ضرورت ہے۔ مضامین مفید و پُراز معلومات بھی ہیں۔ یہ مجموعہ بالغ مبتدیوں کو اُردو سکھانے کے لئے شایع کیا گیا ہے اور یقیناً بہت کارآمد ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے۔

افراط گریہ شیعہ ریڈیکل سوسائٹی لکھیم پور کھیری، اثنا عشری مذہب کے بعض رسوم و قیود کے متعلق عرصہ سے خاموش اصلاحی خدمت انجام دے رہی ہے۔ یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس میں بزم عزا کے صحیح مقاصد کو پیش کرکے گریہ و زاری کی کثرت پر منصفانہ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرات شیعہ عام طور پر اس کو کس نظر سے دیکھیں گے، لیکن اہل فکر ضرور اس کی قدر کریں گے۔

صحت و صفائی محمد حسین صاحب حسان نے بچوں کے لئے صحت و صفائی کے متعلق فسانوی انداز میں بعض اسباق تحریر کئے ہیں جن کا مطالعہ بچوں اور بوڑھوں سب کے لئے مفید ہے۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

انتظام کتب خانہ کتب خانہ کی تنظیم ایک خاص فن ہے جس کے حاصل کئے بغیر آجکل کسی جدید کتب خانہ کو جدید طریقہ سے مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب میں اسی فن پر بحث کی گئی ہے اور ایسے دو شخصوں نے کی ہے جو اس کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو کتاب خانہ رکھنے کے شایق ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

خرمن عشق جناب شفیق جونپوری کا دیوان ہے، جس میں غزلیں، قصیدے، نظمیں اور بہت سے تاریخی قطعات بھی شامل ہیں۔ جناب شفیق، مولانا حسرت موہانی کے شاگرد ہیں اور اس وقت کے خوشگو شعراء میں سے ہیں۔

شروع میں بہت سے لوگوں کی تقریظیں بھی شامل ہیں۔ جن میں اقبال سہیل، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ کتابت و طباعت معمولی ہے۔ قیمت ایکروپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب شفیق۔ جونپور۔

اسلام اور اس کا مستقبل مسٹر لیوپولڈ ویس، ایک انگریز نو مسلم نے، ممالک اسلامی کی سیاحت کرنے کے بعد اسلام قبول کیا اور ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اسلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ کتاب اسی کے بعض ضروری اجزاء کا ترجمہ ہے جسے مجتبیٰ حسن صاحب نے پیش کیا ہے۔ خیالات جتنے پاکیزہ ہیں، ترجمہ بھی اتنا ہی پاکیزہ ہے۔ کتاب بہت مفید و دلچسپ ہے۔ نظامی پریس لکھنؤ سے خط و کتابت کی جائے۔

جنوری سنہ ۴۱ء اور جنوری سنہ ۴۲ء کا نگار

دونوں ایک ساتھ مجلد کرائیے اور اگر ان میں سے کوئی پرچہ موجود نہ ہو تو ہم سے طلب کرلیجئے، ورنہ چند دن بعد نہ ملے گا۔ — منیجر نگار

آبگینے

ایک حقیقی شاعر ماحول سے کتنا متاثر ہوتا ہے؟ اس کا جواب آپ کو ذیل کی نظم سے ملے گا جو سرزمین کشمیر کی پیداوار ہے اور تعریف سے بے نیاز! (نگار)

یاد آگیا پھر اک بُتِ رعنا، غضب غضب — رنگیں خرام، کیف سراپا غضب غضب

سج دھج نرالی، وضع انوکھی، ادائیں — آواز؟ جیسے گیت سُریلا غضب غضب

لہجے میں لوچ، لوچ میں وہ نرم زمزمہ — لہرا بجائیں جیسے کنہیّا غضب غضب

آنکھوں میں نیند، نیند میں ڈورا خمار کا — نازک سے آبگینوں پہ مینا غضب غضب

وہ پتلیاں کہ "مانسرور" کی جھیل میں — "سپنوں کی ناؤ" کھیتے ہیں دیوتا غضب غضب

ابرو وہ بانکے، بات پہ تلوار سوت لیں — اور کردیں ایک "دیکھا نہ دیکھا"، غضب غضب

پلکیں گھنیری، گوپیوں کی ٹوہ کے لئے — "رادھا" کے جھانکنے کا جھروکا غضب غضب

اور اُن کی اور چھور وہ "چت چور" چتونیں — لوٹیں، مگر ذرا جو ہو کھٹکا غضب غضب

ان بستیوں میں پل کے جواں ہوں جو ستیاں — اُن ستیوں کا کیا ہے ٹھکانا غضب غضب

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل کہ ہائے ہائے — جیسے کنول کی تاک میں بھونرا غضب غضب

مدھ کی کٹوریوں میں وہ امرت گھُلا ہوا — جس کا ہے "کام دیو" بھی پیاسا غضب غضب

اُن لمبے لمبے بالوں میں گھونگھر کی لہر سی — کروٹ سے جیسے بہتی ہو گنگا، غضب غضب

اُن گورے گورے گالوں پہ اک لٹ لٹک پڑی — فوراً اُٹھا چہرہ لال بھبوکا غضب غضب

وہ ہونٹ جن کو چوم رہی تھی شگفتگی — یاقوت اتنا سُرخ نہ چوکھا غضب غضب
وہ چُلبُلی ادائیں، اداؤں کے ساتھ ساتھ — نتھنوں کا بار بار پھڑکنا غضب غضب
اپنی ہنسی پہ غصہ، کبھی غصّے پر ہنسی — سُونا لٹا دیا کبھی رو یا غضب غضب
اُف اُف وہ پور پور میں مہندی رچی ہوئی — ٹیسو کا پھُول دیکھا تو ہوگا ؟ غضب غضب!
اس واسطے "چنگیر" ہتیلی کی دیکھ لوں — انگڑائی توڑنے کا بہانا، غضب غضب

بھڑکا رہی تھی حُسن کو گرمی شباب کی
کھنچتا تھا عطر یا تھا پسینا غضب غضب

اک تشنہ کام شوق کی حسرت بھری نظر — دل بیقرارِ عرضِ تمنا، غضب غضب
بہکے ہوئے سوال کا بہکا ہوا جواب — اُس پر دبا کے ہونٹ وہ کہنا "غضب غضب"
وہ التفات بخششِ بے حد کہیں جسے — پُرسش کے بعد رنجشِ بیجا غضب غضب

گفتار کو شئی لبِ میگوں کے ساتھ ساتھ
شرمندگیِ حیا کا تقاضا غضب غضب

بیتابیوں نے ہوش سے بیگانہ کر دیا — برہم ہوئی وہ بزم تماشا غضب غضب
اوجھل ہوا نگاہ سے وہ جانِ آرزو — محرومیاں ہیں اور دلِ شیدا غضب غضب

جوشِ جنوں میں وہ بھی اثر چاک ہوگیا
ہلکا سا رہ گیا تھا جو پردا غضب غضب!

(خان بہادر) جعفر علی خاں اثر بی۔اے

راستے

ارضِ ناقوس و اذاں جولانگہ اہلِ کتاب
اک شبِ بے ماہ و اختر اک سحر بے آفتاب

وہ زمیں، بستے ہیں جس پر زہد کے پالے گناہ
معبدوں کی کھڑکیوں سے جھانکنے والے گناہ

برہمن زادوں کی گلیاں راہبوں کے رہگذر
پے بہ پے کوچہ بہ کوچہ آدمیت کے مزار

زہد کی فتنہ گری زنّار داروں کے فریب
ایسی کالی رات اور یہ چاند تاروں کے فریب

خونِ آدم کا تلاطم رہگذر در رہگذر
آدمیت کا جنازہ کفر و دیں کے دوش پر

رہگذاروں پر رواں تہذیب کے پروردگار
دونوں جانب کوڑھیوں کی چیخ اندھوں کی پکار

بُت گروں کے راستے پیغمبروں کے راستے
آذروں کے راستے ہیں سنجروں کے راستے

سیکڑوں تسبیح خواں ہیں سیکڑوں زنّار دار
اُٹھ رہا ہے ہم نفس وہ دیکھ رستوں سے غبار

آہ وہ رستے رواں ہوں جن پہ ڈاکو سیکڑوں
گام زن ہوں جن پہ چنگیز و ہلاکو سیکڑوں

روندتے ہوں جن کو منعم جن پہ چلتے ہوں امیر
ٹھوکریں کھا کھا کے سوتے ہوں جہاں اندھے فقیر

سیکڑوں مفلوج جن رستوں پہ وقفِ خواب ہوں
گود میں جن ساحلوں کی سیکڑوں سیلاب ہوں

کتنے عارف، کتنے صوفی، کتنے کعبہ کے امام
گام زن ہیں کتنے قیدی، گرم رو کتنے غلام

خاک بر سر کیسے کیسے بے نوا خانہ بدوش
کتنی آہیں، کتنی چیخیں، کتنے غم، کتنے خروش

کتنی میلی چادریں ہیں کتنے برقعوں میں ہے خاک
کتنے دامن ہیں دریدہ کتنے پیراہن ہیں چاک

سوختہ کتنے جگر ہیں کتنے سینے دلفگار
کتنی آہیں بے اثر ہیں، کتنی آنکھیں اشکبار

کس قدر جلوے غبارِ راہ میں گم ہیں یہاں
خون میں ڈوبے ہوئے کتنے تبسم ہیں یہاں،

کیسے کیسے بے سر و ساماں بڑھاپے صرفِ خواب
کتنے افسردہ لڑکپن، کتنے پژمردہ شباب

کتنے دل شعلہ بداماں کتنے سینوں میں ہے آگ
آہ ان رستوں پہ ہیں اُجڑے ہوئے کتنے سہاگ

راستوں میں تپ رہے ہیں کتنے مردوں کے بدن
کتنی لاشیں ہیں انہی رستوں پہ بے گور و کفن

جانبِ دیر و کلیسا جانے والے رہگذار
اُف یہ سانپوں کی طرح لہرانے والے رہگذار

خانقاہوں کے مقدس خواب دکھلاتے رہے
مرمریں آذر کدوں کے زمزمے گاتے رہے،

دور سے آغوش پھیلاتے ہیں کتنے راستے
بن بلائے سامنے آتے ہیں کتنے راستے

ہم نوا میرا نہ کوئی ہم سفر میرے لئے
کتنی وحشت ناک ہے ہر رہگذر میرے لئے!

پروفیسر شور (علیگ)

غزل : فراق گورکھپوری

بہار کیا ہے؟ اِسے گر کوئی کبھی دیکھے ۔ — تو اُس گُلِ چمن آرا کی تازگی دیکھے

یہ شانِ جلوہ گری خوب ہے کہ دیکھی آنکھ — قریب ہی تجھے دیکھے نہ دور ہی دیکھے ۔

وہ آنکھ آئینہ اس دورِ انتشار کا ہو — جو اُس کے گیسوئے پُرخم کی برہمی دیکھے

نہ دل کو اپنے پہ قابو نہ تجھ پہ بس کوئی — وہ اپنا گریۂ غم یا تری خوشی دیکھے

بُھلا کے عہدِ وفا جب وہ پاس آ بیٹھے — بس ایسے میں کوئی اس کی سپردگی دیکھے

وہ جسم سربسر اک خوابِ شادمانی ہے — کہ جیسے کوئی نہ آئی ہوئی ہنسی دیکھے

یہ وصل کا تھا کرشمہ کہ حُسن جاگ اُٹھا — ترے بدن کی کوئی اب خود آگہی دیکھے

کسی کے روٹھ کے مُنہ پھیرنے کی تھی یہ ادا
کوئی فراق کی جانب اگر کبھی دیکھے!

غزل : تمکین سرمست

نیرنگِ دردِ دل کی کوئی انتہا نہیں — اُس کا پتہ ملا تو ہمارا پتا نہیں

ہم یاد کر رہے اُنھیں کس امید پر — اب تو غمِ فراق کا بھی آسرا نہیں

حالانکہ تم نے کب کا بُھلا بھی دیا، مگر — تم مجھ کو بھول جاؤگے دل مانتا نہیں

یہ یاد ہے کہ مجھ کو کسی کی تلاش تھی — اب یہ خبر نہیں کہ ملا بھی وہ یا نہیں

اِک لمحۂ فریبِ اجل کے سوا مجھے — کس وقت انتظار تمھارا رہا نہیں

نزدیک ہو کے دور ہوا کس سے جائے گا — اور اس قدر قریب سے کچھ سوجھتا نہیں

دُنیا و دیں لُٹا کے اُسے دیکھ تو لیا — یہ اور بات ہے کہ کہیں کا رہا نہیں

منزل وہی ہے اپنی جہاں تھک کے بیٹھ جائیں — مدِ نگاہِ شوق کوئی راستہ نہیں

کہنے کو اب بھی زندہ ہوں لیکن ترے بغیر — کب زندگی پہ موت کا دھوکا ہوا نہیں

وصل و فراق کھیل ہیں نیرنگِ شوق کے — ورنہ جنونِ عشق کا کچھ مدعا نہیں

تمکیں جفائے یار کو معلوم ہو تو ہو
اپنی وفا کا مجھ پہ تو عقدہ کُھلا نہیں

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۱	فہرست مضامین مئی سنہ ۴۲ء	شمار ۵

ملاحظات ---------- ۲

قتیل کا وطن ------ سید اسد علی انوری فرید آبادی --- ۵

جاپان کے خوفناک ارادے ---------- ۱۱

سوچ (ایک نفسیاتی مطالعہ) --- مجتبیٰ حسین ------ ۱۴

سیماب صاحب اور شیطان ---- الحق ------ ۱۸

پورب اور پچھم ـ دو ہواؤں کا تصادم --- محمد عتیق صدیقی --- ۲۳

باب الاستفسار ---------- ۳۲

مطبوعات موصولہ ---------- ۳۵

منظومات ---- آثر ـ جمال ـ ماہر ------ ۳۷

ضروری اعلان

میں پہلی مئی کو نینی تال پہونچ جاؤں گا اور ۲۶ مئی تک وہیں رہوں گا۔ چونکہ دفتر کا ایک حصہ میرے ساتھ ہوگا، اس لئے اگر اس زمانہ میں براہ راست نینی تال کے پتہ سے خط و کتابت کی گئی تو تعمیل نسبتاً جلد ہو سکے گی ـ جو ڈاک لکھنؤ کے پتہ سے آئے گی وہ بھی ریڈائرکٹ ہوکر میرے پاس وہیں پہونچے گی لیکن ظاہر ہے کہ اس کی تعمیل میں اور زیادہ دیر ہوگی۔

(۲) جون کا پرچہ غالباً ۱۵ ریا ۲۰ رجون تک شایع ہوگا، اس لئے ۲۵ رجون سے پہلے پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت نہ کی جائے ـ جولائی کا نگار اپنے وقت سے نکلے گا ـ نینی تال کا پتہ: "ہمالیہ ہوٹل" ہوگا

نیاز فتحپوری

ملاحظات

حالات جنگ

گردش اور مدوجزر، کائنات کے نظام اور مظاہر قدرت کا اصل اُصول ہے، کسی ایک نقطہ پر کسی چیز کو سکون نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ لڑائی میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے، لیکن کچھ عرصہ تک ایک ہی قسم کی خبریں سننے کے بعد ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ لڑائی ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی ہے، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔

سنگاپور کے فوراً بعد ہی رنگون پر جاپانی قبضہ نے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقعہ دیا تھا کہ جاپانی فوجوں کی رفتار غالباً یہی رہے گی اور برما کی لڑائی چند دن میں ختم ہو جائے گی، اسی طرح روس کے محاذ پر بھی یہی یقین تھا کہ موسم بہار شروع ہوتے ہی نازی فوجیں اپنی پیشقدمی زور شور سے شروع کر دیں گی، لیکن نہ اب تک برما کی لڑائی ختم ہوئی، نہ ہٹلر نے روس کی طرف کوئی خاص جارحانہ قدم اُٹھایا — مگر اس سے کوئی مختتم نتیجہ نکالنا غلطی ہوگی

اس میں شک نہیں کہ محوری طاقتوں کے مقابلہ میں جمہوری قوتوں کا پلہ اپنی طیاریوں کے لحاظ سے بھاری ہوتا جا رہا ہے، لیکن اگر جرمنی اور جاپان دونوں کا جارحانہ پہلو، مدافعت میں تبدیل ہو جائے، تو بھی اس وقت تک وہ اتنا حاصل کر چکے ہیں کہ اس کے واپس لینے کے لئے وقت، روپیہ اور جان کا زبردست خراج ادا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ جنگ کا ہر وقفہ، اس کی طوالت اور گتھیوں میں اضافہ کرتا جا رہا ہے، اور مشکل ہی سے وقت یا نتیجہ کی تعیین کی جا سکتی ہے*

اس وقت بظاہر لڑائی کے صرف تین محاذ نظر آتے ہیں ایک بحر پاسفک، دوسرا روس اور تیسرا لیبیا، لیکن سچ پوچھئے تو ساری دنیا اس سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہو رہی ہے۔ اگر کسی قطعۂ زمین کو یہ آگ خاک سیاہ کر چکی ہے، تو دوسری جگہ اس کی لپٹیں پہونچ رہی ہیں، اگر کہیں اس کا صرف دھواں نظر آتا ہے، تو دوسری جگہ اس کی گرمی محسوس کی جا رہی ہے، الغرض اسوقت کوئی ملک ایسا نہیں، جو اس خطرہ سے دور ہو

ساحل مدراس پر وزیگاپٹم اور کوکوناڈا میں جاپانی ہوا بازوں نے جو بم گرائے ہیں، ان سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ جاپان کا آئندہ اقدام ہندوستان ہی کی طرف ہونے والا ہے، اور جس خطرہ کا اندیشہ تھا وہ ہمارے سامنے ہے

سنگاپور، جنوبی برما اور جزایر جاوا و سماٹرا پر جاپانی قبضہ نے دشمن کے لئے خلیج بنگال کا راستہ بڑی حد تک صاف کر دیا ہے، چنانچہ اس نے جزائر انڈمان و نکوبار میں بھی اپنی فوجیں اُتار دی ہیں اور اس سلسلہ کی صرف ایک کڑی سیلون ایسی رہ گئی ہے کہ اگر وہ بھی دشمن کے ہاتھ آجائے تو پھر خلیج بنگال میں اسکی نقل و حرکت بالکل آزاد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے اس نے سیلون پر دو بار ہوائی حملے کئے۔ ہر چند وہاں اسے ہر مرتبہ کافی نقصان اُٹھانا پڑا، لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ خطرہ ختم ہو چکا ہے

اس میں کلام نہیں کہ جاپان کی اسکیم خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کے سواحل تک اپنا اثر قایم کرنا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اسے نہ صرف سیلون بلکہ ہندوستان کے بعض ساحلی مقامات پر بھی گھیرا ڈالنا ضروری ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا آغاز کب ہو

شمالی برما کی طرف جاپانی اقدام کی وہ رفتار بیشک نہیں ہے جو اس سے قبل ملایا یا جنوبی برما میں پائی جاتی، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے اور پیٹرول چشموں کے مرکز سخت خطرہ میں ہیں

اب اسی کے ساتھ آپ جرمنی کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ روس میں اسے وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کی اسے توقع تھی اور نازی نقصان کی فہرست اب اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ ہٹلر کوئی دوسرا جارحانہ قدم اُٹھاتے ہوئے ہچکچاتا ہے، لیکن صورتیں کچھ ایسی ہیں کہ اسے بغیر لڑے چارہ بھی نہیں ہے۔ اسلئے

اگر وہ اسکو و لینن گراڈ کی طرف نہ بڑھا تو جنوبی روس کی طرف بڑھنا اس کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ لڑائی جاری رکھنے کے لئے اس وقت سب سے بڑا سوال پٹرول کا ہے اور عراق و باکو کے پٹرولی چشموں تک پہونچنے کے لئے وہ اپنی ساری کوششیں صرف کر دے گا، اس سلسلہ میں قدرتاً ترکی کا سوال بھی سامنے آجاتا ہے، کیونکہ بلغاریا کی طرف سے تازہ فوجوں کا راستہ ترکی ہو کر ہے اور اقرار وانکار دونوں صورتوں میں اس کو میدان جنگ بننا ضروری ہے

کہا جاتا ہے کہ جس وقت جرمنی کا یہ نیا حملہ شروع ہوگا تو جاپان بھی سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا، تاکہ روس کی قوت منتشر ہو جائے اور چونکہ وشی حکومت اب موسیو لاوال کے ہاتھوں میں ہے جو نازیوں کا طرفدار ہے، اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ ہٹلر فرانس کی بحری قوت اور اس کے دوسرے ذرائع سے فایدہ اُٹھا کر براہ لیبیا اسکندریہ اور نہر سویز تک پہونچنے کی کوشش کرے گا

یہ ہے اُن خطرات کی فہرست جو برطانیہ اور اس کی ساتھی حکومتوں کے سامنے ہیں۔ اب آیئے علحدہ علحدہ ان میں سے ہر ایک پر غور کریں کہ ان کی اہمیت کیا ہے اور ان کے خلاف کیا کیا امکانات پائے جاتے ہیں

ہندوستان اور برما جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ہندوستان پر حملہ کرنا یقیناً جاپان کی اسکیم میں شامل ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس میں آسانی سے کامیاب ہو سکے گا۔ حملۂ ہندوستان کی ایک غرض تو یہ ہو سکتی ہے کہ سارے ملک پر قبضہ کیا جائے اور دوسری یہ کہ ساحلی مقامات پر یا ساحل سے قریب تر دوسرے مقامات پر قبضہ کرکے نہ صرف خلیج بنگال بلکہ سارے بحر ہند میں رنگون سے لیکر عدن تک اور نہر سویز تک راستہ صاف کر لیا جائے۔

اول صورت کی کامیابی کے امکانات بہت ضعیف ہیں۔ کیونکہ ہندوستان ایسے طویل وعریض ملک پر تسلط قایم کرنے کے لئے اتنی طویل مہم کی ضرورت ہے کہ شاید جاپان کی عمر اس کے لئے وفا نہ کرے۔ اگر اس نے صرف خشکی کی طرف سے بڑھنے کا ارادہ کیا تو پہلے اسے برما فتح کرنا ہوگا اور شمالی برما میں جنگ کی موجودہ رفتار جاپان کے حق میں اتنی سست ہے کہ قلب ہندوستان تک پہونچنے کے لئے اسے طویل زمانہ درکار ہوگا، اور اگر ہم ان مدافعانہ تدابیر کو بھی سامنے رکھیں جو روز بروز برطانیہ کی طرف سے زیادہ استحکام کے ساتھ اختیار کی جا رہی ہیں اور امریکہ کے اس وعدۂ امداد پر بھروسہ رکھیں جس کا مسٹر روز ویلٹ نے حال ہی میں اعلان کیا ہے، تو پھر یہ بات مشکل ہی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جاپان ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکتا ہے

جاپان کو شاید یہ خیال بھی ہے کہ جس طرح برما کی آبادی نے اس کا ساتھ دیا ہے، ہندوستان کی آبادی بھی اسکی شریک ہو جائے گی، لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ برما کی آبادی نسلی وتمدنی مشارکت کی وجہ سے جاپان کی طرف مایل ہو سکتی تھی، مگر ہندوستان جو بہ لحاظ تہذیب و معاشرت، اخلاق و مذہب جاپان سے بالکل مختلف ہے، کبھی یہ جذبہ اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا، علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ وہ ملک آزادی سے کم کسی اور مفاہمت پر راضی ہو ہی نہیں سکتا اور جاپان کی بدنام امپریلزم سے وہ یوں بھی پوری طرح آگاہ ہے

اگر جاپان نے ہندوستان کا خیال ترک کرکے صرف ساحلی مقامات پر قناعت کرنا چاہی تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اسے زیادہ تر بحری وہوائی قوت سے کام لینا پڑے گا، لیکن چونکہ اسے بحر پاسفک میں بھی اپنی موجودہ پوزیشن کو قایم رکھنا ہے اور ایک مہینہ کے بعد بارش کا موسم جہازوں کی نقل وحرکت کو دشوار بنا دے گا، اسلئے جاپان غالباً اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف وہ اپنے مقبوضات پاسفک سمندر کو بھی ہاتھ سے نہ نکلنے دے، اور دوسری طرف وہ کلکتہ، مدراس اور سیلون سے لیکر افریقہ اور مشرق وسطی کے ساحلوں تک اپنا اقتدار قایم کرے۔ امریکہ جس تیزی کے ساتھ اپنی بحری اور ہوائی طاقت بڑھا رہا ہے، وہ جاپان کے لئے ایک علحدہ مستقل خطرہ ہے جو اسے کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خود اپنے ملک کی طرف سے مطمئن ہو کر دور دراز سمندروں میں قسمت آزمائی کرتا پھرے۔

جاپان اور روس بعض کا خیال ہے کہ جاپان سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا۔ اول تو یوں بھی اس کا امکان بہت ضعیف ہے، کیونکہ جاپان مشکل ہی سے اپنے آپ کو اس خطرہ میں ڈال سکتا ہے کہ ایک طرف وہ بحر ہند و بحر پاسفک میں بھی اپنی مہم جاری رکھے اور دوسری طرف روس پر بھی حملہ کر دے۔ اس کا موجودہ بحری محاذ کیا کم ہے کہ وہ روس ایسی زبردست قوت کی دشمنی مول لیکر خشکی کا دوسرا طویل محاذ قایم کرے —— لیکن اگر اس نے ایسا کیا بھی تو کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے

سوویٹ حکومت ۳۳ء سے مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر جنگ کرنے کی طیاریاں کر رہی ہے اور سائبیریا کی طرف اس کی فوج جوں کی توں محفوظ ہے تیسری پنج سالہ اسکیم کی رو سے سائبیریا کا ریگ زار، ایک نہایت اچھے زرخیز خطہ میں تبدیل ہو گیا ہے، اور وہاں کی زرعی وصنعتی پیداوار اتنی کافی ہو گئی ہے کہ

سوویٹ حکومت اپنے مغربی محاذ کو نقصان پہونچائے بغیر مشرق میں جاپان کو برسوں اُلجھائے رکھ سکتی ہے

یہ درست ہے کہ اوکرائن اور سفید روس کا علاقہ نکل جانے کی وجہ سے مغربی حصۂ ملک کی پیداوار سے وہ بڑی حد تک محروم ہو گیا ہے لیکن سوویٹ حکومت کی پیٹھ کی ہڈی نہ اوکرائن ہے، نہ سفید روس، نہ ماسکو ہے، نہ لینن گراڈ بلکہ یورال پہاڑوں کا وہ سلسلہ ہے جو شمال سے لیکر جنوب میں سرحد ایران تک چلا گیا ہے۔

ان پہاڑوں میں سوویٹ حکومت کے اتنے ذخیرے جمع ہیں اور آلات حرب بنانے کے اتنے کارخانے پائے جاتے ہیں کہ مغرب کی طرف اگر اس کا سارا علاقہ ہاتھ سے نکل جائے، تو بھی وہ برسوں جاپان اور جرمنی دونوں سے جنگ کر سکتا ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ جاپان۔ روس پر حملہ کرنے کی حماقت کر سکتا ہے

روس اور جرمنی

یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ جرمنی کی توقعات روس میں پوری نہیں ہوئیں۔ ہٹلر کو یقین تھا کہ جس وقت نازی فوجیں حدود روس میں داخل ہوں گی، وہاں انقلاب پیدا ہو جائے گا، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ سوویٹ حکومت سے وہاں کی رعایا بالکل مطمئن ہے اور اس لئے دوسرا حملہ اس کا بالکل دوسرے حالات کے تحت ہوگا

پہلے اس کے پاس فوج بھی زیادہ تھی اور پٹرول و دیگر سامان حرب بھی کافی تھا اور روسی رعایا کی طرف سے انقلاب کا خیال بھی اس کا معاون تھا۔ لیکن اب دس ماہ کے بعد جرمنی کی پوزیشن کچھ اور ہے۔ ۲۰ لاکھ سے زیادہ اس کی فوج ختم ہو چکی ہے اور پٹرول کی کمی رومانیا اور پولینڈ کے چشموں سے پوری نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف روسی فوج بھی نازی طریقِ جنگ سے واقف ہو چکی ہے اور اس کی ہمت بہ نسبت پہلے کے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ پہلے ممکن ہے تذبذب کی حالت پائی جاتی ہو لیکن اب روس کو اپنی کامیابی کا یقین ہے اور اس نے نازی جماعت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر ملک کی توقعات کو بہت بلند کر دیا ہے اس لئے ہٹلر کا دوسرا حملہ اگر ہوا بھی تو اس کا زور زیادہ تر عراق اور باکو کی طرف ہوگا تاکہ وہ یہاں کا پٹرول حاصل کر کے جنگ کو کسی طرح جاری رکھ سکے۔

ابھی تک یہ حملہ شروع نہیں ہوا اور اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ وہ فرانس کے مفتوحہ علاقہ کی طرف سے مطمئن نہیں تھا، یعنی اسے انگلستان کی طرف سے بھی حملہ کا اندیشہ تھا اور خود وشی حکومت پر بھی زیادہ اعتماد نہ کر سکتا تھا، لیکن اب کہ وشی حکومت لاوال کے ہاتھوں ہے، اسے اس سرحد کی طرف سے اطمینان ہو گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ روس اور لیبیا دونوں طرف حملہ شروع کرے، لیکن اگر یہ خبر صحیح ہے کہ وشی حکومت نے جرمنی کے استمزاج سے جاپان کے فوجی مشن کو ڈکاسکر آنے کی اجازت نہیں دی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ مڈل ایسٹ اور افریقہ کی طرف جرمنی اور جاپان دونوں کا مل کر گھیرا ڈالنے کی اسکیم پوری ہوتی نظر نہیں آتی اور ہو سکتا ہے کہ اس کا اثر لیبیا کی جنگ پر بھی پڑے

جرمنی اور ترکی

ترکی کے خطرات البتہ زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی غیر جانب داری کو کیونکر قایم رکھ سکتا ہے۔ اگر بلغاریا کی طرف سے جرمن فوجیں عراق کی طرف بڑھیں تو ترکی سے ہو کر گزرنا ناگزیر ہے اور چاہے وہ اجازت دے، یا نہ دے ترکی کی سرزمین ایک سخت خونریز جنگ کا اکھاڑا بن جائے گی

ترکی کی آیندہ پالیسی کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں کہی جا سکتی۔ میلان تو اس کا بڑی حد تک، روس اور برطانیہ ہی کی طرف ہے، لیکن عین وقت پر اسکے مصالح کیا ہوں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے جس طرح جرمنی کی دشمنی مول لینا دشوار ہے، بالکل اسی طرح برطانیہ کی مخالفت پر راضی ہونا مشکل ہے تاہم اسے کسی نہ کسی طرف ہونا پڑے گا اور اس میں شک نہیں کہ یہ وقت ترکی کے لئے بہت سخت ہوگا

خود ترکی میں تو اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ جرمنی کا مقابلہ کر سکے، لیکن برطانوی، امریکی اور روسی امداد سے وہ جرمنی کی راہ میں کافی مشکلات پیدا کر سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ مڈل ایسٹ میں بھی ہٹلر کو ویسے ہی ناخوشگوار تجربات کا مقابلہ کرنا پڑے جو روس کے محاذ پر اُسے حاصل ہوئے ہیں

امریکہ و برطانیہ

الغرض خطرات جتنے زیادہ ہیں، اتنا ہی اطمینان بھی بڑھتا جاتا ہے۔ کیونکہ امریکہ کی ساری دولت، ساری قوت اور تمام ذرائع روس و برطانیہ کے ساتھ ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اتحادی طیاریاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ جب لڑائی شروع ہوئی ہے تو جرمنی کے مقابلہ میں برطانوی قوت نصف سے بھی کم تھی، لیکن آج وہ برابر ہے اور ہر طلوع ہونے والے نئے دن کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس لئے لڑائی جتنی بڑھتی جا رہی ہے، اتحادی کامیابی کے امکانات بھی قوی ہوتے جا رہے ہیں اور اگر سنہ ۴۲ء خیریت سے گزر گیا تو سنہ ۴۳ء کا مطلع غالباً گرد آلود نظر نہ آسکے گا۔

قتیل کا وطن

مرزا محمد حسن قتیل کہاں کے رہنے والے تھے؟ یہ سوال اکثر اصحاب نے مجھ سے کیا ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ وہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ایک اور صاحب کے نزدیک وہ لکھنوی ہیں۔ اصل میں یہ غلط فہمیاں اس لئے ہوئی ہیں کہ بعض تذکروں میں بلا تحقیق بعض باتیں لکھدی گئی ہیں۔ جن حضرات نے مختلف تذکروں کے بیانات کو جانچا تولا نہیں ہے بلکہ محض کسی ایک تذکرے کے دعوئے بے دلیل پر بھروسہ کرلیا ہے وہ اکثر اس مسئلہ میں بہک گئے ہیں۔

سب سے پہلے یہی دیکھنا چاہئے کہ مختلف تذکرے قتیل کے متعلق کیا لکھتے ہیں:۔

۱۔ "عقد ثریا" از مصحفی

"مرزا محمد حسن قتیل۔ در اصل بزرگانش قوم کھتری بھنڈاری پٹالی بودہ اند۔ پدرش درگاہی مل نام داشت و خودش در آں زماں بہ دیوالی سنگھ موسوم بود۔ در ایامے کہ متعلقانش بحسب آبخور بفیض آباد رفتہ استقامت گرفتند بر دست مرزا باقر شہید اصفہانی ہیژدہ سالہ بود کہ بشرف اسلام پیوستہ"۔

۲۔ "مخزن الغرائب" از احمد علی ہاشمی جلد دوئم و سوئم۔ قلمی۔ کتب خانہ ریاست بھیکم پور۔ حبیب گنج

"مرزا محمد حسن المتخلص بقتیل سلمہ اللہ تعالیٰ از قوم کھتری است۔۔۔۔۔ و دریں زماں عدیل و نظیر خود ندارد۔۔۔۔۔ سی سال است کہ فقیر با ایشان فرط محبت و اخلاص دارد و بسا اتفاق افتادہ کہ در یکجا بودہ ایم"

۳۔ "خلاصۃ الافکار" از ابو طالب اصفہانی۔ قلمی۔ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ

"دیگر محمد قتیل داو مردے وارستہ نیک نہاد۔ اصلش از کھتریان ساکن شاہجہان آباد۔۔۔۔۔ نغایت تحریر۔۔۔۔۔ بہ عافیت و سعت بمعاشرت شاگرداں و دوستاں در بلدۂ لکھنؤ بسر می برد"

۴۔ "نتائج الافکار" از محمد قدرت اللہ گوپاموی۔ قلمی کتب خانہ حبیب گنج۔ ریاست بھیکم پور۔

"نکتہ سنج بے عدیل مرزا محمد حسن قتیل کہ اصلش از لاہور است۔ در بدایت حال پدرش درگاہی مل از قوم کھتری معہ متعلقان بہ فیض آباد رفتہ استقامت گرفت۔ وے در عمر ہیژدہ سالگی بر دست مرزا محمد باقر شہید بشرف اسلام مشرف شدہ۔۔۔۔ نظم شستہ و آبدارش مطبوع فصحائے بلاغت شعار و نیز نکتہ و پرکارش مرغوب نکتہ شناسان روزگار بالجملہ از شاہجہان آباد رخت بکالپی کشید و چندے در آں جا بمصاحبت عماد الملک پسر امیر الامرا غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ بن نواب آصف جاہ بکمال خوبی و خرمی گزرانید و پس از آں دل بسیاحت دار الحکومت لکھنؤ نہاد و تا آخر حیات ہماں جا بنہایت جمعیت خاطر بسر برد۔۔۔۔۔ آخر الامر اوائل عشرہ رابعہ ماۃ ثالث عشر رخت بدار آخرت کشید"

۵۔ "شمع انجمن" از نواب صدیق حسن خاں صاحب

"مرزا محمد حسین قتیل پسر درگاہی مل، قوم کھتری بود اصلش از لاہور است۔۔۔۔۔ سیر دہلی نمودہ بکالپی آمد و مصاحب عماد الملک گشت۔ بعدہٗ در لکھنؤ رسید و تا آخر حیات ہماں جا بنہایت جمعیت خاطر بسر برد۔۔۔۔۔ وفاتش در سنہ ۱۲۳۳ھ اتفاق افتاد"

۶۔ "گلشن مشتاق" از محمد حافظ علی مشتاق ملیح آبادی لکھنوی۔ قلمی۔

"قتیل۔ مرزا محمد حسن نام۔ از قوم کھتری است در عنفوان شباب مسلمان گشت۔ در انشا و نثر بے نظیر عصر خویش بود و فکر نظم ہم خوب نمود۔ از شاگردان مرزا محمد باقر کرمانی شاہی شہید تخلص است۔ بتاریخ ۲۲ ربیع الاول روز شنبہ وقت سحر سن یک ہزار و دو صد و سی و سہ ہجری در دار السلطنت لکھنؤ قتیل خنجر اجل و کشتۂ شمشیر فنا گردید"

۷ - "ریاض الفردوس" از مولوی محمد حسین شاہجہانپوری

"مرزا محمد حسین قتیل لکھنوی ہندو پسرے بود۔ بصحبت کسے از شیعان لکھنو مذہب تشیع اختیار کرد۔۔۔۔۔ ایں بیت از دست ؎

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب — کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

۸ - "خوش معرکۂ زیبا" از سعادت خاں ناصر۔ قلمی۔ کتب خانہ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیب

"قتیل فخرِ فاخر مکیں یادگار علی حزیں۔ تصنیفات سے اس کی خاص و عام بہرہ ور نو مسلم اور مسلم الثبوت مثل اس کے کمتر واسطے دریافت کرنے محاورات اہلِ زبان برسوں اصفہان میں رہا اور خوب دریافت کیا۔۔۔۔۔"

۹ - غالب در کلکتہ سنہ ۱۲۴۳ھ

"میں دیوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا"

۱۰ - "یادگارِ غالب" از خواجہ الطاف حسین صاحب حالی -

"(فٹ نوٹ) مرزا قتیل نو مسلم تھے۔ اسلام لانے سے پہلے ان کا نام دیوالی سنگھ تھا۔ اور فرید آباد ضلع دہلی کے کھتری تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے تھے۔ یہاں ان کی بہت قدر ہوئی۔

۱۱ - "قاموس المشاہیر"

"تخلص قتیل، مرزا محمد حسن نام۔۔۔۔ وطن دہلی۔ اصلاً کھتری تھے اور بعد کو مذہب اسلام قبول کیا۔ فارسی اور اُردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔۔۔۔ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ لکھنؤ میں بعہد نواب غازی الدین حیدر سنہ ۱۸۱۷ء مطابق سنہ ۱۲۳۳ھ انتقال کیا"

۱۲ - تاریخ اودھ از حکیم محمد نجم الغنی خاں صاحب۔ جلد چہارم صفحہ ۹۹

"مرزا محمد حسین قتیل جو پہلے ہندو مذہب فرید آباد کے کھتری تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے نظم و نثر میں اُستادی کے رتبہ کو پہونچ گئے تھے۔ قواعد فارسی وغیرہ کے بیان میں ان کے کئی چھوٹے چھوٹے رسالے اور ایک دیوان فارسی مشہور و معروف ہے۔ سنہ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی"

۱۳ - "لکھنؤ کی زبان" از سید محمد باقر شمس لکھنوی۔ مطبوعہ نگار مئی سنہ ۱۹۴۱ء

"یہاں صرف ان شعراء کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔۔۔۔۔۔ (۱۹) مرزا محمد حسن قتیل"

ان کے علاوہ دو اور قلمی تذکروں کا حال مجھ تک پہونچا ہے لیکن میں نے وہ خود اپنی آنکھ سے نہیں دیکھے ہیں۔ گویا اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتی کہ جو حال ان میں بتایا جاتا ہے وہ سب ویسا ہی ہو۔ یہ حسب ذیل ہیں:-

۱۴ - "شمع انجمن" از سید میر جان فرقتی دہلوی عظیم آبادی۔ قلمی۔ (یہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی "شمع انجمن" مطبوعہ سے بالکل الگ چیز ہے)

اس تذکرہ کا وجود ضرور ہے۔ جنوری سنہ ۱۹۰۵ء کے اُردوئے معلےٰ میں ایک مضمون مرزا احمد منشا پر جناب سید علی سجاد دہلوی عظیم آبادی نے حوالۂ قلم فرمایا تھا۔ مرزا منشا کے متعلق لکھا ہے کہ "تلامذۂ مرزا محمد حسن قتیل میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا"۔ مرزا منشا کی ایک غزل اور غالباً دیگر حالات بھی سجاد صاحب نے اسی تذکرہ شمع انجمن سے نقل کر کے لکھے ہیں۔ اس تذکرہ کے متعلق سجاد صاحب کہتے ہیں "یہ تذکرہ زبان فارسی میں ہے اور مولوی سید امیر جان صاحب فرقتی دہلوی ساکن عظیم آباد کی تصنیف سے ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ تذکرہ نگار راقم الحروف کے حقیقی چچا تھے جنھوں نے سال پیوستہ یہیں انتقال فرمایا"

لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں یہ تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن اس کو بھی میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میرے کرمفرما جناب مولوی ابو الکمال صاحب امید نے اسکو سنہ ۱۹۰۱ء میں بالاستیعاب دیکھا تھا۔ اور اپنی عادت کے مطابق اس کا اکثر حصہ قریب قریب حفظ کر لیا۔ امید صاحب فرماتے ہیں کہ اس تذکرہ میں قتیل کا ذکر بہت تفصیل سے تھا۔ وطن وغیرہ کے متعلق مولوی امید صاحب فرماتے ہیں کہ اس تذکرہ میں لکھا تھا کہ قتیل سنہ ۱۱۶۱ھ میں بمقام فرید آباد پیدا ہوئے اور ۶۷ سال کی عمر پا کر سنہ ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا۔

۱۵ - دوسری کتاب جو میں نے نہیں دیکھی وہ ہے "بیاضِ بیرہیا" از مصحفی۔ قلمی۔ مشیر احمد صاحب علوی نے اس کا ذکر نگار کے مصحفی نمبر (جنوری سنہ ۱۹۳۹ء) میں کیا ہے اور اس کو مصحفی کی غیر مطبوعہ بیاض فرمایا ہے۔ مشیر صاحب فرماتے ہیں کہ اس بیاض میں قتیل کا بھی ذکر اس طرح ہے کہ "ان کے بزرگ بٹالہ کے تھے۔ جب قتیل فیض آباد گئے تو مرزا باقر

اصفہانی کے ہاتھ پر ۱۸ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور مرزا محمد حسن کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد کو امامیہ مذہب اختیار کیا۔ اور نواب سعادت علی خاں کے دربار میں باریابی ہوئی۔ ان کی فارسی دانی کی مصحفی نے بہت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ دریائے لطافت کی ترتیب میں یہ انشاء اللہ کے شریک تھے۔ کلام کا نمونہ نہیں دیا"

یہ ہے مرزا قتیل کے وطن کے متعلق دوسروں کی رائے جس تک میری پہونچ ہو سکی ہے۔

گویا ایک صاحب (صاحب تذکرہ ریاض الفردوس (۵)) قتیل کو لکھنوی بتاتے ہیں۔ یہ اگر اس نسبت سے نہیں لکھا گیا ہے کہ مرزا قتیل کی آخر عمر لکھنؤ میں گزری تو پھر یقیناً غلط ہے۔ صاحب تذکرہ یوں بھی کچھ زیادہ تحقیق کے طرفدار نہیں معلوم ہوتے۔ یہاں تک کہ جو شعر مرزا قتیل کا نمونہ میں دیا ہے۔ وہ بھی مرزا مرحوم کا نہیں ہے بلکہ حافظ کی مشہور غزل کا شعر ہے۔ بہرحال ریاض الفردوس کا بیان بے دلیل ہے۔ اور کسی جگہ سے مطلق یہ بات نہیں پائی جاتی کہ قتیل لکھنوی تھے۔

"اصلش از لاہور است" دو تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے۔ یعنی محمد قدرت اللہ صاحب گوپاموی اور نواب صدیق حسن خاں صاحب۔ محمد قدرت اللہ صاحب کی "نتائج الافکار" (۴) کی تاریخ تالیف سنہ ۱۲۲۵ھ ہے۔ گویا یہ کتاب قتیل کے زمانہ حیات ہی میں لکھی گئی تھی لیکن خود قتیل ہی کے حالات میں ان کی وفات تک کا ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کا کام غالباً سنہ ۱۲۳۳ھ تک ہوتا رہا۔ یا بلکہ اس کے بھی بہت بعد تک۔ انتقال سے کچھ پہلے قتیل نے اپنی کتاب "ہفت تماشہ" تصنیف کی تھی جو منظر عام پر آ چکی تھی۔ اس میں مرزا قتیل نے ہندوستان کی ذاتوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے اور کھتریوں کے متعلق لکھا ہے کہ کھتریوں کی اصل پنجاب ہے اور وہیں سے نکل نکل کر مختلف جگہ آباد ہوئے ہیں۔ ممکن ہے قدرت اللہ صاحب کی نظر سے یہ کتاب گزری ہو اور انھوں نے اس بیان کو خود قتیل ہی پر چپکا دیا ہو۔ "اصلش از لاہور است" کے یہ معنی مشکل ہی ہیں کہ خود قتیل یا ان کے باپ لاہور کے تھے۔ بلکہ اس فقرے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم یا قبیلہ کی اصل کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح کا بیان اکثروں کے متعلق ملے گا۔ بہت ایرانی الاصل تھے جن کی تین تین چار چار پشتیں ہندوستان میں گزر چکی تھیں آج بھی دلی میں محلے کے محلے ہزارہا اصحاب سے آباد ہیں جو "پنجابی" کہلاتے ہیں لیکن جن کی پشتیں صدیوں سے دلی میں رہ رہی ہیں۔ اور جن کو نہ ایک لفظ پنجابی کا آتا ہے نہ ان میں سے اکثریت کو یہ معلوم کہ وہ پنجاب کے کس حصہ سے کس زمانے میں آئے تھے۔ کشمیریوں کا حال تو اس معاملہ میں اور بھی اظہر من الشمس ہے۔ یہ اصحاب ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں صدیوں سے نہایت عزت کے ساتھ وہیں کے باشندے ہو کر رہ رہے ہیں لیکن سرشار اور چکبست کی لکھنویت اور کیفی کی دہلویت کے باوجود ان کو "کشمیری الاصل" لکھا جاتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ قدرت اللہ صاحب نے اسی معنی میں "اصلش از لاہور است" لکھا ہے۔ اسی لئے آگے چلکر جب تفصیل فرماتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "بالجملہ از شاہجہاں آباد رخت بکالپی کشید۔۔۔۔۔ پس ازاں دل بساحت دار السلطنت لکھنؤ نہاد"

شمع انجمن (۵) میں نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی "اصلش از لاہور است" تحریر فرمایا ہے لیکن یہ فقرہ ہی نہیں بلکہ اور سارا بیان یہاں تک کہ غلط تاریخ وفات کا اعادہ بھی اس بات کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ کم از کم جہاں تک قتیل کا تعلق ہے شمع انجمن، نتائج الافکار کی ہی مرہون منت ہے۔ نواب صاحب نے اختصار فرمایا ہے لیکن وہ مولوی قدرت اللہ کی تقلید میں کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اس لئے شمع انجمن کا یہ بیان علیحدہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور اس پر وہی تنقید صادق آتی ہے جو نتائج الافکار پر اوپر ہو چکی ہے۔

ایک اور نام نہاد تذکرہ 'ید بیضا' (۵) نے مرزا قتیل کو بٹالہ کا متوطن بتایا ہے۔ اس تذکرہ کو مصحفی کی تصنیف کہا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو اس کی قیمت کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جاتی۔ لیکن شکر ہے اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ مصحفی کا کوئی تذکرہ اس نام (ید بیضا) سے نہیں لکھا گیا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس تذکرہ کا ذکر جناب مشیر احمد صاحب علوی کاکوروی نے نگار کے مصحفی نمبر میں "مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں" کے تحت میں بالتفصیل فرمایا ہے۔ لیکن ابھی بقول شخصے کاغذ کی سیاہی بھی سوکھنے نہ پائی تھی کہ جناب مختار الدین احمد صاحب آرزو نے اپنے مضمون "مصحفی نمبر کی بعض لغزشیں" مطبوعہ نگار ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء میں اس بوستان خیال کا بھرم کھول دیا۔ یہ سارا مضمون پڑھنے کے قابل ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم طویل اقتباسات نذر ناظرین نہیں کریں گے بلکہ صرف نتائج کو جناب آرزو ہی کی زبان میں پیش کئے دیتے ہیں۔ آرزو صاحب فرماتے ہیں "میں یہ کہدینے کے لئے تیار ہوں کہ "مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں" جعل کا بہترین نمونہ ہے اور "ید بیضا" اور "نور ازلی" جناب مشیر کے تخیل کی صرف موجیں ہیں اور بس" آرزو صاحب نے ثابت کیا ہے کہ یہ نئی بیاضیں مصحفی کے تینوں معروف تذکروں کے بیانات کو الٹ پھیر کر گھڑ لی گئی ہیں "واقعات کی بے ربطی سنین کی غلطی اور بیانات کا الجھاؤ" مستزاد ہے۔ میں جناب آرزو کے اس محاکمے پر پوری طرح مطمئن نہ تھا اس لئے آخر فروری سنہ ۴۲ء میں ایک موقعہ نکال کر خود کاکوری گیا۔ وہاں مشیر احمد صاحب سے تو ملاقات نہ ہو سکی لیکن ان کے والد محترم جناب امیر احمد صاحب علوی سے نیاز حاصل ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ "بیاض ید بیضا از مصحفی" کوئی کتاب نہ اسوقت ان کے کتب خانے میں ہے نہ کبھی پہلے تھی۔ نہ کبھی اُن کی نظر سے ایسی کتاب گزری۔ فرماتے تھے کہ "میں نہیں بتا سکتا کہ مشیر صاحب کو ایسا مغالطہ کیونکر ہوا یا کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔ تکیے شریف میں ایک صاحب کے تین قلمی تذکرے ہیں ایک فارسی شاعروں کا ایک اُردو شاعروں کا اور ایک شاعر عورتوں کا۔ لیکن یہ تذکرے مصحفی کے لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ مسرور کاکوروی کے شاگرد کے لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے ان کو دیکھ کر مشیر صاحب کو دھوکا ہوا ہو" غرض یہ بات اب بالکل ثابت ہے کہ "ید بیضا از مصحفی" تخیل کی بلند پردازی کے سوا کچھ نہیں۔ بے وجود چیز پر مزید تنقید و تبصرہ بے کار ہے۔

حسب بالا چار تذکروں کے علاوہ چار اور تذکرے یعنی عقد ثریا - مخزن الغرائب - گلشن مشتاق اور خوش معرکۂ زیبا اس معاملہ میں خاموش ہیں - گلشن مشتاق اور خوش معرکۂ زیبا کی خاموشی پر تو کوئی تعجب نہیں کہ ممکن ہے ان اصحاب کو قتیل کے وطن کے متعلق علم نہ ہوا ہو لیکن مخزن الغرائب اور عقد ثریا کے مولف (احمد علی ہاشمی اور مصحفی) کی یہ فروگذاشت واقعی بے حد حیرت انگیز ہے مصحفی کے تعلقات مرزا قتیل سے بہت گہرے تھے اور عقد ثریا اصل میں مرزا قتیل ہی کی تحریک پر لکھی گئی تھی - اس طرح احمد علی ہاشمی کے وہ اُستاد محسن اور رہنما تھے اور مخزن الغرائب مرزا قتیل ہی کے اشارے پر اور ان کی مدد سے لکھی گئی تھی - اس کے باوجود یہ دونوں اصحاب اپنی انہی کتابوں میں جو محض مرزا قتیل ہی کی تحریک اور امداد سے لکھی گئی تھیں مرزا قتیل کے وطن کے متعلق بالکل خاموش ہیں - یہ بے شک بے حد تعجب انگیز ہے - لیکن گمراہ کن نہیں - اگر اصل وطن نہیں بتایا گیا ہے تو کم از کم لکھنؤ، لاہور یا دہ کوئی ایسی ہی جگہ لکھ کر غلط بیانی بھی نہیں کی ہے اس موقع پر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ یہ پرانے تذکرے اکثر جزئیات اور تفصیلات میں حیرت انگیز تغلیط اور تقصیر کے حامل ہوتے ہیں - ابھی جوشش کا دیوان چھپا ہے - اس کے مرتب جناب قاضی عبدالودود صاحب نے ۱۸ تذکروں سے جوشش کا حال نقل کیا ہے - اور گو اس بیان میں اختصار کا یہ عالم ہے کہ کسی تذکرہ نویس نے بھی دو چار سطروں سے زیادہ چار سطروں سے زیادہ حال نہیں لکھا لیکن وہ بھی مختلف اور اکثر متضاد ہے - جوشش کے ہمعصر اور ہم وطن تذکرہ نویس جو خود جوشش سے گہرے تعلقات کے بھی دعویدار ہیں اکثر ان کے بیان میں بہک گئے ہیں مثلاً تذکرہ شورش - گلزار ابراہیم - تذکرۂ عشقی میں سے ایک نے بھی جوشش کے تبدیلِ مذہب یا ولدیت کے متعلق کچھ نہیں لکھا گو یہ نہایت اہم بات تھی مصحفی نے اپنے تذکرہ میں جوشش کا نام ہی سرے سے بدل دیا ہے - اور گو جوشش مصحفی سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے لیکن مصحفی نے ان کو قدما میں گنوایا ہے - بعد کے تذکروں میں یہ غلط فہمیاں قائم ہیں، مصحفی کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب فرماتے ہیں :- "کوئی اہمیت نہیں رکھتا - ایسی غلطیاں اُن سے بہت ہوئی ہیں" اصل یہ ہے کہ ان پرانے تذکروں کا مقصد ہی ذاتی حالات کے بیان کا نہ ہوتا تھا اور نہ اس کی کوئی اہمیت تھی - چنانچہ صاحب سخن شعرا دیباچہ میں فرماتے ہیں "میں نے بھی چاہا کہ شرح تالیف سے کوزے بھروں اور اس قند کو مکرر کروں یعنی اس طرح کا تذکرہ لکھوں جس میں اشعار آبدار میں اطناب و اعجاز ہو اور احوال شعرا میں اختصار و ایجاز اور حالات ابنائے زماں کو بقدر طاقت بشری جامع اور حشو و زوائد کو مانع ہو"

تینوں تذکرے (خلاصۃ الافکار - قاموس المشاہیر - لکھنؤ کی زبان) مرزا قتیل کو دہلوی بتاتے ہیں - اور یہی قرین صحت ہے (اگرچہ اصل میں وہ فرید آبادی تھے جیسا کہ آئندہ عرض کیا جائے گا) ان تذکروں کے علاوہ اور بھی ثبوت ہیں جن سے مرزا قتیل کا دہلیٔ اعظم[۱] کا ہونا ثابت ہے - سید انشاء اللہ نے دریائے لطافت میں شرائط زباندانی کو متعدد بار گنوایا ہے اور طرح طرح سے یہ کہا ہے کہ اُردو زبان کے متعلق مستند وہی ہے جو دلی کا باشندہ ہو - ایک جگہ فرماتے ہیں :- "اس شان کے حاصل کرنے کے لئے متکلم کے شاہجہاں آباد میں پیدا ہونے اور وہاں کے فصیحوں میں اعتبار حاصل کرنے کی شرط لازم ہے" ایک اور جگہ زباندانی کی چار شرطیں جو گنوائی ہیں ان میں پہلی یہ ہے کہ "اس کا ثبوت کہ اس شخص کے والدین دارالخلافہ کی خاک پاک سے ہیں" - یہی نہیں کہ دلی کی چند روزہ بود و باش پر قناعت ہے - بلکہ اسی لئے ان لوگوں کو ممیز کردیا ہے جو باہر سے آکر دلی میں بس بیٹھے ہوں - اس ضمن میں پنجابیوں کی خصوصیت سے تصریح کردی ہے - اسی لئے کئی عنوان ایسے ثم الدہلوی پنجابیوں کے متعلق قائم کئے ہیں مثلاً "پنجابی لہجہ" "پنجابی اُردو داں کے کلام کی مثال" "پنجابی لہجے اور خصوصیات" - "پنجابی آیندہ روندہ" وغیرہ اور ان سب کو پایۂ فصاحت سے گرا ہوا بتایا ہے - ایسے ہی لوگوں کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں :- "- - - - - - - یہ الفاظ ان لوگوں کی زبان کے ہیں جن کی اصل پنجاب سے ہے - یعنی لاہور - کلانور - بیٹیالہ - - - - - - - سے آئے ہیں" ایک اور جگہ لکھتے ہیں "یہ امر بھی احباب کے ذہن نشین رہے کہ دہلوی ہونا ایک شخص کے دہلی میں پیدا ہونے پر منحصر نہیں ہے - ورنہ مغلپورہ[۲] محلہ کے رہنے والے جو شاہجہاں آباد میں پیدا ہوتے ہیں دہلوی ہونے چاہئیں - لیکن ایسا نہیں ہے - کیونکہ دہلوی وہ ہے جس کا روزمرہ وہ ہو جو دہلی والوں کا ہے - - - - بخلاف اس کے مغلپورہ والوں کو دیکھو کہ ان کی گفتگو لاہور والوں سے ملتی ہے" پھر بھلا اگر قتیل پنجابی ہوتے اور لاہور یا کسی اور مقام سے آئے ہوئے ہوتے تو انشاء اللہ خاں ان کے ساتھ اُردوئے معلّٰی کی سب سے پہلی قواعد و معانی کی کتاب کیسے تصنیف کرتے یہی نہیں بلکہ انشاء اللہ نے دیباچہ میں قتیل کے متعلق صریحاً لکھ دیا ہے کہ " روکردہ او بے تامل بدکردۂ من و پسندیدۂ او پسندیدۂ این کثرہ شیاں بودہ است - و از صغر سن میان من و او ہر چیز حقہ بہ دادمانہ قرار نہ پذیرفتہ" یہ محض آمد سخن نہیں ہے بلکہ اس پر عمل ہے مثلاً ہفت تماشہ میں قتیل نے ایک جگہ لکھا ہے "حلال خور - ہر چند ایں لفظ در اصل غلط است لیکن انچہ مشہور است ہمیں است" دریائے لطافت میں بعد میں انشاء اللہ لکھتے ہیں "لفظ حلال خور اگرچہ اصل میں غلط ہے لیکن چونکہ ہندوستان میں کثیر الاستعمال ہے اس لئے اُردو میں فصیح ہے" یا تشریح تنافر غرابت کی بحث

---

[۱] دلیٔ اعظم - یہ اصطلاح میں نے (Greater London) کے نمونے پر وضع کی ہے - یعنی شہر مع توابع

[۲] دہلی کا ایک محلہ -

میں لکھا ہے "خدا بخشے مرزا علی نقی محشر مقتول نے کہا "پانی الینڈلو" اُردو ہے "پانی تائے لو" پورب کی زبان ہے۔ مرزا قتیل نے جواب دیا کہ پانی اُلینڈ لو وہ لفظ ہے کہ شاہجہاں آباد کے شرفا اور عوام کے کان اس سے ناآشنا ہیں۔ اور پانی تائے لو پورب والوں کے سوائے کوئی نہیں سمجھتا یا آپ سمجھتے ہیں۔ پس جو لفظ اہلِ اُردو کے سننے میں نہیں آیا اس کو اُردو کی عبارت میں لانا غرابت کا نقص عاید کرنا ہے اور فصاحت کے راستے سے بھٹک جانا ہے" یہ خیال رہے کہ مرزا علی نقی محشر شاعر تھے۔ لکھنوی تھے اور دلّی میں بھی دو تین سال رہ آئے تھے۔ انکی بات پر یہ مقام کسی ایسے شخص سے ظہور میں نہیں آسکتا جو اصلاً پنجابی ہو اور دلّی میں صرف کچھ دن رہ لیا ہو۔ اگر متشککین اب بھی مطمئن نہ ہوں تو انکے لئے داخلی اور قطعی ثبوت میں خود مرزا قتیل مرحوم کے کلام کی صریح اور بیّن شہادت پیش کی جاتی ہے۔ دیوان قتیل ست کی ردیف میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے:-

تا برقص آں فتنۂ کون و مکاں برخاست است　　صد بلائے ناگہاں از ہر کراں برخاست است

اس کا مقطع ملاحظہ فرمایئے:-

گرچہ باشد مولدِ من خاکِ دہلی اے قتیل　　کم کسے چوں من ز یزد و ایرواں برخاست است

لیکن یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قتیل دلّی کے تھے تو بھی یہ فرید آبادی ہونے کے مرادف کیونکر ہوا کیونکہ ہمارا دعوٰے تو یہ ہے کہ قتیل فرید آبادی تھے اس کے ثبوت میں حسب ذیل شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو امید ہے شافی سمجھی جائیں گی۔

۱- اول تو یہ بات ملاحظہ طلب ہے کہ اکثر جب وطن کوئی نسبتاً غیر مشہور جگہ ہو تو قریب کے شہر سے نسبت وطن ظاہر کی جاتی ہے۔ آج کل کے زمانہ میں بھی جبکہ رسل و رسائل اور تعلیم و خواندگی بہت عروج پر ہے یہی طریقہ ہے کہ مضافات کے رہنے والے تقریباً بلا استثنا ضلع یا قریب کے شہر سے نسبت وطن ظاہر کرتے ہیں۔ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے تو یہ زیادہ تر ہوتا تھا۔ فرید آباد نہ صرف دلّی کے ضلع میں تھا بلکہ دلّی سے بہت ہی قریب بھی تھا۔ انگریزوں نے شروع میں دلّی کے جنوبی رخ (جدھر فرید آباد ہے) سے بے رُخی برتی اور توسیع شہر شمال میں کی گو اب شہر دلّی جنوب ہی کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن اب بھی وہ صورت نہیں ہے جو اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے تھی۔ اُس زمانے میں نظام الدین۔ عرب سرائے۔ شیخ سرائے۔ تغلق آباد۔ خواجہ کی سرائے اور فرید آباد گویا مسلسل دلّی ہی کے محلے تھے۔ ان مقامات کے لوگ اکثر اپنے آپ کو دہلوی ہی کہتے تھے۔ میر مہدی مجروح عرب سرائے کے رہنے والے تھے اگرچہ سارے تذکرہ نویس اور وہ خود بھی اپنے کو دہلوی کہتے ہیں۔ مختصر اگر قتیل نے خود اپنے کو دہلوی کہا یا دیگر تذکرہ نویسوں نے ان کو دہلوی لکھا تو یہ غلط نہیں بلکہ حسب دستور درست ہے۔ اس قسم کی مثالیں بے شمار دی جاسکتی ہیں اسی مضمون میں محمد حافظ علی مشتاق صاحب گلشن مشتاق کا حوالہ اوپر گذرا ہے۔ وہ اپنے کو ملیح آبادی لکھنوی یا صرف لکھنوی لکھتے تھے۔

۲- چار اصحاب (غالب۔ حالی۔ نجم الغنی اور فرقتی) نے صریحاً قتیل کا فرید آبادی ہونا بیان کیا ہے۔ فرید آباد کچھ بہت مشہور و معروف قصبہ نہیں ہے کہ سہواً یا عادتاً اس کی طرف نسبت سکونت عائد کردی جائے۔ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جب تک علم صحیح نہ ہو کوئی تذکرہ نویس فرید آباد کی سکونت کا اظہار نہیں کرسکتا۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ لاہور یا بعض ملک مثلاً پنجاب۔ پورب۔ دکن۔ بنگال۔ اودھ وغیرہ کی نسبت تو اندازاً بھی بتائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس طرح کسی غیر مشہور قصبہ کا خصوصیت سے نام لیا جانا ممکن نہیں۔ پھر غالب دہلوی۔ حالی پانی پتی فرقتی دہلوی اور نجم الغنی مورخ نے کیونکر قتیل کو فرید آبادی لکھا؟ غور فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح "باہر والے" نہ تھے کہ دلّی اور فرید آباد کے فرق کو نہ جانتے غالب دلّی میں برابر رہے تھے جب قتیل کا طوطی لکھنؤ میں بول رہا تھا۔ خواجہ حالی بھی زیادہ تر دلّی ہی میں رہے بلکہ فرید آباد کو بھی درود مسعود سے عزت بخشی۔ فرقتی بھی دہلوی ہیں اور حالات سے آگاہ۔ حکیم نجم الغنی بے شک رامپور کے تھے لیکن وہ مورخ ہیں محض تذکرہ نویس نہیں۔ انھوں نے غالباً زیادہ تحقیق کے بعد کچھ لکھنا مناسب سمجھا۔

۳- مرزا قتیل کی تحریر میں فرید آباد کے متعلق بھی داخلی شہادت ملتی ہے گو یہ کنایۃً ہے نہ کہ صریحاً۔ شجرۃ الامانی میں ثمرۂ سوئم کے تحت میں لکھتے ہیں " دربیان فارسی اہلِ ہند لیکن کسانے کہ مقلد و ہم نفسِ اہل زبان نہ باشند و آں بر دو گونہ بود یکے فارسی کتابی و آں ہرچند خلاف روزمرہ زبان واقع شود لیکن صحیح باشد۔ مثال آں:- دیروز نیّر جہاں بخاطر من جا نمود کہ پاسے از روز برآمدہ برائے ملاقاتِ گرامی بیایم لیکن یکے از دوستاں ہمیں گفت کہ میرزا صاحب بے کارے بر جناح استعجال بجانب فرید آباد قطرہ زن شدہ اند شمارا از رفتن درچنیں شدت گرما رہم آغوش حرماں باز آمدن چہ حاصل۔ اگر ایں چنیں خیال بخاطر بستہ آید یک ہفتہ مشغول بکار دیگر باید ماند تا مرزائے مذکور را از کار خود دلجمعی حاصل نمودہ بخانہ خود بیایند۔ آں زمان اگر دل دستوری دہد رفتہ از سخنانِ شیریں دل آویز مشار الیہ کام آرزو را رشک تنگ شکر و طبلۂ انگبیں باید نمود۔ بنا براں در آمدنِ مخلص توقف بظہور آمد"

یہ رقعہ غالباً مرزا قتیل کے کسی جاننے والے کا ہے جو ان کے نام لکھا گیا اور جو انھوں نے مثال کے موقع پر نقل کیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب اس میں شک کریں اور فرمائیں کہ یہ تو مثالاً ایک عبارت لکھدی گئی ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ایسے اصحاب یہ غور فرمائیں کہ شجرۃ الامانی سنہ ۱۲۰۳ھ میں لکھی گئی تھی جبکہ مرزا قتیل کو وطن چھوڑے ہوئے اور دلّی سے نکلے ہوئے کم از کم ۲۵ سال (اگر وہ ۱۸ سال کی عمر میں آئے) اور زیادہ سے زیادہ ۴۰ برس (اگر ان کے والد ان کی پیدائش سے پہلے ہی فیض آباد آگئے تھے) ہو چکے تھے۔ لکھنؤ میں اتنے لمبے

عیش و آرام سے قیام کے بعد لکھی جاتی ہے اور مثال میں بے ساختہ دلی سے فرید آباد جانے کا ذکر آجاتا ہے۔ کیا اس شخص سے اس چیز کا امکان ہے جو پنجاب سے آیا ہو اور لکھنؤ چلا ہو۔ کیا کوئی لکھنؤ میں جو کچھ دن کو دلی ہو آیا ہو اپنی کتاب میں ایسی مثال دے سکتا ہے۔ کیا کوئی دلی شہر کا باشندہ جو زیادہ سے زیادہ ۱۸ سال کی عمر میں فیض آباد اور لکھنؤ کو انتقال سکونت کر گیا ہو، برسوں بعد بھی اپنی کتاب میں [illegible] ایسی عبارت [illegible] سکے گا۔ فرید آباد کچھ ایسی جگہ نہیں ہے کہ خواہ مخواہ اس طرف ذہن منتقل ہو یا اس کا نام زبان زد خلائق ہو۔ پھر کیا مرزا قتیل کا فرید آباد کا اس طرح بیان محض اتفاقی ہے ؟

۳۔ ایک آخری لیکن قوی دلیل یہ ہے کہ مرزا قتیل مرحوم کا خاندان ابھی تک فرید آباد میں آباد و خوشحال ہے۔ یہ کھتری صاحبان قصبہ کے معززین میں سے ہیں۔ ان کی وہی گوت ہے جو قتیل کی بتائی گئی ہے۔ فیض آباد کے کھتریوں سے ان کی ابھی تک رسم و راہ اور رشتہ داری ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے پاس قدیم شجرہ موجود ہے جس میں آج تک کے اندراج موجود ہیں لیکن درگاہی مل والد مرزا قتیل کے آگے کوئی نام نہیں دیا گیا ہے غالباً اس لئے کہ درگاہی مل کے صاحبزادے مرزا قتیل مسلمان ہو گئے تھے۔

یہ جو بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ قتیل کے باپ فیض آباد آگئے تھے جہاں مرزا قتیل تولد ہوئے یہ بھی محض غلط معلوم ہوتا ہے۔ مرزا قتیل غالباً ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت فیض آباد کچھ مشہور جگہ نہ تھی۔ کچھ [illegible] کے مکانات اور کچھ فوجی خیمے تھے اور یہ جگہ "بنگلہ" کہلاتی تھی۔ اس وقت بلکہ اس سے بھی پہلے بھلا کوئی کیوں ترک وطن کر کے یہاں آتا۔ اس زمانہ میں تو اودھ کے نواب وزیر بھی یہاں نہ رہتے تھے بلکہ ان کے عامل رہتے تھے۔ ۱۱۷۸ھ میں شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دار الریاست بنایا لیکن ابھی پورے طور پر شہر بننے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۱۸۹ھ میں آصف الدولہ نے پھر لکھنؤ کو مستقر بنا لیا۔ گویا اگر کسی نے فیض آباد آنا چاہا ہوگا تو اسی دس سال کے عرصہ میں آیا ہوگا۔ لیکن قرائن ایسے ہیں کہ غالباً اس زمانہ میں بھی بہت کم لوگ اپنے بال بچوں سمیت فیض آباد گئے ہوں گے۔ شجاع الدولہ نے پابندی لگا رکھی تھی کہ کوئی عورت، بوڑھا، جوان یا بچہ بغیر خاص اجازت نامہ کے فیض آباد کی حدود سے باہر نہ جانے پائے۔ اس کی سختی سے پابندی ہوتی تھی اور اس کے انتظام کے لئے چوبیس گھنٹے [illegible] پہرے ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں سوائے سرکاری ملازمین کے بھلا کوئی کیوں اپنی عورتوں سمیت اس شہر میں آتا ہوگا۔ بہرحال یہ مسئلہ مزید تحقیق چاہتا ہے۔ میں تو نواب [illegible] مرحوم کی رائے سے متفق ہوں کہ مرزا قتیل دلی ہی میں اکتساب علم اور تبدیلی مذہب کر چکے تھے اور اس کے بعد لکھنؤ گئے۔

سید اسد علی انوری۔ فرید آبادی

جاپان کے خوفناک ارادے
اور
اُنکی کامیابیوں کے راز

ہٹلر کی کتاب "میری جد وجہد" بہت مشہور چیز ہے، جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ساری دنیا کو فتح کرنے اور جرمن قوم کو دنیا کی تمام دوسری قوموں پر حکمراں بنانے کی کیا کیا تدابیر پہلے سے سوچ رکھی تھیں، لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جرمنی کی طرح جاپان بھی یہ سودا عرصہ سے اپنے دماغ میں لئے ہوئے تھا۔

اس سلسلہ میں تناکا کی وہ یادداشت جو اس نے جولائی سنہ ۲۷ء میں مکاڈو شاہ جاپان کے سامنے پیش کی تھی بہت مشہور چیز ہے۔ تناکا جاپان کا وزیر اعظم تھا اور اس نے جاپان کے تمام فوجی و غیر فوجی افسروں کی کانفرنس طلب کرکے، ایک یادداشت مرتب کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ تمام مشرقِ بعید کو کس طرح جاپانی مستعمرہ بنایا جا سکتا ہے۔

اس یادداشت میں عام تدابیر کے سلسلہ میں ایک جگہ یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ دُنیا پر اپنا تسلط قایم کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو چین پر اقتدار حاصل کرنا چاہئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے امریکہ کو شکست دیجائے، ویسی ہی شکست جیسی ہم روس کو دے چکے ہیں۔ اور اس کے بعد یا پہلے منچوریا اور منگولیا پر قبضہ کیا جائے۔

اگر ہم چین کو فتح کرلیں گے تو ایشیا کے دوسرے ملک اور جنوبی سمندر کے جزیرے ہمارے سامنے اپنا سر جھکا دیں گے اور پھر ہم ہندوستان، ایشیا کوچک، وسط ایشیا اور یورپ کو زیر کرنے کے لئے آگے بڑھیں گے۔"

اس یادداشت کے ایک اور حصہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ:۔ "ہمیں اپنے ملک کی توسیع کے سلسلہ میں شمالی منچوریا میں روس سے دوسری جنگ کرنا ازبس ضروری ہے کیونکہ جب تک راستے سے یہ پتھر ہٹ نہ جائے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم نے اپنا سب سے پہلا فاتحانہ قدم فارموسا میں اُٹھایا (سنہ ۱۸۹۵ء) دوسرا قدم وہ جب کوریا پر قبضہ کیا (سنہ ۱۹۱۰ء) تیسرا قدم منچوریا اور منگولیا کو فتح کرنا تھا (سنہ ۳۱-۳۲ء) اور اب اگلا قدم چین کی طرف ہوگا۔ افسوس ہے کہ یہ آخری قدم ہم نے ابھی نہیں اُٹھایا۔ کیونکہ اس کے لئے بڑی طیاریوں کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں ہم کو برطانیہ اور امریکہ کی متحدہ قوت سے جنگ کرنا پڑے گی"

جب فتح چین کے بعد تناکا کی یہ یادداشت شایع کی گئی تو جاپانیوں نے اس کی صحت سے انکار کیا، لیکن چین میں برابر سنہ ۲۹ء سے اس کی اشاعت ہو رہی ہے اور جاپان نے اسکی تردید بھی نہیں کی۔ علاوہ اس کے دوسرا ثبوت اس یادداشت کے وجود کا سرلوآنگ کی کتاب (Le Peril jaune) ہے جو سنہ ۳۳ء کی جنیوا والی بین الاقوامی صلح کانفرنس کی طرف سے شایع کی گئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ سنہ ۲۷ء سے برابر جاپان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ وہ سارے ایشیا پر چھا جائے چنانچہ جولائی سنہ ۳۷ء میں اس نے شمالی چین پر حملہ کرکے سنہ ۴۱ء تک گیارہ صوبوں پر اس نے فوجی قبضہ کرلیا اور اس کے بعد فرانسیسی انڈوچائنا پر تسلط جمالیا۔

اول اول جب جاپان نے چین کے خلاف قدم اُٹھایا تھا، اسی وقت سے جاپان کے ہٹلرانہ ارادے دوسرے ذرایع سے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں جنرل اراکی کی ایک تحریر جو اگست سنہ ۳۲ء کے ایک جاپانی میگزین میں شایع ہوئی تھی بہت اہم ہے۔

جنرل اراکی، جاپان کی عسکری جماعت کا بہت بڑا شخص ہے اور اس کا بیان گویا جاپان کے صحیح صحیح ارادوں کا اظہار ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔ "ہمارا ملک اپنے قومی نصب العین کو ساتوں سمندر پار کرکے پورا کرنا چاہتا ہے، اگر اس کے لئے ہم کو لڑنے کی ضرورت پڑی تو ہم لڑیں گے، کیونکہ ہم خدا کی نسل سے ہیں اور ہمیں ساری دنیا پر حکومت کرنا چاہئے لیکن اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چین کی تمام خام پیداوار پر ہمارا قبضہ ہو جائے۔

جب منچوریا اور منگولیا پر جاپانیوں نے قبضہ کیا تو انھوں نے توجیہ یہ کی کہ ہمیں اپنی بقائے حیات کے لئے زمین کی ضرورت ہے اور چین کے ان علاقوں پر ہمارا قبضہ کرنا بالکل فطری اقتضا ہے۔ بالکل یہی توجیہ ہٹلر بھی کرتا ہے کہ جرمن آبادی کی زندگی اور ضروریات کے لئے آس پاس کے ملکوں کو تسخیر کرنا ضروری ہے۔ جاپان اور جرمنی کی یکساں ذہنیت کا ایک اور ثبوت ملاحظہ ہو:۔

جب جاپان کے وزیر اعظم پرنس کونوے نے سنہ ۳۸ء میں چین کے خلاف موجودہ جنگ چھیڑی تھی تو اس نے اعلان کیا تھا کہ مشرقی ایشیا میں وہ جاپان کی سیادت میں ایک نیا نظام حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جب ہٹلر نے یورپ میں لڑائی چھیڑی تو اس نے بھی یورپ میں ایک نئے نظام حکومت کے قائم کرنے کا اعلان کیا۔

اس میں شک نہیں کہ جاپان کے اس جدید نظام حکومت میں صرف چین اور منچوکو شامل تھے، لیکن جب اس نے دیکھا کہ جرمنی کو یورپ میں غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں، تو اس نظام میں اس نے جزائر فلپائن، سنگاپور، انڈوچائنا، ڈچ انڈیز اور ہندوستان کو بھی شامل کر لیا اور دوسری طرف ہٹلر نے اپنے نئے نظام میں نہ صرف تمام یورپ بلکہ افریقہ اور جنوبی امریکہ کو بھی داخل کرنے کا اعلان کر دیا۔

محوری طاقتوں کے اتحاد ثلثہ میں جو شرائط طے پائے ہیں ان کی رو سے جاپان اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ یورپ میں جرمنی اور اٹلی کی سیادت کو مانے گا اور جرمنی و اٹلی نے اقرار کیا ہے کہ وہ ایشیا میں جاپان کی سیادت کو تسلیم کریں گے۔

جاپان کے موجودہ وزیر اعظم توجو نے بھی پچھلے نومبر میں جاپان کے اس جدید ایشیائی نظام کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے ایشیا کو فتح کرنے پر مجبور ہیں۔

جاپانیوں کے اس خیال کا تاریخی پس منظر یہ اعتقاد ہے کہ وہ سورج دیوتا کی اولاد میں سے ہیں اور ان کو ساری دُنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

سیاسی تنظیم کے لحاظ سے جاپان حد درجہ پست ملک ہے اور وہاں کی حالت وہی ہے جو انقلاب سے پہلے روس میں پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ میکاڈو (شاہ جاپان) انسانی صورت میں خدا ہے، اسی لئے وہ میکاڈو اور اس کے وزیروں کے حکم کو خدا کا حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کرتے ہیں اور یہ لوگ جاپانی پبلک کے اس اعتقاد سے ناجائز فایدہ اُٹھاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مادی ترقی کے لحاظ سے جاپان بالکل یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے اعتقادات کے لحاظ سے وہ حد درجہ وحشی ہے ان کے فلسفہ، ان کے لٹریچر اور ان کے آرٹ کا ماخذ قدیم چینی تہذیب ہے، لیکن ان کی سائنس بالکل مغرب کی چیز ہے، جسے انھوں نے اُنیسویں صدی کے آخری دوسرے حصہ میں حاصل کرکے انتہائی ترقی تک پہونچا دیا۔

ان کی قومی اسپرٹ، ان کے اقتصادی اور سماجی حالات سے پیدا ہوئی ہے اور دنیا کی کوئی مہذب قوم ذات پات یا سوسائٹی کے لحاظ سے اتنی پراگندہ نہیں ہے جتنی جاپانی قوم۔

حکمراں طبقہ، یہاں کے کاشتکاروں اور مزدوروں کو اپنا غلام سمجھتا ہے اور جاپان کی ۸۰ فی صدی دولت صرف دس خاندانوں میں تقسیم ہے جن میں دو خاندان (مٹسوئی اور مٹسوبیشی) بہت مشہور ہیں اور وہاں کی تمام تجارت اور صنعت و حرفت پر انھیں کا قبضہ ہے۔

جاپان کے حکمراں طبقہ میں ایک جماعت اُن بڑے بڑے فوجی افسروں پر بھی مشتمل ہے جو شادی بیاہ کے ذریعہ سے حکمراں حلقہ میں شامل ہو گئے ہیں اور دفتری اقتدار انھیں کے ہاتھ میں ہے۔

نوجوان فوجی طبقہ جس میں سب کے سب غریب شامل ہیں، بالکل جاہل ہے اور اُسے کچھ نہیں معلوم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، وہ آنکھ بند کرکے صرف جان دینا جانتا ہے اور ساری دنیا پر چھا جانے کا جذبہ اس میں اتنا قوی ہے کہ وہ کبھی کبھی اس الزام میں اپنے افسروں کی بھی جان لے لیتا ہے کہ جاپانی فتوحات میں کیوں اس قدر دیر ہو رہی ہے۔

جاپانی کامیابی کا راز

جو کچھ بیان کیا گیا اس سے وہ پس منظر ظاہر ہو جاتا ہے جو جاپانیوں کے فوجی اقدامات کی بنیاد ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ اتنے تھوڑے زمانہ میں کیوں اسے اتنی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ کیا یہ صرف کسی اعتقاد کا نتیجہ ہے۔ نہیں، بلکہ اس میں کچھ اور باتیں بھی شامل ہیں۔

جاپان میں پہلے بالکل جاگیردارانہ حکومت قایم تھی، اور ہر جاگیردار اپنی فوج رکھتا تھا جو نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ہر چند اب وہاں کا نظام حکومت بدل گیا ہے لیکن جو قومی اسپرٹ وہاں پہلے پیدا ہو چکی تھی اب بھی پائی جاتی ہے اور فوج کی خدمت کو وہاں نہایت ہی معزز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے فوجی خدمت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تو وہ شرم کی وجہ سے خودکشی کر لیتا ہے۔ اس لئے وہاں کا سپاہی اس لئے نہیں لڑتا کہ وہ لڑنے کا معاوضہ پاتا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہ لڑ کر جان دینے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جاپانی سپاہی حد درجہ محنتی و جفاکش ہوتا ہے اور اس بات میں وہاں کی معاشرت کو بڑا دخل ہے۔ آپ ان کی معاشرت کا مطالعہ کریں تو

معلوم ہوگا کہ ایک جاپانی کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے ہمیشہ جوتا اُتار ڈالتا ہے تاکہ فرش خراب نہ ہو۔ آپ اس کے کمرہ میں کوئی فرنیچر نہ دیکھیں گے وہ فرش ہی پر بیٹھتا ہے وہیں کھاتا پیتا ہے اور وہیں سب کچھ کرتا ہے۔

جب سونے کا وقت آتا ہے تو الماری سے چٹائی نکال کر اسے بچھالیتا ہے اور صبح کو اسے پھر لپیٹ کر رکھ دیتا ہے ــــ وہاں کی فوجی بارکیں زلزلہ کے خوف کی وجہ سے لکڑی کی ہوتی ہیں اور ان میں بھی کوئی فرنیچر نہیں ہوتا، زمین ہی پر تمام سپاہی اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اس سادہ معاشرت کا نتیجہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی وہ زمین پر آرام سے سوسکتے ہیں اور ان کی راحت رسانی کے لئے میز، کرسی، یا پلنگ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان کی وردی ویسی ہی ہوتی ہے جیسی یورپین سپاہی کی، لیکن وہ کم سے کم کپڑا خرچ کرکے زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہاں کا قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر سپاہی خود ہی اپنی وردی کی مرمت بھی کرتا ہے اور میدانِ جنگ میں درزیوں کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ جاپانی سپاہیوں کی غذا کا مسئلہ بھی نہایت سادہ ہے۔ ان کی غذا چاول اور ترکاری کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وہاں کے سپاہی کو تعلیم دیجاتی ہے کہ وہ دورانِ جنگ میں کم سے کم غذا پر زندگی بسر کرے، چنانچہ چاول کے آٹے کا صرف ایک کلچہ ۲۴ گھنٹے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں غذا کے لئے رسد رسانی کا سوال بھی بہت ہلکا ہوجاتا ہے۔

فوجی تربیت بالکل مغربی اُصول پر ہوتی ہے اور بہت سخت محنت کا عادی بنا دیا جاتا ہے، چنانچہ سالانہ فوجی مظاہروں میں جو سال میں دوبار (نہایت سخت گرمی اور سردی کے زمانہ میں) ہوتے ہیں اگر کوئی سپاہی گر پڑتا ہے تو اس کو اسی حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور کوئی ہمدردی اس کے ساتھ نہیں کیجاتی، کیونکہ ایسے سپاہی کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہا اور اس لئے اُسے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

ایکبار وہاں نہایت شدت سے برفباری ہورہی تھی۔ فوج کے کمانڈر نے سوچا کہ اس سے بہتر موقعہ فوجی آزمایش کا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس نے کوچ کا حکم دیدیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے آدمی مرگئے۔ لیکن پبلک یہ سنکر بہت خوش ہوئی اور اس نے کمانڈر کی بہت تعریف کی۔

جاپان میں معمولی معمولی باتوں پر جان دیدینا روز کا مشغلہ ہے، وہ موت سے ڈرنا جانتے ہی نہیں اور بادشاہ کے لئے قربان ہوجانا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں، انکا فلسفہ یہ ہے کہ خودکشی کرلینا، شکست سے زیادہ باعزت بات ہے اور اسی لئے وہ میدانِ جنگ میں نہایت بے جگری کے ساتھ لڑتے ہیں۔ جب کوئی نیا رنگروٹ بھرتی ہوتا ہے تو ایک مذہبی تقریب منائی جاتی ہے۔ سارا خاندان بہترین کپڑے پہن کر جمع ہوتا ہے اور سب ملکر رنگروٹ کو بارک تک لیجاتے ہیں، یہاں ایک افسر ان سب کی پذیرائی کرتا ہے اور رنگروٹ کو جب وردی پہنا کر سامنے لاتا ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

یہی مذہبی عقیدہ ہے جس کی بدولت وہاں کی پبلک اپنے نوجوانوں کو خوشی سے فوجی خدمت کے لئے بھیج دیتی ہے اور یہی معاشرت کی سادگی ہے جو جاپانی سپاہی کو تیزی سے آگے بڑھنے اور مصائب برداشت کرنے میں مدد دیتی ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ان کے آلات حرب بھی بہت سُبک ہیں اور ان کی نقل و حرکت کے لئے بڑی بڑی سڑکوں کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ جنگلوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں سے بھی بہ آسانی گزرجاتے ہیں۔ الغرض جاپانی فوج اس میں شک نہیں بڑی خطرناک چیز ہے، اور اگر ہم اس قوم کی اخلاقی خصوصیات پر نگاہ ڈالیں تو اتنی ہی گھنونی بھی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ وہ ہندوستان یا کسی اور ملک پر صرف اس لئے حملہ کررہے ہیں کہ اس ملک کو آزاد کرائیں گے غلطی ہے، اگر وہ آزادی کے ایسے ہی طرفدار ہیں تو انھوں نے چین پر کیوں حملہ کیا، منچوکو کو کیوں فتح کیا، منگولیا کی آزادی کیوں چھینی۔

سوچ

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

تھکا ہوا سورج دھیرے دھیرے مغرب کی طرف چلا جا رہا تھا، تھکا ہوا سرد دن آہستہ آہستہ اپنے کو ایک سیاہ کمبل میں لپیٹ رہا تھا، دھواں اور کہر اینگ رینگ کر غنودگی کے عالم میں مکانوں کی سونی چھتوں پر پھیل رہا تھا۔ بجلی کے بہت سے قمقمے گردن جھکائے چُپ چاپ سڑک سے گزرنے والوں کو اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، گرد میں اٹے ہوئے درخت نم آلود پتیوں کو لٹکائے ہوئے دم بخود کھڑے تھے، دن بھر کی سرگرمیوں میں ایک اضمحلالی کیفیت سی آچلی تھی۔ زندگی میں ایک عجیب رکاوٹ اور دھیما پن سا پیدا ہو چلا تھا۔ ایک ٹھنڈی۔ افسردہ۔ لڑکھڑاتی ہوئی سی لہر چاروں طرف دوڑ رہی تھی۔ یکے تانگے، موٹر، پیدل چلنے والے بظاہر سب نہایت تیزی سے گزر رہے تھے مگر سب کی رفتار میں ایک خوابناکی سی پائی جا رہی تھی، سواریوں اور راہیوں کا شور و غل، قہقہوں اور کبھی کبھی گانے کی آواز فضا کو ذرا دیر گرما دیتی اور ایک اُداس سہانے پن کا احساس دلاتی ہوئی گزر جاتی مگر اس سہانے پن میں وہی کیفیت ہوتی جو ڈوبتے ہوئے دن میں پائی جاتی ہے ــــ اندھیرا لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک مکان کے چھوٹے سے کمرہ میں لالٹین دھیمی دھیمی جل رہی تھی جس کی بتی کم کر دی گئی تھی۔ میز پر کہنی ٹکائے کرسی پر کوئی بیٹھا ہوا تھا، لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ دھندلا دھندلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گال پر رکھے ہوئے تھے، سامنے کتاب کھلی ہوئی تھی مگر اس کی آنکھیں کمرہ کے ایک تاریک گوشہ میں جمی ہوئی وہاں نہ معلوم کیا دیکھ رہی تھیں ـــ کمرہ کی سوگوار اور دھندلی فضا، خاموشی اور تنہائی، بےحس و حرکت ایک انسانی ڈھانچہ، دو کبھی کبھی خوابناک آنکھیں، دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود اس کا احساس دھیرے دھیرے سرد ہوتا چلا جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس ڈھانچہ میں حرکت ہوئی، اُس نے آہستہ سے ہاتھ اُٹھا کر بالوں کو پیچھے کی طرف کیا اور پھر بتی ذرا تیز کر دی۔ کمرہ میں روشنی یوں پھیل گئی جیسے یکایک متفکر دماغ میں کوئی خیال آجائے۔ اب اس کے خال و خد صاف نظر آنے لگے، وہ سانولے رنگ کا چوبیس پچیس برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ چہرہ پر پھیکا پن۔ بال بکھرے ہوئے۔ گال ذرا پچکے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ان میں ایک لایعنی سی چمک۔ اسنے کتاب کے صفحے پر اُچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر ورق گردانی کرنے لگا، کبھی دو چار ورق پیچھے اُلٹ دیتا اور کبھی دو چار ورق آگے۔ اسکے چہرہ سے جھلک رہا تھا کہ وہ محض شغلاً یہ کر رہا ہے۔ اس کی آنکھیں کتاب کے صفحات پر ہوتے ہوئے بھی ان پر نہیں تھیں ـــــ آخر کار اس نے کتاب بند کر دی اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ وہ کرسی پر اس طرح بیدم ہو کر بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے جسم سے بیزار ہے۔ اس کے ہاتھ پیر سب ڈھیلے پڑے ہوئے تھے گو ان سے عملی قوتیں سلب کر لی گئی ہیں ـــــ سامنے دیکھتے دیکھتے جب وہ اُکتا گیا تو اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ میز پر ایک کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر گئی جگہ اس کے نام لکھے ہوئے تھے اس نے غیر ارادی طور پر جیب سے قلم نکال کر اپنا نام لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی وہ محض لکیریں ہی کھینچتا رہ جاتا۔ اُن تمام باتوں کے باوجود بھی وہ اِن سے قطعاً غیر متعلق تھا۔ وہ نہ معلوم کہاں تھا۔ اُس کی کھوئی ہوئی آنکھیں بدستور کھوئی ہوئی تھیں۔ اس کے دماغ میں شاید کوئی خیال نہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ نہ جانے کس خیال میں ڈوبا ہوا تھا وہ پھر آہستہ آہستہ بالوں کو اُنگلیوں سے گھمانے لگا یہاں تک کہ وہ اس سے بھی گھبرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسرے سے ملالیں اور چٹ چٹ انگلیاں توڑنے لگا۔ پھر جمھائی لی اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھونٹی سے گرم کوٹ اُتار کر پہنا۔ لالٹین دھیمی کی اور کمرہ سے نکل کر سڑک پر ٹہلنے لگا۔

سردی اب تیز ہو چلی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت بھی نسبتاً کم پڑ گئی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے اس کے پیر دکھنے لگے مگر وہ ٹہلتا ہی گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ صرف ایک سگریٹ رہ گیا تھا۔ ذرا سے توقف کے بعد وہ جلا کر پینے لگا۔ اب واقعی اس کے دماغ میں کچھ اُلجھے اُلجھے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ مگر وہ انھیں سلجھانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ وہ دماغ پر زیادہ زور دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ان خیالات کو صاف طور پر سمجھنا ہی چاہتا تھا۔ اُس میں اتنی سکت ہی نہیں رہ گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ ٹہلنے کے بعد وہ پھر کمرہ میں چلا آیا۔ لالٹین تیز کی اور چارپائی کے پاس کرسی کھینچ کر اس پر رکھ دی۔ کوٹ اُتار کر اس نے میز پر پھینک دیا اور چارپائی پر لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ بالکل ساکت لیٹا ہوا تھا مگر اس کے سکون سے ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس میں جھلاہٹ بھری ہوئی ہے۔ ایک عجیب بےچینی اور انتشار اسکی رگ رگ میں پنہاں تھا۔ اُس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سرہانے سے ایک رسالہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اب اس رسالہ میں اسکے

۔ذ کوئی جاذبیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اُسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر ایک تصویر پر جم کر رہ گئی۔

یہ ایک عورت کی تصویر تھی جس کو شاید اس سے قبل اس نے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ مگر آج وہ اس تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا اُس کی نگاہیں عورت کی ہنستی ہنسی آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے اسے نہ معلوم کیا خیال آیا کہ وہ تصویر کو ترچھا کر کے دیکھنے لگا۔ کبھی وہ اس کو دائیں طرف لیجاتا کبھی بائیں طرف۔ کبھی دور لیجاتا اور کبھی قریب لاتا مگر جس زاویہ سے بھی وہ تصویر کو دیکھتا عورت کی آنکھیں اسے اپنی ہی طرف دیکھتی معلوم پڑتیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بہت سی تصویریں وہ یوں دیکھ چکا تھا اور تھوڑے قریب سے میں اس نے یہی بات پائی تھی مگر اس وقت وہ اس میں خواہ مخواہ دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ اسی طرح جی بہلا رہا تھا کہ دروازہ پر قدموں کی آہٹ آئی اور تقریباً اسی کی عمر کا ایک نوجوان داخل ہوا۔

"کہو کیا ہو رہا ہے؟" آنے والے نے پوچھا

"کچھ نہیں اسی رسالہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا —— کہاں سے آ رہے ہو؟"

"گھر سے —— پڑھائی وڑھائی شروع کی کہ نہیں؟"

"ہاں، یہاں لڑکوں کو پڑھانے سے تو فرصت ملتی ہی نہیں تھیں پڑھائی کی سوجھی ہے!"

"ارے بھئی تو صبح کو پڑھاتے ہو کہ شام کو؟"

"نہ صبح نہ شام!" لہجہ میں جواب نہ دینے والی کاہلی کا انداز شامل تھا۔

"کیا مجہول قسم کی باتیں کر رہے ہو —— سگریٹ ہے؟"

"نہیں۔ ایک تھا پی گئے۔ اب کھانا کھانے کے بعد دوکان پر چل کر پئیں گے"

"کتنی دیر میں آئے گا کھانا؟"

"بس اب آتا ہی ہوگا، گھر کے لوگ کھا چکے ہوں گے"

اس مختصر سی گفتگو کے بعد دونوں چپ چاپ بیٹھ گئے جیسے ان کے پاس کوئی اور موضوع نہیں رہ گیا ہے جس پر باتیں کریں۔ گویا دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس نہیں ہے کمرہ میں بالکل سکوت طاری تھا جو ذرا دیر بعد حسب امید سوال پر ٹوٹا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ تو نہیں"

"آخر؟" محض باتیں کرنے کی خاطر اب باتیں ہو رہی تھیں۔

"یہی کہ کھانا ابھی تک نہیں آیا"

"یا یہ کہ دنیا میں کتنے غم ہیں"

"ہٹاؤ کہاں کی بات نکالے ہوئے ہو تم بھی!" اتنے میں ملازم کھانا لیکر آ گیا "آج بڑی دیر لگائی بھئی تم نے!" گویا اس سے زیادہ اور کوئی دسترس وہ ملازم پر نہیں رکھتا تھا۔

"ارے صاحب بغیر سرکار کو کھلائے کیسے لاتے — اور ہاں ماسٹر صاحب سرکار نے کہا ہے کہ آپ کی تنخواہ پرسوں ملے گی"

"خیر —!" اس نے لاپرواہی سے کہا جس میں ملازم کے مقابلہ میں اپنے ذاتی وقار کی خفیف سی نمائش بھی شامل تھی۔ "آؤ بھئی کھانا کھاؤ"

"بسم اللہ کیجئے" اور وہ اس مختصر اور کم مقدار کھانے سے نظر ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

کھانے کے دوران میں بالکل خاموشی تھی۔ دونوں اپنے اپنے خیال میں محو تھے —— کھانے سے فارغ ہو کر دونوں سگریٹ لینے چل دئے۔ راستے میں بھی دونوں چپ تھے۔ وہ زبان کھولتے ہوئے ایک بار سا محسوس کر رہے تھے۔ ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس خاموشی کو توڑیں جیسے وہ ڈرتے تھے کہ اس کے بعد جو کچھ باتیں ہوں گی وہ انہیں اور بے کیف اور پژمردہ بنا دیں گی اُنھیں اپنے وجود کے بیکار ہونے کا احساس دلا دیں گی سگریٹ خریدنے کے بعد دونوں آہستہ آہستہ گھر کی طرف لوٹے پاس ہی کہیں سے گھنٹہ بجنے کی آواز آنے لگی انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ایک دوسری آواز ان کے دماغ کی بے اثر اور ٹھہری ہوئی آواز کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انھیں

جھنجھوڑ کر جگا رہی ہے ۔ دونوں دل میں گھنٹے گن رہے تھے ۔

"ایک ۔۔ دو ۔۔ تین ۔ چار ۔۔ پانچ ۔۔ چھ ۔۔ سات ۔۔ آٹھ ۔۔ نو ۔۔ ٹن ۔۔ ٹن سے آخری گھنٹہ بولا اور انھوں نے ایسا محسوس کیا دونوں میں سے ایک کو اب بولنا چاہئے

"نو بجے ہیں ۔۔ ماسٹر صاحب ۔" ماسٹر صاحب کو کھینچ کر ادا کیا گیا ۔

"ہاں"

"لڑکیاں انگریزی سینما دیکھکر واپس ہو رہی ہوں گی ۔ ذرا اور رک رک کر چلو"

"فایدہ ؟"

"گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی"

"جی ہاں سردی میں جان دینا ہے"

"جیسے اتنی دیر میں جم ہی تو جائیں گے آپ"

دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی سینما سے لوگ لوٹ رہے تھے ۔ آواز قریب آ گئی ۔ ایک ٹانگا پاس سے ہو کر گزر گیا ۔ اس پر صرف مرد ہی تھے ۔

"لا حول ولا قوۃ"

ایک اور ٹانگے کی بھی آواز سُنائی دینے لگی ۔

"اس پر ضرور ہوں گی ۔ میرا دل کہہ رہا ہے"

یہ ٹانگا بھی تیزی سے گزر گیا ۔ چند نرم و نازک ہلکے پھلکے قہقہوں کی آواز فضا میں گونج کر رہ گئی ۔ دونوں ٹانگے کو مڑ کر دیکھنے لگے ۔ بجلی کے دوسرے کھمبے کے پاس پہنچکر ٹانگے پر ذرا روشنی پڑی انھوں نے دیکھا تین لڑکیاں آپس میں گفتگو کرتی ہوئی چلی جا رہی تھیں ۔ دو کو وہ صاف طور پر نہیں دیکھ سکے ۔ مگر ایک پر روشنی زیادہ پڑ رہی تھی ۔ اس کا چہرہ انھوں نے صاف طور پر دیکھ لیا ایک عجیب لاحاصل سا احساس حُسن ان میں جاگ اُٹھا ۔ ابھی آنے والے ٹانگے پر وہ پہلے ہی سے متوجہ ہو گئے ۔ اس پر کی سواریوں کو انھوں نے اچھی طرح دیکھا ۔ واقعی بہت خوبصورت لڑکیاں تھیں ۔

"دیکھا تم نے ! مگر دوست ان میں سے کوئی بھی تمھیں پوچھنے والی نہیں ۔ تم ہوا کرو قابل اور حساس ۔ جب تک تم چند روپیوں کے واسطے یہاں ٹکے ہوئے پڑھا رہے ہو تم ماسٹر صاحب ہی بنے جاؤ گے ۔ تمھاری دماغی قوتیں سو جائیں گی ۔ کیا تم خود نہیں محسوس کرتے کہ تم میں وہ اگلی سی چمک نہیں رہی ۔ تم دن کا بیشتر حصہ معمولی معمولی باتیں سوچنے میں گزار دیتے ہو ۔ تمھاری گفتگو بدمزہ اور پھیکی ہونے لگی ہے" وہ رو میں کہتا چلا جا رہا تھا جیسے وہ خود اپنے دل کا بخار نکال رہا ہے ۔ اس نے پھر خطابت شروع کر دی "کون جانتا ہے کہ تمھارے پاس اتنا بیدار دماغ ۔ اتنا پُر خلوص دل ۔ اتنے لطیف جذبات ہیں ۔ تم سے بھلا کس کو محبت ہو سکتی ہے کیتنی غلط بنیادوں پر ہماری ازدواجی زندگی قایم ہے ۔ جانتے ہو زندگی کا سب سے المناک پہلو کیا ہے ۔۔ آیں ! آیں !"

"ادل !" وہ چونک پڑا "کس کا سب سے المناک پہلو !"

کوٹھری آ گئی دونوں لحاف اوڑھکر چارپائی پر بیٹھ گئے

"زندگی کا سب سے المناک پہلو !" اس نے دہرایا اور پھر سوچ میں پڑ گیا

"ہاں کیا ہے ؟"

"شاید یہی سوچتے رہنا کہ کیا کرنا چاہئے"

"اور تنہائی ؟"

تنہائی !" اس نے دھیرے سے کہا اور اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چاروں طرف نظر دوڑائی ۔ اُسے ایک دم سے تنہائی کا احساس ہونے لگا اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے چلتے چلتے یکایک اس کی نبضیں رک گئی ہیں ۔ جیسے ساری دنیا اچانک سونی ہو گئی ہے اور وہ تن و تنہا تاریک اور مبہم خلاؤں میں سانس لے رہا ہے ۔ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا ہے مگر اسے کوئی نظر نہیں آ رہا ہے ۔۔۔ وہ تنہا ہے ۔ بالکل تنہا ۔ نہ وہ کسی کو دیکھ رہا ہے نہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے ۔۔ اُسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہے ۔۔

اف! کتنا خوفناک احساس! اسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا ہے! وہ ٹھٹھرنے لگا - اسے سردی لگنے لگی - اس کے تمام بدن میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہو چلی - اس کے دوست نے اسے پھر خواب سے چونکایا ——— "سنا تم نے! تنہائی! زندگی کا سب سے المناک پہلو تنہائی ہے اور اس کی بھی وجہ یہی غلط قسم کی ازدواجی زندگی ہے - ہماری زندگی کی ساری مسرتیں سارا حوصلہ فنا ہو جاتا ہے - ہم بہت جلد بے روح ہو جاتے ہیں - اگر عورت اچھی ہے تو اسے مرد اچھا نہیں مل رہا ہے اگر مرد اچھا ہے تو اسے مناسب عورت نہیں مل رہی ہے دونوں میں سے کسی کو بھی حسب خواہش ساتھی نہیں ملتا!"

"اتنا میری طرف سے اضافہ کر دیجئے اگر دونوں مل بھی گئے تو پھر روپیہ نہیں ملتا کہ ان دونوں کو متحد کر سکے" اور اس نے پھر اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں چاروں طرف نظر دوڑائی - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوٹھری بھی اُسے بار بار دیکھ رہی ہے - دونوں پھر چپ ہو گئے -

"آخر تم چپ کیوں ہو جایا کرتے ہو" اس کے دوست نے خاموشی سے اکتا کر پوچھا

"اس قسم کی باتوں کا لازمی نتیجہ خاموشی کے سوا اور کیا ہے" اس نے مڑ کر اس کی طرف چڑ کر جواب دیا اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی

اس کے بعد موضوع بدل گیا - کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر اس کا دوست اپنے گھر چلا گیا ——— وہ چار پائی پر یونہی گم سم بیٹھا رہا - اس کے دماغ میں پھر کوئی خیال نہیں رہ گیا تھا - اور وہ پھر بیکاری محسوس کر رہا تھا کبھی وہ لالٹین تیز کر دیتا اور کبھی دھیمی - اس کے چہرہ پر کبھی اُجالا دوڑ جاتا اور کبھی تاریکی ——— وہ بالکل خالی الذہن بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی آنکھیں برابر چمک رہی تھیں ——— ایک اداس بے حس چپ! ——— باہر رات اور زیادہ سرد اور بے جان ہو چلی تھی - اُس نے پھر وہی رسالہ اُٹھا لیا - اُس کی نظر پھر اُسی عورت کی تصویر پر پڑی جو اسے برابر دیکھے جا رہی تھی - وہ تصویر کو اور غور سے دیکھنے لگا - اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے عورت کے لبوں میں جنبش ہونے والی ہے اور وہ کچھ بولنا ہی چاہتی ہے - وہ تصویر کو اور قریب لا کر دیکھنے لگا - - - - - - - اُسے کچھ اور معلوم ہونے لگا جیسے عورت کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے - اور وہ گردش کرنے ہی والی ہیں" اُس نے اپنی آنکھوں کو چھوا خود اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں "کیا حماقت ہے بیٹھے بیٹھے! کوئی بات نہیں اور خواہ مخواہ افسردہ ہوتا چلا جا رہا ہوں" اُس نے رسالہ رکھ دیا مگر رفتہ رفتہ وہ پھر سوچنے لگا - "زندگی اور تنہائی! تنہائی اور بیکاری! آخر یہ سب کیوں ہے؟ میں تنہا کیوں ہوں میرا دل کتنی محبت کر سکتا ہے مگر مجھ سے کوئی محبت نہیں کر سکتا - کوئی بھی نہیں - مجھے تنہا ہی رہنا پڑے گا - اور میں رہوں گا بھی تنہا - مگر کیا واقعی ہمیشہ تنہا رہوں گا ——— ہمیشہ تنہا!" اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں بند کر لیں ——— سامنے لالٹین جل رہی تھی ——— مگر وہ بالکل تاریکی میں تھا ——— تھاہ تاریکی! ——— زندگی کی بھیانک - خاموشی، انجان تاریکی! جس میں صرف خیالات چکر لگایا کرتے ہیں - جہاں عدم و وجود گھل کر ایک ہو جاتے ہیں ——— وہ آنکھیں یونہی بند کئے بیٹھا تھا ——— سامنے لالٹین اسی طرح جل رہی تھی - بہت دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں - لالٹین مدھم ہو رہی تھی شاید تیل ختم ہو رہا تھا - اس نے لالٹین گل کر دی - کمرہ میں کامل اندھیرا چھا گیا جس میں وہ بالکل گم ہو کر رہ گیا - معلوم ہوتا تھا کہ زمین آسمان کچھ بھی نہیں رہ گئے ہیں ——— صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور اس میں لیٹا ہوا وہ آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا ——— اور شاید سوچ رہا تھا ——— یا شاید ——— مگر اس کی آنکھیں اندھیرے میں کون دیکھ سکتا تھا!

مجتبیٰ حسین

سیماب صاحب اور شیطان

جناب سیماب اکبرآبادی نے شیطان کے متعلق ایک نظم "موحد اعظم" کے عنوان سے لکھی جو کسی رسالہ میں شایع ہوئی۔ اس کو پڑھکر کوئی مولوی صاحب برافروختہ ہوئے اور انھوں نے تردید لکھ دی۔ ایک شاعر صاحب کو جوش آیا، انھوں نے جواب میں ایک نظم چھپوادی، سیماب صاحب کے دوستوں نے یہ ہنگامہ دیکھکر نظم کی مدح سرائی شروع کی، مخالفوں کو جلال آیا، انھوں نے اعتراض سرزد کردئے۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ نظم کو جانچا، نہ مضمون پر غور کیا، نہ زمانہ و ماحول کو دیکھا، نہ سیماب صاحب کو سمجھا۔

(۱) اس نظم (موحدِ اعظم) کا فنِ شاعری میں کوئی مرتبہ نہیں ہے اور خود سیماب صاحب کے کلام میں بھی یہ کوئی شہپارہ نہیں۔ انھوں نے اس سے بہتر نظمیں کہی ہیں یہ نظم نہایت معمولی، چلتی ہوئی صرف لکھنے کے لئے لکھدی ہے۔

(۲) "موحدِ اعظم" میں شاعری کی غلطیاں موجود ہیں۔ جو سیماب صاحب سے بعید تھیں۔ الفاظ غلط نظم ہوئے ہیں اور بے اصول ساخت کئے گئے ہیں۔ ترکیب و بندش میں سستی و کمزوری ہے، مضامین غلط ہیں۔ شاعر کی نظر نظم کے نفس موضوع تک نہیں پہونچی، اس لئے نظم بے اثر ہوگئی اور "سخن گسترانہ بات" آپڑی۔ مختصر تفصیل ملاحظہ ہو:۔

(۳) نظم کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع ہے:۔ "فرشتوں کا معلّم، عالمِ ملکوت کا عالم"

اس میں (ملکوت) بسکونِ ثانی نظم ہوا ہے یہ غلط ہے۔ (ل) پر زبر ہونا چاہئے۔ ایک اور مصرع ہے:۔ "خدا کے ساتھ "آعوذ" میں استحکام ہے اسکا"

یہاں آعوذ (مد کے ساتھ) پڑھنے سے مصرع موزوں ہوتا ہے، جُہلا "آعوذ" کہا کرتے ہیں۔ اصل صیغہ بغیر مد کے ہے۔ یہ بجائے خود شاعر کا ضعفِ نظم ہے اور یہاں اس لئے زیادہ ہوگیا کہ اس بحر میں بغیر مد کے نظم ہوسکتا ہے۔ مثلاً اس طرح کہہ سکتے ہیں:۔ "خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اس کا"

تیسری جگہ سیماب صاحب فرماتے ہیں:۔ "سرشتاً تجھکو ہونی چاہئے شیطان سے نفرت"

فارسی لفظ (سرشت) پر عربی کی تنوین بھی سیماب صاحب کے قلم سے عجیب ہے یہ بھی جاہلوں کا انداز ہوگیا ہے۔

(۴) سیماب صاحب یہ آمیزشِ عربی و فارسی اور جگہ بھی کرچکے ہیں۔ رسالہ چمنستان دہلی بابت مارچ سنہ ۱۹۴۱ء میں اپنے مضمون (شاعر حیات) کے صفحہ ۳۹ پر تحریر فرمایا ہے

"وضع قدیم کے پابند جوان العمر رئیس تھے"

اس حساب سے ان کے نزدیک "قریب المرگ" بھی جائز ہوگا۔ یہاں زبان کی صحت اور معیار کی بحث آجاتی ہے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ سیماب صاحب کی غلطی مستند مان لی جائے اور یہی قانون بن جائے۔ سیماب صاحب جیسے شاعر یہ آزادی اختیار کریں گے تو زبان کو بگڑتے کچھ دیر نہ لگے گی۔

(۵) سیماب صاحب کی اسی نظم کا ایک مصرعہ ہے:۔ "اُدھر یہ ضد کہ ہو مسجود خاکِ آدمِ اُولیٰ"

سیماب صاحب کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ اُولیٰ مونث ہے اور اوّل الذکر آدمِ اوّل کہنا چاہئے تھا۔ یہ غلطی سیماب صاحب سے ہونے کی نہ تھی۔

(۶) سیماب صاحب فرماتے ہیں:۔ بذہنِ عشق حکم سجدۂ آدم نمی گنجد

یہ "ہندوستانی فارسی" ہے، ایرانی اسلوب کو اس سے کچھ تعلق نہیں — بہتر ہوتا کہ یہ مضمون بھی اُردو میں لکھ دیتے۔

(۷) ایک جگہ لکھتے ہیں:۔ کبھی ہیں کعبۂ مسجود در دانے قیادت کے

یہاں یہ غلطیاں ہیں:۔ (۱) "کعبۂ مسجود" نامانوس ترکیب ہے۔ (۲) کعبہ کبھی مسجود نہیں ہوتا۔ (۳) "کعبۂ مسجود" کہنے سے پہلے مصرع کے مقابلہ میں کوئی جدّت ترقی اور بلندی پیدا نہیں ہوئی۔ (۴) اگر اختراع سے کام نہ لیتے اور وہی قدیم لفظ "کعبۂ مقصود" رکھدیتے، تو مصرع کہیں سے کہیں پہونچ جاتا لیکن شعر یہ ہوتا

کبھی سجدے ہیں تیرے آستانے پر حکومت کے　　　　کبھی ہیں کعبۂ مقصود در وازے قیادت کے

"کعبۂ مقصود" کہنے سے "کعبہ" میں پہلے مصرعہ کا مضمون سجدہ بھی آگیا۔ اور مقصود کے مضمون کا اضافہ بھی ہوگیا۔

(۸) سیماب صاحب نے اس نظم میں ذوقؔ کا ایک شعر اس طرح تضمین کیا ہے :۔

وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا　　　　قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے　　　　اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

(۱) تضمین کرنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ وہ شعر گویا اپنا کرلیا جائے۔ اس کا مضمون اپنی نظم میں کھپا لیا جائے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے۔

(۲) ذوقؔ کے پہلے مصرع میں اظہار واقعہ ہے اور دوسرے میں اس کی تائید۔ سیماب صاحب جب اوپر سے شیطان کی تحسین کر رہے ہیں تو اسکے لعین و رجیم ہونے کی تائید موزوں نہیں، جو ذوقؔ کے مصرعۂ ثانی کا مفہوم ہے صرف پہلا مصرع کھپ سکتا ہے۔

(۳) ذوقؔ کا شعر بے جگہ رکھا گیا ہے۔ اس سے اوپر سیماب صاحب کا جو شعر ہے، اس کے صرف پہلے مصرعہ سے ذوقؔ کا شعر متعلق ہے یعنی ترکِ سجدہ سے یہ برہمی پیدا ہوئی کہ شیطان مارا گیا۔ دوسرے مصرع سے کوئی میل نہیں ہے۔ مصرعوں کی ترتیب بدل کر اس طرح تضمین درست و با معنی ہو سکتی تھی۔

قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے، کر حساب انکا　　　　وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے　　　　اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

(۹) سیماب صاحب نے مرزا داغؔ کا یہ شعر بھی اپنی نظم میں چسپاں کیا ہے :۔

تمھیں چاہوں، تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں　　　　مرا دل پھیر دو، مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

داغؔ کا یہ شعر ان کے عامیانہ شعروں میں ہے، جس میں بوالہوس عاشقوں کا جذبہ و معاملہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کو ظرافت کے موقعہ پر بطور ضرب المثل کے لکھ سکتے ہیں اس لئے نظم میں اس شعر کے آنے سے نظم کا توازن اور لہجہ بدل گیا (جس کو انگریزی میں ٹون کہتے ہیں)

(۱۰) شعرائے متصوفین کو شیطان کے انکار سجدہ میں ایک بات سوجھی لیکن وہ صرف تصوف کا ایک نکتہ اور شاعری کا ایک لطیفہ تھا۔ اس لئے صوفی شاعروں نے اس کو صرف مثال و نکتہ کی حد تک رکھا۔ چنانچہ کسی کی رُباعی ہے :۔

جعفرؔ سخن از کعبہ و از دیر مکن　　　　در وادیِ شک چو گمرہان سیر مکن
رو شیوۂ بندگی ز شیطان آموز　　　　یک قبلہ گزیں و سجدۂ غیر مکن

ایک شاعر بے نماز مسلمان کا شیطان سے مقابلہ کرتا ہے :۔

شیطاں ہزار مرتبہ بہتر ز بے نماز　　　　آں سجدہ پیشِ آدم و ایں پیشِ حق نہ کرد

ان سب سے بڑھکر حضرت خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مشہور قصیدے میں شیطان کے متعلق ایک لطیفہ و معرفت کا ایک نکتہ بیان کیا ہے یہ مضمون ۲۰ شعروں میں لکھا ہے۔ اس طرح شروع کرتے ہیں :۔

روزے از روزہا کلیم اللہ　　　　خواست مرشد ز ایزدِ دادار
شد ندائے برائے او کہ برو　　　　پیشِ ابلیسِ مفسداں سالار

یعنی ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ سے اپنے لئے ایک ہادی و مرشد طلب کیا۔ ندا آئی کہ مفسدوں کے سالار ابلیس کے پاس جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ شیطان کے پاس تشریف لے لئے اور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ تجھ سے ارشاد ہدایت چاہتا ہوں۔ "خواہم من از تو ارشادے"۔ اس کو ابلیس نے جس طرح سُنا اور جو کچھ کہا۔ اس کو خواجہ عطاؔر نے اس طرح ادا کیا ہے کہ وہ اشعار قصیدہ کے شہ پارے ہیں فرماتے ہیں :۔

زیں سخن ہمچو شعلہ سر پیچید　　　　جست و بر جانشست ہمچو شرار
گفت من از دمِ ازل دارم　　　　طوقِ لعنت بہ گردنِ ادبار

نہ تھی۔ دوسرا گروہ فاسد العقیدہ انقلاب پسند مسلمانوں کا ہے۔ وہ خدا کے انکار اور مذہب سے بیزاری میں آپ کے دعظ و تبلیغ کی حد سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں، وہ آپ کے مضمون پڑھ کر ہوا کے مترادف انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ آجکل خدا اور مذہب سے بغاوت کی نظمیں نہایت کثیر و عام ہیں۔ ان نظموں کے اقتباس سے مضمون اور طویل ہو جائے گا اس لئے ترک کرتا ہوں۔ ان کو بھی آپ کا انتظار بیکار ہے۔ آپ اس ارشاد پر عمل کرتے ہیں کہ "فذکر انما انت مذکر"۔ لیکن یہ لوگ منافق ہیں کہ باوجود بیدینی کے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ بھی یاد رہے کہ:۔

"ذالک بانہم آمنوا ثم کفروا فطبع علیٰ قلوبہم فہم لا یفقہون"

(۱۵) اب رہے سیماب صاحب کے خاص شاگرد، تو ایک تلمیذ رشید کہتے ہیں:۔

میری گستاخی معاف اے خالق فطرت کہ آج — تیرے قانون قضا سے کر رہا ہوں احتجاج

اور ایک طویل نظم میں موت کے خلاف احتجاج کر کے اس نتیجہ اور نصیحت پر نظم کو ختم کرتے ہیں:۔

جبر ہی پر ہے اگر دارومدار زندگی — تو یہ بہتر ہے کہ ہر انسان کرے خودکشی (رسالہ شاعر جنوری ۱۹۳۵ء)

دوسرے شاگرد عزیز ایک طویل نظم کہتے ہیں۔ "اگر خدا ہے" نمونے کے طور پر دو شعر اس کے سن لیجئے:۔

اگر خدا ہے تو کیوں نہیں اس کو اپنی دنیا کی فکر و پروا — ازل سے سو رہے یوں کہ بیدار تا ابد اب نہ ہوگا گویا

اگر خدا ہے تو اسے بھی فرشتہ نیک نام سن لے — حیات کہہ نو ... بنوں گا تیرے خدا کا غلام سن لے

(رسالہ کنول آگرہ فروری ۱۹۳۶ء)

(۱۶) آخر میں خود سیماب صاحب کی سنیئے۔ ان کو پیامی شاعر بننے کا دعویٰ ہے۔ چنانچہ ایک پیام دیتے ہیں:۔

عشرت کی طرف نگاہ بھی میں نہ کروں — تو نغمہ سرا ہو، آہ بھی میں نہ کروں

نیکی نہیں ممکن ہے تو کیا اے ناصح — دنیا میں کوئی گناہ بھی میں نہ کروں

ہر جلوہ کہ دادخواہ ہے فطرت کا — اک عقیدۂ بے پناہ ہے فطرت کا

حیرت نہیں فطرت میں جو اسکی ہے گناہ — انسان خود اک گناہ ہے فطرت کا

سوچیئے کہ ان رباعیوں میں کیا پیام ہے اور کیا دعوت عمل ہے اور غور کیجئے کہ دوسری رباعی میں شاعری کیا ہوئی اور شعریت و ادبیت کیا نکلا اگر انسان کا گناہ فطرت ہوتا کسی شاعرانہ توجیہ سے بھی ثابت کیا ہوتا تو کچھ بات پیدا ہو جاتی۔ اس کے مقابلہ میں کسی شاعر کی اس رباعی کی لطافت و شعریت دیکھئے:۔

یہ بات نہیں کہ سب پہ تہمت ہے گناہ — مٹ جائے خودی جس سے وہ تہمت ہے گناہ

پھر جا سے کوئی گناہ بھی وہ نہ کرے — انسان کے لئے خود اسکی ہستی ہے گناہ

سیماب صاحب نے اس طرح کے پیام اور بھی دئے ہیں جن میں ضلالت اور کجروی کی تیارت نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اولیاء اللہ کی توہین بھی جائز رکھی ہے انھوں نے اپنے رسالہ شاعر میں ایک مضمون شایع فرمایا تھا۔ جس میں اقبال کی خودی پر تنقید کی تھی۔ اس میں حضرت منصور، حضرت شبلی اور حضرت سرمد کی شان میں گستاخانہ الفاظ موجود ہیں۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

"خودی کے ایک معنی ہیں خود کو کچھ سمجھنا، اپنی انانیت۔ اور یہ ہی شعار انسانیت ہے ایک مستوار غیر مستحسن ہے منصور بن حلاج، شبلی اور سرمد کو اگر سوسائٹی صوفی اور خدا شناس کہکر خودی و خودنمائی کے گناہ سے بری کر دے تو فرعون، شداد، ہامان وغیرہ خودنما انسانوں پر تعزیر و تکفیر تعصبیت کا ایک مظاہرہ ثابت ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ مسالک دونوں طبقوں کا ایک ہے"۔ (شاعر آگرہ ستمبر ۱۹۳۶ء)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں نے محض تعصب سے فرعون و شداد و ہامان کو اولیاء الشیاطین ان رکھا ہے اور انھیں جیسے خودنما انسانوں منصور، شبلی و سرمد کو اولیاء اللہ میں شامل کر لیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک!

یہ اعتراضات اس وجہ سے ہیں کہ سیماب صاحب کی طرف سے بار بار دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ پیامی شاعر ہیں ان کا کلام ملک و قوم کے لئے ایک پیغام ہے

بیباک نہ ہو تو کچھ بات نہیں۔ ان سے پہلے کتنے فارسی و اُردو شاعروں نے خدا اور انبیاء و اولیاء کو کیا کیا کہا ہے۔ غالب و مومن، امیر و داغ وغیرہ سب اس حمام میں برہنہ ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے پیغامبر ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا۔ صرف شاعری کی ہے۔ رسمی شاعری جس میں طریقت و معرفت، اخلاق و موعظت کے ساتھ ساتھ رندی و بیباکی بددینی و عیاشی کے مضامین بھی تھے۔ وہ لوگ شعر کو "برائے گفتن" سمجھتے تھے اس لئے ناگفتنی بھی کہہ جاتے تھے۔ نہ پرہیزگاری کا دعویٰ تھا، نہ رندی کا اعلان۔ اسی لئے کسی نے ان کے "کلمات کفر" پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

سیماب صاحب بھی پیامی شاعر اور مصلح اعظم بننے کا دعویٰ چھوڑ دیں سب اعتراضات اُٹھ جاتے ہیں۔ پھر بقول خواجہ عطار کے، "ہرچہ خواہی بگو و پاک مدار" "الحق"

(نگار) حضرت سیماب کی نظم "معبد اعظم" کچھ عرصہ سے مولویوں اور شاعروں میں موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔ اس دوران میں متعدد مقالے اور استفسارات ہمیں بھی موصول ہوئے۔ چند استفسارات کا جواب تو خطوں کے ذریعہ سے دیدیا گیا۔ لیکن مقالوں کی اشاعت غیر ضروری سمجھی گئی۔ لیکن چونکہ اس مقالہ کے آخری حصہ میں ایک اصولی بحث آگئی ہے۔ اس لئے اس کی اشاعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مقالہ نگار نے جو اعتراضات شاعری کے متعلق کئے ہیں، اس کا جواب دینا سیماب صاحب کے ذمہ ہے، لیکن مذہب کو سامنے رکھ کر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا جواب دینا ہر اُس شخص کا فرض ہے جو مذہب کو مجموعۂ "مزخرفات" نہیں سمجھتا۔

سیماب صاحب نے اس نظم میں اس وقت کے مدعیان مذہب پر طنزیہ تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بحالات موجودہ جبکہ ہر مولوی ایک بت بنا ہوا ہے، شرک نے ایسی خطرناک عمومی حیثیت اختیار کرلی ہے کہ سوائے "شیطان" کے اب کوئی صحیح معنے میں "موحد" نظر نہیں آتا۔

یہ درست ہے کہ نظم کے لب و لہجہ میں تلخی زیادہ ہے، لیکن اس کے مطالعہ کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ شاعر نے شیطان کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا ہے، بلکہ ایک تقابلی نفسیاتی مطالعہ معلوم ہوتا ہے، جس میں عہد حاضر کے حامیان مذہب کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

اس وقت تک مولویوں کا فتوائے کفر و الحاد صرف نثر نگاروں تک محدود تھا، لیکن اب شعراء بھی اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں، سچ ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں !

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء) - جنوری عہ ر - (سنہ ۲۷ء) - اگست عہ ر - (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر - (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸ ر - اگست ۸ ر - ستمبر عہ ر - اکتوبر ۸ ر - نومبر ۸ ر - دسمبر ۸ ر - (سنہ ۳۲ء) - جنوری ۱۲ ر - فروری عہ ر - مارچ عہ ر - مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ - نومبر عہ ر - (سنہ ۳۳ء) - فروری عہ ر - (سنہ ۳۴ء) - فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ - (سنہ ۳۵ء) دسمبر عہ ر - (سنہ ۳۶ء) جنوری ۱۲ ر - (سنہ ۳۷ء) - جنوری عہ ر - فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ - اکتوبر عہ ر - (سنہ ۳۸ء) جنوری ۱۲ ر، فروری ۸ ر، اپریل عہ ر، مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۳۹ء) - جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ - ستمبر عہ ر - اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۰ء) - جنوری عہ ر، فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۱ء) - جنوری، فروری ۱۲ ر - مارچ تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۲ء) جنوری فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی ۸ ر فی پرچہ -

مینیجر نگار

پورب اور پچھم ــــــــــ یعنی ــــــــــ دو ہواؤں کا تصادم

چین کے معاشرتی انقلاب کا نفسیاتی مطالعہ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جب میں نے اپنے گھر کو خیر باد کہا اور اُس مسرت کی کرسی پر بیٹھی، جس پر بیٹھ کر دلہن شوہر کے گھر جاتی ہے تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ میں اپنے شوہر کو خوش نہ کر سکوں گی۔ مجھے اس خیال سے اُس وقت مسرت تھی کہ میرا جسم ہلکا پھلکا اور خوبصورت ہے اور میرے چہرے کی ساخت بیضاوی ہے جس کو دیکھ کر سب خوش ہوتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میرا شوہر بھی میری شکل دیکھ کر خوش ہوگا۔

شراب کی رسم کے موقعہ پر میں نے اپنی نقاب کے ریشمی تاروں سے اُس کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سخت قسم کے سیاہ بریشمی کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اُس کا جسم لانبا اور بانس کی طرح سیدھا تھا۔ میرا دل بیک وقت سرد بھی ہوا اور اُچھلنے بھی لگا۔ میں تو دل ہی دل میں اُس کو دیکھنے کے لئے مر رہی تھی مگر اُس نے میری طرف نظریں بھی نہیں اُٹھائیں ہم نے ایک ساتھ شراب پی اور ایک ساتھ اُس کی خاندانی لوح کے سامنے سر جھکایا اور پھر میں نے اُس کے پاک اجداد کے سامنے بھی سر خم کیا۔ لیکن اُس نے مجھے قطعاً نہیں دیکھا۔

اُسی رات دعوت اور فلک شگاف قہقہوں کے بعد میں حجلۂ عروسی میں تنہا بیٹھی تھی اور خوف سے دبی جا رہی تھی۔ زندگی کا وہ لمحہ جس کے متعلق میں سوچا کرتی تھی، جس کا مجھے ڈر بھی تھا اور جس کی آرزو بھی، بالآخر آ ہی گیا۔ اُس نے آہستہ سے نقاب سرکائی اور غور سے میری صورت دیکھی، وہ دیر تک دیکھتا رہا، گویا اُس نے میری شکل پسند کی۔ پھر میرے سرد ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھوں میں لئے۔ میری ماں نے مجھے تعلیم دی تھی کہ :- "گرم جوشی سے سرد مہری بہتر ہوتی ہے اور شرم کا ذائقہ بہت شہید کی اُس شیرینی سے اچھا ہوتا ہے، جس سے طبیعت فوراً سیر ہو جائے۔ اگر تم نے اس کو یاد رکھا تو تمھارے شوہر کی طبیعت تم سے کبھی بھی سیر نہ ہوگی"۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے اُس کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی، میرے شوہر نے بھی شاید اس کو محسوس کر لیا چنانچہ اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنے ہاتھ الگ کر لئے۔ پھر اُس نے پر خلوص سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا اُس کی آواز بیحد دلکش تھی، گہری مردانہ آواز۔ میرا بدن مارے شرم کے کانپنے لگا۔ پہلے تو میں اُس کی باتیں سمجھ ہی نہیں پائی، پھر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ کیا کہہ رہا تھا ؟

"آج پہلی بار ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا ہے۔ یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ تمھیں ہم سے محبت ہو ہی جائے گی۔ یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے ہم لوگ اب تک اِس معاملہ میں قطعاً بے بس تھے۔ لیکن اب جبکہ ہم دونوں تنہا ہیں اپنی زندگی اپنی خواہش کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نئے طریقوں کو پسند کرتا ہوں۔ ہر معاملہ میں تم کو میں اپنے برابر سمجھوں گا اور کسی بات کے لئے مجبور نہ کروں گا۔ تم میری ملکیت یا منقولہ جائداد نہیں ہو۔ ہاں اگر چاہو تو میری دوست بن سکتی ہو"۔

بہن ! یہ تھیں وہ باتیں جو مجھے اپنی شادی کی پہلی رات میں سننی پڑیں۔ پہلے تو میں اُس کا مطلب ہی نہیں سمجھی اور پھر جب میں نے سمجھا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی ـــ میں اُس کے برابر ہوں ؟ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے ؟ کیا میں اُس کی بیوی نہیں ہوں ؟ اگر وہ میری رہبری نہ کرے گا تو کیا کوئی باہر سے مجھے راستہ بتانے آئیگا ؟ کیا قانوناً وہ میرا مالک نہیں ہے ؟ مجھے کسی نے اُس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا۔ اور میں کرتی کیا اگر اُس کے ساتھ شادی نہ کرتی ؟ شادی کرنے کی میرے پاس اور کونسی صورت تھی سوا اس کے کہ میرے والدین جو رشتہ پسند کریں میں اُسے قبول قبول کر لوں ؟ جس کے ساتھ میں بچپن سے منسوب ہو چکی تھی، اُس کے علاوہ اور کس سے میں شادی کرتی ؟ یہ سب تو بالکل دستور کے مطابق ہوا تھا۔ اس میں زبردستی کا کیا سوال ہے۔

اُس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے کہ "یہ شادی ہم دونوں پر زبردستی عاید کی گئی ہے"، میں ڈر کے مارے بیہوش سی ہوئی جا رہی تھی۔ کیا وہ

میرے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا!

بہن! میں سخت کرب و بےچینی میں مبتلا تھی اور دونوں ہاتھ گود میں رکھے مل رہی تھی۔ اول تو بولنے کی میرے اندر ہمت نہیں تھی ....

...... اور اگر ہمت بھی ساتھ دیتی تو ان باتوں کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ پھر اُس نے اپنا ایک ہاتھ میرے دونوں ہاتھوں پر رکھ دیا۔ میں بےحد پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ اُٹھالے۔ میں اُس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ اُس کی آواز کچھ مدھم مگر تلخ تھی۔

"وہی ہوا جس کا مجھ کو ڈر تھا۔ تم اپنی اصلی خواہشوں کا اظہار مجھ سے نہ کرو گی۔ تم نہیں کر سکتی ہو۔ رسم و رواج کی بندشیں تم نہ توڑو گی اور آج کے لئے تم کو جو تعلیم دی گئی ہے تم اُس سے الگ نہیں ہو سکتیں۔ اچھا میری ایک بات سُنو۔ میں تم کو باتیں کہنے کے لئے مجبور نہ کروں گا۔ صرف ایک چھوٹی سی بات چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر تم میرے ساتھ نئے راستے پر چلنا پسند کرتی ہو تو اپنا سر اک ذرا سا جھکا دو۔"

وہ میری طرف بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اُس کے ہاتھ بڑی تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف جھک رہے ہیں۔ ان باتوں سے اس کا کیا مطلب تھا؟ آج واقعات نے متوقع شکل کیوں نہیں اختیار کی؟ میں تو اُس کی بیوی تھی اور اُس کے بچے کی ماں بننا چاہتی تھی۔ میرے غم کی ابتدا اُسی وقت سے ہوتی ہے۔ اور غم کا یہ بوجھ نہ تو دن کو کم ہوتا ہے اور نہ رات کو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور میں نے تو حماقت میں اُس وقت اپنا سر بھی جھکا دیا۔

"میں تمھارا بڑا ممنون ہوں" وہ تو مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ اُس نے اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں پر سے ہٹالئے اور اُس نے کہا "اب تم اس کمرے میں آرام کرو۔ یاد رکھو کہ آج یا کبھی بھی تم کسی چیز سے ڈرنا نہیں۔ اچھا اب تم لیٹو۔ آج میں بغل کے چھوٹے کمرے میں سوؤں گا"

وہ تیزی سے گھوم کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اے رحم کی دیوی ماں ان ([illegible])! میرے حال پر رحم کر ــــ میرا سن ہی کیا تھا، میں تو بالکل بچہ تھی، اکیلی ڈر رہی تھی۔ آج تک میں گھر کے باہر کبھی نہیں سوئی تھی۔ لیکن آج تنہا لیٹی تھی اور مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ شوہر کی نظروں میں کوئی وقعت میں نہیں حاصل کر سکی۔

پریشانی میں دوڑ کر میں دروازے کی طرف گئی کہ شاید بھاگ کر ماں کے گھر پہونچ سکوں، لیکن بھاری آہنی دروازوں پر جوں ہی میرے ہاتھ پڑے میں اس خیال سے چونک پڑی کہ میں تو اب کبھی بھی اس گھر سے نہ جا سکوں گی۔ اور پھر اگر میں مکان کے ناآشنا حصوں کو پار بھی کر لوں تو سڑکوں سے بھی تو میں ناواقف ہوں۔ اور اگر کسی نہ کسی طرح اپنے گھر کے دروازوں پر بھی میں پہونچ جاؤں تو اب وہ دروازے میرے استقبال کے لئے نہیں کھل سکتے۔ اور اگر بوڑھا دربان رحم کھا کر دروازے کھول بھی دے تو میری ماں فوراً مجھے واپس کر دے گی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ میری ماں غمگین مگر تحکمانہ انداز میں مجھے واپس جانے کا حکم دے رہی تھی۔ اب اُس گھر سے مجھے کوئی تعلق نہ تھا ــــ میں نے آہستہ سے اپنا عروسی جوڑا تبدیل کیا اور الگ تہ کر کے رکھ دیا۔ میں دیر تک اُس چوڑی مسہری کے کنارے بیٹھی رہی جس کے چاروں طرف پردے پڑے تھے۔ میں اندر گھستے ہوئے اپنے سایہ سے ڈرتی تھی۔ اس وقت بھی اُس کی گفتگو میرے دماغ کی چار دیواری سے ٹکرا رہی تھی۔ بالآخر آنسو طوفان کی طرح میری آنکھوں میں اُمنڈ آئے، میں منھ اوڑھ کر رونے لگی اور روتے روتے میری آنکھ لگ گئی۔

بہت صبح میری آنکھ کھلی۔ میں پہلے تو اپنے کو ایک اجنبی جگہ پا کر کچھ گھبرا سی گئی لیکن جلد ہی کل واقعات مجھے یاد آگئے۔ میں اُٹھ کر جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے لگی۔ اتنے میں خادمہ گرم پانی لے کر آگئی۔ اُس نے مسکرا کر مستفسرانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھ کو خوشی تھی کہ میں نے اپنی ماں سے تمکنت کے سارے انداز سیکھ لئے تھے۔ آخر کسی کو یہ کیوں معلوم ہو کہ میں اپنے شوہر کو خوش نہ کر سکی۔

"یہ پانی اُس کمرے میں لے جاؤ" میں نے پُرشکوہ آواز کے ساتھ حکم دیا "تمھارا آقا وہاں لباس تبدیل کر رہا ہے"

میں نے فخر کے ساتھ اپنا کمخواب کا جوڑا زیب تن کیا اور زیور پہنے۔

میری شادی کو ایک مہینہ گزر چکا ہے اور اس عرصہ میں جو واقعات پیش آئے انھوں نے ہماری زندگی کو ایک معمہ سا بنا دیا ہے۔

اُس کے آبائی مکان کو خیرباد کہہ کر اب ہم ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اُس نے تو اپنی محترم ماں کے متعلق یہاں تک کہہ دیا کہ وہ خود سر واقع ہوئی ہے اور وہ اپنی بیوی کو گھر کی لونڈی نہیں بنانا چاہتا۔

یہ سب باتیں دراصل ایک معمولی سی بات سے پیدا ہوئیں۔ جب شادی کی دعوتیں ختم ہوئیں تو میں اپنی ساس کی خدمت میں حاضر ہوئی اور رسم کے مطابق

میں نے صبح کے وقت خادمہ کو گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ وہ پانی پیتل کے تسلے میں لیکر ایک خادمہ کے ہمراہ اپنی ساس کے کمرہ کی طرف چلی۔ میں نے سر خم کر کے لجاجت کے ساتھ کہا کہ:

"میں التجا کرتی ہوں کہ اس پانی سے ہاتھ منہ دھو کر آپ میری عزت افزائی فرمائیں"

وہ اپنے بستر پر ساٹن کی ریشمی رضائی اوڑھے پہاڑی دیو کی طرح لیٹی تھی۔ وہ اُٹھی تو اُس کے چہرہ پر نظر ڈالنے کی میں جرأت نہ کرسکی۔ اُس نے فارغ ہونے کے بعد تسلا ہٹانے اور رخصت ہونیکا اشارہ کیا۔ تسلا ہٹاتے ہوئے میرے ہاتھ نہ جانے ریشمی پردوں میں اُلجھے یا ڈر کے مارے اُن میں لرزش پیدا ہوگئی، بہرحال ایک ذرا سا پانی بستر پر گر پڑا۔ ڈر کے مارے میرے جسم میں خون کی گردش رک گئی میری ساس نے اپنی بھاری آواز میں ڈانٹ کر کہا:— "بہو کو یوں ہی کام کرنا چاہیے؟"

میں جانتی تھی کہ ایسے موقعہ پر اپنی صفائی میں بولنا بدتہذیبی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن تسلا سنبھالتے ہوئے میں باہر آگئی۔ اُس وقت میرا شوہر بھی اُدھر سے گزر رہا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اُس کا چہرہ مارے غصہ کے سُرخ تھا۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ مجھ ہی پر خفا نہ ہو کہ پہلے ہی موقعہ پر اُس کی ماں کو میں خوش نہ کرسکی۔ میں نے اپنے آنسو خشک کرنے کی بھی ہمت نہ کی اگرچہ میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ ڈھلک کر گالوں تک آچکے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا:— "یہ تسلا پھسلتا ہے اور ———"

"میں تم کو الزام نہیں دیتا" اُس نے میری بات کاٹ کر کہا "میں اپنی بیوی سے نوکروں کا کام نہ لوں گا۔ میری ماں کے پاس سیکڑوں نوکر ہیں"۔

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اُس کی ماں کی تابعداری کروں گی۔ میری ماں نے مجھے وہ سب کچھ سکھلایا ہے، جس کی ایک بہو کو ضرورت ہوتی ہے۔ میں بڑی خاکساری کے ساتھ اُس کے سامنے آنتوں گی اور اُس کی موجودگی میں برابر سر جھکائے کھڑی رہوں گی۔ اُسے صدر میں لے جا کر بٹھاؤں گی۔ اُس کی پیالی میں گرم گرم چائے ڈال کر دونوں ہاتھوں سے اُس کے سامنے پیش کروں گی۔ لیکن میرا شوہر تو ارادہ کر چکا تھا۔ اُس نے میری ایک بھی نہ سنی —— یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ معاملہ آسانی سے طے ہوگیا۔ اُس کے والدین کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ اُنکی خواہش تھی کہ ہم لوگ رواج کے مطابق آبائی مکان ہی کی چھت کے نیچے زندگی بسر کریں۔ اُس کا باپ پڑھا لکھا آدمی ہے اور اُس کی کمر علم کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ اپنے کمرہ میں وہ آبائی لوح کے نیچے بیٹھا تھا، اُس نے اپنی مختصر سی داڑھی پر بار بار ہاتھ پھیر کر کہا:— "بیٹا، تم یہیں رہو۔ میرا جو کچھ ہے وہ آخر تمہارا ہی تو ہے۔ جب تمہارے گھر میں کھانے پینے کی کمی نہیں ہے تو پھر محنت کرنے سے کیا حاصل۔ تم آرام کے ساتھ زندگی گزارو اور کتابیں پڑھا کرو جس کا تم کو شوق ہے۔ یہیں تمہارے بال بچے ہوں جس سے ہمارا گھر آباد ہو۔ ایک چھت کے نیچے تین پشتوں کو رہتے دیکھکر دیوتا بھی خوش ہوتے ہیں"

میرا شوہر بڑا ہی جلد باز ہے۔ اُس نے باپ کے سامنے سر جھکائے بغیر جواب دیا کہ، "محترم باپ! میں محنت کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے جس کو مغرب میں سب سے زیادہ شریفانہ پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ رہا یہ اولاد پیدا کرنا، میں اس کو پہلا درجہ نہیں دیتا۔ میں تو اپنے دیش کی بھلائی کے لئے پہلے اپنے دماغ کا پھل پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ جسمانی پھل تو کتے بھی پیدا کر لیا کرتے ہیں"

میں دروازے کے پاس پردوں سے لگی یہ باتیں سُن رہی تھی۔ میرا جسم خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ اگر وہ اپنے باپ کی پہلی اولاد ہوتا یا اسے پُرانے زمانہ کی تعلیم دیجاتی تو وہ ایسی باتیں نہ کرتا۔ یا اگر برسوں اُن ملکوں میں اُس نے زندگی نہ گزاری ہوتی جہاں چھوٹے بڑوں کی عزت نہیں کرتے تو وہ اپنے باپ کو اس ناشائستگی کے ساتھ جواب نہ دیتا۔ لیکن رخصت ہوتے وقت اُسنے کافی سعادتمندی کا ثبوت دیا اور اپنے والدین کو یقین دلایا کہ اُس کے پہلو میں لائق اولاد کا دل ہے۔ لیکن وہ الگ ہو ہی گیا

یہ نیا مکان عجیب طرح کا ہے۔ ایسا مکان میں نے تو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا چوکور کمرہ ہے اور اُسی کمرے سے اور کمروں میں جانے کے دروازے بھی ہیں اور اوپر جانیکا زینہ بھی۔ پہلی مرتبہ جب میں اُس زینہ پر چڑھی تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب گری اور تب گری۔ میرے پاؤں اوپر چڑھنے کے عادی نہیں تھے اس لئے میں تو زینہ پر بیٹھ گئی اور لکڑی کی ریلنگ پکڑ کے پکڑے اوپر چڑھی۔ لکڑی کا رنگ میرے کوٹ میں بھی لگ گیا۔ کوٹ میں نے فوراً بدلا کہ میرا شوہر اُس کو دیکھ کر میرا مضحکہ نہ اڑائے۔ وہ بہت زور سے اور تیزی کے ساتھ ہنستا ہے۔ میں تو اُسکے قہقہے سے ڈرتی ہوں

ایسے گھر میں فرنیچر لگانے کا مسئلہ آسان نہ تھا۔ میں نے ایسا گھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اِن کمروں سے کوئی کام لیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ میں جہیز کا کچھ سامان ساتھ لائی تھی، ایک میز، ایک بڑی کرسی اور ایک چوڑی سی مسہری جو اُس مسہری کے برابر تھی جو میری ماں کو جہیز میں ملی تھی۔ میز اور کرسی تو میرے شوہر نے اُس کمرہ میں لگائی جسے وہ "کھانے کا کمرہ" کہتا ہے۔ اور بڑی مسہری جس کے متعلق مجھے خیال تھا کہ اس پر میرا لڑکا جنم لے گا، وہ اوپر کے کسی کمرہ میں نہیں آئی میں نوکروں کی طرح بانس کے پلنگ پر سوتی ہوں اور میرا شوہر لوہے کے پلنگ پر لیٹتا ہے، جو ایک بنچ سے زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ میں اتنی تبدیلی کی عادی نہیں ہوسکتی۔

مکان کا بڑا کمرہ جسے وہ "بیٹھک" کہتا ہے، وہاں اُس نے خرید کر کچھ نئی کرسیاں ڈالی ہیں۔ یہ عجیب سی ہیں اور بدشکل ہیں۔ اُن میں کوئی کرسی بھی

ایک دوسرے سے مشابہ نہیں، اور بعض کرسیاں تو بالکل معمولی بید کی بنی ہیں۔ بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر ایک ریشمی کپڑا پڑا ہے اور چند کتابیں رکھی ہیں۔ کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے ۔۔ دیواروں پر اُس نے چند چوکور تصویریں لٹکائی ہیں۔ یہ اُس کے اُستادوں کی تصویریں ہیں۔ جا بجا اُس نے کچھ کپڑے بھی ٹانگے ہیں جن پر بہشتی حرفوں میں کچھ لکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا یہ اُس کی سند ہے۔ اس پر وہ بڑی زور سے ہنسا اور پھر مجھکو اپنی سند لاکر دکھلائی۔ جعلی ایسے کاغذ پر کالے کالے حرفوں میں کچھ لکھا تھا۔ اُس نے اُنگلی رکھ کر اپنا نام مجھے دکھلایا جو ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا تھا۔ سب سے اوپر کالج کا نام لکھا تھا، جہاں اُس نے تعلیم پائی تھی۔ سب سے نیچے اُس فن کا نام لکھا تھا جس کا اُس نے امتحان پاس کیا ہے۔ میں نے سوال کیا کہ "یہ سند کیا ہماری پرانی طبی سند 'ہان لن' کے برابر ہے؟" میرے سوال پر بھی وہ بہت ہنسا اور بتلایا کہ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ یہ سند ایک بڑے چوکھٹے میں مہمانوں کے بیٹھنے والے کمرے میں عین اُس جگہ ٹنگی ہے جہاں میری ماں نے اپنے مہمانوں والے کمرے میں پہلے منگ بادشاہ کی تصویر لٹکائی ہے ۔۔ مغربی انداز کے اس خوفناک مکان کو میں شاید ہی کبھی "اپنا گھر" سمجھ سکوں۔ بڑی بڑی کھڑکیاں ہیں جن میں چاول کے کاغذ کی جگہ پہ بڑے بڑے شیشے لگے ہیں جن سے آر پار دکھلائی دیتا ہے۔ تیز دھوپ سفید دیواروں کو چمکا دیتی ہے اور ذرا سی گرد بھی اگر فرنیچر پر پڑ جائے تو وہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ میں ایسی بے پناہ روشنی کی بالکل عادی نہیں ہوں۔ اگر میں لبوں پر سرخی یا بھوؤں پر چاول کا پاؤڈر ملتی ہوں، جس کی مجھ کو تعلیم دی گئی ہے تو یہ تیز روشنی اس درجہ اس کو نمایاں کر دیتی ہے کہ میرا شوہر کہہ اُٹھتا ہے کہ۔۔ "خدا کے لئے تم یہ سب نہ کیا کرو، مجھے تو قدرتی عورت پسند ہے۔"

مگر سرخی یا پاؤڈر استعمال نہ کرنا تو حُسن کو نامکمل چھوڑ دینے کے مصداق ہے اور یہ تو ایسے ہے کہ میں بالوں میں برش تو کروں لیکن تیل نہ لگاؤں یا جوتے تو پہنوں مگر وہ بالکل سادے اور بے کڑھے ہوں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ چینی گھروں میں کھڑکیاں جھلملی دار ہوتی ہیں اس لئے چینی عورتوں کے چہروں پر روشنی ہلکی ہلکی پڑتی ہے میں اس مکان میں کیونکر اُسے خوبصورت معلوم ہو سکتی ہوں۔

یہ کھڑکیاں بھی عجیب احمقانہ انداز کی ہیں۔ میرے شوہر نے سفید کپڑا خرید کر کچھ پردے مجھ سے سلوائے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ کون طریقہ ہے کہ پہلے تو دیوار میں بڑا سوراخ کر کے شیشہ جڑا گیا اب اُس شیشے پر پردے ڈالے جائیں گے ۔۔ مکان کا فرش لکڑی کا بنا ہے۔ میرا شوہر جب اپنے ولایتی جوتے پہن کر اُس پر چلتا ہے تو بہت آواز پیدا ہوتی ہے۔ اب اُس نے ایک چوکھنٹی سی اونی پھولدار چیز فرش پر ڈال دی۔ اس پر بھی مجھکو بڑا تعجب ہوا کہ ایسی خوبصورت اور قیمتی چیز جوتوں سے روندی جائے۔ مجھ کو ڈر تھا کہ نوکر تھوک کر اُس کو خراب نہ کر دیں۔ جب میں نے یہ بات اپنے شوہر سے کہی تو وہ بیحد خفا ہوا اور کہا کہ فرش تھوکنے کے لئے نہیں ہوتا۔

"فرش پہ نہیں تو پھر آدمی کہاں تھوکنے جائے؟"

"گھر کے باہر" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

نوکروں کے لئے یہ بیحد مشکل تھا۔ اور نوکر تو نوکر تھے خود میں اکثر بھول جاتی اور تربوز کے بیج فرش پر ڈال دیتی۔ اب اُس نے اگالدان خرید کر ہر کمرے میں رکھ دئے ہیں اور صرف اُس میں تھوکنے کی ہدایت کی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ جس کپڑے سے منہ پونچھتا ہے، اُس کو پھر جیب میں ڈال لیتا ہے۔ یہ بھی کتنی گندی مغربی عادت ہے۔

آہ! بعض وقت تو جی چاہتا ہے کہ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں لیکن جاؤں بھی تو کہاں جاؤں۔ ان حالات میں ماں کو تو میں صورت دکھلانے سے رہی اور دوسری کوئی جگہ نہیں ہے جہاں مجھے پناہ مل سکے۔ بہر حال زندگی کے دن، دُکھ کے دن اور تنہائی کے دن کسی نہ کسی طرح کٹ ہی رہے ہیں۔ صبح سے شام تک وہ کام کرتا ہے، بالکل مزدور کی طرح جسے اپنا پیٹ پالنے کے لئے محنت ضرور کرنی پڑتی ہے۔ گویا وہ ایک معزز امیر کبیر افسر کی نہیں بلکہ کسی غریب مزدور کی اولاد ہے۔ صبح کو آفتاب کے بلند ہونے سے پہلے وہ باہر نکل جاتا ہے اور پھر میں شام تک اس مکان میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ مکان کے اندر سب نئے نوکر ہیں، اُن کی باتیں سُن سُن کر میں شرمایا کرتی ہوں۔ اکثر میں تو سوچتی ہوں کہ زنانہ مکان کی چار دیواری میں بند رہنا اور ساس کے ساتھ میں زندگی گزارنا اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہاں کم از کم قہقہے کی آوازیں تو سنائی دیا کریں گی۔ یہاں تو مکان کی دیواروں پر ہر وقت خاموشی بادل کی طرح چھائی رہتی ہے۔ میں دن بھر بیٹھی یہ سوچا کرتی ہوں کہ اُس کے دل پر کیسے قابو حاصل کروں ۔۔ روزانہ صبح اُٹھتی ہوں اور پھر اُس کے سامنے جانے کے لئے بناؤ سنگار کرتی ہوں۔ چاہے رات بھر سارے بچھو کے ڈنک نیند نہ آئی ہو مگر سویرے اُٹھ کر گرم پانی سے ہاتھ منہ دھونا تیل وغیرہ استعمال کرنا ضروری ہے تاکہ اُس کا دل لبھا سکوں۔ میں جس قدر بھی سویرے اُٹھوں وہ مجھ سے پہلے ہی اُٹھ چکا ہوتا ہے۔ میں روزانہ اُس کو میز پر پڑھتے پاتی ہوں ۔۔ ہر روز یہی ہوتا ہے، آہستہ سے کھانس کر دروازے کا ہینڈل گھماتی ہوں۔ یہ بھی کتنے عجیب و غریب ہینڈل ہیں۔ اُن کو کھولنے کے لئے مجھے کتنی بار مشق کرنا پڑی ہے۔ اب بھی روزانہ میں اُس کی غیر موجودگی میں اسکی مشق کرتی ہوں تاکہ اُس کے سامنے جلدی سے کھول سکوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی صبح کے وقت میرا ہاتھ پھسل ہی جاتا ہے اور میں جلدی کھول نہیں پاتی ہوں۔ میرا دل بیٹھ

ٹکتا ہے کیونکہ اُس کو آہستگی سے نفرت ہے۔ چلتے وقت وہ بڑی پھرتی کے ساتھ اپنے جسم کو جنبش دیتا ہے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہ کسی وقت وہ اپنے جسم کو مجروح نہ کرلے۔

اُس کو اپنے جسم کے تحفظ کی بھی کوئی پروا نہیں ہے۔ روزانہ صبح کو ناشتے میں جب گرم چائے اُس کے سامنے میں پیش کرتی ہوں تو وہ اُس کو قبول کرنے کے لئے بھی اپنی نظریں کتاب سے نہیں ہٹاتا۔ میں ہر روز صبح نوکر کو بیکار، جوہی کے پھول لانے کے لئے بھیجتی ہوں۔ اُن کی خوشبو تو ولایتی کتابوں کے اندر نہیں گھس سکتی۔ بارہ دنوں میں گیارہ دن یہ ہوتا ہے کہ جب میں اُس کی غیر موجودگی میں کمرے کے اندر یہ دیکھنے جاتی ہوں کہ اُس نے چائے پی یا نہیں تو میں دیکھتی ہوں اُس نے تو پیالی کا ڈھکن بھی نہیں کھولا ہے اور چائے کی پتیاں برابر تیر رہی ہیں۔ اُس کو کتابوں کے سوا اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میری ماں نے شوہر کو خوش کرنے کے جتنے جتن بتلائے تھے میں نے سب کو آزما دیکھا۔ میں نے لذیذ کھانے پکائے۔ نوکر کو بھیج کر مرغ کا تازہ گوشت منگایا، بانگو سے بانس کی تازہ پھلیاں منگوائیں، سرخ مچھلیاں، ادرک، سرخ شکر اور سویابین کی چٹنی منگوائی۔ میں نے سب کھانے بڑی محنت سے طیار کئے ان کو خوش ذائقہ اور خوشبودار بنایا جب سب چیزیں طیار ہوگئیں تو میں نے نوکر کو ہدایت کی روزانہ جو کھانا ہوا کرتا ہے، جب وہ کھایا جا چکے تب یہ کھانے لانا۔ آکر میرا شوہر خوش ہوکر کہہ اُٹھے گا:۔ ”اچھے اچھے کھانے بعد کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔ یہ تو شاہی کھانے ہیں“۔ لیکن جب یہ کھانے لگائے گئے تو اُس نے ان کو ایسی خاموشی کے ساتھ کھایا کہ گویا یہ تو روزانہ ہوا کرتے ہیں۔ اُس کے منھ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ میں بڑے شوق سے اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، مگر وہ تو بالکل خاموش تھا۔ بانس کی پھلیاں تو اُس نے اِس طرح کھائیں جیسے وہ گویا بھی ہے جو کسی کھیت سے منگالی گئی ہے ۔۔ رات کو جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں نے سوچا کہ شاید یہ کھانے اُسے پسند نہیں ہیں، اسی وجہ سے وہ خاموش رہا۔ اور چونکہ وہ خود کبھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کرتا ہے اس لئے میں کسی نوکر کو اُس کی ماں کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجوں کہ اُس کو کونسے کھانے پسند ہیں۔ میں نے یہی کیا۔ اس کی ماں نے جواب دیا کہ ”سمندر پار جانے سے پہلے تو اُسے بطکا بھنا ہوا گوشت جو جنگلی بیر کے سرکہ میں تر کیا گیا ہو پسند تھا۔ لیکن برسوں تک مغربی باشندوں کے وحشیانہ اور کچے پکے کھانے کھانے کے بعد، اُس کو اچھے کھانوں کی کوئی خواہش نہیں رہی“۔

میں یہ سنکر خاموش ہوگئی۔ میرے شوہر نے مجھ سے ابتک کسی چیز کی فرمائش نہیں کی شاید اُس کو کوئی ایسی ضرورت ہی پیش نہیں آئی جس کو میں پورا کرسکوں۔

اِس گھر میں آنے کے کوئی پندرہ دن بعد، ہم لوگ شام کو کمرہ میں بیٹھے تھے۔ میں جس وقت وہاں پہونچی تو میرا شوہر ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ سامنے والے صفحہ پر ایک تصویر تھی جس پر میری نظر پڑی۔ یہ ایک آدمی کی تصویر تھی جو سیدھا کھڑا تھا۔ لیکن میں یہ تصویر دیکھ کر ڈر گئی کیونکہ یہ صرف ڈھانچہ ہی ڈھانچہ تھا اور گوشت کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ مجھے بڑی تکلیف ہوئی کہ وہ اِس قسم کی کتابیں کیوں پڑھتا ہے۔ لیکن میری زبان سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔

میں بید کی عجیب سی کرسی پر جو وہیں پڑی تھی بیٹھ گئی۔ میں سیدھی بیٹھی رہی اور پیچھے کی طرف ٹیک نہیں لگائی کیونکہ کھلی جگہ پر اس طرح بیٹھنا نازیبا سمجھا جاتا ہے مجھے رہ رہ کر اپنی ماں کا گھر یاد آرہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اس وقت لوگ رات کا کھانا کھانے کے لئے جمع ہو رہے ہوں گے ۔۔ میرے باپ کی داشتہ عورتیں اور شور مچانے والے بچے، سب مومی بتی کی ہلکی ہلکی روشنی میں جمع ہوں گے۔ میری ماں اپنی جگہ پر میز کے کنارے بیٹھی نوکروں کو گرم گرم ترکاریاں اور چاول لانے اور سب کے سامنے تیلیاں رکھنے کا حکم دے رہی ہوگی۔ کھانے کے بعد میرا باپ اندر آئے گا اور اپنی داشتہ عورتوں کے بچوں کے ساتھ کچھ دیر کھیلے گا۔ کام ختم کرنے کے بعد سب نوکر صحن میں اپنے اپنے اسٹول پر رات کو بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میری ماں اُسوقت میز پر بیٹھ کر باورچی سے دن بھر کے خرچ کا حساب لیگی اور اُسوقت سرخ بتی کی روشنی اُس پر پڑے گی۔

میں وہاں جانے کے لئے بے قرار تھی ———— میں اس وقت وہاں پھولوں کی کیاری پر ٹہل کر غور کیا کرتی تھی کہ نئے [illegible] نکلنے شروع ہوئے یا نہیں کیونکہ بہار شروع ہوچکی تھی اور یہی زمانہ اُن کے نکلنے کا تھا۔ چاند کے کچھ بلند ہونے کے بعد میری ماں مجھسے ستار لانے کے لئے کہتی اور پھر وہ اپنے پسندیدہ نغمے الاپنا شروع کرتی۔

اِس خیال کے ساتھ ہی میں اپنا ستار لانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ستار کو اُس کے خانہ سے نکالا، جس کے اندر موسیقی کی آٹھ روحوں کی تصویریں سیپی پر کھدی ہوئی ہیں۔ خود ستار میں تاروں کے نیچے طرح طرح کی لکڑیاں لگی ہیں۔ جب تاروں سے سر پھوٹتے ہیں تو اُس وقت اُن سروں میں لکڑیاں اپنے حسین نغموں کا بھی اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہ ستار اور اُس کا خانہ میری دادی کے لئے اُن کے باپ نے اُس وقت خریدا تھا جب پاؤں کے باندھے جانے پر انھوں نے اپنا رونا موقوف کیا تھا۔

میں نے آہستہ سے تاروں پر چوٹ لگائی اور اُس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی غم آگیں آواز پیدا ہوئی۔ یہ میرا خاندانی ستار ہے اور اس کو چاندنی رات میں خاموش

پانی کے کنارے کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ کر بجانا چاہئے۔ اُس وقت اس کے نغمے زیادہ میٹھے اور سریلے ہوتے ہیں۔ لیکن اس نامانوس اور سنسان کمرے میں اُس کی آواز بھی کمزور نکل رہی تھی۔ پہلے میں نے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن پھر میں نے سنگ کے زمانہ کا ایک پرانا نغمہ شروع کیا۔ میرے شوہر نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔

"یہ تو بہت اچھا نغمہ ہے" اُس نے کہا "مجھ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم یہ بھی جانتی ہو۔ میں تم کو کچھ دنوں میں پیانو خرید دوں گا اور تم مغربی موسیقی بھی سیکھ لینا۔" اور پھر اُس نے کتاب پڑھنا شروع کر دیا۔

وہ موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا اور میں اُس کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ ستار بجا رہی تھی اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت میں کیا بجا رہی ہوں میں نے پیانو کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں یہ بدیشی چیز لے کر کیا کروں گی؟ پھر یکایک میری اُنگلیاں رک جاتی ہیں، میں ستار ایک طرف رکھ دیتی ہوں اور سر جھکا کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی ہوں — میرا شوہر بڑی دیر کے بعد اپنی کتاب بند کر کے میری طرف متوجہ ہوتا ہے۔

"کیوی لین" اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

میرا دل اُچھل پڑا۔ آج پہلا موقعہ تھا جبکہ اُس نے نام لے کر مجھ کو پکارا ہے۔ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ میں نے شرمیلے پن کے ساتھ اپنی نظریں اُٹھائیں۔

"شادی کے بعد سے برابر میرا جی چاہتا ہے کہ میں تم سے پیر کھول ڈالنے کی استدعا کروں۔ یہ تمھارے سارے جسم کے لئے بیحد مضر ہے۔ دیکھو تمھاری ہڈیاں اس طرح کی معلوم ہوتی ہیں۔"

اس نے پنسل اُٹھائی اور اپنی کتاب کے ورق پر پیر کی ایک ٹیڑھی میڑھی سی تصویر بنا دی جو بالکل میرے پیر کی نقل تھی۔ اُس کو میرے پیر کی شکل کیسے معلوم ہوئی؟ میں نے تو آج تک اُس کی موجودگی میں جوتے بھی نہیں پہنے تھے۔ ہم چینی عورتیں کبھی کسی کے سامنے اپنا پیر نہیں کھولتے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی ہم لوگ موزے پہنے رہتے ہیں۔

"تم کو یہ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ میں ڈاکٹر ہوں۔ اور مغرب میں میں نے یہ سیکھا ہے" اس نے جواب دیا۔ "اچھا تو میں تم سے استدعا کرتا ہوں کہ ان کو کھول ڈالو کیونکہ یہ خوبصورت بھی نہیں معلوم ہوتے اور پھر اب پیر باندھنا فیشن میں بھی تو داخل نہیں رہا۔ اس کا تم پر کچھ اثر ہوتا ہے"۔ اُس نے مسکرا کر مجھے دیکھا، اُس کی نظروں میں مہربانی تھی۔ لیکن میں نے جلدی سے اپنے پیر کرسی کے نیچے چھپا لئے۔ میں اُس کے الفاظ سن کر اچنبھے میں پڑ گئی تھی۔ کیا میرے پیر واقعتاً خوبصورت نہیں ہیں؟ مجھ کو تو اب تک ان پر بڑا ناز رہا ہے۔ میرے بچپن کے زمانہ میں میری ماں نے ہمیشہ میرے پاؤں کی خود دیکھ بھال کی اور اُن کی بندش کی مضبوطی روزانہ بڑھائی گئی۔ جب میں درد کے مارے چیخنے لگتی تو وہ کہتی کہ اسی کی بدولت ایک دن تمھارا شوہر تمھارے پیروں کے حسن کی تعریف کرے گا۔

میں نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے اپنا منہ پھیر لیا۔ مجھ کو اس وقت وہ دن اور وہ راتیں یاد آرہی تھیں جب مارے تکلیف کے میں تڑپا کرتی تھی، نہ کھانے کو جی چاہتا تھا اور نہ کھیلنے کو۔ میں اپنے پلنگ کے کنارے بیٹھ کر پیر کو ہلاتی رہتی تاکہ اس سے خون کا بوجھ کچھ کم ہو اور ذرا سا سکون ہو جائے۔ اور اتنے دنوں تک مصیبت برداشت کرنے کے بعد جب ادھر کچھ دنوں سے تکلیف کم ہوئی ہے تو آج معلوم ہوا کہ وہ خوبصورت نہیں ہیں۔

"نہیں، میں یہ نہیں کر سکتی" میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں نے یہ انکار اس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنے پیروں کی زیادہ پرواہ تھی۔ بلکہ میں نے سوچا کہ حسین پھول دار جوتوں میں پڑے ہوئے پیر جب اُس کی محبت نہ حاصل کر سکے تو پھر اب اس کی کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ کبھی مجھ سے محبت کرے گا۔

چینیوں کے دستور کے مطابق، دو ہفتہ کے بعد میں اپنے گھر پہلی بار روانہ ہوئی۔ میرے شوہر نے پھر پیر کھولنے کے متعلق دوبارہ کچھ نہیں کہا اور نہ پھر اُس نے مجھے نام لیکر پکارا ہی۔

تم پریشان تو نہیں ہو رہی ہو میری بہن؟ اچھا تو میں پھر شروع کرتی ہوں:—

مجھ کو رخصت ہوئے اگرچہ زیادہ دن نہیں گذرے تھے مگر مجھ کو تو محسوس ہوتا تھا کہ چاند اس عرصہ میں اپنی گردش سیکڑوں بار پوری کر چکا ہے۔ رخصت ہوتے وقت میں کچھ کم پُرامید نہ تھی اور خوفزدہ بھی تھی اور اب بیاہی عورت کی حیثیت سے میں واپس آئی ہوں، جب میری چوٹی جوڑے میں تبدیل ہو چکی ہے اور میری پیشانی بالوں سے پاک ہو گئی ہے جو کتخدائی کی نشانی ہے — تب بھی میں کم و بیش پہلے ہی جیسی لڑکی ہوں، پہلے سے زیادہ خوفزدہ، زیادہ تنہا اور کم پرامید۔

میری ماں اپنے عصا پر جھکی ہوئی پہلے صحن تک میرے استقبال کے لئے آئی۔ مجھ کو وہ پہلے سے کچھ زیادہ پریشان نظر آئی، یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اُس

آج زیادہ عرصہ کے بعد دیکھا تھا۔ بہرحال اُس کی آنکھوں کی غم انگیزی کے اضافہ نے مجھے اُس سے اور بھی قریب تر کر دیا۔ اُس کے سامنے سرخم کرنے کے بعد میں نے اُس کے ہاتھ بھی اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور خود اُس نے بھی آہستہ سے میرے ہاتھ دبائے۔ ہم لوگ ایک ساتھ زنانہ مکان کے صحن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آہ! میں بھی کس قدر حریصانہ انداز میں ہر چیز کو دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ ہر چیز میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوگی مگر نہیں ہر چیز صحن میں پہلے کی طرح اپنی جگہ پر تھی، سوا اس کے کہ جب داشتہ عورتوں، اُن کے بچوں اور نوکروں نے مجھے دیکھا تو وہ سب ہنستے اور چلاتے ہوئے میرے گرد جمع ہو گئے۔ اوائل خزاں کا سورج پھول کی دیواروں پر چمک رہا تھا، صحن کے پتھروں کو جگمگا رہا تھا اور تمام جھاڑیوں اور تالاب پر اُس کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمروں کے جنوبی حصہ کے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھول دی گئی تھیں تاکہ گرمی اور دھوپ وہاں تک پہونچ سکے چنانچہ آفتاب کی کرنیں چھت کی رنگین اور نقشی کڑیوں تک پہونچ رہی تھیں۔ اگرچہ مجھ کو اس کا پورا احساس تھا کہ اب میرے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں رہی لیکن اس کے باوجود میری روح اپنے حقیقی آشیانے میں خوش تھی۔

میں صرف ایک کمی محسوس کر رہی تھی۔

"تیسری داشتہ کہاں ہے؟" میں نے اپنی ماں سے سوال کیا

میری ماں نے ایک لونڈی کو حقہ بھرنے کے لئے آواز دیتے ہوئے کہا:۔ "تم نے لامے کے متعلق سوال کیا تھا؟ ہاں میں نے اُسے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے دیہات بھیج دیا ہے۔

اُس کے انداز سے میں سمجھ گئی کہ زیادہ سوال کرنا بے سود ہے اور شام کو جب میں اپنے پرانے بچپن والے کمرے میں سونے کا انتظام کر رہی تھی تو پہلے کی طرح وانگ ڈاما میرے بالوں میں برش کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے اور باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلایا کہ میرا باپ ایک چوتھی داشتہ کا اضافہ کرنے والا ہے۔ جو پیکنگ کی ایک رقاصہ ہے اور جس نے جاپان میں تعلیم حاصل کی ہے اور میرے باپ کی تیسری داشتہ کو اس بات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے تو جان ہی دیدینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ ہیرے کی جو انگوٹھی پہنے ہوئے تھی، اُس کا نگ وہ کھا گئی اور دو دن تک کسی کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔

بالآخر میری ماں کو اس کا پتہ چلا۔ اُس نے ایک ڈاکٹر کو بلوایا جس نے اُس کی کلائی اور اُس کے ٹخنوں میں سوئیاں بھوکیں لیکن اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہو سکا۔ ایک پڑوسی نے ولایتی اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر میری ماں اس کے لئے مستعد نہ ہوئی کیونکہ ہم لوگوں کو ولایتی آدمیوں کا کچھ حال نہیں معلوم اور اس کے علاوہ کسی غیر ملکی آدمی کو یہ کیونکر پتہ چل سکتا ہے کہ چینی کو کیا مرض ہے؟ غیر ملکی ڈاکٹر اپنے لوگوں کا مرض سمجھ سکتے ہیں جو متمدن اور پر پیچ چینیوں کے مقابلہ میں وحشی اور سادہ ہوتے ہیں۔ اتفاقاً اُس وقت میرا بھائی بھی گھر پر "آٹھویں چاند" کا تہوار منانے آیا تھا، وہ خود جاکر ایک ولایتی ڈاکٹرنی کو بلا لایا۔

ڈاکٹرنی اپنے ساتھ ایک عجیب سا اوزار لائی، جس میں ایک لمبی سی نلی لگی تھی۔ اور اُس اوزار کو اُس نے مریض کے حلق میں گھسیڑ دیا اور اُسی کے ساتھ نگ باہر آگیا۔ ہر شخص سوا اُس ڈاکٹرنی کے اس بات پر بیحد متعجب تھا۔ ڈاکٹرنی نے خاموشی کے ساتھ اپنا اوزار اُٹھایا اور باہر چلی گئی، جیسے یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔

دوسری داشتہ عورتیں اُس سے بیحد خفا تھیں کہ اُس نے اتنی قیمتی چیز کیوں برباد کی۔ چنانچہ موٹی عورت نے کہا:۔

"اس سے اچھا تھا کہ تم دیاسلائی کی تیلیوں کو چبا لیتیں جو ایک پیسہ میں بہت سی ملتی ہیں"

لیکن اُس نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب اُس کی حالت آہستہ آہستہ روبہ اصلاح تھی لیکن اِس عرصہ میں کسی نے اُس کو کھاتے پیتے یا باتیں کرتے نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت پردے ڈالے ہوئے پلنگ پر پڑی رہتی۔ اُس کو اپنی ناکامی کا بڑا صدمہ تھا اور اُس کا چہرہ بالکل اُتر گیا تھا۔ میری ماں کو اُس پر بہت ترس آیا اور اُس نے اُس کو باہر بھیجدیا تاکہ لوگوں کے طنز سے وہ محفوظ رہے۔

یہ چھوٹی سی بات تھی اسی وجہ سے میری ماں نے شاید اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ مگر چونکہ مجھے اس گھر سے بیحد اُنس ہے اس لئے میں نے سارا قصہ تفصیل کے ساتھ وانگ ڈاما سے سنا۔ یہ ہمارے گھر کی پرانی خادمہ تھی اور اُس کو ہم سب لوگوں کا دل و دماغ سمجھا جاتا تھا۔ وہ دراصل میری ماں کے ساتھ شان سی سے اُس کی شادی کے وقت آئی تھی۔ اُس نے میری ماں کے سب لڑکوں کو کھلایا ہے اور اب جب میرے بھائی کی شادی ہوگی اور اُس کے بچہ ہوگا تو اُس کو بھی یہی کھلائے گی۔

میں نے اپنی خادمہ سے جو قصے سنے اُن میں ایک بات بہت اہم تھی اور وہ یہ کہ میرے بھائی نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری ماں نے اس کا بھی مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور وانگ ڈاما صبح کے وقت جب میرے منھ دھونے کے لئے گرم پانی لائی تو اُس نے بتلایا کہ پہلے تو میرا باپ اپنے لڑکے کے اس خیال پر بہت ہنسا کیں

پھر وہ بھی اس کے لئے بالآخر تیار ہو ہی گیا کہ وہ امریکہ پڑھنے کے لئے جائے۔ کیونکہ اب تو باہر پڑھنے جانا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ میری ماں نے جب میرے باپ کے فیصلہ کو سُنا تو وہ بہت رنجیدہ ہوئی اور شاید اتنا صدمہ اُس کو اُس وقت بھی نہیں ہوا تھا جب میرے باپ نے پہلی داشتہ عورت کے ساتھ شادی کی تھی۔ اُس نے تین دن تک نہ تو کچھ کھایا اور نہ کسی سے بولی لیکن میرے بھائی پر جب اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور کسی طرح وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آیا تو میری ماں نے کوشش کی کہ جانے سے پہلے وہ اپنی منسوبہ کے ساتھ شادی کرے۔ میری ماں نے کہا کہ "تم شاید اس سے انکار نہ کر سکو گے کہ تمہارا گوشت و خون صرف تمہارا ہی گوشت و خون نہیں بلکہ اس پر دوسروں کو بھی حق حاصل ہے۔ اب جب کہ سب کی مرضی کے خلاف تم نے وحشی ملک میں جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو جانے سے پہلے اپنی منسوبہ کے ساتھ شادی کر لو اور اپنے اجداد کے اُس پاک ورثہ کو جو تمہاری پشت میں محفوظ ہے دوسرے کے جسم میں منتقل کر دو تاکہ سلسلۂ نسل جاری رہے۔ اور اگر خدانخواستہ تم وہاں مر جاؤ تو میں اپنے پوتے ہی کو دیکھ کر سکون حاصل کر لیا کروں گی"۔

میرے بھائی نے جواب دیا :- "شادی کی مجھے کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں تو زندگی میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پیاری ماں، میں وہاں مر نہ جاؤں گا اور آپ کے پاس صحیح و سالم واپس آؤں گا۔ میں جب واپس آؤں گا تو پھر ——"

اس جواب کے بعد میری ماں نے اپنے شوہر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اپنے لڑکے کو کسی طرح شادی کے لئے طیار کرے، لیکن وہ بہت ہی لاپرواہ قسم کا انسان تھا، اور اُس وقت اپنی نئی داشتہ کا معاملہ طے کر رہا تھا، اُس کو ان باتوں کی کہاں فرصت تھی۔ بالآخر میرا بھائی یوں ہی کنوارا امریکہ چلا گیا۔

مجھ کو اپنی ماں کے ساتھ ہمدردی تھی۔ میرا باپ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور اس طرح سے میرا بھائی ہے۔ اگر خدانخواستہ کچھ ہوا تو نسل ہی منقطع ہو جائے گی چونکہ میری ماں کے اور لڑکے بچپن ہی میں داغ دے چکے تھے اس لئے یہ میرے بھائی کا فرض تھا کہ جلد سے جلد شادی کر کے اولاد پیدا کرے تاکہ میری ماں اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر میرے اجداد کی روح کے سامنے سرخرو ہو۔ وہ بچپن ہی سے خاندان لی کی لڑکی کے ساتھ منسوب ہو چکا ہے۔ میں نے خود لڑکی کو نہیں دیکھا ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ خوبصورت نہیں ہے۔ لیکن اُس کی بدصورتی کی میری ماں کی خواہش کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں۔

کئی دن تک مجھے اپنے بھائی کی اس نافرمانی کی بڑی تکلیف رہی۔ میری ماں نے اس کا مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اس غم کو بھی اپنی روح کی گہرائی میں دفن کر لیا۔ یہ اُس کی عادت تھی کہ جب کوئی مصیبت آ ہی جاتی تو اُس کا وہ خاموشی کے ساتھ مقابلہ کرتی اور لبوں کو سی لیتی۔ چنانچہ میں بھی جانی پہچانی صورتوں اور پرانے در و دیوار کی فضا میں اپنی ماں کا غم آگیں اور پر سکوت چہرہ دیکھنے کی عادی ہو گئی۔

گھر بھر کی آنکھیں جو سوال مجھ سے کر رہی تھیں وہ وہی تھا جس سے میں ڈر رہی تھی —— میں ماں بننے والی ہوں یا نہیں ؟ لوگ مجھ سے سوال کرتے اور میں خوبصورتی کے ساتھ سر کے اشارے سے ٹال جاتی۔ میں نے یہ چھپانے کی پوری کوشش کی کہ میرا شوہر میری پرواہ نہیں کرتا ہے۔ لیکن میں اپنی ماں کو دھوکا نہیں دے سکی۔

گھر جانے کے ساتویں دن میں اُس دروازے کے قریب بیٹھی تھی جو صحن کے سامنے تھا۔ شام ہو رہی تھی اور سب نوکرات کے کھانے کے انتظام میں مشغول تھے۔ ہوا میں مچھلی اور بطے کے گوشت کے بھونے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور فضا گل داؤدی کی خوشبو سے معطر تھی۔ میرے اندر گھر کی اور قدیم گرد و پیش کی محبت جوش مار رہی تھی۔ میں بڑی محبت کے ساتھ ہر ایک نقش و نگار پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور اُس جگہ آپ اپنے کو بالکل محفوظ پا رہی تھی جہاں میرا بچپن اس طرح گزرا تھا کہ اُس کے گزرنے کا مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس جگہ کی ہر چیز سے اُنس تھا، شام کی خاموش تاریکی سے جو آہستہ آہستہ گھر کی ترچھی چھتوں پر قبضہ جماتی، اُس مومی روشنی سے جو کمروں کو منور کرتی کھانے کی خوشبو سے، بچوں کی چلاہٹ سے اور اُن کے جوتوں کی نرم آواز سے جو زمین پر جوتوں کے پڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ آہ ! میں قدیم چینی گھرانے کی بیٹی ہوں، جہاں پُرانا طریقہ، پُرانا فرنیچر اور پُرانے مضبوط اور قدیم رشتے پائے جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہاں کس طرح زندگی گزاری جاتی ہے۔

پھر مجھے اپنا شوہر یاد آیا جو اپنے بدوضع مکان میں میز کے قریب اپنے ولایتی انداز کے کپڑے پہنے اس وقت بیٹھا ہوگا۔ وہ ہر طرح سے بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ میں اُس کی اس زندگی کے ساتھ کیسے میل کھا سکتی ہوں ؟ اُس کو تو میری کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میرا دل بھر آیا، میں اپنے کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگی، میں نے کبھی بھی اپنے کو اس قدر تنہا نہیں محسوس کیا تھا۔ اب مستقبل میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اُس میں سوا تلخی اور کچھ نہ تھا۔ میں نے تاریکی کی سمت سے اپنی آنکھیں پھیریں اور میرے گالوں پر دھیمی دھیمی روشنی پڑنے لگی۔ اتنے میں کھانے کی گھنٹی بجی اور میں اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کھانے کے کمرے میں اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

میری ماں آج معمول سے کچھ پہلے اپنے کمرے میں چلی گئی اور داشتہ عورتیں بھی اپنی اپنی کوٹھریوں میں داخل ہو گئیں۔ میں اکیلی بیٹھی چا پی رہی تھی کہ وانگ ڈا نمودار

ہوئی اور کہا کہ:-

"تمہاری محترم ماں تم کو یاد کر رہی ہیں"

"لیکن انھوں نے تو کہا تھا کہ وہ سونے جا رہی ہیں" میں نے سوال کیا۔

"نہیں میں تو وہیں سے آ رہی ہوں" اُس نے جواب دیا "انھوں نے تم کو بلایا ہے"

خادمہ صحن کی طرف چلی گئی اور میں آہستہ سے پردہ سرکا کر ماں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خاموشی کے ساتھ بستر پر پڑی تھی ایک میز پر اُس کی بغل میں لمبی سی ایک بتی جل رہی تھی۔ میں نے اس طرح سے اُس کو کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لئے مجھے کچھ تعجب بھی ہوا۔ وہ بالکل کمزور اور زرد معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور لب کچھ لٹکے ہوئے سے تھے۔ میں آہستہ سے جا کر بستر کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرہ پر کوئی رنگ نہ تھا، بالکل سنجیدہ، نازک اور غم آگیں چہرہ۔

"ماں" میں نے آہستہ سے کہا

"بیٹی" اُس نے بھی اسی طرح جواب دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے بیٹھنے کو کہہ رہی ہے یا کھڑے رہنے کو۔ پھر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا حکم دیا — میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئی میں دل میں سوچا کہ شاید وہ میرے بھائی کے خیال سے پریشان ہے جو پردیس میں پڑا ہوا ہے۔

لیکن وہ میرے بھائی کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اُس نے اپنا چہرہ میری طرف پھیرا اور آہستہ سے کہا:-

"بیٹی! میرا خیال ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔ جب سے تم واپس آئی ہو میں محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری اگلی سی آسودگی تم سے رخصت ہو چکی ہے۔ تمہاری روح مضطرب رہا کرتی ہے اور تمہاری آنکھوں میں بہت جلد آنسو آ جایا کرتے ہیں۔ اگرچہ تمہارے لب خاموش ہیں مگر صاف پتہ چلتا ہے کہ کوئی غم ہے جو ہر وقت اندر ہی تمہارے دل سے ہم آغوش رہتا ہے۔ یہ قصہ کیا ہے؟ اگر تم کو اس کا دکھ ہے کہ اب تک تم حاملہ نہیں ہوئیں۔ تو صبر کرو ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ میں نے شادی کے دو سال بعد تمہارے باپ کو بچہ کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح اپنے غم کا اظہار کروں۔ ریشمی پردے کا ایک تار میرے قریب لٹک رہا تھا اور میں اُسی سے کھیل رہی تھی اور خاموش تھی۔ خیالات کا میرے دماغ میں ایک ہجوم سا تھا۔

"بولو" میری ماں نے کچھ تحکمانہ انداز سے کہا۔

میں نے اُس کی طرف نظریں اُٹھائیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور میں کچھ نہ بول سکی۔ اُن کی موجیں بڑھتی گئیں۔ میری سانس پھولنے لگی اور میں نے سسکیاں لینی شروع کیں۔ میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا اور اپنا چہرہ ماں کی آغوش میں چھپا لیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے" میں نے روتے ہوئے کہا "وہ کہتا ہے کہ تم میرے برابر ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اُس کو میرے پیروں سے نفرت ہے اور اُن کی تصویر کھینچتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اُس نے میرے پیر کیسے دیکھے جبکہ آج تک میں نے اپنا پیر کبھی بھی اُس کے سامنے کھولا نہیں ہے"

"اُس کے برابر؟" میری ماں اُٹھ بیٹھی اور سوال کیا "اس سے اُس کا کیا مطلب ہے؟ تم اپنے شوہر کے برابر کیونکر ہو سکتی ہو؟"

"مغرب میں عورتیں" میری آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

"ہاں" میری ماں نے کہا "ہم لوگ تو یہاں کے رہنے والے ہیں۔ اور تمہارے پیر کی تصویر کیوں اُتارتا ہے؟ کیا مطلب کیا ہے؟"

"یہ بتلانے کے لئے کہ میرے پیر بدصورت ہیں" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے پیر؟ میں نے تم کو بیس جوڑ جوتے دئے ہیں، یقیناً تم نے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام نہ لیا ہوگا"

"وہ میری ہڈیوں کا خاکہ اُتارتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ٹیڑھی ہیں"

"عورت کے پیر کی ہڈی آج تک کسی نے بھلا دیکھی ہے؟ کس کی آنکھیں گوشت کے اندر گھس سکتی ہیں؟"

"وہ کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر ہوں، مجھے اندر کا حال معلوم ہے"

"میری بدنصیب بیٹی!" اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "تو کیا وہ مغرب کے جادو سے بھی واقف ہے؟"

"اُس کو تو اس کی پروا نہیں ہے کہ میرے بچہ ہو۔ اُس کو مجھ سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے۔ میری پیاری ماں میں تو اب تک کنواری ہوں"

پھر خاموشی چھا گئی اور میں نے اپنا چہرہ ماں کی آغوش میں چھپا لیا۔ میں نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے سر پر محسوس کیا جو دیر تک وہیں رکھا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھی اور کہنے لگی:-

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمھاری تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں۔ مجھکو یقین ہے کہ کوئی شریف چینی مرد تم سے ناخوش نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمھاری شادی کسی وحشی کے ساتھ ہوئی ہو؟ وہ تو لگنگ خاندان کا فرد ہے۔ اُس پر تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اُس کے پردیس میں برسوں رہنے کا قصور ہے۔ اس خیال سے میں تمھارے بھائی کے وہاں جانے سے پہلے اُس کا مرجانا بہتر سمجھتی تھی" اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور پھر لیٹ گئی۔ جب اُس نے پھر بولنا شروع کیا تو اُس کی آواز سے نرمی ٹپک رہی تھی۔

"بیٹی! اس دنیا میں عورت کے لئے بہرحال ایک اور صرف ایک راستہ ہے جس پر وہ چل سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اُسے اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح خوش رکھنا چاہئے۔ مجھے اس کا بیحد دکھ ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ جتنی محنت کی تھی سب اکارت جا رہی ہے۔ اب میرے خاندان سے تم کو کوئی تعلق نہیں رہا اور تم اپنے شوہر کی ہو چکیں۔ اب سوا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ تم اپنے شوہر کو خوش کرو۔ اچھا تم ایکبار اُس کو ہاتھ میں لینے کی پھر کوشش کرو۔ گہرے سبز اور سیاہ کپڑے پہنو عطر درکنول کا پانی استعمال کرو۔ لبوں کی خفیف جنبش کے ساتھ مسکرایا کرو جس میں کچھ شرم کا بھی پہلو ہو۔ تم اُس کے ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے کر اُن کو آہستہ سے دباؤ۔ اگر وہ ہنسے تو تم بھی خوش ہو۔ اور اگر اب بھی وہ خوش نہ ہو تو اُس کی مرضی کے آگے سر جھکا دو"

"کیا میں اپنے پیر بھی کھول ڈالوں؟" میں نے آہستہ سے سوال کیا۔ میری ماں نے کچھ دیر سوچا۔

"ہاں" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "یقیناً کھول ڈالو۔ اب زمانہ بدل گیا ہے"

اچھا تم اب جاؤ

محمد عتیق صدیقی

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دنیا: اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

الہامات شاد: شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت علاوہ محصول آٹھ آنہ

اقبال کی شاعری: یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنہ علاوہ محصول۔

مقام محمود: مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ

قیمت پانچ روپیہ (عہ) علاوہ محصول

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

"نگار" کے بعض خاص نمبروں کے متعلق ضروری اعلان

نگار جنوری ۱۹۳۳ء (غالب نمبر) اب چار روپیہ فی کاپی کے حساب سے ملے گا۔ اور نگار جنوری ۱۹۳۵ء (اُردو شاعری نمبر) اور نگار جنوری ۱۹۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی، اُن کے لئے ہم دوسروں سے خرید کر فراہم کر سکیں گے لیکن قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہو سکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔

نگار جنوری ۱۹۳۸ء (تاریخ اسلامی ہند) کی قیمت اب تین روپیہ فی کاپی اور نگار جنوری ۱۹۳۹ء (اصحاب کہف ڈراما) کی قیمت دو روپیہ فی کاپی ہو جائے گی۔

سرورق کے آخری صفحہ پر جو قیمتیں نگار میں درج ہیں انھیں منسوخ سمجھا جائے۔

جنوری ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۲ء تک کے جنوری نمبر جو پاس ہیں وہ ابھی طلب فرمالیں، ورنہ چند دن کے بعد ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مینجر نگار

باب الاستفسار

فلکیات کے بعض مسائل

(جناب سید حیدر رضا صاحب - پالن پور)

اس سے قبل نگار میں فلکیات کے متعلق بڑے اچھے اچھے مقالے شایع ہوئے ہیں، لیکن اب کچھ عرصہ سے یہ سلسلہ بند ہے۔ میری رائے میں کبھی کبھی اس قسم کے مضامین شایع ہوتے رہنا چاہئے، کیونکہ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور دلچسپ تو خیر یہ موضوع اتنا ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ بہرحال، اس وقت میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آسمان کا رنگ نیلگوں کیوں نظر آتا ہے اور آفتاب صبح و شام یا بادل اور کہر کے اندر کیوں سرخ رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ کیا آپ تکلیف فرما کر اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے؟

(**نگار**) اس سے قبل نگار میں فلکیات پر اتنے مقالے شایع ہو چکے ہیں کہ اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو اس موضوع پر اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ اس فن پر تحقیقی کام برابر جاری ہے، اس لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہی رہتی ہے اور نگار میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ آپ کے ان دو سوالوں کا جواب نگار کے پچھلے فایل میں کہیں مل سکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ آفتاب کا اصلی رنگ کیا ہے اور اسکی شعاعوں میں انکسار ہونے کے بعد کیا کیا رنگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ میں آپ کے دوسرے سوال پر بھی غور کروں گا۔

اگر ہم سات میل فی ثانیہ کی رفتار سے فضا میں بلند ہو سکیں تو ایک خاص مقام پر پہونچ کر ہم دو باتیں محسوس کریں گے ایک یہ کہ زمین کے دائرۂ کشش سے نکل کر سورج کے دائرۂ کشش میں آگئے ہیں یعنی خود بخود سورج کی طرف کھنچے جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ سورج کی روشنی کا مفہوم جو کچھ ہم نے سمجھ رکھا ہے وہ بالکل غلط ہے ہم اس رفتار سے چند سکنڈ پرواز کرنے کے بعد ہی، فضائی روشنی میں عجیب و غریب تغیرات محسوس کرنے لگیں گے۔ یعنی وہ آسمان جو ہمیں نیلا نظر آتا ہے بلندی پر پہونچنے کے بعد تاریک دکھائی دے گا یہاں تک کہ اور زیادہ بلندی پر وہ بالکل شب دیجور نظر آئے گا اور سورج بالکل ایسا معلوم ہوگا جیسے لوہے کے توے کو سفید ہونے کی حد تک گرم کیا جائے۔ ایسا کیوں ہے، اس کی علمی توجیہ بھی سن لیجئے:

اگر آپ نے دریا کے کنارے کسی پل کے اوپر سے پانی کے دھارے کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جب کوئی بڑی ہر پل کے پایہ سے ٹکراتی ہے تو وہ پیچھے ٹکرا کر آگے بڑھتی ہے اور دونوں جسے پھر ایک ہو جاتی ہیں، لیکن چھوٹی لہریں ٹکرا کر چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں۔ بالکل یہی حال سورج کی روشنی کا ہے۔ وہ جب زمین کی طرف بڑھتی ہے تو فضا میں حجابات و موانع سے اس کو ویسا ہی مقابلہ کرنا پڑتا ہے جیسا دریا کی لہر کو پل کے پایہ کا۔ چونکہ آپ کو علم ہی ہے کہ سورج کی روشنی بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہے جو قوس قزح میں ہم کو الگ الگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سورج کی روشنی میں لہریں ہوتی ہیں اور لہروں کی لمبائی کے لحاظ سے رنگ پیدا ہوتے ہیں مثلاً لمبی لہروں سے سرخ یا گہرا سنہرا رنگ ظاہر ہوتا ہے اور چھوٹی لہروں سے نیلا رنگ۔

پھر جس وقت سورج کی روشنی فضا کے حجابات و موانع سے ٹکراتی ہے تو وہ ہم تک جوں کی توں پہونچ جاتی ہے۔ اس کی لمبی لہریں جن سے سرخ روشنی پیدا ہوتی ہے متاثر نہیں ہوتیں، لیکن چھوٹی لہریں جن سے نیلا رنگ پیدا ہوتا ہے چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں اور اسی لئے ہمیں آسمان نیلا نظر آتا ہے۔ گویا یہ رنگ آسمان کا نہیں بلکہ روشنی کی ان چھوٹی چھوٹی لہروں کا ہے، جو فضا میں منتشر ہو کر چاروں طرف پھیل گئی ہیں اور جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو ہم اس کی سرخ لہروں سے دوچار ہوتے ہیں۔ سطح پڑتا ہے

"میری بدنصیب بیٹی!" اُس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا "تو کیا وہ مغرب کے جادو سے بھی واقف ہے؟"

"اُس کو تو اس کی پروا نہیں ہے کہ میرے بچہ ہو۔ اُس کو مجھ سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے۔ میری پیاری ماں میں تو اب تک کنواری ہوں"

پھر خاموشی چھا گئی اور میں نے اپنا چہرہ ماں کی آغوش میں چھپا لیا۔ میں نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے سر پر محسوس کیا جو دیر تک وہیں رکھا رہا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھی اور کہنے لگی:-

"میرا خیال ہے کہ میں نے تمھاری تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ کوئی شریف چینی مرد تم سے ناخوش نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تمھاری شادی کسی وحشی کے ساتھ ہوئی ہو؟ وہ تو لنگ خاندان کا فرد ہے۔ اُس پر تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ اُس کے پردیس میں برسوں رہنے کا قصور ہے۔ اس خیال سے میں تمھارے بھائی کے وہاں جانے سے پہلے اُس کا مرجانا بہتر سمجھتی تھی" اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر لیٹ گئی۔ جب اُس نے پھر بولنا شروع کیا تو اُس کی آواز سے ناامیدی ٹپک رہی تھی۔

"بیٹی! اس دنیا میں عورت کے لئے بہرحال ایک اور صرف ایک راستہ ہے جس پر وہ چل سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اُسے اپنے شوہر کو کسی نہ کسی طرح خوش رکھنا چاہئے۔ اس کا بیحد دکھ ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ جتنی محنت کی تھی سب اکارت جا رہی ہے۔ اب میرے خاندان سے تم کو کوئی تعلق نہیں رہا اور تم اپنے شوہر کی ہو چکیں اب سوا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ تم اپنے شوہر کو خوش کرو۔ اچھا تم ایکبار اُس کو ہاتھ میں لینے کی پھر کوشش کرو۔ گہرے سبز اور سیاہ کپڑے پہنو عطر اور کنول کا پانی استعمال کرو۔ لبوں کی خفیف جنبش کے ساتھ مسکرایا کرو، جس میں کچھ شرم کا بھی پہلو ہو۔ تم اُس کے ہاتھ میں لے کر اُن کو آہستہ سے دباؤ۔ اگر وہ ہنسے تو تم بھی خوش ہو۔ اور اگر اب بھی وہ خوش نہ ہو تو اُس کی مرضی کے آگے سر جھکا دو"

"کیا میں اپنے پیر بھی کھول ڈالوں؟" میں نے آہستہ سے سوال کیا۔ میری ماں نے کچھ دیر سوچا۔

"ہاں" اُس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا "یقیناً کھول ڈالو، اب زمانہ بدل گیا ہے"

اچھا تم اب جاؤ

محمد عتیق صدیقی

باب الاستفسار

فلکیات کے بعض مسائل

(جناب سید حمید رہنما صاحب - پالن پور)

اس سے قبل نگار میں فلکیات سے متعلق بڑے اچھے اچھے مقالے شایع ہوئے ہیں، لیکن اب کچھ عرصہ سے یہ سلسلہ بند ہے۔ میری رائے میں کبھی کبھی اس قسم کے مضامین شایع ہوتے رہنا چاہئے، کیونکہ ان سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور دلچسپ تو غیر یہ موضوع اتنا ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ بہرحال، اس وقت میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آسمان کا رنگ نیلگوں کیوں نظر آتا ہے اور آفتاب صبح و شام یا بادل اور کہر کے اندر کیوں سرخ رنگ کا دکھائی دیتا ہے۔ کیا آپ تکلیف فرما کر اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے؟۔

(**نگار**) اس سے قبل نگار میں فلکیات پر اتنے مقالے شایع ہو چکے ہیں کہ اگر ان کو یکجا کر دیا جائے تو اس موضوع پر اچھی خاصی کتاب مرتب ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ اس فن پر تحقیقی کام برابر جاری ہے، اس لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہی رہتی ہے اور نگار میں بھی وقتاً فوقتاً ان کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ آپ کے ان دو سوالوں کا جواب نگار کے پچھلے فایل میں کہیں مل سکتا ہے یا نہیں۔ اس لئے میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ آفتاب کا اصلی رنگ کیا ہے اور اس کی شعاعوں میں انکسار ہونے کے بعد کیا کیا رنگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ میں آپ کے دوسرے سوال پر بھی غور کروں گا۔

اگر ہم سیارہ میں فی ساعت ... کی رفتار سے فضا میں بلند ہو سکیں تو ایک خاص مقام پر پہونچ کر ہم دو باتیں محسوس کریں گے ایک یہ کہ زمین کے دائرۂ کشش سے نکل کر سورج کے دائرۂ کشش میں آ گئے ہیں یعنی خود بخود سورج کی طرف کھنچے جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ سورج کی روشنی کا مفہوم جو کچھ ہم نے سمجھ رکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ ہم اس رفتار سے چند سکنڈ پرواز کرنے کے بعد ہی فضائی روشنی میں عجیب و غریب تغیرات محسوس کرنے لگیں گے یعنی وہ آسمان جو ہمیں نیلا نظر آتا ہے بلندی پر پہونچنے کے بعد تاریک دکھائی دے گا یہاں تک کہ اور زیادہ بلندی پر وہ بالکل شب دیجور نظر آئے گا اور سورج بالکل ایسا معلوم ہوگا جیسے لوہے کے توے کو سفید ہونے کی حد تک گرم کیا جائے۔ ایسا کیوں ہے، اس کی علمی توجیہ بھی سن لیجئے:

اگر آپ نے دریا کے کنارے کسی پل کے اوپر سے پانی کے دھارے کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ جب کوئی بڑی لہر پل کے پایہ سے ٹکراتی ہے تو وہ بچ نکل کر آگے بڑھتی ہے اور دونوں جانب پھر ایک ہو جاتی ہیں، لیکن چھوٹی لہریں ٹکرا کر چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں۔ بالکل یہی حال سورج کی روشنی کا ہے۔ وہ جب زمین کی طرف بڑھتی ہے تو فضا میں حجابات و موانع سے اس کو ویسا ہی مقابلہ کرنا پڑتا ہے جیسا دریا کی لہر کو پل کے پایہ کا۔ چونکہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ سورج کی روشنی بہت سے رنگوں کا مجموعہ ہے جو قوس قزح میں ہم کو الگ الگ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سورج کی روشنی میں لہریں ہوتی ہیں اور لہروں کی لمبائی کے لحاظ سے رنگ پیدا ہوتے ہیں مثلاً لمبی لہروں سے سرخ یا گہرا سنہرا رنگ ظاہر ہوتا ہے اور چھوٹی لہروں سے نیلا رنگ۔

پھر جس وقت سورج کی روشنی فضا کے حجابات و موانع سے ٹکراتی ہے تو وہ ہم تک جوں کی توں پہونچ جاتی ہے۔ اس کی لمبی لہریں جن سے سرخ روشنی پیدا ہوتی ہے متاثر نہیں ہوتیں، لیکن چھوٹی لہریں جن سے نیلا رنگ پیدا ہوتا ہے چاروں طرف منتشر ہو جاتی ہیں اور اسی لئے ہمیں آسمان نیلا نظر آتا ہے۔ گویا یہ رنگ آسمان کا نہیں بلکہ روشنی کی ان چھوٹی چھوٹی لہروں کا ہے، جو فضا میں منتشر ہو کر چاروں طرف پھیل گئی ہیں اور جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو ہم اس کی سرخ لہروں سے واسطہ پڑتا ہے

جو لمبی ہوتی ہیں اور فضا میں کسی حجاب سے ٹکرا کر منتشر نہیں ہوتیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سورج کی روشنی جو ہمیں نظر آتی ہے وہ بھی اصلی روشنی نہیں ہے کیونکہ اس میں سے نیلگوں چھوٹی لہریں علحدہ ہو چکی ہیں۔ اور اسی لئے حجابات سے ٹکرا کر چھوٹی لہریں جتنی زیادہ چھن کر علحدہ ہوتی جائیں گی، سورج اتنا ہی زیادہ سرخ نظر آئیگا یہی وجہ ہے کہ بادل، بھاپ اور کہر وغیرہ کے اندر سے آفتاب زیادہ سُرخ دکھائی دیتا ہے۔ صبح وشام، طلوع وغروب کے وقت بھی آفتاب کا رنگ زیادہ سُرخ اسی لئے نظر آتا ہے کہ اُس وقت شعاعیں زیادہ فاصلہ طے کرکے ترچھی ہو کر ہم تک پہونچتی ہیں اور زیادہ حجابات سے ٹکرانے کے بعد چھوٹی لہریں (نیلگوں) بہت زیادہ چھن کر علحدہ ہو جاتی ہیں — سورج کی اصلی روشنی، جس وقت وہ سورج سے چلتی ہے، کئی رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے، لیکن جوں جوں زمین کی فضا سے قریب ہوتی جاتی ہے، اس کی چھوٹی لہریں منتشر ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ہم تک صرف سُرخ لہریں پہونچتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم کو سورج ویسا ہی نظر آئے جیسا کہ ایک جلتا ہوا آہنی توا جو سفید ہونے کی حد تک گرم کیا گیا ہے۔

مذہب وعقل

(جناب مرتضیٰ علی خانصاحب - اٹاوہ)

میں نے بعض لوگوں کو کہتے سُنا ہے کہ سچا مذہب وہی ہے جسے عقل انسانی قبول کرسکے اور جب میں اُن سے مذہبی معتقدات کے متعلق عقلی گفتگو کرتا ہوں تو بعض یہ کہتے ہیں کہ مذہب عقل سے بالاتر چیز ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ہماری آپ کی عقل ہی کیا کہ غور کرکے فیصلہ کرسکیں، بتائیے اس صورت میں کیا کیا جائے۔

(**نگار**) میری رائے یہ ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ کیونکہ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، اس میں اس قسم کی لایعنی گفتگو کی گنجایش ہی نہیں۔ اس قسم کی باتیں اگر سنجیدگی سے کی جایئں تو وہ جھگڑا پیدا کرتی ہیں اور اگر محض تفریحی مشغلہ ہو تو بے نتیجہ ہے۔ مذہب وعقل کی جنگ نئی چیز نہیں۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے، اسی وقت سے وہ اس مخمصہ میں پڑا ہوا ہے، پہلے بھی نظام قدرت اور حوادث طبیعی کے اکثر مناظر ومظاہر اس کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور اب بھی یہی حال ہے، مگر فرق یہ ہے کہ پہلے وہ زیادہ سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرتا تھا اور جو بات سمجھ میں نہ آتی تھی اسے کسی دوسری قوت غیر معلوم سے منسوب کر دیتا تھا (اور یہی بنیاد تھی مذہب کی) لیکن اب چونکہ بہت سے حجابات دور ہو چکے ہیں، اس لئے وہ عدم علم کو کوئی اضطراری وفطری چیز نہیں سمجھتا اور کوشش کرتا ہے کہ اسرار کی حقیقت تک پہونچ جائے، الغرض وہ دور جب عقل کسی حجاب سے ٹکرا کر مذہب کی پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی تھی، بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے اور اب مذہب وعقل کی جنگ ایسے دو فریق کی جنگ ہے جس میں ایک جدید آلات حرب سے آراستہ ہے اور دوسرا صرف روحانی عزم وارادہ کے بھروسہ پر لڑنا چاہتا ہے۔ مذہب کے باب میں سب سے سامنے ہمیشہ یہ سوال آیا کہ اگر اس کا تعلق اخلاقیات یا روحانیات سے ہے (جیسا کہ کہا جاتا ہے) تو اس کا مقصود دنیا میں صرف امن وسکون کی اشاعت ہونا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت اس کے خلاف ہے — اس لئے اب دو ہی صورتیں ہیں یعنی اگر مذہب کوئی خدائی یا الہامی چیز ہے تو ہم اس کا صحیح استعمال نہیں کر رہے ہیں اور اگر وہ خود انسان کی پیدا کی ہوئی چیز ہے تو اب اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یقیناً مذہب ایک مجبور وبیکس انسان کے لئے بڑا سہارا اور سکون ہے، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ وہ ساری دُنیا کے انسانوں کے لئے رُسا ثابت نہ ہو حالانکہ صورت اسکے بالکل خلاف ہے — مذہب کا تخیل اگر صرف یہ قرار دیا جائے کہ تمام انسان خدا کے بندے ہیں اور وہی سب کا مالک ہے، تو پھر وہ مذاہب جو صرف معتقدات اور تعبیرات کی بنا پر دوسرے مذاہب والوں کو گمراہ اور دوزخی سمجھتے ہیں، سوسائٹی کے لئے مفید ثابت نہ ہوں گے اور عقلیت پسندوں کا ہدف قرار پائیں گے۔ خدا کا بلند ترین تصور جو اس وقت تک قایم کیا گیا ہے وہ اسکے بے نیاز اور قادر مطلق ہونے کا ہے۔ لیکن عقاید کی دنیا میں یہ تصور بالکل بدل جاتا ہے۔ خدا کے بے نیاز ہونے کے معنے صرف یہ ہوسکتے ہیں کہ وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی اور یہیں سے مذاہب کا تمام مابعد الطبیعاتی ذخیرہ اور حشر ونشر ختم ہو جاتا ہے — اخروی عذاب وثواب کو اعمال دنیا کا لازمی نتیجہ قرار دینا گویا یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا متاثر ہوسکتا ہے، حالانکہ یہ اس کی شان بے نیازی کے منافی ہے۔ اسی طرح یہ سمجھنا کہ وہ ہم سے خوش یا ناخوش ہو کر اس دنیا میں ہمیں کامیاب یا محروم کرسکتا ہے، اس تصور کے خلاف ہے — اب قادر مطلق ہونے کو لیجئے، تو یہ عقیدہ اور زیادہ رواداری اور مسالمت چاہتا ہے کیونکہ اس صورت میں ہمیں یہ کہنے کا حق باقی ہی نہیں رہتا کہ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہی صحیح ہے اور دوسرے غلطی پر ہیں۔ بہرحال مذہب کی صحیح روح میری رائے میں یہی ہونا چاہئے کہ وہ تمام افراد انسانی کو ایک رشتہ سے وابستہ کردے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اختلاف عقاید کو ہم بالکل ذاتی وانفرادی چیز خیال کریں — وہ زمانہ جب مذہب کی مدد سے صرف قبایلی یا قومی اغراض پورے کئے جاتے تھے گزر گیا ہے، اب اس میں آفاقیت پیدا ہونا چاہئے اسے ایک کائناتی چیز ہونا چاہئے اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ مذہب کا مفہوم محض "انسانیت پرستی" قرار دیا جائے۔ اگر خدا کو جتے پوجتے ہم آپس میں لڑنے لگیں تو اس سے زیادہ خدا کی توہین کیا ہو سکتی ہے؟

مطبوعات موصولہ

فن شاعری ارسطو کی مشہور کتاب بوطیقا (Poetics) کا ترجمہ ہے جناب عزیز احمد صاحب بی۔اے استاذ انگریزی جامعہ عثمانیہ کے قلم سے ـــــ ارسطو کی یہ کتاب غالباً دنیا کی سب سے پہلی کتاب ہے جس میں فن شاعری پر علمی انتقادی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں، پہلے حصہ میں شاعری پر ایک عمومی تبصرہ کیا گیا ہے، دوسرے میں ٹریجڈی پر گفتگو کی گئی ہے، تیسرے میں رزمیہ شاعری پر، چوتھا نقادوں کے اعتراضات اور ان کے جواب دینے کے اُصول سے متعلق ہے اور پانچویں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ٹریجڈی رزمیہ شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔

ابتدا میں فاضل مترجم نے ایک مقدمہ کے ذریعہ سے اس کتاب کی اہمیت اور اس کے اُصول نقد کو وضاحت [illegible] بیان کیا ہے اور آخر میں اشارات و تلمیحات کا ایک باب اضافہ کرکے ترجمہ کو بہت زیادہ مفید بنا دیا ہے۔

انجمن ترقی اُردو نے اس کتاب کو شایع کرکے فن نقد کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور وہ حضرات جو اس فن کا اُصولی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس کتاب سے استفادہ ناگزیر ہے۔ قیمت عہ ـ ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

علم الاقوام ڈاکٹر بیرن عمر رالف ایہرن فیلس کی تصنیف کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اس نام سے کیا ہے۔ "علم الاقوام" جتنا دلچسپ علم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ دلچسپ اس لئے کہ اس میں خود انسان اپنی جستجو کرتا ہے اور مشکل اس لئے کہ تمام دُنیا میں پھیلے ہوئے انسانوں اور انکی تہذیبوں کا کسی ایک مرکز تک سراغ لگانا آسان کام نہیں۔ اس کے لئے انتہائی صبر، حد درجہ کاوش اور غیر معمولی فراست وسلیقہ کی ضرورت ہے۔ اصل کتاب کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ ایک زبردست ماہر "اقوامیات" کی کاوش کا نتیجہ ہے اور ترجمہ کی خوبی وصحت کے لئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔

یہ کتاب دو جلدوں میں انجمن ترقی اُردو دہلی نے شایع کی ہے۔ پہلی جلد کی قیمت للعہ ہے اور دوسری جلد کی عہ۔

ہماری غذا ترجمہ ہے رابرٹ ایکلیسن کی کتاب کا جو مسئلہ غذا میں استنادی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ انتخاب غذا کے اُصول کیا ہیں اور اس کا انتخاب کیونکر کرنا چاہئے۔ آجکل انسانی صحت کا انحصار زیادہ تر "حیاتین" پر سمجھا جاتا ہے اور شاید یہی وہ چیز ہے جس سے ہندوستانی عام طور پر ناواقف ہیں۔

چونکہ قومی ترقی کے مسایل میں مسئلۂ صحت سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے اس لئے اس وقت جبکہ ہندوستان نے بھی ترقی کی طرف قدم اُٹھایا ہے ضرورت ہے کہ "اصول غذا" کی طرف لوگوں کو متوجہ کریں اور اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس قسم کی کتابیں پبلک کے سامنے کثرت سے پیش کی جائیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ انجمن ترقی اُردو ہند نے اپنے سلسلۂ مطبوعات میں اس کو بھی جگہ دی اور ایک اچھی کتاب اُردو داں پبلک کے سامنے پیش کی۔ ترجمہ سید مبارز الدین احمد رفعت نے کیا ہے اور ڈاکٹر غلام دستگیر صاحب نے نظرثانی کی ہے۔ قیمت عہ

انشاء داغ مجموعہ ہے نواب مرزا داغ کے خطوط کا جسے جناب احسن مارہروی (مرحوم) نے مرتب کیا تھا۔ یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں امراء ورؤساء کے نام کے خطوط ہیں۔ دوسرے حصہ میں اعزہ واحباب کے نام کے اور تیسرے حصہ میں شاگردوں کے نام کے خطوط یکجا کر دئے گئے ہیں ان خطوں میں محض انشاء کے لحاظ سے تو کوئی خاص بات نہیں، لیکن تاریخی حیثیت سے یہ بڑے کام کی چیز ہیں۔ ضرورت تھی کہ داغ ایسے شاعر کے خطوط کا مجموعہ شایع کیا جاتا۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی۔

حیوانی دنیا کے عجائبات

فن تاریخ میں نیچرل ہسٹری کا شعبہ غالباً سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ مغربی زبانوں میں تو اس فن پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اُردو میں اس کی بہت کمی تھی۔ جناب عبدالبصیر خانصاحب (مسلم یونیورسٹی) نے یہ کتاب لکھ کر بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جا بجا تصاویر و نقوش سے اس کی اہمیت و دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ قیمت عاا۔ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

دیوان جوشش

محمد روشن جوشش، عظیم آباد کے مشہور شعراء میں تھے۔ ان کے باپ کا نام جسونت ناگر تھا جو علی وردی خاں کے ممتاز سرداران قوم میں سے تھے۔ قریب قریب تمام تذکروں میں ان کا ذکر نظر آتا ہے، لیکن دیوان اس وقت تک شایع نہ ہوا تھا۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کمی کو پورا کیا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اس کو مرتب کیا ہے اور ابتدا میں ایک مقدمہ کے ذریعہ سے تمام وہ معلومات پیش کر دی ہیں جو ایک مقدمہ نگار کو پیش کرنا چاہئے۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ زیادہ تر سودا کی تقلید پائی جاتی ہے اور وہ بھی ناقص۔ قیمت عہ ہے۔

ہماری قومی زبان

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، اُردو زبان کے مشہور حامی ہیں اور انھوں نے جب کبھی کسی جلسہ میں اس موضوع پر تقریر کی ہے، صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس رسالہ میں انھیں کے خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔

محمدؐ

ترجمہ ہے توفیق الحکیم مصری کی کتاب کا جناب ملیح آبادی کے قلم سے۔ سیرت نبوی پر اس وقت تک بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ زمانہ کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے ان کے اسلوب کو بدلا جائے۔ چنانچہ یہ کتاب بالکل اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

اس میں ولادت سے لیکر رحلت تک کے تمام اہم واقعات ڈرامہ کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف مستند واقعات لئے جائیں۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ ترجمہ کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ ملیح آبادی کی نسبت اس کے حسن و صحت کے لئے کافی ضمانت ہے۔

قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر روزنامہ ہند کلکتہ۔

ترکی افسانے

ترجمہ ہے چار ترکی افسانوں کا جو وہاں کے مسلم الثبوت افسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے ترکی انشا کا مطالعہ کیا ہے وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ترکوں کی انشاء عالیہ کتنی بلند چیز ہے۔ ملیح آبادی صاحب نے ان ترجموں کو اُردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی تمام خصوصیات کو قائم رکھا ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر روزنامہ ہند کلکتہ۔

نورس

جناب مسعود اختر جمال کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جمال ایک نوجوان شاعر ہیں اور جیسا کہ میں ان سے ملا تھا ان کو عوام ہی سمجھتا تھا۔ اگر تخلص کا اثر کسی کے کلام پر پڑ سکتا ہے تو میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جمال کا کلام واقعی جمیل ہے۔

اس مجموعہ میں مذہبی، قومی، ادبی ہر طرح کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور ہر نظم میں کوئی نہ کوئی بات ایسی پائی جاتی ہے جو ہمارے فکر و تخیل کو چونکا دیتی ہے یا مسرور بنا دیتی ہے، قدامت کا گھنونا پن کہیں نہیں ہے۔ بہر حال یہ ایک ذہین نوجوان کی دلچسپ نظمیں ہیں اور ترقی پسند لٹریچر میں یہ مجموعہ یقیناً ایک مفید اضافہ ہے۔ قیمت غیر مجلد عمر۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ادبستان بنارس۔

سنہ ۴۱ء کی بہترین نظمیں

حلقۂ ارباب ذوق لاہور نے اس مجموعہ میں ۵۲ نظمیں آج کل کے ترقی پسند نوجوانوں کی جمع کر دی ہیں۔ ابتدا میں ہلکا سا تبصرہ بھی شامل ہے۔

کشمش نانی

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی مطبوعہ کتاب ہے۔ یہ کتاب "ادبیات اطفال" کے سلسلہ کی چیز ہے اور خوب ہے۔ اس سلسلہ میں قصے کہانیوں کے ذریعہ سے بچوں کو کام کی باتیں بتلانے والی کتابیں شایع کی جاتی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۱ر ہے اور ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر حیدرآباد (دکن)۔

گارسان دتاسی

اس کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بتایا ہے کہ گارسان دتاسی اور اس کے بعض ہمعصر مستشرقین نے اُردو کی کتنی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ یہ کتاب نقادوں اور تذکرہ نویسوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ قیمت عہ۔

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، حیدرآباد (دکن)۔

گلِ تریاک [۱]

(ابن العربی کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ بہ واسطۂ انگریزی)

[illegible] ایک نواب صاحب کو چانڈو پیتے دیکھا تھا تاریک کوٹھری، نہایت کثیف، ایک چراغ روشن۔ ایک شخص نے [illegible] افیون کی چھوٹی چھوٹی [illegible] نے کی چپوچی میں جو نے کی وسط میں ہوتی تھی لگایا۔ ایک شخص کروٹ سے لیٹا، دوسرا، دوسرا اسکے کولے [illegible] ہوا۔ چپوچی کو چراغ کی لو سے ملایا، دم لگایا، ادھر ایک شعلہ فروزاں ہوا ادھر دم لگانے والے کی آنکھیں پلٹ گئیں۔ اور وہ ٹنے لگا دوسرا [illegible] اٹھا اور اسی عمل کا اعادہ ہوا۔ اس شعلے کو یہ لوگ "گل تریاک" کہتے تھے۔ اب نظم کے آخری بند پر غور کیجیے۔ کلی کا جلکر شاداب و شگفتہ ہونا، تہ اور خنک خاموشی میں گلِ تریاک کا کھلنا تشنگی، مدہوشی! معلوم ہوتا ہے ابن العربی کے زمانہ میں عربوں میں چانڈو کا رواج تھا۔ "اثر"

سیمابی ہوا میں ہانپتے پودے دھوپ کے گھونٹ چڑھاتے ہیں
شدت وہ عطش کی ہے لیکن اس پر بھی ہانپتے جاتے ہیں

غش کھائے گلا بچے رس کو چوس رہی ہے سنہری اک تتلی
نازک نازک، سندر سندر، چھوٹی موٹی، دبلی پتلی

اور ہونٹ ترے سوتے میں ادھر ہیں نیم تبسم آلودہ
اے کاش کبھی دیکھوں میں انھیں پیغام سے اپنے آسودہ

جنبش نہ ہو یوں ہیں سوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی
اور ہوش سبھوں کے کھوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی

بار یک سنہری نقاب تو اپنے روئے زیبا سے نہ ہٹا
مشتاق ہیں آنکھیں ذروں کی اور تاک میں ہے تپتا صحرا

یہ تیرے خزانۂ زر کی نگہباں ہے اور اسکو چھپائے ہے
وہ پردا ہے جو چشم زخم سے حسن کو تیرے بچائے ہے

سورج کی دمکتی لپٹ جو ہے شفاف تن بلوریں میں
(محلول ستارے یا موتی بیٹھائے مٹی انگوریں میں)

وہ سہم کے ہو نہ فرار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی
اور فتنے نہ ہوں بیدار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی

---

[۱] چانڈو باز گلِ تریاک اس شعلے کو کہتے ہیں جو چانڈو کا دم لگانے پر [illegible] ہوتا ہے [illegible] لگانے [illegible] "[illegible]" کہتے ہیں۔

حیوانی دنیا کے عجائبات

فن تاریخ میں نیچرل ہسٹری کا شعبہ غالباً سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ مغربی زبانوں میں تو اس فن پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن اُردو میں، ان کی بہت کمی تھی۔ جناب عبدالبصیر خاں صاحب (مسلم یونیورسٹی) نے یہ کتاب لکھ کر بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ جابجا تصاویر و نقوش سے اس کی اہمیت و دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ قیمت ۶ر ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی۔

دیوان جوشش

محمد روشن جوشش، عظیم آباد کے مشہور شعراء میں تھے۔ ان کے باپ کا نام جسونت ناگر تھا جو علی وردی خاں کے ممتاز سرداران قوم میں سے رہے۔ قریب قریب تمام تذکروں میں ان کا ذکر نظر آتا ہے، لیکن دیوان اس وقت تک شایع نہ ہوا تھا، اب انجمن ترقی اُردو نے اس کمی کو پورا کیا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اس کو مرتب کیا ہے اور ابتدا میں ایک مقدمہ کے ذریعہ سے تمام وہ معلومات پیش کر دی ہیں جو ایک مقدمہ نگار کو پیش کرنا چاہئے۔

کلام میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ زیادہ تر سودا کی تقلید پائی جاتی ہے اور وہ بھی ناقص۔ قیمت عہ ہے۔

ہماری قومی زبان

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، اُردو زبان کے مشہور حامی ہیں اور انھوں نے جب کبھی کسی جلسہ میں اس موضوع پر تقریر کی ہے، صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اس رسالہ میں انھیں کے خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو دہلی۔

محمدؐ

ترجمہ ہے توفیق الحکیم مصری کی کتاب کا جناب ملیح آبادی کے قلم سے۔ سیرت نبوی پر اسوقت تک بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ زمانہ کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے ان کے اسلوب کو بدلا جائے۔ چنانچہ یہ کتاب بالکل اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

اس میں ولادت سے لیکر رحلت نبوی تک تمام اہم واقعات ڈرامہ کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ صرف مستند واقعات لئے جائیں۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ ترجمہ کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ ملیح آبادی کی نسبت اس کے حسن صحت کے لئے کافی ضمانت ہے۔

قیمت ؏ ملنے کا پتہ:۔ دفتر روزنامہ ہند کلکتہ۔

ترکی افسانے

ترجمہ ہے چار ترکی افسانوں کا جو وہاں کے مسلم الثبوت فسانہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے ترکی انشاء کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ترکوں کی انشا عالیہ کتنی بلند چیز ہے۔ ملیح آبادی صاحب نے ان ترجموں کو اُردو میں منتقل کیا ہے اور اصل زبان کی تمام خصوصیات کو قایم رکھا ہے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر روزنامہ ہند کلکتہ

نورس

جناب مسعود اختر جمال کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جمال ایک نوجوان شاعر ہیں اور جب تک میں ان سے ملا نہ تھا ان کو عورت ہی سمجھتا تھا۔ اگر تخلص کا لحاظ کسی کے کلام پر پڑ سکتا ہے تو میں پورے یقین کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ جمال کا کلام واقعی جمیل ہے۔

اس مجموعہ میں مذہبی، قومی، ادبی ہر طرح کی نظمیں پائی جاتی ہیں اور ہر نظم میں کوئی نہ کوئی بات ایسی پائی جاتی ہے جو ہمارے فکر و تخیل کو چونکا دیتی ہے یا مسرور بنا دیتی ہے، قدامت کا گھنونا پن کہیں نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک ذہین نوجوان کی دلچسپ نظمیں ہیں اور ترقی پسند لٹریچر میں یہ مجموعہ یقیناً ایک مفید اضافہ ہے۔

قیمت غیر مجلد عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ ادبستان بنارس۔

سنہ ۴۱ء کی بہترین نظمیں

حلقۂ ارباب ذوق لاہور نے اس مجموعہ میں ۲۵ نظمیں آج کل کے ترقی پسند نوجوانوں کی جمع کر دی ہیں۔ ابتدا میں ہلکا سا تبصرہ بھی شامل ہے۔

کشمش نانی

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی ۵۰ ویں کتاب ہے۔ یہ کتاب "ادبیات اطفال" کے سلسلہ کی چیز ہے اور خوب ہے۔ اس سلسلہ میں قصے کہانیوں کے ذریعہ سے بچوں کو کام کی باتیں بتلانے والی کتابیں شایع کی جاتی ہیں اس کتاب کی قیمت ۱ر ہے اور ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر حیدرآباد (دکن)

گارسان دتاسی

اس کتاب میں پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بتایا ہے کہ گارسان دتاسی اور اس کے بعض ہمعصر مستشرقین نے اُردو کی کتنی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ یہ کتاب نقادوں اور تذکرہ نویسوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔ قیمت ؏

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر۔ حیدرآباد (دکن)

گلِ تریاکؔ

(ابن العربی کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ بہ واسطۂ انگریزی)

میں نے اپنے بچپن میں ایک نواب صاحب کو چانڈو پیتے دیکھا تھا۔ تاریک کوٹھری، نہایت کثیف تکیہ، ایک چراغ روشن۔ ایک شخص نے قیوام کا توم لوہے کی تیلی سے نے کی چھوچھی میں جو نے کی وسط میں ہوتی تھی لگایا۔ ایک شخص کروٹ سے لیٹا، دوسرا، دوسرا اُسکے کولے پر سر رکھکر دراز ہوا۔ چھوچھی کو چراغ کی لَو سے ملایا، دم لگایا، ادھر ایک شعلہ فروزاں ہوا اُدھر دم لگانے والے کی آنکھیں پلٹ گئیں۔ اور بیٹھنے لگا دوسرا سر بڑے اُٹھا اور اسی عمل کا اعادہ ہوا۔ اس شعلے کو یہ لوگ "گلِ تریاک" کہتے تھے۔ اب نظم کے آخری بند پر غور کیجیے۔ کلی کا جبلگر شاداب و شگفتہ ہونا تنہا اور خنک خاموشی میں گلِ تریاک کا کھلنا تشنگی، مدہوشی۔ معلوم ہوتا ہے ابن العربی کے زمانہ میں عربوں میں چانڈو کا رواج تھا۔ "اخترؔ"

سیمابی ہوا میں ہانپتے پودے دھوپ کے گھونٹ چڑھاتے ہیں　　شدت وہ عطش کی ہے لیکن، اس پر بھی ہانپتے جاتے ہیں

غش کھائے گلابکے رس کو چوس رہی ہے سنہری اک تتلی　　نازک نازک، سندر سندر، چھوٹی موٹی، دُبلی پتلی

اور ہونٹ ترے سوتے میں ادھر ہیں نیم تبسم آلودہ　　اے کاش کبھی دیکھوں میں انھیں پیغام سے اپنے آسودہ

جنبش نہ ہو یوہیں سوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی

اور ہوش سبھوں کے کھوتی رہ، اے نیند کی ماتی متوالی

باریک سنہری نقاب تو اپنے روئے زیبا سے نہ ہٹا　　مشتاق ہیں آنکھیں ذروں کی اور تاک میں ہے تپتا صحرا

یہ تیرے خزانۂ زر کی نگہباں ہے اور اُسکو چھپائے ہے　　وہ پردا ہے جو چشمِ زخم سے حُسن کو تیرے بچائے ہے

سورج کی دمکتی لپٹ جو ہے شفاف تن بلوریں میں　　(محلول ستارے یا موتی مینائے مئی انگوریں میں)

وہ سہم کے ہو نہ فرار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی

اور فتنے نہ ہوں بیدار کہیں، اے نیند کی ماتی متوالی

ؔ چانڈو باز گلِ تریاک اس شعلے کو کہتے ہیں جا چانڈو کا دم لگانے پر سے [illegible] ہوتا ہے۔ دم لگانے کو یہ لوگ "چھینٹا لینا" کہتے ہیں۔

مد و جزرِ موج دریا سینے کے اُبھرنے میں ڈوبنے میں	تھکتی ہی نہیں تکنے سے جنھیں نوخیز حبابوں کی آنکھیں

اُف بروں کی ایسی سفیدی مگر دو ڈورے جو لہو میں سانس کے تھے	ساحل کا راز تشنہ لبی، اس درجہ قریب اور آئیں نہ ہاتھ

جیسے ہو دہن میں موج کے کف، زریں زریں، تاباں تاباں	تند اور سرکش، تاہم دلکش، برخود نازاں برخود پیچاں

کروٹ نہ بدل، کروٹ نہ بدل، اے نیند کی ماتی متوالی

ہے ہے نہ مچل، ہے ہے نہ مچل، اے نیند کی ماتی متوالی

پھر کیوں نہ ہو چشمہ اشک فشاں اور توڑے نہ دم بیلی تتلی	منظر ہو جب ایسا تاب شکن، کیوں غیر نہ ہو حالت دل کی

جب ایسی شدید محبت ہو، کثرت سے گلابی میخواری	خوابیدہ پیکر رعنائی، اپنی مجبوری، ناچاری

کیوں لپٹیں نہ جلتی آنکھیں مری چھاتی کے سرخ انگوروں سے	کیوں رحم کی رکھوں آس نہ میں ہشیار نما مخموروں سے

جلتی ہے جو چھاتی جلنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی

جو کچھ بھی ہو آنکھیں ملنے دے، اے نیند کی ماتی متوالی

جل جائے تو میرے دل کی کلی شاداب و شگفتہ ہو جائے	ہو خاک اور پھر یہ خاک اُڑ کر اک کیف ابد میں کھو جائے

مَس ہو کے گل و صندل سے مہکتے جسم کی تیرے خوشبو سے	قسمت پہ نہ کیوں وہ ناز کرے جس کو ہوں میسر یہ بوسے"

پروانے پہ گزرے جو گزرے شعلے سے مبارز کوشی میں	مانند گلِ تریاک کھلے تنہا و خنک خاموشی میں

اس تشنگی و مدہوشی میں، اے نیند کی ماتی متوالی

حسرت کشئ ہمدوشی میں، اے نیند کی ماتی متوالی

اثر لکھنوی

ایک شاعرانہ لمحہ

جسمِ سیمیں کی یہ لرزش - یہ محبت کا سلام — مسکراتی ہوئی آنکھوں میں وفا کا پیغام
اُف یہ لغزیدہ قدم - ہائے یہ بے ربط کلام — عشق نے بخشدیا آج تجھے حسنِ دوام
جو ادا ہے تری بیہوش ہوئی جاتی ہے

حشر کیا اے دلِ رنجور ہوا جاتا ہے — حسن اک عالمِ مجبور ہوا جاتا ہے
کیف وہ ہے کہ جہاں چور ہوا جاتا ہے — ہر نفس بے خود و مخمور ہوا جاتا ہے
ہر نظر میکدہ بردوش ہوئی جاتی ہے

دل میں شورش ہے کہ برپا ہے سکوں کیا کہئے — شعلۂ زیست میں یہ سوزِ دروں کیا کہئے
کارگر ہے مری نظروں کا فسوں کیا کہئے — تیری آنکھوں میں یہ اندازِ جنوں کیا کہئے
آرزو محشرِ خاموش ہوئی جاتی ہے

ہائے کس درجہ حسیں رات ہے - کیا لمحہ ہے — تیری ہر سانس میں اک جذبۂ وارفتہ ہے
کیا ترنم ہے - یہ کیا سحر ہے - کیا نغمہ ہے — کتنا رس ہے تری آواز میں کیا لہجہ ہے
دل کی دنیا ہمہ تن گوش ہوئی جاتی ہے

یہ نگاہوں میں تری حسرتِ پرواز ہے کیا — رخ پہ یہ برہمیِ زلف کا انداز ہے کیا
ہائے انجامِ تمنّا کا یہ آغاز ہے کیا — رہ گیا آکے جو لب تک وہ حسیں راز ہے کیا
بات کیا ہے جو فراموش ہوئی جاتی ہے

چشمِ غمناک میں یہ جذب یہ تاثیر ہے کیوں — میرا غم آج ترا عالمِ تصویر ہے کیوں
اُلجھی اُلجھی سی مرے خواب کی تعبیر ہے کیوں — شمعِ احساس یہ گم کردۂ تنویر ہے کیوں
عقل خود رفتہ و مدہوش ہوئی جاتی ہے

یہ مرادوں کا شبستاں - یہ خیالوں کا ہجوم — تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے تابندہ نجوم
اُف یہ ہیجانِ تمنّا - یہ نگاہِ معصوم — یہی دنیا جو تھی آغوشِ وفا سے محروم
آج آغوش در آغوش ہوئی جائی ہے

مسعود اختر جمال

حسین دوشیزہ

دوشیزگیِ حُسن کا اللہ رے! آغاز
بہکی ہوئی رفتار، یہ کھوئے ہوئے انداز

ہر بات میں سہمی ہوئی لے نازو ادا کی
ہر سانس میں دبتی ہوئی جذبات کی آواز

گھبرائی ہوئی چال کا یہ حال ہے جیسے
اک طائرِ نوخیز کی جھجکی ہوئی پرواز

عارض سے نکلتی ہوئی اک آتشِ بے رنگ
ہونٹوں پہ لرزتا ہوا اک نغمۂ بے ساز

رُخسار سے تھم تھم کے یہ ہٹتے ہوئے گیسو
ہو شام کو جیسے کسی میخانہ کا در باز

مدہوش بنا کر ہی یہ ڈھاتا ہے قیامت
رفتار کا جادو، کبھی گفتار کا اعجاز

آنکھوں کو جھکائے ہوئے مبہم سا اشارہ
سو جان سے ہو جس پہ فدا صنعتِ ایجاز

آنکھیں وہ حیا کوش کہ نظارے سے بیزار
عارض میں وہ نازک کہ پسینہ سے گرانبار

اونچی ہے ستاروں سے بھی اخلاق کی رفعت
پھولوں سے بھی بڑھ کر کہیں معصوم کردار

آنکھوں کا وہ اندازِ تغافل نہ توجہ
گردن کا وہ خم، جس میں نہ انکار نہ اقرار

وہ سادگیِ حُسن کی افسانہ نگاری
سانچے میں اداؤں کے وہ ڈھلتے ہوئے اشعار

آگاہ نہیں ہے ابھی دُنیا کی ہوا سے
اپنوں ہی سے واقف ہے نہ غیروں سے خبردار

اک آتشِ خاموش ہے کہتے ہیں یہ تیور
طوفان ہے طوفان بتاتے ہیں یہ آثار

اک صبح کہ جس میں نہ اندھیرا نہ اُجالا
اک کشتیِ جذبات نہ اِس پار نہ اُس پار

شانوں پہ دوپٹہ کا یہ اُڑتا ہوا آنچل
ماحول ہے بے چین، ہواؤں میں ہے ہلچل

زلفوں کی گھنی چھاؤں میں یہ تابشِ رُخسار
آتشکدۂ حسن پہ چھائے ہوئے بادل

اللہ رے! یہ ساقِ بلوریں دمِ رفتار
جنبش میں ہو جس طرح مئے ناب کی بوتل

چھایا ہوا اک بار ہے احساسِ حیا کا
تیور بھی گرانبار ہیں، پلکیں بھی ہیں بوجھل

کُرتہ کے گریبان پہ کچھ پان کے دھبے
آنکھوں میں پسینہ سے ہے پھیلا ہوا کاجل

گردن میں ہے مالا نہ کلائی میں ہے کنگن
اور پاؤں میں پازیب، نہ گھنگرو ہیں نہ چھاگل

جس سے کوئی کھیلا نہ ہو وہ لعبتِ رنگیں
شبنم سے بھی ہو پاک وہ اُٹھتی ہوئی کونپل

وہ گیت مُغنّی جسے دُہرا نہ سکا ہو
وہ ساز جسے چھو نہ سکی جنبشِ مضراب

وہ بُت کہ نہ اک پھول چڑھایا ہو کسی نے
جس میں کوئی سجدہ نہ ہوا وہ خمِ محراب

کچھ تجربہ دُنیا کا نہ آگاہیِ ماحول
بیگانۂ دستور ہے ناواقفِ آداب

کیا چیز ہے دُنیا اسے معلوم نہیں ہے
ظالم ہے یہ ظالم، ابھی مظلوم نہیں ہے

ماہر القادری

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۱ | فہرست مضامین جون سنہ ۴۲ء | شمار ۶

ملاحظات ------------------ ۱
جھوٹوں کے بادشاہ ------------------ ۵
اے حُجرہ نشینو! (نظم) ------ سیماب اکبرآبادی ------ ۸
جنگی تحریک کے شاعر ------ گوری سرن لال سریواستو ایم۔ اے (ملیگ) ۹
عقلیت کیا ہے؟ ------ ڈاکٹر پریم ناتھ ------ ۱۳
ابدی طاقت (نظم) ------ مسعود اختر جمال ------ ۱۷
ستاروں کی پیدائش اور انکا وزن ------------------ ۲۰
اقتباسات ------------------ ۲۳
احسان (فسانہ) ------ شنکر سروپ بھٹناگر ------ ۲۴
بازگشت خیال۔ آترس (منظومات) ۔ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر ------ ۲۷
زار سے اسٹالین تک ------------------ ۲۹
زندگی (نظم) ------ نبی احمد بریلوی ------ ۳۲
مکتوبات نیاز ------------------ ۳۳
منظومات ------ فضل الدین آثر۔ (پروفیسر) شور ------ ۳۷
باب الاستفسار ------------------ ۳۸
مطبوعات موصولہ ------------------ ۴۰

ملاحظات

جنگ کی موجودہ منزل

لڑائی کا تیسرا سال ختم ہونے کے قریب ہے اور اس دوران میں یہ آگ قریب قریب کرۂ زمین کے ہر گوشہ تک پہونچ چکی ہے، لیکن نوع انسانی ابھی تک بیم و رجا کی منزل سے نہیں گزر چکی ـــ

لاکھوں انسانوں کا درندوں کی طرح ایک دوسرے کا خون بہانا، ہزاروں میل تک جہاں کھیتیاں لہلہایا کرتی تھیں، انسان کے گرم خون کی کیچڑ کے سوا کچھ نظر نہ آنا ـــ بیشمار گھروں کا جلکر خاک سیاہ ہو جانا، کروروں تیمیوں اور بیواؤں کا رات دن روح فرسا درد دُکھ میں تڑپتے رہنا ـــ ایک عالمگیر فقر و فاقہ، ایک غیر متناہی ویرانی و بربادی ـــ نہ بجھنے والی آگ کی لپٹوں میں انسان کی کٹی ہوئی گردنوں اور چھدے ہوئے سینوں سے اُبلتے رہنے والا خون! کچلے ہوئے سر اور سروں کے بھیجوں سے لتھڑے ہوئے چہرے ـــ کٹی ہوئی پسلیاں، پھٹے ہوئے شکم، ٹوٹے ہوئے بازوں اور ٹانگوں کی کھال کو پھاڑ کر نکل آنے والی ہڈیاں ـــ اور اسی قسم کے بہت سے ہولناک مناظر! ـــ یہ ہے موجودہ جنگ جو انسان کی تاریخ میں شدت درندگی کے لحاظ سے شاید سب سے پہلی اور آخری جنگ ہے ـ

جب خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بناکر بھیجنا چاہتا ہوں تو فرشتوں نے عرض کی "کیا تو اُس کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو زمین کو فساد و خونریزی سے بھر دے گا" خدا نے فرمایا ـ "انی اعلم مالا تعلمون" ـــ تمھیں نہیں معلوم، میں جانتا ہوں ـــ

پھر فرشتوں کی پیشین گوئی تو ہمارے سامنے ہے، لیکن خدا کیا جانتا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ علم خدا وندی کے بے پردہ ہونے تک خدا کا یہ خلیفہ اب خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا

اس سے پہلے بھی لڑائیاں ہوئی ہیں اور سو سو سال تک برابر جاری رہی ہیں، لیکن ہلاکت باری کے لحاظ سے اس جنگ کا ایک ایک دن پچھلی لڑائیوں کے ایک ایک سال پر بھاری ہے اور اس لئے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد اس کے نقصانات کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی، لیکن اس کے زیادہ عرصہ تک جاری رہنے کی پیش گوئی نہیں کر سکتے!

لڑائی اب جس منزل سے گزر رہی ہے وہ یقیناً بیم و رجا کی منزل ہے، لیکن اس منزل کو اب جلد ختم ہونا ہے، کیونکہ فریقین کی جانب سے جو انتہائی حدود، کوشش و کاوش کے متعین ہو سکتے تھے وہ سب متعین ہو چکے ہیں اور دھونی سیلاب کی یہ خونی موج اب بلند ہو کر اس نقطہ پر پہونچ گئی ہے، جہاں سے اس کو اب نشیب ہی کی طرف مایل ہونا ہے اور ساحل سے ٹکرائے یا نہ ٹکرائے مگر اب اس کے اُبھرنے کا کوئی امکان نہیں!

جن جن ملکوں کو جنگ میں شریک ہونا تھا، ہو چکے ہیں اور اب کوئی حکومت ایسی نہیں جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ اس کی شرکت موجودہ توازن میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے گی۔ اس لئے فریقین کی قوت و ذرایع جنگ کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے اور ہر چند لڑائی کے معاملات میں زیادہ منطق سے کام نہیں لیا جا سکتا، تاہم اسباب و علل کی دنیا میں ہمیں صغریٰ و کبریٰ دیکھ کر نتیجہ پر حکم لگانا ہی پڑتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یورپ کے بڑے حصہ پر اس وقت نازی اقتدار قایم ہے، لیکن محوری طاقت نام ہے صرف جرمنی، اٹلی اور جاپان کے اتحاد کا، اور انھیں کو لڑائی کا سارا بوجھ اٹھانا ہے۔ دوسری طرف برطانیہ، امریکہ، چین اور روس کی اجتماعی قوت ہے، اس لئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فریقین میں کس کا پلہ بھاری ہے اور اگر فیصلہ "الفت بالالفت" کے حساب سے ہو تو بھی نتیجہ کے متعلق دو رائیں قایم نہیں کی جا سکتیں۔

جرمنی کی انتہائی قوت اور اس کے انتہائی عروج کا زمانہ وہ تھا جب اس نے دفعتاً مغرب کی طرف سے پلٹ کر مشرق کا رُخ کیا اور تین چار مہینے کے اندر روسی فوجوں کو ماسکو اور لینن گراڈ کی چار دیواری تک ڈھکیل دیا۔ یہ وقت روس کے لئے بہت نازک تھا اور اس کی حالت ایسے قطرۂ شبنم کی سی تھی جو کانٹے کی نوک پر ٹھہرا رہا ہو، لیکن اشتراکیت کا معجزہ سمجھئے یا موسم سرما کی شدت کہ نازی سیلاب کا وہ زور گھٹنے لگا اور اسے بجائے حملہ کے دفاعی تدابیر اختیار کرنا پڑیں۔

یقیناً روس اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن اس نے جرمنی کو اتنا نقصان ضرور پہونچا دیا کہ اب موسم بہار میں جو اس نے دوسرا حملہ شروع کیا ہے وہ نسبتاً بہت تھکا ہوا اور بیجان معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت خارکوف کے میدان میں بڑے معرکہ کی لڑائی ہو رہی ہے اور دونوں طرف کی آہن پوش قوتیں نہایت شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ ہر چند خبروں سے واقعی صورت حال کا پتہ نہیں چلتا، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جرمن فوجوں کو ابھی تک نہ کرچ کی طرف آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے نہ خارکوف کی طرف اور اگر روس اس موسم بہار میں اسی طرح کامیاب مدافعت کرتا رہا تو پھر جرمنی کے خلاف پانسہ پلٹنا بالکل یقینی ہے۔

ہٹلر کو جو ناکامی روس کے محاذ پر ہوئی ہے اور اس کا جتنا اثر ہٹلر پر ہوا اس کا پتہ خود ہٹلر کے بیانات سے چلتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ روس کے محاذ سے اپنے دامن کو کیونکر علیحدہ کرے۔ اور جرمن آبادی کو وہ کس طرح اطمینان دلائے کہ اس کی زبردست قربانیاں رائگاں جانے والی نہیں ہیں۔

اس دوران میں اس کو ایک سیاسی کامیابی فرانس میں ضرور ہوئی اور وہ یہ کہ وہاں لاوال برسرِ اقتدار ہو گیا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسولینی نے جن شرائط پر آیندہ مدد کا وعدہ کیا ہے وہ ہٹلر کو وشی حکومت کے اس انقلاب سے بھی فایدہ نہ اُٹھانے دیں گی۔ اٹلی کا ایسے وقت میں وشی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا کہ کارسکا وغیرہ اس کے حوالے کر دئے جائیں، کبھی ہٹلر کو پسند نہیں آ سکتا اور اگر یہ سب کچھ ہٹلر کے اشارہ سے ہوا ہے اور اس کا مقصود وشی حکومت پر دباؤ ڈال کر کام نکالنا ہے، تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لاوال فرانس کی آبادی کو یہ زہر کا گھونٹ کس طرح آسانی سے پلا سکے گا، تاہم وشی حکومت سے اندرونی طور پر ہٹلر کی کوئی مفاہمت ضرور ہوئی ہے جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تیونس میں پھر جرمنی نے اقدام شروع کر دیا ہے۔

یہ موسم لیبیا میں جنگ جاری رکھنے کے لئے بالکل ناموزوں ہے، اس لئے جیبوٹ جیباٹ سے زیادہ یہاں کچھ ہوتا نظر نہیں آتا اور اگر آگے چلکر یہ لڑائی کوئی اہمیت حاصل کرلے تو بھی اُس سے اتحادیوں کے مقاصد کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا، کیونکہ مڈگاسکر پر انگریزی فوجوں کے تسلط نے بحرِ روم اور سواحل افریقہ کے اُن خطروں کو بہت ضعیف کر دیا ہے جو چند دن قبل، جاپانیوں کے وہاں تک پہونچ سکنے کے خیال سے پیدا ہو چلے تھے۔ قبضۂ مڈگاسکر کے بعد دوسری اہم بات میکسیکو کا جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دینا ہے، جس سے امریکہ کے ہاتھ زیادہ مضبوط ہو جائیں گے اور بحرِ اٹلانٹک میں نازی غارتگری کا استیصال نسبتاً آسان ہو جائے گا۔

ایشیا میں برما سے انگریزی فوجیں ہٹکر ہندوستان کی سرحد پر آگئی ہیں، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ برما کی جنگ ختم ہو چکی ہے، کیونکہ اب برطانیہ و چین کے مقاصد بالکل ایک ہیں اور جس طرح برطانیہ، جاپان کی کسی کامیابی کو گوارا نہیں کر سکتا خواہ وہ اندرونِ چین ہی سے کیوں نہ متعلق ہو اسی طرح چین بھی اس کے کسی کامیاب اقدام کو پسند نہیں کر سکتا، خواہ اس کا تعلق برما یا اندرونِ ہند ہی سے کیوں نہ ہو — اس لئے برما کے بڑے حصہ پر قابض ہو جانے کے بعد بھی جاپان ابھی تک برما کی لڑائی لڑ رہا ہے اور اس وقت تک وہ یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک چین کو بالکل ختم نہ کر دے۔ چنانچہ جاپان کے تازہ اقدامات سے پتہ چلتا ہے کہ اب اس کی فوجوں کا زیادہ زور چین ہی کی طرف ہے۔

بحرِ پاسفک میں بھی جاپانی تگ و دو بہت دھیمی پڑ گئی ہے اور جنرل توجو (وزیرِ اعظم جاپان) کا آسٹریلیا کو ایشیا کے جدید نظام میں جاپان کا ساتھ دینے کی دھمکی ملی ہوئی دعوت دینا، اُن ناکامیوں کی ناکام تلافی کی کوشش سے زیادہ نہیں جو آسٹریلیا کے مسئلہ میں اسے حاصل ہوئی ہیں۔ لیکن ان باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہندوستان کا خطرہ دور ہو گیا ہے، درست نہیں۔

امریکہ جس انداز سے اس جنگ میں حصہ لے رہا ہے، وہ بظاہر نمایاں نہ ہو، لیکن بہت ٹھوس تدابیر پر قائم ہے اور تدریجی طور پر اتحادی کامیابیوں کو مستحکم بنا رہا ہے۔ طیارے، بحری جہاز، آبدوز کشتیاں، اور ہر قسم کا سامانِ حرب نہایت تیزی کے ساتھ وہاں طیار ہو رہا ہے اور اُس کی بری، بحری و فضائی فوجوں نے بھی نقل و حرکت شروع کر دی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وہاں کے جنرل جارج مارشل کا یہ اعلان کہ امریکی فوجیں بہت جلد فرانس میں داخل ہو جائیں گی، امریکہ کے اُن وسیع عزایم و ذرایع کو ظاہر کرتا ہے جو اتحادیوں کی آخری کامیابی کے لئے وہ اختیار کر رہا ہے۔

بہرحال جس حد تک طیاریوں اور مستقبل کے ارادوں کا تعلق ہے، اتحادی اب بہت مضبوط چٹان پر کھڑے ہوئے ہیں اور محوری طاقتیں، اپنے تمام ممکن ذرایع صرف کرنے کے بعد بھی، جنگ کے ضایعات کی تلافی اپنی حربی صناعت سے نہیں کر سکتے اور اس صورت میں جنگ جتنی زیادہ طویل ہوگی، اتحادی کامیابی اتنی ہی قریب ہوتی جائے گی۔

اگر درمیان میں کوئی اور تازہ واقعہ رونما نہ ہوا، تو جنگ کا مستقبل روس کے میدان میں بہت جلد واضح ہو جائے گا، کیونکہ لڑائی کا اصل سررشتہ جرمنی ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس کی قسمت کا فیصلہ روس ہی میں ہونا ہے۔ اگر اب کے موسمِ بہار میں وہ روس کو شکست دینے یا اسکو صلح پر مجبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا، تو اس کی شکست پر مہرِ توثیق ثبت ہو جائے گی اور پھر جاپان کو بھی اپنے بلند ارادوں سے باز آنا پڑے گا۔ لیکن اگر وہ روس میں کامیاب ہو گیا تو جنگ کی تیسری منزل شروع ہوگی اور یہ منزل یقیناً بہت زیادہ ہولناک اور پُر از خطر ثابت ہوگی۔

ہندوستان کی حکومت، جاپانی خطرہ کا مقابلہ کرنے کی طیاریاں کر رہی ہے، فوجی طیاریوں کا تو پورا حال معلوم نہیں، لیکن پبلک طیاریاں سب کے علم میں ہیں اور ان طیاریوں میں "اے۔ آر۔ پی" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ملک کے ہر گوشہ میں لوگوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ ہوائی حملہ کے وقت اُن کو کیا کرنا چاہئے اور حکومت کے ساتھ تعاون کی کیا صورتیں اس وقت مفید ہو سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں روشنی کے گُل یا کم کرنے کے متعلق جو مشق کرائی جا رہی ہے، وہ بھی ضروری چیز ہے، لیکن اس پر مسلسل اصرار کی ضرورت نہیں۔ مہینے میں ایک دو دن اس مشق و تجربہ کے لئے کافی ہیں۔

تخلیہ کے متعلق حکومت نے بہت زیادہ نرم پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ کسی خطرہ کی جگہ سے بھاگنا انسان کی فطرت ہے لیکن اصولاً کوئی

معقول بات نہیں۔ اس سے حکومت و رعایا دونوں کے لئے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ لوگ جو ایک جگہ سے بھاگ کر دوسری جگہ جاتے ہیں، وہ خود بھی خانماں برباد ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشانیوں میں مبتلا کرتے ہیں۔ اول تو ابھی ہندوستان پر ہوائی حملہ کا کوئی اندیشہ نہیں اور اگر ہو بھی، تو اس کی تدبیر بھاگ نکلنا نہیں، بلکہ اپنی جگہ رہکر اس کے مقابلہ کی تدابیر اختیار کرنا ہے۔ شاید بھاگنے والے سمجھتے ہیں کہ حملہ کا مقصود محض انھیں کو ہلاک کرنا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو بھاگنے کی حالت میں اُن کی ہلاکت اور زیادہ یقینی ہے اور، اگر غلط ہے تو پھر کیوں نہ پوری آبادی کی قسمت کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کرکے صبر و سکون کے ساتھ مصیبت کا مردانہ مقابلہ کیا جائے۔

جنگ کے دوران میں ایک خطرہ اندرونی بدامنی کا بھی ہوا کرتا ہے اور ملک کا جرائم پیشہ عنصر ہمیشہ اسی تاک میں رہتا ہے کہ لوگ گھبرا کر بھاگیں اور وہ اس اضطراب سے فایدہ اُٹھا کر لوٹ مار شروع کردیں۔ اس لئے ملک کے اندر بدامنی پیدا نہ ہونے دینے کے لئے بھی ضروری ہے کہ جو شخص جہاں ہے وہیں رہے اور "اندیشۂ فردا" سے متاثر ہوکر بھاگ نکلنے کی غیر شریفانہ اور بزدلانہ حرکت اختیار نہ کرے۔

"سر اسٹیفورڈ کرپس" کے ناکام واپس جانے کے بعد، یہاں کی سیاسیات کا نہایت دلچسپ واقعہ راجہ گوپال اچاریہ کا وہ رزولیوشن ہے جس میں انھوں نے "پاکستان" کے قیام کو اُصولاً تسلیم کرلیا ہے۔ راجہ جی اپنی رائے پر اس قدر استحکام کے ساتھ قایم ہیں کہ انھوں نے کانگرس کی مجلس عاملہ سے بھی استعفا دیدیا اور اب وہ کانگرس میں ایک پاکستانی جماعت علیحدہ قایم کرنے کی بھی کوشش کررہے ہیں۔

مسلم لیگ نے راجہ جی کے اس خیال کا اول اول تو بڑے زور سے خیر مقدم کیا، لیکن اب یہ زور کچھ سرد پڑگیا ہے، یہاں تک کہ مسٹر جناح نے بھی ابتک کوئی مفصل بیان اس باب میں نہیں دیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہی چیز جو پہلے انھیں اچھی معلوم ہوتی تھی اب راجہ جی کے کہنے سے محل نظر ہوگئی ہو، کیونکہ "ساقی" کی غیر معمولی عنایتوں سے یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اس نے "کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ راجہ جی کی یہ اپیچ واقعی مسلم لیگ کی حمایت میں ہے یا اس سے کسی اور "استان" کی بنیاد ڈالنا مقصود ہے، بہرحال جو مقصد بھی ہو، "متحدہ ہند" کی اسکیم کے منافی ہے اور عملاً اس کی کامیابی بہت دشوار ہے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ چیز "گاندھی جی" کا وہ بیان ہے جس میں انھوں نے آزادی ہندوستان کے لئے کسی بڑی زبردست تحریک کے پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے ۔۔۔ جس وقت سے گاندھی جی کا یہ ارادہ ظاہر ہوا ہے، ہر شخص اپنی جگہ قیاس آرائی سے کام لے رہا ہے، لیکن آزادی۔ عدم تشدد ۔۔۔ ستیا گرہ اور امن پسندی ۔۔۔ ان سب کے امتزاج کی کوئی صحیح صورت سمجھ میں نہیں آتی ۔۔۔ بہرحال گاندھی جی جو صورت بھی تجویز کریں گے وہ ایک بار ملک میں ہلچل تو ضرور پیدا کردے گی، خواہ اس کے بعد انھیں اپنی غلطی کا اعتراف ہی کیوں نہ کرنا پڑے!

"حُر" جماعت کی شورش افسوسناک بات ہے۔ روہڑی (سندھ) کے قریب ایک گاؤں ہے کہنگڑی، وہیں کے پیر کے مُرید حُر کہلاتے ہیں ان کے پیر کا دعویٰ ہے کہ وہ سید شاہ علی مکی کی اولاد میں سے ہے جو محمد قاسم کے ساتھ حملۂ سندھ کے وقت آئے تھے (۷۱۲ء)۔ یہاں انھوں نے ایک ہندو خاتون سے شادی کرلی تھی جو مسلمان ہوگئی تھی۔ سید شاہ علی مکی کی بعض اولاد خیرپور کے علاقہ میں بھی بس گئی تھی جن میں سے ایک پیر محمد راشد نے بڑی جماعت مُریدوں کی پیدا کرلی۔ انھوں نے تیرہ بیٹے چھوڑے اور ان میں خلافت پر جھگڑا ہوا، لیکن چونکہ وہ اپنے بیٹے صبغۃ اللہ کو نامزد کرگئے تھے اس لئے زیادہ تر لوگوں نے انھیں کی پیروی کی، پیر صبغۃ اللہ نے ان کی وفاداری دیکھ کر انھیں حُر کا لقب دیا (وہ حُر جنھوں نے کربلا میں امام حسین کا ساتھ دیا تھا)۔ پیر صبغۃ اللہ کے ایک مُرید نے رفتہ رفتہ اس جماعت کو بہت منظم کرلیا اور ان کے لئے مونگیا رنگ کا لمبا کُرتہ اور خاص قسم کی پگڑی مقرر کی ۔۔۔ اس کے بعد حُر جماعت کی تاریخ گویا فتنہ و فساد کی تاریخ ہے جس میں خلافت کے جھگڑے، غارتگری اور حکومت کے خلاف بغاوت وغیرہ سب شامل ہیں اور یہ تاریخ ۱۸۹۳ء سے شروع ہوتی ہے۔

ہندوستان میں تصوف و درویشی کے بہت سے ادارے پائے جاتے ہیں، لیکن فتنہ و فساد، شورش و ہنگامہ کے لحاظ سے اس ادارہ کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی انھوں نے بارہا سر اُٹھایا اور ہمیشہ اس فتنہ کو سختی سے دبانا پڑا۔

جھوٹوں کے بادشاہ

جھوٹ بولنے کی ابتدا کیونکر ہوئی، اس کا سراغ لگانا مشکل ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انسان کے تاریخی دور کا کوئی حصہ اور معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں جھوٹ نہ بولا گیا ہو، اور اسی لئے جھوٹ کی قسموں کی انتہا نہیں

ماں اپنے بچے سے گہوارہ ہی میں جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے، لیکن اس کا نام پیار ہے، جب بچے ہوش سنبھالتے ہیں تو باپ جھوٹ بولتا ہے اور اس کا نام "طفل تسلی" ہے بچے اپنے والدین سے جھوٹ بولتے ہیں اور اسے "طفلانہ خوف" کہتے ہیں۔ اُستاد اپنے طلبہ سے جھوٹ بولتے ہیں اور اس کا نام "تادیب" ہے۔ دوست دوست سے جھوٹ بولتا ہے اور اسے مذاق کہتے ہیں۔ حکومت اپنی رعایا سے جھوٹ بولتی ہے اور اس کا نام "مصلحت" ہے۔ لیکن جھوٹ بولنا محض جھوٹ بولنے کی غرض سے — یہ آرٹ یقیناً بہت بعد کی پیداوار ہے

جھوٹ کی ایک قسم وہ ہے جس میں سنجیدگی کے ساتھ جھوٹ بولا جائے اور دوسرا وہ جس کا مقصود صرف لطف و مزاح ہو۔ فارسی میں بوستانِ خیال اور اُردو میں طلسم ہوشربا یقیناً دنیا کا سب سے بڑا "دفترِ کذب و دروغ" ہے، لیکن ان کا شمار اُن قصوں، کہانیوں میں ہوتا ہے، جن کو ہر پڑھنے والا جھوٹ ہی جانکر پڑھتا ہے۔ واقعاتی رنگ کے فسانوں سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ ان میں جس قدر مبالغہ اور دوراز عقل باتوں سے کام لیا گیا ہے، وہ خود اپنے کذب کی شہادت ہیں۔ یعنی ان میں جھوٹ تو سنجیدگی کے ساتھ بولا گیا ہے لیکن محض جھوٹ کی غرض سے — لطف و مزاح کے سلسلہ میں وہ تمام چھوٹے چھوٹے لطایف و ظرایف پیش کئے جاسکتے ہیں، جن سے ہر زبان کا لٹریچر مالا مال ہے

یوروپ کے لٹریچر میں ہمیں بعض مثالیں جھوٹ کی ایسی بھی ملتی ہیں، جن میں جھوٹ پوری قوت کے ساتھ بولا گیا، اور اس مقصد کے ساتھ کہ لوگ اسے سچا سمجھیں۔ اور اس سلسلہ میں بیرن موںچاسن (Baron Munchausen) اور سالمنازار (Psalmanazar) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے

بیرن، جرمنی کا باشندہ تھا، جس نے روس کی سیاحت کرنے کے بعد اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور جتنا جھوٹ بول سکتا تھا وہ سب اس کتاب میں پایا جاتا ہے، چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "دورانِ سیاحت میں مجھے ایک بارہ سنگھا ملا، اس وقت میں چیری کھا رہا تھا، میں نے اس کی گٹھلی پھینک کر ماری، جو اس کے سینگوں میں لگی اور آخرکار بارہ سنگھے کے سر سے ایک پورا درخت چیری کا اُگ آیا"

یہیں روس میں اس نے ایک کوئی درخت بویا اور وہ بڑھتے بڑھتے اتنا بلند ہوگیا کہ چاند کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا ایک اور لطیف جھوٹ ملاحظہ ہو عام طور پر چیزوں کے محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ انھیں اسپرٹ میں ڈالدیتے ہیں اور وہ سڑنے گلنے سے محفوظ رہتی ہیں، لیکن بیرن لکھتا ہے کہ میں نے ایک بار ایک عمدہ گانے والے کی تانوں اور گٹکریوں کو بھی اسپرٹ میں رکھکر محفوظ کرلیا

روس کی سیاحت کے دوران میں اسے جنگلی جانوروں سے بہت واسطہ پڑا جن میں سے بعض کو اس نے رام کرلیا، اور بعض کو ہلاک کر ڈالا اور بعض سے وہ بال بال بچ گیا۔ اس سلسلہ میں دو بھیڑیوں کے واقعات بہت عجیب و غریب ہیں۔ ایک بھیڑئے کو تو اُس نے پکڑ کر لگام چڑھادی اور گاڑی میں جوت کر سنٹ پیٹرسبرگ کے بازار دن میں اسے لئے پھرا، اور دوسرا بھیڑیا وہ تھا جس کے حلق کے اندر ہاتھ ڈالکر وہ دُم تک لے گیا اور پھر ہاتھ باہر کھینچکر بھیڑئے کو اس طرح اُلٹ دیا جس طرح دستانہ کو اُلٹ دیتے ہیں، یعنی بھیڑئے کے جسم کا بیرونی حصہ اندر ہوگیا اور اندرونی حصہ باہر آگیا

بیرن کوئی فرضی ہستی نہیں تھا بلکہ روسی فوج میں ایک افسر کی حیثیت رکھتا تھا، جس نے سنہ ۱۷۴۰ء میں ترکوں کی لڑائی کے بعد پنشن لی اور اپنے عجیب و غریب تجربات برلن کے بعض رسایل میں شایع کرائے۔ اتفاق سے ایک شخص نے جس کا نام راسپ (Raspe) تھا ان مقالات کو غور سے پڑھا اور اس نے سوچا کہ

اگر ان سب کو یکجا مسلسل واقعات کی طرح شایع کر دیا جائے تو کافی آمدنی ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ جرمنی میں رہنے کے بعد وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا اس لئے بھاگ کر انگلستان آیا اور اس طرح بیرن کے سفرنامہ کا سب سے پہلا اڈیشن انگریزی زبان میں شایع ہوا

یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ انگریزی زبان کے طنز نگاروں نے ہر نئے اڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرنا شروع کیا، لیکن یہ اضافہ کوئی اچھا پیوند نہ تھا، اس لئے رفتہ رفتہ لوگوں کی دلچسپی کم ہونے لگی

بیرن کے جھوٹ اور دوسرے لوگوں کے اضافہ میں یہ فرق تھا کہ بیرن کے جھوٹ میں سچ کا انداز تھا اور ہلکی سی ظرافت جو دوسروں کے حاشیہ آرائی میں مفقود تھی گویا وہ ایک ایسا لطیفہ گو تھا جو بغیر ہنسے ہوئے دوسروں کو ہنسانا چاہتا تھا۔ علاوہ بریں، اس کے جھوٹ میں ایک منطقی استدلال بھی ہوا کرتا تھا اور بچوں کی سی سادگی بھی جو ہر بات پر حیران ہو جاتے ہیں

وہ لکھتا ہے :۔ "میں ایک بار کسی گاؤں میں پہونچا جو شدید برفباری کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا، میں نے اپنا گھوڑا کھونٹا سمجھ کر ایک لکڑی سے باندھ دیا جو زمین سے ابھری ہوئی نظر آتی تھی، رات بھر میں برف پگھل گئی اور صبح کو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑا ایک منارہ کے بادنما سے بندھا ہوا ہے" مطلب یہ کہ برفباری کی کثرت سے پورا منارہ چوٹی تک چھپ گیا تھا اور صرف بادنما کا حصہ کھلا ہوا باقی رہ گیا تھا جسے کھونٹا سمجھ کر اس نے گھوڑا باندھ دیا تھا، اس لئے جب برف پگھل گئی تو گھوڑا بادنما سے بندھا ہوا لٹک رہا تھا

ایک دفعہ اس کے پوستین کے کوٹ کو کسی باؤلے کتے نے کاٹ لیا۔ تو کوٹ بھی دیوانہ ہو کر کتے کی طرح ادھر اُدھر مارا مارا پھرنے لگا

ایکبار اس کا دستہ کسی گاؤں میں پہونچا جہاں سخت برفباری ہو رہی تھی۔ سوتے وقت اس نے بگل بجایا، لیکن اس سے کوئی آواز پیدا نہ ہو سکی۔ دوسرے دن جب وہ کسی اور مقام پر پہونچا جہاں سردی کم تھی اور بگل کو کھونٹی پر لٹکا دیا تو اُس سے وہی آواز نکلنے لگی جو پہلے نہ نکلی تھی۔ یعنی وہ آواز جو سردی کی شدت سے بگل کے اندر جم کر رہ گئی تھی، گرم جگہ پہونچکر سنائی دینے لگی

بیرن کا جھوٹ ایک طرح سے گویا جن و پری کی کہانیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے اور جو یورپ کے بعض قصّے کہانیوں سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، مثلاً درخت کا اُگ کر چاند تک پہونچ جانا کہ بعینہٖ یہی کہانی جرمنی کے (Fairy tales) میں بھی پائی جاتی ہے

جرمن زبان میں اس قسم کی کہانیاں بہت پائی جاتی ہیں اور (Schildburg) کے رہنے والوں سے اس قسم کے احمقانہ واقعات اکثر منسوب کئے جاتے ہیں سرزمین شلاراف لینڈ کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں، جہاں اسی شخص کو بادشاہ بنایا جاتا تھا جو سب سے بڑا جھوٹ بولنے پر قادر ہو۔ چنانچہ ایک شخص کو اس روایت پر بادشاہ بنایا گیا کہ اس نے بھُنے ہوئے مسلم سوروں کو ادھر اُدھر لوگوں کے پاس جاتے اور کھانے کی درخواست کرتے ہوئے دیکھا تھا

انگریزی زبان میں اس قسم کے ادب کا عنصر بہت ضعیف ہے۔ للی پٹ (Lilliput) کے یہاں طنز کا حصہ زیادہ غالب ہے اور شاعری کا کم

بیرن کی سی دروغ بافی زیادہ تر سیاحوں کے یہاں پائی جاتی ہے، لیکن بیرن کے بعد سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ جھوٹ بولنے والا سالمنازر ہوا ہے ——

یہ لینگوڈاک کا رہنے والا تھا جو اپنے داستان گوئیوں کی وجہ سے مشہور ہے

بیرن کا جھوٹ تو ایک قسم کا تفریحی جھوٹ تھا جس سے مقصود دھوکا دینا نہ تھا، لیکن اس شخص نے تو جھوٹ کی ایک عمارت کھڑی کر دی اور عرصہ تک لوگوں کو اسپر سچ کا گمان رہا۔ اس کی عمر ابھی ۲۰ سال کی بھی نہ تھی کہ ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر اس نے سیاحت شروع کر دی، لیکن یہ سیاحت یورپ سے باہر کی نہ تھی، کچھ دنوں تک غائب رہنے کے بعد جب واپس آیا تو وہ بالکل دوسرا شخص تھا، یعنی یہ اپنے آپ کو جاپان کا باشندہ بتانے لگا اور اسی کے ساتھ جزیرۂ فارموسا کے حالات سیاحت بیان کئے جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا

اس نے یہ حالات جاپانی زبان میں لکھے حالانکہ وہ اس زبان سے ناواقف تھا، اس طرح اس نے گویا اپنی طرف سے ایک زبان علٰحدہ ایجاد کی (جسے وہ جاپانی کہتا تھا) اور اس زبان میں اس نے جاپانیوں کی معاشرت اور ان کے مذہبی رسوم کی تاریخ لکھی، جاپانی زبان کی گرامر ایجاد کی اور بہت سے ایسے اعداد و شمار پیش کئے جنھیں ایک جاپان کا باشندہ ہی بتا سکتا تھا۔ الغرض یہ شخص اس قدر محنت و سلیقہ سے جھوٹ بولا کہ لوگ عرصہ تک اس کو سچ سمجھتے رہے اور شاید دُنیا کی تاریخ میں یہی پہلا شخص ہے جس نے جھوٹ بولنے کا ایسا زبردست ریکارڈ قائم کیا۔

اے حجرہ نشینو!

شکن ڈالے پڑے ہو، خاک آلودہ جبینوں میں
چھپائے دست و بازو لمبی لمبی آستینوں میں

یبوست کا تسلّط ہے دماغِ زہد پرور پر
تناسب ہے قیاسوں میں، نہ گہرائی قرینوں میں

وہی وقتی تضرّع ہے، وہی رسمی جبیں سائی
غلامی اینڈتی پھرتی ہے سجدے کے نگینوں میں

سمجھتے ہو تمھارا دل نہیں، عرشِ الٰہی ہے
خدا کو بند کر رکھا ہے تم نے اپنے سینوں میں

ابوجہلو! تمھیں عرفاں نہیں اس راز کا شاید
خدا اب جلوہ فرما ہے بموں اور گن مشینوں میں

کشاکش ہائے نظمِ عالمِ امکاں میں ملتا ہے
وہ حجروں میں نہیں، اب جنگ کے میداں میں ملتا ہے

نہیں ہے امتدادِ وقت کا تم کو یقیں اب تک
کہ تم ہو دورِ ماضی کی طرح بارِ زمیں اب تک

ہوئی مدت کہ تم نے سلب کر لی روحِ ملّت کی
رہے میّت فروشِ مذہب و ایمان و دیں اب تک

نماز و سجدہ تک محدود استعداد و ہمّت ہے
وضو میں صرف چڑھتی ہیں تمھاری آستیں اب تک

روایاتِ کہن کا درس اب بھی دے رہے ہو تم
خبر کچھ انقلابِ بزمِ ہستی کی نہیں اب تک

قیامت ساحلِ مشرق سے ٹکراتی ہے سر اپنا
مگر اے بزدلو! تم ہو یہاں حجرہ نشیں اب تک

تمھارا خانوادہ قوم کا اک جزوِ مہمل ہے
جو ہے اسلام کا داعی، وہی طبقہ معطّل ہے

سبق تیرہ صدی پہلے کے ابتک ہیں زبانوں پر
کیا کرتے ہو تم لفظوں سے جادو نوجوانوں پر

حوادث سے زمیں کا گوشہ گوشہ شعلہ بر سر ہے
دماغ ابتک تمھارے ناچتے ہیں آسمانوں پر

حدیثِ ارتقا ایسی اذانِ بزمِ ہستی ہے
کہ سنتے ہی جسے تم ہاتھ رکھ لیتے ہو کانوں پر

خُدا اُن کے بنے بیٹھے ہو تم زعمِ تقدس میں
پڑے رہتے ہیں جو جاہل تمھارے آستانوں پر

عصا و جبّہ و عمامہ اسبابِ نمایش ہیں
مقدس جال ہیں یہ لمبے لمبے بال شانوں پر

شکاری قوم کے ہو - تاجرِ علم و عقیدت ہو
حقیقت میں تمھیں وجہ زوالِ اہلِ ملّت ہو

چھپے بیٹھے ہوئے ہو تم قدامت کے نقابوں میں
مسلسل، عورتوں کی طرح رہتے ہو حجابوں میں

اُٹھو، اور دو ثبوت اسوقت اپنے مرد ہونے کا
کہ تم ہو مجلسِ اہلِ وطن کے باریابوں میں

تحفظ میں وطن کے - ساتھ اربابِ وطن کا دو
وطن ہے مبتلا اسوقت صد گونہ عذابوں میں

سوادِ ہند کے چاروں طرف بارود پھیلی ہے
نہیں معلوم کس دن آگ لگ جائے شتابوں میں

یہ حجرے ہی تمھارے مستقل مدفن نہ بن جائیں
کہیں تم دب کے رہ جاؤ نہ بوسیدہ کتابوں میں

ہے عہدِ جنگ، ذہنیت بدل کر باہر آجاؤ
جو زندہ ہو تو حجروں سے نکل کر باہر آجاؤ

سیماب اکبرآبادی

بھگتی تحریک کے شاعر

علم و ادب کا احیاء

امیر خسرو کے بعد کچھ عرصہ تک ادب کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ زمانہ شعر و شاعری کے لئے سازگار نہ تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ اس دور میں مذہب کا بہت زور رہا۔ مذہب کی تبلیغ کے لئے شاعری کو ایک ناکارہ سی چیز سمجھا جاتا ہے لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے نظم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آخرکار جس مذہبی تحریک کی بدولت ہندی شاعری کو دیس نکالا ملا تھا وہی ڈیڑھ دو سو برس کے بعد اس کی ترقی کا باعث ہوئی۔ شمالی ہندوستان میں وشنو مذہب کا پھیلنا تھا کہ ہندی ادب میں جان پڑ گئی۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد ہندوؤں میں ایک بھاگ دوڑ مچ گئی۔ یہی حال سنہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کا ہوا تھا جسے ترکوں نے فتح کیا تھا۔ وہاں کے یونانی عالم اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بختیار کے بیٹے محمد خلجی نے جب بہار فتح کیا تو سارا ہندوستان سہم گیا۔ بڑے بڑے عالم پنڈت اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے چن چن کر بت توڑے اور مندر برباد کئے لیکن اس سے ہندو مذہب فنا نہ ہو سکا۔ ہندو مذہب کا فلسفہ ایسا اٹل ہے کہ اگر رسم و رواج کا خاتمہ بھی ہو جائے پھر بھی ہندو دھرم اس فلسفہ کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمان پرانے مذہب کو مٹا نہ سکے ورنہ جہاں کہیں بھی یہ گئے انھوں نے سارے ملک کو مسلمان بنا دیا۔ چنانچہ مذہب اسلام سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے وشنو دھرم کا پرچار ہوا لیکن آگے چل کر ان دونوں کے عناصر اس طرح خلط ملط ہو گئے کہ ایک اور مذہب پیدا ہوا جسے "صوفی مت" کہتے ہیں۔ اس طرح ہندو مسلمانوں کے خیالات میں بڑی حد تک یگانگت پیدا ہو گئی جیسے پھر کبھی نہ پیدا ہوئی۔

بھگتی تحریک کو تین شاخوں میں منقسم کر سکتے ہیں (۱) رام کی بھگتی (۲) کرشن کی بھگتی اور (۳) صوفی مت۔ یہ لازم ہے کہ ان تحریکوں کو ایک دوسرے سے بالکل الگ سمجھا جائے کیونکہ ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اتنی بات تو ہر وشنو، چاہے وہ کسی فرقہ کا ہو، مانتا ہے کہ خدا انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے یعنی اوتار لیتا ہے اور انسان اس کے آگے سرِ اطاعت خم کرتا ہے۔ یہی مکتی یا نجات حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔ یہ فلسفہ بڑا دلکش تھا۔ اس کے مقابلہ میں برہمنوں کا فلسفہ وحدانیت جس کے بانی شنکر اچاریہ تھے بہت خشک تھا۔ چنانچہ وشنو دھرم کے بے شمار پیرو کار ہو گئے اور برہمنوں کا زور دن بدن کم ہونے لگا۔ ان معنوں میں کہا جا سکتا ہے کہ وشنو تحریک برہمنوں کا اقتدار کم کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ وشنو مذہب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی تھیوسوفی (Theosophy) سے کیا جا سکتا ہے جس میں محض رسم و رواج کی پابندی کا نام مذہب نہیں ہے بلکہ جس کا واحد مقولہ یہ ہے کہ "خدا محبت ہے اور محبت خدا" (God is love and love is God)۔ جب یہ حال ہو تو وشنو مذہب کیوں نہ مقبولِ عام ہوتا۔ اس کی بے نظیر مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ اس نے سنسکرت کو چھوڑ کر عام بول چال کی زبان میں دھرم کا پرچار کرنا شروع کیا۔ اس لئے مذہب کے دائرہ میں اس نے جو کچھ کیا وہ تو ایک الگ چیز ہے۔ لٹریچر پر اس کے احسانات بہت زیادہ ہیں چنانچہ قدیم ہندی نظم کا سب سے خوشگوار حصہ وہی ہے جو رام اور کرشن کے بھگتوں نے لکھا ہے۔

تحریک بھگتی کا آغاز

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بھگتی تحریک کی ابتدا رامانند سے ہوئی لیکن ان سے پہلے بھی بعض بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے رامانند کے لئے شاہراہ طیار کی تھی چنانچہ سکھوں کی مقدس کتاب "آدی گرنتھ صاحب" ہے جس میں بہت سے قدیم شاعروں کا کلام ہے۔ اسے سنہ ۱۶۰۴ء میں گرو ارجن نے مرتب کیا تھا۔ اس میں بھگتی کے اشعار بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں[1]۔ ان سے بہت پہلے سرن اور نام دیو دو شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں بہت زیادہ حسن اور شیرینی ہے۔ عہدِ قدیم کا ایک اور شاعر ہے جس کا نام جے دیو ہے۔ یہ "گیتا گوبند" نامی مشہور کتاب کا مصنف بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ کوئی اور شخص رہا ہوگا ہم نے جس شاعر کا ذکر کیا ہے اس کی نسبت کچھ معلوم نہ ہو سکا اور نہ اس کا کلام ہی دستیاب ہو سکا۔

---

[1] گرنتھ صاحب کسی ایک آدمی کی تصنیف نہیں ہے اس میں بہت سے شاعروں کا کلام پایا جاتا ہے چنانچہ کبیر کا بہت سا منتخب کلام اس میں شامل کیا گیا ہے۔ قدیم ترین بھگتی شاعروں کے اشعار بھی اس میں پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے یہ ایک نادر کتاب ہے۔

سرن پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ کہتے ہیں اس کی پیدائش سندھ میں کسی قصاب کے گھر ہوئی تھی لیکن اس نے اپنا آبائی پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا اور ساری زندگی یاد الٰہی میں گزار دی۔ "گرنتھ صاحب" میں اس کے دو حمد ملتے ہیں۔

نام دیو، مرہٹہ دیس کا رہنے والا تھا اور پورندر پور کے "وٹھوبا" کا چیلا تھا۔ وہ غالباً پندرھویں صدی کی ابتدا میں ہوا ہے۔ ذات کا درزی تھا۔ پہلے اس نے اپنے پیشے کی طرف بہت توجہ صرف کی لیکن جب اس میں نفع کی صورت نہ دیکھی تو ڈاکوؤں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ آخر اس نے اس مکروہ پیشہ سے توبہ کی اور سادھو ہو گیا۔ اس کی شاعری کا دور بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ نام دیو نے اپنی مادری زبان مرہٹی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہندی میں بھی اس کا کلام بہت وافر ہے۔ اس کے بہت سے حمد گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ نام دیو کی مختلف اختیارات شخصیت بہت دلچسپ ہے۔ مذہب ہو یا ادب دونوں حیثیتوں سے بہت کم انسان ایسے گزرے ہیں جو اس کی صف میں کھڑے کئے جا سکیں۔

رامانند

غالباً رامانند کا عہد زندگی ۱۴۰۰ء ہے۔ انھوں نے رام چندر جی کو خدا کا اوتار مانا ہے اور اس کی تعلیم زندگی بھر دیتے رہے۔ ان کے خیال میں رام کی بھگتی سعادت ارین ہے جس سے انسان آواگون کی زنجیروں سے نجات پا جاتا ہے۔ رامانند اس عقیدہ کے بانی نہیں ہیں۔ ان سے پہلے نام دیو اور سرن یہی درس دے گئے تھے البتہ ان کی تعلیم کسی منظم تحریک کی صورت میں لوگوں کے سامنے نہیں آئی اس لئے رامانند کو مواد طیار ملا اور انھوں نے اپنی تحریک میں بڑی شاندار کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے بنارس میں قیام کیا اور یہیں اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہندوستان کے عظیم ترین مذہبی رہنماؤں میں سے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے پیروؤں میں قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے بلکہ دوسرے فرقوں کے لوگ بھی انھیں اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔

لیکن اس پرعظمت زندگی سے ادب کو زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہ ملا۔ بحیثیت شاعر کے ان کا مرتبہ بلند نہیں ہے ——— گرنتھ صاحب اور بعض دیگر مجموعوں میں ان کا ہندی کلام موجود ہے۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ خدا انسان کے دل میں ہے۔ اس کا نور ذرے ذرے میں پھیلا ہوا ہے، پھر ہم کیوں اسے مندر یا مسجد میں تلاش کریں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ رامانند بت پرستی کے خلاف تھے گو انھوں نے اس طرز عبادت پر حرف ضرور رکھا ہے۔ وہ رام کے بھگت تھے لیکن بت پرستی کو جائز سمجھتے تھے۔ تثلیث کے بھی قائل تھے اور ہندو دیومالا کی بڑی قدر کرتے تھے۔

بھگتی دھرم کا خاص اصول یہ ہے کہ اگر انسان میں سچی لگن ہے تو خدا ضرور مل جاتا ہے۔ کون ایسا انسان ہے جسے خدا کی تلاش نہ ہو، پس رامانند کے مذہب میں ہر مذہب و ملت اور ہر فرقہ و طبقہ کے لوگ شامل ہو گئے۔ ہندو مسلمان، شودر، اچھوت، مرد عورت سب نے ان کے مذہب کو لبیک کہا لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مساوات اور رواداری کے باوجود بھی ذات پات کی بندھن نہیں ٹوٹی بلکہ دن بہ دن مضبوط ہوتی گئی۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ در پردہ برہمنوں کا اب بھی زور تھا اور مذہب اسلام کے سامنے ذات پات کی آہنی دیوار قائم کرنے کا جذبہ دن بہ دن دلوں میں موجزن ہوتا جا رہا تھا۔ رامانند اور ان کے چیلوں نے سنسکرت کو دور ہی سے سلام کیا اور ہندی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ ٹھہرایا۔ ہندی کی تحریک اس طرح ایک مخصوص طبقہ سے نکل کر عوام میں پہونچی۔

رامانند کے شاگرد ۱۰ ہیں بارہ زیادہ مشہور ہیں جن کا کلام ابھی تک محفوظ چلا آتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل ذکر راجہ پیپا ہیں جو گگروں گڑھ کے راجہ تھے۔ انکی ولادت ۱۴۲۵ء میں ہوئی تھی۔ رامانند کے حلقۂ اثر میں آنے کے بعد انھوں نے راج پاٹ چھوڑ دیا اور فقیر ہو گئے۔ دوسرے دھنا جاٹ تھے جو ان سے دس سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی نسبت مزید تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ سین مہاراجہ ریواں کے یہاں نائی تھا۔ اس کے بعض دوہرے گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔ عبادنند، امرت، دھارا نامی کتاب کے مصنف تھے۔ اس کا موضوع ویدانت ہے۔ یہ کتاب چودہ فصلوں میں ہے۔ ریداس ذات کے چمار تھے لیکن ان سے زیادہ سچا بھگت شاید بھگتی کی تاریخ میں کبھی نہ پیدا ہوا ہوگا۔ ریداس جیتے تھے تو رام کے لئے اور مرتے تھے تو رام کے لئے۔ ان کی عظمت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ میرا بائی ایسی بھگت ان کی چیلی تھی۔ ریداس کے تیس حمد گرنتھ صاحب میں درج ہیں۔

کبیر داس

مذہبی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے کبیر داس رامانند کے شاگرد رشید کہے جا سکتے ہیں۔ روایت ہے کہ وہ کسی بیوہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے اپنی لاج رکھنے کے لئے بچے کو بنارس کے قریب کسی تالاب[1] میں پھینک دیا۔ ایک جولاہے نے جس کا نام نیرو تھا یہ دلخراش منظر دیکھا اور تالاب میں کود کر بچے کو نکال لیا۔ اس کی بیوی جس کا نام نیما تھا بچے کو پاکر بہت خوش ہوئی۔ یہ دونوں بے اولاد تھے، اولاد کو ترس گئے تھے انھوں نے اس بچہ کو پالا

[1] داستان معنف راماین کے بارے میں بھی اسی طرح کا قصہ مشہور ہے۔ یونان کے مشہور شاعر ہومر کی نسبت بھی ایسی ہی ایک روایت سنی جاتی ہے۔ [2] اس تالاب کا نام میرتارا ہے۔

پوسا اور اس کا نام کبیر رکھا۔ کبیر کی نسبت ایک روایت اور بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ جوان تھے اس زمانہ میں ہندو مسلمان دونوں ان سے ناراض ہوگئے۔ ہندو اس وجہ سے برہم تھے کہ کبیر نے اچھوتوں کو جنیو پہننے کی اجازت دیدی تھی، مسلمان اس وجہ سے خفا تھے کہ انھوں نے رام کو خدا کا اوتار مانا تھا۔ لوگ طعنے دیتے تھے کہ تمھارے تو کوئی گرو ہی نہیں۔ کبیر کے لئے یہ کلنگ کا ٹیکا تھا اسے مٹانے کے لئے انھوں نے راما نند کا ساتھ کیا۔ پہلے تو ہیں کلام تھا کہ گرو انھیں اپنے مریدوں میں شامل کریں گے یا نہیں اس لئے انھوں نے یہ سوانگ رچا کہ عبور کے وقت گھاٹ کی سیڑھی پر لیٹ گئے۔ ادھر ہی سے گرو جی کا گزر ہوتا تھا۔ جب وہ سیڑھی کے سہارے نیچے اترنے لگے تو ان کے پیر کبیر کے بدن سے لگ کر لڑکھڑا گئے اس پر انھوں نے "رام رام" کہا۔ یہ کلمہ منھ سے نکلنا تھا کہ کبیر ان کے چیلے ہوگئے۔ اب کبیر راما نند کے نقش قدم پر چلنے لگے اور ایسے ۔ چلے کہ اپنے گرو سے بہت آگے نکل گئے، ان کا مذہب "کبیر پنتھ" کہلاتا ہے جس کے ماننے والے اب بھی شمالی ہندوستان میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کبیر مسلمان تھے اس وجہ سے ان کی تعلیم میں اسلامی رنگ بھی موجود ہے۔ انھوں خدا کی وحدانیت پر بہت زور دیا ہے۔ خدا کے لئے وہ "رام" "ہری" "گوبند" اور "اللہ" وغیرہ ہر طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں کبیر کو اوتاروں پر اعتقاد نہ تھا۔ بت پرستی اور اس طرح کے بہترے " پاکھنڈوں" سے انھیں سخت نفرت تھی۔ چونکہ لوگ برہمنوں کی زیادتیوں سے تنگ آگئے تھے اس وجہ سے انھیں کبیر کی تعلیم بہت پسند آئی۔ کبیر کو وہی کامیابی نصیب ہوئی جو ان سے تقریباً دو ہزار برس پہلے گوتم بدھ کو ہوئی تھی۔ ہندوستان میں جو مذہب کا اس قدر اثر ہے وہ انھیں مہاتماؤں کی تعلیم کی بدولت ہے (ملاحظہ ہو کتاب "کبیر اینڈ کبیر پنتھ" مصنفہ پادری ای۔ سی ڈیوک)

کبیر پنتھیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ صرف کبیر کے چیلے ہی نہیں بلکہ اور متوں کے ماننے والے بھی ان کے اصولوں سے بہت فیض اٹھاتے ہیں۔ ان بہت سے متوں کے پھیل جانے سے شاعری کا رواج بہت بڑھ گیا اور اس طرح ادب کا ذخیرہ بھی وسیع ہوگیا۔ کبیر کی نسبت سیکڑوں روایات مشہور ہیں لیکن ان میں بہت کم صداقت کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ کبیر نے اپنے مذہبی خیالات کی دھن میں کبھی کبھی اپنے کنبہ والوں کو ناراض بھی کر دیا تھا یہی نہیں ہندو مسلمان ہر ایک ان سے ناراض تھا۔ یہ مخالفت ساری زندگی ان کے لئے سوہان روح رہی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ کبیر ہندو دھرم اور مذہب اسلام دونوں کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ سکندر لودی جو اس زمانہ میں بادشاہ تھا کبیر پر بہت برہم ہوا اور انھیں قید کرلیا۔ رہائی کے بعد بھی انھیں حکم دیا کہ بنارس سے نکل جائیں۔ آخر انھیں بنارس چھوڑنا پڑا اور قصبہ مگہر ضلع گورکھپور میں قیام کرنا پڑا ۔ یہیں پیرانہ سالی میں ان کا انتقال ہوا۔

کبیر کی نظمیں بے شمار ہیں جس کا ایک نادر مجموعہ بابو شیام سندر داس نے "کبیر گرنتھاولی" کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے بھگتی تحریک پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ کبیر کی نسبت جو عام طور پر مشہور ہے کہ انھوں نے ہندی زبان کی بڑی خدمت کی ہے، اس کی مولف موصوف نے پر زور تردید کی ہے۔ کبیر کے مذہب، ان کے گرو کا نام، ان کے شاگردوں کی تعداد اور ان کے سنہ وفات کی نسبت سخت اختلاف ہے لیکن ڈاکٹر "میورا" کی سند پر ہم نے جو حالات کبیر کے درج کئے ہیں وہی تحقیق سے صحیح معلوم ہوتے ہیں[2]۔

کبیر کا مذہب صوفیوں سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے یہاں تک کہ ان پر بھی بادشاہ وقت کا قہر اسی طرح نازل ہوا جس طرح عرب میں منصور حلاج پر "انا الحق" کہنے کے باعث نازل ہوا تھا۔ کبیر کی آزادروی ان کے ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے۔ وہ دنیا کو "مایا جال" سمجھتے تھے اس لئے اس کی ترغیبات میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا مذہب انسان کا مذہب تھا ہندو مسلمان کا مذہب نہیں ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر نے اپنے کلام کو خود تحریر کا جامہ نہیں پہنایا۔ غالباً یہ ان کے شاگردوں نے کیا۔ کبیر کے بہت سے مجموعے موجود ہیں لیکن ان میں بہت سا حصہ ایسا ہے جس کے وہ مصنف نہیں تھے۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا حصہ "گرنتھ صاحب" میں موجود ہے۔ ایک مجموعہ "بیجک" (مخفی خزانہ) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب کبیر پنتھیوں کی مذہبی اور مقدس کتاب ہے۔ اسے بھاگو داس نے ترتیب دی جنھیں کبیر سے بڑا اعتقاد تھا۔ یہ کوئی مسلسل نظم نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سی نظمیں ہیں جن میں اکثر کی بحریں مختلف ہیں۔ ایک اور مجموعہ نظم "رامائنی" ہے جس میں ان کے تمام مذہبی اصول اکٹھا کر دئے ہیں۔ "سیرہ" نامی اسی طرح کی نظم ہے لیکن اس کی بحر رامائنی سے مختلف ہے۔ چونتیسا میں "اکرہ" رسم الخط کی مذہبی اہمیت کا ذکر ہے۔ وپرتیسی میں برہمنوں کی قدامت پرستی پر سخت چوٹ کی گئی ہے۔ "کہرا"۔ "بسنتا"۔ "بیلی"۔ "چاچری"۔ "برہولی"۔ اور "ہنڈولا" بھی مذہبی رنگ کی نظمیں ہیں۔ جن بحروں میں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں ان کے بھی یہی نام ہیں۔ ان نظموں میں لگ بھگ چار سو ساکھی (بند) ہیں۔ گرنتھ صاحب کا وہ حصہ جو کبیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

---

[1] کبیر کے پیر شیخ تقی نامی ایک بزرگ تھے۔ کبیر کے دو چیلے دھرم داس اور گوپال بہت مشہور ہیں۔ کبیر کی بیوی کا نام لوئی اور بیٹے کا نام کمال تھا۔ (ماخوذ از شیام سندر داس)

[2] ملاحظہ ہو: Antiques of the North Western Provinces by Dr: Fichrer

سب کا سب انھیں کی تصنیف نہیں ہے۔ اسی طرح "بیجک"، جو کبیر کی تصنیف سمجھی جاتی ہے اس میں آدھے سے زیادہ اشعار دوسروں کے کہے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ ہزار سے زیادہ دوہے کبیر کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ محلہ کبیر پورا شہر بنارس میں کبیر کی ایک کتاب ملی ہے اس میں ان کے کلام کا بیشتر حصہ موجود ہے۔ اس کتاب میں بیس ابواب ہیں جس میں زیادہ تر حصے شاگردوں کے لکھے ہوئے ہیں لیکن یہ اب تک شایع نہیں ہوئے۔ بیجک اودھی زبان میں ہے اس لئے کبیر کے بقیہ کلام سے مختلف ہے جس کی زبان عامیانہ اور سوقیت سے بھری ہوئی ہے[1]۔ زبان تو گنوارو ہے ہی اسلوب بیان بھی سخت عامیانہ ہے۔ الفاظ ایک دوسرے میں زبردستی گتھ دئے گئے ہیں۔ حرفی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ جیسے ادبی حیثیت نہیں رکھتے صرف گنواروں کی بول چال میں کام آسکتے ہیں۔ صنعت ایہام اور صنائع بدائع کی اس قدر بھرمار ہے کہ بعض اوقات مطلب گم ہو جاتا ہے۔ باوجود ان سب خامیوں کے کبیر کا مرتبہ ہندی شاعری میں بہت بلند ہے۔ "پاکھنڈ" یعنی ظاہر پرستی کے انھوں نے پرخچے اڑا دئے، خدا پرستی کا صحیح اور سب سے آسان راستہ بتایا۔ یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ ان کے اشعار دل میں چبھنے والے اور جذبات کو ابھارنے والے ہوتے ہیں۔ ہندی شاعری کا انھیں باوا آدم کہا جاتا ہے۔ شاعری میں جو ایک صنف حمد و ثنا کی بہت مقبول ہے اس کے بانی یہی ہیں۔ ان سے پیشتر جو شعرا گزرے ہیں، ان کی تعلیم اس قدر عام نہ ہو سکی تھی۔ کبیر نے مختلف مذاہب اور اعتقادات کے لوگوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ کبیر کے بعد جو لوگ ہوئے وہ انھیں کے نقش قدم پر چلے۔ کبیر کے خیالات ہندوستان میں اس قدر مقبول ہیں کہ شاعر اعظم رابندرناتھ ٹیگور نے ان کی سو نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور انھیں کے خیالات سے مستفید ہو کر "گیتان جلی" لکھی جس پر انھیں دنیا کا سب سے بڑا انعام "نوبل پرائز" ملا (ملاحظہ ہو Hundred Poems of Kabir by Dr. Tagore)

ایک خاص بات جو کبیر اور ان کے دور کے تمام شعرا میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ایک خاص پیغام کی حامل ہوتی ہے۔ ہماری شاعری میں آج یہ نقص بتایا جاتا ہے کہ ہم خود نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ اعتراض بڑی حد تک درست ہے۔ اردو ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کی جمع پونجی وہی چند عشقیہ باتیں، ہجر و فراق اور رز[illegible] کے مضامین ہیں۔ ہم اس بدنما داغ کو دھونے کے لئے اس سے بہتر اور کیا کام کر سکتے ہیں کہ کبیر، نانک اور چیتنیہ کی طرح اپنی شاعری کا ایک خاص مقصد بنا لیں۔ دنیا کے تمام مذہب ملکوں میں یہی ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کی بنیاد پڑ چکی ہے لیکن ہنوز ترقی کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

کبیر کے ایک بیٹے کمال نامی تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کی تمام تعلیم کو مٹی میں ملا دیا اور اس کی سخت تردید کی اسی وجہ سے ایک بار کبیر نے خود کہا تھا:-

"میرے کو کھ لے سانپ جنا ہے" یعنی میری اولاد سخت نالائق ہے۔

نانک

کبیر کی تعلیم سے جتنے مذاہب پیدا ہوئے ان میں نانک کے مذہب نے سب سے زیادہ ترقی کی۔ نانک کا زمانہ حیات (۱۴۶۹-۱۵۳۸ء) ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب یہ ۲۰ برس کے تھے تو ان کی ملاقات کبیر داس سے ہوئی۔ اس ملاقات کا یہ اثر ہوا کہ نانک کے خیالات بھی کبیر سے ملنے جلنے لگے۔ یہاں تک کہ نانک ہندو مذہب سے کبیر کی نسبت زیادہ قریب ہیں۔ عرصہ تک گرو نانک اپنے شاگرد مرداں کے ساتھ ادھر ادھر پھرتے رہتے[3]۔ مرداں کو ساز بجانے میں اچھی مہارت تھی۔ اس کے کلام ملتے ہیں ان میں پنجابی اور ہندی کی کھچڑی ہوتی ہے۔ اگرچہ بحیثیت شاعر اس کا مقابلہ کبیر سے نہیں کیا جا سکتا پھر بھی اس کے اشعار میں شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ نانک کے بہت سے چیلے تھے جو عبادت کے وقت گرو کے بھجن گایا کرتے تھے۔ "گرنتھ صاحب" میں نانک کا کلام کثرت سے ملتا ہے۔

رام بھگتی کا دور راما نند اور کبیر داس ہی تک ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس تحریک کے روشن ترین ستارہ تلسی داس ہیں۔ ان کے بعد بھی اس کا بہت زور رہا چونکہ مذہب ہندوستان کی روح ہے اس لئے رام اور کرشن کی بھگتی ہمیشہ رہی ہے اور رہے گی۔ البتہ اس کے ادبی رجحانات کو سمجھنے کے لئے راما نند، کبیر، تلسی داس اور نانک کا کلام کافی ہے۔ اب رہا کرشن بھگتی کا اثر، اس مضمون میں اس کا ہم تفصیل سے ذکر نہیں کر سکتے کیونکہ یہ موضوع طویل ہے۔ انشاءاللہ کسی آیندہ مضمون میں اسکی وضاحت کی جائے گی۔

گوری سرن لال سریواستو ایم۔ اے (علیگ)

---

[1] کبیر نے خود لکھا ہے "میری بولی پوربی"، لیکن ان کی زبان میں اودھی، راجستھانی، پنجابی اور پوربی کا "معجون مرکب" ہے۔ ماخوذ از شیام سندر داس

[2] کبیر کے اشعار کھردرے ہیں۔ ان میں ادبیت کی چاشنی نہیں ہے۔ (شیام سندر داس)

[3] نانک صاحب اولاد بھی تھے لیکن بعد میں انھوں نے ترک و تجرید اختیار کر لیا تھا۔

[4] نانک کا بعض فارسی غزلیں بزرگوں کی زبانی سنی ہیں لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے۔

عقلیت کیا ہے؟

دنیا کی ہر شئے انقلاب پذیر ہے۔ ہر چیز، ہر لمحہ، ہر گھڑی تبدیل ہو رہی ہے۔ جو صورت کل تھی وہ آج نہیں، جو آج ہے کل نہ ہوگی۔ کسی چیز کو قیام نہیں اگر قیام ہے تو فقط تبدیلی کو۔

ہر شئے کے ساتھ ساتھ ہمارے مذہبی تصورات اور سماجی و اخلاقی قدروں میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ کبھی قدما کے ہر قول و فعل پر آمنا صدقنا کہنا ہمارا شیوہ تھا۔ جو کچھ وہ کہہ گئے اُس میں سرِ مو تبدیلی کرنا یا ان کی کسی بات پر شک کرنا گناہِ عظیم تھا۔ ان کا فرمان تھا کہ جو وہ کہدیں اسی کو صحیح سمجھو۔ نہ تجربے سے حقیقت سمجھنے کی ضرورت، نہ مشاہدے کو دلیلِ راہ بنانے سے غرض۔ مگر یہ حالت بھی قائم نہ رہ سکی۔ آفتابِ علم کی دن بدن بڑھتی ہوئی تمازت نے صدیوں کے منجمد اور متحجر خیالات کو پگھلانا شروع کیا، انسانی دنیا پُرانے خیالات، قدیم رسم و رواج اور مذہبی عقاید کی سچائی میں شبہ کرنے لگی۔ محض اندھی تقلید اور اعتقادیت سے انسان کی تسلی نہیں ہوئی حقیقت اور سچائی کے شیدائی کرم خوردہ کتابوں کی ورق گردانی کی بجائے براہِ راست فطرت کا آزاد مطالعہ کرنے لگے۔

پہلے مذہبی عقیدوں اور مفروضہ حقیقتوں کے مطابق قدرتی مظاہر کی تشریح کیجاتی تھی۔ اب ہر کیفیت کا طبعی سبب ڈھونڈھا جانے لگا۔ اندھی تقلید کی بجائے عقل کو فوقیت حاصل ہونے لگی۔ دماغی غلامی کی زنجیریں ایک ایک کر کے کٹنے لگیں۔ یہی وہ چیز تھی جس نے قدما کے بسیط عناصرِ اربعہ کا تجزیہ کر کے انھیں ۹۹ عناصر میں ترتیب دیدیا۔ زمین جسے کائناتِ عالم کے مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا سورج کا ایک ادنےٰ سا سیارہ ہو کر رہ گئی۔ ستارے جو چرخِ نیلی پر زیبائش کے لئے سونے کی کیلوں کے بجائے سورج سے بھی بڑے بڑے آتشیں گولے نظر آنے لگے۔ حضرت انسان کو گمان تھا کہ وہ دوسرے جانداروں سے ایک مخلوق ہے۔ مگر نظریۂ ارتقا کی صداقت نے ثابت کر دیا کہ یہ سب وہم ہے۔ غرض کہ علوم کی ترقی نے انسانی ذہنیت کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ یہ نئی ذہنیت ایک نئے فلسفہ کی صورت میں فروغ پانے لگی۔ آج اس فلسفہ کو ہم عقلیت کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

عقلیت نام ہے اس ذہنیت کا جو بلا استثنا و کلّی طور پر عقل کی برتری کو تسلیم کرے اور ایسے فلسفہ و اخلاقیات کو تشکیل دے، جو عقل کی کسوٹی پر کسا جا سکے اور ہر طرح کے خیالی مفروضات سے مبرّا ہو۔ عقلیت ایک طریقہ ہے جو ہر چیز کا ٹھوس تجزیہ کر کے اس کی صحیح قدر معلوم کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عقلیت، فلسفۂ زندگی کا اور فلسفۂ زندگی کی حیثیت سے عقلیت زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے مگر یہ دوسرے فلسفوں کی طرح چند مخصوص نظریوں کا مجموعہ نہیں بلکہ بدلتی ہوئی دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں بدلتی ہوئی چیزوں کی قدر معلوم کرنے کی کسوٹی ہے۔

یوں تو ہر شخص سوچتا اور سمجھتا ہے۔ کم و بیش اپنی عقل کا استعمال بھی کرتا ہے۔ مگر سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ عقلیت پسند زندگی کے مسئلوں کی ہر گتھی کو عقل کے ناخون سے سلجھاتا اور عقل ہی کی روشنی میں ہر چیز کا مطالعہ کرتا ہے۔ اگر اُس کے خیالات بانتیجہ غلط ثابت ہوں تو وہ انھیں تبدیل کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اُس کے نزدیک سچائی سے بڑھکر کوئی سند نہیں۔ مگر وہ شخص جو کسی پنتھ یا فرقہ کا پابند ہے۔ جس کی ذہنیت چند مخصوص اعتقادات تک محدود ہے لازمی طور پر اپنی عقل کی وسعت اور دائرۂ عمل کو تنگ کر دیتا ہے۔ اگر اُس کے اعتقادات غلط ثابت ہوں تو بھی وہ نہ انھیں چھوڑ سکتا ہے اور نہ چھوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمانہ کے انقلاب سے پیدا شدہ نئے حالات کے زیرِ اثر وہ خود کو نہیں بدل سکتا وہ ہر چیز کو اپنے تنگ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ ہر معنی اور حقیقت کو نہایت بے رحمی سے توڑ مروڑ کر اپنے فرسودہ اعتقادوں کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے خواہ اس میں انصاف اور سچائی ہی کو کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔

عقیدہ سے ہماری مراد کسی ایسے دعوے سے ہے جس کی تائید میں نہ کوئی ثبوت ہو اور نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ کی ضرورت سمجھی گئی ہو بلکہ اس میں دخل دینا کافی سمجھا جاتا ہو۔ مثلاً فلاں بات نہ ماننے سے گناہ ہوگا یا جہنم میں بھیجے جاؤگے یا سماج سے خارج کر دئے جاؤگے وغیرہ۔

مذہب کی بنیاد کسی الہامی کتاب یا کسی ایسے شخص کے اقوال پر ہوتی ہے جو مافوق الفطرت خصوصیات رکھتا ہے۔ مذہب ہمارے سامنے چند دعوے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم ان پر یقین کریں۔ ناچیز عقل اور شیطانی سائنس کی کسوٹی پر انھیں پرکھنے کی اجازت نہیں۔

نت نئی دریافتوں اور معلومات کے اضافہ سے ہمارا علم لگاتار ترقی کر رہا ہے۔ موجوداتِ عالم کے بارے میں جتنی معلومات آج ہمیں حاصل ہیں اُتنی کبھی نہ تھیں۔ چنانچہ ہمارے خیالات اور نظریوں میں موجودہ علم کے مطابق بڑی حد تک ترمیم و تنسیخ ہوئی ہے اور آئندہ بھی علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ خیالات اور نظریے بدلتے رہیں گے مگر مذہبی اعتقادات کبھی نہیں بدلتے .... ایک بار جو مذہبی قوانین بنا دئے مذہب کے خیال میں وہ ہر مقام، ہر قوم اور ہر حالت میں یکساں کارآمد ہیں۔ برخلاف اس کے عقلیت کسی عقیدہ کی حامل نہیں، عقلیت پسند موجوداتِ عالم کے متعلق اپنے خیالات کو علمی ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور اپنے اخلاق اور اعمال میں سماج کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق ترمیم کر لیتا ہے۔ کوئی عقیدہ، رسم و رواج یا روایت خواہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو اُسے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی۔

مندرجہ بالا بیان سے واضح ہو گیا ہوگا کہ عقلیت، مذہب کے خلاف ہے کیونکہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ عقلیت ہر اُس خیال اور رسم و رواج کی مخالف ہے جو معقولیت سے خالی ہے اور انسانیت کے حق میں نقصان دہ ہے۔ مگر پھر بھی محض مذہبی احکام کے زیر اثر یا اُن کی قدامت کے باعث مانا جاتا ہو۔ مثال کے طور پر اہلِ ہنود کے ذات پات کے مذہبی سماجی نظام کو لیں۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ انسان پیدائش ہی سے اچھا یا بُرا، اعلےٰ یا ادنےٰ ہوتا ہے۔ بڑی ذاتیں چار ہیں۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔ برہمن سب سے اعلےٰ سمجھے جاتے ہیں اُن کی تعظیم اور پیروی دیگر سب ذاتوں پر فرض ہے۔ اس نظام میں شودر کا درجہ سب سے نیچا ہے۔ اُس کی قسمت میں اونچی ذات والوں کی خدمت کرنا ہی لکھا ہے وہ اپنی حالت کو بہتر نہیں بنا سکتا اونچی ذات والوں سے ہمسری کی خواہش تک اُس کے حق میں موت کا پیغام ہو سکتی ہے۔ اسی ذات پات کے بندھن کے باعث کروروں انسان جہالت، غربت اور ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ انسانیت سوز اور آمرانہ سماجی نظام مذہب کی سرپرستی میں قایم کیا گیا تھا۔ مذہب نے کہا ابتدا میں برہمن برہما کے تن سے نکلا۔ کھشتری بازؤں سے ویش پیٹ میں سے شودر پاؤں سے پیدا ہوئے، چنانچہ اسی تناسب سے برہمن سب سے اونچے اور شودر سب سے نیچے سمجھے گئے۔ اس غلامانہ نظام کو قایم رکھنے کے لئے دو اعتقاد گھڑے گئے ایک مسئلہ آواگون اور دوسرا کرم کا قانون۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہر جاندار مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہوتا ہے۔ نیز ہر شخص کی موجودہ حالت اور ذات اس کے پچھلے اعمال پر منحصر ہے یعنی اگر اُس نے پچھلی زندگی میں ہندو مذہب کے مطابق نیک اعمال کئے ہیں تو وہ اس زندگی میں برہمن یا دوسری اونچی ذاتوں میں پیدا ہوگا اور اگر بُرے اعمال کئے تو شودر بنے گا۔ صدیوں پہلے فاتح آریوں ہی نے ذات پات کے نظام کو ہندوستان کے مفتوح باشندوں پر لادا تھا۔ اور اُن میں سے اکثر کو نیچ ذات یا شودر قرار دیا تاکہ وہ بدیسی حاکموں کی خدمت کرتے رہیں زمانہ بدلا، آقا خود دوسروں کے غلام بن گئے، لیکن اس وقت تک ذات پات کا عقیدہ عوام کے مذہب کا جزو بنکر اُن کی ذہنیتوں پر چھا چکا تھا۔ وہ لکیر کے فقیر بن چکے تھے برہمنوں کی مذہبی حکومت کے قدم جم چکے تھے۔ آج بیسویں صدی میں بعہدِ جمہوریت میں جب ہم "مساوات" "اخوت" اور آزادی کے لئے اپنا خون بہاتے ہیں۔ آج جب ہم کہتے کہ ہر شخص کو زندہ رہنے اور سماج کی مشترکہ دولت میں حصہ داری کا حق حاصل ہے۔ یہی ذات پات والے ہماری قومی اور سماجی ترقی کی راہ میں کانٹا بنتے ہوئے ہیں آج بھی وہ عہدِ جاگیرداری کے خواب دیکھتے ہیں۔ اُن پر اس چیز کا اتنا اثر ہے ان کا آزادی کا تخیل اور معیاری حکومت کا تصور رام راج تک محدود ہے۔ رام راج کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جاگیرداری، اُمرا شاہی، غلامی ذات پات کی غیر فطری وانسانیت سوز تقسیم اور عورتوں پر ظلم کے سوا اور وہ کچھ بھی نہ تھا۔

ہمارے سیاسی معاملات کا بھی یہی حال ہے۔ ان پیچیدہ مسئلوں کو عقل اور حقیقت کی روشنی میں حل کرنے کی بجائے ہم ایسے لوگوں کے پیچھے آنکھیں بند کرکے چل رہے ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ ضرورتِ وقت کیا ہے۔ ایک وہ ہیں کہ قوم اور ملک کی قسمت کو ستیہ اور اہنسا کے تجربات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں انھیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ اگر اُن کا تجربہ ناکامیاب رہا تو ملک کا کیا حشر ہوگا ان کے نزدیک ستیہ اور اہنسا مقصود کو حاصل کرنے کے ذرایع نہیں بلکہ خود مقصود ہیں۔ اسی ذہنیت نے ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی قومی جماعت کی بجائے بھگتوں اور چیلوں کی بھجن منڈلی بنی ہوئی ہے اور دوسرے ہیں کہ عوام کی فرقہ وارانہ ذہنیت کو اُکسا کر اپنی شہرت اور منفعت کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔ کہیں پاکستان کی طیاریاں ہیں تو کہیں رام راج کی صدائیں آ رہی ہیں۔ غرضکہ حقیقت بینی اور عقل کے استعمال کے بجائے فرسودہ اعتقادات اور جذبات کی رو میں بہکر ہم زندگی کی اُلجھنوں کو سلجھانا چاہتے ہیں!

کہا جاتا ہے کہ عقلِ انسانی سہو و خطا سے بری نہیں اس لئے اس پر کامل بھروسہ رکھنے سے ممکن ہے کہ یہ ہمیں غلط راستہ پر لیجائے۔ عقل اور منطق سے انسان

جوجا ہے ثابت کر دکھاتا ہے - عدالتوں میں وکلا انہی کے سہارے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بتا دیتے ہیں۔ اس لئے عقل کے ذریعہ ہم کسی شئے کے متعلق یکساں نتیجہ پر بھی نہیں پہونچتے۔ اس کے علاوہ خشک اور بے رنگ منطق و عقل کی پیروی بھی تو زندگی کا واحد مقصد نہیں ہو سکتی۔ احساسات اور جذبات کی رنگینی انسانی زندگی پر ہمیشہ اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ انسانی مزاج میں پسند ناپسند۔ محبت نفرت اور روپ رنگ کی دلفریبی کو بہت بڑا دخل حاصل ہے۔ تصوف و عرفاں کی مہمل اور معقولیت سے خالی باتیں اُسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ انسان نے انہی جذبات اور احساسات سے متاثر ہو کر بارہا ایسے اشرف اور نمایاں کام کئے ہیں جو ان کے بغیر ممکن نہ تھے۔

ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری قوتِ ادراک و فہم خطا کر سکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہی وہ وقت ہے جس کے مناسب استعمال سے ہم ہر چیز کی حقیقت معلوم کر سکتے ہیں۔ عقل ہی انسان کی سب سے بڑی ذہنی قوت ہے۔ عقل ہی بُرے بھلے کی تمیز کرتی ہے۔ رہا ادراک و فہم کی غلطیوں کا سوال تو اس کے جواب میں ہم دو باتیں کہیں گے۔ اول یہ کہ ہمارے سوچنے سمجھنے میں جو عام غلطیاں ہوتی ہیں اگر ہم اُن کی وجوہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ عقل کی کسی کمزوری یا نقص کے باعث نہیں بلکہ ہمارے تعصبات یا ذاتی رجحانات یا جذباتی ہیجان کے عقل و فہم پر غالب آجانے سے ہوتی ہیں۔ ایسی غلطیوں سے بچنے کے لئے نہ صرف یہی ضروری ہے کہ ہم صحیح اور درست طریقہ پر کسی چیز کے بارے میں سوچیں بلکہ جہاں تک ہو سکے اخذ کردہ نتائج پر ذاتی تعصبات اور رجحانات کا اثر نہ ہونے دیں۔ دوم صرف عقل ہی میں یہ غیر معمولی استعداد ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو خود صحیح کر لیتی ہے اپنے افعال کی خود تنقید و تنظیم کرتی ہے۔ یہ اوصاف ہماری کسی اور ذہنی قوت میں نہیں پائے جاتے۔ مثال کے طور پر عقیدت مندی کو لیجئے۔ وہ لوگ جو عقل کو ہیچ سمجھتے ہیں اکثر کہا کرتے ہیں کہ جہاں عقل کی رسائی نہیں وہاں ایمان لیجاتا ہے۔ اس لئے ایمان زیادہ قابل اعتبار ہے۔ بلاشبہ ایمان سے ان کا مطلب مذہبی عقاید سے ہے۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ مذاہب بھی کسی بات میں ہمخیال اور متفق نہیں۔ مختلف مذاہب اپنے پیرؤں کو مختلف باتوں پر عقیدہ رکھنے کا حکم دیتے ہیں بعض اوقات ایک مذہب کے عقیدے دوسرے کے عقیدوں سے نہ صرف مختلف بلکہ بالکل متضاد ہوتے ہیں۔ دونوں مذاہب خدائی مگر احکام ایک دوسرے کے قطعی خلاف!

کہا جاتا ہے کہ عقلیت پسند بھی تو کسی نہ کسی چیز پر یقین رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر سائنسدانوں پر، کیونکہ علم کا خزانہ اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص ہر بات کا علم بذات خود حاصل نہیں کر سکتا اس لئے بہت سی باتوں میں سائنسدانوں اور عالموں کے اقوال کا اعتبار کرنا پڑتا ہے۔ مگر سائنسدانوں پر یقین رکھنا جن کی ہر بات کی تصدیق ہو سکتی ہے، ایسے شخص یا کتاب پر ایمان لانے سے بالکل مختلف ہے کہ جس کے دعوؤں کی کسی صورت بھی تصدیق نہیں ہو سکتی۔ کسی علمی سچائی کو ہم عقیدۂ محض نہیں کہہ سکتے کیونکہ کسی شخص یا سائنسدان کی صرف سند یا قول پر ہی ہم اسے ماننے کے لئے مجبور نہیں۔ دوم ہر علمی اور سائنٹفک سچائی کی مشاہدہ تجربہ اور استخراج سے تصدیق ہو سکتی ہے اس کے برعکس کسی عقیدہ پر بلا کسی ثبوت کے یقین رکھنا ضروری ہے۔

اگر کبھی ہم اپنے خیالات پر ایک تنقیدانہ نظر ڈالیں تو ایسی باتوں کی تعداد دیکھ کر حیران رہ جائیں گے، جنھیں ہم بلا حجت آنکھیں بند کئے مانتے چلے آئے ہیں جنکی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی صحیح دلیل یا ثبوت نہیں۔ زیادہ تر ہمارے خیالات اور اعتقادات دوسروں کی ایما سے بنتے ہیں جنھیں ہم اپنی ذہنیت کا جزو بنا لیتے ہیں۔ کسی نے کسی جگہ، کسی وقت کسی بات کا اظہار کیا اور ہم نے اسے اعتقاداً مان لیا۔ عام طور پر دوسروں کے خیالات کا اثر بچپن میں ہوتا ہے جبکہ سوچنے سمجھنے کی قوت کمزور ہوتی ہے بعد میں ہم ان خیالات سے اتنے مانوس ہوجاتے ہیں کہ ان کی سچائی میں شبہ بھی محال ہوتا ہے۔ ہمیں اُن کی صداقت عیاں نظر آتی ہے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس میں شبہ کرنا بھی بیہودہ پن میں شامل ہوگا۔

لیکن اگر کسی کٹر سے کٹر مسلمان اور ایک پکّے سے پکّے ہندو کو جبکہ وہ دودھ پیتے بچے تھے بدل کر مسلمان کو ہندو گھرانے میں رکھا جاتا اور ہندو کو خالص اسلامی ماحول میں پلنے دیا جاتا تو اس میں قطعی شبہ نہیں کہ آج اُن کے خیالات اور اعتقادات یہ نہ ہوتے جو اب ہیں اور اس حالت میں بھی ہر ایک اپنے خیالات کی صداقت میں اتنا ہی یقین رکھتا جتنا کہ وہ آج مخالفت میں رکھتا ہے یہی چیز مذہبی اعتقادات کے علاوہ دوسری باتوں میں بھی صحیح ہے۔ اگر ہم ایسے سماج یا فرقہ میں پیدا ہوتے جہاں دختر کشی یا آدم خوری رائج ہے تو ہمیں بھی اس ماحول میں پرورش پانے سے وہ باتیں قدرتی جائز نظر آتیں۔ اگر ہماری پرورش شہر کے جرائم پیشہ طبقہ میں ہوتی تو ہمارا اخلاقی معیار بھی ویسا ہوتا جیسا ان کا ہے۔ اسی طرح کسی انگریز بچہ کو جرمن گھر میں رکھا جائے اور اُسے اس کا علم نہ ہونے دیا جائے کہ اُس کے والدین انگریز تھے تو بالغ ہونے پر بھی اُس کے جذبات اور احساسات جرمن قوم اور ملک سے وابستہ رہیں گے۔ جرمنوں کی طرح اسے بھی تمام انگریز غیر قوم اور دشمن نظر آئیں۔ ہمارے اعتقادات اور خیالات ---

ہمارے بعض نہایت گہرے اور بنیادی عقیدے ـــــ اُس ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں جن میں ہم نے پرورش پائی ہے۔ اس لئے ایمان کو عقل کا بدل تصور کرنا غلطی ہے ہمیں اس سے انکار نہیں کہ جب تک انسانی دماغ کی بناوٹ ایسی ہی رہے گی جیسی کہ اب ہے تب تک انسانی زندگی کے ڈرامہ میں جذبات اور احساسات ہمیشہ ایک اہم پارٹ ادا کرتے رہیں گے بلا شبہ انسان کے بعض نہایت اعلیٰ اور اشرف کارنامے انہی کے اثرات کی پیداوار ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ قبیح سے قبیح افعال کا مرتکب بھی انہی کے زیر اثر ہوا ہے۔

مانا کہ روایتیں اور رسم و رواج کسی عہد کی خوبیوں کو قائم رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی اُس زمانہ کی خرابیوں اور برائیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں اس لئے قدیم رسم و رواج اور روایات کے بیشتر حصہ کی موجودہ زمانہ میں بہت کم اہمیت رہ گئی ہے۔ کیونکہ انقلابات زمانہ نے انسانی ماحول کو بنیادی طور پر بدل دیا ہے۔ انسان کے شخصی معاشی اور سیاسی تعلقات میں ایک انقلاب عظیم برپا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے زمانہ میں علم و سائنس بہت ترقی کر گئی ہے۔ ہمارے آباواجداد کا عملی تجربہ اور موجودہ زمانہ کا وسیع علم دونوں ہمارے پاس ہیں اس لئے آج بدلے ہوئے حالات میں بھی ہر بات میں قدماء کے قول کو سند ماننا صحیح نہیں۔ سماج کی صحیح معنوں میں ہم اسی حالت میں خدمت کرسکتے ہیں اگر ہم ماضی کا مطالعہ زمانۂ حال کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے کریں۔

اخلاق کا عقلی نظریہ یہ ہے کہ کوئی فعل جتنا سماج اور فرد کے لئے مفید ہے اُتنا ہی اچھا اخلاق ہے۔ بااخلاق وہ ہے جو حتے الامکان ایک منظم سماج کو تشکیل دینے اور بہتر بنانے میں مدد دیتا ہے اور ہر اُس فعل سے پرہیز کرتا ہے جسے وہ جانتا ہے کہ اُس کے یا سماج کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ہمارے ملک کو عقلی ذہنیت کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ہماری بہت سی اُلجھنوں اور گتھیوں کو سلجھا دے گی جن کا ہم آج تک کوئی حل تلاش نہ کرسکے مثال کے طور پر ہمارے مذہبی تفرقات اور تعصبات جو ہمارے لئے وبال جان ہیں عقلیت کے زیر اثر رواداری اور آزاد خیالی کی رو میں بہ جائیں۔ ہمارے سیاسی مسئلہ بھی عقل و فہم کی روشنی میں بخوبی حل ہوسکتے ہیں جذبات کی فراوانی سے نہیں۔ فرقہ پرست، متعصب اور رجعت پسند راہنمایان قوم کی راہنمائی سے نہیں۔ وہ ملک یا قوم جو اپنی عقل کا استعمال نہیں کرسکتی جس کی مشعلِ راہ قدامت پرستی اور کورانہ تقلید ہو تہذیب اور ترقی کی ہمیشہ پچھلی صفوں میں رہے گی۔

ہمارے وسیع ملک کی اکثریت افلاس۔ بیماری اور جہالت کے خوفناک غاروں میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ وہ قوم جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے ذات پات اور فرقوں کی غیر فطری زنجیروں میں بندھی مذہبی ریاکاری۔ توہم پرستی اور مختلف اقسام کے استحصالات کے بے پناہ بوجھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ہماری آیندہ ترقی کا راز زندگی کے ہر شعبہ میں سائنس اور عقل کے استعمال میں پنہاں ہے۔

ڈاکٹر پریم ناتھ

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (سنہ ۲۷ء) اگست عہ ر۔ (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر۔ (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔ (سنہ ۳۲ء) ۔جنوری عاار۔ فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (سنہ ۳۳ء) :۔ فروری عہ ر۔ (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۶ء) دسمبر عہ ر۔ (سنہ ۳۷ء) جنوری عاار فروری عہ ر، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر۔ (سنہ ۳۸ء) جنوری سے ر۔ فروری ۸ ر، اپریل عہ ر، مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۳۹ء) جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ، ستمبر عہ ر، اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۰ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۱ء) جنوری فروری عاار۔ مارچ تا دسمبر ۶ ر فی پرچہ۔ (سنہ ۴۲ء) جنوری فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

ابدی طاقت

صوفی کا تصور :-

کون ہے ۔ جس نے کیا عالمِ امکاں تخلیق
کس کے احساس نے بخشی ہے نگاہِ تحقیق،

جامِ کونین میں کیا ہے ۔ یہ چھلکتی ہوئی مے
تیرتی ہے یہ فضائے ابدی میں کیا شے

انجمستاں کی فضا میں یہ کشش ہے کیسی
دلِ خورشید میں آخر یہ تپش ہے کیسی

کون ہے یہ جو خراماں ہے چمن زاروں پر
دبدبہ کس کا ہے ۔ چھایا ہوا کہساروں پر

بجلیوں میں یہ تب و تابِ نظر ہے کس کی
مسکراتی ہوئی یہ شام و سحر ہے کس کی

لالہ و گل میں بھڑکتے ہوئے شعلے کیا ہیں،
سطحِ دریا پہ مچلتے ہوئے نغمے کیا ہیں

عالمِ عشق میں ہے کس کا خرامِ رنگیں،
حسن ہے کس کی تجلی کا پیامِ رنگیں

کس کی تصویر ہے یہ دل کے صنمخانے میں
یہ مئے ناب ہے کیا عقل کے پیمانے میں

جامِ رنگیں میں یہ مستانہ ادا ہے کس کی
لبِ منصور پہ آخر یہ صدا ہے کس کی

کس کے آئینۂ ہستی کا ہے ادراک و نمود
یہ امڈتا ہوا طوفاں ۔ یہ کہستاں کا جمود

ہائے یہ حسن و جوانی کی متاعِ ابدی
ہائے یہ مہرِ درخشاں ۔ یہ شعاعِ ابدی

لامکاں کی یہ فضائیں ۔ یہ نظر کی پرواز
عالمِ شوق و تمنا کا یہ سربستہ راز،

میرے احساس میں یہ جذبِ نہاں ۔ سوزِ دروں
دل کی دنیا میں یہ ہیجان ۔ یہ شورش ۔ یہ جنوں،

ہو نہ ہو کوئی زیارت کدۂ دل ہے ضرور
انھیں موجوں میں کوئی دامنِ ساحل ہو ضرور

"کب فلک کو یہ سلیقہ ہے ستم کاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

سرمایہ دار کا تصور :-

کس کے جلووں سے یہ شہروں کی فضا ہے معمور
کون برساتا ہے محلوں کے در و بام پہ نور،

تاجِ سلطاں میں یہ تابش ۔ یہ جھلک ہے کس کی
ان دمکتے ہوئے سکوں میں چمک ہے کس کی

شمعِ تہذیب میں یہ سوزِ دروں ہے کس کا
جگمگاتی ہوئی سڑکوں پہ فسوں ہے کس کا

فیض سے کس کے یہ دولت ہے سزاوار مجھے
کس کی رحمت نے بنایا ہے گنہگار مجھے

معرفت کس کی سکھاتے ہیں یہ پیمانۂ و خُم — کس کی قدرت کا ہے شہکار یہ ماہ و انجم
محفلِ عیش میں نوروز ہے کیا ۔ عید ہے کیا — حرم و دیر میں یہ نغمۂ توحید ہے کیا
کس کی تقدیس سے روشن ہیں عبادت گاہیں — کس نے کھولی ہیں نجاتِ ابدی کی راہیں
کس کی عظمت ہے یہ مسجد کے مناروں سے عیاں — کس کے شعلے ہیں کلیسا کے شراروں سے عیاں
کس نے سونپی ہے یہ قارون کی دولت مجھ کو — کس نے بخشی ہے یہ تقدیر کی جنت مجھ کو
کس کا مظہر ہے یہ طوفانِ حوادث کا جلال — کس کے ہاتھوں میں ہے قوموں کا عروج اور زوال
حکم سے کس کے ہے یہ معرکۂ سود و زیاں، — کس کی ابرو میں لچکتی ہے معیشت کی کماں
ہو نہ ہو یہ کوئی معبودِ حقیقی ہے ضرور — عادلِ کون و مکاں ۔ خالقِ ہستی ہے ضرور
جو لٹاتا ہے زر و سیم و گہر میرے لئے — بخشتا ہے جو دعاؤں میں اثر میرے لئے
کیف سے جس کے ہے معمور دو عالم کا ایاغ — جس کی تنویر سے روشن ہیں مذاہب کے چراغ

غریب کا تصور :—

کس نے بھیجا ہے یہ طوفان ۔ یہ سیلابِ عظیم — کون ہے قحط کی دنیا کا خداوندِ کریم ،
قہر ہے کس کا ۔ سمندر کا اُبلتا ہوا جھاگ — کون برساتا ہے سورج سے دہکتی ہوئی آگ
اس کڑکتی ہوئی بجلی میں غضب ہے کس کا — یہ گرجتا ہوا طوفان سبب ہے کس کا
آگ ہے کس کی یہ جنگل کے چناروں میں نہاں — کس کے قبضے میں ہے بپھری ہوئی موجوں کی عناں
کس نے فردوسِ تمنا کی مجھے دی ہے خلش — کس نے بھر دی مری ہستی میں قیامت کی تپش،
کس کی آنکھوں میں ہے یہ میری تمناؤں کا خوں — کس کی بیرحم مشیت ہے مرا حالِ زبوں ،
سینۂ بحر پہ یہ دیو کے مانند جہاز — زر پرستوں کے یہ محمود ۔ حکومت کے ایاز
کوئی بتلائے کہ یہ زیرِ نگیں ہیں کس کے — راز داں کس کے ہیں ۔ جبریلِ امیں ہیں کس کے
کارخانوں کی یہ چمنی ۔ یہ دھوئیں کے بادل — چشمِ افلاک میں پھیلا ہوا جیسے کاجل
یہ فضاؤں میں اڈتا ہوا سیلابِ خیال — شعلۂ زیست میں یہ حلقۂ گردابِ خیال
زندگی موت کی آغوش میں پر تولے ہوئے — آندھیاں بڑھتی ہوئیں ۔ زلزلے منہ کھولے ہوئے
کس کی جانب ہیں ۔ وہاں یہ مری قسمت کے سفیر — کس کے ہاتھوں میں ہے یہ موجِ ہوا کی زنجیر
کتنا تاریک ہے دُنیا کے تصور کا مآل، — کتنا عفریت کے سایوں سے لرزتا ہے خیال
میری تخئیل میں یزداں بھی ہے ۔ ابلیس بھی ہے — اہرمن زار بھی ہے ۔ گلشنِ تقدیس بھی ہے

میری پستی نے بنائے ہیں ہزاروں مسجود
وہم نے میرے تراشے ہیں ہزاروں معبود،

ایسے معبود کہ ہے جن کا تصور بھی محال
ایسے خالق کہ زمانے میں نہیں جن کی مثال

دیوتاؤں کو مگر پھر بھی مری فکر نہیں
بزمِ افلاک میں افسوس مرا ذکر نہیں

داستانِ غمِ دل جا کے سناؤں کس کو
داغِ دریوزہ گری آہ دکھاؤں کس کو

اُف یہ تپتا ہوا دن اور جھلستی ہوئی رات،
موت کے خواب میں کھوئی ہوئی تعبیرِ حیات

ہائے مٹتی ہوئی صورت یہ شبستانوں کی،
یہ اُجڑتی ہوئی دنیا مرے ارمانوں کی،

کتنا دلدوز ہے یہ رات کا پرہول سماں،
نہ کوئی شمعِ سرِ راہ۔ نہ منزل کا نشاں

کوئی دمساز۔ کوئی راہنما ہے کہ نہیں
سوچتا ہوں کوئی میرا بھی خدا ہے کہ نہیں

مسعود اختر جمال

ستاروں کی پیمائش اور انکا وزن

وہ لوگ جو فلکیات کی ریاضی سے واقف نہیں ہیں، انھیں یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی ستارے کا وزن یا اس کی پیمائش بیٹھے بیٹھے جان لی جائے اور اسی لئے جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ہماری زمین کا وزن اتنا ہے، مشتری اتنی دور واقع ہے، یا سورج کا رقبہ اتنا ہے، تو وہ ہنستے ہیں کہ یہ سب لغو قیاس آرائی ہے اور صحت و حقیقت سے اسے کوئی تعلق نہیں ۔ لیکن جو لوگ اس فن کے جاننے والے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں صحیح ہے اور اتنا صحیح ہے جیسے دو اور دو چار۔

آیئے آج کی صحبت میں ہم بھی غور کریں کہ کیا ان لوگوں کا کہنا واقعی درست ہے اور وہ کیا اُصول ہیں جن کی بنا پر وہ یہ سب کچھ کہا کرتے ہیں ۔

اس سے شاید کسی کو انکار نہ ہوگا کہ ساری کائنات میں اصول کشش جاری و ساری ہے، یعنی فضائے بسیط کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو اس زنجیر سے جکڑا ہوا نہ ہو۔ چاند کا مقررہ وقت سے مقررہ دوری پر گردش کرتے رہنا، سیاروں کا ایک خاص دائرہ میں چکر لگانا، سمندروں میں مدوجزر پیدا ہونا، یہ سب قوتِ کشش ہی کا نتیجہ ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو یہی وہ کشش تھی جس نے اربوں سال پہلے کرۂ آفتاب سے اس کے ایک حصہ کو جدا کرکے ہماری زمین کو پیدا کیا اور یہی وہ کشش ہے جو اُسے آفتاب کے دائرۂ حرارت کے اندر رکھتی ہے، ورنہ یہ فضائے بسیط کے کسی برفانی عمق میں خدا جانے کب غائب ہو گئی ہوتی اور جانداروں کے وجود سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ۔

اب آیئے قوتِ کشش کو سمجھیں کہ وہ کیا چیز ہے ۔ آپ سے اگر کہا جائے کہ دس من کا پتھر اُٹھایئے تو آپ نہ اُٹھا سکیں گے، کیوں ؟ صرف اس لئے کہ زمین اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہم اس کشش کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ ایک اور مثال لیجئے ۔ آپ کرکٹ کے گیند کو پوری قوت صرف کرنے کے بعد بھی چند گزوں سے زیادہ دور نہیں پھینک سکتے محض اس لئے کہ زمین کی کشش اسے دور نہیں جانے دیتی ۔ اگر یہ کشش مزاحم نہ ہو تو وہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹتے ہی ۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا سکتا ہے اور ایک سال کے بعد فضا میں ۱۷۵۰۰۰ میل آپ سے دور ہو جائے ۔ چاند ہی کو لیجئے کہ ہمارے سروں پر ۲۳۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگا رہا ہے، لیکن اگر زمین اسے اپنی طرف نہ کھینچے تو ایک سال کے اندر وہ فضا میں ہم سے دو کروڑ میل دور ہو جائے ۔

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ کشش کیا چیز ہے اور نظامِ کائنات میں اسے کتنا دخل ہے، پھر اس کشش کا تفصیلی مطالعہ صرف زمین کی انسانی تجربہ گاہوں ہی میں نہیں ہو سکتا، بلکہ قدرت کے اس وسیع تجربہ گاہ میں بھی ہوتا ہے جسے فضائے بسیط کہتے ہیں اور جہاں بڑے بڑے کُرے رات دن گردش کیا کرتے ہیں ۔

تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جسم جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی زیادہ کشش اس میں پائی جائے گی ۔ چونکہ زمین سے بڑی چیز کوئی اور ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لئے ہم کو زیادہ تر اسی کی کشش سے واسطہ پڑتا ہے اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزوں کی کشش کا علم ہمیں نہیں ہوتا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے حقیر سے حقیر ذرہ میں قوتِ کشش پائی جاتی ہے ۔ ایک دوسری بات اور بھی ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ جب دو جسم ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو مقدارِ کشش دونوں کی ایک ہوتی ہے، لیکن ہم اسے محسوس نہیں کر سکتے ۔

ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے، اس کے معنے یہ ہیں کہ زمین نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا، لیکن چونکہ سیب زمین کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اس لئے ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ خود اس کی قوتِ کشش کا زمین پر کیا اثر ہو ۔ دوسری بات یہ ہے کہ دو چیزوں کے درمیان قوتِ کشش کا انحصار بہت کچھ مادہ کی مقدار پر ہوا کرتا ہے، مادہ کی نوعیت پر نہیں ۔ اسی لئے زمین کی قوتِ کشش جتنی ایک من سیسہ پر صرف ہوتی ہے اتنی ہی ایک من روئی پر، ورنہ دنیا کا تمام تجارتی کاروبار درہم برہم ہو جائے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سے یوں سمجھئے :۔

آپ بازار جاتے ہیں اور دوکاندار سے ایک پونڈ چاء خریدتے ہیں، وہ ترازو کے ایک پلڑے میں پونڈ کا باٹ رکھتا ہے، دوسرے میں چاء اور جس وقت دونوں پلڑے برابر ہو جاتے ہیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ چاء کا وزن پورا ہو گیا ۔ آپ نے شاید غور نہ کیا ہوگا کہ وزن جس چیز کا نام ہے وہ صرف زمین کی کشش ہے، یعنی ترازو میں چیز کو

وزن نہیں کیا جاتا بلکہ زمین کی کشش کا اندازہ کیا جاتا ہے اور چونکہ زمین کی کشش ہر مادہ کی ایک معین مقدار پر یکساں کام کرتی ہے اس لئے ایک پلڑے میں باٹ اور دوسرے میں چاول دونوں پر اس نے یکساں کام کیا اور جب دونوں پلڑوں پر کشش برابر ہو گئی تو سمجھ لیا گیا کہ دونوں کا وزن برابر ہے۔

کشش کے ان چند ابتدائی اُصول کے سمجھنے کے بعد آپ کو یہ سمجھنا زیادہ آسان ہو جائے گا کہ سیاروں کا وزن کیونکر معلوم کیا جاتا ہے۔

زمین کا وزن

اگر ہم دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں تو فاصلہ کی مقدار سے ان کی باہمی کشش بھی کم ہو جائے گی۔ لیکن فاصلہ اور کشش میں کیا تناسب ہے، اس کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا۔ ماہرین نے تجربات سے اس کو بھی متعین کر لیا ہے اور وہ بتا سکتے ہیں کہ اگر ایک ہی وزن کی دو چیزوں کو ایک دوسرے سے دور کیا جائے تو دوری کے لحاظ سے باہمی کشش میں کتنا فرق پیدا ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ انھوں نے مختلف اوزان کی چیزوں کے درمیان بھی فاصلہ و کشش کے تناسب کو معلوم کر لیا ہے اور اس طرح زمین کی اس کشش کا اندازہ کر کے جو ایک من سیسہ ایک گیند یا چاند پر صرف ہوتا ہے، انھوں نے معلوم کر لیا ہے کہ زمین کا وزن تقریباً ۶,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ٹن ہے

آفتاب کا وزن

جس طرح ہم زمین اور چاند کی کشش سے زمین کا وزن معلوم کر سکتے ہیں، اسی طرح ہم آفتاب کی کشش سے جو نظام شمسی کے تمام سیاروں پر صرف ہوتی ہے خود اس کا وزن بھی جان سکتے ہیں اور اسی بنا پر ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ آفتاب کا وزن زمین سے ۳۳۲۰۰۰ گنا زیادہ ہے، گویا ہر اونس حصۂ زمین کے مقابلہ میں آفتاب ۹ ٹن سے زیادہ وزن رکھتا ہے۔

چونکہ آفتاب کا وزن بہت زیادہ ہے اس لئے اس کی قوت کشش بھی اتنی ہی بڑھی ہوئی ہے۔ ہم زمین پر کئی کئی من کا وزن اُٹھا لیتے ہیں اور گیند کو کافی دور تک پھینک سکتے ہیں، لیکن آفتاب کی سطح پر مضبوط سے مضبوط آدمی بھی سات پونڈ کا وزن نہیں اُٹھا سکتا اور گیند دو تین گز سے زیادہ دور نہیں پھینک سکتا۔ اور یہ بھی اُس صورت میں ممکن ہے جب آدمی فولاد کا بنا ہو ورنہ یوں تو وہ خود اپنے ہی وزن سے پسکر رہ جائے گا۔

پھر جس طرح آفتاب کی کشش نظام شمسی کے تمام سیاروں پر کام کر رہی ہے، اسی طرح ان سیاروں کی کشش بھی چھوٹے چھوٹے اجسام پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سیارۂ مشتری کے مطالعہ سے اس کا کھلا ہوا ثبوت ملتا ہے۔

ہر اُس شخص کو جسے فلکیات سے دلچسپی ہے، یہ بات معلوم ہوگی کہ مشتری کے نو چاند ہیں یعنی جس طرح زمین کا ایک حصہ اُس سے جدا ہو کر ایک چاند بن گیا، اسی طرح مشتری نے نو چاند پیدا کئے۔ لیکن اب جدید تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ سات چاند تو بیشک اس سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن دو ایسے ہیں جو اپنی کشش کی بدولت اس نے فضاء سے حاصل کئے ہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان دو کی گردش دوسرے سات چاندوں سے مختلف ہے، وہ مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتے ہیں اور یہ شمال سے جنوب سے شمال کی طرف۔ زحل اور عطارد میں بھی ایک ایک چاند اسی طرح کا نظر آتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آفتاب کی طرح دوسرے سیارے بھی چھوٹے اجسام کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔

نظام شمسی کے بعید ترین سیاروں کا انکشاف

ایک صدی قبل نظام شمسی کا بعید ترین سیارہ یورانوس سمجھا جاتا تھا، لیکن ماہرین نے دیکھا کہ آفتاب اور یورانوس کی باہمی کشش کے لحاظ سے جو راستہ یورانوس کی گردش کا ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہے اور انھیں خیال ہوا کہ ممکن ہے بعض اور سیاروں کی کشش اس راستہ سے ہٹا دیتی ہو، چنانچہ پندرہ سال کی تحقیق و جستجو کے بعد ۱۹۳۰ء میں معلوم ہوا کہ واقعی ایک سیارہ عطارد سے بھی زیادہ دور ایسا ہے جو یورانوس کے دائرۂ رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا نام انھوں نے پلوٹو رکھا۔ یہ بہ نسبت زمین کے ۴۰ گنا زیادہ آفتاب سے دور ہے اور ۲۵۰ سال میں آفتاب کے گرد اپنا دائرہ پورا کرتا ہے۔

دوسرے سیاروں کا وزن

یہاں تک تو صرف ان سیاروں کا ذکر تھا جن کا تعلق ہمارے نظام شمسی سے ہے، لیکن یورانوس اور پلوٹو سے بھی آگے فضا میں بے شمار جھنڈ تاروں کے نظر آتے ہیں اور اُن میں سے بعض اتنے چھوٹے یا اتنی دور ہیں کہ وہ جھنڈ سے علحدہ دکھائی بھی نہیں دیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی اُصول کشش کے ماتحت ایک دوسرے سے وابستہ ہوں گے اور ان کی دُنیا میں بھی قریب قریب وہی حالت پائی جاتی ہوگی جو ہمارے نظام شمسی میں نظر آتی ہے۔

ان جھنڈوں میں ہم سے قریب تر جھنڈ تین ستاروں کا ہے جن میں دو زیادہ روشن اور ایک کم روشن ہے، بعض صرف دو ستاروں کا جھنڈ ہے، لیکن ان سب کا

گردش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قانونِ کشش کے پابند ہیں اور اس لئے ان کا وزن بھی بڑی حد تک معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ماہرین نے ان میں سے بعض سیاروں کا وزن آفتاب سے ایک ہزار گنا زیادہ اور بعض کا ۸۰ گنا زاید دریافت کیا ہے۔

سیاروں کی روشنی

آسمان میں ہم کو بعض ستارے بہت روشن اور بعض بہت دھندلے نظر آتے ہیں، لیکن جس طرح یہ ضروری نہیں کہ زیادہ روشن ستارہ ہم سے زیادہ قریب ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں زیادہ دھندلا ستارہ ہم سے زیادہ دور ہو۔ بعض ستارے واقعی بہت روشن ہیں اور بعض بہت کم۔

تمام اُن ستاروں میں جو ہمیں نظر آتے ہیں، سیرئیس (Sirius) سب سے زیادہ روشن ستارہ ہے، اسی سے متصل ایک اور ستارہ نظر آتا ہے جو بہت دھندلا ہے، حالانکہ یہ یقیناً زیادہ دور واقع نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر ستارہ کی روشنی علیٰحدہ علیٰحدہ ہے اور ماہرین نے ان کی روشنی کا اندازہ بھی کیا ہے۔ سب سے پہلے زمین کو لیجئے۔ اس کا فاصلہ سورج سے ۹۲۹۰۰۰۰۰ میل ہے اور اگر اتنی دوری پر ہمارا کرۂ زمین بھی روشن نظر آتا ہے تو اسے ۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ بتیوں کی روشنی پیدا کرنا چاہئے۔

سیرئیس ۵ لاکھ گنا زیادہ دور ہے، یعنی آفتاب کی روشنی تو ہم تک آٹھ منٹ میں آجاتی ہے لیکن سیرئیس کی آٹھ سال میں، اس لئے باوجود اتنی دوری کے سیرئیس کا اتنا روشن نظر آنا ثابت کرتا ہے کہ وہ آفتاب سے زیادہ روشن ہے۔ چنانچہ ماہرینِ فن نے بتایا ہے کہ وہ آفتاب سے ۲۶ گنا زیادہ روشنی رکھتا ہے یعنی اگر سورج کی جگہ ہم سیرئیس کو رکھدیں تو قطبین کے برف پوش سمندر بھی آناً فاناً اُبلنے لگیں اور دنیا کے تمام جاندار دفعتاً مر جائیں۔ لیکن کائنات کی وسعت اور قدرت کی عظمت کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہوگا کہ سیرئیس سے بھی زیادہ روشن ستارے فضا میں پائے جاتے ہیں، چنانچہ ایک ستارہ ڈوراڈس، سیرئیس سے دس ہزار گنا اور آفتاب سے ۵ لاکھ گنا زیادہ روشن ہے۔ یعنی جتنی حرارت آفتاب سے پورے ایک سال میں پیدا ہوتی ہے، اتنی اس ستارے سے صرف ایک منٹ میں پیدا ہو جاتی ہے اور اگر ہم آفتاب کی روشنی کو ایک موم بتی کی روشنی فرض کریں تو یہ ستارہ اس کے مقابلہ میں سرچ لائٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سیاروں کی جسامت

آفتاب زمین سے بارہ ہزار گنا بڑا ہے اور اس کی سطح سے ہر وقت جتنی روشنی و حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے، اس سے ہم لوگ پوری طرح واقف ہیں کہ ۹ کروڑ میل کے فاصلہ پر بھی مئی جون میں جھلسنے لگتے ہیں۔ لیکن ڈوراڈس سیارہ سورج سے ۵۰ ہزار گنا زیادہ حرارت و روشنی پیدا کرتا ہے، تو کیا یہ سورج سے ۵۰ ہزار گنا بڑا ہے یا یہ کہ اس کی برقی قوت اتنی زیادہ ہے۔

اس سوال کا جواب دو صورتوں سے دیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہم براہِ راست ڈوراڈس کی جسامت معلوم کرنے کی کوشش کریں یا یہ معلوم کریں کہ فی مربع گز اس کی سطح سے کتنی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سیاروں کی جسامت معلوم کرنا بہت دشوار ہے۔ کیونکہ جب ہم دوربین سے انھیں دیکھتے ہیں تو بھی وہ اتنے چھوٹے نظر آتے ہیں کہ ہم ان کی جسامت کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ایک آلہ حال ہی میں ایجاد ہوا ہے جسے (Interferometer) کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے بعض بڑے بڑے سیاروں کی جسامت کا حال معلوم ہو سکتا ہے اور انیشٹین کے نظریۂ اضافیت (Relativity) کی رو سے بعض چھوٹے ستاروں کی جسامت بھی متعین کی جا سکتی ہے لیکن ان دونوں طریقوں سے جتنے ستاروں کی جسامت کا حال اس وقت تک معلوم ہوا ہے ان کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ البتہ دوسرا طریقہ زیادہ کامیاب ہے، یعنی ہر سیارہ سے جتنی برقی قوت پیدا ہوتی ہے، اس کا اندازہ کر کے اس کی جسامت کا حال زیادہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے۔

سیاروں کا رنگ

اگر آپ سُرخ اور نیلے کپڑوں کی تصویر لیں تو سُرخ رنگ تصویر میں سیاہ نظر آئے گا اور نیلا قریب قریب سفید، کیونکہ کیمرے کا لنس نیلے رنگ سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور سُرخ سے بہت کم۔ اب آپ آسمان کے کسی حصہ کی تصویر لیں تو اس میں بھی آپ کو بعض ستاروں کی تصویر بہت روشن نظر آئے گی اور بعض کی دھندلی۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ستاروں کے رنگ مختلف ہیں جن کا رنگ نیلگوں ہے ان کی تصویر زیادہ صاف آتی ہے اور جو سُرخ رنگ کے ہیں وہ دھندلے نظر آتے ہیں۔ الغرض کیمرے کے ذریعہ سے ستاروں کا رنگ آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے، لیکن رنگ کا یہ اختلاف کیوں ہے اس کا معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

بات یہ ہے کہ ستاروں کا درجۂ حرارت مختلف ہے اور حرارت کی کمی بیشی سے رنگ بدل جاتا ہے۔ اگر آپ لوہے کے کسی ٹکڑے کو بھٹی میں گرم کریں تو آپ دیکھیں گے کہ پہلے اس کا رنگ ارغوانی ہوگا، پھر سُرخی میں تبدیل ہوگا، اس کے بعد وہ زرد ہوگا اور پھر سفید، چنانچہ لوہار انھیں رنگوں کو دیکھ کر معلوم کرتے ہیں کہ لوہا کتنا گرم ہے۔

ماہرینِ فلکیات بھی اسی طرح ستاروں کے رنگ سے ان کا درجۂ حرارت معلوم کرتے ہیں۔ جو ستارے سُرخ نظر آتے ہیں وہ نسبتاً کم گرم ہیں اور ان کا درجۂ حرارت ۲۵۰۰ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ زرد رنگ کے ستاروں کا درجۂ حرارت ان سے دوچند ہوتا ہے، ان کے بعد سفید رنگ کے سیارے ہیں جو آفتاب کا سا درجۂ حرارت (دس ہزار) رکھتے ہیں اور پھر نیلگوں اور بنفشئی رنگ کے سیارے جو بہت زیادہ گرم ہیں اور جن کا درجۂ حرارت ۷۰ ہزار سے کم نہیں۔

ستر ہزار درجۂ حرارت رکھنے والے سیارے غیر معمولی برقی قوت پیدا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی چند مربع گز سطح سے جتنی قوت پیدا ہوتی ہے، اس سے کرۂ زمین کی تمام ریلوں کو چلایا جا سکتا ہے، اور ایک بڑے سے بڑے جہاز کو چلانے کے لئے صرف ایک مربع انچ سے پیدا ہونے والی قوت کافی ہے۔

ان طریقوں سے سیاروں کی جسامت اور قوت کا جو حال معلوم ہوا ہے وہ بہت حیرتناک ہے۔ آفتاب جسے ہم اس وقت تک بہت بڑا سیارہ سمجھتے تھے اتنا بڑا کہ لاکھوں کرۂ زمین اس میں سما سکتے ہیں وہ اب بہت معمولی سیارہ رہ گیا ہے اور بعض اتنے بڑے سیارے دریافت ہوئے ہیں کہ آفتاب ایسے لاکھوں کرے اس میں سما سکتے ہیں اور پھر بھی بہت جگہ باقی رہ سکتی ہے، یعنی اگر ہم ان سیاروں کی جسامت موٹر کے برابر فرض کریں تو اس کے مقابلہ میں آفتاب کی جسامت ایک مٹر سے زیادہ نہیں ہوتی!

اعتبارات!

"بڑھیا تو کیوں رو رہی ہے" "میرا بچہ بیمار ہے۔ جوان اکلوتا بچہ! میری زندگی کا اکیلا سہارا، میرے اُجڑے ہوئے گھر کا تنہا چراغ۔ آہ، وہ بہت بیمار ہے، لوگ کہتے ہیں وہ بچے گا نہیں، سچ بتاؤ، کیا واقعی وہ مر جائے گا؟"

—"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، گھبراؤ نہیں، علاج کرو، اچھا ہو جائے گا"

—"علاج! ہاں، علاج تو میں کر چکی جو کچھ کر سکتی تھی۔ اس پھٹی ہوئی دھوتی کے علاوہ جو کچھ تھا سب بیچ کر میں اسکے علاج میں لگا چکی، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا"

—"پھر اب کہاں جا رہی ہے"

—"مسجد جا رہی ہوں، خدا سے التجا کرنے جا رہی ہوں، وہی سُنے گا اور وہی اسکو اچھا کرے گا"

—"ضرور جاؤ، خدا میں بڑی قدرت ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے"

چند دن بعد—

—"بڑھیا یہ کیا بک رہی ہے، خدا کی شان میں ایسی گستاخی!"

"خدا! ۔ کون خدا؟ وہی جس نے میرا اکلوتا بچہ مجھ سے چھین لیا، جو رات دن ناک رگڑوانے کے بعد بھی میری خواہش کو پورا نہ کر سکا۔ جو مردوں کو جلانے کی قدرت رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود معمولی کھانسی بخار کو دور نہ کر سکا— ہٹ جاؤ میرے سامنے سے، مجھے نہیں معلوم میں کیا کہہ رہی ہوں، میرے سینہ سے دھواں اُٹھتا ہے۔ مجھے نہ چھیڑو— میرے جسم کی رگ رگ ٹوٹی جا رہی ہے۔ میرا ریشہ ریشہ اینٹھ رہا ہے— جب میرا بیٹا دنیا میں نہ رہا تو میں خدا کو لیکر کیا کروں گی!"

—"بڑھیا، ایسی ناشایستہ باتیں منہ سے نہ نکال، تیرا بیٹا خدا کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی، اس میں بُرا ماننے کی کیا بات!"

—"خدا کی امانت تھی! بالکل جھوٹ؟ جب اس کا باپ چھوٹا سا چھوڑ کر مرا تو کیا خدا نے اس کو آکر پالا تھا— کیا جلتی دھوپ میں پتھر توڑ توڑ کر خدا ہی اسکے لئے غذا فراہم کیا کرتا تھا— ہونہہ! — میں نے اپنا خون پلا پلا کر اُسے پالا، میں نے فاقہ کر کر کے اس کا پیٹ بھرا— جب بیمار پڑا تو ساری گھرستی بیچکر میں نے اس کا علاج کیا، رات رات بھر میں اس کے لئے جاگی۔ اس کی صحت کے لئے میلوں پیدل چلکر میں دوا لائی— خدا نے کیا کیا— وہ میرا بیٹا تھا میری چیز تھی۔ امانت کیسی!"

—"معلوم ہوتا ہے تو نے صرف دوا پر بھروسہ کیا۔ خدا سے دعا نہیں کی"

—"(چیخ کر) ہٹ جاؤ، دور ہو میرے سامنے سے— میں نے دعا نہیں کی؟ اندھو جاؤ، جا کر دیکھو، مسجد کے فرش پر اب بھی میرے آنسوؤں کے دھبے بہت سے موجود ہوں گے— خدا— خدا، کرتے پھرتے ہیں— جب دعا کرتے وقت میرا سینہ پھٹتا تھا، تو تم میں سے کوئی میرا ساتھ دینے والا نظر نہ آتا تھا اور اب جو میں دعا نہ سننے والے کو بُرا بھلا کہہ رہی ہوں، تو تم سب کائیں کائیں کر کے میرے پیچھے پڑے ہو— اگر خدا کسی کی دعا نہیں سُن سکتا، تو اسے بُرا بھلا سننے کے لئے بھی طیار رہنا چاہئے"

بڑھیا کو پاگل سمجھ کر لوگ چلے گئے، لیکن میں نے یہ سارا واقعہ ایک بڑے دیندار عالم سے بیان کیا، تو انھوں نے کہا "افسوس ہے اسلامی حکومت نہیں، ورنہ اس بڑھیا کو قتل کر دیا جاتا—"

یہ سنکر میں نے دل ہی دل میں کہا کہ— "بڑھیا کو تو خیر غم نے دیوانہ بنا دیا تھا اور وہ خدا کے صحیح تصور پر قادر نہ تھی لیکن انھیں کیا ہو گیا ہے"

خدا اور دار و رسن!

اس امتزاج پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

احسان

چمپا کو ہم ایک ہی پوشاک میں پھرتا ہوا دیکھتے۔ سفید دھوتی۔ سفید جمپر اور ایک پھٹی سی چپل، یہ تھی اس کی وضع جس میں وہ رات دن دیکھی جاتی مگر اس کے پاس ایک دھوتی اور ایک جمپر اور بھی تھا۔ جب ایک ان میں سے میلا ہو جاتا تو دوسرا جو دھوبی سے دھلا کر بڑی احتیاط سے رکھا ہوا ہوتا نکالتی اور پہنتی!! سال میں صرف ایک دفعہ یا اگر اس کی تقدیر جاگ گئی تو دو مرتبہ نئی دھوتی، نئے جمپر اور نئی چپل پہنے دیکھی جاتی مگر یہ بھی ہوتا تھا۔ جب پہلی چیزیں پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتیں!!

اس سے زیادہ اس کو کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ اس کو خواہش کرنے پر بھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سوچا کرتی کہ شاید میں زیور اور اچھی اچھی ساریاں اپنی قسمت میں لائی ہی نہیں۔ پرماتما نے بھی ہماری قسمتوں میں کتنا فرق رکھا ہے۔ اس کے پڑوسی کے کئی ایک باغ ہیں، گاؤں ہیں، وہ رات دن گھر میں پڑا رہتا ہے اور اس کا کام صرف نوکروں پر حکم چلانا اور غریبوں پر اپنی ہیکڑی جتانا ہے!۔ اور میرے پتا! صبح کو تو یا دس بجے گھر سے نکل جاتے ہیں اور جب تک سورج ڈوب نہیں جاتا، گھر کے اندر قدم نہیں رکھتے۔ پھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اور تیس دن میں ان کو ملتا کیا ہے؟ ۔ کُل تیس روپئے۔ وہ سوچا کرتی کہ میرے پتا کو دنیا میں سب سے زیادہ روپیہ ملنا چاہئے تھا۔ مگر نہیں یہ دنیا کا قاعدہ نہیں۔ اُس آدمی کو زیادہ روپئے ملتے ہیں جو کم کام کرتے ہیں اور وہ آدمی بھوکوں مرتے ہیں جو کام کرتے ہیں۔

چمپا اور سوچتی "کیا کبھی میری تقدیر بھی پھرے گی۔ کیا میں بھی کبھی زیور پہن سکوں گی؟" مگر وہ سوچتی رہ جاتی!! اور اس کے سوچ کا کچھ اثر نہ ہوتا! — وہ ٹھنڈی سانس بھرتی اور خاموش لیٹ جاتی۔

پڑوس میں بڑے دھوم دھام سے شادی ہو رہی تھی۔ سنا جا رہا تھا کہ لڑکی کو بہت زیور چڑھا ہے۔ چمپا بھی یہ باتیں کان لگا کر سنتی اور اپنی ماں سے کہتی! — ماں سنتی ہے!۔ کوئی چیز لاکٹ بھی آئی ہے۔ ماں کیا ہوتا ہے لاکٹ؟ سنا ہے نیک لیس بھی آیا ہے! یہ کیسا ہوتا ہے۔ ماں ہوں ہاں کر کے خاموش رہ جاتی۔

"چمپا کا بیاہ کب کرے گی؟" ایک بڑھیا نے اس سے کہا!

"چمپا کا بیاہ؟ — ہو جاوے گا۔ روپیہ چاہئے؟"

"سبکو روپئے کی کیا ضرورت۔ اس کو چاہے کوئی بیاہ لے جائے۔ وہ روپ دنی ہے!!" آج پہلی مرتبہ چمپا کی ماں کو معلوم ہوا کہ روپ ہونا بھی لڑکی کے اندر گُن ہے! آج تک وہ یہی سمجھتی آتی تھی روپیہ ہی بڑا گُن ہے!

"تو بتاؤ اس کے روپ کی قدر کون کرے گا؟"

"دیکھو شیلا کی چاچی آئی ہے۔ ان کے لڑکے کی بہو ابھی مری ہے۔ ان کا بڑھاپا ہے۔ کوئی لڑکی لڑکا نہیں۔ لاکھوں روپیہ ہے۔ سیکڑوں زیور ہیں۔ میری بات مان تو تیری لڑکی رانی بن جاوے گی!!" — اس کی ماں سوچ رہی تھی اور سُن رہی تھی!

"ارے اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ روزانہ ایسے لڑکے ہاتھ تھوڑے ہی آتے ہیں۔ اور لڑکوں کی تم خوشامد کرو گی۔ وہ تم سے روپیہ مانگیں گے، مگر ان کو روپیہ کا ذرّہ بھی لالچ نہیں۔ بلکہ یہ تو ایسے امیر ہیں جو غریبوں پر دیا کرتے ہیں! ان کو بہو چاہئے اور کچھ نہیں!!

چمپا کی ماں کے دماغ میں سب کچھ آ گیا! وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس نے کہا دروازہ پر آئے ہوئے دیوتا کو واپس نہ کرنا چاہئے۔ میری لڑکی کی ایسی قسمت کہاں تھی کہ وہ اتنے امیر گھر بیاہی جاتی! اس کو تو اب ایک نئی دنیا مل جائے گی۔ اس دلدر سے اس کو چھٹکارا مل جائے گا۔

چمپا نے بھی سنا اور حیران رہ گئی، وہ اپنی آیندہ زندگی کی تصویر کھینچنے لگی!! — دولت اس کی باندی ہوگی! — وہ نئی ساریاں پہنے ہر وقت پھرا کرے گی — اس کی نگاہ اپنی میلی دھوتی پر پڑی تو اس کے دل میں آیا کہ اس دھوتی کو ایسی جگہ چھپا دے جہاں اس کو کبھی نظر نہ پڑے!

بہت بڑا مکان ہے۔ مٹی کے فرش کے بجائے یہاں سنگ مرمر کے فرش ہیں جس پر پاؤں پڑتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے! چھوٹے چھوٹے کمروں کی بجائے یہاں بڑے بڑے کمرے ہیں جن کو وہ تعجب سے دیکھتی! اس کی ساس اس کے پاس آئی اور پوچھا۔ "یہاں طبیعت لگ گئی" مگر چمپا نے اپنا منھ چھپالیا۔ ایودھیا رانی نے خود ہی جواب دیدیا "یہاں طبیعت کیوں نہ لگے گی۔ شاید اب تم اپنے گھر جانے کا نام بھی نہ لوگی!! وہاں کچے مکان ہیں۔ تنگ گلی ہیں! چھوٹے چھوٹے اندھے کمروں میں جا کر اب کیا کروگی!" — اس کے پتی نے پوچھا "یہاں تمھاری طبیعت لگ گئی!" — "جی" اس نے جواب دیدیا — "اوہ میں یہی چاہتا تھا! جب میری پہلی استری مری تو سارے بنگلہ میں مردنی چھائی تھی۔ در و دیوار کھانے کو دوڑتے تھے۔ مگر اب وہی در و دیوار ہنس رہے ہیں! یہ تمھاری وجہ ہی سے ہے۔ تم جانتی ہو!! — تم مجھ سے کبھی خفا نہ ہونا" چمپا کے دل میں خوشی کی گدگدی سی دوڑ گئی!!

چمپا کو پڑوس کی عورتیں دیکھنے آئیں! وہ شرما رہی تھی کیونکہ اس نے نئے نئے کپڑے۔ بہت قیمتی ساریاں اور زیور پہنے تھے۔

"گھر سے کیا آیا!"۔ کسی نے ایودھیا رانی سے پوچھا۔

"ارے یہ امید کر کے تھوڑے ہی شادی کی تھی۔ غریب گھر کی لڑکی ہے"

"تم نے بھی اچھا کیا۔ کہ غریب گھر کی بہو لی"

یہ کہنا چمپا کو کچھ اچھا نہ لگا۔ اس کو زیور مل گئے، اس کو نئی نئی ساریاں مل گئیں، اس کی قسمت واقعی جاگ گئی۔ مگر یہ گھر کی فضا کیسی! بنگلہ میں ہمیشہ خاموشی رہتی۔ جو زور سے بولتا وہ بدتمیزوں میں گنا جاتا تھا — ہر ایک ناپ تول کر بات کہتا!!۔ کھانے کا کمرہ الگ بنا ہوا تھا۔ ہر ایک کو اسی کمرہ میں کھانا پڑتا تھا — ہر ایک ناک چڑھا کر بولتا تھا۔ ان لوگوں کی کچھ عادت سی معلوم ہوتی تھی۔ خاص طور پر عورتوں کی!!۔ نوکر بھی اپنے آپ کو کچھ سمجھتے تھے اگر کوئی باہر کا آدمی ان سے کام کرنے کو کہتا تو ایک دو دفعہ تو ٹال دیتے جیسے کہ وہ کام کرنے کے لئے نہ ہوں اور یا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ اتنے مصروف ہیں کہ ان کو سننے کی بھی فرصت نہیں!! — ایسی فضا میں چمپا کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا تھا۔ اس کو ہر ایک دفعہ سوچنا پڑتا تھا کہ کہیں ایسا کام نہ ہو جائے جو ان لوگوں کے رواج کے خلاف ہو۔ اس کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے گھر آئی ہے!! — وہ ایسی فضا میں گھٹی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اس فضا میں آزادی بالکل نہیں تھی!!

اس کے پتی کی بہن جو نئی بہو کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہو رہی تھی، اس کے کان میں کہہ رہی تھی "تم ماتا جی کی بہت خدمت کرنا۔ وہ تم سے ہمدردی کرتی ہیں اگر ان کو تم سے ہمدردی نہ ہوتی تو تم ہی سوچو کہ غریب گھر کی لڑکی کو کون پسند کرتا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا ماتا جی ہی کی وجہ سے ہوا" چمپا کو بھی ماننا پڑا کہ ایودھیا رانی ہی کے گن گانے چاہئیں۔ اس روز سے اس نے ایودھیا رانی کی خدمت اس طرح کرنی شروع کی کہ کوئی لونڈی بھی نہ کرے گی — وہ خیال کر لیتی "اگر میں خدمت نہ کروں گی تو دنیا میرے جنم میں تھوکے گی۔ سارے محلے میں۔ سارے شہر میں ہر ایک آدمی کو یہ معلوم ہے کہ ایودھیا رانی نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے۔ ایودھیا رانی بھی اپنا کام کرانے میں نہ چوکتی تھی دن بھر اس کے سارے حکموں کی تعمیل کرتی اور رات کو ایودھیا رانی کے پاؤں دابتی اور جب تک وہ سو نہ جاتی دابتی رہتی!! — اس کی انگلیاں اکڑ جاتیں! باہیں درد کرنے لگتیں!! مگر ایودھیا رانی کو اس کی پروا نہ ہوتی۔

انسان تعریف کا بھوکا ہے۔ مگر چمپا تعریف کا ایک لفظ بھی نہ سنتی! وہ روزانہ خیال کرتی کہ آج شاید ایودھیا رانی کہے کہ تو نے بہت کام کیا ہے مگر ان لفظوں کو وہ کبھی نہ سنتی! پھر وہ خیال کرتی "اسے تعریف نہیں چاہئے! یہ تو اس کا فرض ہے، فرض ادا کرنے کی کیا تعریف؟"

ایک روز صبح وہ جلدی نہ اٹھ سکی۔ اس کی کمر اکڑی ہوئی تھی۔ دماغ گھوم رہا تھا۔ ہاتھ گرم ہو رہا تھا مگر ایودھیا رانی کو کیا معلوم!! اس نے دو تین مرتبہ دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹا دی!

پتی نے کہدیا — "اس کو بخار آگیا ہے!"

ایودھیا رانی نے کہا، "بخار — اونھ یوں ہی حرارت سی آگئی ہوگی۔ کیا ایسے میں کھاٹ پکڑ کر پڑ رہتے ہیں!!۔ ایسا کچھ کام بھی تو گھر کا نہیں کرتی جو بخار آجاوے!!"

چمپا نے سنا — "ایسا کچھ گھر کا کام بھی تو نہیں کرتی ہے!" اور اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دل پر کسی نے گھونسا مارا ہو۔ چمپا نے خیال کیا کہ کیا اسی دن کے لئے وہ ان کی خدمت کر رہی تھی۔ مانتی ہوں میرے اوپر ان کا بہت بھاری احسان ہے مگر میں بھی تو ان کے احسان کا بدلہ چکا رہی ہوں۔

چمپا کا پتی اندر داخل ہوا۔ چمپا کا منھ اور لال ہو گیا تھا۔ "کیا اور تیز بخار آگیا ہے!!"

"میں گھر کا کچھ کام نہیں کرتی ہوں تو مجھے مرجانے دو!!"

"اوہ" ۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا: ۔"تم ناراض ہو!! ۔ ماں، ان کو مناؤ۔ یہ ناراض ہیں ان سے کہہ دو کہ یہ بہت کام کرتی ہیں" اور وہ ہنس دیا مگر ایودھیا رانی کو ہنسی نہ آئی ۔ وہ بات سمجھ گئی ۔

ایودھیا نے کہدیا ۔" میں کیا مناؤں ۔ اگر ناراض ہیں تو ہوجانے دو! بڑی ناک والی ہیں نا ؟

"تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قدر کچھ بھی نہیں! اگر وہ غریب گھر کی ہے تو اس ۔ کے یہ معنی ہیں کہ وہ نیچ ہے، ماں کی خدمت بھی کرے اور ذلت بھی جھیلے!"

تمام دن یہی خیالات سر میں چکر لگاتے رہے ۔ اور جیسے کسی بچّے کو پالنے کے جھونکے سلاتے اور جگاتے رہتے ہیں اسی طرح سے یہ خیالات اس کو جگاتے اور سلاتے رہے!! اس نے اپنی بابت بہت کچھ سوچا ۔ مگر وہ اپنے پتی اور ایودھیا رانی اور قسمت کے خلاف کچھ نہ سوچ سکی !! ۔ اپنے پتی کے خلاف کیا سوچے! وہ دیوتا تھا جس کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ خوش ہوجایا کرتی تھی اور ایودھیا رانی کے خلاف کیا کہے! اگر ایودھیا رانی کے خلاف کچھ سوچے تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی قسمت کی بُرائی کر رہی ہے ۔

چمپا نے دن بھر کچھ نہ کھایا ۔

"کیوں ری آج سارے دن تو بھوکی پڑی رہی ۔ تجھے ہمارا کچھ بھی خیال نہیں!! ۔ تو کسی کا احسان نہیں مانتی!! تو جب اپنے باپ کے گھر تھی، جب کی حالت کو سوچ اور اب کی حالت کو سوچ ۔ یہ گدّے تکیے کیا وہاں نصیب آسکتے تھے" اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان گدّے تکیوں میں سے آگ نکلنے لگی ہو ۔

آج سارا بھید اس پر کھُل گیا جس کو سچائی جان کر وہ کانپ جاتی تھی اور جس کا خیال وہ دل میں لاتے ہوئے بھی گھبراتی تھی ۔ آج اس کے سامنے تھا ۔ کیا یہ سب زیور کی وجہ سے ہے ۔ کیا ان زیوروں نے میری عزت کھو دی ۔ اگر مجھے زیور نہ ملے ہوتے تو چاہے ماتھے پر بہت بڑا غریبی کا ٹیکہ لگا ہوتا مگر پھر بھی میری عزت ہوتی!! مجھے سب بہو کی نظر سے دیکھتے ۔ اس نظر سے کوئی نہ دیکھتا کہ میرے اوپر احسان کیا گیا ہے ۔

وہ بستر سے اُٹھی ۔ اس نے گدّے تکیے الگ رکھدئے ۔ اس نے اپنی ساری اُتار ڈالی ۔ اور اپنی پُرانی سفید دھوتی پہن لی ۔ اس نے سونے کے زیوروں کا ڈبہ نکالا اور اس میں ایک ایک زیور اُتار کر رکھدیا ۔ اس کو اب ایسا معلوم ہوا جیسے دل کا بوجھ کم ہوگیا ۔

"مائیں، یہ کیا بھیس بنا رکھا ہے ؟" اس کے پتی نے کہا ۔ "تمھارے زیور تمھاری ساری کہاں ہے"

"اُتار دئے!"

اس نے زیوروں کا بکس نکالا اور اپنے ہاتھ سے ایک ایک زیور پہنانے لگا ۔ "دُنیا کو بکنے دو ۔ زیور تو میں نے دئے ہیں ۔ میں تم کو زیور ہر وقت پہنے دیکھنا چاہتا ہوں"

اس کے چند دن بعد پتی کی بہن کی شادی ہوئی اور اس نے اپنے سارے گہنے بہن کو دیدئے!!

"تم نے پھر یہ کیا کیا ؟ ؟ آج زیور پہننے کا دن ہے کہ ان کو اُتار کر بیٹھ جانے کا ۔ بکس نکالو"

بکس نکلا مگر اس میں ایک بھی زیور نہ تھا ۔

"مائیں زیور کہاں گئے !!"

"مجھے تمھاری بہن کی شادی کی بہت خوشی تھی ۔ میں نے سب گہنے اسے دیدئے ہیں ۔"

اس کا پتی سناٹے میں آگیا ۔ اس کے ہاتھ سے زیوروں کا ڈبہ چھوٹ گیا ۔

"میرا خیال غلط تھا کہ میں زیوروں سے خوش ہوسکوں گی! وہ تو بچپن کا خیال تھا ۔ اب زیوروں کو اُتار کر ایسا محسوس کرتی ہوں جیسے منوں بوجھ ہٹ گیا ہو میں آج سے زیادہ کبھی خوش نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کو مجھے خوش دیکھ کر خوش ہونا چاہئے !!"

پتی چمپا کے بالوں میں اُنگلی ڈال کر سوچنے لگا ۔

شنکر سروپ بھٹناگر

بازگشت خیال

مئے گلرنگ سے لبریز ہے مینائے خیال، میری ہر سانس ہے اک جرعۂ صہبائے خیال
تیرا آئینہ بنا جلوۂ زیبائے خیال، ہے ترے شوق میں آراستہ لیلائے خیال

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

خواب دیکھے ہیں بہت عالم بیداری میں بیخودی میں، کبھی مستی، کبھی ہشیاری میں
عشرتیں لوٹی ہیں تخئیل کی گلکاری میں نظم و ترتیب میں، تزئین میں، طیاری میں،

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

شمع فانوس نے یہ حسن نہ پایا ہرگز اس طرح ٹوٹ کے پروانہ نہ آیا ہرگز
میرے مانند جلا دل نہ جلایا ہرگز جان بیتاب کو شعلہ نہ بنایا ہرگز

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

شوق جب دل کو ہوا انجمن آرائی کا آگیا سامنے جلوہ تری رعنائی کا
فکر نے کام دیا چشم تماشائی کا دور پہ دور چلا ساغر مینائی کا،

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

زخمہ زن ہوتی ہے اس طرح تری شوخ نظر دیتی ہے بے خبری عالم بالا کی خبر
چونک پڑتی ہے مری روح پھریری لے کر شعر بن جاتا ہے اک نغمۂ لبریز اثر

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

جاگ اُٹھیں وہ تمنائیں جو تھیں سوئی ہوئی
راہ پر آئیں وہ امیدیں جو تھیں کھوئی ہوئی
آرزوئیں ہوئیں شاداب جو تھیں روئی ہوئی
لہلہاتی ہے ہر اک کشت مری بوئی ہوئی

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضو فشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

تجھ سے کاشانۂ ہستی مرا آباد ہوا
جس قدر رنج سہے اور بھی دل شاد ہوا
للہ الحمد کہ ہر قید سے آزاد ہوا
ایک گلزار طرب عالم ایجاد ہوا

دلکشی طرز میں ہے، شیفتگی بات میں ہے
ضوفشاں حسن ترا پردۂ جذبات میں ہے

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

آئرس[1]

چوم کر منہ گُلِ آئرس سے یہ میں نے پوچھا
اس مہک پر تجھے ویرانہ ہوا کیوں مرغوب؟
مسکرا کر یہ کہا، شاعرِ وارستہ مزاج
راہ چلتے ہوئی مجھ پر بھی عنایت، کیا خوب!
خیر منظور ہے مجھ کو تری خاطر، سُن لے
آ بتاؤں تجھے، صحرا سے ہوا کیوں منسوب،
تیری ہی طرح مجھے فطرت آزاد ملی
تیری ہی طرح نمائش کو بھی سمجھا معیوب
ملتفت مجھ سے نہیں ہوتے جو ظاہر بیں ہیں
حُسن میرا ہے فقط اہلِ نظر کو محبوب

وہ گلستاں ہی سہی قید ہے پھر قید اثر
ذوق پرواز کو ہے وسعتِ "لاشے" مطلوب

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

[1] آئرس، کشمیر کا ایک سپید خودرو پھول۔

زار سے اسٹالین تک

اس وقت ساری دُنیا کی آنکھیں اسٹالین کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اسٹالین کے معنے "فولادی انسان" کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہٹلر کا مقابلہ کرنے میں اس نے اپنے آہنی عزم و ارادہ کا پُرا ثبوت دیدیا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اسٹالین کی یہ کامیابیاں ممکن ہیں عارضی ہوں اور روسی آبادی زیادہ عرصہ تک اس کشاکش کو برداشت نہ کر سکے لیکن اگر انقلاب روس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ سوویٹ حکومت کی جڑیں کتنی مضبوط ہیں اور دُنیا کی کوئی قوت اسے غلام بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

دنیا میں اس وقت تک بہت سے انقلابات ہوئے ہیں جن میں انقلاب فرانس کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ روس کا انقلاب اس سے کہیں زیادہ اہم تھا، کیونکہ فرانس کا انقلاب دُنیا میں کوئی ایسی حکومت قایم نہ کر سکا جو جماعتی تفریق کو یکسر مٹا دے۔ لیکن انقلاب روس کے بعد سارا ملک ایک ایسے نظریۂ حکومت پر متفق و متحد ہو گیا ہے جس کے بدلنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

انقلاب فرانس نے اس میں شک نہیں کہ سارے یورپ کو ہلا کر رکھدیا، لیکن روس اس سے بالکل متاثر نہیں ہوا، بلکہ زار کا اقتدار اور بڑھ گیا اور زاریت اہل روس کے لئے بے پناہ عذاب بنکر رہ گئی۔

صدیاں گزر چکی تھیں کہ روس کا زراعتی طبقہ غلامی کی زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا اور زار کے ظالمانہ اقتدار کو دور کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن جب جنگ کریمیا میں روس کو شکست ہوئی تو روسی آبادی کی آنکھیں کھلیں اور اس کے بعد جب سنہ ۱۹۰۵ء میں جاپان نے زار کی فوجوں کو شکست دی، تو انقلاب کی لہر سارے ملک میں دوڑ گئی اور ہڑتالوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اسی دوران میں زار کا چچا (گرانڈ ڈیوک [illegible]) قتل کیا گیا اور ملک میں عام بے چینی پیدا ہو چلی۔

ہر چند زار نے لوگوں کو مطمئن کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن حالات بہت کچھ بدل گئے تھے اور وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ الگزنڈر دوم کے قتل کے بعد لینن کے بھائی نے نئے زار کے خلاف سنٹ پٹرسبرگ میں زبردست سازش شروع کی، لیکن حملہ کا جو دن مقرر کیا گیا تھا اسی دن وہ گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا ــــ اسوقت لینن کی عمر ۱۷ سال کی تھی اور یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ ذہنی انقلاب تیغ و تفنگ سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے، اس لئے زاریت کے خلاف پروپگنڈا شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں سوشلسٹ جماعت برسر اقتدار تھی اور وہاں سب سے پہلی "لیبر یونین" (مجلس اتحادِ عمال) قایم ہو چکی تھی۔ اسکو دیکھکر لینن کا حوصلہ بلند ہوا اور اس نے بھی اپنے چند احباب کی مدد سے روس میں ایسی ہی یونین قایم کرنا چاہی۔ چنانچہ سارے ملک نے ایک زبردست ہڑتال کے ذریعہ سے اس تحریک کا خیر مقدم کیا، لیکن زار نے اس تحریک کو بڑھنے نہ دیا اور لینن کو جلاوطن کر کے سائبیریا بھیجدیا۔

اس کے بعد جب سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی، تو انقلاب پسندوں کے لئے اچھا موقعہ ہاتھ آگیا اور سنہ ۱۹۱۷ء کے آغاز میں پٹروگراڈ میں بغاوت شروع ہو گئی زار نے باغیوں پر گولی چلانے کا حکم دیا لیکن فوج نے انکار کر دیا اور زار نے موقع کی نزاکت کا احساس کر کے ۱۵ مارچ کو تخت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد نئی حکومت قایم ہوئی جس کا وزیر اعظم "پرنس لووف" ([illegible]) اور وزیر جنگ کرنسکی منتخب کیا گیا۔ اس کے چند دن بعد کرنسکی وزیر اعظم ہو گیا، لیکن یہ نئی حکومت ابھی مستحکم نہ ہوئی تھی کہ ماڈریٹ اور انتہا پسند جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا۔ ماڈریٹ چاہتے تھے کہ لڑائی کو جاری رکھی جائے اور انتہا پسند انقلاب چاہتے تھے۔ چونکہ جرمنی اس وقت لڑائی سے تھک چکا تھا اور چاہتا تھا کہ روس میں انقلاب پسند جماعت کو کامیابی حاصل ہو، اس لئے اس نے بھی خفیہ طور پر انقلاب روس کی کامیابی کی کوشش کی اور لینن کو جو اسوقت جرمنی ہی میں تھا مسلح بمقفل ٹرین کے ذریعہ سے روس پہونچا دیا۔ جب لینن یہاں پہونچا، تو کرنسکی بھاگ گیا اور لینن نے پورا اقتدار حاصل کر کے سوویٹ (کونسل) قایم کر دی اور ٹراٹسکی کو وزیر خارجہ بنا دیا۔

انھوں نے اس کے بعد ہی روس کے تعلقات اتحادیوں سے قطع کر دئے اور جرمنی کے ساتھ علیحدہ صلح کر لی۔ اس سے لینن کا مقصود صرف یہ تھا کہ وہ کسی طرح انقلاب کو کامیاب بنا سکے اور اپنے ملک کی اقتصادی حالت کو درست کر سکے۔ ہر چند صلح نامہ کی رو سے، پولینڈ، اوکرائن، فن لینڈ، علاقۂ بالٹک سب سے روس کو دستبردار ہونا پڑا، لیکن بعد کو تاریخ نے ثابت کر دیا کہ در اصل فتح لینن ہی کو حاصل ہوئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اب حکومت لینن ہی کے ہاتھ میں تھی، لیکن اس کے متبعین ابھی اقلیت میں تھے اور جب جنوری ۱۹۱۸ء میں ملک کے تمام نمایندوں کا جلسہ ہوا تو بالشویک حکومت کے مخالفین زیادہ نظر آئے۔ لینن نے ہوا کا یہ رخ دیکھ کر جبر لوگوں کے دلوں میں بالشویک حکومت کے برکات ذہن نشین کرنا شروع کئے اور پایۂ تخت پیٹروگراڈ سے ماسکو منتقل کر دیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۱۸ء میں زار کے خاندان کا قتل عمل میں آیا اور کلیساؤں کی جایداد ضبط کر لی گئی۔

اسوقت تک لینن نے جو کچھ کیا اس سے جنگ کا مسئلہ تو بیشک طے ہو گیا لیکن اقتصادی الجھن بدستور باقی رہی، آخر کار ۱۹۲۱ء میں اس نے اعلان کر دیا کہ کسان اپنی پیداوار کے مالک ہیں اور وہ اسے اپنے طور پر بازار میں فروخت کر سکتے ہیں۔ لینن سمجھتا تھا کہ اگر اس وقت اس نے اپنی نئی پالیسی کو رائج کرنا چاہا تو انقلاب میں کامیابی نہ ہوگی۔ الغرض لینن نے نہایت ہوشیاری اور ترکیب سے کامل تین سال کی کوشش کے بعد رفتہ رفتہ سوویٹ حکومت کی بنیاد مضبوط کر لی، لیکن بد قسمتی سے ایک دن کسی عورت نے جو اس کی پالیسی کی مخالف تھی اسے گولی کا نشانہ بنایا اور وہ ایک سال تک بستر پر پڑے رہنے کے بعد چل بسا۔

لینن کا جانشین قدرتاً ٹراٹسکی کو ہونا چاہئے تھا، لیکن چونکہ ٹراٹسکی بین الاقوامی انقلاب کا حامی تھا اور لینن کی اقتصادی پالیسی کا بھی مخالف تھا، اس لئے لینن کی پارٹی اس کی مخالف ہو گئی اور تھوڑے سے خلفشار کے بعد اسٹالین برسر اقتدار ہو گیا۔ اسٹالین، لینن کا بڑا معتقد تھا اور وہ انقلاب کو روس کے اندر ہی محدود رکھ کر پہلے اپنے ملک کو مضبوط بنانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اقتصادی و عسکری، صنعتی و زرعی ترقی کی طرف توجہ کی اور ۱۹۲۸ء میں اپنی پہلی پنج سالہ اسکیم پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ اس اسکیم میں اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۹۳۳ء میں دوسری پنج سالہ اسکیم کا آغاز ہوا جو پہلے سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

اسٹالین کا مقصود اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ صلح و آشتی رکھ کر ترقی کرنا تھا، یہاں تک کہ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ۱۹۳۹ء میں جرمنی سے بھی ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا، لیکن چونکہ اسٹالین جانتا تھا کہ ہٹلر کا کوئی اعتبار نہیں ہے اس لئے وہ فوجی طیاریاں بھی کرتا جاتا تھا اور آخر کار اسٹالین کا اندیشہ پورا ہو کر رہا اور نازیوں نے روس پر حملہ کر ہی دیا۔

روس کا موجودہ عسکری نظام

اس میں شک نہیں کہ اول اول جرمنی کو روس کے مقابلہ میں بہت کامیابی ہوئی، لیکن اب صورت بہت کچھ بدل چکی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موسم سرما نے بھی جرمن افواج کے اقدام کو روکنے میں بڑی مدد دی ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ پچھلے گیارہ ماہ کے اندر روسی افواج کے نظام میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے اور مارشل ٹموشنکو نے وہاں کی فوجوں کی حالت بہت کچھ بدل دی ہے۔

اس سے قبل سرخ افواج کا نظام یہ تھا کہ افسر اور معمولی سپاہی میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ تھا، یہاں تک کہ سپاہی اگر راستہ میں اپنے افسر سے ملتا تو سلام کرنے پر بھی مجبور نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ جذبۂ مساوات بڑی عمدہ چیز ہے اور بہ حالت امن فوج کے لئے بھی برا نہیں، لیکن بحالت جنگ اس کا تجربہ اچھا ثابت نہ ہوا چنانچہ مارشل ٹموشنکو نے فوج کی تنظیم بالکل بدل دی۔

نازی طریق جنگ کو دیکھ کر ٹموشنکو نے محسوس کیا کہ فوج کے لئے لازم ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر جلد سے جلد قدم اٹھائے اور اس کے تمام دستوں میں اتحاد عمل پایا جائے۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے روس کی تمام افواج کو صرف ایک مرکز سے وابستہ کیا اور اسی کے ساتھ جو غلط قسم کی جمہوریت و مساوات ان میں پائی جاتی تھی اسے دور کیا تاکہ افسر کی طرف سے جب کوئی حکم دیا جائے تو یہ بحث نہ شروع ہو کہ یہ حکم مناسب ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ سپاہیوں کی از سر نو تنظیم کر کے ان کو احکام کی پابندی، جفاکشی اور ہمت و استقلال کی تعلیم دی گئی، چنانچہ گیارہ ماہ کے اندر روسی فوج کی حالت بالکل بدل گئی۔

[illegible] افواج کی تنظیم کلب کی تنظیم نہیں ہے، جہاں صرف گپ لڑائی جاتی ہے اور افسر و سپاہی کے درمیان کوئی امتیاز قایم نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ شہری آبادی میں بھی [illegible] پیدا کی جا رہی ہے اور مدارس میں پانچویں درجہ سے فوجی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ الغرض اب سرخ افواج کی حالت بہت کچھ بدل گئی ہے اور اسی تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ روس نے دفاع کے ساتھ جارحانہ اقدام بھی شروع کر دیا ہے۔

روس کے ذرایع دفاع

لڑائی میں کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے، ایک عسکری تنظیم، دوسرے اقتصادی اطمینان اور صنعت حربی کا استحکام۔ روس کی فوجی تنظیم کا مختصر حال ابھی آپ سن چکے، اب دوسری بات کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ روس اس باب میں بہت مضبوط ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یوکرائن، سفید روس اور کریمیا، روس کے بڑے اہم زرخیز علاقے ہیں جہاں زراعت و صنعت کے مرکز بہ کثرت پائے جاتے ہیں، لیکن غالباً بہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ روس کے اصلی صنعتی مرکز میدان جنگ سے ۲۰۰۰ میل دور کوہستان یورال میں واقع ہیں اور اب کہ مغربی روس میں دشمن کے حملہ کی وجہ سے یہاں کے تمام صنعتی مرکز درہم برہم ہو رہے ہیں، ہر قسم کی کمک یورال ہی کی طرف سے پہونچ رہی ہے۔

مسٹر جان اسکاٹ جس نے خود اس حصۂ ملک کی سیاحت کی ہے، لکھتے ہیں کہ ۲۰۰ سے زیادہ صنعتی کارخانے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان یہاں قائم ہو چکے ہیں جو کوہستان کے اندر نہایت مخفی طریقہ سے رات دن کام کر رہے ہیں اور لطف یہ ہے کہ کام کرنے والے سب کے سب روسی ہیں اور حکومت نے ان کے چلانے کے لئے کسی سے قرض نہیں لیا۔

ایک مقام ہے گنی ٹوگورسک جو ۱۹۲۹ء میں ایک معمولی کوہستانی گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن اب وہ دُنیا کی سب سے بڑی معدن کوئلے اور لوہے کی ہے۔ حکومت نے دو ارب روبل کے صرف سے یہاں لوہا اور کوئلہ نکالنے کے کارخانے قائم کئے ہیں جو شب و روز کام کر رہے ہیں اور روس کو بڑی حد تک ان دونوں چیزوں کی طرف سے بے نیاز بنائے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک معدن پٹرول کی بھی ہے جو دُنیا کی سب سے بڑی معدن خیال کی جاتی ہے۔ یہاں سے کم از کم ۵ لاکھ ٹن صاف شدہ پٹرول ہوائی جہازوں کے لئے سالانہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس علاقہ میں بیس ہوائی جہاز بنانے والے کارخانے بھی ہیں جو دشمن کی زد سے محفوظ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یہی حال یہاں کے ذخایر غلّہ کا ہے جو سیکڑوں میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے کسی ملک کو تیل کی اتنی ضرورت نہیں جتنی روس کو ہے، کیونکہ یہاں کی تمام صنعت اور ساری زراعت بالکل میکانکی صورت اختیار کر چکی ہے اور زندگی کا ہر شعبہ مشین پر قائم ہے، لیکن اگر یوکرائن اور کریمیا کے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے تو بھی اس کی پٹرولی پیداوار جو کوہستان یورال میں پائی جاتی ہے، اسے سالہا سال تک جرمنی کے مقابلہ پر آمادہ رکھ سکتی ہے۔

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دُنیا:۔ اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

الہامات شاد:۔ شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن انکے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے قیمت ۸

اقبال کی شاعری:۔ یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنہ

مقام محمود:۔ مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت پانچ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

نگار کے بعض خاص نمبروں کے متعلق ضروری اعلان

نگار جنوری ۱۹۳۳ء (غالب نمبر) اب چار روپیہ فی کاپی کے حساب سے ملے گا۔ اور نگار جنوری ۱۹۳۵ء (اردو شاعری نمبر) اور نگار جنوری ۱۹۳۶ء (ہندی شاعری نمبر) بالکل ختم ہو گئے ہیں، جن حضرات کو اشد ضرورت ہوگی ان کے لئے ہم دوسرے ذرائع سے خرید کر فراہم کر دیں گے لیکن ان کی قیمت کی کوئی تعیین نہیں ہو سکتی، فروخت کرنے والا جو طلب کرے گا دینا پڑے گی۔

نگار جنوری ۱۹۳۸ء (تاریخ اسلامی ہند) کی قیمت اب تین روپیہ فی پرچہ اور نگار جنوری ۱۹۳۹ء (اصحاب کہف نمبر) کی قیمت دو روپیہ فی کاپی لی جائے گی۔

جن حضرات کے پاس ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۰ء تک کے نمبر نہیں ہیں وہ ابھی طلب فرمالیں ورنہ چند دن کے بعد ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

مینجر نگار

زندگی

فسردگی سے میں کرتا ہوں تازگی پیدا
مرے شباب سے دنیا ہے خُلد کی پیدا

گھٹا سے ہے مجھے تخلیقِ برق کا ارماں
اندھیریوں سے میں کرتا ہوں روشنی پیدا

تصوّرات کے بل پر مرے شبستاں میں
شبِ مہیب سے ہوتی ہے چاندنی پیدا

بہار ہو کہ نہ ہو، میرا ذوق کرتا ہے
خزاں کے روپ میں اندازِ دلکشی پیدا

نشاط اور مسرت میں مست رہتا ہوں
مذاقِ غم سے ہے یک گونہ سرخوشی پیدا

روش روش پہ بچھاتا ہوں رات کو تارے
سرشکِ غم سے ہے اک نوع کی ہنسی پیدا

مجھے یبوست زہد و ورع نہیں منظور
گنہ سے کرتا ہوں احساسِ زندگی پیدا

میں چاہتا ہوں کہ ہنگامہ زار ہو دنیا
خموشیوں سے ہو اک شورِ دائمی پیدا

میں چاہتا ہوں رواں دواں رہے عالم
کہ ہو جمودِ دو عالم میں برہمی پیدا

نگار خانۂ ہستی مرا تبسم ہے
گرفتگی سے مرے دل کی ہے کلی پیدا

حیاتِ نو کا پیامِ شگفتہ لایا ہوں
کروں گا بزم میں اک زندگی نئی پیدا

وہ زندگی کہ جو ہنگامہ در کنار رہے
وہ زندگی نہیں جو سرد و ناگوار رہے

نبی احمد بریلوی

آپ کیسے ہیں ؟

سنئے

دل میں غم آیا کہ یا شادمانی یہ نہ پوچھ
کس ڈگر پر چل رہی ہے زندگانی یہ نہ پوچھ

میرے دامن میں گل و نشتر ہیں اتنا دیکھ لے
میری آنکھوں میں شرارے ہیں کہ پانی یہ نہ پوچھ

دیکھتی ہے اب بھی یہ دنیا مجھے ہنستا ہوا
اس ہنسی میں موت ہے یا زندگانی یہ نہ پوچھ

اک جانب وقت کی قوت ہے اک جانب ہے دل
کون کس پر کر رہا ہے مہربانی یہ نہ پوچھ

تیرا میں نے اگر چاہا تو پھر ملجائیں گی،
گیت لیکن گا سکے گی پھر جوانی یہ نہ پوچھ

بس یونہی آنسو نکل آتے ہیں آنکھوں سے کبھی
کوئی ہوتی بھی ہے وجہ شادمانی یہ نہ پوچھ

دیکھ یہ ہاتھوں سے چھپا [illegible] دیکھ چہرے کی خراش
پھر بھی کیوں ہیں ہونٹ صرف نغمہ خوانی یہ نہ پوچھ

زندگی کیسی تڑپ ہے زندگی کیسی گداز
ماورائے شوق باقی ہے کہ فانی یہ نہ پوچھ

میں یہاں پہ ختم کر سکتا ہوں اپنی داستاں
میں کہاں سے کہہ سکوں گا اب کہانی یہ نہ پوچھ

فضل الدین اخترؔ ایم۔ اے۔ بی ٹی

غزل

تری سعیٔ کرم بھی رائیگاں معلوم ہوتی ہے
کہ اب کچھ تیز تر عمر رواں معلوم ہوتی ہے

وہ کھائے ہیں سر منزل فریب زندگی میں نے
کہ گرد رہگزر بھی کارواں معلوم ہوتی ہے

نگاہِ شوق ہی پروردگارِ حسنِ رنگیں ہے
یہی دریا، یہی موجِ رواں معلوم ہوتی ہے

لرزتا تھا جس کو دیکھ کر اپنے نشیمن پر
وہی بجلی چراغِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نظر پڑتی ہے جا کر جب مآلِ حسنِ رنگیں پر
کلی کھلنے سے پہلے خونچکاں معلوم ہوتی ہے

مرے حساس دل میں درد ہے سارے گلستاں کا
مجھے ہر شاخ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

قیامت ہے تلاطم شورِ دریائے محبت کا
جو موج اٹھتی ہے وہ ساحل نشاں معلوم ہوتی ہے

[illegible]

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(جناب سید علی سجاد مرزا - سہارن پور)

مارچ کے نگار میں شرح کلام مومن کا سلسلہ "غم کرتے ہیں" کی زمین تک پہونچا تھا۔ اب اسکے آگے کے چند اشعار اور پیش کرتا ہوں۔ ان پر بھی توجہ فرمایئے -

۱ -- صورت دکھائے جو کبھی جا کے خواب میں بیدید آنکھ کھول دے جھنجھلا کے خواب میں

کیا بیدید سے مراد یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے وہ جھنجھلا کے آنکھ کھول دیتا ہے -

۲ -- شب وہ جو سو رہے مرے پاس آکے خواب میں، جاگے تھے بخت خفتہ تمنا کے خواب میں

تمنا کے خواب میں کس کے بخت خفتہ جاگے ؟

۳ - آنکھوں کو بند کر کے وہیں کھولدے گر آئے یوسف کسی کے محو تماشہ کے خواب میں

کون آنکھ بند کر کے کھولدے اور کیوں ؟

۴ - کابوس ہیں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

پہلے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بہت مبہم ہے اور اس کا پورے شعر سے کیا تعلق ہے ؟

۵ - سو رہتے پائے ناقہ زمان و داع گر طالع نہ ہوتے قیس کے لیلیٰ کے خواب میں

دوسرا مصرعہ بہت اُلجھا ہوا ہے، "لیلیٰ کے خواب میں قیس کے طالع نہ ہوتے" - یہ کیا بات ہوئی ؟

۶ - نیرنگ عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

پورے شعر کا مفہوم چاہتا ہوں -

۷ - رہتا ہے دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں، کیوں چونک چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں

پورے شعر کا مطلب بیان فرمایئے -

۸ - اُس کی گلی ہے نالۂ زنجیر غل نہ کر یاں پاؤں جاگتے ہیں کوئی جاگے خواب میں

کیا مطلب ہے -

۹ - سو جاؤں روتے روتے تو کیا ہنس کے طعن سے کہتا ہے سوتے ہو مرے بن آکے خواب میں

دوسرے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا بہت مبہم ہے -

۱۰ -- سوزِ دل کے ہاتھ سے ڈھونڈھوں جو آمن آب میں ہووے ہر ہر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں

دوسرے مصرعہ کا کیا مفہوم ہے

۱۱ -- گر نہ وہ دستِ حنائی عکس افگن خواب میں ہووے مرجاں جوں چنار آتش زن تن آب میں

دوسرے مصرعہ کا ٹکڑا کیا مفہوم رکھتا ہے -

۱۲ -- دی دل سوزاں کو تشبیہ سمندر میں نے اب چھوڑ کر آتشکدہ ڈھونڈھے ہے مسکن آب میں

پورے شعر کا مفہوم درکار ہے -

۱۳ - دیدۂ چشم یار میں دریا پہ رو یا بن گئیں مردم آبی کی پتلیاں شمع روشن آب میں

کیا مفہوم ہے -

۱۴ — دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں — کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

کیا مطلب ہے۔

(نگار) ۱ — "بیدید" کے معنی بیمروت و سنگدل کے ہیں۔ اسی معنے میں "بیدیدہ" بھی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کبھی خواب میں بھی مجھے دیکھ لیتا ہے تو وہ بیمروت فوراً جھنجھلا کے آنکھیں کھول دیتا ہے۔

۲ — "تمنا کے خواب میں" نہ کہئے۔ دوسرے مصرعہ کی نثر یوں ہوگی "تمنا کے بخت خفتہ، خواب میں جاگے تھے"۔ اب مطلب صاف ہو گیا۔

۳ — وہ شخص جو میرا محو تماشہ ہے وہ اگر یوسف بھی خواب میں نظر آئے تو فوراً آنکھیں کھول دے۔ مطلب یہ کہ جو تیرا تماشائی ہے وہ یوسف پر بھی نگاہ نہیں ڈال سکتا۔

دوسرے مصرعہ میں کسی کے بعد "کے" بیکار معلوم ہوتا ہے "کسی محو تماشہ کے خواب میں" ہونا چاہئے، اس لئے مجھے اس مصرعہ کی صحت میں کلام ہے۔

۴ — کابوس ایک بیماری ہے جس میں انسان سوتے سوتے چونک پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بار بار چونک پڑنے کو اطبا کابوس کا مرض بتاتے ہیں، حالانکہ اسکا سبب یہ ہے کہ میرا محبوب مجھے خواب میں نظر آتا ہے۔ اس لئے بربنائے رشک میں یہ تو گوارا نہیں کر سکتا کہ میرا محبوب ہی طبیبوں کو خواب میں نظر آئے لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کوئی اور حسین انھیں اسی طرح نظر آئے اور وہ بھی میری طرح چونک چونک پڑیں۔ اور اس طرح انھیں حقیقت کا علم ہو سکے۔

۵ — دوسرے مصرعہ میں "قیس کے" بعد "آور" محذوف ہے۔ یعنی اگر قیس کے اور لیلےٰ کے طالع خواب میں نہ ہوتے تو وداع کے وقت ناقۂ لیلیٰ کے پاؤں سو جاتے اور وہ روانہ نہ ہو سکتی۔

۶ — مشہور ہے کہ زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھنچکر زلیخا کے پاس پہونچ گئے۔ مومن کہتے ہیں کہ جو کشش زلیخا کے خواب میں تھی وہی میرے دلِ بیدار میں بھی ہے، دونوں کا ایک رنگ ہے۔

۷ — اگر تم مجھے دیکھتے بھی نہیں ہو۔ تو میرا دھیان ضرور تمھیں رہتا ہے ورنہ خواب میں گھبرا کر چونک پڑنا کیسا؟

۸ — "نالۂ زنجیر" سے خطاب ہے کہ اُس کی گلی میں غُل نہ کر کیونکہ یہاں ہر ایک کے پاؤں پھیلا کر سو جاتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "استفہام انکاری" ہے اس لئے اسی لہجہ سے پڑھئے۔

۹ — دوسرے مصرعہ کی نثر یوں ہے: —

خواب میں آکے کہتا ہے کہ مرے بن سوتے ہو؟

۱۰ — میرے سوزِ دل کا یہ عالم ہے کہ اگر پانی میں پناہ لوں تو ہر ہر قطرہ گلخن کو بھی داغِ رشک دے۔ یعنی گلخن بھی اپنی گرمی کو بھول جائے۔

۱۱ — اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے دستِ حنائی کا عکس پانی میں پڑے تو پنجۂ مرجاں بھی چنار کی طرح آگ دے اُٹھے۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں ردیف بیکار معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بحالت خواب دستِ حنائی کا عکس افگن ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، اسی طرح دوسرے مصرعہ میں "تن" کا لفظ بھی کوئی خاص مفہوم پیدا نہیں کرتا۔

۱۲ — سمندر، آگ کا کیڑا ہے، لیکن اگر بیں اب دلِ سوزاں سے اسے تشبیہ دیدوں تو وہ بھی آگ سے گھبرا کر پانی میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈھے۔

۱۳ — میں چشمِ یار کی یاد میں دریا پر رویا تو آنسوؤں کی سوزش کی وجہ سے مردم آبی کی پلکیں بھی شمع کی طرح جلنے لگیں۔

۱۴ — جب موت پر سکتہ کا شبہ ہوتا ہے تو چہرہ کے سامنے آئینہ رکھ کر دیکھتے ہیں، کیونکہ اگر ہلکی سی ہلکی سانس ہوگی تو بھی آئینہ پر اس کا دھندلا سا نشان پڑ جائے گا۔ مومن کہتا ہے کہ یہاں تو جان ہی نہیں اور تم سکتہ کا شبہ کر کے آئینہ دکھاتے ہو۔ کیا اسی پر یہ بدگمان نہ ہونے کا دعوے کرتے ہو۔

مطبوعات موصولہ

دردانہ مجموعہ ہے آنسہ محمودہ رضوی کے بعض ادبی مقالات کا جسے اس۔ جی کاروانی ام۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ آنسہ محمودہ کے یہ مقالات بعض رسایل میں شایع ہو چکے ہیں اور اپنے انداز تحریر سے اس دور کی یادگار ہیں جب ٹیگور کی تقلید ذوق عام کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

خیالات کی پاکیزگی اور بیان کی لطافت سے پتہ چلتا ہے کہ آنسہ محمودہ اس سے بہتر خدمت زبان کی انجام دے سکتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- دفتر انجمن ترقی اردو کراچی۔

دشمن کے گیت(?) جناب نسیم اس وقت کے صاحب فکر نوجوان شاعروں میں سے ہیں اور موجودہ دور کی شاعری میں جو جدید رجحانات نظر آتے ہیں وہ ان کے کلام میں بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔ ابتدا میں ڈاکٹر تاثیر کا ایک مختصر سا مقدمہ بھی شامل ہے اور میں ان کے اس خیال کا موید ہوں کہ ندیم نے ان قطعات میں شاعری اور افسانہ دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ان قطعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر کافی غایر ہے، لیکن اس میں فلسفیانہ خشکی یا واعظانہ یبوست نہیں، بلکہ ادبی لطافت ہے۔ ہلکے قسم کا رومان ہے، ایک خاص قسم کا دردمندانہ احساس ہے، جو پڑھنے والے کو کافی متاثر کرتا ہے۔

قطعات کا زیادہ حصہ سوگوارانہ کیفیت لئے ہوئے ہے، انقلابی شاعرانہ رنگ کے قطعات بھی کافی ہیں لیکن انقلابی رنگ کی کوئی چیز اس میں نہیں پائی جاتی بہرحال مجموعہ بہت پر لطف ہے اور اس کا مطالعہ تھوڑی دیر کے لئے فکر حیات زمانہ سے ہمیں علحدہ کر دیتا ہے۔ آردو اکاڈیمی لاہور نے اسے نہایت اہتمام سے مجلد شائع کیا ہے قیمت ہے۔

شیخ و برہمن مجموعہ ہے جناب اعظم کریوی کے سولہ افسانوں کا۔ اعظم کریوی بہت مشاق فسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں کا مقامی رنگ عام طور پر بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں پلاٹ، کردار اور زبان سب ایک ہی ہیجان کو ظاہر کرتے ہیں اور وہ رجحان زندگی کی طرف ان پانوں سے متعلق ہے جو بغیر کسی ٹیکنیکی اپیچ کے ہمیں روزانہ متاثر کرتی رہتی ہیں۔

گاؤں اور گاؤں والوں کی فطرت و معاشرت سے متعلق جو واقعات فسانہ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، انھیں کو اعظم صاحب نے لیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی اس بدنصیب آبادی کا بڑا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ دو روپیہ میں کتابخانہ دانش محل امین آباد پارک سے مل سکتا ہے۔

شان خدا مولانا عبیدالرحمان عاقل رحمانی کی تالیف ہے جس میں وجود خالق سے بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مقصود دہریوں اور ملحدوں کو راہ راست پر لانا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فاضل مولف نے ابھی تک یہی نہیں سمجھا کہ اصل نزاع کیا ہے۔ اصل سوال یہ نہیں ہے کہ خدا ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ کہ خدا کا جو تصور مذاہب نے پیش کیا ہے وہ قابل قبول ہے یا نہیں۔ عاقل صاحب اپنے استدلات میں جو زیادہ تر منقولی اور کمتر معقولی ہیں، کوئی نئی بات نہیں بتائی اور اسی مولویانہ کج بحثی اور کم نظری سے کام لیا ہے جو اس طبقہ کا قدیم شیوہ ہے۔ خدا سے انکار کرنے والوں کا جواب تو آسانی سے دیا جا سکتا ہے، لیکن وہ لوگ جو مذہب کے بتائے ہوئے تصور خداوندی پر اعتراض کرتے ہیں، ان کا جواب دینا مشکل ہے کیونکہ اس صورت میں حشر و نشر وغیرہ کا عقیدہ سب خاک میں ملجاتا ہے جس پر مذہب کی بنیاد قایم ہے۔ اس کتاب کی قیمت عہ ہے اور ملنے کا پتہ:- کتابستان پوسٹ بکس ۱۶۶۳ بمبئی۔

محمد رسول اللہ ترجمہ ہے طامس کارلائل کی مشہور تصنیف کا جس میں اس نے رسول اللہ کی حمایت کی ہے اور معترضین کا جواب دیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی مولانا عبیدالرحمان صاحب عاقل رحمانی کا کیا ہوا ہے اور برا نہیں ہے۔ کارلائل نے جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی ہے اس وقت سائنس نے اتنی ترقی نہ کی تھی اور اسی لئے اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس وقت کے لئے زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اب جو اعتراضات خدا اور رسول کے مفہوم پر کئے جاتے ہیں ان کی نوعیت بالکل علحدہ ہے اسلئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے ترجمہ سے کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ وہی۔

جواہر العلوم ترجمہ ہے علامہ طنطاوی جوہری مصری کی کتاب کا۔ ترجمہ مولوی عبدالرحیم صاحب پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور نے کیا ہے اور برا نہیں ہے۔ اس کتاب میں بہ صورت مکالمہ دنیا کے بعض قدیم و جدید عجائبات کو پیش کیا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب چیز کتاب کا وہ حصہ ہے جس میں قیامت اور جزا و سزا کے ثبوت پر عقلی دلایل پیش کئے گئے ہیں میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس حصہ کا کیا تعلق تھا موضوع سے کیا تعلق تھا مغربی زبان کی کتابوں کو دیکھتے ہوئے جواہر العلوم بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہے قیمت دو روپیہ ملنے کا پتہ کتابستان پوسٹ بکس ۱۶۶۳ بمبئی۔

راہگزر جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جناب عاشق حسین صاحب مشاق افسانہ نگار ہیں۔ یہ افسانے متوسط درجہ کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کو سامنے رکھکر لکھے گئے ہیں اور ان تمام الجھنوں، بے تابیوں اور نامرادیوں کے آئینہ دار ہیں جن سے ہمیں اکثر واسطہ پڑتا ہے۔ پلاٹ، زبان اور ادبیت سب کچھ ان میں موجود ہے اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس رنگ کے افسانے لکھنے میں عاشق صاحب نے جو جگہ حاصل کر لی ہے وہ انکے لئے مخصوص ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- لاہور بک شاپ نسبت روڈ لاہور

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲	فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۴۲ء	شمارہ ۱

ملاحظات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱
ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر ۔ ۔ ۔ سید حکیم احمد نقوی ۔ ۔ ۔ ۔ ۵
یوروپ میں اشتراکیت کی جدوجہد ۔ صدرالدین عظیم ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳
ترہاتِ نظیری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (حکیم) سید اعجاز احمد معجز ۔ ۔ ۔ ۱۷
خاکِ دامن گیر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کلیم اللہ ۔ ام ۔ اس ۔ سی ۲۰
ناظورۂ کشمیر (نظم) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرزا جعفر علی خاں اثر ۔ ۔ ۔ ۲۶
غزلیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پروفیسر شور ۔ سلیمان اریب ۔ ۲۷
قتیل پنجابی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملک ام ۔ ام ۔ اے ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۸
مکتوبات نیاز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۰
کیا کہنا! (نظم) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (خان بہادر) مرزا جعفر علیخاں اثر ۳۴
باب الاستفسار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۵
وقت کی باتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۷
اعتبارات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴۰

ملاحظات

عرضِ حال جون کا مہینہ یوں تو تمام شمالی ہند کے لئے قیامت کا مہینہ تھا، لیکن میرے لئے خصوصاً بہت ہی روح فرسا اور ایذا رساں ثابت ہوا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کا انتہائی درجۂ حرارت کبھی ۱۱۴ ڈگری سے زیادہ نہیں بڑھا اور وہ بھی صرف ہفتہ عشرہ کے لئے، لیکن اس مرتبہ گرمی ۱۲۳ درجہ تک پہونچ گئی اور لوہ کی شدت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان و زمین تنور ہو کر رہ گئے ہیں اور انسانوں کی حالت ایسی تھی جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈالدیا جائے۔ یہ تکلیف تو خیر تھی ہی، اس پر طرہ یہ کہ نینی تال سے واپس آنے کے بعد میں بیمار بھی پڑ گیا اور اور پورا مہینہ اُس حال میں گزر گیا جس کا ذکر میر نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم!

تفصیل کیا عرض کروں، یوں سمجھئے کہ دل و دماغ دونوں جواب دے چکے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ شاید جولائی کے رسالہ میں آپ کوئی اور خبر سنیں گے لیکن شکر ہے، قدرت نے چند دن کی مہلت اور دیدی اور میں آج ۳۰ جون کو اس قابل ہو سکا ہوں کہ یہ چند سطریں لکھ سکوں

ظاہر ہے کہ ان حالات میں پرچہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب نہ کر سکتا تھا، تاہم "ہوش" میں رہنے کا کوئی لمحہ میں نے ضایع نہیں کیا اور نگار کی خصوصیات برقرار رکھنے کی کوشش رایگاں نہ گئی۔ اب بھی میں اس قابل نہیں ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور دے سکوں، لیکن اگر ہفتہ عشرہ میں یہ کیفیت کم ہو گئی، تو احباب کے ان خطوں کا جواب بھی دے سکوں گا جو عرصہ سے بند پڑے ہیں اور جن کے جواب نہ دے سکنے کا مجھے سخت افسوس ہے۔

لڑائی کی تیسری منزل

کسی ماہانہ رسالہ میں جنگ پر تبصرہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن شکر ہے کہ اب لڑائی کے حالات میں بھی تبدیلیاں اتنی جلد جلد نہیں ہو رہی ہیں، کہ آج کی چیز کل باسی نظر آئے۔ علاوہ اس کے ہم لوگوں کا جنگ پر کہنا سننا گپ سے زیادہ کچھ نہیں اور گپ کبھی پُرانی ہوتی نہیں!

یوں تو جب تک لڑائی ختم نہ ہو، نہ انجام کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کی جا سکتی ہے اور نہ درمیانی انقلابات کے بابت کچھ کہا جا سکتا ہے تاہم بعض باتیں ایسی ضرور رہتی ہیں، جنھیں دیکھ کر ہم ایسے معمولی آدمی بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا نتیجہ خیز ہونا ضروری ہے، اور زیادہ سے زیادہ ہم انھیں باتوں پر گفتگو کر سکتے ہیں

دوران جنگ میں اول تو ساری خبریں ہم تک پہونچتی نہیں، اور جو پہونچتی بھی ہیں، اُن میں مصلحت آمیزی اس قدر شامل ہوتی ہے کہ قیاس و اندازہ سے بھی کام لینا خطرہ سے خالی نہیں، لیکن نہ چھپ سکنے والی بڑی بڑی باتیں آخر کار معلوم ہو ہی جاتی ہیں اور وہی ہم لوگوں کی بحث کا موضوع ہوا کرتی ہیں

جنگ میں خبروں کی ایک قسم تو وہ ہے جو خانہ پُری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، مثلاً دشمن کے فُلاں فُلاں مقامات پر کامیابی سے بمباری کی گئی۔ فلاں فلاں جہازوں پر کامیابی کے ساتھ نشانہ بیٹھا۔ فلاں فلاں کارخانوں میں سیکڑوں میل سے شعلے بھڑکتے نظر آئے۔ وغیرہ وغیرہ ان خبروں سے مقصود صرف اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے، اور اپنی زندگی کا ثبوت دینا دشمن کی ہلاکت سے علیحدہ ایک چیز ہے جسے ہم صرف نفسیاتی دروابست کہہ سکتے ہیں۔ لیکن خبروں کی ایک قسم اور بھی ہے جس کا چھپانا ممکن نہیں اور انھیں "ناگزیر" قسم کی خبروں سے ہم اپنے جذبات بیم و رجا کی تسکین کرایا کرتے ہیں

جون میں ہم کو اس طرح کی تین خبریں سننے میں آئیں۔ ایک روس و برطانیہ کا جدید معاہدہ، دوسرے جرمنی کا سباسٹوپول اور خارکوف پر زبردست اقدام اور تیسرے طبروق کا سقوط، اور یہ تینوں خبریں اپنی جگہ بے انتہا وزنی اور درجہ اہم ہے

۱- پہلی خبر کے متعلق سوچنے کی ایک بات یہ ہے کہ جب برطانیہ و روس میں اس سے پہلے معاہدۂ اتحاد ہو چکا تھا تو اب دوبارہ اس جدید معاہدہ کی ضرورت کیوں پیش آئی، دوسرے یہ کہ اس جدید معاہدہ کا اثر روس کے حال و مستقبل پر کیا پڑے گا۔ اس معاہدہ کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ پہلے معاہدہ میں امریکہ شامل نہ تھا اور اب شرکت جنگ کے بعد اس کا بھی فریق معاہدہ بننا ضروری تھا۔ لیکن ایک دوسرا پہلو اور بھی ہے وہ یہ کہ لڑائی کا فیصلہ چونکہ روس ہی کی سرزمین پر ہوتا معلوم ہوتا ہے اس لئے ضرورت تھی کہ روس کے مقاصد کو اپنے مقاصد سے قریب تر رکھنے کی احتیاط کر لی جائے تاکہ بعد اختتام جنگ شرائط صلح کی تعیین کے وقت ان خطرات کے پیدا ہونے کا امکان ضعیف ہو جائے، جو اصولاً اشتراکیت اور ڈیماکریسی کے تصادم اغراض سے رونما ہو سکتے ہیں

اس معاہدہ سے روس کو فی الحال سب سے بڑا فایدہ یہ پہونچے گا کہ برطانیہ و امریکہ کی امداد بیش از بیش اسے حاصل ہو سکے گی اور ممکن ہے جرمنی کے خلاف برطانیہ کوئی نیا مورچہ قایم کر کے روس میں دشمن کے دباؤ کو بھی کم کر دے۔ اس معاہدہ کا مستقبل البتہ تاریکی میں ہے تاہم یہ واضح ہے کہ اگر روس کو شکست ہوتی ہے، تو پھر یہ معاہدہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر روس کو کامیابی ہوتی ہے تو دُنیا کی جدید تنظیم میں اگر ڈیماکریسی و اشتراکیت کو ملایا نہ جا سکا تو اشتراکیت کے لئے ایک حد فاصل قایم ہو سکے گی اور "بالشویت" کو زیادہ معتدل صورت اختیار کرنا پڑے گی کیونکہ اگر روس اس جنگ میں کامیاب ہوا تو اس کامیابی کا بڑا سبب امریکہ و برطانیہ کی مدد ہوگی اور شرائط صلح کی تعیین میں قدرتاً ان کی آواز کو زیادہ با اثر ہونا چاہئے

بہرحال روس و برطانیہ کا جدید معاہدہ بڑی اہم چیز ہے اس وقت دوران جنگ میں بھی اور جنگ کے بعد بھی اگر جرمنی کو ناکامی ہوئی

۲- جرمنی کا تازہ حملہ روس کی طرف ۲۲ مئی سے شروع ہوا ہے اور اس وقت ایک مہینہ ختم ہونے کے بعد بھی کوئی نتیجہ اس کا نہیں نکلا۔ اس وقت جو خبریں آ رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ کسی طرح وہ سباسٹوپول پر قابض ہو جائے

اور خارکوف کی طرف روسیوں کو پیچھے ڈھکیل کر قفقاز کا راستہ ان پر بند کردے

پچھلے سال روس میں جرمنی کا نقشۂ جنگ کچھ اور تھا۔ اُس وقت تو صورت یہ تھی کہ ہٹلر سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ پولینڈ سے اُٹھکر اوکرائن، سفید روس، ماسکو، لینن گراڈ اور تمام یورپی علاقہ روس کا فتح کرتا ہوا کوہستان اورال تک آسانی سے پہونچ جائے گا اور اس گلگشت میں کوئی اس کا مزاحم نہ ہوگا، لیکن اب حالت کچھ اور ہے۔ ہٹلر اچھی طرح سمجھ گیا ہے کہ وہ روس کے پر و بال نوچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور وہ اُسے اس حد تک نیچا نہیں دکھا سکتا کہ اس سے من مانی شرطیں منوا سکے، اسی کے ساتھ خود جرمنی پر پچھلے دو سال میں جتنا دباؤ پڑا ہے وہ اسے زیادہ عرصہ تک جنگ جاری رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے ہٹلر چاہتا ہے کہ جلد سے جلد جتنا فایدہ بھی روس کی سرزمین سے اُٹھایا جاسکتا ہے، اُٹھالے ۔۔ اور یہ فایدہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہ باکو کے پیٹرول پر قابض ہوجائے جس کی اسے شدید ضرورت ہے

اگر سباسٹپول پر اس کا قبضہ ہوگیا اور خارکوف کی طرف اس نے روسی فوجوں کو اتنا پیچھے ڈھکیل دیا کہ وہ قفقاز کی طرف نہ بڑھ سکیں، تو یہ قاف کے کوہستان کو عبور کرکے باکو کی طرف بڑھے گا اور پھر نہ صرف عراق و ایران بلکہ تمام مشرق ادنیٰ لڑائی کا اکھاڑا بن جائے گا

اس وقت تک جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سباسٹپول میں روسیوں کی حالت نازک ہے اور خارکوف کی طرف بھی حالات زیادہ امید افزا نہیں، لیکن روس کی سخت جانی کو دیکھتے ہوئے مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں

بہرحال اگر سباسٹپول، روس کے ہاتھ سے نکل گیا (جو اس لڑائی کا رُخ پھیر دینے والا واقعہ ہوگا) تو بحر اسود میں روسی بیڑا بھی ایک حد تک بیکار ہوجائے گا اور خارکوف کی طرف سے روسی فوجوں کی نقل و حرکت بھی دشوار ہوجائے گی۔ اس صورت میں قفقاز کی حفاظت کی ذمہ داری زیادہ تر اتحادیوں کی اس فوج پر عاید ہوگی جو عراق و ایران میں موجود ہے اور اس جنگ میں شاید یہ پہلا سخت معرکہ ایشیا کی سرزمین پر ہوگا

اس میں شک نہیں کہ قفقاز کا راستہ بہت دشوار گزار ہے اور ہٹلر آسانی سے کوہستان قاف کو عبور کرکے باکو تک نہیں پہونچ سکتا، لیکن چونکہ اس جنگ نے ممکن و ناممکن کے فرق کو گھٹا کر بہت کم کر دیا ہے، اس لئے نقل و حرکت کی دشواریوں کو سامنے رکھ کر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا البتہ یہ ضرور ہے کہ عراق و ایران کی طرف اتحادیوں کی طیاریاں بہت زبردست ہیں اور انھیں پر ہم کو اعتماد ہوسکتا ہے

اگر ہٹلر کو سباسٹپول لینے میں کامیابی نہ ہوئی، تو پھر وہ مجبور ہوگا کہ ترکی کے راستہ سے عراق ہوتا ہوا باکو تک پہونچے اور یہ وقت وہ ہوگا جب ترکی کو اِدھر یا اُدھر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کا فیصلہ کیا ہوگا

۲- آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت ہٹلر نے کریمیا اور خارکوف میں دباؤ ڈالنا شروع کیا اسی وقت اس نے لیبیا کی جنگ شروع کردی، حالانکہ سخت گرمی کے زمانہ میں ریگستان لیبیا کو معرکہ زار بنانا معمولی بات نہ تھی، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ برطانوی فوجیں نہایت مضبوطی سے وہاں قدم جمائے ہوئے تھیں

بات یہ ہے کہ ہٹلر نے فی الحال جو نقشۂ جنگ بنایا ہے، وہ یہ ہے کہ اُدھر روس میں کریمیا کی طرف سے آگے بڑھے اور اِدھر فلسطین و عراق کی طرف سے اقدام کرے۔ گویا وہ مشرق ادنیٰ کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر، عراق، ایران، اور باکو کے پٹرول تک پہونچنا چاہتا ہے۔ وہ ترکی کے راستہ سے بھی یہ گھیرا ڈال سکتا تھا، لیکن اول تو وہ ترکی کی غیر جانبداری کو اس وقت چھیڑنا نہیں چاہتا اور دوسرے یہ کہ جب تک فلسطین، شام اور مصر کی اتحادی فوجوں کی طرف سے وہ مطمئن نہ ہوجائے یہ گھیرا کامیاب نہیں ہوسکتا، بلکہ خود گھر جانے کا اندیشہ ہے

وہ جانتا ہے کہ سواحل مصر سے لیکر سواحل عرب تک اتحادی فوجیں ہر جگہ نہایت کثرت سے موجود ہیں اور صحیح تدبیر جنگ ان کے درمیان سے گزر جانا نہیں بلکہ اُن کا احاطہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے، اور اسی لئے اس نے بیک وقت لیبیا اور کریمیا دونوں طرف اقدام شروع کیا

تاکہ پشت سے حملہ ہونے کا امکان دور ہو جائے
افسوس ہے کہ لیبیا میں برطانیہ کو اس وقت تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ طبروق بھی ہاتھ سے نکل گیا اور مطروح بھی خالی کیا جارہا ہے اس کے بعد اب اسکندریہ ہی رہ جاتا ہے جو مصر و لیبیا کی جنگ میں ایک "کلید" کی حیثیت رکھتا ہے
طبروق کا ہاتھ سے نکل جانا، سنگاپور اور برما کے سقوط سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ یہی طبروق ہے جس نے اس سے قبل ۲۵۰ دن تک دشمن کا مقابلہ کرکے اندر داخل ہونے سے اُسے روک رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ ناکام واپس گیا، یا اب وہ ایک دن بھی مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ درانحالیکہ بہترین برطانوی فوجیں وہاں موجود تھیں، چنانچہ اس واقعہ کا اثر برطانوی پبلک پر اس حد تک ہوا کہ اب مسٹر چرچل سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ وہ اس کا جواب دیں اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں مسٹر چرچل کو پھر ارکان وزارت میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا پڑے
کسی خطرہ یا مصیبت سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم ہر بات کو تفاؤلانہ (Optimistic) انداز سے دیکھیں، بلکہ تاریک سے تاریک پہلو کو سامنے رکھ کر ہمیں تدابیر اختیار کرنا چاہئے۔ اس لئے اگر ہم یہ کہدیں کہ طبروق کا سقوط بہت معمولی بات ہے اور اس کا کوئی اثر جنگ پر نہیں پڑتا، یا یہ کہ کریمیا میں جرمنی کی کامیابیاں بالکل بے نتیجہ ہیں تو یہ نہایت غلط قسم کا مداوا ہوگا، لیکن باوجود ان تلخ حقیقتوں کے بھی اتحادی کامیابی کے امکانات بہت قوی ہیں
جنگ کی موجودہ حالات اس میں شک نہیں کہ جرمنی کی موافقت میں ہیں اور اس سے انکار حقیقت کا انکار ہوگا، لیکن جیسا کہ میں نے عنوان میں ظاہر کیا ہے یہ جنگ اپنی تیسری منزل سے گزر رہی ہے، اور یہی منزل اتحادیوں کی کامیابی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے
میں نے تیسری منزل کی تعیین اتحادیوں کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ جرمنی کے زاویۂ نگاہ سے کی ہے، کیونکہ جرمنی جس منزل سے گزر رہا ہے وہ اس کے لئے خستگی کی منزل ہے اور اتحادی اس حیثیت سے پہلی ہی منزل میں ہیں، یعنی وہ ابھی تک اپنے حوصلہ و اندازہ کے مطابق پوری طیاری بھی نہیں کرسکے۔ ظاہر ہے کہ جب اتحادیوں نے باوجود پوری طرح طیار نہ ہونے کے دو سال تک جرمنی کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا، اور اسے تھکا کر اس حد تک پہونچا دیا کہ اگر وہ جلد کامیاب نہیں ہوتا تو اس کی شکست یقینی ہے، تو اب جبکہ ان کی طیاریاں اپنے شباب تک پہونچنے والی ہیں، جرمنی کو اپنی کامیابی کی کیا توقع ہو سکتی ہے
لڑائی کی درمیانی منزلوں میں کسی مقام کا ہاتھ سے نکل جانا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا اس پر قابض رہنے کی حالت میں لڑائی کے پھیلاؤ کو سنبھالے رکھنا، اور اس باب میں اب نازی حکومت کا ضعف ہر جگہ رونما ہورہا ہے۔ اول تو ابھی کریمیا ہی کا معرکہ اسے سر کرنا ہے، اس کے بعد اسکندریہ، حیفہ، شام و عراق کے ہفت خواں طے کرنا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ یہ سب آسانی سے اور جلد طے کرسکے گا
اس میں شک نہیں کہ جرمنی نے اب اپنا سب کچھ سامنے رکھ کر یہ قدم بڑھایا ہے اور اسی قدم پر اس کی تمام امیدوں کا انحصار ہے لیکن اسی کے ساتھ جب ہم دوسری طرف دیکھتے ہیں تو ہم صرف ایک ہی نتیجہ پر پہونچتے ہیں اور وہ یہ کہ وقت کی دوڑ میں ہٹلر کی ناکامی بالکل یقینی ہے اور لڑائی پر جتنے دن گزرتے جارہے ہیں اتنا ہی زیادہ نازی آفتاب ڈھلتا جارہا ہے۔ کیونکہ منزل مقصود کا کوسوں پتہ نہیں اور تھک کر بیٹھ جانے میں اب کچھ دنوں کی دیر ہے
اس لئے سوال اس وقت نہ کریمیا و لیبیا کا ہے، نہ عراق و باکو کا۔ بلکہ صرف ڈٹے رہنے کا ہے اور اس باب میں اتحادیوں کی پوزیشن جتنی صاف و واضح ہے، اس سے شاید دشمن کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

ہندوستان میں مسلمان قومیں زیادہ تر ایران اور افغانستان کے راستے سے آئی ہیں اور مسلمانانِ ہند کی تہذیب و معاشرت کی بنیاد بیشتر حصہ ایران ہی کی تہذیب پر قایم ہے۔ اسلامی حکومت کے دور میں دفتروں کی زبان بھی ایران کی زبان رہی اور جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء تک سیاسی معاہدات اور تحریرات کے لئے فارسی زبان ہی مخصوص تھی۔ اس کے بعد بھی اکثر تعلیم یافتہ لوگ اُردو کی جگہ فارسی ہی میں خط لکھا کرتے تھے اور اب بھی اُردو لکھنے پڑھنے والوں کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ وہ فارسی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں، ان حالات میں اگر ایران اور ایران کی زبان فارسی کے متعلق مختصر طور پر ایک عام اور صاف مفہوم پیش کرنے کی جرأت کی جائے تو ایسی کوشش غالباً غیر موزوں خیال نہ کی جائے گی۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ ایران کس خطۂ ملک کو کہتے ہیں اور وہاں کے رہنے والے کس ابتدائی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے منسلکہ نقشہ[1] ملاحظہ طلب ہے۔ اگرچہ یہ نقشہ باقاعدہ طریق پر مرتب نہیں ہوا ہے۔ اس نقشہ میں ذیل کی حدود و نشان کرنے کے قابل ہیں:—

۱- نقشے کے مشرق میں (سیدھے ہاتھ کی طرف) سب سے اوپر بدخشان۔ اُس کے نیچے کابل اور اُس کے نیچے بلوچستان۔

۲- شمال میں (اوپر کی طرف) (۱) سُغدیانہ۔ (۲) دریائے جیحون اور بحیرۂ کاسپین کے درمیانی علاقے بلخ۔ مشہد۔ خوارزم۔ استرآباد۔ (۳) بحیرۂ کاسپین کے مغرب میں آرس کا جنوبی علاقہ معہ آذربائیجان۔

۳- جنوب میں (نیچے کی طرف) مکران۔ لارستان۔ اور پارس۔

۴- مغرب میں (اُلٹے ہاتھ کی طرف)۔ (۱) اصفہان اور کاشان سے لیکر آرمینیا کے کوہستان تک (۲) کُردستان۔ (۳) خوزستان۔

قدیم زمانہ میں وہ خطہ جو حدودِ مذکورہ پر مشتمل اور اُن میں داخل ہے ایران کہلاتا تھا۔ پارسی روایاتِ قدیمہ کے مطابق جیسا کہ شاہنامۂ فردوسی وغیرہ میں درج ہے لفظِ ایران فریدوں کے بیٹے ایرج نامی سے منسوب ہے لیکن یہ لفظ کتاب آوستان میں ایریانہ لکھا ہوا پایا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ قوم ایریا کی سرزمین تھی۔ یہی لفظ سنسکرت میں آریہ لکھا گیا ہے اور دونوں زبانوں میں قریب قریب ایک ہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جب اہلِ یونان کا سابقہ ایرانیوں سے پڑا تو اُنھوں نے اس ملک کا نام "پرسیس" قرار دیا اور اُن کے بعد اہلِ عرب نے بھی اُس کو فارس کے نام سے موسوم کیا۔ نقشے کے دیکھنے سے ظاہر ہوگا کہ ایران کے جنوب میں خلیج فارس سے ملحق ایک علاقہ ہے جس کا نام قدیم زمانہ میں پارسا تھا اور بعد میں پارس کہلانے لگا۔ یہ علاقہ یا صوبہ اپنے اُسی نام کے ایک قدیم شہر سے منسوب تھا جس کو یونانیوں نے اپنی زبان میں پرسیس کے نام سے بدل دیا۔ چونکہ اہلِ یونان اور اہلِ عرب کے حملوں کے وقت اسی علاقے کے بادشاہوں کی سارے ایران پر حکومت تھی اس لئے ان دونوں قوموں نے سارے ایران کو پارس کہکر پکارا۔ ورنہ پارس ایران کے اُس جنوبی حصہ کا نام ہے جس کا ذکر شیخ سعدی نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں کیا ہے:—

یارب ز بادِ فتنہ نگہدار خاکِ پارس
چنداں کہ خاک را بود و باد را بقا

اسی نہج پر لفظ 'پارسی' کے معنوں کی کیفیت سمجھنی چاہئے۔ ایک معنی میں 'پارسی' ایران کی زبان کو کہتے ہیں اور دوسرے معنی میں ایران کے باشندہ کو 'پارسی' کہا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت سلمان فارسی۔ لیکن آجکل اہلِ ایران اپنے آپ کو ایرانی کہتے ہیں اور پارسی قوم سے صرف وہ ایرانی

[1] نقشہ دیر میں ملا اس لئے اب مضمون کے آخر میں شامل کیا جائے گا۔ (نگار)

مراد ہیں جو مذہب زردشتی رکھتے ہیں - پروفیسر براؤن نے ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کا یہ مفہوم ہندوستان کی ایجاد ہے مگر یہ معنی ایران میں بھی رائج ہو گئے ہیں -

اس تعیین کے بعد کہ قدیم زمانہ میں ایران کی حدود میں بدخشاں - سغدیانہ - کابل - بلوچستان - بلخ - خراسان - ازندران - گیلان - آذربائجان کردستان - خوزستان - عراق عجم - فارس - کرمان - لارستان - مکران - داخل اور شامل تھے - یہ دیکھنا چاہیئے کہ بہ اعتبار تاریخی معلومات کے قدیم اہل ایران کس قوم سے تھے اور موجودہ ایرانی کس نسل سے ہیں -

فردوسی کا شاہنامہ حقیقی معنی میں ایران کی قدیم روایات کا دفتر ہے اور ہو بہو ساسانیوں کے زمانہ کی سینہ بہ سینہ منتقل شدہ حکایات اور پہلوی کتابوں کی روایات کا مجموعہ ہے - روایات و حکایات صرف اس قدر ظاہر کرتی ہیں کہ ایران کے ابتدائی تمدن و تہذیب و حکومت کی نسبت ایسے خاندان سے تھی جس کو پیشدادی خاندان کہتے ہیں - اُس کے بعد کیانیوں کی حکومت ہوئی جو سکندر کے حملہ تک قایم رہی - سکندر کے بعد طوائف الملوکی کا دور رہا جسکو ساسانی حکومت نے ختم کیا - مسلمان مورخوں نے اور اُن کے ساتھ پارسی علماء نے اپنا رسوخ پیدا کرنے کی غرض سے قریب قریب اسی سلسلہ کو قایم رکھا - اور یہودی روایات کی بنا پر پیشدادی بادشاہوں کا سلسلہ آدم و نوح سے منسوب کرکے روایاتِ ایرانی میں عجیب و غریب اضافہ کر دیا اور ایرانی قوم کو سامی اقوام میں مخلوط کر دیا -

زمانۂ حال کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ جس قوم کو اب آریہ کہا جاتا ہے اُس کے متفرق فرقے کسی قدیم زمانے میں ایران میں وارد ہوئے اور اُنھیں فرقوں کی نسل اُس زمانہ سے ابتک ایران میں آباد ہوتی چلی آئی ہے - البتہ اہلِ عرب کے تسلط کے بعد سے اُن میں عرب - مغل - ترک اور افغان قوموں کی کم و بیش آمیزش ہوتی رہی ہے - آریہ فرقے کس وقت اور کس ترتیب کے ساتھ ایران میں داخل ہوئے اِس کی بابت کوئی معلومات صحت کے ساتھ فراہم نہیں ہو سکی ہے -

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ اقوام آریہ سے کیا مُراد ہے یہ ذہن نشین ہونا چاہئے کہ اہلِ تحقیق نے دنیا کی آبادی کو مختلف النسل قرار دیکر متعدد شاخوں میں تقسیم کیا ہے - مذہبی نقطۂ نظر سے گو سب انسان نفسِ واحد ہی سے پیدا ہوئے ہوں مگر محققین ابھی تک اُس نقطۂ ابتدائی یا مرکز پر نہیں پہونچے ہیں جہاں سے یہ شاخیں پھوٹی ہوں - اختلافِ نسل کا انحصار بہت کچھ اقوام کے ابتدائی مسکن پر ہے - قیاس یہ کیا گیا ہے کہ جس سمندر کو اب بحیرۂ کاسپین کہتے ہیں کسی زمانۂ بعید میں بہت وسیع تھا اور خراسان سے لیکر قسطنطنیہ تک پھیلا ہوا تھا - اُس سمندر کے اوپر کا حصہ وہ علاقہ تھا جس کو وسط ایشیا اور روس کا فرنگی علاقہ کہتے ہیں - اُس کے نیچے وہ علاقے تھے جن کو اسوقت ایشیائے کوچک - شام - عراق عجم اور ایران وغیرہ کہتے ہیں - جو فرقے وسطِ ایشیا اور روس کے علاقے میں پرورش پا رہے تھے اُن کو آریہ کہا جاتا ہے - یہ فرقے کسی وقت خانہ بدوشی کے عالم میں اوقات بسر کرتے تھے اور جب اور جس طرف اُن کو موقعہ ملتا تھا گھس جاتے تھے - اُن میں سے بہت سے یوروپ کی طرف چلے گئے - اور اکثر ایران و ہند میں داخل ہو گئے - جس وقت تک یہ سب فرقے وسطِ ایشیا اور علاقۂ روس میں جاگزیں تھے - اُن کا ایک ہی قوم سے متعلق ہونا مانا جاتا ہے اور بحیثیتِ مجموعی اُن کا نام ہند و یوروپ کی قوم آریہ رکھا گیا ہے -

بعض محققین کا خیال ہے کہ اس آریہ قوم کے جو فرقے نیچے کی طرف چلے وہ سب سے پہلے افغانستان میں داخل ہوئے - اور یہاں سے ایک طرف پنجاب میں چلے گئے اور دوسری سمت ایران کے علاقوں میں منتقل ہو گئے - بعض کہتے ہیں کہ آریہ اولاً پنجاب میں آئے اور وہاں سے ایرانیوں کا افتراق ہوا - ایک رائے یہ بھی ظاہر کی گئی ہے کہ آریوں کے متفرق فرقے مختلف سمتوں سے ایران میں داخل ہوئے ہیں - مثلاً افغانستان کی راہ سے اور خراسان کی جانب سے اور بحیرۂ کاسپین کی شمال و مغربی سمت سے ـــ یہی رائے قابل قبول معلوم ہوتی ہے - بہر حال یہ امر حقیقت کے طور پر مان لیا گیا ہے کہ موجودہ ایرانیوں کے آباؤ اجداد اور ہندوستان کے آریوں کے مورث کسی وقت ایک ہی مقام پر رہتے تھے اور ایک بولی بولتے تھے - یہ بات بھی قرینِ قیاس خیال کی گئی ہو کہ ہندوستان کے آریہ ایران اور افغانستان کے راستہ ہی سے ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں - ان خیالات کی تائید میں یہ اُمور بیان کئے گئے ہیں کہ رگ وید میں ایسے مقامات کا ذکر پایا جاتا ہے جن کا تعلق افغانستان سے ہے اور یہ کہ سنسکرت اور فارسی کے الفاظ کثرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں - قیاس مذکور کی مزید تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ ایران میں جن ابتدائی آریہ فرقوں کا پتہ چلا ہے وہ عناصر پرست اور آفتاب و

ماہتاب پرست پائے جاتے ہیں اور یہی کیفیت اُن آریہ فرقوں کی ہے جو ہندوستان میں وارد ہوئے اور جن سے رگ وید کے ابتدائی حصوں کی تصنیف متعلق ہے۔ ہندوستانی آریوں میں بت پرستی وغیرہ بعد کا اضافہ ہے۔

ہندوستان میں آریوں کے ورود کا تعین مختلف طور پر کیا گیا ہے۔ افراط و تفریط کو چھوڑ کر درمیانی رائے یہ قرار پائی ہے کہ اقوام آریہ ہندوستان میں سنہ عیسوی سے یقیناً ایک ہزار برس سے ڈیڑھ دو ہزار برس قبل تک پہونچی ہیں۔ اسی نہج پر قیاس کر لینا چاہئے کہ ایران میں بھی اُسی زمانہ میں یا اسکے آس پاس کے زمانہ میں اقوام آریہ داخل ہونا شروع ہوئی ہوں گی۔

ایران میں آریوں کے وارد ہونے سے پہلے جو قومیں آباد تھیں اُن میں سے بعض کا پتہ چلا ہے جس سے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایران میں ایسی قومیں بستی تھیں جو ترکی النسل تھیں یا اُس نوع کی حبشی نسل والی تھیں جس میں ہندوستان کی قدیم ڈراوڈی قوم داخل سمجھی جاتی ہے۔ ایران میں رَے ایک مشہور مقام ہے۔ آریوں سے پہلے اسی علاقہ میں ایک قوم مندا کا وجود تحقیق سے ثابت ہوا ہے۔ اس قوم کا ترکی النسل ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ جب آریوں کا وہ فرقہ کوہستان قاف یا خراسان کو پار کرکے ایران کے علاقۂ آذربائجان میں داخل ہوا جس کو اہلِ یونان نے قوم مید کہا ہے اور فارسی لٹریچر میں مادا اور ماہ آباد بیان کیا گیا ہے تو اُس کا تصادم عرصہ تک قوم مندا سے ہوتا رہا جو رَے کے علاقہ میں آباد تھی۔ اسی طرح وہ قوم جس کا نام سُمیر ہے اور جس نے عراق میں دریائے فرات کے کنارے عیسوی سنہ سے کئی ہزار برس پہلے شہری حکومتیں قایم کیں ترکی النسل مانی گئی ہے۔ اس طور پر یہ مان لینے میں ہرج نہیں ہے کہ ایران میں سب سے پہلے ترکی النسل قومیں یا ڈراوڈی قسم کی قومیں آباد تھیں۔ ڈراوڈی قسم کے فرقے اُس علاقہ سے پائے جاتے ہیں جس کو اب خوزستان کہتے ہیں اور جو قدیم زمانہ میں ایلام کہلاتا تھا۔ اسی حلقہ میں علاقۂ پارس شامل تھا۔

دریائے فرات کی حکومتوں کا گہرا تعلق ایرانی علاقجات سے پایا جاتا ہے۔ ابتدائی سُمیری قوم کے بعد فرات کے علاقوں پر سامی نسل کے لوگ مسلط ہو گئے تھے اور اس نسل کی حکومتوں اور سلطنتوں (انھیں میں بابل کی شہنشاہی بھی شامل ہے) سے اور ایرانی علاقوں سے ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ دریائے فرات کے ایک قدیم شہر شرفورلہ کے بادشاہ این۔تی۔نا کا ایک سنگین کتبہ برآمد ہوا ہے جس میں ذکر ہے کہ بادشاہ مذکور کے باپ ای۔اتا۔توم نے ایلام کو فتح کیا۔ ای۔اتا۔توم کا زمانہ سنہ ۲۲۰۰ ق.م۔ کا قرار دیا گیا ہے۔ شرفورلہ کے بعد دریائے فرات پر دوسری بادشاہی موسوم بہ کِش قایم ہوئی اور اس شہر کِش کے آثار سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے ایک بادشاہ نے تقریباً تین ہزار آٹھ سو پچاس سال قبل مسیح میں ایلام کو مع علاقۂ پارسی کے فتح کیا اور وہاں سے سنگ مرمر کے پیالے لوٹ کر لایا۔ سنہ ۲۳۶۰ ق.م میں اہلِ ایلام بابل پر قابض نظر آتے ہیں لیکن یہ قبضہ بہت عارضی تھا اور دو ہزار تین سو چالیس سال قبل مسیح حمورابی (معاصر ابراہیم علیہ السلام) نے ایلام والوں کو بابل سے نکال دیا۔ تاہم سنہ ۱۷۶۰ ق.م میں خوزستان کی ایک کوہستانی قوم قسّی خروج کرکے بابل پر قابض ہو گئی اور پانچ سو برس تک بابل میں حکومت کرتی رہی۔ اس قوم کے شاہی خاندان نے اخیر میں سلطنت عسوری کے شاہی خاندان سے رشتہ داری اور میل جول پیدا کر لیا تھا اور سامی اقوام میں یہ لوگ مل جُل گئے تھے لیکن اس کے بعد سلطنتِ عسوری نے عروج کیا اور تقریباً سنہ ۱۳۰۰ ق.م۔ میں بابل اور ایلام کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

کیفیتِ مندرجۂ صدر سے ظاہر ہوگا کہ ایران کا کچھ مغربی اور جنوبی علاقہ فرات کی سامی حکومتوں اور عسوری سلطنت سے اثر پذیر رہا ہے۔ عسوری قوم بھی اُنھیں سامی اقوام کی ایک شاخ تھی جو فرات کے کنارے آباد تھیں۔ لیکن اس شاخ نے بجائے فرات کے دجلہ کے کنارے اُس مقام کے متصل جہاں اب بغداد واقع ہے اپنی حکومت کی بنیاد قایم کی اور اُس حکومت کو شہنشاہی کے مرتبہ تک پہونچا دیا۔ اس شہنشاہی کے زیر تسلط ایران کا وہ تمام علاقہ مدتوں تک رہا جس میں اصفہان۔ کاشان۔ طہران۔ ہمدان اور تبریز شامل ہیں۔ قدیم یونانی مورخ اس علاقہ کو میدیا کے نام سے موسوم کرتے ہیں یعنی قوم مید کا مسکن۔ غالباً یہ وہی قوم ہے جس کو ایک قدیم پارسی کتبہ میں مادا اور بعد میں ماہ آباد بیان کیا گیا ہے۔ اقوام آریہ کا یہ پہلا فرقہ ہے جس کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ کوہ قاف سے گزر کر ایران کے مغربی اور شمال مغربی علاقوں میں داخل ہوا۔ عسوری سلطنت کے کھنڈروں سے جو تاریخی مواد برآمد ہوا ہے اُس میں سے ایک شاہی سنگین کتبہ ہے جس کو سنہ ۱۱۰۰ ق.م کے زمانہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس میں آما دانہ (حال ہمدان) سلطنتِ عسور کی ماتحتی میں ہونا بیان کیا گیا ہے۔ بعد کے دو کتبوں سے بھی جن کا زمانہ سنہ ۷۳۰ ق.م اور سنہ ۶۸۰ ق.م علی الترتیب بیان کیا گیا ہے علاقۂ میدیا

کا سلطنت عسور کی ماتحتی میں ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ کتب یہود میں بھی ذکر ہے کہ شاہ عسور تے سامریا فتح کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو میدیا کے علاقہ میں جلاوطنی کی سزا دی اور یہ واقعہ ۷۲۲ ق۔م کا ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح یونانی مورخ ہرادتوس نے بیان کیا ہے کہ قوم میدصدیوں تک سلطنت عسور کی ماتحت رہی اور یہ کہ [illegible] ق۔م کے زمانہ میں اس قوم نے خود مختاری حاصل کی۔ حالات مذکور سے ظاہر ہوگا کہ ایران کا شمال مغربی۔ مغربی اور جنوب مغربی حصہ کس قدر سامی اقوام کے زیر اثر رہا ہے۔ آگے چلکر یہ بھی ظاہر ہوگا کہ ایرانی اقوام کے خیالات اور زبانیں سامی تعلقات سے کس قدر متاثر ہوئے۔

ہرادتوس کے بیان کے مطابق قوم میدنے اپنی خود مختار حکومت قایم کرنے کے بعد ایران کے دیگر علاقہ جات پارس وغیرہ پر بھی قبضہ و اقتدار حاصل کرلیا قدیم یونانیوں میں (Laws of the Medes) اور فارسی کتابوں میں آئین مہ آبادی کا حوالہ ضرب المثل کے طور پر مستعمل ہے لیکن ان توانین و آئین کے متعلق کوئی تاریخی مواد ہاتھ نہیں لگا ہے اور نہ اُن کے زمانہ کے کوئی کتبے یا مکتوبات برآمد ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے زمانہ کا کوئی سکہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے حالانکہ اس قوم کا دورِ حکومت تقریباً دو سو برس تک قایم رہا ہے۔ اس لئے تحقیق طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُن کی زبان اور اُنکا مذہب کیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ اُن میں ایک فرقہ ایسا تھا جو اقوام ہند کے برہمنوں کے مانند پوجا پاٹ کرایا کرتا تھا اور جس کو مُغ یا متوش کہتے تھے اور جو بعد میں مجوس ہوگیا۔

ہرادتوس نے قوم مید کے چار بادشاہوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے بادشاہ کا نام یونانی کتابوں میں دیاکس۔ یا دیوسیس بیان کیا گیا ہے جس نے سلطنت عسوری سے آزادی حاصل کی۔ سنہ ۷۱۵ ق۔م۔ کے ایک عسوری کتبہ میں دیاکو نام کے ایک بادشاہ کے گرفتار کئے جانے کا ذکر ہے اور دوسرے کتبہ میں بیتِ دیاکو کے فتح کئے جانے کا تذکرہ ہے جس کا زمانہ ۷۱۳ ق۔م کا ہے۔ دیاکو کے بعد ۶۴۷ ق۔م میں دوسرا بادشاہ فرارتس ہوا۔ قدیم فارسی میں اس نام کو فراورتیش لکھا گیا ہے۔ ۶۲۵ ق۔م میں فرارتس کا جانشین سیاک زر (قدیم فارسی۔ ہُوخشتر) ہوا جس نے ۶۰۶ ق۔م میں سلطنت عسور کے پایۂ تخت نینوا کو تباہ و برباد کیا۔ اور ۵۸۵ ق۔م میں ملک شام کی قوم اریا سے میدانِ جنگ میں سورج گرہن واقع ہونے کے باعث صلح کرلی۔ سیاک زر کے بعد استاجس (قدیم فارسی۔ دشتاسپ) قوم مید کا اخیر بادشاہ ہوا۔ اور ۵۵۰ ق۔م میں سلطنتِ مید کا خاتمہ ہوکر ایران کے بادشاہی علاقۂ پارس کے ایک خاندان میں منتقل ہوگئی۔

ایران کے شمالی حصۂ میدیا سے پاس کے جنوبی علاقہ کے جن لوگوں میں شاہی منتقل ہوئی وہ بھی قوم آریہ کا ایک فرقہ تھا۔ اس فرقہ کو عموماً فارسی قوم کہا جاتا ہے اور اسی نام سے اُس میں اور قوم مید میں تمیز کی جاتی ہے۔ جس خاندان پارس نے شاہی حاصل کی یونانی زبان میں وہ ایکیمنیس خاندان کے نام سے مشہور ہے لیکن قدیم فارسی زبان میں ہاکہامنش لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ اُردو میں اخمنی کہنے لگے ہیں۔ اس خاندان کے چند ابتدائی بادشاہوں کا مختصر شجرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

عام طور پر یونانی مورخوں نے اس شجرہ کے چوتھے بادشاہ سائرس کو اس خاندان کا پہلا بادشاہ تصور کیا ہے۔ اسی بادشاہ نے سنہ ۵۵۰ ق۔م میں سلطنتِ مید کے اخیر بادشاہ استاجس کو شکست دیکر سارے ایران پر قبضہ کرلیا لیکن اس خاندان کے نویں بادشاہ دارایاوش نے اپنے ایک کتبہ میں اپنے آپ کو اپنے دو شاخہ خاندان کا نواں بادشاہ ہونا تحریر کیا ہے اور یہی بات ہرادتوس مورخ نے بھی بیان کی ہے۔

اس اخمنی، خاندان کے اخیر بادشاہ کا نام بھی دارا یا ڈاریوش (دارا) تھا جس پر سکندر یونانی نے فتح حاصل کرکے ایرآن کی بادشاہی اپنی طرف منتقل کرلی اور اخمنی سلطنت کا خاتمہ کردیا -

سکندر کی وفات کے بعد اُس کے مقبوضات اُس کے سپہ سالاروں میں تقسیم ہوگئے۔ چنانچہ ایران کی حکومت سکندر کے سپہ سالار سلیوکس نامی کے حصہ میں آئی۔ سلیوکس نے بابل کو دارالحکومت قرار دیا لیکن اُس کے خاندان میں حکومت تھوڑے ہی عرصہ قایم رہی۔ تین چار پشت کے بعد ہی خراسان والوں نے سرتابی کرکے قومی حکومت ایران کے شمالی حصہ خراسان میں قایم کی۔ جن اقوام خراسانی نے یہ سلطنت قائم کی۔ جن اقوام خراسانی نے یہ سلطنت قایم کی اُن کو انگریزی میں ایک لفظ پارتھیا سے تعبیر کیا گیا ہے اور عربی و ایرانی تاریخ میں اشکانی و اشغانی کے نام سے اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ حکومت کئی سو برس تک قایم رہی لیکن ایران کی قومی کتابوں اور شاہنامہ میں اس حکومت کا محض بالاجمال حوالہ دیا گیا ہے۔ کوئی تفصیلی واقعات درج نہیں کئے گئے ہیں -

اشکانی حکومت کو اُرتخشتر (اردشیر پاپکان) نے سنہ ۲۲۶ء میں اردوان کو شکست دیکر ختم کیا اور اُس ساسانی سلطنت کا آغاز کیا جو یزدگرد ثالث پر ختم ہوئی اُس کے بعد سے عربوں کا تسلط ہوا اور رفتہ رفتہ تقریباً کل اہلِ ایران مسلمان ہوگئے۔ تھوڑے سے لوگ ایرآن چھوڑکر ہندوستان میں آباد ہوگئے اور اُنھیں کی نسل کو پارسی کہتے ہیں۔ ایک قلیل تعداد ایران میں بھی رہ گئی جو زیادہ تر علاقہ یزد میں اب تک آباد ہے -

کیفیتِ متذکرہ صدر سے واضح ہوگا کہ ایرانیوں کی تاریخ اجمالی طور پر کئی دوروں پر مشتمل ہے -

۱- پہلا دور وہ ہے جب ہندوستان اور ایران میں وارد ہونے والے فرقے ایک مقام پر رہتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے یہ مقام وسط ایشیا میں ہونا چاہئے اور اس دور کے زمانہ کو عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی تین ہزار برس پہلے کا سمجھنا چاہئے -

۲- دوسرا دور وہ ہے جب علاقہ میڈیا سلطنتِ عسوری کی ماتحتی میں رہا۔ تقریباً سنہ ۱۲۰۰ ق-م سے سنہ ۷۰۰ ق-م تک -

۳- تیسرا دور ہے جس میں قوم میڈ کی سلطنت کا قیام رہا یعنی سنہ ۷۰۰ ق-م سے سنہ ۵۵۰ ق-م تک -

۴- چوتھا دور اخمنی سلطنت کا دور ہے۔ سنہ ۵۵۰ ق-م سے سنہ ۳۳۰ ق-م تک -

۵- پانچواں دور سکندر کے بعد سے اشکانی حکومت کے خاتمہ تک ہے جس کی مدت سنہ ۳۳۰ ق-م سے شروع ہوتی ہے اور سنہ ۲۲۶ء میں ختم ہوتی ہے -

۶- چھٹا دور ساسانی حکومت کا ہے۔ سنہ ۲۲۶ء سے سنہ ۶۵۱ء تک -

پہلا دور پہلے دور کے احوال کی کوئی تفصیل معلوم نہیں لیکن اس قدر ضرور پتہ لگا ہے کہ اُس زمانہ کی چند روایات ہندوستان اور ایران میں اسوقت تک بدلی ہوئی شکلوں میں مشترک طور پر زندہ ہیں۔ نیز جہاں تک ان ملکوں کی زبان کا تعلق ہے زمانۂ مذکور کی زبان کا کچھ اندازہ اُن کثیر التعداد الفاظ سے ہوسکتا ہے جو سنسکرت اور فارسی میں مشترک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رگ وید کی زبان اور آوستا کے ابتدائی حصہ کی زبان میں جو فرق ہے وہ تلفظ یا املا کی خفیف تبدیلی سے دور ہوسکتا ہے -

روایات کی ذیل میں ایران کی تاریخ کا وہ حصہ آتا ہے جس کو عربی اور ایرانی مصنفین اور ایرانی روایتیں پیشدادی خاندان سے منسوب کرتی ہیں۔ فردوسی کے شاہنامہ کو قدیم ایرانی روایتوں کا مکمل دفتر مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ساسانی حکومت کے زمانہ میں روایات مذکورہ پہلوی زبان میں جمع کی گئی تھیں اور یہی مجموعہ سامانیوں کے زمانہ میں اول دقیقی شاعر کے سپرد ہوا جس نے لہراسپ اور گشتاسپ کا حال نظم کیا اور اُس کے بعد سلطان محمود کی سرپرستی میں، فردوسی نے شاہنامہ کی تکمیل کی۔ پروفیسر براؤن کی رائے ہے کہ ایسی باتوں کے سوا جو خلاف اسلام ہوسکتی ہوں فردوسی نے پورے طور پر پہلوی افسانوں کو نظم کیا اور جزئیات میں کامل مطابقت قایم رکھی ہے۔ اپنی رائے کے ثبوت میں پروفیسر موصوف نے پہلوی کتاب 'کارنامک ارتخشتر پاپکان' اور شاہنامہ کے اُس حصہ کا جس میں 'اردشیر بابکان' کا بیان ہے لفظ بہ لفظ مقابلہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دونوں کتابوں میں سرِمو فرق نہیں ہے -

شاہنامہ کے مطابق پیشدادی خاندان کا دور کیومرث سے شروع ہوتا ہے اور جمشید پر ختم ہوتا ہے اور اُس کا تعلق سرزمین ایرآن سے قایم کیا گیا ہے بعض فرنگی مورخین مثلاً سرجان مالکم نے اس دور کو ایرآن سے تو متعلق سمجھا ہے لیکن شاہنامہ کے اس حصہ کو افسانہ سے زیادہ قرار نہیں دیا ہے اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جب اہلِ ایران حالتِ وحشت سے گزر کر تمدن کے راستہ پر آرہے تھے۔ ضحاک کے زمانہ کی نسبت بھی اسی طور پر صاحب

موصوف یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ عسوری سلطنت کے تسلط کا زمانہ تھا۔

محققین مابعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ اس دور کے بادشاہ اور ضحاک کے بعد فریدوں و منوچہر، ایرج وغیرہ کوئی تاریخی وجود نہیں رکھتے مگر یہ کہ اُن کے ناموں کا وجود ضرور اُس زمانہ سے متعلق ہے جبکہ ہندوستانی اور ایرانی شاخیں جُدا نہیں ہوئی تھیں۔ اس کی توضیح اس طرح کی جاتی ہے کہ کیومرث کا نام کتاب اوِستا میں گیومرتیا لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔ کتاب مذکور کے جو اجزا اس وقت موجود ہیں اُن میں سے ایک حصہ کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ ۵۸۳ء ق۔م اور ۶۵۰ء ق۔م کے درمیان کی تصنیف ہے۔ مزید تفصیل اس کتاب کی آگے آئے گی۔ سرِ دست یہاں اس قدر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس کتاب میں گیومرتیا کو انسان اول مانا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اوِستا لکھی گئی اُس وقت ایران میں ایسی روایات موجود تھیں جن کے مطابق گیومرتیا یا کیومرث بمنزلہ آدم مانا جاتا تھا۔ بعد میں اس روایت نے وہ شکل اختیار کی جس میں کیومرث ایران کا پہلا بادشاہ بن گیا۔ اسی طرح جمشید کی کیفیت ہے۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ یہ نام خورشید کی طرح مرکب ہے الفاظ 'جم' اور 'شید' سے۔ اور 'شید' ماخوذ ہے زبانِ اوِستا کے لفظ 'شیتا' سے جس کے معنی سردار، بادشاہ اور روشن کے ہیں۔ پس اصل لفظ یا نام 'جم' باقی رہتا ہے۔ آوِستا میں اس نام کو یَم اور سنسکرت میں یَم لکھا گیا ہے۔ ہندوستانی افسانوں میں 'یم' وہ پہلی بزرگ مگر ذاتی شخصیت ہے جو بحالت حیاتِ عالمِ ارواح میں پہونچی اور آوِستا کے مطابق 'یم'، ابن 'وِوَان ہو' ایک خوشرو نوجوان ہے جس نے اہورمزد کی پیغمبری قبول نہیں کی مگر بالآخر چار گوشہ ورن (غالباً کوہ البرز کے آس پاس کا علاقہ) کی تعمیر پر مامور ہوا۔ شاہنامہ میں یہ ایک ایسے عظیم الشان بادشاہ کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے جس نے اہلِ ایران کو چار طبقوں پر منقسم کیا۔ عمارات اور شہر تعمیر کئے۔ جشنِ نوروز قایم کیا اور ہوائی تخت پر بیٹھ کر فضا میں سیر کی۔ اور آخرکار ضحاک کے ہاتھوں اپنے تکبر کا شکار ہوا۔ ضحاک کو شاہنامہ میں عرب النسل بادشاہ ظاہر کیا گیا ہے جس کے کاندھوں پر شیطان کی اغوا سے دو سانپ نمودار ہو گئے تھے اور جس نے گوشت خوری کا آغاز کرکے اپنے ظلم و تعدی سے اہلِ ایران کو پریشان کر دیا تھا۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ اہلِ مشرق ضحاک کو عربی لفظ سمجھ کر اُس کے معنی مسخرے یا ہنسنے والے کے لیتے ہیں لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ صاحب موصوف یہ خیال کرتے ہیں کہ فردوسی نے ضحاک نام کا ظالم اور عربی النسل بادشاہ بنا کر اُن ایرانی جذبات کا اظہار کیا ہے جن سے ایرانیوں کے دل اہلِ عرب کے خلاف بھرے پڑے تھے۔ جیسا کہ فردوسی کے مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:۔

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسیدست کار

کہ تختِ کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو ای چرخِ گرداں تفو

صاحب موصوف بیان کرتے ہیں کہ کتاب آوِستا میں قدیم روایتوں کی بنا پر ایک ایسے سانپ کا ذکر ہے جس کے سر پر دو سانپ اور نکلے ہوئے تھے۔ اُس کا نام اژی دہاک تھا جو انڈو یورپین کے سلسلہ میں ضحاک ہو گیا اور معمولی زبان میں اژدہا رہ گیا۔ دیگر آریہ شاخوں میں تین تین سر والے اژدروں کے قصے پائے جاتے ہیں چنانچہ یہی لفظ سنسکرت میں آہی دَہک کی شکل میں موجود ہے۔ 'اہی' بمعنی افعی اور 'دہک' کاٹنے والا۔ فریدوں بھی جم و ضحاک کی طرح ہند و ایران کی مشترک فرضی شخصیت مانی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اہلِ تحقیق کے نزدیک پیشدادی خاندان اور اُس کے بادشاہ حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتے۔ نہ صرف یہ بلکہ کیانی خاندان اور کیانی بادشاہوں کا بھی کوئی تاریخی وجود تسلیم نہیں کیا جاتا اور شاہنامہ میں کیقباد سے لیکر گشتاسپ و اسفندیار تک جسقدر احوال بیان کیا گیا ہے اُس کو افسانۂ دیرینہ سے زیادہ وقعت نہیں دیجاتی۔ رستم اور اُس کے خاندان کو شاہنامہ میں کیانی بادشاہوں کے خاندان کے احوال سے وابستہ رکھا ہے لیکن اوِستا میں رستم یا خاندانِ رستم کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ اس سے قیاس کیا گیا ہے کہ آوِستا کی تصنیف کے زمانوں میں اور اُس علاقہ میں جہاں آوِستا کی تصنیف ہوئی یا جاری رہی رستم پہلوان کے خاندان کے متعلق کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ اِن روایتوں کی پیدایش کسی مابعد زمانہ سے اور علاقۂ پارس و سیستان سے متعلق سمجھی جاتی ہے یعنی یہ کہ رستم کی داستان اُس انڈو یورپین کی ذیل میں نہیں آتی جو ہند و ایران میں ورود سے پہلے آریہ اقوام کی مشترک سرمایہ تھی۔ رستم کے متعلق مقامی روایات کے وجود کو قیاساً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن زال و رستم کا کُل افسانہ خود فردوسی کے بیان کے مطابق فردوسی کی شاعری کا نتیجہ مانا جاتا ہے۔

منش کردہ ام رستمِ پہلواں — وگرنہ یلے بود در سیستاں

بعض صاحبان نے کیانی خاندان کے بادشاہوں کی اُن بادشاہوں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جن کے تاریخی حالات یونانی اور دیگر مورخین کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ مثلاً قوم مید کے متعلق اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ایران کی پہلی آریہ قوم ہے جس کے بادشاہوں کا تاریخی حال معلوم ہوا ہے۔ نقشہ و بیان مندرجۂ ذیل سے ظاہر ہوگا کہ قوم مید کے بادشاہوں اور کیانی بادشاہوں کے ناموں میں کس طور پر تطبیق کی گئی ہے :-

نمبر شمار	شاہنامہ کے مطابق	مورخ ہرادتوس کے مطابق	مورخ ٹےسیس کے مطابق	مورخ موسی کے مطابق	کتب یہود کے مطابق	مدتِ حکومت
۱	فریدون	آربسیس	آربسیس	وربسیس	اسیورس	۱۸ برس
۲	منوچہر		من داسیس	من داسیس		۱۵ برس
۳	نوذر		سوزرمس	سوزرمس		۷ سال مطابق فردوسی
۴	زو		اریتا	ارتوکس		۵ برس مطابق فردوسی
۵	گرشاسپ	} بدنظمی کا زمانہ	اربیانس	کارڈسیس		۹ برس مطابق فردوسی
۶	کیقباد (ارشس)	دیوسیس (دیاکو)	ارسیس	دیوسیس	ارفخشد	۴۰ سال مطابق ٹےسیس
۷	افراسیاب	فرارتس	ارٹائنس	ارٹونس		۲۲ سال مطابق ہرادتوس
۸	کیکاؤس	سیاک زرس	ارتی برس	کیک زرس		۴۰ سال ایضاً
۹		استاجس	اسپدان	استاجس	ڈرائس قوم مید	۳۵ سال

جو صاحبان شاہنامہ کے ناموں کی یونانی مورخوں کے نوشتہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ ضحاک، عسوری سلطنت کے اُس بادشاہ کا نام تھا جس نے میدیا کو فتح کیا تھا اور یہ کہ ضحاک کی مدتِ حکمرانی سے وہ سارا زمانہ مراد ہے جو عسوری سلطنت کی ماتحتی میں اہلِ میدیا کا گزرا۔ عسوری سلطنت سے تقریباً ۸۷۵ ق۔م کے آس پاس آزادی حاصل کی گئی اور اُسی زمانہ میں بادشاہ اربسیس تھا۔ اس لئے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ اربسیس ہی وہ بادشاہ ہے جس کو شاہنامہ میں افریدون بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تائید میں درفش کاویانی کی شہادت پیش کی جاتی ہے۔ کاوہ نے جب ضحاک سے بغاوت کی تھی تو ایک چمڑے کا جھنڈا بھی طیار کیا تھا جس کو بعد کے ایرانی بادشاہوں نے زروجواہر سے مرصع کیا۔ اس جھنڈے کے نام سے اور اس امر سے کہ یہ جھنڈا اہلِ عرب کی فتح کے وقت موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ شاہنامہ کا وہ بیان جو فریدون کی ضحاک پر کامیابی سے متعلق ہے قریبِ صحت ہے۔

فریدون کے بعد دوسرا بادشاہ جس کی مطابقت کی جاتی ہے کیقباد ہے۔ مطابقت کی دلیل یہ ہے کہ شاہنامہ کے بیان کے مطابق زو اور گرشاسپ کا زمانہ وہ تھا جبکہ افراسیاب نے ایران کو اپنا ماتحت بنالیا تھا اور ایران کی حالت ابتر ہوگئی تھی۔ ہرادتوس نے بھی اُس زمانہ کے حالات کو بدنظمی کا زمانہ تحریر کیا ہے۔ اس بدنظمی کے عالم میں رستم وزال نے بقول مصنفِ شاہنامہ بزرگانِ ایران سے مشورہ کرکے کیقباد کو علاقۂ البرز سے تلاش کرکے بادشاہ بنایا۔ ہرادتوس کا بھی یہی بیان ہے کہ بدنظمی کی وجہ سے اہلِ میدیا نے دیوسیس کا انتخاب کیا۔ دوسری مطابقت یہ ظاہر کی جاتی ہے کہ یونانی اور ایرانی کتابوں میں اس بادشاہ کا دوسرا نام ارش یا ارس لکھا ہوا پایا جاتا ہے۔

اسی طرح سیاک زرس (ہُوَخشتر) کو کیکاؤس قرار دیا جاتا ہے۔ شاہنامہ میں کیکاؤس، ہاماوران پر حملہ کرکے اُس کو فتح کرلیتا ہے۔ ہاماوران کو سامی ممالک کا کوئی حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ تاریخی واقعہ یہ ہے کہ سیاک زرس نے اہلِ بابل سے مل کر عسوری سلطنت کے پایۂ تخت نینوا کو تباہ و برباد کرکے سلطنت مذکور کا خاتمہ کردیا اور عسوری شہزادی سے شادی بھی کرلی۔ شاہنامہ میں بھی ہاماوران کی شہزادی سے کیکاؤس کا عقد ہونا بیان کیا گیا ہے۔

یونانیوں کے نزدیک قوم مید کا اخیر بادشاہ استاجس ہوا۔ اس بادشاہ کو علاقۂ پارس کے بادشاہ سائرس (کروش یا کرویا کورس) نے زیر کرکے سارے ایران پر قبضہ کرلیا اور ہخمنی سلطنت کی بنیاد قائم کی۔ مطابقت کرنے والے اصحاب اس بادشاہ یعنی کروش کو کیخسرو ظاہر کرتے ہیں اور وجہ مطابقت

یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس طرح شاہنامہ میں کیخسرو کا کیکاؤس کا پوتا اور افراسیاب کا نواسہ ہونا اور اُس کا توران میں افراسیاب کے سپہ سالار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانا مذکور ہے اُسی طرح یونانی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ کروشس نواسہ تھا استاجس کا۔ استاجس نے ایک موحش خواب دیکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے نواسہ سے خائف رہتا تھا اور بالآخر اُس نے اپنے نواسہ کو بغرض ہلاکت اپنے سپہ سالار کے سپرد کر دیا تھا لیکن سپہ سالار مذکور نے بچّہ کو ہلاک کرنے کے بجائے اُس کی خفیہ پرورش کی اور جب کروشس جوان ہو کر استاجس سے لڑا تو وہ سپہ سالار کروشس سے مل گیا۔ مطابقت کرنے والے اس سپہ سالار کو وہی پیران ویسہ قرار دیتے ہیں جو افراسیاب کا جنرل تھا اور جس نے کیخسرو کی پرورش کی تھی۔ اسی طرح کیخسرو اور کروشس کے آخر حالات میں بھی کچھ یکسانیت ہے جو اُن کی موت سے متعلق ہیں۔ اس تطبیق سے ایک مشابہت اور پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ افراسیاب جس کو شاہنامہ میں ترکوں کا بادشاہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور جس کا ایران کو گاہے بگاہے فتح کر لینا بھی مذکور ہے وہی استاجس اور قوم میڈ کے دوسرے بادشاہ ہیں جن کی حکومت علاقۂ پارس میں رہی۔

با ایں ہمہ محققین حال شاہنامہ کے پیشدادی اور کیانی بادشاہوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ پیشدادی خاندان کے قصوں کو تو اُس زمانہ کی روایات سے منسوب کرتے ہیں جو ہند و ایران سے باہر اقوام آریہ کا بسر ہوا۔ اور کیانی بادشاہوں کے تذکرہ کو محض افسانہ قرار دیتے ہیں اور صرف اس قدر ممکن خیال کرتے ہیں کہ شاہنامہ میں جن ایرانی و تورانی لڑائیوں کا ذکر ہے اُن سے وہ جنگیں مراد ہیں جو قوم میڈ کے ایران میں وارد ہونے کے زمانہ میں آذربائجان اور رَے کے علاقوں میں قوم میڈ اور علاقجات مذکورہ کے ترکی النسل فرقوں کے درمیان ہوئیں، یا وہ خونریزیاں مراد ہیں جو قوم میڈ کے بادشاہوں اور پارس کے ہخمنی بادشاہوں سے ہوئیں۔ یا وہ لڑائیاں ہیں جو زردشت کے زمانہ میں بلخ (باختر) کے بادشاہوں اور دریائے جیحون کے اُس پار رہنے والی ترکی اقوام سے باہم ہوئیں۔ اسی طرح محققین اس امر کے قیاس کرنے کی اجازت دیتے ہیں کہ ضحاک کی حکایت سے عسوری سلطنت کی حکومت مراد لی جا سکتی ہے۔ زیادہ کچھ نہیں۔

خلاصہ کے طور پر دورِ اول کی یادگار میں صرف وہ الفاظ سمجھے جاتے ہیں جو فارسی و سنسکرت میں مشترک ہیں اور وہ روایات ہیں جو بدلی ہوئی شکلوں میں مثل کیومرث۔ جمشید۔ ضحاک و فریدوں وغیرہم کی داستانوں کے ہندو ایران میں اب تک رائج و شایع ہیں یا ایسی مذہبی رسوم ہیں جیسی زنار بندی یا آتش پرستی وغیرہ۔

دوسرا دور باعتبار تاریخی معلومات کے دوسرا دور ایرانی حالات کا وہ قرار دیا گیا ہے جس میں میڈیا اور علاقۂ پارس بابلی اور عسوری سلطنتوں کی ماتحتی میں رہے۔ اس زمانہ کے تفصیلی حالات کے متعلق کوئی معلومات نہیں بجز اُن واقعات کے جو عسوری کتبوں سے ظاہر ہوتے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے۔ البتہ یہ ضرور پایا جاتا ہے کہ جہاں تک زبان اور شاہانہ مراسم کا تعلق ہے عسوری زبان اور عسوری سلطنت نے ایران کی زبان اور شاہی رسم و رواج پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ قدیم فارسی حروف تہجی عسوری رسم الخط سے اخذ کئے گئے اور سامی زبانوں کے بہت سے الفاظ قدیم فارسی زبان میں اس طور سے داخل ہو گئے کہ لکھنے میں تو الفاظ وہی لکھے جاتے تھے جیسا سامی زبانوں میں اُن کا تلفظ ہوتا تھا لیکن پڑھا جاتا تھا اُن کو ایرانی زبان میں۔ مثلاً الفاظ تو ملکان ملک لکھے جاتے تھے گر یہی الفاظ شہنشاہ پڑھے جاتے تھے۔ گویا سامی الفاظ کا جو مفہوم ہوتا تھا، اُس کو ایرانی زبان میں ترجمہ کر کے پڑھا جاتا تھا۔ شاہانہ رسم و رواج کا یہ اثر ہوا کہ جس طرح عسوری بادشاہ اپنے آپ کو شاہِ شاہان وغیرہ سمجھتے تھے اور خدائی صفات والقاب سے خود کو متصف کرتے تھے اسی کی نقل ایرانی بادشاہوں نے بھی اُتاری۔

(باقی)

سید حکیم احمد نقوی

یوروپ میں اشتراکیت کی جدوجہد

یوروپ میں اشتراکیت کی عملی تاریخ کا سلسلہ سنہ ۱۸۴۸ء سے شروع ہوتا ہے مگر اس سے پہلے فرانس میں سینٹ سیموں و فوریہ اور انگلستان میں روبرٹ اون وغیرہ نے اشتراکی خیالات کی تبلیغ اور اقتصادی تحریک کی تنظیم شروع کر دی تھی چنانچہ انگلستان کی لبرل پارٹی کی ابتدا روبرٹ اون کی طرف منسوب کی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۸۴۸ء میں جب کارل مارکس نے اپنا "جماعتی بیان" شایع کیا اسوقت سے اشتراکیت ایک مکمل اصول اور لائحۂ عمل کے ساتھ دنیا کے سامنے آگئی چنانچہ سنہ ۱۸۴۸ء اور اس کے بعد یوروپ میں جو کشمکش ہوئی اس کی بنیاد یہی اشتراکیت تھی، جرمنی اور فرانس میں اشتراکیوں نے اس کی کوشش کی کہ لیڈری کی باگ ڈور متوسط طبقہ کے ہاتھوں چھین جائے مگر چونکہ اسوقت انگلستان کے علاوہ یوروپ کے کسی ملک میں صنعت و حرفت نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ مزدوروں کی طاقت ایک منظم اشتراکی تحریک کو چلانے کے لئے کافی ہوتی اس لئے یہ جدوجہد ناکام رہی اور اشتراکی حریت پسندوں کو ہر جگہ ناموافق حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

پچھلی نصف صدی میں اشتراکیت کی اس ناکامی سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب اس کی ترقی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی مگر کچھ ہی عرصہ بعد اشتراکی لیڈروں نے پھر اس تحریک کو زور و شور کے ساتھ شروع کیا اور لندن کا شہر جلاوطن اشتراکیوں لیڈروں کا ایک پناہ گاہ ہوگیا جہاں کارل مارکس کی سربراہی میں اشتراکیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۶۴ء میں جب پہلی مزدور پارٹی[1] قائم ہوئی تو اشتراکی لیڈروں نے اپنی ساری کوشش اس بات پر صرف کر دی کہ یوروپ کے مختلف ملکوں خصوصاً جرمنی اور فرانس میں باضابطہ اشتراکی جماعتیں قایم ہوجائیں۔ چنانچہ جرمنی میں ایک طویل عرصہ کی جدوجہد کے بعد ایک جمہوری اشتراکی جماعت قایم ہوئی جس کے بہت سے اصول موجودہ جرمنی میں رائج ہیں۔ یہ جمہوری اشتراکی پارٹی شہنشاہیت کے زوال کے بعد سے برابر جرمنی حکومت میں نمایاں رہی ہے لیکن جب ہر ہٹلر نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت پارٹی کا شیرازہ بکھر کر نیشنل سوشلزم میں مل جل گیا اور آج سارا جرمنی اسی وطنی اشتراکیت کا پرستار ہے

فرانس میں اشتراکیت کا دو بڑی طاقتوں سے سامنا ہوا، ایک براڈلون کے متبعین کی جماعت تھی جو قریب قریب انارکسٹ تھے اور ہر اجتماعی مسئلہ کو اشتراکیت کے اصول سے بالکل مختلف طریقے پر جانچنے کے عادی تھے۔ دوسری طاقت بلانکی کے متبعین کی تھی جو اگرچہ کارل مارکس کی رائے سے بڑی حد تک متفق تھی مگر ان کا میلان زیادہ تر انقلاب اور بغاوت کی طرف تھا۔

اسی طرح اٹلی میں بھی اشتراکیت کے لئے راستہ صاف نہ تھا کیونکہ وہاں ایک طرف اس کی مخالف ماتوزینی کے متبعین کی جماعت تھی، دوسری طرف ایک دوسری پارٹی تھی جو بیکین روسی کے انارکسٹانہ خیالات سے متاثر تھی۔ تقریباً ایسے ہی حالات روس میں بھی پیدا ہوگئے تھے اس لئے اشتراکیوں نے وہاں صنعتی کارخانوں کی عدم موجودگی میں کسانوں کو ورغلانا چاہا اور اس کے لئے ان کی نگاہ میں مارکس کے نظریات سے نارکزم کی راہ بہتر تھی۔

لیکن سنہ ۱۸۷۰ء اور سنہ ۷۱ء میں روس اور فرانس کی جنگ میں نپولین کی ناکامی کے بعد فرانس میں کمیونسٹوں نے زور پکڑا جس سے ان کو حکومت میں دخل حاصل ہوگیا تو اس وقت بین الاقوامی مزدور پارٹی کو یوروپ میں ایک بلند مقام حاصل ہوگیا۔ فرانس میں اس اشتراکی حکومت کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی کیونکہ اول تو یہ حکومت مختلف عقیدوں کے لوگوں کا مجموعہ تھی، دوسرے ان لوگوں نے چند ایسی کارروائیاں کیں جن سے فرانسیسی قوم بگڑ گئی اور

---

[1] یہ بین الاقوامی مزدور پارٹی اپنی یوروپین تاریخ میں "پہلی پارٹی" کے نام سے موسوم ہے تاکہ دوسری اور تیسری بین الاقوامی پارٹی میں ممیز ہوسکے جنکا بیان آگے آئیگا

اس نے موسیو پٹرس کی تائید شروع کردی جس کی وجہ سے فرانس میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو تقریباً دو ماہ تک (از اپریل تا ۲۸ مئی سنہ ۱۸۷۱ء) جاری رہی، اس میں کمیونسٹ پارٹی کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھوں سے حکومت چھن گئی، اب فرانسیسی جمہوریوں کا راستہ صاف ہوگیا، انھوں نے تیسری بار پھر جمہوری حکومت قایم کی جس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ حکومت متوسط طبقہ کی حکومت ہوگی چنانچہ فرانسیسی حکومت کی یہ خصوصیات کے ساتھ قایم رہیں۔

فرانس کی پہلی اشتراکی حکومت کے ٹوٹ جانے کے بعد اشتراکی لیڈروں کے حوصلے پست ہوگئے اور یورپ میں اشتراکیت کی حیثیت محض ایک قومی تحریک کی سی ہوکر رہ گئی اور مختلف ملکوں میں اسے عروج و زوال کی منزلوں سے گزرنا پڑا چنانچہ جب جرمنی میں کارل مارکس کے نظریئے رواج پذیر ہو رہے تھے اسوقت پرنس بسمارک اس کی مخالفت پر مستعد ہوگئے اور انھوں نے اسے سخت سے سخت قوانین میں جکڑ دیا جس کا سلسلہ تقریباً سنہ ۱۸۷۸ء سے لیکر سنہ ۱۸۹۰ء تک رہا اور جس کی وجہ سے اشتراکی جرمنی سے نکلنے پر مجبور ہوئے لیکن باہر جاکر بھی یہ لوگ اپنی تحریک چلاتے رہے اور بالآخر ان کی کوششوں سے اسے جرمنی میں فروغ حاصل ہوا اور وہاں کی جمہوری اشتراکی پارٹی نے سنہ ۱۸۹۱ء میں قومی سیاست کے اندر ایک نمایاں جگہ حاصل کرلی۔ اسی سال سے جرمن اشتراکی، جرمن پارلیمنٹ ریشٹاک (Riechstag) میں اپنی نشستوں کی زیادتی کے لئے بہت سرگرمی سے کام لینے لگے مگر اس سے پارٹی کے مقاصد میں بہت کچھ انقلاب آگیا اور یہ جماعت ایک دم اعتدال پسند ہوکر رہ گئی۔ اس انقلاب کا بڑا باعث ایڈورڈ برنسٹین تھا گو برنسٹین اور اس کے ہمخیال رفیقوں کو سنہ ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں پارٹی سے علحدہ کردیا گیا مگر اس کے مویدین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وجہ سے پارٹی کے اُصول میں اہم تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ اور اس کا مقصد انقلاب کے بجائے اصلاح ہوگیا یعنی اس جماعت کی رگ رگ میں اعتدال پسندی سرایت کرگئی۔ یہ وہی جرمنی کی اشتراکی پارٹی ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کرچکے ہیں۔

انگلستان میں بھی گزشتہ صدی کے آخری حصہ میں لبرل صیغوں کے قیام کا رجحان پیدا ہوچلا تھا مگر آگے چلکر جب اقتصادی اُلجھنیں بڑھ گئیں تو یہ تحریک کمزور پڑگئی اور اس کی جگہ پر مزدور اپنی اُلجھنوں سے گھبراکر ایک ایسی جماعت کے طالب ہوئے جس کے مقاصد و مطالبات کافی وسیع ہوں چنانچہ لیبر پارٹی وجود میں آئی جس کی مزدوروں نے پوری تائید کی، اور چند ہی سال میں اس کو تقویت حاصل ہوگئی کہ اس کے نمایندے پارلیمنٹ کے انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہونے لگے۔ تاہم بعض لوگوں نے اس سے بڑھکر مارکزم کے اُصولوں پر ایک اشتراکی جماعت قایم کی مگر مزدوروں نے اس کے متعلق کوئی گرمجوشی نہیں دکھلائی جس کی وجہ سے اس تحریک میں کوئی زور پیدا نہیں ہوا۔ پھر جب بیسویں صدی کے شروع میں سٹر کیر ہارڈی کی رہنمائی میں مزدور پارٹی از سر نو مرتب ہوئی تو اس سے اشتراکی پارٹی کو بہت ٹھیس لگی اور اس کی قوت اور بھی کمزور ہوگئی۔ یہ مزدور پارٹی یورپ کی دوسری اشتراکی جماعتوں سے بالکل مختلف تھی اور گو وہ بعض اشتراکی اُصولوں سے متفق تھی مگر اشتراکیت سے اس کا راستہ کوسوں دور تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ پارلیمنٹ کے ذریعہ مشکلات کی اصلاح کیجائے نہ اشتراکی ہنگامہ آرائی کے ذریعہ، یہ حربے حقیقی اصلاح کے لئے بالکل بے سود ہیں۔

مگر روس کے حالات جرمنی اور انگلستان سے مختلف تھے اس لئے کہ روس اشتراکی وہاں ظلم و تشدد اور جلاوطنی وغیرہ کا ہمت و استقلال سے مقابلہ کرتے رہے، بڑے بڑے اشتراکی رہنماؤں کو سائبریا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں جلاوطن کردیا گیا مگر اس تحریک کی آگ برابر مشتعل رہی، آگے چلکر جب سنہ ۱۹۰۵ء کے اہم انقلاب میں اشتراکی ناکام رہے تو ان کے اوپر مصائب و مظالم کا انبار اور بھی زیادہ ہوگیا جس کی بدولت ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ روس کی اس اشتراکی تحریک کو باہر سے تقویت دیں۔

ان مظالم کے علاوہ اسوقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے، ایک پارٹی کا مقصد کاشتکاروں کی اصلاح تھا مگر چونکہ ان کے نزدیک انقلاب کے بغیر کاشتکاروں کی اصلاح نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے ان کا رجحان انارکزم کی طرف تھا اور وہ بیکن روسی کے خیالات سے زیادہ متاثر تھے ایک دوسری جماعت کارل مارکس کی پیرو تھی سنہ ۱۹۰۳ء اور سنہ ۱۹۰۴ء میں اس کے دو حصے ہوگئے، ایک بالشویزم کی جماعت تھی جو سنہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سے اس وقت تک روسی اشتراکیت کے نام سے موسوم ہے اور دوسری جماعت کارل مارکس کے اُصول کی پیرو ہونے کی دعویدار تھی مگر درحقیقت اس کا خیال یہ تھا کہ روس میں اشتراکیت اس وقت قایم ہوسکتی ہے جب متوسط طبقہ سے تعاون کرکے پہلے ایک جمہوری حکومت قایم کرلی جائے، یہ بالشوزم کی انقلاب پسندی اور تدریجی تبدیلی کے بجائے فوری عروج کی مخالف تھی اور اس کے نزدیک یک بیک اشتراکیت کا قیام ناممکن و وہم و گمان تھا۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی بین الاقوامی مزدور پارٹی ۱۸۶۴ء میں قائم ہوئی مگر فرانس کی اشتراکی حکومت کی ناکامی کے بعد آہستہ آہستہ فنا ہو گئی، لیکن ۱۸۸۹ء میں اشتراکی جماعتوں نے مل کر ایک دوسری بین الاقوامی قائم کی جو دوسری بین الاقوامی پارٹی یا بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جماعت پہلی بین الاقوامی جماعت سے مختلف تھی کیونکہ اُس کے پاس کوئی ہمہ گیر مرکزی نظام نہ تھا بلکہ اس کی توجہ صرف اس بات پر محدود تھی کہ مختلف اشتراکی جماعتوں کو کس اسلوب اور کس طرح چلایا جائے مگر اس دوسری پارٹی نے ۱۹۱۱ء تک اس مسئلہ کو بھی اپنے سامنے رکھا کہ امن و جنگ کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے اور اس میں اشتراکیوں کی کیا حیثیت ہو؟ یہ موضوع امسٹرڈم (ہالینڈ) کی ۱۹۰۴ء کی کانفرنس کا خاص موضوع تھا چنانچہ فرانسیسی اشتراکی جورز نے 'نئی فوج' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ مگر اشٹیٹگرٹ (جرمنی) کی دوسری کانفرنس میں ہروے نے نیشنلزم اور وطنیت کی صدا بلند کی، اور اس میں جرمنی کے دو لیڈروں (سبیل و فولمار) نے صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ اگر جرمنی پر حملہ ہوا تو جرمنی کی جمہوری اشتراکی پارٹی سب سے پہلے اس کی مدافعت میں حصہ لے گی۔

اس کے بعد جب ۱۹۱۱ء میں یورپ کی فضا بہت مکدر ہو گئی تو ۱۹۱۲ء میں اشتراکی لیڈروں نے بین الاقوامی تعلقات پر غور و فکر اور اپنی امن پسندانہ پالیسی کی وضاحت کے لئے یکجا ہو کر ایک اہم ریزولیوشن پاس کیا کہ دُنیا کے تمام مزدور اپنی اپنی ملکی حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ اپنی خارجی پالیسی امن پسندی کے اُصول کی بنیاد پر کرے تاکہ دُنیا عالمگیر جنگ سے باز رہے۔ امن پسندی کی یہ صدائیں تمام ممبروں کی زبانوں سے بلند ہو رہی تھیں اور ۱۹۱۴ء میں پھر ایک کانفرنس منعقد ہونے کی تجویز تھی کہ جنگ چھڑ جانے سے سارا پروگرام یکایک معطل ہو گیا اور کانفرنس نہ منعقد ہو سکی۔

اس جنگ سے اشتراکیوں کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اشتراکیوں نے جنگ کو روکنے کی بڑی کوشش کی تھی مگر ۱۹۱۴ء کے موسم گرما میں یورپ کی حکومتیں باہم دست و گریباں ہو گئیں تو ہر اشتراکی پارٹی اپنے بین الاقوامی جماعت کے فیصلہ کے خلاف اپنی قومی حکومت کی تائید میں مشغول ہو گئیں۔ مگر اس کے باوجود اس وقت چند ایسے اشتراکی موجود تھے جنھوں نے اپنی قومی حکومت کے جنگی رویہ سے اختلاف کر کے اسے جنگ سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یاد ہو گا کہ فرانسیسی اشتراکی لیڈر موسیو جورز نے فرانسیسی حکومت کی اس بارے میں مخالفت کی تھی جس کا ثمرہ اسے موت کی شکل میں حاصل ہوا تھا، اسی طرح مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے بھی انگلستان کے جنگی رویہ پر اعتراض کیا تھا مگر اس پر چنداں دھیان نہیں دیا گیا البتہ اس سلسلہ کا ایک پُرلطف واقعہ یہ ہے کہ جب مسٹر میکڈانلڈ بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک انگریزی جہاز پر سفر کرنے والے تھے تو اس جہاز کے سارے نوکروں نے اس جہاز میں کام کرنے سے انکار کر دیا جس پر مسٹر میکڈانلڈ سوار ہوں۔ لیکن درحقیقت بہت کم لوگ بین الاقوامی اشتراکی کانفرنس کے نقطۂ خیال پر ثابت قدم رہے یا اشتراکی تحریک کے بین الاقوامی پہلو کو اپنی قومیت پر ترجیح دی اور اسکے فیصلہ کو لائق احترام سمجھا بلکہ اس جنگ میں عموماً ہر شخص اپنی قومیت پر قربان ہوا اور سبھوں نے جنگ میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ فرانس اور برطانیہ کی اشتراکی پارٹیاں جنگی وزارتوں سے ملکر پوری طرح سرگرم کار رہیں اور اگر جرمن حکومت جرمنی کی اشتراکی پارٹی کو وزارت میں دعوت دیتی تو وہ یقیناً اس سے انکار نہ کرتی، مگر اس کے باوجود بھی اس کی ہمدردی اپنی گورنمنٹ کے ساتھ تھی۔

غرض ان حالات میں جب بین الاقوامی اشتراکی پارٹی کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ستمبر ۱۹۱۵ء اور اپریل ۱۹۱۶ء میں زمرفولڈ اور کینٹال میں دو بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جس میں اشتراکی جوش و خروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں دو قسم کے خیالات کے لوگ شریک تھے، ایک جماعت یہ سمجھتی تھی کہ اس کانفرنس میں جنگ کے انسداد پر زور دیا جائے گا اور دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ اس عالمگیر جنگ سے فائدہ اُٹھا کر ہمیں ان کانفرنسوں کو اشتراکیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنانا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو اشتراکیت کو ہر جگہ پھیلایا جائے۔ اس خیال کا پہلا حامی لینن تھا۔

اس کے بعد روس کی عظیم الشان اشتراکی بغاوت رونما ہوئی جو درحقیقت حکومت کے مظالم کا نتیجہ تھی۔ اس وقت روسی اشتراکی مختلف جماعتوں میں منقسم تھے، ایک پارٹی انقلاب پسند اور باغی تھی جس کا مقصد کاشتکاروں کا فلاح تھا! دوسری پارٹی مارکس کی پیرو کار ہوتی تھی، اس میں بھی دو پارٹیاں تھیں، ایک اعتدال پسند جو طبقۂ متوسط سے تعاون کی قایل تھی، دوسری پارٹی مزدوری کے انقلاب کی حامی اور مزدوروں کی ڈکٹیٹری کی طالب تھی۔ اسی وقت اسے بالشویک کے نام سے پکارا جاتا ہے مگر جب ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر اعتدال پسند اشتراکی اور متوسط طبقہ کے

آزاد خیالوں نے بغاوت شروع کی تو سب خیال کے اشتراکیوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس انقلاب کے بعد جو وزارت قایم ہوئی اس کا وزیراعظم کرنسکی تھا لیکن اس کے بعد جب بالشویکوں کی قیادت اور لینن کی رہبری میں دوسرے انقلاب کے شعلے مشتعل ہوئے اور ان لوگوں نے ایک مزدور ڈکٹیٹرشپ کا اعلان کیا تو یورپین اشتراکی دو جماعتوں میں منقسم ہوگئے اور دونوں میں اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع اور عمیق ہوگئی۔ جب بالشویک روس کی حکومت پر پوری طرح قابض ہوگئے اور انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہی اشتراکیت کے حقیقی پیرو ہیں اور ایک تیسری بین الاقوامی اشتراکی پارٹی قایم کی اور اپنے اُصول کے مطابق دنیا کو ایک عالمگیر انقلاب کی دعوت دینے لگے جس کے اُصول کارل مارکس کی کتابوں اور اس کے اس بیان سے ماخوذ ہیں جو اس نے ۱۸۴۹ء میں شایع کیا تھا تو اسوقت انھوں نے جمہوری اعتدال پسند اشتراکیوں پر یہ اتہام لگایا کہ وہ کارل مارکس کے نظریات کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے سرمایہ داری قایم کرنے کے لئے متوسط طبقہ سے تعاون کا ڈھونگ نکالا ہے۔ اس کا جواب جمہوری اشتراکیوں نے یہ دیا کہ خود بالشویکی اشتراکیت کے اُصولوں سے منحرف ہوگئے ہیں اور انھوں نے روس کی جمہوریت اور آزادی کا خاتمہ کرکے روسی عوام پر محض قوت و طاقت کے ذریعہ تسلط اور غلبہ حاصل کیا ہے۔ روس کی اس باہم کشمکش کا سلسلہ بہت طولانی ہے اور اس کا مفصل ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

روس کے حالات تبدیل ہو جانے سے اور اشتراکیت کا رخ دوسری طرف پھر جانے کے بعد بھی جمہوری اشتراکیوں نے یورپ کے دوسرے ملکوں میں اپنی جدوجہد جاری رکھی چنانچہ جرمنی میں (باوجود اس کے کہ روسی بالشوزم سے متاثر ہوکر وہاں ایک بالشویک پارٹی قایم ہوگئی تھی) جمہوری اشتراکی اپنے اُصولوں پر قایم رہے۔ اسی طرح انگلستان کی بھی اشتراکی تحریک پر بالشوزم کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ فرانس میں بھی جب بعض اشتراکیوں کا میلان بالشوزم ہو چلا تھا تو جمہوری اشتراکی پارٹی کی پھر سے تنظیم کی گئی چنانچہ وزیروں کے انتخاب میں یہ پارٹی سب سے نمایاں اور سب پر فایق رہی۔ رہا اٹلی تو وہاں اسوقت تین جماعتیں ہوگئیں، ایک بالشویک دوسرے وہ جنھیں بالشویک بھی نہیں کہا جا سکتا، تیسرے وہ جو بالشوزم کے مخالف اور فاشزم کے حامی ہیں اور اب تو سارا اٹلی فیسسٹ ہے۔

صدرالدین عظیم

ترہاتِ نظیری

نظیری اُن شعرائے ایران سے ہے جنھوں نے ہندوستان آکر سلاطین تیموریہ کے ابرِ کرم کے رشحات سے تمتع حاصل کیا ہے اگرچہ دربارِ اکبری میں اس کا پایہ چنداں ممتاز نہیں ہوا لیکن جہانگیر بلکہ شہزادہ مراد کی قدر افزائی نے اس کو گونہ فروغ دیا وہ ایک غزل گو شاعر تھا قصیدہ میں وہ اپنے معاصرین سے بہت پیچھے ہے تغزل میں وہ ایک روشِ خاص سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں ایک حد تک اس کا مذاق کامیاب ہے وہ حسن و عشق کے تعلقات سے باخبر واردات و معاملات بیان کرنے کی قوت رکھتا ہے لیکن اس حد تک جہاں عام عاشق مزاجوں کی رسائی ہے اسی وجہ سے اس کی غزل زیادہ تر عام پسند ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اسالیبِ تغزل کی دلآویزیوں سے باہر قدم رکھتا ہے تو اس کے طائرِ فکر کی قوتِ پرواز سلب ہو جاتی ہے۔ فلسفہ، عبرت، حکمت، موعظت اور معرفت کے مضامین اس کے یہاں محض آورد و تکلف پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ تصوف سے بیگانہ اور حقائق سے ناآشنا ہونے کے باوجود ان پر قلم اُٹھاتا ہے اور مرغِ شکستہ بال کی طرح منہ کے بل زمین پر آ گرتا ہے اسی وجہ سے اس کے کلام میں ناہمواری ہر جگہ نمایاں ہے غالباً مرزا صائب نے اس کے اندازِ وقوع گوئی و معاملہ نگاری پر نظر کرتے ہوئے کہا ہے ؎

صائب چہ خیال است شوی ہمچو نظیری عرفی بہ نظیری نرساند غزل را

اس کے یہ معنی نہیں کہ فی الحقیقت حسن و عشق و رموزِ محبت و حقائق میں نظیری عرفی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ قصیدہ میں عرفی ایک اختراعی قوت اور طرزِ خاص رکھتا ہے جس سے فیضی و ظہوری بھی قاصر ہیں لیکن اس کی خود بینی و خود نمائی ہمعصر شعراء کو خیال میں نہیں لاتی وہ اساتذہ متقدمین پر بھی آوازے کستا ہے لیکن باایں نخوت خواجہ صاحب کی روش کا اتباع سخت دشوار جانتا ہے ؎

بر آں تتبعِ حافظ رواست چوں عرفی کہ دل بکار دو دردِ سخنوری داند

نظیری قصیدہ میں کوئی پایہ نہیں رکھتا اور غزل میں جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے جب اپنی سادہ تغزل کی روش سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے لسان الغیب حضرت خواجہ حافظ قدس سرہٗ کی متابعت کا اظہار کرتے ہوئے نہایت بدمزگی و بےکیفی کے ساتھ گستاخانہ تعریضات کر کے اپنی بے مائگی کا بیّن ثبوت دیتا ہے۔ اعجازِ موسوی کا معارضہ سحرِ سامری سے کرتا ہے مرزا صائب نے عموماً متقدمین اور معاصرین کا نام ادب و احترام سے لیا ہے اور ان کی غزل کا جواب دیا ہے لیکن خواجہ صاحب کی غزل پر جب غزل کہی ہے تو اس کو ترکِ ادب تصور کر کے نہایت معذرت کی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

صائب چہ تواں کرد بتکلیفِ عزیزاں ورنہ طرفِ خواجہ شدن بےبصری بود

یعنی لوگوں کے اصرار سے یہ جرأت کرنا پڑی کہ خواجہ کی غزل پر غزل لکھی ایک اور مقطع میں کہا ہے ؎

رواست صائب اگر نیست از رہِ دعوے تتبعِ غزلِ خواجہ گرچہ بےادبی ست

کچھ صائب ہی پر موقوف نہیں ہے تمام اربابِ فن خواجہ کا اعتراف کرتے ہیں ان کے تقدم کے معترف ہیں اور بہت ہی ادب سے ان کا نام لیتے ہیں خود نظیری نے اس سنت کا اتباع کیا ہے وہ کہتا ہے ؎

تا اقتدا بحافظِ شیراز کردہ ام گردید مقتدائے دو عالم کلامِ ما

غالباً قبولیتِ عام حاصل کرنے کے لئے خواجہ صاحب کی پیروی کا دعوے کیا گیا ہے ورنہ حقیقتاً نظیری اپنے کو خواجہ صاحب کا حریف سمجھتا ہے مضامین میں مجادلہ و مکابرہ کی صورت اختیار کرتا ہے اور جوشِ مخالفت میں دائرۂ تغزل سے باہر ہو جاتا ہے۔ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے ہم اس دیدہ دلیری کی چند مثالیں پیش

کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ان کا نصب العین تغزل و تفنن نہیں ہے بلکہ صرف خواجہ صاحب کے کلام پر نقص و ایراد مقصود ہے - سنئے خواجہ صاحب کہتے ہیں ؎

ہنگام تنگدستی در عیش کوش و مستی　　　کیں کیمیائے ہستی قاروں کند گدا را

عیش و مستی کی تعلیم خواجہ صاحب کا خاص مذاق ہے وہ افکار و علائق کو منزل اُلفت میں سالک کے لئے خار راہ سمجھتے ہیں اُن کے نزدیک افلاس و تنگدستی مسرت روحانی و کیفیت وجدانی کی راہ میں حائل نہیں، دلشکستی دنیوی آلام و محن میں دامن اُلجھانا تجرد کے خلاف ہے لیکن بیچارہ نظیری اپنی پست فطرتی سے مجاز کے خارستان میں اُلجھا ہوا رموز حقیقت سے بےخبر اس نظریہ کے سمجھنے سے قاصر رہا یا محبت الفت کے جنون میں جامہ سے باہر اور تغزل سے بیگانہ ہو کر خواجہ کے رد پر آمادہ ہو گیا اُسکو اپنی تفضیح کا خیال بھی دامنگیر نہ ہوا کہتا ہے ؎

با فقر و تنگدستی شوم ست عُجب و مستی　　　در کشور غیوراں نخوت کشد گدا را

یعنی فقر و ناداری میں مستی ادبار ہے اور نخوت گدا کے لئے موجب ہلاکت ہوتی ہے - اکثر شعرائے متصوفین فرقہ جبریہ کے اعتقاد کے مطابق افعال و اعمال بشری کو قضا و قدر کی جانب منسوب کرکے عوام طعنہ گویوں کی زبان بند کرتے ہیں نیز اسباب و وسائط قریبہ کو نظر انداز کرکے مبدء اول پر نظر ڈالتے ہیں اور یہ فنا کی ایک منزل ہے جسکو ہمہ اوست یا ہمہ از دوست سے تعبیر کرتے ہیں اسی رمز کو خواجہ صاحب اپنے الفاظ میں یوں بیان فرماتے ہیں ؎

در کوئے نیکنامی ما را گزر ندادند　　　گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

مطلب یہ ہے کہ نیکنامی سے ہم کو کچھ حصہ نہیں ملا لیکن اگر تجھ کو یہ حالت ہماری پسند نہیں ہے تو تو ہماری قسمت کو پلٹ دے - نظیری اس پر سخت برہم ہوتا ہے اور سطحی نظر سے نغمہ خارج از آہنگ الاپتا ہے ؎

بر قدر قابلیت دادند ہر چہ دادند　　　حق راست بر تو حجت تہمت مکن قضا را

کوتاہ بینی سے اس کو یہ نظر نہ آیا کہ استعداد و قابلیت بھی اُدھر ہی کا عطیہ ہے لہذا حجت تمام نہیں ہوئی اور قضا پر تہمت قایم ہے نظیری کا یہ فلسفیانہ استدلال بالکل باد ہوا ہے خواجہ صاحب کا مطمح نظر خلاق عالم کی قدرت کاملہ و مشیت ازلی ہے وہ ایک ذرہ کائنات کو بھی خداوند تعالی کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں جانتے اور اسی بنا پر اپنی مجبوری کا عذر پیش کرتے ہیں - - اخلاق و موعظت جو خواجہ صاحب کی جولانی فکر کا میدان ہے اس میں فرماتے ہیں ؎

دہ روزہ مہر گردوں افسانہ ایست افسوں　　　نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

کہتے ہیں کہ "چند روزہ زندگی یا فرصت کو غنیمت سمجھو اور دوستوں سے نیکی کر چلو" لیکن نظیری اس کو پسند نہیں کرتا اور احسان کا دائرہ تنگ کرنا چاہتا ہے - لطف عام کو مکروہ جانتا ہے پھر اس کو ایک مہمل نظریہ سے ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

از کاہش محباں بر قدر خود فزائید　　　با این خسیس مردم یاری مگیر یارا

یعنی ایسے لوگوں سے جو دوستوں کی قدر گھٹا کر اپنی عزت بڑھاتے ہیں حسن سلوک نہ کرو ؎

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

خواجہ صاحب فلاسفہ کے غیر منتج قیاسات پر خط بطلان کھینچتے ہوئے نغمہ حقیقت بلند آہنگی کے ساتھ اپنے ساز میں سناتے ہیں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو　　　کہ کس نگشود و نگشاید بحکمت ایں معما را

جب فلسفہ اسرار کائنات کے عقدے حل کرنے سے عاجز آتا ہے تو یہی اعتراف کرتا ہے اور عقل صائب کا یہ فتویٰ تسلیم کئے بغیر حکیم کو کوئی چارہ کار نہیں ہوتا لیکن ایک فاقد البصیرۃ مباحث حکمیہ و مسائل فلسفیہ کو بجائے باطل و غیر مفید ہونے کے ان کی دقت و دشواری کا انکار کرکے خواجہ کا رد کرتا ہے - چنانچہ نظیری کہتا ہے ؎

ہر جاں رانیست آں معنی کہ باید فکرآں کردن　　　الف با خوان ہر مکتب شناسد ایں معما را

مطلب یہ ہے کہ ہر طفل ابجد خواں جانتا ہے کہ عالم کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کی ادراک میں کسی کو غور و فکر کی حاجت ہو - ایک غلط دعویٰ کو کس دھوم دھام سے پیش کیا ہے ؎

گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا　　　کار طفلاں تمام خواہد شد

ہم نہیں سمجھتے کہ اس شاعر خانہ ویاد و سرائی کا جنون نظیری کو کس وقت ہوا اور اس نے یہ ہذیان کیوں بکا - ایسے اشعار اس کے یہاں اور بھی ہیں جن پر نقد کرنا تضییع وقت

خاکِ دامنگیر

حمید خاں میرے والد کے زمانہ کے ملازم تھے۔ یہیں جوان ہوئے اور یہیں بڑھے ہوگئے۔ شادی نہیں کی۔ جوانی میں زیادہ وقت ورزش میں گذارتے۔ کشتی لڑتے یا مجھے کھلایا کرتے۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب میرے والد کا انتقال ہوچکا تھا اور حمید خاں کی عمر پچاس سے زیادہ تھی۔ اب ان کا وقت بانس کی چھڑی یا غلیل بنانے میں زیادہ صرف ہوتا۔ ان چیزوں کا انھیں خاص شوق تھا۔ رات کے وقت خانصاحب اکثر قصے کہانیاں بھی سنایا کرتے۔ ہمارے یہاں اب ان کا وجود نوکر کی طرح نہیں تھا بلکہ ایک بزرگ و مربی کی حیثیت سے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے بارعب چہرے اور رکھ رکھاؤ نے محلے والوں میں بھی انکی ایک مستقل شخصیت قایم کردی تھی۔

حمید خاں کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ کم ازکم اس قدر "ہموار قسمت" کا انسان مجھے نہیں ملا۔ زمانہ کے حوادث ان کی زندگی پر کبھی زیادہ اثرانداز نہ ہوسکے۔ انھوں نے مصیبت کو کبھی مصیبت نہیں سمجھا اور نہ مسرت کے خوشگوار لمحے ان کو زیادہ مسرور کرسکے۔ ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ حمید خاں کے مزاج میں "انکسار" عنصر بھی شامل تھا یعنی یہ ان کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ کسی لطیف شے کو لطیف سمجھ کر لطف اندوز ہوسکیں۔

دو سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں دفتر میں کام کی زیادتی تھی اس لئے میں اکثر کاغذات مکان پر لے آتا اور صبح نو بجے تک ان کے ساتھ دماغ سوزی کرتا تھا۔ اس روز خلافِ معمول فقیروں نے مجھے بہت زیادہ پریشان کیا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ میں مکان کے بیرونی کمرے میں جو سڑک پر ہے بیٹھ کر کام کر رہا تھا۔ اور وہ دن اتفاق سے جمعرات کا تھا۔ جب پہلے فقیر نے آکر صدا دی اور میرے انہماک میں خلل ہوا تو میں نے اس کو ایک پیسہ دیکر ٹال دیا۔ لیکن نہ معلوم کیوں ہر پندرہ بیس منٹ کے وقفہ کے بعد رنگ برنگے فقیروں نے آنا شروع کیا اور میرے کام میں اس قدر حارج ہوئے کہ مجبور ہوکر مجھے حمید خاں کی مدد لینی پڑی۔ میں نے حمید خاں سے بلاکر کہا "خانصاحب، دیکھئے ان فقیروں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے ذرا یہیں باہر بیٹھ جائیے" حمید خاں نے ایکبار آنکھیں نکال کر سڑک کی طرف دیکھا اور خفگی کے آثار چہرہ پر پیدا کرکے باہر چبوترے پر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد پھر کسی فقیر کو سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔

دوسرے دن سہ پہر میں ۳ بجے کے وقت کمرے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس روز اتفاق سے دفتر کا کام نہیں تھا۔ فقیروں کی آمد نسبتاً کم تھی لیکن پھر بھی دو ایک نظر آچکے تھے۔ خانصاحب کو تو ان سے نفرت ہوگئی تھی وہ باہر چبوترے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ بانس کی چھڑی بغل میں تھی اور تجسس نگاہیں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ کسی غریب مسافر کو بھی فقیر کا شبہ کرتے اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگتے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک لڑکی جس کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہ تھی میرے کمرہ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ بدرنگ سی لنگی اور بوسیدہ ساڑی اس کے جسم پر تھی۔ ہاتھ میں المونیم کا ایک کٹورہ تھا جس میں ایک پیسہ اور ایک دھیلا نظر آرہا تھا۔ چہرہ پر افسردگی کی دبیز اداسی چھائی ہوئی تھی اور نرم نرم ہونٹ سوکھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرا ہاتھ خود بخود جیب کی طرف گیا۔ لیکن فوراً ہی خانصاحب کا خیال آگیا اور میں رک گیا۔

خانصاحب کی کرخت آواز کانوں میں آئی "ارے کیا ہے یہاں کیوں کھڑی ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ بھیک مانگتی ہے۔ ادھر آ۔ جلدی کر" یہ تمام سوالات اور احکامات خانصاحب نے ایک ہی سانس میں صادر کردئے۔ وہ بیچاری سہم گئی۔ ہاتھ میں کٹورا کانپ گیا۔ وہ ساڑی کو سنبھالتی ہوئی آہستہ آہستہ خانصاحب کی طرف بڑھی۔ میں نے دیکھا خانصاحب ہی تھے کہ ایک لمبا کش لیا چھڑی کو ہاتھ میں دبایا اور کھڑے ہوگئے۔ میں نے یہ سمجھا کہ خانصاحب اس غریب لڑکی کو اسی بیدردی سے ڈانٹ سکیں گے جس طرح وہ دوسرے فقیروں سے پیش آتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے چہرہ کی معصومیت اور مظلومیت ضرور خانصاحب پر اثر انداز ہوگی اور ان کی زبان زیادہ سختی نہ کرسکے گی لیکن خلاف توقع خانصاحب نے اس کو بھی نہایت نامناسب طریقہ سے جھڑک دیا۔

بولے "بھیک مانگنے آئی ہے - شرم نہیں آتی - جوان ہے - بدن میں قوت ہے - ہر طرح کا کام کر سکتی ہے - کام چور - محنت مزدوری کرکے پیٹ کیوں نہیں پیدا کرتی - مفت مانگ مانگ کر کھانے کی عادت ہو گئی ہے" - لڑکی بالکل چپ ہوئی خانصاحب کے سامنے کھڑی کانپ رہی تھی - آنکھیں نیچی تھیں اور چہرہ کا رنگ اُڑ چکا تھا - خاں صاحب اپنی آواز بلند کرتے جا رہے تھے - "نوجوان ہے - کمبخت کسی مصیبت میں پھنس گئی تو بھیک مانگنے کا سارا مزا بھول جائے گا - مگر کیا ٹھیک - مکار کہیں کی کمانے نکلی ہے . . . ." خانصاحب یہاں تک کہہ چکے تھے کہ یکایک ان کو لڑکی کے رخساروں پر آنسوؤں کے قطروں کی چمک نظر آئی اور شاید ایک سسکی بھی سنائی دی - میں تو خانصاحب کی طرف سے نا اُمید ہو گیا تھا لیکن نہ معلوم وہ کیا سمجھے اور جلد ہی انھوں نے نرم الفاظ میں اس کو سمجھانا شروع کیا "دیکھو بیٹی! زمانہ خراب ہے تو بھیک مانگنا چھوڑ دے، یہ کام بڑا ذلیل ہے اور تیرے لایق ہرگز نہیں - تو چاہے تو میں تجھے کسی کارخانہ میں کام دلانے کی کوشش کروں" لڑکی نے خانصاحب کو کوئی جواب نہ دیا - جدھر سے آئی تھی اسی طرف آہستہ آہستہ واپس چلی گئی - کٹورے والا ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا - میں اخبار پڑھنا بھول چکا تھا میں نے بڑھکر اس لڑکی کو ایک اکنی دینی چاہی لیکن اُس نے گردن کے اشارہ سے انکار کر دیا - اس کی سسکیاں میری اس حرکت سے تیز ہو گئیں - اور وہ جلدی سے گلی کے موڑ پر گھوم گئی - میں نے خانصاحب کی طرف دیکھا وہ قدرے افسردہ نظر آرہے تھے - وہ کچھ دیر تک لڑکی کی طرف دیکھتے رہے - جب وہ گلی میں داخل ہو گئی تو آہستہ آہستہ گردن جھکائے ہوئے مکان کے صدر دروازہ کی طرف بڑھے دروازہ کے قریب پہونچکر انھوں نے ایک بار گردن کو جنبش دی اور "آخ" کی آواز سنائی دی - گویا سارے حزن و ملال کے اثرات کو انھوں نے چشم زدن میں اس طرح تھوک دیا - وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے - زیادہ دیر تک غمگین رہنا پسند نہیں کرتے تھے -

میرے اوپر اس واقعہ کا خاص اثر تھا . . . کئی روز تک وہ فقیرن مجھے اکثر یاد آتی رہی - جب بھی خانصاحب میرے سامنے آتے ان کے کرخت الفاظ مجھے یاد آجاتے - میں یہ تو جانتا ہی تھا کہ خانصاحب غیر معمولی طبیعت کے انسان ہیں، مگر اس واقعہ نے میرے خیال میں اور بھی استحکام پیدا کر دیا اور میں نے از سر نو خانصاحب کا مطالعہ شروع کیا - اکثر میں موقع نکال کر ان سے دیر تک گفتگو کرتا اور موضوع کو تھوڑی دیر کے بعد عورت کی طرف رجوع کر دیتا - پہلے تو خانصاحب نے مجھے زیادہ منھ نہ لگایا اور نہ کچھ زیادہ موقع ہی ملا کہ اطمینان کی گفتگو ان سے کروں - ایک روز زنانہ میں خانصاحب سے میں نے قصہ کہنے کی فرمائش کی خیال یہ ہے کہ درمیان میں قصہ کا رخ اپنے مطلب کی طرف پھیر دوں گا - میں چاہتا تھا کہ خانصاحب سے ان خیالات کا علم حاصل کروں جو وہ عورت کی طرف رکھتے ہیں - مجھے اس قسم کا شوق ہمیشہ سے ہے کہ اس قسم کے عجیب الخلقت لوگوں کا نفسیاتی مطالعہ کروں - خانصاحب نے حقہ کا ایک کش لیتے ہوئے قصہ شروع کیا - درمیان میں ایک جگہ بیان کیا - "شاہزادہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور جنگل میں راہ بھٹک کر کھو گیا - پریشان حال پیاس کی شدت سے نڈھال - گھوڑے پر چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ سے ایک جھونپڑی نظر پڑی - خدا کا شکر ادا کرکے وہ وہیں اتر پڑا تاکہ اپنی پیاس بجھالے - جھونپڑی میں اس کو ایک نوجوان لڑکی ملی - نہایت حسین - چندرے آفتاب چندرے ماہتاب - اس نے اس کو دیکھا اور فوراً عاشق ہو گیا" - میں نے خانصاحب کو روک دیا - "یہ تو بتایئے اس کی کیا وجہ ہے کہ کسی نے جوان لڑکی کو دیکھا اور عاشق ہونا ضروری ہو گیا" - "مجھ سے اس قسم کی واہیات باتیں نہ پوچھو" خانصاحب نے ناراضگی کا اظہار کیا -

"آخر کچھ تو بتایئے - ماجرا کیا ہے - ابھی اس روز آپ نے بھی اس نوجوان فقیرن کو دیکھا تھا لیکن آپ تو عاشق واشق نہیں ہوئے"

"تم قصہ سنوگے یا نہیں - اگر مجھے ستاؤگے تو میں پھر کبھی قصہ نہ کہوں گا"

"خانصاحب! دیکھیئے آپ خفا ہو جاتے ہیں لیکن یہ باتیں آپ نہیں بتائیں گے تو کون بتائے گا"

خانصاحب کچھ نرم ہوئے "دیکھو، جانتے ہو کہ مجھے اپنی زندگی میں کبھی عورتوں سے دلچسپی نہیں رہی - چاہے وہ کتنی ہی حسین کیوں نہ ہوں - - - -

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا"

"آپ پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو عورتوں سے دلچسپی کیوں نہیں ہے" میں نے ان کو پھر چھیڑا -

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی"

"دیکھو! - تم قصہ سنوگے یا نہیں - میں یہ سب کچھ نہیں جانتا - میں نے شادی نہیں کی ہے"

"آخر یہ تو بتایئے - ناراض کیوں ہوتے ہیں" - میں نے اپنے چہرہ پر افسردگی طاری کرکے کہا - خانصاحب کو میں بہت عزیز تھا - وہ تھوڑی دیر

تک خاموش کچھ سوچتے رہے پھر بولے "میرے والد نے مجھے تعلیم دی تھی کہ عورت سے ہمیشہ ڈروں۔ چنانچہ میں نے ابتدا ہی سے اس پر عمل کیا اور کچھ قدرت نے بھی میرا دل ایسا بنایا ہے کہ وہ جلد ایسی چیزوں کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ زندگی میں کئی بار میں نے بھی اپنے قدم میں لغزش محسوس [illegible] ---
اب میں تم سے کہاں تک کہوں۔ ایسی ایسی بدحال عورتوں کو میں دیکھ چکا ہوں۔ یہ فقیرن مجھ پر کیا اثر کرتی۔ اور دیکھا تم نے میں اسے اچھی باتیں سمجھا رہا تھا لیکن اس نے بُرا مانا اور لگی رونے"۔ خانصاحب پر کچھ غصہ طاری ہو رہا تھا۔ میں نے خانصاحب کو روکا "سنئے تو آپ کو اپنی زندگی میں کسی عورت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، کوئی کمی آپ نے اپنی زندگی میں نہیں پائی"۔ "توبہ کرو"۔ خانصاحب نے خاص انداز میں فرمایا۔ "جس چیز کو میں قابلِ نفرت سمجھتا ہوں اس کی مجھ کو کمی محسوس ہو۔ میں نے تو کہدیا تم سے کہ عورت کو میں نے کبھی اپنا بنانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ عورت بہت کمزور فطرت کی ہوتی ہے۔ معمولی جھونکے بھی اس کو جھکا دینے کے لئے کافی ہیں۔ میں نے تو تنہا زندگی گزار دی۔ اسی میں مجھے بہت آرام رہا۔ آخری ایام میں میں تو بہت خوش ہوں۔ خدا آپ لوگوں کو ہمیشہ زندہ رکھے"۔ یہ دعائیہ کلمات کہکر خانصاحب خاموش ہو گئے اور کچھ سوچنے لگے۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد خانصاحب نے پھر قصہ شروع کیا اور نہ معلوم کب تک کہتے رہے میں تو سو گیا۔

اس کے بعد دور دور تک میری اور خانصاحب کی کوئی خاص گفتگو نہ ہوئی۔ تیسرے دن اتوار تھا۔ میں دن بھر گھر ہی پر رہا۔ شام کے وقت خانصاحب سے مجھے بات چیت کا پھر موقع مل گیا۔ وہ صحن میں بیٹھے بانس کی غلیل بنا رہے تھے، چاقو سے چھیلکر اسے نہایت مشقت کے ساتھ سڈول کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب پہونچا تو کہنے لگے۔ "دیکھو بابو یہ غلیل بہت عمدہ ہوگی یہ جو مرزا صاحب ہیں نا بیچارے بہت دنوں سے کہہ رہے تھے، انھیں کی فرمایش پوری کر رہا ہوں سوچتا ہوں کہ ایسی چیز بنا کر دوں کہ عرصہ تک یاد رکھیں"۔ "جی ہاں، بہت اچھی غلیل طیار ہوگی"۔ میں نے بھی خانصاحب کا دل بڑھایا۔ "آپ تو خانصاحب غلیل چلانے میں بڑے ماہر ہیں۔ آجکل شکار وغیرہ چھوڑ دیا ہے کیا"۔

"بھئی! اب آنکھوں کی روشنی بہت کم ہو گئی ہے۔ ورنہ تمھیں تو یاد ہوگا میں غلیل ہی سے کبوتر اور فاختے مارا کرتا تھا"۔ خانصاحب نے فخریہ فرمایا

"جی ہاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے"۔ میں نے خانصاحب کو پھر چھیڑنا چاہا "خانصاحب! یہ فاختہ بہت ہی معصوم اور غریب پرندہ ہے میں تو اُسے مارنا پسند نہیں کرتا"۔ "ہاں بھئی۔ بات تو ٹھیک کہتے ہو"۔ خانصاحب نے میری تصدیق کی۔

"مجھے بھی بڑا ترس آتا ہے۔ بڑا بھولا اور حسین پرندہ ہے"۔

"تو آپ کو حسین چیزیں پسند آتی ہیں"۔

"دیکھو"، خانصاحب نے اپنے مخصوص انداز سے کہا۔ "تم نے تو پھر مجھے پریشان کرنا شروع کیا"۔

"جی نہیں"۔ میں نے کہا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے، خوبصورت اور حسین چیز ہر ایک کو اچھی معلوم ہوتی ہے"۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عورت کا حسن میرے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتا"۔ خانصاحب نے اس طرح کہا گویا وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔ "میں حسین عورت کو بدصورت کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کے پاس حسن ایک ایسی چیز ہے جس سے وہ بڑی سے بڑی مہم بھی سر کر سکتی ہے ــ میں بھی ایکبار اس فریب میں مبتلا ہو چکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو"۔ "کون سی بات خانصاحب۔ ذرا میں بھی سنوں"۔ میں نے اصرار کیا۔

"نہیں نہیں۔ تم کو نہیں بتاؤں گا ــ تم بہت شریر ہو۔ مجھ سے تمام باتیں سننا چاہتے ہو"۔ اس کے بعد میں نے بہت اصرار کیا۔ لیکن خانصاحب نے میری ایک نہ سنی ۔ ۔ ۔ میرا اصرار ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ خانصاحب کی نظر یکایک سڑک کی طرف اٹھی۔ "دیکھو، وہ فقیرن آج پھر اس طرف آئی"۔ خانصاحب نے کہا میں نے دیکھا تو سڑک پر وہی لڑکی ہاتھ میں کٹورا لئے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑھی عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔

خانصاحب اس کی طرف بڑھے۔ میں نے انھیں روکنا چاہا کہ وہ اُسے بُرا بھلا نہ کہیں۔ خانصاحب نے کہا "میں ذرا اُس سے بات چیت کروں گا۔ اس غریب کو سمجھا دوں۔ کہیں کسی بدمعاش کی نظر پڑ گئی تو مصیبت میں پڑ جائے گی"۔ خانصاحب اس لڑکی کے پاس گئے۔ میں دور ہی سے دیکھتا رہا۔ خانصاحب نے اس سے کچھ بات چیت شروع کی۔ اور ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ بہت دور تک چلے گئے۔ وہ کافی دیر تک واپس نہیں آئے۔ میں منتظر بیٹھا رہا۔ اندھیرا ہوتے ہوتے

ان کی واپسی ہوئی - میں نے دریافت کیا " اس لڑکی کے سمجھ میں آپ کی بات آئی یا نہیں "

" جی ہاں " - خانصاحب نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے ان کی آواز رُک رہی ہو

" اب تو وہ شاید بھیک نہ مانگے گی "

" معلوم نہیں - ممکن ہے نہ مانگے "

خانصاحب پر اس خاص بات کا اثر ہو چکا تھا - اُن کی آواز اور گفتگو کا وہ مخصوص طرز بدلا ہوا معلوم ہو رہا تھا، یہ دو چار جملے کہکر خانصاحب اپنی کوٹھری میں چلے گئے - میں بھی کچھ سوچتا ہوا وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا -

دوسرے روز پانچ بجے شام کے قریب میں دفتر سے واپس آرہا تھا، میرے مکان کے پاس ہی سڑک پر املی کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے نیچے محلے کے شریر لڑکے دن بھر جمع رہتے - میں نے اس درخت کے نیچے دیکھا - خانصاحب وہ فقیرن اور بڑھیا تینوں موجود ہیں، میں دور ہی ایک مکان کی آڑ میں ہوگیا تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکیں - میں نے دیکھا اس بڑھیا نے اپنی ساری کے کسی حصہ سے ایک چاندی کا چمکتا ہوا سکّہ نکالا اور خانصاحب کے ہاتھوں پر رکھدیا - خانصاحب بُت کی طرح ساکت کھڑے تھے - ان کے جسم میں ذرا بھی جنبش نہیں ہو رہی تھی -

تھوڑی دیر تک بڑھیا دھیمی آواز میں خانصاحب سے کہتی رہی - جس کو میں فاصلے کی زیادتی کی وجہ سے سُن نہ سکا، تھوڑی دیر کے بعد بغیر اپنی باتوں کا جواب سنے ہوئے اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو چلی گئی - - - - - خانصاحب کچھ دیر تک اس کو دیکھتے رہے لیکن جب وہ اندھیرے میں چھُپ گئی تو وہ بھی مکان کی طرف واپس چلے گئے - میں یہ معمہ نہ سمجھ سکا - اس واقعہ کے ہر حصے نے مجھے عجیب قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا - - - - میں بھی مکان کے اندر جلدی چلا آیا کپڑے تبدیل کئے منھ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھ گیا - سوچ رہا تھا کس عنوان سے خانصاحب سے دریافت کروں کہ آخر ماجرا کیا ہے اس بڑھیا نے ان کو وہ روپیہ کیوں دیا اور ان سے کیا کہتی رہی - میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ میرے چند احباب آگئے - چائے پی گئی - اور میں ان کے ہمراہ ٹہلنے کے لئے نکل گیا -

رات کے وقت جب میں سونے کے لئے طیار ہوا تو ارادہ کیا کہ خانصاحب کو پھر کہانی کہنے کے بہانے سے بلاؤں اور بات ہی بات میں ان سے اصلیت دریافت کروں - میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خانصاحب خود آگئے - ان کے چہرے پر میں نے آج تک اس قسم کی کیفیت نہیں دیکھی جیسی اس رات دیکھی تھی - انتہائی اُداسی اور گھبراہٹ کا عالم تھا - قبل اس کے کہ میں ان سے مزاج پُرسی کرتا - انھوں نے خود کہا :-

" میاں (وہ مجھے اسی نام سے پکارا کرتے تھے) آج میں آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں - اب میں ان لوگوں کو چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں "

" کیوں ؟ - کیا ہوا ؟ - کیا بات ہے ؟ " میں نے گھبرا کر اُن سے سوالات کئے - میں اس اچانک حادثہ سے پریشان ہوگیا - مجھے خانصاحب کی ذات ازحد عزیز تھی - اور میں یہ آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں -

" جی ہاں " - خانصاحب نے اس طرح کہا گویا انتہائی حد تک مایوس تھے - " اب مجھے جانے ہی دیجئے میرا جانا اب بہت ضروری ہے - مجھے دوسری جگہ نہایت ضروری کام ہے - مجھے اجازت دیدیجے - آپ کا احسان ہوگا "

" آخر کیوں ؟ - کہاں جائے گا ؟ کیا ضروری کام درپیش ہے ؟ - بیٹھ جائیے اطمینان سے - کچھ مجھے بھی بتائیے آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں " میں نے یہ چند باتیں انتہائی خلوص کے ساتھ خانصاحب سے کہیں - وہ ایک طرف فرش پر بیٹھ گئے اور کہنے لگے - " میں اب یہاں سے دوسری جگہ جاؤں گا - ایک بہت ضروری کام ہے - آپ کو بتا کر کیا کروں گا - اور آپ سُن کر کیا کیجئے گا - میں کوشش کروں گا کہ جلد واپس چلا آؤں لیکن اگر نہ آسکا تو زیادہ دنوں تک میرا انتظار مت کیجئے گا - مجھے خانصاحب کی گفتگو سنکر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی خانصاحب ہیں جو اپنے مزاج کی سختی اور طبیعت کی پختگی پر نازاں تھے -

ان کی آواز اور چہرہ کی کیفیت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دل کے اندر طوفان برپا ہے - اور اندر ہی اندر خاموش قسم کی آگ سُلگ رہی ہے، اس انقلاب کو دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا - میں سمجھنے سے قطعی قاصر تھا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے - جب میں نے دیکھا کہ میرا شدید اصرار بھی خانصاحب کو اپنے راز کے انکشاف کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا میں نے اُن سے آخری اور کارگر سوال کیا " آج شام کو آپ املی کے درخت کے نیچے کھڑے کس عورت سے باتیں کر رہے تھے - میرا خیال ہے

کہ اسی وقت سے آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔"

"جی نہیں"۔ خانصاحب نے گھبرا کر جواب دیا۔" میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب مجھے اجازت دیجئے میں کل صبح ہی رخصت ہو جاؤں گا۔"

"ذرا تشریف رکھئے" میں نے دوبارہ خانصاحب سے کہا کہ" اس وقت وہ فقیرن بھی غالباً وہاں موجود تھی اس بڑھیا نے آپ کو ایک روپیہ کیوں دیا تھا"۔۔۔۔۔ میں اتنا کہنے ہی پایا تھا کہ خانصاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بول اٹھے۔" تو آپ نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔۔۔۔۔۔ اچھا تو سنئے۔ میں آپ کو ایک ایسا قصہ سناتا ہوں جس کو عرصہ ہوا میں بھی بالکل بھول چکا تھا ـــــ مگر شرط یہ ہے کہ میں کل صبح ہی ضرور چلا جاؤں گا"

میں خاموش عالم حیرت میں بیٹھا رہا اور خانصاحب نے اپنی داستان یوں شروع کی:۔

"یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب میں جوان تھا۔ آپ کے والد کی عمر بھی مجھ سے بہت زیادہ نہ تھی۔ میں ان کے ہمراہ علاقہ پر جایا کرتا تھا۔ اول تو وہ مجھ سے زیادہ مانوس تھے دوسرے میں جایداد کے کام میں ہمیشہ سے ہوشیار تھا مالگذاری وغیرہ کی وصولیابی میں ان کی کافی مدد کیا کرتا تھا۔ گرمی کا زمانہ تھا میں آپ کے والد کے ساتھ علاقہ پر تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا کہ یک بیک آپ کے والد صاحب کو کوئی بات یاد آئی۔ اور مجھے حکم ملا کہ چماروں کے محلہ میں جاکر ایک چمار کو بلا لاؤ۔ میں تعمیل حکم کے لئے فوراً چلدیا۔ جب میں اس چمار کے مکان کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ ایک نوجوان چمارن چلی آ رہی تھی۔ میں نے اس روز سے قبل اس گاؤں میں نہیں دیکھا تھا۔ شاید کسی کی مہمان تھی۔ نہ جانے کیوں میں نے اُس میں کچھ کشش محسوس کی لیکن آپ یقین مانئے کہ مجھے صرف ایک ہلکا سا خیال اُس کے چہرے کی جاذبیت کی نسبت پیدا ہوا تھا اور کچھ نہیں۔ جب وہ قریب آئی تو میں نے اُسی سے اس چمار کی موجودگی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے فوراً گھونگھٹ کر لیا اور دبی ہوئی زبان سے جواب دیا کہ اسے اس کے بارہ میں علم نہ تھا۔ خیر میں آگے بڑھا اور اپنا کام کیا۔ یعنی اس چمار کو ساتھ لیا اور واپس ہوا۔ واپسی پر پھر وہ لڑکی مجھے کنوئیں پر پانی بھرتی نظر آئی۔ نہ معلوم کیوں اس مرتبہ میں اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے قطعی اعتراف ہے کہ اس وقت مجھے اپنے دل میں کچھ کمزوری محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی میں نے اپنی نگاہ دوسری طرف ہٹالی۔ اس چمار سے کھیتی اور غلہ وغیرہ کے بارہ میں گفتگو کرنے لگا۔ یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد دو روز تک یعنی جب تک کہ میں نے اس کو تیسری بار نہیں دیکھا وہ مجھے پھر یاد نہ آئی۔ تیسرے روز شام ہی کا وقت تھا میں آپ کے والد کے ہمراہ شکار سے واپس آ رہا تھا۔ وہ مجھے اسی کنوئیں پر نظر آئی۔ مجھے اس کی طرف دیکھنے میں ایک خاص لطف محسوس ہوا۔ میں اس کو پلٹ پلٹ کر دور تک دیکھتا رہا۔ اس مرتبہ مجھے یقین ہے کہ اس نے بھی مجھکو دیکھا تھا۔ ممکن ہے یہ میرا خیال ہی ہو۔ خیر اس روز رات میں قریب بارہ بجے میری یکایک آنکھ کھل گئی اور دیر تک اسکے بارہ میں نہ معلوم کیا کیا سوچتا رہا۔ کئی بار میں نے کوشش کی کہ اپنے خیال کو دوسری طرف رجوع کردوں۔ لیکن ہر ایسی کوشش کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر مجھے یاد آئی"

خانصاحب کچھ اس انداز سے یہ داستان بیان کر رہے تھے کہ گویا اپنے دماغ پر زور دیکر اس واقعہ کی ہر تفصیل کو یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے لب ولہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس واقعہ کے بیان کرنے میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ایسی لذت جس میں حزن وملال کے عناصر بھی پوشیدہ تھے۔ میں نے خانصاحب کی زندگی کا ایک نیا ورق اپنے سامنے کھلتا ہوا دیکھ رہا تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ خانصاحب کی زبان سے میں آخری کہانی سُن رہا ہوں۔ خانصاحب نے اپنی داستان جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

دوسرے ہی روز شام کو ٹہلتا ہوا میں پھر چماروں کی بستی کی طرف گیا وہ حسب معمول کنوئیں کی طرف آ رہی تھی۔ میں اس کو دیکھنے ہی کی غرض سے گیا تھا اور میں نے اس کو دیکھا۔ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال آیا۔ جس نے مجھے اپنے اندر کمزوری کا احساس کرایا۔ میں جلد ہی وہاں سے واپس چلا آیا۔ اس کے بعد دو دن تک میں آپ کے والد صاحب کے ساتھ وہاں رہا اور انھیں کے ہمراہ شہر واپس چلا آیا۔ کچھ دنوں تک وہ مجھے ضرور کبھی کبھی یاد آئی لیکن جلد ہی میں اسے بالکل بھول گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد مجھے پھر کسی ضروری کام سے آپ کے والد صاحب نے علاقہ پر بھیجا۔ جب میں راستہ میں تھا تو وہ مجھے پھر یاد آئی اور پانچ میل کا راستہ میں نے پاپیادہ اس قدر جلد طے کرلیا گویا میں دوڑتا ہوا گیا۔ میں کنوئیں کے پاس کافی دیر تک انتظار کرتا رہا مگر اسے نہ دیکھ سکا۔ عجیب قسم کی تکلیف مجھے محسوس ہوئی۔ اسی مایوسی کے عالم میں میں ندی کی طرف چلا کہ ذرا پانی کی روانی اور ہوا کی تازگی سے اپنے دل کی افسردگی دور کردوں۔ میں ایک ارہر کے کھیت کے قریب سے گزر رہا تھا کہ وہ مجھے ندی کی طرف سے آتی ہوئی نظر آئی۔ میں اس کو دیکھ کر کسی حد تک چونک اٹھا۔ جب وہ میرے قریب آئی تو میں نے ہمت کرکے اس سے دو ایک

سوال کئے جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک چمار کے یہاں مہمان تھی۔ کیونکہ اس کے گاؤں میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جا رہی واپس چلی جائے گی۔ میرے سوالوں کا جواب دیکر اس نے جلدی جلدی مکان کی طرف قدم بڑھایا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ مجھے اس کی اس حرکت سے تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ اس قدر تیز قدم اُٹھائے کیوں چلی جا رہی تھی ——— شام کا اندھیرا، ہوا کی بھینی بھینی خنکی، فضا کا بھاری پن از حد صبر آزما ثابت ہونے لگا۔ میں نے پھر اسے آواز دی وہ رُک گئی۔ میں اس کے قریب پہونچا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا گفتگو کروں۔ میرے اندر ایک بہت طاقتور قسم کا بہیمت اُٹھ رہا تھا مجھے شرم آتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ اسوقت جو میری کیفیت تھی وہ اپنے وحشیانہ طرز کی وجہ سے حد درجہ مُہلک اور تباہ کن تھی۔ میرے اندر وہ جانور بیدار ہو چکا تھا جس کے متعلق میرا دعوٰے تھا کہ وہ پوری طرح میرے قبضہ میں ہے۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن میں اس وقت بالکل اندھا تھا اور بالکل اندھوں کی سی حرکتیں مجھ سے سرزد ہوئیں۔

جب میں وہاں سے واپس چلا تو دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ منھ سے آواز تو نہیں نکلتی تھی لیکن گریہ کی تمام کیفیات جو انسانی قلب و دماغ پر انتہائی غم و اندوہ کا عالم طاری کر سکتی ہیں، موجود تھیں۔ میں اس منظر کی زیادہ دیر تک تاب نہ لا سکا اور یہ سوچ کر کہ اُس غریب کو میری ذات سے جو تکلیف پہونچی تھی وہ شاید اس طرح ختم ہو جائے میں نے ایک روپیہ اس کی گود میں پھینکا اور وہاں سے تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر چلا آیا۔ ارہر کے کھیت کے دوسرے سرے تک مجھے اس کے سسکیوں کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ جیسے گناہ کے مکروہ شیاطین میرا مُنھ چڑھا رہے ہیں"

اس کے بعد خانصاحب تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ میں نے بھی سوال کرنے کی ہمت نہ کی۔ "یہ بڑھیا جس کو آپ نے آج شام کو درخت کے نیچے دیکھا ہے وہی چمارن تھی" خانصاحب نے آہستہ آہستہ کہا۔ جیسے ان کا دل کیفیات کے ہجوم سے خالی ہو چکا تھا اور وہ لڑکی کون تھی۔ میں نے فوراً دریافت کیا۔ بولے "وہ میری لڑکی ہے"۔ خانصاحب نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ میرے اوپر انتہائی افسردگی طاری ہو گئی۔ میں نے پوچھا "اور وہ روپیہ جو اُس بُڑھیا نے آپ کے ہاتھ پر رکھا تھا"۔ بولے "یہ وہی روپیہ ہے جو میں نے کسی وقت اس کو دیا تھا"

خانصاحب نے اپنی داستان ختم کر دی اور اُٹھکر چلے گئے۔ میں نے روکنا چاہا کہ کچھ مزید سوالات کروں لیکن وہ نہ رُکے میں نے بھی سوچا کہ دوسرے دن صبح پھر گفتگو ہوگی۔

دوسری صبح کو خانصاحب اپنی کوٹھری میں نہیں ملے وہ جا چکے تھے۔

میں بہت دنوں تک تمام شہر میں تلاش کرتا رہا کہ شاید خانصاحب کا سُراغ مل سکے لیکن ناکام رہا۔ دو سال بعد مجھے گوالیار جانے کا اتفاق ہوا وہاں بعد نماز جمعہ جب میں مسجد سے باہر نکلا تو سیڑھیوں پر فقیروں کے گروہ میں خانصاحب کی جھلک نظر آئی، وہ لڑکی اور بڑھی فقیرن بنی آپ کے ساتھ صدا لگا رہی تھی۔

کلیم اللہ - ام - اس - سی

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء) جنوری عہ ر - (سنہ ۲۹ء) اگست عہ ر - (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر - (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸ - اگست ۸ ر - ستمبر عہ ر - اکتوبر ۸ ر - نومبر ۸ ر - دسمبر ۸ ر - (سنہ ۳۲ء) جنوری عا ر - فروری عہ ر - مارچ عہ ر - مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ - نومبر عہ ر - (سنہ ۳۳ء) فروری عہ ر - (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ ر فی پرچہ - (سنہ ۳۵ء) دسمبر عہ ر - (سنہ ۳۶ء) جنوری عا ر - فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ - اکتوبر عہ ر - (سنہ ۳۸ء) جنوری ست ر فروری ۸ ر - اپریل عہ ر - مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۳۹ء) جنوری عہ ر، فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ، ستمبر عہ ر - اکتوبر، نومبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۰ء) جنوری عہ ر - فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۱ء) جنوری فروری عا ر - مارچ تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۲ء) جنوری فروری عہ ر - مارچ، اپریل، مئی، جون ۸ ر فی پرچہ -

ناظورۂ کشمیر

ناظورۂ نازنیں ہے اورمیں
کشمیر کی سرزمیں ہے اورمیں

قربان بہار ہو رہی ہے
رعنائی نثار ہو رہی ہے

ہر شاخ بجائے خود چمن ہے
اللہ اللہ عجب پھبن ہے

اٹھتی کونپل کی اُٹھ جوانی
اور اُس پہ لباس ارغوانی

ہر پھول دُلھن بنا ہوا ہے
ڈوبی ہوئی عطر میں ہوا ہے

یوں گرمیٔ حُسن سے ہے تپتی
بوٹے بوٹے کی پتّی پتّی،

گویا کندن کی ڈاک دے کر
یاقوت سے جڑ دیا ہے زیور

ہر گام پہ اک نیا ہے منظر
رنگیں، شاداب، حسن پرور

گُل پھول کھلائے جا رہے ہیں
قالین بچھائے جا رہے ہیں

چھتنار چنار کا وہ سایا
جس سے گھونگھٹ گھٹا نے کھایا

کُہسار جو یوں تنے کھڑے ہیں
اُپچی ہیں کہ بات پر اڑے ہیں

تخئیل پہ حُسن چھا گیا ہے
جب باغ نشاط بن سکا ہے

فوارے چھٹے کہ مور ناچے
منقار میں موتیوں کے مالے

طاؤس سفید جو ہے عنقا
ہے اُس نے یہاں پرا جمایا

جادو فطرت کا چل رہا ہے
پانی گوہر اُگل رہا ہے!

تعمیر جو ایک خواب کی تھی
تعبیر ہے شالامار اُس کی

اک شور ہے آبجو کا ہر سو
اک حشر ہے رنگ و بو کا ہر سو

اُڑتا ہے یہ غول تتلیوں کا
یا قوسِ قزح سے رنگ برسا

اکثر ہوا موجِ گُل پہ دھوکا
بہتا ہوا رنگ کا ہے دریا

دلکش کون ایسا گلکدہ ہے
تو ہی "فردوسِ گم شدہ" ہے

کشمیر کی مندری میں وہ نگ ہے
جس پر لہلوٹ سارا جگ ہے

خود حُسن کو تیری آرزو ہے
صنعت کا وہ شاہکار تو ہے

بیمار سے چشمہ کہہ رہا ہے
پی، آبِ حیات بہہ رہا ہے

آغوش میں سائے کے ہو گھاٹی
ہے دور پہ دھوپ چٹ پٹاتی

اک پنچھی کے ہاتھ بھیجی پاتی،
"ہوتی جو چھما تو میں بھی آتی"

تیتر کا جواب جب نہ پایا
چہرہ غصّے سے تمتمایا

ہلکان ہوئی جو روتے روتے
سونلا گئی شام ہوتے ہوتے

دریا تھم تھم کے بہہ رہا ہے
موجوں کو سمیٹے کہہ رہا ہے

"آؤ کھو جائیں اس فضا میں
سو جائیں گلے میں ڈالے بانہیں"

گُل خطّہ ہے نقشِ زندگانی
چشمے ہیں رگیں، لہو ہے پانی

کھیتی یوں لہلہا رہی ہے
دریا کو جھُرجھُری آ رہی ہے

تاروں بھری رات گو حسیں ہے
جب ڈل کی نہیں تو ہاں نہیں ہے

جب آنکھ سے آنکھ لڑ گئی ہے
ناہید پہ اوس پڑ گئی ہے،

یہ بیچ میں پھول ہیں کنول کے
یا مانگ بھری ہے موتیوں سے

جو ریمسی ادھ کھلی کلی ہے
جھومر پہنے، اس کی کھلبلی ہے

گھاٹی میں جو گھر کہیں کہیں ہیں
گھونگھٹ میں چھپائے منہ حسیں ہیں

دوشیزہ شگوفہ یاسمن کا
چلتا ہوا سحر بھولے پن کا

گو شرم و حیا کی پتلیاں ہیں
آنکھوں میں نہاں وہ بجلیاں ہیں

جو اہلِ ہوس کو خاک کر دیں
ہر سانس میں اتنی آگ بھر دیں

نیکوں کے لئے نویدِ عشرت
صورت پہ اضافہ حُسنِ سیرت

فطرت کی چہیتی بیٹیاں ہیں،
آنکھیں جنت کی کھڑکیاں ہیں

اور شہر کی زندگی کا نقشہ؟
جو شمع ہے آہ وہ فسردہ!

تاریک فضا ہے، دل اُندھا ہے
چہرے پہ دھواں سا چھا رہا ہے

آنکھوں میں پڑے ہوئے ہیں حلقے
رخ زرد ہے بال اُلجھے، اُلجھے

رنگین خرامیاں تو کیسی — ہے موت یہاں شگفتگی کی
وہ بدلی چھپٹی وہ چاند جھانکا — درشن کرنے کو شنکرا[1] کا
تاروں کی بھی ٹکٹکی بندھی ہے — سنسار "خموش آرتی" ہے
سانسیں سینوں میں رک گئی ہیں — پھولوں کی جبینیں جھک گئی ہیں

کھلتا نہیں اس میں راز کیا ہے — موتی سرکوہ جڑ دیا ہے
ہے تیاگ کسی کا یا تپسیا — جس نے مندر کا چولا بدلا
دینے کو یہ درس ہوشمندی — انجام فنا ہے سربلندی

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

غزل : (پروفیسر) شور

جنوں قیدِ تکلم سے نکل جاتا تو اچھا تھا — ترا ہر درد اگر اشکوں میں ڈھل جاتا تو اچھا تھا
مری اک خامشی پر اتنی تنقیدیں زمانے کی — ترے ہی منہ سے اک نالہ نکل جاتا تو اچھا تھا
مرا احوال اب تک پوچھتے ہیں پوچھنے والے — اگر عنوانِ غمخواری بدل جاتا تو اچھا تھا
وہ غم جو قیدِ لفظ و صوت میں آ ہی نہیں سکتا — حدودِ اشک سے آگے نکل جاتا تو اچھا تھا
میں تنہا رہ گیا ہوں اک فضائے برق و طوفاں میں — چمن کے ساتھ ہی نشیمن بھی جل جاتا تو اچھا تھا
زمانے کی نگاہیں میری جانب اٹھتی جاتی ہیں — ترے رخ پر ترا آنچل سنبھل جاتا تو اچھا تھا

کھڑا ہوں شور اب تک منزلِ عہدِ تمنا پر،
یہ ساحل بھی تلاطم سے بدل جاتا تو اچھا تھا

غزل : سلیمان اریب

چاہتا ہوں انجمن آرائیاں ! ! — ہاں ابھی کچھ حوصلہ افزائیاں
کس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئیں — چاند کیوں لینے لگا انگڑائیاں
جیسے کوئی لہر ابھرے اور دبے — اللہ اللہ! ان کی وہ انگڑائیاں
ایک پیکر پھول بھی اور آگ بھی — میں نے دیکھی ہیں تری رعنائیاں،
ان سے تو اچھی ہے نادانی مری — گر یہی ہیں آپ کی دانائیاں،
تیرے دل کی وسعتوں کے سامنے — ہیچ ہیں آفاق کی پنہائیاں

[1] شنکرا چاریہ یا تخت سلیمان - سری نگر میں ہزار فٹ اونچی ایک پہاڑی ہے - جس پر ایک مندر واقع ہے - ہندو اور مسلمان دونوں اس پہاڑی کو مقدس مقام سمجھتے ہیں - ایک مندر کہتا ہے، ایک مسجد !

قتیل پنجابی تھا

مئی کے نگار میں جناب سید اسد علی انوری فریدآبادی کا مضمون "قتیل کا وطن" شایع ہوا ہے۔ اس کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے :۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں ذکرِ غالب کی اشاعت کے بعد جب میں نے غالب کے متعلقات پر کام شروع کیا تو قدرتاً قتیل کے خاندان و وطن کا مسئلہ بھی میرے سامنے آیا۔ اس سلسلہ میں متعدد تذکرے دیکھے لیکن مجھے مصحفی کے سوا کسی اور پر اعتبار نہیں ہوا۔ انوری صاحب فرماتے ہیں کہ مصحفی، قتیل کے وطن کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ نہ معلوم انھیں یہ غلط فہمی کیوں ہوئی۔ عقد ثریا کا جو اقتباس انھوں نے دیا ہے اس کا پہلا ہی فقرہ ہے :۔ "در اصل از نژاد قوم کھتری بھنڈاری بٹالی بودہ اند"۔ انھوں نے غور نہیں فرمایا۔ اس میں لفظ بٹالی سے ان کا وطن مراد ہے۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ میں نے دوسرے تذکرہ نگاروں پر مصحفی کے بیان کو اس لئے ترجیح دی کہ ان کے قتیل سے نہایت گہرے تعلقات تھے اور عقد ثریا بھی قتیل ہی کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ اس لئے طبعاً میں نے خیال کیا کہ اس باب میں مصحفی کی معلومات زیادہ صحیح ہوں گی۔

ٹپالی یا پٹیالی۔ ضلع ایٹہ میں ایک مختصر سا قصبہ ہے اور اس لحاظ سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا کہ اسے حضرت امیر خسرو کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میرا ذہن سب سے پہلے اسی طرف گیا لیکن جب میں نے اس جگہ تحقیق کی تو نتیجہ کوئی نہ نکلا۔ یہاں کسی کو مرزا محمد حسن قتیل کا نام تک معلوم نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے اصل میں پٹیالہ ہو جو کاتبوں کی مہربانی سے پٹیالی بن گیا ہے۔ لیکن پٹیالہ میں پوچھ گچھ کا نتیجہ بھی کچھ نہ نکلا۔ چونکہ ایک آدھ تذکرہ نویس نے لاہور کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس لئے میں نے یہاں بھی کھوج لگانے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہی ناکامی!۔ اگرچہ یہ غالب کے سلسلہ میں ایک ضمنی بحث تھی اور میرے اصل موضوع سے چنداں متعلق بھی نہ تھی کہ میں اسے اتنی اہمیت دیتا تاہم مجھے اپنی محنت کے رائگاں جانے کا افسوس ضرور تھا۔ مگر اس سے زیادہ حیرانی مصحفی پر تھی کہ اگر اس بھلے آدمی کو یقین نہیں تھا تو اس نے بٹالی کیوں لکھدیا۔

یوں جستجو کرنے کو تو میں نے پٹیالی تک کی خاک چھانی لیکن اس دوران میں ایک بات رہ رہ کے میرے ذہن میں آتی تھی کہ قتیل کا اصل وطن کہیں پنجاب ہی میں ہے اول اس لئے کہ بھنڈاری خاندان پنجاب کی پیداوار ہے دوسرے قتیل کے والد کا نام درگاہی مل۔ یہ نام ایسا ٹھیٹھ پنجابی ہے کہ میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ وہ دہلی، لکھنؤ یا فریدآباد کے رہنے والے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس ابتدائی تگ و دو کی ناکامی کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ حتیٰ کہ جنوری ۱۹۳۹ء میں نگار کا مصحفی نمبر شایع ہوا۔ اس میں ایک مضمون مشیر احمد صاحب علوی کاکوروی کا تھا جس میں انھوں نے "ید بیضا از مصحفی" کے حوالہ سے قتیل کا وطن بٹالہ لکھا تھا۔ ید بیضا کا وجود خارج میں ہے یا نہیں اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس وقت مجھے اس سے سروکار نہیں لیکن جونہی یہ پرچہ مجھے موصول ہوا میں نے بٹالہ میں ایک دوست کو خط لکھا کہ معلوم کر کے مجھے مطلع کریں کہ کیا وہاں بھنڈاریوں کے خاندان میں کوئی قتیل کو جانتا ہے اور مجھے کامیابی ہوئی۔

بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کا مشہور قصبہ ہے۔ امرتسر سے جو ریلوے لائن پٹھانکوٹ کو جاتی ہے اس پر واقع ہے اور ریلوے جنکشن بھی ہے۔ یہاں کا بھنڈاری خاندان بہت قدیم اور علم دوست خاندان ہے۔ قتیل اسی خاندان سے تھے۔

میں سب سے پہلے ان کے شجرۂ نسب کا ضروری حصہ درج ذیل کرتا ہوں :۔

باب الاستفسار

شرح کلام مومن

(جناب سید علی سجاد مرزا صاحب ۔ سہارنپور)

پچھلے مہینے جس غزل تک شرح کلام مومن کا سلسلہ پہونچا ہے اس کے آگے کے اشعار پیش کرتا ہوں ۔ توجہ فرمایئے :۔

۱ ۔ ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں — جاں دادۂ شوخ بے وفا ہوں

دونوں مصرعوں کا کیا تعلق ہے ۔ ہجراں میں زیست چاہنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے ۔

۲ ۔ اُٹ کر گئی یاد گرمجوشی — میں آتش مردہ سے جلا ہوں

یہ شعر بالکل سمجھ میں نہیں آیا، گرمجوشی کسے یاد کر گئی اور آتش مردہ سے جلنا کیا ؟

۳ ۔ کیا شکوہ جفائے آسماں کا — میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

پہلے مصرعہ کا دوسرے سے کیا تعلق ہے ۔

۴ ۔ خودبینی و بیخودی میں ہے فرق — میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

کم نما ہونا کیا معنی ؟

۵ ۔ مجھ رمز شناس سے یہ باتیں — کیا ذوب میں غیر سے بڑا ہوں

معلوم ہوتا ہے اس شعر میں بہت سے محذوفات ہیں ۔

۶ ۔ ہر دم دشمن کشمکش دست یار رہیں — بیابان کے بند کس سے گریباں کے تار ہیں

۷ ۔ کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

۸ ۔ عمر دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو — دیکھو زمان ہجر کے امیدوار ہیں

۹ ۔ شبنم خراب مہر و کتاں سینہ چاک ماہ — لو اور بھی ستمزدۂ روزگار ہیں

۱۰ ۔ شب وصل اسکے تغافل کی زہر تاب نہیں — تلخی مرگ ہے آنکھوں میں شکر خواب نہیں

مومن کو شکر خواب کی فرصت کہاں سے مل گئی ؟

۱۱ ۔ دل کا کیا حال کرے دیکھئے یہ گرمی حسن — ٹھہرتا آئینۂ رخ میں سیماب نہیں

۱۲ ۔ آہ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں — جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں

۱۳ ۔ ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

۱۴ ۔ اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال — دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

۱۵ ۔ باتیں وہ تیری ہوشربا ہیں کہ کیا کہوں — جو کوئی رازداں ہے مرا رازداں نہیں

دوسرے مصرعہ میں رازداں کا رازداں نہ ہونا کیا معنے رکھتا ہے ۔

۱۶ ۔ نومیدی جواب ہے کیوں اتنے شوق پر — یہ کیا ہوا کہ میں ہی قاصد رواں نہیں

۱۷ ۔ کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر — یہ کیا کریں کہ اس کو سر امتحاں نہیں

۱۸ - اس کو بھی جانتا ہوں فریب وصال غیر — تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں

۱۹ - اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاعِ روزگار — دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں

۲۰ - میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا — آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

۲۱ - اس بُت کی ابتدا جوانی مراد ہے — مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

(نگار) - ۱- ہجر کے زمانہ میں کوئی عاشق زندہ رہنا نہیں چاہتا، لیکن مومن ایسا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک شوخ بے وفا کے عاشق ہیں اور بیوفائی کا اثر ان میں پیدا ہونا چاہیئے۔

۲- اس شعر کے پہلے مصرعہ کو آپ نے غلط پڑھا۔ یوں پڑھیئے: "اُف کر گئی - یادِ گرمجوشی"۔ اُف کر جانا یعنی پھونک جانا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی گرمجوشی کی یاد مجھے پھونک گئی۔ گویا یوں سمجھئے کہ مُردہ آگ نے مجھے جلایا۔ مُردہ آگ اسلئے کہا کہ اب وہ گرمجوشی کہاں ہے۔ صرف اسکی یاد باقی رہگئی تھی جس نے پھونک کر رکھدیا۔

۳- میں آسماں کا شکوہ کیا کروں گا، میں خود اپنے آپ کو اس سے زیادہ بلند سمجھتا ہوں یعنی آسمان کا شکوہ کرنا میری خودداری وعالی حوصلگی کی توہین ہے۔

۴- "گم نما" ہونا یعنی اپنے آپ کو چھپانا۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو صرف خودبینی کی وجہ سے پوری طرح کسی کے سامنے نہیں آتے اور یہاں میں اپنی بیخودی کی وجہ سے خود اپنے آپ سے بھی چھپا ہوا ہوں اس لئے میں اس باب میں تم سے بڑھا ہوا ہوں۔

۵- محبوب نے مومن سے کہا کہ یہ زمانہ دوستی کا نہیں ہے۔ اسپر مومن نے کہا میں یہ باتیں خوب سمجھتا ہوں۔ کیا میں غیر سے بھی بُرا ہوں کا اسکے لئے تو زمانہ دوستی کا ہو اور میرے لئے نہیں

۶- جس طرح عاشق کے ہاتھ گریباں کو تار تار رکھتے ہیں، اسی طرح محبوب کے ہاتھ چلون کو بھی تار تار رکھتے ہیں۔

۷- محبوب جتنا زیادہ بے حجاب ہوتا ہے، اتنا ہی ہم شرم کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے۔

۸- اس شعر میں مومن نے یہ ظاہر کیا ہے زمانِ ہجر سے زیادہ طویل مدت اور کوئی نہیں ہوتی۔

۹- مومن کے صحیح رنگ کا شعر ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تنہا میں ہی ستمزدہ نہیں بلکہ شبنم بھی آفتاب کی محبت میں پریشان ہے اور کتاں بھی ماہتاب کے عشق میں سینہ چاک ہے۔ اصل مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو تعلق شبنم و آفتاب، یا کتاں و ماہتاب میں ہے وہی مجھ میں اور میرے محبوب میں ہے

۱۰- شکر خواب مومن کا نہیں، بلکہ محبوب کا مراد ہے۔

۱۱- آئینہ سیماب سے طیار کیا جاتا ہے، لیکن گرمیٔ حسن کا یہ عالم ہے کہ وہ آئینہ کے پشت پر ٹھہرتا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر مومن کو خیال آتا ہے کہ دیکھئے گرمیٔ حسن سے اس کے دل کا کیا حال ہو۔ سیماب سے دل کو تشبیہ بھی دیتے ہیں۔

۱۲- دنیا میں اب ہر جگہ تیرے غم سے فلک شگاف آہیں بلند ہوتی ہیں۔ پہلے یہ فتنے آسمان سے نازل ہوتے تھے اور اب تمھارے دور میں زمین ہی سے اُٹھتے ہیں۔

۱۳- مومن کا خاص شعر ہے۔ آشیاں کی بربادی مسلم ہے، اس لئے اگر صیاد کی نگاہ اُس طرف نہیں تو بجلی کا ڈر ہے۔

۱۴- تمھارا مجھ سے وصل میں محبت کا اظہار کرنا باعثِ خوشی نہیں ہوسکتا، کیونکہ رقیب سے تمھاری نامہربانیوں اور بے وفائیوں کا حال سُن چکا ہوں۔

۱۵- "رازداں" اس لئے رازداں نہیں کہ تیری ہوشربا باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

۱۶- شوق کا تقاضہ یہ تھا کہ قاصد کے پیچھے پیچھے مومن خود بھی ساتھ جاتے، لیکن جواب کی طرف سے اتنی مایوسی ہے کہ وہ اس کی ہمت نہ کرسکے۔

۱۷- جب محبوب کو وفا کا امتحان ہی مقصود نہیں تو پھر کس امید پر وفا کیجئے۔

۱۸- تم کہتے ہو میں بدگمان نہیں، حالانکہ اس سے مراد تمھاری صرف یہ ہے کہ میں دھوکے میں آکر وصالِ غیر کے معاملہ کو بھول جاؤں۔

۱۹- دُنیا کی باتیں میری نگاہ میں اتنی حقیر ہیں کہ مجھے اپنی ناکامیوں کا خیال بھی نہیں آتا۔

۲۰- تمھاری شوخیاں مرنے کے بعد بھی مجھے آسودہ دیکھنا نہیں چاہتیں۔ اسی لئے تم نعش پر آئے ہو۔

۲۱- جس چیز کو فتنۂ آخر زماں کہتے ہیں وہ اُس بُت کی ابتدارِ جوانی ہے۔

وقت کی باتیں

مغربی ایشیا کا قدیم ترین دروازہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے، جرمنی کے تازہ حملۂ بہار کی خبر سنکر کوہ قاف کے مورچہ کے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار "امرت بازار پترکا" میں کیا ہے، ان کا اقتباس یہ ہے :-

"اگر جرمن فوجیں کوہستان قاف کو عبور کرنے میں کامیاب ہوگئیں تو داہنے ہاتھ پر انھیں، عراق اور ترکی کی سرزمین، بائیں ہاتھ پر ہندوستان کا راستہ اور سامنے ایران ملے گا اور اگر وہ تمام موانع کو دور کرنے کے بعد شمالی ایران تک پہونچ گئیں تو اس میں شک نہیں کہ تمام مغربی ایشیا کے لئے یہ نہایت سخت خطرہ کی بات ہوگی۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جرمنی اور جاپان کے ابین کوئی مفاہمت ہوگئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس مفاہمت کی بنا پر، جاپان بحیرۂ عرب اور بحر احمر تک پہونچنے کی کوشش کرے۔

جب میں نے جریدہ ٹائمس آف انڈیا پر جرمن حملہ کی خبر سنی تو مجھے خیال آیا کہ دیکھئے تاریخ بھی کس کس طرح اور کتنی بار اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ تقریباً ... سال قبل مسیح کی بات ہے جب سیتھیا والوں (Scythians) نے اسی کوہستان قاف کی بلندیوں کو عبور کر کے سلطنت اسیریا پر حملہ کیا تھا اور وہاں اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ ہیروڈوٹس نے بھی اس حملہ کی داستان ہمیں سنائی ہے اور توریت میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

دو سو سال کے بعد سائرس اعظم کے زمانہ میں پھر اس سرزمین کو تاریخی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور شمال کی وحشی قومیں پھر قاف کے دروں سے گزر کر لوٹ مار شروع کر دیتی ہیں۔

اس کے بعد کئی صدی تک تاریخ خاموش نظر آتی ہے، لیکن پہلی صدی عیسوی میں مشہور عبرانی مورخ جوزیفس پھر مغربی ایشیا کے اس پھاٹک کا ذکر کرتے ہوئے اس کی فوجی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ اس کے کئی صدی بعد ایران کے ساسانی بادشاہوں کے زمانہ میں، روما کی فوجوں نے پھر اسی راستے سے حملے شروع کئے اور ۵۲۶ء میں، رومن جنرل بلی سیریس نے اپنی مہم اس طرف روانہ کی۔ اس حملہ کا ذکر پروکوپیس نے کیا ہے جو خود بھی فوج کے ساتھ تھا۔

کوہ قاف گویا ایک بلند دیوار ہے جس نے شمال کو جنوب سے بالکل علحدہ کر دیا ہے اور قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ایشیا پر یلغار کرنے کے لئے ہر حملہ آور کو یہ دیوار عبور کرنا پڑی ہے اور شاید اسی لئے مسیح سے ... سال قبل اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ پھاٹک بند کر کے مغربی ایشیا کو حملوں سے محفوظ کر دیا جائے۔

اگر آپ نقشہ کو دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ مشرق کی طرف بحر کاسپین واقع ہے اور مغرب کی طرف بحر اسود، اور کوہ قاف کا سلسلہ ایک کے ساحل سے شروع ہو کر دوسرے کے ساحل تک چلا گیا ہے۔ گویا قدرت نے اس پھاٹک کے درمیان ایک بلند دیوار اٹھا دی ہے۔

قدیم زمانہ میں اس دیوار کو عبور کرنے کے صرف دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو بالکل پہاڑ کے درمیان ہو کر ہے جو بعد کو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہوا۔ موجودہ نقشوں میں یہ درہ ولاڈی کاکاز اور طفلس کے درمیان دکھایا گیا ہے۔ جب سیتھیا والوں نے اسیریا پر حملہ کیا تھا تو شاید اسی راستہ سے کیا تھا۔ دوسرا راستہ پہاڑ کے مشرقی ڈھلوان حصہ کی طرف سے ہے اور بحر کاسپین کے مغربی ساحل کی طرف اس حصۂ زمین تک پہونچتا ہے جسے آذربیجان کہتے ہیں اور سائرس کے زمانہ میں شمال کی وحشی قومیں اسی راستہ سے ساحلی مقاموں پر حملہ کرتی تھیں۔

تاریخ سے یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ کب لیکن یہ بالکل یقینی ہے کہ مسیح سے بہت قبل ایک غیر معمولی انسانی کوشش اس بات کی کی گئی تھی کہ مضبوط دیوار کھڑی کر کے ان دروں کو بند کر دیا جائے۔ یہ دیوار، دیوار چین سے قبل کی چیز ہے اور اس لئے تاریخ میں اپنی قسم کی بالکل پہلی کوشش تھی۔ یہ دیوار لوہے کی بڑی بڑی سلوں سے بنائی گئی اور بجائے گارے کے پگھلا ہوا سیسہ استعمال کیا گیا تھا، اسی لئے جارجیا والے اسے اب بھی "لوہے کا پھاٹک" کہتے ہیں جس کا ترجمہ ترکی زبان میں "دمر قپو" ہے۔

یہ دیوار تو مغربی ڈھلوان کی طرف بنائی گئی تھی، لیکن مشرقی ڈھلوان کی طرف بھی ایک دیوار بنانا ضروری تھی، چنانچہ اس طرف بھی ایک دیوار طیار کی گئی جو زیادہ

لمبی تھی۔ الغرض دو دیواریں سمندر کے کنارے سے اٹھائی گئیں جن میں سے ایک دو میل لمبی تھی، اور دوسری پچاس میل۔ ان دونوں دیواروں کا فصل ساحل کے قریب ۵۰۰ گز ہے، لیکن جتنی وہ آگے بڑھتی گئی ہیں ان کا فصل کم ہوتا گیا ہے یہاں تک کہ جب یہ فصل ۲۰۰ گز کا رہ گیا تو اس جگہ ایک قلعہ بنا دیا گیا۔

دربند آذربیجان کا مشہور شہر انھیں دونوں دیواروں کے درمیان واقع ہے۔ پہلی دیوار میں کسی وقت لوہے کا پھاٹک تھا اور اسی کے اندر سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ شہر کی دوسری جانب بھی آہنی پھاٹک تھا جس سے شمالی درہ بند ہوتا تھا اور اسی لئے اس شہر کا نام ساسانیوں کے زمانہ میں دربند پڑ گیا۔

ساسانیوں کے زمانہ میں اس مقام کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کیونکہ شمال کی طرف سے حملہ کرنے والوں کی راہ میں یہی ایک بڑا زبردست قلعہ بند شہر تھا۔ چنانچہ تمام عرب مورخین وجغرافیین نے (مثلاً المقدسی والہمدانی) نے اس کا ذکر کیا ہے۔ الاصطخری، المسعودی، البیرونی اور یاقوت نے لکھا ہے کہ ساسانی بادشاہ اس مقام کو سلطنت کی کنجی سمجھتے تھے۔

جب عربوں نے اس حصہ کو ساتویں صدی ہجری میں فتح کیا تو انھوں نے بھی اس مقام کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اسے "باب الابواب" اور "الباب" کے نام سے موسوم کیا، مسعودی اور یاقوت نے اس کا نام باب الترک اور باب الخزر ظاہر کیا ہے۔

یہ دیواریں کس نے طیار کیں۔ تاریخوں کے بیانات اس باب میں بہت مبہم اور مجمل ہیں۔ بعض نے "خسرو انوشیرواں" کا نام بتایا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہو سکتا کیونکہ جوزیفس نے خسرو سے ۵۰۰ سال پہلے ان دیواروں کا ذکر کیا ہے اور پروکوپیس نے ۵۲۲ء میں خود ان دیواروں کے دیکھنے کا حال لکھا ہے۔ انوشیرواں کا زمانہ تمام مورخوں نے ۵۳۱ء اور ۵۷۹ء کے مابین متعین کیا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دیوار انوشیرواں کی بنوائی ہوئی نہیں ہے۔

جوزیفس اور پروکوپیس کا خیال ہے کہ یہ دیوار سکندر اعظم نے بنوائی تھی، لیکن تاریخی شہادتیں اس کے بھی خلاف ہیں۔ میرے نزدیک یہ دیواریں سائرس اعظم نے ۵۲۹ - ۵۵۹ ق۔م میں طیار کرائی تھی ہو سکتا ہے کہ ساسانیوں نے ان کی مرمت کرائی ہو۔ اور انوشیرواں نے ان کو از سرِ نو تعمیر کرایا ہو۔

دربند کی دونوں دیواریں اٹھارویں صدی کے اخیر تک پائی جاتی تھیں۔ ایک روسی سیاح نے ۱۷۹۶ء میں خود ان کو دیکھا تھا اور اپنی کتاب میں انکا حال لکھا تھا، لیکن جب ولیم جیکسن سنہ ۱۹۰۳ء میں یہاں گیا تو ایک دیوار کے آثار مٹ گئے تھے اور دوسری باقی تھی۔ اس کے پانچ سال بعد جب میں گیا تو میں نے بھی یہ آثار دیکھے۔ آذربیجان کے مشہور پٹرولی چشمے دربند کے قریب واقع ہیں اور باکو انھیں کے جنوب میں ہے۔ باکو کا اصل نام بادکوبہ تھا (یعنی ہوا کا تباہ کیا ہوا شہر) قدیم ایرانی اس حصۂ زمین کو "آذر پایگاں" کہتے تھے کیونکہ یہاں کی پٹرول ملی ہوئی مٹی، خشک لکڑی کی طرح فوراً آگ پکڑ لیتی تھی (آذر بایگاں کے معنے ہیں "آگ کا مقدس استھان") - عربوں نے اس کو آذربیجان کر دیا۔

زمانہ کے انقلابات نے قاف کے ان دشوار گزار دروں اور راستوں میں بھی بہت سے تغیرات پیدا کر دئے ہیں چنانچہ وہ راستے جو آہنی دیواروں سے بند کر دئے گئے تھے اب وہاں رات دن ریلیں چلتی ہیں جو سیکڑوں مسافروں کو پہاڑ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچاتی رہتی ہیں۔

قاف کا اندرونی حصہ تفرج گاہوں، صحت گاہوں اور معدنی چشموں کی دولت سے بھرا پڑا ہے اور زار کی حکومت کے زمانہ میں جتنی بے توجہی اس طرف اختیار کی گئی تھی، اس کی پوری تلافی اب سوویٹ حکومت نے کر دی ہے۔

اگر جرمن فوجیں اس طرف آئیں تو وہ کدھر سے آئیں گی، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ آسان راستہ دربند ہی کا ہے۔

حُر جماعت کے تفصیلی حالات

پچھلے مہینے ہم نے اس جماعت کی بابت ایک مختصر سا نوٹ شایع کیا تھا جو بہت مبہم اور غیر واضح تھا۔ چونکہ اسوقت یہ جماعت جو سندھیوں اور بلوچیوں پر مشتمل ہے عام توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اس لئے ہم ذرا تفصیل کے ساتھ اس کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ پیروں کے جس ادارے سے اس جماعت کا تعلق ہے اُس کا سلسلہ محمد قاسم فاتح سندھ کے زمانہ سے ملتا ہے۔ لیکن جس زمانہ سے ان کو حُر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اُس کی ابتدا پچھلی صدی کے وسط سے شروع ہوئی۔ یہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں کہ سندھ میں ایک مقام کنگری ہے اور وہی اس ادارے کا مرکز رہا ہے۔ جب پچھلی صدی میں حزب اللہ شاہ کنگری میں اپنے باپ کے جانشین قرار پائے تو انھوں نے ضلع حیدرآباد میں اپنا خلیفہ ایک شخص غلام نبی کو مقرر کیا، لیکن ضلع حیدرآباد کے دوسرے حصہ میں حزب اللہ شاہ کے عم زاد بھائی پیر فضل اللہ شاہ بہت پہلے سے اپنا اثر جمائے ہوئے تھے، اور اپنی پرہیزگاری خوش بیانی

رجسٹرڈ نمبر ۱۷۶۶ھ

قیمت فی کاپی ۸ر

چندہ سالانہ صہ ر

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲	فہرست مضامین، ستمبر سنہ ۴۲ء	شمار ۳

ملاحظات ۳

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر .... سید حکیم احمد نقوی ۵

الحق — اور — سیماب .... اعجاز صدیقی ۱۱

بادر پچم (دو ہواؤں کا تصادم) ۲۰

سائنس کے کرشمے، شعبدے ۲۴

مکتوبات نیاز ۲۸

جنگ کے دہشت انگیز مصارف ۳۲

باب الاستفسار ۳۴

جاسوسی کے علمی طریقے ۳۵

منظومات — مرزا جعفر علی خاں اثر۔ جمال۔ مظفر۔ اثر رحمانی۔ رمزی ۳۷

ملاحظات

رفتار جنگ

نتیجہ کے لحاظ سے ہم ابھی تک اسی جگہ ہیں جہاں پچھلے مہینے تھے، لیکن جنگ کی شدت کے لحاظ سے اگست کا مہینہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس دوران میں سرزمین قفقاز میں جو رن پڑے ہیں وہ دنیا کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے

سباسٹپول کے بعد سب سے بڑا معرکہ جرمنی کے [illegible] تاکہ وہ دریائے ڈون کو عبور کرکے اس میدان میں آجائے جو استراخان، اسٹالن گراڈ اور رسٹوف کے درمیان ایک مثلث بناتا ہے اور ہرچند [illegible] کے ان نقصانات کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اس مہم میں اسے اٹھانا پڑے [illegible] پھر کسی نہ کسی طرح [illegible] دریائے ڈون کے [illegible] جو اسٹالن گراڈ سے قریب تر واقع ہے [illegible] تک پہونچ گئی ہیں جو اسٹالن گراڈ کی حفاظت کے لئے قایم کئے گئے تھے اور شہر تک کا فاصلہ ہر ساعت کم ہوتا جارہا ہے

روس جس جرأت و دلیری سے دشمن کا مقابلہ کر رہا ہے، وہ بھی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہنے والی چیز ہے، لیکن جرمنی کی بری و فضائی فوج کی کثرت اور بڑھی ہوئی میکانکی قوت کا مقابلہ آسان نہ تھا اور یقیناً یہ سرخ افواج کی تنظیم و اخلاقی برتری کا معجزہ ہے کہ اس نے مہینوں تک جرمن افواج کو دریائے ڈون عبور کرنے سے باز رکھا اور اب بھی کہ وہ اس دریا سے گزر کر اسٹالن گراڈ کے حدود میں داخل ہو چکی ہیں، ایک ایک انچ پر ہزاروں جانوں کا خراج ان سے وصول کیا جا رہا ہے

اس میں شک نہیں کہ اسٹالن گراڈ جتنا قریب ہوتا جا رہا ہے، جرمن افواج کو اتنی ہی سخت مقاومت سے واسطہ پڑتا جاتا ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ جس طرح پچھلے سال، ماسکو اور لینن گراڈ کے سامنے جرمن اقدامات روک دئے گئے تھے، اسی طرح اسٹالن گراڈ کے سامنے بھی روک دئے جائیں گے۔ کیونکہ سردی شروع ہونے کو ابھی کم از کم ڈیڑھ مہینہ باقی ہے اور اتنی مدت تک جرمنی کے سیلاب آہن و آتش کو روکے رکھنا آسان نہیں۔

پھر اگر اسٹالن گراڈ روس کے ہاتھ سے نکل گیا، تو اس میں شک نہیں کہ روس کے محاذ پر جرمنی کا پلہ بہت بھاری ہو جائے گا اور اگر آیندہ موسم سرما تک وہ کوئی اور اقدام نہ کر سکا تو بھی وہ اپنی اس کامیابی سے بڑا فایدہ حاصل کر لیگا اور روسی فوجیں اس استفادہ سے اسے باز نہ رکھ سکیں گی

اسٹالن گراڈ اور استراخان کی اہمیت کا ذکر ہم پچھلے مہینے کے ملاحظات میں کر چکے ہیں اور اگر آپ نقشہ اٹھا کر دیکھیں گے تو آپ خود اس اہمیت کا اندازہ کر سکیں گے۔ روس کا جنوبی حصہ جسے قفقاز کہتے ہیں، اس حصۂ زمین کا نام ہے جو بحر اسود اور بحر کاسپین کے درمیان واقع ہے اور جس کی چوڑائی [illegible] اور ۵۰۰ میل کے درمیان ہے۔ یقیناً یہ کوئی بڑا حصۂ زمین نہیں، لیکن اس کی جغرافی و سیاسی پوزیشن بڑی اہم ہے۔ ہرچند یہ علاقہ کوہستانی ہے [illegible] معدنی دولت [illegible] سے مالا مال ہے۔ اس قطعۂ زمین میں اس قدر کثرت سے دریا پائے جاتے ہیں کہ بحر اسود اور بحر کاسپین کا تعلق خشکی و تری دونوں طرف سے بہت آسان ہو گیا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ ان دونوں سمندروں کے ساحلوں پر ریلوے لائن بھی پائی جاتی ہے اور بحر اسود و بحر کاسپین کے درمیان ایک بڑی چوڑی سڑک بھی موجود ہے

پٹرول کی پیداوار کے لحاظ سے امریکہ کے بعد قفقاز ہی کا مرتبہ ہے یہی حال ان دوسری معدنی پیداواروں کا ہے جو جنگ کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں اور یہ بالکل واقعہ ہے کہ جرمنی کا قفقاز کی طرف اقدام صرف پٹرول حاصل کرنے کے لئے ہے جس کی کمی کو وہ اب بری طرح محسوس کر رہا ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو اس میں بھی شک نہیں کہ جنگ جاری رکھنے کے لئے اس کو بڑا ذریعہ ہاتھ آجائے گا

لیکن نقشہ دیکھنے سے یہ بات مشکل سے سمجھ میں آئے گی کہ قفقاز کو اسٹالن گراڈ سے کیا واسطہ ہے اور جرمنی کیوں سیدھا قفقاز تک نہیں بڑھا

بات یہ ہے کہ جنگ کا اولین اصول حملہ کرنا نہیں، بلکہ فریق مقابل کے ذرایع کمک اور وسایل نقل و حرکت پر قابض ہونا ہے۔ پھر چونکہ بحر کاسپین اور دریائے والگا کے ذریعہ سے ماسکو، لینن گراڈ اور قفقاز تک پورا سلسلہ نقل و حرکت کا پایا جاتا ہے، اس لئے جرمنی کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس سلسلہ کو درمیان سے قطع کر دے تاکہ ماسکو کی طرف سے کوئی مدد قفقاز کو نہ پہونچ سکے

دریائے والگا اتنا اہم دریا ہے کہ اگر ہم اسے روس کی شہ رگ سے تعبیر کریں تو غلط نہ ہوگا، اس کی لمبائی ۲۳۲۵ میل ہے اور ماسکو و لینن گراڈ کے درمیان کوہستان والڈائی سے نکل کر اسٹالن گراڈ ہوتا ہوا بمقام استراخان بحر کاسپین میں گرتا ہے اور علاوہ ان متعدد نہروں کے جو اس دریا سے نکل کر روس کے وسطی و شمالی علاقوں تک پہونچی ہیں، خود یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ استراخان سے لیکر لینن گراڈ تک اس میں برابر اسٹیمر چلتے ہیں اور اس طرح اس دریا نے تمام قفقاز کے علاقہ کو مرکزی حکومت سے قریب تر کر دیا ہے۔ پھر چونکہ دریائے والگا اسٹالن گراڈ ہی سے ہو کر گزرتا ہے اس لئے جرمنی نے شمالی و جنوبی روس کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے بے تعلق کرنے کے لئے اسٹالن گراڈ پر حملہ کیا، کیونکہ اس شہر پر قابض ہو جانے کے بعد استراخان کی ساحلی اہمیت مفقود ہو جاتی ہے اور بحر کاسپین کے تمام ساحلی مقامات مع قفقاز کے علاقہ کے مرکزی حکومت سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے میں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر اسٹالن گراڈ روسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو یہ بڑی سخت ضرب ہوگی اور جرمنی اس سے فایدہ اُٹھا کر جنگ کو کافی عرصہ تک جاری رکھنے کے قابل ہو جائے گا

ہر چند قفقاز کی حفاظت کے لئے بحر اسود کے بعض ساحلی مقامات ابھی تک روس کے قبضہ میں پائے جاتے ہیں، لیکن آپ نے خبروں سے یہ بھی معلوم کیا ہوگا کہ جرمن افواج جنوب کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ جنوب سے مراد بحر اسود کا ساحلی حصہ ہے، اس لئے اگر نازی فوجیں ایک طرف اسٹالن گراڈ کی جانب بڑھ رہی ہیں اور دوسری طرف سواحل بحر اسود کی طرف، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قفقاز کے تمام امکانی ذرایع امداد کو بند کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں اور ان کی یہ چال کوئی معمولی چال نہیں ہے

بہر حال اگر اسٹالن گراڈ فتح ہو گیا، تو پھر قفقاز کی مدافعت کا سارا بار اُن اتحادی فوجوں پر پڑ جائے گا جو ایران و عراق میں مجتمع ہیں اور اگر ہمارا یہ خیال غلط نہیں کہ اتحادی طیاریاں ایران و عراق میں بڑی زبردست ہیں تو پھر یہ معرکہ بھی کوئی معمولی معرکہ نہ ہوگا اور نازیوں کے پاس اس کا کوئی علاج نہ ہوگا کہ وہ ہندوستان اور خلیج فارس کی طرف سے پہونچنے والی کمک کو روک سکیں

ان حالات میں یہ کہنا مشکل ہے کہ آیندہ سرما تک نازیوں کا اقدام کوئی ایسی صورت اختیار کر سکے گا کہ جنگ قفقاز کسی فیصلہ کن منزل تک پہونچ جائے لیکن اسی کے ساتھ جرمنی کو اس کے مقبوضہ علاقہ سے نکالنا بھی روس کے لئے ناممکن ہو جائے گا

بہر حال اس وقت تو یہ لڑائی ایران کی سرحد تک پہونچتی معلوم نہیں ہوتی اور غالباً سال آیندہ کی گرمیوں تک پھر دنیا کو دور انتظار و تذبذب سے واسطہ پڑنے والا ہے، جو انسانی دماغ و اعصاب کے لئے جنگ سے زیادہ تباہ کن ہے۔ ہاں، اگر اس دوران میں مصر کی جنگ پھر شروع ہو گئی، جس کے امکانات روز بروز قوی ہوتے جاتے ہیں، تو اُس جنگ کا پس منظر جو ایشیا کی سرزمین پر چھڑنے والی ہے، البتہ زیادہ واضح ہو جائے گا اور پھر موسم سرما میں دونوں طرف سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانے کا اندیشہ بھی جاتا رہے گا

مسٹر چرچل اور اسٹالن

اگست کے تمام واقعات میں سیاسی حیثیت سے اہم ترین واقعہ مسٹر چرچل کا سفر کریملن تھا۔ مسٹر چرچل کا مصر کے مورچوں کا معائنہ کرتے ہوئے اسٹالن سے ملنے کے لئے ماسکو تک پہونچنا اس وقت تک ظاہر نہیں ہوا جب تک وہ واپس نہیں آ گئے، لیکن جب وہ واپس آ گئے تو پھر یہ راز راز نہ رہا کہ اس سفر کا بڑا مقصود دوسرے محاذ کے قیام کے متعلق اسٹالن کو اطمینان دلانا تھا۔ چنانچہ مسٹر چرچل اور اسٹالن کے درمیان یہ گفتگو جاری ہی تھی کہ برطانیہ نے ساحل ڈیپ پر فوجیں اُتار کر دوسرے محاذ کی داغ بیل ڈال ہی دی

مغربی ساحل فرانس کا بڑا حصہ اس وقت جرمنی کے قبضہ میں ہے اور ڈیپ اسی ساحل کا ایک اہم مقام ہے جہاں برطانوی فوجیں صرف یہ دیکھنے کے لئے اُتاری گئی تھیں کہ دوسرا محاذ قایم کرنے کے لئے اتحادیوں کو کیا کیا طیاریاں کرنا ضروری ہیں

یہ شگون کس حد تک مُبارک ثابت ہوا، اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس وقت تک جو خبریں موصول ہوئی ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ فرانس اور بلجیم کے ساحلوں پر جو جرمنی کے قبضہ میں ہیں، اتحادی حملہ کا واقعیت کی صورت اختیار کر لینا اگر ناگزیر نہیں تو محال بھی نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ سنہ ۴۲ء میں ہم کو اس جدید محاذ کی بھی دلچسپ خبریں سننے میں آئیں

جاپان اور بحر پاسفک

بحر پاسفک میں جزایر سلیمان کے آس پاس جاپانیوں کو جو نقصانات حال ہی میں اُٹھانا پڑے ہیں اُن سے ہم اس نتیجہ پر تو نہیں پہونچے کہ بحر پاسفک سے زرد خطرہ دور ہو گیا ہے، لیکن اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا وہ جارحانہ اقدام جس کی خوشخبری ہمیں پچھلے سال سنائی گئی تھی شاید شروع ہو گیا ہے، اور اگر چین کی یہ خبریں صحیح ہیں کہ جاپان کو وہاں سخت نقصان اُٹھانا پڑ رہا ہے تو پھر ہمیں بہت کم پس و پیش کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ جاپان کی پہلی دوڑ ختم ہو چکی ہے اور دوسری دوڑ میں اس کے حریفوں کا اندازہ زیادہ نبرد آزما نظر آتا ہے

اس دوران میں کئی بار یہ خبر سننے میں آئی کہ جاپان، سائبیریا کی طرف سے روس پر حملہ کرنے کی طیاریاں کر رہا ہے، لیکن یہ خبریں ہمیشہ چینی ذرایع سے آئی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ان کی بنیاد واقعہ سے زیادہ احتیاط و اندیشہ پر قایم ہو، کیونکہ جاپان کے سامنے فتوحات میں اضافہ کرنے سے زیادہ اہم سوال موجودہ مقبوضات پر اقتدار قایم رکھنے کا ہے اور وہ بحر پاسفک سے اپنی توجہ کسی اور طرف ہٹا ہی نہیں سکتا، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ امریکی طیاریاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور آسٹریلیا و ہندوستان کی طرف جاپانی اقدام امید موہوم سے زیادہ نہیں - ہاں اگر چینیوں کے نزدیک جاپانی قوت واقعی اتنی زبردست ہے کہ وہ بیک وقت بحر پاسفک پر بھی چھائی رہ سکتی ہے اور سائبیریا پر بھی حملہ کر سکتی ہے تو پھر روس سے زیادہ چینیوں کو اپنی فکر کرنا چاہئے، کیونکہ جس طرح جرمنی کے سامنے اب صرف روس کا سوال ہے، اسی طرح جاپان کے سامنے چین کا ہے اور انھیں دونوں جگہ اس لڑائی کا فیصلہ ہونا ہے

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پچھلے پانچ سال میں چین نے جس بری طرح جاپان کو اُلجھائے رکھا ہے، وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ چین کے ذرایع مدافعت پر اس دوران میں کافی اثر پڑا ہے — ایک طرف روس کا اپنی مصیبت میں مبتلا ہونا، دوسری طرف برما کی سڑک ہاتھ سے نکل جانا، یہ دونوں واقعے ایسے ہیں جنھوں نے برطانیہ و روس دونوں طرف سے چین کی امداد کے ذرایع کو بہت تنگ کر دیا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس نقصان کی تلافی کی کیا کیا امکانی صورتیں اتحادیوں نے سوچی ہیں اور ان پر کس حد تک عمل ہو سکتا ہے -

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

قدیم فارسی قدیم فارسی وہ زبان ہے جو شاہانِ ہخمنی بولتے تھے یعنی یہ زبان بہمن داراب اور دارا کی زبان ہے۔ اس خاندان کے بادشاہوں کا عہد ۵۵۰ ق۔م۔ سے شروع ہوا اور ۳۳۰ ق۔م میں سکندر کے ہاتھوں ختم ہوا۔ اس زمانہ کی کوئی تصنیف کتاب کی شکل میں موجود نہیں ہے البتہ کوہ بہیستون اور کے پرانے محلوں پر چند کندہ عبارتیں پائی گئی ہیں جو شاہانِ وقت نے لکھوائی ہیں۔ یہ کتبے پہلے نقش و نگار سمجھے جاتے تھے۔ لیکن محققین فرنگ نے اب ان معموں کو حل کر لیا۔ صرف چار سو مختلف الفاظ پر مشتمل ہیں۔ اس زبان کا رسم الخط عسوری کتابت سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے اور اس کے حروف تہجی اس مخروطی شکل کے ہیں جس کو خط میخی کہتے ہیں۔ حروف کی تعداد اکتالیس ہے۔ اس زبان کا ایک فقرہ نمونہ کے طور پر درج کیا جاتا ہے:۔

"دارایاوُش۔ شائے تہیہ۔ وِزرکَ۔ شائے تہیہ نام۔ شائے تہیہ۔ دہ یونام۔ وِشتاسپہیہ۔ پُترا۔ ہاکھانشیہ۔ ہیا۔ اِمَم۔ تچرم۔ اکُوناش" (کتبۂ کھنڈرات قدیم شہر پارس)

ترجمہ:۔ "دارا۔ شاہ اعظم۔ شاہان شاہ۔ شاہِ ممالک۔ پسرِ وِشتاسپ ہخمنی۔ جس نے یہ عبادت گاہ بنائی"

عسوری اور قدیم فارسی کے رسم الخط میں اہم فرق یہ ہے کہ عسوری زبان میں ایسے حروفِ تہجی موجود نہ تھے جن کا صوت سے تعلق ہو۔

آوستا کی زبان کتاب آوستا کی زبان قدیم فارسی کی بہن سمجھی جاتی ہے۔ قدیم فارسی کی یادگار صرف چند کتبے اور گنتی کے الفاظ باقی رہ گئے ہیں لیکن آوستا کی زبان کتاب کی صورت میں اب بھی دستیاب ہے۔ اسلام کی اشاعت سے قبل کل ایران کا مذہب زردشتی تھا زردشت کا کچھ حال قوم میڈ کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ قوم میڈ کے فرقہ مجوس کی اس شاخ میں جس کو آتھ روان یا آتش رُواں کہتے ہیں ایک شخص پیدا ہوا جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور کتاب آوستا پیش کر کے نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ میکس مُلر سنسکرت کا ایک مشہور محقق گزرا ہے۔ اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابتداءً آریہ اقوام پنجاب میں داخل ہوئیں اور کسی بعد کے زمانہ میں ایک فرقہ مذہبی اختلافات کی بنا پر علیحدہ ہو کر ایران چلا گیا اور وہاں ہندی آریوں کے عقاید اور اصولوں کے برعکس نئے مذہب کی بنیاد قایم کی گئی۔ مثلاً ہندی آریہ دیو یا دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے لیکن زردشت نے ایران میں دیو کو شیطان کا قایم مقام قرار دیا چنانچہ سنسکرت میں دیو نورانی پیکر کے معنی میں مستعمل ہے مگر فارسی میں اس کے معنی برعکس ہیں۔ اسی طرح "آسُر" سنسکرت میں شیطانی ہستی کے معنی دیتا ہے لیکن یہی لفظ "آہور" فارسی میں نورانی ہستی کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مگر میکس مُلر کی یہ رائے قابلِ تسلیم تصور نہیں کی گئی ہے اور رد کر دی گئی ہے۔ بعض لوگ شروع سے زردشت کی ہستی ہی کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کی شخصیت کو فرضی قرار دیتے ہیں لیکن یہ خیال بھی قابل وقعت نہیں مانا جاتا اور مجموعی طور پر محققین زردشت کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس بارہ میں پھر اختلاف عظیم ہے کہ زردشت کی بعثت کس زمانہ میں ہوئی۔ بعض کے نزدیک زردشت کا زمانہ عیسیٰ سے پندرہ سو یا دو ہزار سال قبل کا ہے مگر ایسے محققین جن کو اپنے جذبات پر قابو ہے شہادت کی بنیاد پر یہ رائے قایم کرتے ہیں کہ زردشت کی پیدائش ۶۶۰ء اور ۵۸۳ ق۔م کے درمیان ہوئی۔ مقام پیدائش کے متعلق بھی اختلاف ہے لیکن مرجح رائے یہ ہے کہ زردشت کا پیدائشی علاقہ آذربائیجان ہے۔ اور یہ کہ وطن میں کامیابی نہ ہونے کی وجہ سے زردشت کو علاقہ باختر میں جانا پڑا۔ باختر میں بلخ کے ایک بادشاہ وِشتاسپ نامی نے اس نئے مذہب کو قبول کیا اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قوم میڈ کی حکومت قایم تھی اور ہنوز ہخمنی سلطنت کا دور کردش کی سرکردگی میں شروع نہیں ہوا تھا۔ کتاب آوستا زردشت سے منسوب کی جاتی ہے اور الہامی کتاب مانی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مذہب کردش کے بعد کے زمانہ میں ہخمنی سلطنت میں پھیل گیا اور سارے ملک ایران کا مذہب آتش پرستی ہو گیا۔ یہاں یہ نکتہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شاہنامہ میں کیخسرو کے غائب ہونے کے بعد لہراسپ و گشتاسپ و اسفندیار کا سلسلہ جوڑ دیا گیا ہے۔ لہراسپ و گشتاسپ کی داستان فردوسی کے شاہنامہ سے پہلے مرتب ہو چکی تھی اور اس میں لہراسپ کو خدا پرست ظاہر کیا گیا ہے اور آتش پرستی کے رواج کو گشتاسپ و اسفندیار سے متعلق کیا گیا ہے۔ نیز ان دونوں بادشاہوں کا دارالسلطنت بھی شہر بلخ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس روایت سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے جو ابھی بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ بلخ کے کسی بادشاہ وِشتاسپ یا گشتاسپ نامی نے زردشت کو پیغمبر تسلیم کر کے اس کا مذہب قبول کیا اور بعد میں یہ نیا مذہب ہخمنی سلطنت کے زمانہ میں سارے ایران میں پھیل گیا۔

تحقیق کے طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ جب اس مذہب کی اشاعت ہوئی اُسوقت شاہانِ اخمنی کے زمانہ تک یعنی سکندر کے حملہ تک آوستا کتاب کی شکل میں موجود تھی لیکن پارسی روایات کہتی ہیں کہ بیلوں کے چمڑے پر آبِ زر سے لکھا ہوا مکمل نسخہ شاہانِ اخمنی کے خزانہ میں موجود تھا جو سکندر کے حملہ میں بالکل تلف ہوگیا۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ زردشت کے زمانہ یا اخمنی حکومت کے زمانہ کی کوئی کتاب اس وقت موجود نہیں ہے۔ جو کتاب اس وقت رائج ہے اُس کی ترتیب و تالیف عیسیٰ سے پچاس ساٹھ سال بعد اشکانی حکومت نے شروع کی اور ۳۰۹ء تک ساسانی حکومت کے اہتمام میں جاری رہی۔ اس نسخہ کو ساسانی نسخہ کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی اس وقت مکمل صورت میں موجود نہیں۔ اُس کے صرف چند اجزا باقی ہیں۔ عام طور پر کتاب کا نام آوِستا ہے اور اُس کی زبان آوستی زبان کہتے ہیں۔ کوئی خاص نام اُس زبان کا نہیں ہے اس ایک کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کتاب یا کتبہ اُس زبان میں ہے۔ لفظ آوستا کا سُراغ بھی ساسانی زمانہ سے پیشتر نہیں چلتا۔ البتہ ایک فرنگی محقق نے یہ رکیا ہے کہ اخمنی بادشاہ دارا یا وش کے کوہ بیستون والے کتبہ میں لفظ آبستام مستعمل ہوا ہے۔ اُسی سے لفظ آوستا ماخوذ ہے۔ پہلوی کتابوں میں یہ لفظ ر آپستاک تحریر ہوا ہے۔ شامی زبان میں آپستاغ لکھا ہوا ہے اور عربی میں اَبستاق۔ ایک دوسرے محقق نے اپنی رائے یہ ظاہر کی ہے کہ لفظ مذکور ی کے لفظ اُوپِستا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں 'امداد' یا 'سہارا'۔

اس زبان کا رسم الخط قدیم فارسی اور پہلوی سے مختلف ہے۔ حروف تہجی کی تعداد اُنتالیس بیان کی جاتی ہے جن میں سے تیرہ حروف علت ہیں۔ تحریر دائیں جانب سے بائیں طرف کی جاتی ہے اور الفاظ کی ترکیب میں پورے حروف بغیر ملائے ہوئے لکھے جاتے ہیں۔ الفاظ کے دو نمونے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

لفظ ـــ دہ ملیلے یا ما ــــــ لفظ ـــ [illegible]

تلفظ ـــ اَرشیمُ ــــــ تلفظ ـــ وُوُ ہُوُ

قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کتاب میں تین لاکھ سینتالیس ہزار الفاظ تھے لیکن اُن میں سے اس وقت صرف تراسی ہزار موجود ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کل کتاب آوستا اکیس جلدوں پر مشتمل تھی جن کو نسک کہتے ہیں۔ بہ اعتبار نوعیتِ مضمون یہ جملہ نسک تین برابر کے حصوں پر منقسم تھے لیکن اس ساری کتاب کی جان ایک آیت یا شعر سمجھا جاتا ہے جس کو 'آہُون وِیریہ' کہتے ہیں۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ رگ وید میں اسی طرح ایک اشلوک ہے جس کو 'گاتیری' کہتے ہیں اور جس کو کل وید کی روح خیال کیا جاتا ہے۔ اپنی دیگر مذہبی کتابوں میں اہل ہند اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور لفظ 'اوم' میں کائنات کا تمام راز اور خالق و مخلوق کی پوری حقیقت مخفی ہونا تصور کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کے حروف مقطعات خیال کئے جا سکتے ہیں۔ نیز وہ روایت جو حضرت علیؑ سے منسوب ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ قرآن شریف کی کنجی سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ فاتحہ کا خلاصہ بسم اللہ ہے۔ بسم اللہ کا راز بائے بسم اللہ میں پنہاں ہے۔ بائے بسم اللہ کی حقیقت کا جامع اُس کا نقطہ ہے اور حضرت علی وہ نقطہ ہیں۔ بابی فرقہ نے اسی نقطہ کو جامۂ الوہیت سے ملبوس کر دیا ہے اور اپنے پیشواؤں کو اسی لقب سے اپنی کتابوں میں یاد کیا ہے۔

اسوقت جو آوستا موجود ہے وہ مشتمل ہے صرف ایک مکمل نسک پر جس کو 'وِینْدِیداد' کہتے ہیں۔ چار نسک ایسے ہیں جن کے کچھ اجزا اُس جلد میں شامل ہیں جن کو یَسن کہتے ہیں۔ باقی سولہ نسک کے بہت مختصر اجزا کہیں کہیں پہلوی کتابوں میں نظر آجاتے ہیں ورنہ سب ضایع ہو چکے ہیں۔ موجودہ شکل میں آوستا مندرجہ ذیل حصوں میں منقسم ہے:-

(۱) یَسنہ ـ اس حصہ میں بہتّر ابواب (ہائتی یا ہا) ہیں۔ یہی تعداد اُن دھاگوں کی ہے جن سے 'کُشتی' (زنّار) بٹی جاتی ہے۔ جس طرح ہندوؤں میں جنیئو پہنایا جاتا ہے اور بچہ ہندو مذہب میں داخل کیا جاتا ہے اُسی طرح پارسیوں میں کشتی پہنانے کی وہ رسم ہے جس کے ذریعہ سے بچہ مذہب زردشتی میں داخل ہوتا ہے۔ اس حصہ میں وہ تمام بھجن درج ہیں جو فرشتوں اور روحانی ہستیوں کی حمد میں گائے جاتے ہیں۔ اسی حصہ میں وہ قدیم جزو شامل ہے جس کو 'گاتھا' کہتے ہیں۔

(۲) وِسپرِدَ ـــ اس میں تقریباً ستائیس باب (کَرْدَ) ہیں۔ یہ حصہ بطور خود کوئی مستقل یا مسلسل کتاب نہیں ہے بلکہ وہ مجموعہ ہے ایسے اوراد و وظائف اور نغموں کا جو ضمنی طور پر یَسن سے متعلق ہیں، اور اُس کے ساتھ عبادت کے وقت استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

(۳) وِنْدِیداد ـــ اس میں بائیس باب (فَرگَرْدَ) ہیں۔ اس کو ایسا سمجھنا چاہئے کہ یہ زردشتیوں کے مذہبی قانون یا فقہ کی کتاب ہے۔ اس میں مذہبی

طہارت ۔ کفارہ ۔ ریاضت ۔ مجاہدہ ۔ نفس کُشی کے عقاید کا اور اُن مراسم کا اندراج ہے جو اُمور مذکور سے متعلق ہیں ۔ اسی کتاب کے پہلے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُہُر مُزد (آہُورمَزد) نے یکے بعد دیگرے کون کون سی نیک چیزیں پیدا کیں اور اُس کے برعکس اہرمن (آنگرومنش) نے اشیاء مذکور کے مقابلہ میں کیا کیا بدی خلق کی ۔ آہورمزد کی تخلیق کے سلسلہ میں جن مقامات کے نام گنائے گئے ہیں اُن میں نمبر ۱۵ پر ہپتہ ہِندُو (سات دریا) یعنی پنجاب کا نام بھی درج ہے ۔ محققین نے اس امر کے متعلق بہت رائے زنی کی ہے کہ جس سلسلہ سے مقامات کے نام اِس کتاب میں درج ہیں اُسی کے مطابق یہ سمجھنا چاہئے کہ اقوام آریہ ایران میں داخل ہونے کے بعد ایک مقام سے دوسرے مقام تک آگے بڑھی ہیں ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا علاقہ وہ ہے جس کو اب آذربائجان کہتے ہیں اور جس کو آوستا میں 'ایران واِجُو' لکھا گیا ہے ۔

(۴) یَشت ـــــ یہ تعداد میں اکیس ہیں اور اُن میں اُن فرشتوں اور روحانی ہستیوں کے حمد کے بھجن درج ہیں جن کو اشماسپند اور ایزد کہتے ہیں ۔ آوستا میں مہینہ تیس دن کا قرار دیا گیا ہے ۔ اخیر سال پر پانچ دن اور بڑھا دئے جاتے ہیں ۔ مہینہ کے ہر دن کے لئے ایک ایزد یا اشماسپند نامزد ہے اور دن کا نام بھی اُسی ایزد یا اشماسپند کے نام سے قایم ہوتا ہے ۔ مہینہ میں کوئی ہفتہ کا دن مقرر نہیں ہے بلکہ ہر ماہ کا جو پہلا دن ہوتا ہے وہ تیوہار کے طریق پر مانا جاتا ہے ۔ اور مہینہ کا نام بھی اُسی روحانی ہستی کا نام ہوتا ہے جو اُس دن کے لئے نامزد ہے ۔ بابی مذہب میں بھی مہینوں اور دنوں کا حساب اسی طرز پر قایم کیا گیا ہے ۔ یعنی ۱۹ دن کا مہینہ اور ۱۹ مہینوں کا سال مقرر ہے اور اُن میں کوئی ہفتہ کا دن مقرر نہیں ہے ۔ آوستی اور بابی ترتیب میں تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ بابی مذہب میں دن اور مہینوں کے نام صفات الٰہی سے منسوب کئے گئے ہیں اور اُن کے نام جُدا جُدا ہیں ۔ آوستی مذہب میں دن اور مہینوں کے نام ایک ہی ہیں اور اُن روحانی ہستیوں سے منسوب ہیں جو خدائی دربار میں عملہ کے طور پر متعین ہیں تقریباً اُسی طرح جس طریق پر عام مسلمانوں کے ذہن میں فرشتوں کے طبقے اور درجے قایم ہیں ۔

(۵) خوردہ آوستا ـــــ اس کو ایسا خیال کرنا چاہئے کہ یہ زردشتیوں کی عبادت یا نماز کی کتاب ہے ۔ اس کتاب کو شاپور ثانی کے زمانہ میں (۳۱۰ء لغایت ۳۷۹ء) دستور آذر پادہ مہر سپند نے عوام کے استعمال کے لئے مُرتب کیا تھا ۔ اس میں آوستا کا کچھ انتخاب شامل ہے اور چند ارکان وعقاید دینی پاژند میں تحریر کئے ہوئے ہیں ۔ نیز اسی کتاب میں نیایش ہائے پنجگانہ (آفتاب ۔ ماہتاب ۔ مِتھرا ۔ موکّل آب ۔ آتشِ بہرام کے حضور میں دعائیں یا نماز) گاہ پنجگانہ ۔ سیروزہ صغیر وکبیر ۔ آفرینگان اربعہ (برکت ہائے چارگانہ) مذکور ہیں ۔

مجموعی طور پر پروفیسر براؤن نے آوستا کے متعلق حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے :-

"Speaking for myself, I can only say that while my appreciation of the Quran grows the more I study it and endeavour to grasp its spirit, the study of the Avesta, save for philological, mythological, or other comparative purposes, leads only to a growing weariness and satiety.."

پہلوی دور

اس زبان کا آغاز اخمنی سلطنت کے اخیر زمانہ سے متعلق ہے ۔ (پارتھی (اشکانی) حکومت کے دور میں اُس کا رواج شروع ہوا اور ساسانی دور میں اُس کو عروج حاصل ہوا ۔ دراصل لفظ پہلوی سے اس زبان کا رسم الخط مراد ہے لیکن عام طور پر اُس کا اطلاق زبان پر کیا جاتا ہے اور اس معنی میں اُس کا ایک غیر متعین مفہوم ہے ۔ وہ یہ کہ عام بول چال میں یا محاورہ میں کسی لفظ کو فرسِ قدیم کہہ دیتے ہیں خواہ وہ آوستی ہو یا قدیم فارسی کا یا خاص پہلوی زبان کا ۔ اس زبان اور اس رسم الخط کا عام رواج اب سے تقریباً ایک ہزار سال پیشتر بند ہو چکا ہے گو اب بھی علمائے زردشتی میں اس زبان اور رسم الخط کا استعمال تھوڑی بہت بگڑی ہوئی شکل میں جاری ہے ۔

پہلے ذکر آچکا ہے کہ یہ زبان قدیم فارسی شاہانِ اخمنی کی زبان سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اُس کا رسم الخط بھی قدیم فارسی کے رسم الخط سے حاصل کیا گیا ہے۔

لفظ پہلوی کی نسبت محققین کی رائے ہے کہ یہ لفظ پارتھو سے نکلا ہے۔ قدیم فارسی میں پارتھیا کو پرتھو لکھا ہوا پایا گیا ہے۔ جس طرح الفاظ چتھر اور متھر چہر اور مہر سے تبدیل ہوئے اُسی طرح لفظ پرتھو کی تغیرات پہلو (پہلوئیں) اور بعدش پہلو میں قیاس کی گئی ہے۔ اس کی تصدیق اور تائید اس طور پر کی جاتی ہے کہ عربی شکل میں لفظ پہلوا ایران کے عربی جغرافیہ کی کتابوں میں فہلو لکھا گیا ہے اور اُس کا اطلاق اُس علاقہ پر کیا گیا ہے جو وسط ایران اور مغربی ایران پر مشتمل ہے اور جس میں اصفہان رے۔ ہمدان وغیرہ شامل ہیں۔ پارتھیوں کی نسبت پورے یقین کے ساتھ قطعی طور پر تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی قومیت کیا تھی یعنی وہ ترکی تھے یا آریہ لیکن اس امر سے کہ ہندوستان میں پہلو قوم کا وجود ظاہر ہوا ہے اور ایرانی کتابوں میں بھی پہلوانوں (Heroes .) کا ایک دور قرار دیا گیا ہے۔ نیز دیگر وجود کی بنیاد پر پارتھیوں کو آریہ اقوام میں سے ہی قیاس کیا گیا ہے۔ بہر حال جو امر یقینی ہے وہ یہ ہے کہ پہلوی زبان اور رسم الخط کا رواج پارتھیوں کے زمانہ ہی میں ہوا۔

لفظ ——— [illegible]

تلفظ ——— عام

معنی ——— رعایا

اس رسم الخط کی ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ اُس کے بعض حروف تہجی ایسے ہیں جن میں سے ہر حرف مختلف آوازوں کا مترادف ہے۔ مثلاً ایک ہی حرف 'یا' کی بھی صورت رکھتا ہے اور دال اور زا کی بھی۔ ابتدا میں یہ مختلف الصوت حروف یا تو شکل میں مختلف تھے یا اُن پر ایسی علامتیں لگا دی جاتی تھیں جن سے اُن کی شکلوں میں فرق ہو جاتا تھا اور آواز بھی مخصوص ہو جاتی تھی لیکن بعد میں شکلوں میں تبدیلی یا علامتوں کے معدوم ہو جانے سے الفاظ کا تلفظ بہت مبہم ہو گیا اور اس ابہام سے الفاظ کے معنی بھی بدل گئے۔ اس لئے جو پُرانی کتابیں پہلوی زبان کی اس وقت موجود ہیں وہ اغلاق سے بھری ہوئی ہیں۔

رسم الخط اور زبان سے متعلق پہلوی کی ایک خصوصیت اور بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلوی زبان عسوری۔ آرمی اور دیگر سامی زبانوں سے بہت اثر پذیر رہی ہے اور اُن زبانوں کے الفاظ سے مملو رہی ہے۔ اس خصوصیت کا کچھ حوالہ اوپر آچکا ہے جس کی تفصیل اس جگہ بیان کی جاتی ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ پہلوی تحریری زبان اُس زبان سے مختلف ہے جو بولی جاتی تھی۔ تحریر کی عبارت کا اکثر حصہ سامی الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس وجہ سے بعض محققین نے تو یہ رائے قائم کی ہے کہ تحریری پہلو میں بجز اس کے کہ جملہ کی ترکیب و ترتیب پہلوی ہو یا جہاں ضمائر کا استعمال کیا گیا ہو یا مصادر کی علامت ظاہر کی گئی ہو یا حروف رابط ہوں، باقی کل عبارت سامی زبان کی عبارت ہوتی تھی۔ گو یہ رائے مبالغہ آمیز ہے تاہم سامی الفاظ کا استعمال تحریر میں کثرت کے ساتھ ہے۔ اس طرز تحریر کو ہُزوارِش کہتے ہیں (اور زواریش بھی)۔ لیکن جب تحریری پہلوی پڑھی جاتی تھی تو عبارت میں جو سامی الفاظ ہوتے تھے وہ نہیں پڑھے جاتے تھے بلکہ پہلوی زبان کے لفظ اُن کی بجائے پڑھے جاتے تھے اور بات چیت اور بول چال میں پہلوی زبان ہی کے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔ مثلاً جب لکھنے بیٹھتے تھے اور شہنشاہ کا مفہوم ادا کرنا چاہتے تھے تو اُس کو کتابت میں ملکان ملک لکھتے تھے اور جب اُس کو پڑھتے تھے تو شاہان شاہ پڑھتے تھے اور یہی لفظ عام بول چال میں داخل تھا۔ یہ طریقہ یہاں تک رائج تھا کہ فارسی کے مصادر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ مثلاً فارسی کا مصدر نوشتن (بمعنی لکھنا) ہے۔ اگر اس لفظ کو لکھنا مقصود ہوتا تو سامی لفظ یکتیبون لکھ کر اُس پر فارسی مصدر کی علامت 'تن' اور بڑھا دیتے تھے اور یکتیبون تن لکھ دیتے تھے مگر پڑھتے وقت اُس کو 'نوشتن' ہی پڑھتے تھے۔

اس امر سے کہ سامی الفاظ تحریر میں تو استعمال کئے جاتے تھے لیکن تقریر میں اُن کا کوئی وجود نہیں تھا ظاہر ہے کہ سامی الفاظ۔ الفاظ کے طور پر مستعمل نہیں ہوتے تھے اور نہ اُن الفاظ کا کوئی صوتی تعلق پہلوی زبان سے سمجھا جاتا تھا بلکہ الفاظ مذکور کی شکلیں کسی خاص مفہوم کے اظہار کے لئے معین سمجھی جاتی تھیں جب تک حروف تہجی یعنی صوت کی علامات مقرر نہیں ہوئی تھیں اور اُن کے ذریعہ سے الفاظ کی ترکیب ایجاد نہیں ہوئی تھی دنیا میں ایسی شکلوں ہی سے کام لیا جاتا تھا مثلاً اگر شیر کے مفہوم کا اظہار مقصود ہوتا تھا تو شیر کی شکل بنا دی جاتی تھی۔ یا۔ اگر بیت (گھر) کا مفہوم سمجھانا ہوتا تو گھر کی شکل دو دیواریں اور چھت بنا کر (لـــا) بتایا جاتا تھا۔ یہی شکلیں چھنٹ چھنٹا کر اور مختصر ہو کر حروف کی صورت میں آگئیں اور اُن کو اصوات سے متعلق کر دیا گیا۔ پہلوی زبان سے پہلے یہی کیفیت کچھ ملکی کے ساتھ خود عسوری زبان کی بھی پائی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ فرات کے کنارے ابتدا میں تورانی قومیں سُمیر وغیرہ آباد تھیں۔ ان کی زبانوں میں۔ لفظ باپ کے معنی دینے والا تھا وہ 'آد' تھا۔ عسوری زبان میں اس لفظ کو لکھتے تو 'آد' ہی تھے لیکن پڑھتے تھے 'اب'، کیونکہ جو اُن کی زبان کا لفظ باپ کے

معنی میں مستعمل تھا۔ یہ خصوصیت زمانۂ حال کی زبانوں میں بھی ہے لیکن نہ ہونے کے برابر۔ انگریزی میں etc لکھتے ہیں مگر ایٹ سیٹ را پڑھتے ہیں۔ لکھتے ہیں e.g. اور پڑھتے ہیں For example ۔ اُردو فارسی میں بھی لکھتے ہیں عم اور پڑھتے ہیں علیہ السلام۔ لکھتے ہیں صلعم اور پڑھتے ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ تحریر کرتے ہیں الخ اور پڑھتے ہیں الی آخرہ۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ تقریری پہلوی زبان کیا اور کیسی زبان ہے زمانۂ حال کی فارسی کو سامنے رکھا جائے۔ اُس میں سے تمام عربی الفاظ نکال دئے جائیں۔ باقی جو زبان رہے گی وہ اصل فارسی زبان ہوگی جس کے الفاظ شستہ اور نکھرے ہوئے ہوں گے۔ انھیں الفاظ کی پُرانی شکل پہلوی ہوگی۔ یعنی موجودہ فارسی اور پہلوی میں ایسا ہی فرق ہوگا جیسا کہ آج کل کی اُردو اور ابتدائی زمانہ کی اُردو میں ہے۔ مثلاً "تلک" اور "تک" کا جو فرق اُردو میں ہے ایسا ہی فرق فارسی حال اور پہلوی میں سمجھنا چاہئے۔ تحریری پہلوی میں جو اغلاق ہے اُس سے تقریری زبان پاک وصاف ہے اور فارسی حال (عربی الفاظ کو علٰحدہ کرکے) اور پہلوی میں زیادہ فرق نہیں۔ موجودہ زمانہ کا ایرانی پہلوی کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے لیکن جو فرق پہلوی اور قدیم فارسی میں ہے وہ بہت زیادہ ہے اور اس قدر ہے کہ اگر ساسانی زمانہ کا کوئی شخص ہخمنی زمانہ کی قدیم فارسی کی بول چال سمجھنا چاہئے تو نہیں سمجھ سکتا۔

ساسانی زمانہ میں یعنی پہلوی زبان کے زمانہ میں لکھنے پڑھنے کا رواج عام نہیں تھا اسی لئے اس زبان کی کتابت میں اغلاق تھا یا یہ امر تھا کہ طبقۂ اُمرا فوجی ہنر ہی کو ہنر سمجھتے تھے اور لکھنے پڑھنے کو دوسروں کا کام سمجھتے تھے۔ بہرحال جب تک پہلوی حروفِ تہجی اور زوارشی طرزِ تحریر جاری رہا اُسوقت تک لکھنا پڑھنا خصوصاً لکھنا زردشتی مُغ پات اور دستوبار (ملّایان رقوم) تک محدود تھا یا پیشہ ور کاتبوں کا کام تھا۔ جب عربوں کے تسلط کے بعد عربی حروف کا استعمال شروع ہوا تو لکھنے پڑھنے میں آسانی ہوگئی اور یہی آسانی عربی حروف تہجی اور رسم الخط کے استعمالِ عام کا باعث بھی ہوئی جو اس وقت تک جاری ہے۔ عربی رسم الخط کے رواج نے عربی الفاظ کو بھی پہلوی عبارت میں کثرت کے ساتھ داخل کردیا اور عربی قواعد صرف ونحو بھی پہلوی جملوں کی ترکیب میں شامل ہوگئے۔

لفظ پہلوی کے ساتھ ساتھ ایران کی پُرانی زبان کے سلسلہ میں الفاظ ژند و پاژند کا بھی استعمال غیر متعین طریق پر کیا جاتا ہے۔ آپ یہ معلوم کرچکے ہیں کہ آوستی زبان کے حروف تہجی اور پہلوی زبان کے حروف تہجی جدا جدا ہیں اور یہ کہ پہلوی حروف اور تحریری زبان کی یہ خصوصیتیں ہیں کہ حروف مختلف الاصوات ہیں اور تحریر میں سامی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں لیکن دیگر طریق پر پڑھے جاتے ہیں۔ اِس صراحت کے بعد آپ ژند کے معنی یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب آوستا کی کسی عبارت کی تفسیر یا تشریح پہلوی زبان میں پہلوی تحریر کے ذریعہ کی جائے تو اُسکی تفسیر یا تشریح کو ژند کہتے ہیں۔ اور جب اِس تحریری پہلوی تفسیر کی تشریح پہلوی تقریری زبان میں آوستی حروف تہجی کے ذریعہ کی جائے اور پہلوی تحریری عبارت کے سامی الفاظ کے بجائے یعنی زوارشی طرزِ تحریر کو ترک کرکے پہلوی تقریری زبان کے الفاظ استعمال کئے جائیں تو اُس کو پاژند کہتے ہیں۔ یعنی خالص پہلوی الفاظ کو آوستا کے رسم الخط میں لکھا جائے تو ایسی تحریر پاژند کہلائے گی۔ اور اگر اُس کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے تو وہ زبان ہوگی جس کو ہم معمولاً فارسی کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تحریری پہلوی اپنے مختلف الصوت حروف اور زوارشی طرزِ تحریر کی وجہ سے ایک عجیب خصوصیت رکھتی ہے جس کے باعث اُس کو اسوقت تک فارسی حال سے علٰحدہ طور پر ایک علٰحدہ زبان سمجھا جاتا ہے ورنہ ہُزوارشی طرزِ تحریر کو حذف کرکے پُرانی شکل میں یہ وہی زبان ہے جو فارسی حال سے عربی الفاظ کو کم کرکے باقی رہتی ہے۔

ہُزوارش طرزِ تحریر کی ایک توجیہ گزشتہ بیان میں یہ ظاہر کی جاچکی ہے کہ اُس کا رواج مفہوم ذہنی کی تصویر کے طور پر ہونا ممکن ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ زبان کو عام طور پر مغلق کرنے کے لئے یہ ترکیب سوچی گئی ہو تاکہ عوام اُس کو نہ سمجھ سکیں۔ یہ توجیہ اس لئے قابل قیاس ہے کہ الفاظ ہُزوارش اور زوارشن مصدر زوارِیدَن سے ماخوذ سمجھے جاتے ہیں جس سے چھپانے یا گمراہ کرنے یا دھوکا دینے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی بجائے پہلوی الفاظ کے تحریر کرنے کے سامی الفاظ کا استعمال ایک طرح سے مضمون کو مخفی کردیتا ہے اور یہی نتیجہ حروف تہجی کے مختلف الاصوات ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

ہُزوارش طریقِ تحریر کے ساتھ ساتھ ایک اور بات یہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ بہت سے الفاظ جن کو مفرد خیال کیا جاتا ہے دراصل مرکب الفاظ ہیں۔ جب یہ الفاظ پہلوی میں لکھے جاتے تھے تو کتابت میں اُن کے پورے اجزا لکھے جاتے تھے جن سے وہ مرکب ہوتے تھے لیکن اُن کو مفرد الفاظ کے طور پر دیگر تلفظ سے پڑھا جاتا تھا۔ مثلاً فارسی مصدر پنداشتن ہے۔ عام طور پر اس کو مفرد لفظ خیال کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ اجزائے ذیل سے مرکب ہے :-

پادان - (پا بمعنی لئے یا واسطے) - ہانا (این بمعنی یہ) - یخسنون تن (داشتن بمعنی رکھنا یا تھامنا)

مطلب یہ کہ جب لفظ پنداشتن لکھا جاتا تھا تو اُس کے مذکورۂ بالا اجزا لکھے جاتے تھے اور اُس کو پنداشتن کے تلفظ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اسی طرح لفظ 'مگر' ہے جو دو آرمی الفاظ سے مرکب ہے جن کے معنی 'نہیں' اور 'اگر' کے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ اور ملکوں کی طرح ایران کے بھی مختلف حصوں میں عام زبان فارسی مختلف خصوصیات کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اگر اُردو زبان کی مثال لی جائے تو اُس میں دیہاتی۔ قصباتی۔ شہری۔ گنواری وغیرہ کئی قسم کی زبانیں پائی جائیں گی۔ اسی طرح ایران کے دیہات و قصبات کی زبانیں ہیں جو ایک دوسری سے مختلف طرز یا نوعیت کی ہیں۔ ان زبانوں میں الفاظ اور محاورات کے اعتبار سے بہت فرق ہوتا ہے۔ بعض میں تو اتنا فرق ہے کہ بغیر خاص محنت کے اُنکا سمجھنا مشکل ہے۔ آج کل کی مشہور بولیاں حسب ذیل ہیں:-

شمالِ ایران میں مازندران اور گیلان کی بولی۔ شمال و مشرق میں سمنان کی۔ وسطِ ایران میں تہرود اور کاشان کی زبانیں۔ یزد اور کرمان میں گبری زبان۔ مغرب میں کُردستان اور لُورستان کی بولیاں۔

اسی طرح اور بھی بولیاں ہیں جن میں مشہور شاعروں (مثلاً سعدی و حافظ وغیرہ) نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور بالعموم فہلویات کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔ باباطاہر عُریاں ایران کا ایک مشہور پرانا شاعر ہے جس کے اشعار ایران میں عام طور پر گائے جاتے ہیں۔ یہ لورستان کی بولی میں اشعار لکھتا ہے۔ دو آسان نمونہ درج ذیل ہیں:-

(۱)　چہ خوش بی مہربونی از دو سربی　　　کہ یک سر مہربونی درد سربی
اگر مجنوں دلِ شوریدہ داشت　　　دلِ لیلےٰ ازاوں شوریدہ تربی

اس قطعہ میں مقامی بولی کا فرق تین جگہ ہے۔ ایک تو مہربونی میں الف کی جگہ واؤ۔ دوسرا لفظ بی کا استعمال بجائے بود کے تیسرا بجائے 'آں' کے 'اوں'

(۲)　وِشُم واشم ازیں عالم بدر شُم　　　وِشُم از چیں و ماچیں دیرتر شُم
وِشُم از حاجیانِ حج بپرسم　　　کہ ای دیری بسے یا دیرتر شُم

اس قطعہ میں وِشُم بجائے بشوم بمعنی چلا جاؤں گا۔ واشم بجائے باشم یا بازشوم یعنی ٹھیروں گا یا پھر چلا جاؤں گا۔ شُم بجائے شوم۔ دیرتر بجائے دُور تر۔ اِی بجائے ایں۔ اور 'بسے' بجائے بس است کے استعمال ہوئے ہیں۔

اِن بولیوں کے متعلق سرسری طور پر یہ تحقیقات بھی کی گئی ہے کہ کون سی بولی آوستی زبان سے ماخوذ ہے اور کون سی قدیم فارسی سے۔ رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ ایران کے شمالِ مغرب کی بولیاں یعنی جس علاقہ کو پہلے میڈیا کہتے تھے اُس کی بولیاں اور یزد و کرمان کی گبری بولیاں آوستی زبان سے ماخوذ ہیں۔ آوستی زبان اور قدیم فارسی کی زبان آپس میں بہنوں کی طور پر مانی گئی ہیں۔ اکثر الفاظ کی اصل دونوں میں ایک ہے لیکن اُس اصل سے جو مشتقات دونوں زبانوں میں ہوئے وہ ذرا مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر دو الفاظ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن میں سے ایک کی اصل دونوں زبانوں میں ایک ہے اور دوسرے لفظ کی اصل ایک زبان سے دوسری زبان میں علحدہ ہے۔ کرنے کے معنی میں جو الفاظ آوستا کی زبان اور قدیم فارسی کی زبان میں ہیں اُن کی اصل کر ہے۔ قدیم فارسی میں 'کردن' سے کُن (صیغۂ امر) اور کنم (مضارع) قایم ہیں۔ آوستی زبان میں کرم (صیغۂ مضارع) ہے۔ قدیم فارسی میں فارسی لفظ گفتن کی اصل گوب ہے اور آوستی زبان میں جو لفظ کہنے کے معنی دیتا ہے اُسکی اصل 'واچ' ہے۔ محققین نے اس اعتبار سے جن جن بولیوں میں فرق پایا ہے اُسی لحاظ سے اُن کو آوستی یا قدیم فارسی سے ماخوذ خیال کیا ہے۔ مثلاً باباطاہر کی بولی میں جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے بجائے کنم کے 'کرم' کا استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اُس کو آوستی زبان سے متعلق سمجھا گیا ہے۔

(باقی)

سید حکیم احمد نقوی

الحق —— اور —— سیماب

اپریل ۱۹۴۲ء کے "نگار" میں "سیماب اور شیطان" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں بعض اعتراضات علم وفن سے متعلق ہیں اور بعض مفہوم نظم سے۔ دوسری قسم کے اعتراض کا جواب حضرت مولانا نیاز فتحپوری مضمون کے آخری حصہ میں دے چکے ہیں امید ہے کہ الحق صاحب مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ لیکن چونکہ علمی و فنی اعتراضات کے سلسلے میں حضرتِ نیاز نے مولانا سیماب کو مخاطب کیا ہے اس لئے جواب ناگزیر ہے۔

تقریبًا ایک سال سے نظم "موحدِ اعظم" ملاؤں اور حاسدوں کے تیروں کا نشانہ بنی ہوئی ہے لیکن مولانا سیماب نے بجز اپنے مسلک کی توضیح کے نہ کسی ملا کو جواب دیا اور نہ الحق جیسے کسی ناقد کو —— ہاں دوسرے حضرات جواب دے رہے ہیں۔

علمی - ادبی اور لسانی مسائل میں خاموشی بسا اوقات طالبانِ علم وفن اور اہلِ نظر کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے میں ایک اجمالی جواب پیش کر رہا ہوں مولانا سیماب انسان ہیں اور انسان سہو وخطا کا مجموعہ ہے اس لئے اُن سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ لیکن کتابت کی غلطی اور سہوِ نظر کو آلۂ اعتراض بنانا کسی طرح شایانِ تنقید نہیں —— الحق صاحب کے اعتراضات یہ ہیں :-

(۳) الف - "فرشتوں کا معلّم عالمِ ملکوت کا عالِم" اس میں (ملکوت) بسکونِ ثانی نظم ہوا ہے۔ یہ غلط ہے (ل) پر زبر ہونا چاہئے۔

ب - "خدا کے ساتھ آعوذ میں استحکام ہے اس کا"۔ یہاں آعوذ (مد کے ساتھ) پڑھنے سے مصرع موزوں ہوتا ہے۔ جہلا آعوذ کہا کرتے ہیں۔

ج - "سرشتاً" تجھ کو ہونی چاہئے شیطان سے نفرت" فارسی لفظ (سرشت) پر عربی تنوین بھی سیماب صاحب کے قلم سے عجیب ہے۔

(۴) سیماب صاحب یہ آمیزش عربی و فارسی اور جگہ بھی کر چکے ہیں "وضعِ قدیم کے پابند جوان العمر رئیس تھے" اس حساب سے اُن کے نزدیک "قریب المرگ" بھی جائز ہوگا۔

(۵) "ادھر یہ سند کہ ہو مسجودِ خاک آدمِ اولیٰ" سیماب صاحب کو اس بات کا علم نہیں کہ اولیٰ مونث ہے۔ ادمِ اوّل کہنا چاہئے۔

(۶) "بذہنِ عشق حکمِ سجدۂ آدم نمی گنجد" یہ ہندوستانی فارسی ہے۔ ایرانی اسلوب کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔

(۷) "کبھی ہیں کعبۂ مسجود دروازے قیادت کے" کعبۂ مسجود نامانوس ترکیب ہے۔ کعبہ کبھی مسجود نہیں ہوتا۔ کعبۂ مقصود ہونا چاہئے۔

(۸) سیماب صاحب نے اس نظم میں ذوقؔ کا ایک شعر اس طرح تضمین کیا ہے۔

وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا — قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے — اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

تضمین کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ شعر گویا اپنا کر لیا جائے۔ اس کا مضمون اپنی نظم میں کھپا لیا جائے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے۔

(۹) سیماب صاحب نے مرزا داغ کا یہ شعر بھی اپنی نظم میں چسپاں کیا ہے۔

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں — مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

داغؔ کا یہ شعر اُن کے عامیانہ شعروں میں سے ہے۔ جس میں بوالہوس عاشقوں کا جذبہ و معاملہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کو ظرافت کے موقع پر بطور ضرب المثل کے لکھ سکتے ہیں اس لئے نظم میں اس شعر کے آنے سے نظم کا توازن ولہجہ بدل گیا۔

(۱۰) بزرگوں اور شاعروں نے ابلیس کو موحدِ اعظم اور عارفِ کامل قرار نہیں دیا۔

جواب :- (۳) الف - عروض کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی ایک رکن میں تین حرکتیں متواتر آئیں تو وسط کی حرکت کو ساکن کر دیتے ہیں اس کا نام

"تسکینِ اوسط" ہے۔ جیسے فَعِلَاتُن میں تینوں حروف متحرک ہیں، عین کو ساکن کر دیا تو فعْلاتن بہ سکونِ عین رہ گیا۔ اسی کو مفعولن سے بدل دیتے ہیں ایسی حالت میں یہ رُکن مسکن کہلاتا ہے۔ "تسکین اوسط" زحافاتِ عامّہ میں سے ہے ہر بحر اور ہر مقام پر آسکتا ہے۔ "دریائے لطافت" میں "توالیٔ حرکات" کا بیان شاید الحق صاحب کی نظر سے نہیں گزرا خیر اب ملاحظہ فرمالیں -

" عربی میں ایک کلمہ میں توالیِ حرکاتِ اربعہ ممنوع ہے۔ یہی حال ہندی میں توالیِ حرکاتِ ثلاثہ کا ہے مثلاً "شرف النساء" دوسرے حرف "ر" کو سکون کے ساتھ بولنا اچھا ہے اس کے فتح کے ساتھ غلط اور مکروہ ہے۔ اگرچہ اصل کے اعتبار سے صحیح ہے۔ اسی طرح "شکرانہ" "کاف" کے سکون کے ساتھ اور "نظروں" "ظ" کے سکون کے ساتھ بولنا اور باندھنا صحیح اور فصیح ہے۔"

تسکینِ اوسط کی مثالوں سے شعرا کے دواوین بھرے پڑے ہیں اور یہاں اشعار کے اخذ و نقل کی چنداں ضرورت نہیں۔ "دریائے لطافت" کی مندرجۂ بالا عبارت ہی کافی ہے۔ اسی قاعدے کے مطابق مولانا سیماب نے "ملکوت" (بہ سکونِ لام) نظم فرمایا ہے۔

ب - حیرت ہے کہ الحق صاحب نے یہ اعتراض کیا حالانکہ اُنھیں علم ہے کہ مولانا سیماب کا صحیح مصرع یوں ہے ؎

خدا کے ساتھ اعوذ میں بھی استحکام ہے اس کا

ہوا یہ کہ کاتب نے "بھی" حذف کرکے الف پر مد لگا دیا اور نقل در نقل کی وجہ سے یہ غلطی ویسے ہی چلی آئی۔ ایک دن ایک خاص ضرورت کے تحت جب مولانا سیماب نے مطبوعہ نظم دوبارہ دیکھی تو کتابت کی اس غلطی کا احساس ہوا اور اس کی تصحیح اخبار "زمزم" لاہور اور رسالہ "شاعر" آگرہ میں کر دی گئی۔ جناب الحق پورے ۷ - ۸ ماہ بعد اعتراض فرما رہے ہیں۔ حالانکہ "شاعر" کا ہر شمارہ اُن کی نظر سے گزرتا ہے -

ج - "سرشتاً" پر جو اعتراض کیا گیا ہے وہ بھی پُرانا ہے۔ اس کا جواب کئی اخبارات و رسائل میں دیا جا چکا ہے کہ یا تو یہ سہوِ نظر ہے یا رواج کی تائید۔ ہندوستان کے مستند ادبا اور شعرا کے مضامینِ نظم و نثر میں سرشتاً۔ نمونتہً۔ اندازاً اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ الحق صاحب کے مضامین کی تو میں نے چھان بین نہیں کی۔ پھر بھی اُصول بہرحال اُصول ہے اور یہ غلطی قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی خواہ کسی سے ہو۔ مگر میرا ایمان ہے کہ سب سے ایسی غلطیاں غیر ارادی طور پر ہو جاتی ہیں۔ الحق صاحب ذرا اپنے ضمیر پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں کہ کیا مولانا سیماب دیدہ و دانستہ ایسی فروگزاشت کر سکتے ہیں؟ جب کہ وہ ان معاملات میں خود بہت محتاط ہیں -

(۴) "جوان العمر" سراسر کتابت کی غلطی ہے یا پھر نقل مضمون میں یہ غلطی ہوئی ہوگی۔ عام طور پر مولانا سیماب کے مضامین نقل کرکے بھیجے جاتے ہیں۔ الحق صاحب کا یہ کہنا کہ مولانا کے نزدیک "قریب المرگ" بھی جائز ہوگا۔ محض اپنی بات کی پچ ہے حالانکہ "شاعر" کے پُرانے پرچوں میں مولانا کئی بار اس قسم کی غلط تراکیب پر طلبہ کو متنبہ کر چکے ہیں -

(۵) جی ہاں سیماب صاحب کو اس کا علم ہے کہ "اولیٰ" مونث ہے لیکن ضرورتِ قافیہ کو آپ کیا کریں گے۔ پھر اول اور "اولیٰ" باعتبارِ معنیٰ ایک ہی ہیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی تراکیب مستند حضرات نے بے محابا استعمال کی ہیں ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) غیر مطبوعہ خط بنام مرزا نبو صاحب - از مرزا رجب علی بیگ سرور صاحبِ "فسانۂ عجائب"

فقط دولت سے جُدا، مصیبت کا مبتلا - خوشی سے دُور، رجب علی بیگ سرور عفی عنہ　۱۲ "ربیع الاولیٰ"[۱] چہار شنبہ کانپور

(۲) یدِ علیا بہ یدِ سفلیٰ چہ ماند[۲] - - - - - - - - - - (شیخ سعدی)

(۳) ملائکہ سفلیٰ[۳] نہ واقف سوند آں جمیعت را - - - - - - - - شرح تاویل الحکم از مولوی محمد حسن مارہروی

---

[۱] اول تو سرور کی عبارت سے کسی لفظ کے صحیح استعمال پر استناد درست نہیں، دوسرے ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔　(نیاز)

[۲] عربی میں لفظِ "ید" مونث استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے صفت بھی مونث استعمال کی گئی -　(نیاز)

[۳] "ملائکہ" جمع ہے ملک کی اور جمع کے لئے عربی میں صفت مونث استعمال ہوتی ہے -　(نیاز)

لیجئے کلام پاک سے بھی ایک مثال پیش کی جاتی ہے :-

(۴) " والاخرۃ خیر لک من الاولیٰ [1] " اس میں " اولیٰ " کی تانیث موجوداتِ مذکر کو مستثنیٰ نہیں کرتی -

(۵) " ۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء کو مولانا عرشی امرتسری کی تازہ تصنیف " ملّتِ ابراہیم " بغرضِ تنقید و تبصرہ وصول ہوئی ہے - اس کے صفحہ ۵ پر مولانا محمد اقبال سلمانی مدیر رسالہ " البیان " امرتسر کی مختصر تقریظ ہے جس کا عنوان جلی حروف میں " نقطۂ اولیٰ " قائم کیا گیا ہے - حالانکہ " نقطہ " بالاتفاق مذکر ہے [2] اور اولیٰ مؤنث ربیع الاولیٰ - یدِ سفلیٰ - ملائکۂ سفلیٰ اور نقطۂ اولیٰ وغیرہ کی موجودگی میں " آدمِ اولیٰ " پر اعتراض کیا معنی رکھتا ہے ؟ جن لوگوں کی سندیں پیش کی گئی ہیں - وہ عوام میں سے نہیں بلکہ خواص میں سے ہیں "

عربی قاعدہ کے اعتبار سے صفت و موصوف کی حالت یکساں ہونی چاہئیے - لیکن مولانا سیماب کے شعر میں " اولیٰ " آدم کی نہیں بلکہ " خاک " کی صفت ہے [3] لہذا اعتراض کا محل ہی نہیں - الحق صاحب اُس وقت کہاں تھے جب مولانا کی نظم " موحدِ اعظم " کے جواب میں اخبار " مدینہ " بجنور میں ایک نظم " مشرکِ اولیٰ " کے عنوان سے شایع ہوئی تھی - اس پر بھی اعتراض کیا ہوتا !

(۵) الحق صاحب کا یہ اعتراض اتنا کم وزن اور بے معنی ہے کہ جواب دینے کو جی نہیں چاہتا - ہندوستان میں بسنے والے فارسی گو شعرا سے یہ مطالبہ کہ وہ اہلِ فارس کی طرح شعر کہیں کسی طرح جائز نہیں - جب عرفی - نظیری [4] اور بیدل جیسے باکمال شعرا کی فارسی شاعری کو ہندوستانی اسلوب سے تعبیر کیا گیا تو پھر مولانا سیماب اس اعتراض سے کیونکر بچ سکتے ہیں ؟ ڈاکٹر اقبال کی فارسی شاعری کے متعلق بھی یہی اعتراض ہوتا ہے - لیکن افسوس ہے کہ اکتسابی اور مادری زبان کے نکتہ کو بھی ہمارے الحق صاحب نہیں سمجھتے -

(۶) الحق صاحب بھی مُصر ہیں کہ " کعبۂ مقصود " ہونا چاہئیے ظاہر ہے کہ ہر شخص " کعبۂ مقصود " ہی لکھتا لیکن نکتہ یہ ہے کہ مولانا سیماب نے قیادت کے دروازوں کو " کعبۂ مسجود " کہا ہے اس لئے کہ خوشامدانہ سجدے قیادت کے دروازوں ہی پر ہوتے ہیں - لہذا وہ دروازے مسجود نہ ہوئے تو کیا ساجد ہوئے [5] ؟

(۷) اگر الحق صاحب نیتِ صادقہ کے ساتھ مولانا سیماب کی نظم " موحدِ اعظم " کا مطالعہ فرماتے تو وہ فوراً سمجھ جاتے کہ دوسرے شعرا کے جو تین شعر مولانا نے اپنی نظم میں پیش کئے ہیں وہ بطور تضمین نہیں ہیں بلکہ علحدہ علحدہ اپنے مفاہیم کو پورا کرتے ہیں اور نظم کے ساتھ بھی اُن کا ایک خاص ربط و علاقہ باقی رہتا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے شعر کے مصرعوں میں تقدم و تاخر کر کے الحق صاحب نے کیا نتیجہ اخذ کیا ؟ - میں تو اتنا سمجھ سکا ہوں کہ وہ علمی و ادبی حلقوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مولانا سیماب میں تضمین کرنے کی بھی اہلیت نہیں ! جب ذہنیت پستی کی اس منزل میں ہو تو بجز خاموشی اور چارۂ کار ہی کیا ہے -

(۸) الحق صاحب کو اتنا بھی علم نہیں کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے - حالانکہ مولانا سیماب نے تحتِ نظم مضطر خیرآبادی مرحوم کا نام لکھ دیا تھا - رہا یہ امر کہ مضطر خیرآبادی مرحوم کے شعر سے نظم کا توازن و لہجہ بدل گیا یا نہیں - یہ ہر شخص کا کام نہیں - شعر سے صرف اہلِ مجاز کا مسلکِ محبت معلوم ہوتا ہے اور اُس سے پہلے اور بعد کے اشعار کو عشقِ حقیقی کی بنیاد بنا دیتے ہیں - آگے چلکر ناظرین اس سلسلہ کے اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں گے -

(۹) اس اعتراض کا جواب اتنا تفصیلی دیا جا سکتا ہے کہ " نگار " کے تمام صفحات اس کی نذر ہو جائیں لیکن مصلحت اجازت نہیں دیتی - صرف الحق صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے چند اشارات ہی پر اکتفا کروں گا -

---

[1] صحیح عبارت یوں ہے " وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ " چونکہ آخرۃ سے آنے والا زمانہ یا آیندہ واقعات مراد ہیں اور اولیٰ سے پچھلے واقعات - اس لئے اولیٰ ہی ہونا چاہئیے نہ کہ اول اور اگر موجودات ہی مراد ہے تو بھی یہ جمع ہونے کے لحاظ سے مؤنث ہیں (نیاز) - [2] " نقطہ " مؤنث ہے جسے آپ ہ سمجھتے ہیں وہ تائے تانیث ہے اس لئے اسکی صفت اُولیٰ ہونا چاہئے - (نیاز) - [3] یہ جواب بھی درست نہیں - اگر اولیٰ صفت خاک کی قرار دیجائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آدم کی کوئی خاک اس کے بعد بھی ہوئی - علاوہ اس کے خاک اُردو میں مؤنث ہے نہ کہ فارسی میں جہاں تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہی نہیں ہے اسی لئے فارسی والے بھی خاک کی صفت میں اول کا لفظ استعمال کریں گے نہ کہ اولیٰ، پھر چونکہ سیماب صاحب کے شعر میں فارسی ترکیب استعمال ہوئی ہے اس لئے اولیٰ صحیح نہیں - (نیاز) - [4] عرفی و نظیری تو ایرانی تھے اور ان کی شاعری پر یہ اعتراض کسی نے نہیں کیا کہ وہ ٹکسال باہر ہے - بیدل تخیل کا بادشاہ تھا جس میں ایرانی روزمرہ کیا کام دیسکتا تھا - (نیاز) - [5] کعبہ تو جہاں ہے مسجود ہے، اسلئے " کعبۂ مسجود " کہنے سے کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی صرف کعبہ کہدینا کافی تھا - (نیاز)

مقام حیرت ہے کہ الحق صاحب شیطان کو "موحد" نہیں مانتے۔ بالفاظِ دیگر شیطان اُن کی نظر میں "مشرک" ہے۔ غالباً انھیں "موحد" اور "مشرک" کے معنی کا علم نہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ "موحد" اسے کہتے ہیں جو خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہ کرے اور "مشرک" کے معنی ہیں خدا کی ذات میں کسی کو شریک کرنے والا۔ کیا الحق صاحب ثابت کرسکتے ہیں کہ ابلیس نے مردود ہونے سے پہلے یا مردود ہونے کے بعد خدا کی ذات میں کسی کو شریک کیا؟ اگر وہ "ماسوا اللہ" کو سجدہ کرلیتا تو بھی یہ کہنے کی گنجایش تھی کہ وہ مشرک ہے۔ لیکن اس نے تو کسی درجہ میں بھی ایسا نہیں کیا! "اسلام سے پہلے جو لوگ خدا کو وحدہٗ لاشریک مانتے تھے وہ بھی موحدین کہلاتے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کو "موحدِ اعظم" کہدیا جائے تو کیا اس سے اسلام یا اور کسی مسلمان کی توہین ہوجائے گی؟"

(مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایم۔اے۔ فاضل دیوبند مدیر "برہان" دہلی)

رہا ابلیس کے "عارفِ کامل" ہونے کا سوال تو اس کے لئے معترض کو وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔ حیاتِ ابلیس ماقبل واقعۂ آدمؑ جو کتب عربیہ معتبرہ سے ثابت ہے۔ انھیں میں سے بعض کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں:۔

(ترجمہ) "وہ ایک مدت تک زمین کا "بادشاہ" فرشتوں کا "عالم" اور جنت کا "خازن" رہا اور اڑتا تھا عرش سے سیلی زمین تک۔ ساکنانِ ارض وسما اسکو دیکھتے تھے اور اس کے امر کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تو رکھا زمین کے ساتویں طبقہ کے نیچے سیلی زمین پر پس اُس نے اس جگہ ایک ہزار برس عبادت کی۔ پھر ساتویں طبقہ پر لایا گیا وہاں دو ہزار برس عبادت کی۔ پھر چھٹے طبقہ پر تین ہزار برس۔ پھر پانچویں طبقہ پر چار ہزار برس۔ پھر چوتھے پر پانچ ہزار برس۔ پھر تیسرے پر چھ ہزار برس۔ پھر دوسرے پر سات ہزار برس۔ پھر پہلے پر آٹھ ہزار برس۔ پھر اُٹھایا گیا آسمان دنیا پر وہاں نو ہزار برس پھر دوسرے پر دس ہزار برس، پھر تیسرے پر گیارہ ہزار برس، پھر چوتھے پر بارہ ہزار برس۔ پھر پانچویں پر تیرہ ہزار برس۔ پھر چھٹے پر چودہ ہزار برس پھر ساتویں پر پندرہ ہزار برس۔ یہ کل مدت ایک لاکھ بیس ہزار برس ہوئی۔ پھر عبادت کی عرش کے سامنے اس سے دوچند یعنی دو لاکھ چالیس ہزار برس۔ آسمان اور زمین پر ایک بالشت بھی ایسی جگہ باقی نہیں رہی جہاں ابلیس (عزازیل) نے سجدہ نہ کیا ہو"

(تاریخ الخمیس علامہ شیخ حسین ابن محمد ابن حسن دیار بکری)

(ترجمہ) "نافرمانی سے پہلے ابلیس فرشتوں میں سے تھا اور اس وقت اس کا نام عزازیل تھا اور وہ ساکنانِ ارض میں سے تھا۔ فرشتوں کی جماعت میں وہ بہت بڑا مجتہد اور علم میں سب سے زیادہ تھا۔"　　(تفسیر ابن جریر)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی قرآنِ مجید کے ترجمہ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں:۔ "روئے زمین پر اللہ پاک نے جنات کو آباد کر رکھا تھا۔ جب جنات میں فسق و فجور اور معصیت کی کثرت ہوئی تو اللہ پاک کا فرشتوں کو حکم ہوا کہ یہ شریر اور مفسد مخلوق اس سطحِ ارض پر آباد رہنے کے قابل نہیں ان کو پہاڑوں اور جزیروں میں بسادو اور زمین ان سے خالی کرالو اور ان کی جگہ تم آباد ہوجاؤ غرض جنات کے قایم مقام فرشتے ہوئے اور ان سب کا مرشد و افسر عزازیل کو مقرر کیا گیا اور "معلم الملکوت" کے لقب کا اعزاز بخشا۔ ہزاروں برس اس نے اللہ پاک کی وہ طاعت کی کہ جو واقعی اُسی کا کام تھا۔ سطحِ ارض و سما پر بالشت برابر ایسی جگہ نہ چھوڑی جس پر اُس نے سجدہ نہ کیا ہو"

کعب الاحبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:۔

(ترجمہ) "ابلیس لعون (عزازیل) چالیس ہزار برس تک جنت کا خازن رہا اور ملائکہ کے ساتھ اسی ہزار برس تک رہا اور تبلیغ کی ملائکہ کی جماعت میں بیس ہزار برس اور سرداری کی مقرب فرشتوں کی تیس ہزار برس اور روحانیوں کا سردار رہا ہزار برس اور طواف کیا عرش کے گرد چودہ ہزار برس۔ اُس کا نام پہلے آسمان پر عابد دوسرے میں زاہد تیسرے میں عارف۔ چوتھے میں ولی۔ پانچویں میں تقی، چھٹے میں خازن۔ ساتویں میں عزازیل اور لوحِ محفوظ میں ابلیس تھا اور اُس کو اپنے انجام کی خبر نہ تھی۔ (تفسیر جمل)

ابلیس (عزازیل) کے "عارفِ کامل" عابد و زاہد اور متقی ہونے کے سلسلے میں اور بھی متعدد مستند کتب عربیہ کے اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مندرجہ بالا اقتباسات ہی سے جناب الحق مطمئن ہوجائیں گے۔ الحق صاحب کا مقصد اگر صرف بزرگ شعرا ہی سے تھا میں نے تو اُن علما کے اقوال پیش کردئے جو اسلام کے مبلغ اور مربی ہیں۔ اب فیصلہ وہ خود فرمالیں۔

حسنِ عقیدت اگر ڈاکٹر اقبال مرحوم یا اور کسی اُردو فارسی کے شاعر کے کلام کو جو ابلیس کی ذات سے متعلق ہے قابلِ گرفت نہ ٹھہراتے تو یہ دوسری بات ہے ورنہ کیا مولانا سیماب کی نظم اور کیا کسی دوسرے شاعر کا کلام سب کا پس منظر ایک ہی ہے۔ جناب مسعود احمد قریشی کا ایک مضمون "اقبال کا تصورِ ابلیس" کا کچھ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"انکارِ سجدہ کی دوسری وجہ داخلی ہے اور یہی اس کا زیادہ شاندار رُخ ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ ابلیس کا انکار تکبر و غرور کا نتیجہ نہیں۔ ابلیس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ اقدام کیا۔ ابلیس اس بات کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ جو جبینِ نیاز خدائے لم یزل کے سامنے جھکائی جا چکی ہے وہ کسی اور کے حضور میں بھی جھکے۔ اس طرح وہ انسان کو یہ سبق دینا چاہتا تھا کہ وحدت کسے کہتے ہیں اور لاالہ کا کیا مطلب ہے۔ وہ انسان کو بتانا چاہتا تھا کہ لاالہ کا مظاہرہ اپنی عزیز ترین متاع کو کھو کر بھی کیا جانا چاہئے۔

نہ ہر کس خو گر و ہم خود گداز است   نہ ہر کس مست ناز اندر نیاز است

بقائے لاالہ خونیں قبائے است   کہ بر بالائے نامرداں دراز است

دوسرے وہ عشق کے رمزوں سے خوب واقف تھا اور وہ جانتا تھا کہ وصالِ محبت کی موت کا پروانہ ہے۔۔۔۔۔۔"

پھر مولانا سیماب نے بھی تو یہی کہا ہے۔ مختلف اشعار ملاحظہ فرمائیے :۔

بشر سمجھا نہ اب تک مرتبہ دُنیا میں ٹھیک اُس کا   کہ ترکِ شرک و بدعت میں نہیں کوئی شریک اس کا

وہ صرف اللہ کو ارض و سما میں پوجنے والا   علی الرغم ملائک جس نے حکمِ سجدہ کو ٹالا

وہ ناری جس کا سوزِ عشق میں کوئی نہیں ثانی   سراپا آگ جس کا جسم لیکن روح نورانی

محبت کب پرستش غیر کی تسلیم کرتی ہے   محبت اقتضائے حُسن میں ترمیم کرتی ہے

محبت میں روا غیروں کو سجدا ہو نہیں سکتا   سجود ماسوا ہرگز گوارا ہو نہیں سکتا

یہی جذبہ رہا ہے فطرتِ عشقِ مجاز اب تک   کہ عاشق احترامِ غیر سے ہے بے نیاز اب تک

تمھیں چاہوں، تمھارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا

تو پھر عشقِ حقیقی میں کہاں گنجائش شرکت   حقیقت در وحدت کو زیبا نہیں آلائش شرکت

عزازیل اور خدا میں واسطہ تھا حُسنِ اُلفت کا   ہوا طغیان سرزد، یہ تقاضا تھا محبت کا

خدا کے سامنے سجدہ بشر کو نقصِ غیرت تھا   یہی فرضِ عبودیت، یہی حقِ محبت تھا

ذرا الحق صاحب فرمائیں کہ مولانا سیماب نے جو تقابلی عنصر اپنی نظم میں پیدا کرکے ریاکارانہ عبادت کے خلاف جہاد فرمایا ہے وہ ڈاکٹر اقبال یا کسی اور اُردو فارسی کے شاعر کے یہاں اتنی صراحت سے ملتا ہے ؟ یہ تو سب شاعر کہتے ہیں کہ ابلیس کا انکارِ سجدہ اُس کی وحدت پرستی کا بہترین ثبوت ہے لیکن بطور نتیجہ کسی نے ریاکار مسلمانوں کو تنبیہ بھی کیا ؟ ۔ شعرائے پیشین نے جو کچھ ابلیس کے متعلق کہا ہے اس کی بے اثری کا اندازہ اسی سے کرلیجئے کہ آج مسلمان عبادت سے پیچھے بھاگ رہے ہیں ۔ ذرا الحق صاحب بتائیں کہ سو میں سے کتنے مسلمان ایسے ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور ان پڑھنے والوں میں ریاکار کتنے ہوں گے ۔ مسلمانوں کی ایسی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر مولانا سیماب نے یہ نظم لکھی جس میں نہ کسی قسم کا الحاد ہے اور نہ ابہام وہ تو صاف کہتے ہیں :۔

وہاں اک ترکِ سجدہ سے ہوئی یہ برہمی پیدا   قضا کتنے ہوئے ہیں تیرے سجدے کر حساب ان کا

اور شعرائے پیشین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ زیادہ سے زیادہ تشریح طلب ہے اور ایک حد تک گمراہ کن بھی ۔ دونوں کی افادی حیثیت کا اندازہ الحق صاحب خود کریں۔ اس اجمالی گزارش کے بعد میں چاہتا تھا کہ الحق صاحب کی اُس غلط بیانی کے متعلق کچھ عرض کروں جو انھوں نے بطور اتہام مولانا سیماب کی ذات سے منسوب کی ہے کہ انھوں نے اولیا اللہ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے ۔ لیکن مضمون بہت طویل ہو جائے گا ۔ اولیا اللہ کی توہین کے سلسلے میں الحق

صاحب نے "شاعر" کا جو اقتباس پیش کیا ہے اُس پر وہ دوبارہ غور فرمائیں۔ کسی مضمون کی چند سطور لیکر اُن پر ہر قسم کا اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن بہ اعتبار موضوع سلسلے کی کڑیوں کو اگر جوڑا جائے تو ہر اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔ الحق صاحب چاہیں تو وہ اس بحث کو نگار میں جاری رکھ سکتے ہیں۔ انشا اللہ اُنھیں مطمئن کر دیا جائیگا ہاں میرا یہ دعویٰ ضرور ہے کہ مولانا سیماب، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق اور سیدنا حضرت حاجی وارث علی شاہ قبلہ کے پرستار ہیں۔ اُن سے بہتر اولیا کی قدر اور عزت کون کر سکتا ہے۔ الحق صاحب حضرت سیدنا حاجی بہاؤ الدین شاہ کے مرید ہوتے ہوئے بھی اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ حیرت ہے!

الحق صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا سیماب کی دو رباعیاں دیکر سوال کیا ہے کہ ان میں کیا درس و پیام ہے؟ آگے چلکر فرماتے ہیں کہ "یہ اعتراضات اس وجہ سے ہیں کہ سیماب صاحب کی طرف سے بار بار دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ پیامی شاعر ہیں اور اُن کا کلام ملک و قوم کے لئے ایک پیغام ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو کچھ بات نہ تھی" دیکھا آپ نے

خارِ حسرت زبان سے نکلا　　　　دل کا کانٹا زبان سے نکلا

ہمارے الحق صاحب کو بس یہ بات ناگوار ہے کہ مولانا سیماب کا شمار "پیامی شعرا" میں کیوں ہوتا ہے؟ ان کے خیال میں تو سوائے ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اور کسی کا کلام درس و پیام کا حامل ہی نہیں۔ خیر یہاں تقابلی بحث کا موقع نہیں۔ الحق صاحب ثبوت دیں کہ مولانا سیماب نے یہ کہاں اور کب لکھا ہے کہ:-
"میں پیامی شاعر ہوں؟" اپنے دعوے کے ثبوت میں الحق صاحب نے جو رباعیاں پیش کی ہیں اسی سلسلہ میں میں اُنھیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ کسی ایسے "شاعر" کا نام لیں جسے وہ پیامی سمجھتے ہوں۔ میں اس کے سیکڑوں انفرادی اشعار ایسے پیش کر دوں گا جن میں درس و پیام تو کیا حقیقی جذبات بھی نہ ہوں گے۔ اُنھیں اتنی بھی خبر نہیں کہ کسی شاعر کا رنگ اُس کے کل کلام کو سامنے رکھ کر پہچانا جاتا ہے۔ انفرادی اشعار کبھی اس سلسلہ میں کام نہیں دیتے۔ بہر طور کسی بات کو زبان سے کہہ دینا تو آسان ہے لیکن دلائل و براہین سے ثابت کرنا بہت مشکل ہے!

اگر گنجایش ہوتی تو میں دکھاتا کہ مولانا سیماب کے کلام میں "درس و پیام" کے کتنے محل ہیں اور اُن کی شاعری نے وطن اور قوم کو کتنا بیدار کیا ہے۔

الحق صاحب! خود کوئی پیامی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا کرتا۔ ہاں کلام ناقدین کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ یہ شاعر "پیامی" ہے۔

"سیماب کے کلام میں درس و پیام کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ ہر غزل میں چند شعر اس موضوع پر مل جاتے ہیں ...."

سیماب کی نظمیں اپنے اندر عالمگیر جذبہ رکھتی ہیں۔ اُس کی تخییل اپنے ماحول ہی میں چکر نہیں کاٹتی۔ وہ کہیں تمام عالم کو پیغام دیتا ہے ....."

محی الدین قائد بی۔ اے سابق مدیر الجمعیۃ دہلی ۱۹۳۷ء

"ان کی بعض نظموں اور غزلیات کے متعدد اشعار پڑھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ آگرہ کے بجائے لاہور کے باشندے ہوتے تو پیغمبر بے کتاب بنا دئے جاتے ....."

(شمس العلماء) تاجور نجیب آبادی

"سیماب کے کلام سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فطری طور پر نظام کائنات اور اہم سیاسی مسائل پر غور و خوض کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ اس غور و فکر کے نتائج انھوں نے جا بجا اپنی نظموں میں پیش کئے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک علم و حکمت کا ایک درس ہے ....."

(ڈاکٹر) محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی لاہور

مولانا سیماب کے پیامی شاعر ہونے کے ثبوت میں مجھے کسی کاوش کی ضرورت نہیں اور جو رائیں میں نے پیش کی ہیں وہ بھی وجہ تفاخر نہیں محض "سخن گسترانہ بات" کی وجہ سے زبان کھولنی پڑی۔

اعجاز صدیقی

(نگار) حضرت سیماب کی نظم "موحدِ اعظم" ایک زمانہ سے موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے۔ نظم کی حیثیت سے بھی اور اپنے مفہوم و موضوع کے لحاظ سے بھی۔ جس حد تک فنِ شعر کا تعلق ہے۔ یقیناً یہ نظم جناب سیماب کی بہترین نظموں میں سے نہیں ہے۔ انھوں نے اس سے بہتر نظمیں کہی ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔ رہا موضوع، سو وہ بھی نیا نہیں۔ شیطان کے موحد ہونے پر بہت سے صوفیہ اور شعرا نے وہی لکھا ہے جو جناب سیماب نے۔ اس لئے میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ ہنگامہ کیوں ہے۔ البتہ اگر گفتگو ہو سکتی ہے تو اس مسئلہ پر کہ شیطان کے موحد ہونے پر جو لٹریچر ہمارے یہاں پایا جاتا ہے وہ واقعی قابل استناد ہے

یا نہیں ؟ اور اس صورت میں فریق سیماب صاحب نہیں قرار پاتے بلکہ تمام وہ حضرات جو اس سے پہلے شیطآن کی شان میں مدح سرائی فرما چکے ہیں۔

اگر یہ نظم عقل و درایت سے کچھ بھی تعلق رکھتی تو میں صاف صاف کہدیتا کہ شیطان یا ابلیس کا وجود خارجی تھا کب، جس پر یہ ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے لیکن چونکہ یہ نظم ابلیس کے متعلق اُسی روایت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے جو عیسائیوں سے مسلمانوں میں منتقل ہوئی تھی اور چونکہ عام طور پہ غلطی سے واقعی شیطان کے وجود کو ایک مستقل ہستی مان لیا گیا ہے، اس لئے اسی اعتقاد کو سامنے رکھ کر ہمیں غور کرنا چاہئے کہ شیطان کی تعریف میں جو کچھ اسوقت تک لکھا گیا ہے وہ قابل اعتنا رہے یا نہیں۔

اسلامی لٹریچر میں ہم کو بالکل دو متضاد خیال نظر آتے ہیں، یعنی ایک جماعت تو اس پہ ہر نماز کے بعد لاحول پڑھتی ہے اور دوسری جماعت اس کے انکار سجدہ کو "تصور توحید" کی اعلیٰ منزل قرار دیکر اس کی تعریف کرتی ہے۔ چنانچہ اعجاز صاحب نے بھی تاریخ الخمیس اور تفسیر ابن جریر کے حوالہ سے ابلیس کی عظمت ثابت کرنے کے لئے چند اقوال نقل کئے ہیں جن سے ابلیس کے علم و فضل اور تخلیق آدم سے پہلے اس کی عبادت و ریاضت کا حال تو ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن انکار سجدہ کے بعد اس کے موحد باقی رہنے کا کوئی ثبوت ان سے نہیں ملتا اور اگر ایسا ہو بھی تو یہ اقوال اس قدر لغو مہمل اور مضحک ہیں کہ ایک ذی فہم انسان خود اپنی غلطی تو تسلیم کر لیگا لیکن اس قسم کی روایات و بیانات سے استناد پیش کرنے کی توہین کبھی گوارا نہ کرے گا۔ بہرحال شیطآن کی مذمت میں ہمارے یہاں مزخرفات کا ایک انبار نظر آتا ہے اور ایسی صورت میں کہ اختلاف رائے کھلے ہوئے تضاد کی حد تک پہونچ گیا ہے، ہمارے لئے محفوظ طریق کار صرف یہ ہے کہ ہم قرآن مجید سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں کیونکہ اس سے بہتر حکم کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

اس بحث کے سلسلہ میں کئی باتیں سامنے آتی ہیں، ابلیس و شیطآن کی حقیقت، کفر و شرک کا فرق، توحید کا صحیح مفہوم، لیکن چونکہ مسئلہ زیر بحث میں ان تمام مسائل علٰحدہ علٰحدہ غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور امر مابہ النزاع صرف یہ ہے کہ "شیطان موحد تھا یا نہیں اور اگر موحد تھا تو کیا وہ واقعی تعریف کا مستحق ہے" اس لئے میں زیادہ تر اسی پہ غور کروں گا۔ قرآن مجید میں، ابلیس کا لفظ چند سات جگہ سے زیادہ نہیں آیا اور شیطآن، الشیطآن اور شیاطین کے الفاظ بہت جگہ استعمال ہوئے ہیں ـــــ بعض مفسرین نے یہ خیال قایم کیا کہ ابلیس خاص اس فرشتہ کا نام تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور شیطان اسم صفت ہے اسی لئے اس پر آل داخل کرکے الشیطآن بھی کہا گیا ہے اور اس کی جمع شیاطین و الشیاطین بھی استعمال ہوتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال درست نہیں، اور اس کی تصدیق سورۂ سبا اور الشعرا سے بھی ہوتی ہے۔ سورۂ سبا میں تین والوں کی گمراہی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ "ولقد صدق علیہم ابلیس ظنہ فاتبعوہ الا فریقا من المومنین" (ابلیس کا گمان ان لوگوں کے متعلق صحیح نکلا اور سوائے ایک فریق کے سب نے اس کی پیروی کی) ظاہر ہے کہ یہاں ابلیس سے مراد وہ خاص ابلیس نہیں جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ عام مفہوم میں شیطان مراد ہے۔

سورۂ الشعراء میں "جنود ابلیس" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس و شیطان میں کوئی فرق نہیں۔ اور اگر ہم ماہرین زبان کے اس بیان کو صحیح مان لیں کہ یہ لفظ مادۂ "ب-ل-س" سے مشتق ہے جس کے معنے مایوس و محروم ہو جانے کے ہیں[1]۔ نیز یہ کہ ابلیس کی جمع ابالیس اور ابالسہ مستعمل ہوتی ہے، تو بھی شیطآن اور ابلیس کو ایک ہی چیز ماننا پڑے گا۔

یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں کہ ابلیس یا شیطآن کس قسم کی مخلوق سے تھا یعنی وہ جنات میں سے تھا اور ناری مخلوق تھا یا کچھ اور، کیونکہ اصل موضوع سے اس کا تعلق نہیں۔ بہرحال وہ جو کچھ تھا اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس جرم میں وہ مردود قرار پایا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ موحد تھا یا نہیں۔ کلام مجید میں لفظ واحد تو اکثر جگہ آیا ہے، لیکن لفظ توحید یا اس کے مشتقات کہیں نظر نہیں آتے، اسی لئے توحید کا مفہوم متعین کرنے میں (جس کا اسم فاعل موحد ہے) اختلاف خیال پایا جاتا ہے۔ صاحب لسان العرب کا بیان ہے کہ توحید سے مراد "علم التوحید والصفات" ہے جسے بقول علامہ تفتازانی ہم علم کلام سے متعلق کر سکتے ہیں۔

---

[1] عربی زبان میں کہتے ہیں "ابلس من رحمۃ اللہ" یعنی وہ رحمت خدا وندی سے مایوس و محروم ہو گیا۔ (نیاز)

معتزلہ "علم التوحید" میں صفات کو شامل نہیں کرتے اور دوسرے لوگ "توحید ذات" کے بھی مختلف مفہوم قرار دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
یعنی بعض تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کو ایک کہنے کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنی ذات کے لحاظ سے تنہا ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں، بعض یہ کہتے ہیں کہ حقیقی معنی میں صرف خدا کو "موجود" ماننا "توحید" ہے اور بعض ایک کے معنی کل کے لیتے ہیں، یعنی خدا کو کل سمجھنا توحید ہے۔ صوفیہ کا مسلک یہ ہے کہ توحید کا صحیح مفہوم "مشاہدۂ حق" کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

پھر معلوم نہیں کہ جناب سیماب کا شیطان کو نہ صرف موحّد بلکہ موحد اعظم کہنا، توحید کے کس مفہوم کے اعتبار سے ہے؟ خود قرآن مجید میں تو شیطان کو کسی جگہ موحّد بھی ظاہر نہیں کیا گیا، موحد اعظم ہونا تو خیر بڑی چیز ہے۔ علاوہ اس کے نفس توحید میں کمی یا زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ہم خدا کو ایک سمجھتے ہیں تو ہم موحّد کہلائیں گے، چھوٹا موحد، بڑا موحد کیسا؟ ۔ لیکن اصطلاح سے ہٹ کر البتہ ایک صورت ایسی ہو سکتی ہے جس کی بنا پر ہم ایک شخص کو موحد اعظم یا موحد اصغر کہہ سکتے ہیں اور اس کا تعلق طاعت و فرمانبرداری سے نہ ہوگا۔ فرض کیجئے ایک شخص خدا کو ایک تو کہتا ہے لیکن اس کے احکام نہیں مانتا تو وہ موحّد تو ضرور ہے مگر اس موحّد سے کمتر درجہ کا ہے جو احکام خداوندی کی تعمیل بھی کرتا ہے۔ پھر کیا شیطان کو اس معنی میں "موحد اعظم" کہنا درست ہوگا؟

اس سلسلہ میں ہم کو دیکھنا چاہئے کہ خدا نے ابلیس یا شیطان کو کن الفاظ سے یاد کیا ہے۔

سورۂ بقر اور سورۂ ص میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "ابیٰ استکبر وکان من الکافرین"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انکار سجدہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوا بلکہ چونکہ وہ پہلے ہی سے کافر تھا اس لئے اس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کیا۔

اس آیت سے تو شیطان کا ماضی بھی ہمیں ایسا شاندار نظر نہیں آتا، جیسا کہ عام مفسرین بیان کرتے ہیں۔

سورۂ حجر میں ارشاد ہوتا ہے:۔ "فاخرج منہا، فانک رجیم" یعنی اسے مردود قرار دیا گیا۔ سورۂ "الشعراء" میں صاف صاف ابلیس اور جنود ابلیس کے جہنم میں ڈالے جانے کی خبر دی جاتی ہے۔

یہ اقتباسات ہے صرف ان آیات کا جن میں ابلیس کا ذکر ہے، ورنہ شیطان کے متعلق تو بہت سی آیتیں ملتی ہیں:۔ چند ملاحظہ ہوں!

سورۂ نساء :	"یرید الشیطان ان یضلہم"	(شیطان گمراہ کرتا ہے)
اسرائیل :	"وکان الشیطان لربہ کفورا"	(شیطان ناشکر گزار ہے)
نور :	"لاتتبعوا خطوات الشیطان"	(شیطان کی پیروی نہ کرو)
اسرائیل :	"ان الشیطان للانسان عدو مبین"	(شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے)
مریم :	ان الشیطان کان للرحمٰن عصیا"	(شیطان خدا سے منحرف ہے)

پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس ہستی کو خدا نے کافر، مردود، جہنمی، گمراہ اور دشمن انسانیت قرار دیا ہو، وہ کیونکر مدح و ثنا کا مستحق ہو سکتا ہے اور قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی قول و روایت کو ترجیح دیکر اس سے استناد و استشہاد کیا معنی رکھتا ہے۔

اول تو خود قرآن سے ابلیس کا کافر ہونا ثابت ہے، لیکن اگر اس کے بعد بھی ہم اسے موحّد سمجھنا چاہتے ہیں، حالانکہ ایسا سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، تو محض موحّد ہونا کوئی ایسی بات نہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتنا سمجھا جائے۔ عہد رسالت میں بھی موحدین پائے جاتے تھے لیکن غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے انھیں کافر ہی سمجھا جاتا تھا۔

سیماب صاحب نے شیطان کو موحد اعظم، غالباً صوفیہ کے نقطۂ نظر سے کہا ہے جو آدم کو سجدہ نہ کرنے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ نہ کرنا چاہتا تھا اور یہ عظمت خداوندی کے اظہار کا نہایت اعلیٰ معیار تھا، لیکن کلام پاک سے کسی جگہ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے اس خیال سے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، بلکہ اس کی وجہ اس نے یہ ظاہر کی تھی کہ "میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم مٹی سے، اس لئے آگ مٹی کے سامنے کیونکر جھک سکتی ہے" علاوہ اس کے خود کلام مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ کا سوال پیدا ہونے سے پہلے ہی وہ کافر تھا اور اسی لئے اسنے

حکم خداوندی سے سرتابی کی۔

اعجاز صاحب نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا سیماب عاشق رسول ہیں اور حاجی وارث علی شاہ صاحب کے پرستار۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ رسول اللہ کی کوئی ایک حدیث یا حاجی صاحب کا کوئی ایک قول ایسا پیش کر سکتے ہیں، جس میں شیطان کو "موحد" کے لقب سے یاد کیا گیا ہو پھر حیرت کا مقام ہے کہ جب خدا، رسول اور پیر تینوں اس باب میں سیماب صاحب کے ہم آہنگ نہیں، تو وہ کونسی چوتھی قوت ایسی ہے جو اُن سے شیطان کی مدح سرائی کراتی ہے۔ سُنا ہے کہ گوسالۂ سامری پر شیطان کے پاؤں کی خاک ڈالدی گئی تھی تو وہ بولنے لگا تھا، لیکن یہاں تو سیماب صاحب کی ہستی تو ایک جیتی جاگتی ہستی ہے اور انھیں گویا کرنے کے لئے اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے صرف اُسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر لکھا ہے جو اس وقت سیماب صاحب اور اُن کے مخالفین کے سامنے ہے۔ ورنہ میرے نزدیک ابلیس و شیطان کا کوئی خارجی وجود نہ تھا جس کے موحد یا غیر موحد ہونے پر بحث کی جائے۔ قرآن میں اس کا ذکر صرف تمثیل کے طور سے ہوا ہے، ابلیس یا شیطان سے مراد خود انسان کی بُری فطرت ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس لئے اگر سیماب صاحب نے بھی اسی تمثیل کو سامنے رکھ کر آج کل کے مدعیان مذہب و اخلاق کو شیطان سے بدتر ظاہر کیا تو کوئی غلط بات نہیں کہی۔

سیماب صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے شاعری ہی سمجھنا چاہئے تھا، اس پر مذہبی نقد و تبصرہ کی ضرورت نہ تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ شاعر اگر موسیٰ، عیسیٰ، یوسف کی توہین کرے تو اہل مذہب خاموش رہیں اور اگر ایکبار شیطان کی تعریف کر دے تو قیامت برپا کر دیں۔

معترضین سے زیادہ مجھے سیماب صاحب پر حیرت ہے کہ وہ اسے کیوں پسند کرتے ہیں کہ جواب دیتے وقت مذہبی پہلو اختیار کیا جائے اور استناداً وہ اقوال پیش کئے جائیں جو یکسر پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں اور جو قرآنی شہادت کے مقابلہ میں کسی طرح قابل اعتنا نہیں۔

جناب اعجاز نے مولانا سیماب کے پیامی شاعر ہونے کے متعلق جو رائیں پیش کی ہیں، اُن سے انکار نہیں، لیکن میرے نزدیک پیامی شاعر صرف وہ شاعر ہے جو اپنے پیام پر عمل بھی کرے، ورنہ صرف "نظریئے" پیش کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر جناب سیماب واقعی اپنے ہر پیام کی صداقت کو اپنے عمل سے بھی ثابت کرتے ہیں، تو وہ نہ صرف پیامی شاعر بلکہ "نبی شاعر" ہیں اور یہی "یقین عمل" ان کے "نفس" کو اس حد تک مطمئن کر دینے کے لئے کافی ہے کہ وہ اس قسم کی بحث و نزاع سے علٰحدہ رہیں لیکن چونکہ ہندوستان میں اس وقت کوئی پیامی شاعر ایسا نہیں ہے جس کے حال و قال دونوں یکساں ہوں اسی لئے لوگ جناب سیماب کے بھی پیامی شاعر ہونے سے انکار کرتے ہیں اور چونکہ سیماب صاحب نے نظم "موحد اعظم" لکھ کر ایک ہی ہستی میں بیک وقت "کفر و توحید" کا اجتماع ممکن ثابت کر دیا ہے، اس لئے افسوس ہے کہ ہم ان منکرین کو شیطان کہکر بھی ان کے جحود و انکار کا انتقام نہیں لے سکتے۔

پورب اور پچھم

دو ہواؤں کا تصادم

(ایک چینی خاتون کے خطوط)

بسلسلۂ نگار اپریل ۴۲ء

میرے دل کی کیا کیفیت ہے، اسے کیونکر ظاہر کروں ..... آخر کار گھر سے روانگی کا دن آ ہی گیا۔ کیسا اُداس اور خاموش دن تھا!

سال کا دسواں مہینہ ختم ہو رہا تھا، زرد زرد خاموش پتیاں درختوں سے زمین پر گرنا شروع ہو گئی تھیں اور بانس کے درخت صبح و شام کی خنکی میں ہلتے ہوئے ایسا معلوم ہوتے تھے جیسے وہ کانپ رہے ہوں ۔ میں مکان کے ایک ایک گوشہ میں جاتی اور ہر جگہ دیر تک کھڑی ہو کر اس کی دلچسپی و دلکشی پر اس طرح غور کرتی، گویا میں ان کو اپنے ساتھ لیجانا چاہتی تھی ۔ میں حوض کے پاس دیر تک کھڑی ہو کر دیکھا کی کہ ہوا کس طرح نیلوفر کے پتوں سے کھیل رہی ہے ۔ میں ایک گھنٹہ تک جونیپر کے درخت کے نیچے بیٹھی رہی جو ہمارے مکان کے صحن میں اپنی عمر کے تین سو سال پورے کر چکا ہے ۔ میں نے اپنے ساتھ لیجانے کے لئے بانس کی ایک پتلی سی شاخ کاٹی اور داؤدی کے آٹھ گملے انتخاب کئے ۔ اس وقت داؤدی کے پھول پورے حسن و شباب پر تھے ۔ میں نے خیال کیا کہ ان کا سُرخ، سنہرا رنگ شاید میرے مکان کی اُداسی کو دور کر سکے گا ۔

الغرض میں اپنے شوہر کے گھر واپس آ گئی، لیکن وہ موجود نہ تھا ۔ نوکر سے معلوم ہوا کہ بہت صبح کسی کام سے باہر چلا گیا ہے، لیکن یہ پتہ نہیں کہ کہاں؟ میں نے داؤدی کے گملے چھوٹے کمرے میں رکھوا دئے اور سوچتی رہی کہ انھیں کس طرح سجاؤں کہ میرا شوہر جب واپس آئے تو دیکھ کر حیران رہ جائے ۔ میں نے بہت کوشش کی، لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ میرے میکہ میں تو ان کے پھول دیواروں کے سیاہ نقوش کے سامنے بہت اچھے معلوم ہوتے تھے، لیکن یہاں سفید دیواروں کے پاس وہ بہت اُداس سے نظر آتے تھے!

یہی حال میرا بھی تھا ۔ میں نے فیروزی رنگ کا ریشمی لباس پہنا اور بغیر آستین کی سیاہ مخملی جاکٹ ۔ میں نے اپنے بالوں کو بھی فیروزی رنگ کے زیوروں سے سنوارا اور کانوں کے آویزے بھی اسی رنگ کے پہنے ۔ جوتے سیاہ مخمل کے تھے جس میں سونے کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں ٹکی ہوئی تھیں ۔ ہونٹوں پر میں نے سرخی ملی، ہتھیلیوں کو گلاب سے معطر کیا، الغرض اپنے شوہر سے ملنے کے لئے پوری طرح بن ٹھن کر بیٹھ گئی، اور تھوڑی دیر بعد ہی میں نے ڈیوڑھی پر اس کے قدموں کی آواز سنی ۔ اگر میں اس وقت قدیم چینی وضع کے مکان میں ہوتی، تو میں فوراً پردہ سرکا کر سامنے آ سکتی تھی، لیکن مشکل یہ تھی کہ میں کوٹھے پر تھی اور مجھے چرچراتے ہوئے زینوں سے اُتر کر نیچے آنا تھا، اس لئے میں مجبور ہو گئی اور میری حالت بھی انھیں گل داؤدی کے پودوں کی سی ہو گئی، جو صرف خوبصورت ہیں اور کچھ نہیں ۔

میرا شوہر دیر میں آیا تھا اور تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ اس وقت تک میری تازگی بھی ختم ہو چکی تھی ۔ ہر چند اس نے مہربانی کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا، لیکن اس نے مجھے غور سے دیر تک دیکھا نہیں ۔ اس نے مجھ سے صرف یہ کہا کہ نوکر سے جلد کھانا طیار کرایا جائے کیونکہ وہ دن بھر ایک مریض کے علاج میں مصروف رہا تھا اور کھانا کھانے کا موقعہ اسے نہ ملا تھا ۔

ہم دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا، اس حال میں کہ میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور میں انھیں پی جاتی تھی ۔ لیکن اس نے جلدی سے چاول ختم کئے اور چائے پینے میں مصروف ہو گیا ۔ لیکن کبھی کبھی ٹھنڈی سانس بھی لے لیتا تھا ۔ آخر کار وہ تھکا ہوا اُٹھا اور کمرے میں چلا گیا ۔ میں بھی ساتھ تھی ۔

اس نے میرے ماں باپ کا حال دریافت کیا، لیکن میری طرف وہ زیادہ متوجہ نہ تھا اس لئے میں بھی خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بعد وہ چونکا اور معذرت کے انداز میں بولا۔ "مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی کہ تم آگئیں۔ میری خاموشی پر تم کچھ اور گمان نہ کرنا۔ افسوس ہے کہ آج سارا دن میں نے واہمہ پرستی مقابلہ کرنے میں صرف کردیا اور مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے وہ سب کچھ کیا جو کرسکتا تھا مگر پھر بھی ناکام رہا ــ تم تو خاندان کو تو جانتی ہوگی۔ انھیں کی دوسری بیوی نے آج گلے میں رسّی ڈالکر خودکشی کرلی۔ وہ اپنی ساس کی بدزبانی سے بہت عاجز آگئی تھی۔ انھوں نے مجھے بلایا اور وہ یقیناً بچ جاتی کیونکہ اسے رسّی سے لٹکے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی اور میں وقت پر پہونچ گیا تھا، لیکن جس وقت میں دوائیں بنا رہا تھا کہ بڑھا یوآیا اور اس نے کہا کہ یہ سب فضول ہے، وہی پُرانے طریقے استعمال کئے جائیں، چنانچہ اس نے پجاریوں کو بلایا تاکہ وہ ڈھول بجا بجاکر برہم شدہ روح کو پھر واپس بلائیں۔ انھوں نے اس کی ناک، منہ میں روئی ٹھونس دی چہرہ پر چاروں طرف کپڑا لپیٹ دیا اور ــــ"

میں نے کہا۔ "یہ تو ہمیشہ کیا جاتا ہے تاکہ جتنی روح اندر رہگئی ہے وہ باہر نکلنے نہ پائے" ـ وہ یہ سنکر کمرے میں ٹہلنے لگا، اور پھر میری طرف گھور کر بولا "کیا تم بھی ــــ!" ـ میں سنکر پیچھے ہٹ گئی اور آہستہ سے دریافت کیا کہ "کیا وہ مرگئی" ـ اس نے حیرت سے کہا "مرگئی! ـ وہ کیا تم بھی مرجاؤ اگر یہ عمل تمہارے ساتھ کیا جائے"۔

یہ کہکر اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور دوسرے ہاتھ سے میری ناک پر رومال کس کر لپیٹ دیا۔ میں نے گھبرا کر اسے نوچ پھینکا ـ وہ ہنسنے لگا اور پھر اپنا سر ہاتھوں پر رکھ کر دیر تک خاموش بیٹھا رہا گویا اس کا سر درد کر رہا تھا۔ میں بھی اسے خاموش دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کیا واقعی وہ سچ کہتا تھا

اس رات میں نے اپنے تمام زیور اُتار کر بکس میں رکھدئے۔ میں افسردہ تھی اور سوچ رہی تھی کہ مجھے اسوقت تک جو تعلیم دیگئی ہے کیا وہ واقعی غلط ہے۔ میرا شوہر ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کے لئے عورت محض عورت ہونے کے لحاظ سے کوئی دلچسپ چیز ہے۔ وہ پھول کو صرف اس کی خوشبو کی وجہ سے پسند نہیں کرتا۔ اس لئے مجھے اسے خوش کرنے کے لئے دوسرے طریقے استعمال کرنا چاہئے، اور مجھے یاد آگیا کہ میری ماں نے کہا تھا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ میں خود آسانی سے اپنے جکڑے ہوئے پاؤں کو نہیں کھول سکتی تھی۔ اس باب میں مسز لیو نے میری مدد کی۔ یہ ایک معلم کی بیوی تھی جو ایک غیر ملکی اسکول میں پڑھاتا تھا اور میرا شوہر اسے اپنا دوست کہتا تھا ـ جس دن میں واپس آئی تھی اسی دن مسز لیو نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ اگلے دن ملنے آئے گی۔ چنانچہ میں نے اس کی پذیرائی کے لئے بڑی طیاریاں کیں، میں نے نوکر سے کہا کہ اچھے قسم کے کیک خرید کر لائے اور تربوز کے بیج بھی۔ چائے کا بھی خاص اہتمام کیا، میں نے ارغوانی ریشم کا لباس پہنا اور کانوں میں موتیوں کے آویزے بھی ڈال لئے۔ چونکہ میں سمجھتی تھی میرا شوہر اسوقت گھر پر نہ رہے گا، اس لئے میں نے خیال کیا کہ مکان کا فرنیچر اپنے ذوق کے لحاظ سے آراستہ کردوں، لیکن وہ گھر ہی پر رہا اور جس وقت گھنٹی بجی تو خود دروازہ کھولنے گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک عورت کے استقبال کے لئے مرد کیونکر جا سکتا ہے۔ میں نے کمرہ کے اندر جھانک کر دیکھا تو میں نے ایک عجیب وغریب بات دیکھی، میرا شوہر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے اُسے جھٹکے دے رہا تھا اور دونوں بہت خوش تھے۔ میں حیران تھی کہ اس وقت اس کے چہرہ پر جس خوشی کے آثار پائے جاتے تھے وہ کبھی مجھے دیکھ کر پیدا نہیں ہوئے اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اس کو خوش رکھنے کی کیا صورت اختیار کروں۔

جب تک وہ میرے مکان پر رہی میں نے بہت غور کیا کہ اس کے چہرہ میں کیا بات ہے جو مجھ میں نہیں، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وہ یقیناً مجھ سے زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ اس کا چہرہ چوڑا چکلا تھا اور آنکھیں چھوٹی۔ وہ معمولی ریشمی قمیص کے اوپر خاکی رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھی اور اس کے پاؤں میں مردوں کا سا جوتا تھا۔ اس کی آواز البتہ دلکش تھی، گفتگو بھی جلد جلد کرتی تھی اور اس کی ہنسی میں ایک خاص قسم کی گرمی پائی جاتی تھی۔

وہ دیر تک میرے شوہر سے باتیں کرتی رہی اور میں سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی، انھوں نے ایسی ایسی باتیں کیں جو میں نے کبھی نہ سُنی تھیں۔ غیر ملکی الفاظ ان کی زبان سے نکلتے تھے اور دونوں بہت خوش نظر آتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد میں اپنے شوہر کے پاس خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ رہ رہ کر مجھے دن کا خیال آرہا تھا جب مسز لیو ملنے آئی تھی۔ میں نے اپنے شوہر کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا، وہ اس سے اس طرح باتیں کرتا تھا گویا وہ مرد تھی۔

میں اُٹھکر اس کے پاس گئی اور میں نے اس سے پوچھا کہ "مجھ سے اس خاتون کا حال بیان کرو، جو آج ملنے آئی تھی"۔

وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور مجھ کو غور سے دیکھ کر بولا کہ "وہ یوروپ کے ایک بڑے کالج کی گریجویٹ ہے، وہ بڑی ہوشیار و ذہین ہے جیسا کہ ایک عورت کو ہونا چاہئے۔ وہ اس وقت تین لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کر رہی ہے جو بہت ذہین، صاف ستھرے اور سلیقہ مند ہیں، میں جب انھیں دیکھتا ہوں تو بہت خوش ہوتا ہوں"

میں نے یہ سُنا تو اس عورت کی طرف سے اور زیادہ نفرت دل میں پیدا ہوئی، لیکن کیا کر سکتی تھی۔

میں نے پوچھا:- "کیا تم اسے خوبصورت خیال کرتے ہو"

اس نے کہا:- "کیوں نہیں، وہ تندرست ہے، ذی فہم ہے اور اپنے مضبوط و توانا قدموں پر چلتی ہے"۔ یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کے دل میں کیا تھا۔ اگرچہ میں بہترین شفتالو کے رنگ کے ریشمی لباس پہنے ہوئے تھی اور کان میں موتیوں کے آویزے بھی تھے۔ میرے سیاہ چمکیلے بال بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ گندھے ہوئے تھے اور میں اس سے اتنی قریب کھڑی تھی کہ اس کے جسم کی ذراسی جنبش میرے جسم سے مس کر سکتی تھی لیکن وہ میری طرف بالکل متوجہ نہ تھا۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا اور اپنے ماضی کو فراموش کر کے کہا کہ "میں اپنے بندھے ہوئے پاؤں کھولنے کے لئے طیار ہوں"۔

جس وقت میں پچھلی باتوں کا خیال کرتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے شوہر کی دلچسپی میرے ساتھ اسی شام سے شروع ہوئی۔ اس سے پہلے ہم دونوں کے پاس گفتگو کرنے کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ میں اسے حیرت سے دیکھا کرتی تھی اور وہ مجھے دیکھتا ہی نہ تھا۔ جب ہم باتیں کرتے تو اس طرح گویا ایک دوسرے سے اجنبی ہیں۔ لیکن اب وہ مجھے دیکھتا بھی تھا، میری سنتا بھی تھا اور اپنی کہتا بھی تھا۔ میری محبت جو اس وقت تک دل ہی دل میں کپکپایا کرتی تھی اب اس میں ٹھیراؤ پیدا ہوگیا تھا۔ میں کبھی وہم بھی نہ کر سکتی تھی کہ ایک مرد عورت کی طرف اتنا جھک سکتا ہے۔

جب میں نے اس سے پوچھا کہ "اپنے پاؤں کیسے کھولوں"، تو میں نے خیال کیا کہ وہ مجھے اس کی ترکیب بتا دے گا، لیکن میں حیران رہ گئی، جب وہ خود اُٹھ کر طشت، گرم پانی اور سفید کپڑے کی پٹی لایا! مجھے شرم معلوم ہوتی تھی، میں یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ میرے پاؤں دیکھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا اسوقت سے اب تک کسی نے میرے پاؤں نہ دیکھے تھے۔ اس لئے جب زمین پر طشت رکھ کر وہ میرے پاؤں کی طرف جھکا، تو میرا جسم کانپ رہا تھا۔

میں نے کہا:- "میں خود کھول لونگی"۔ اس نے جواب دیا:- "تم خیال نہ کرو، تمھیں معلوم نہیں، میں ڈاکٹر ہوں"۔

میں نے پھر انکار کیا تو اس نے میرے چہرہ کو غور سے دیکھا اور بولا "مجھے معلوم ہے کہ تمھیں اس خیال سے تکلیف ہوتی ہے کہ میں تمھارے پاؤں چھوؤں لیکن میرا فرض ہے کہ تمھاری مدد کروں۔ کوئیلین، میں تمھارا شوہر ہوں"۔ یہ سُنکر میں خاموش ہوگئی۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر آہستہ سے جوتا موزہ اُتارا اور کپڑا علحدہ کیا۔ اس نے نہایت نرم و افسوس کے لہجہ میں کہا "تمھارا لڑکپن بھی کیسی مصیبت میں بسر ہوا اور پھر کوئی نتیجہ نہیں!"

یہ سنکر میری آنکھ میں آنسو آگئے۔

جب میرے پاؤں کھول کر دوبارہ ان پر ڈھیلی پٹی باندھی گئی تو مجھے سخت تکلیف شروع ہوئی۔ یعنی جو تکلیف اول اول پاؤں کے باندھنے میں ہوئی تھی وہی اب کھولنے کے بعد بھی محسوس ہونے لگی۔ میرے پاؤں آہستہ آہستہ پھیلنے لگے اور خون کی گردش شروع ہوئی۔

دن میں کسی وقت گھبرا کر میں پٹی کھول لیتی اور پھر تنگ کر کے باندھتی تاکہ تکلیف کم ہو جائے، لیکن پھر شوہر کے خیال سے ڈھیلی کر دیتی۔ اب مجھے نہ آئینہ دیکھنے کا ہوش تھا اور نہ اس بات کا کہ میں اپنے شوہر کے سامنے بن سنور کر آؤں۔

رات کو میری آنکھیں روتے روتے سوج جاتی تھیں اور میری آواز بھرّانے لگتی تھی، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ میں اپنے حُسن سے وہ چیز حاصل نہ کر سکی تھی جو اب رنج و تکلیف سے حاصل ہوئی۔ کیونکہ اب میرا شوہر مجھے ہر وقت تسکین دیا کرتا اور بعض اوقات میں بچوں کی طرح اس سے لپٹ کر رونے لگتی۔

اس نے کہا:- "کوئیلین، ہم دونوں ملکر تمھاری اس تکلیف کو برداشت کریں گے۔ بیشک تمھیں سخت تکلیف ہے، لیکن یہ تو سوچو کہ تمھاری یہ قربانی دوسروں کے لئے ہے، ساری قوم کے لئے ہے اور پُرانی ذلیل رسموں کے خلاف احتجاج ہے"۔

میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا:- "نہیں، میں یہ سب کچھ صرف تمھارے لئے برداشت کر رہی ہوں"۔ وہ یہ سنکر ہنسنے لگا اور اس کے چہرہ پر وہی چمک آگئی جو مسز لیو سے بات کرتے وقت نظر آتی تھی۔ یہ تھا میری تکلیف کا انعام اور اس کے بعد مجھے کوئی مصیبت نہ رہی۔

اب میرے پاؤں زیادہ مضبوط ہو چلے تھے اور میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتی تھی - چونکہ میں جوان تھی اس لئے میرے پاؤں جلد ٹھیک ہو گئے - بوڑھی عورتوں کے پاؤں تو بعض اوقات خشک ہو کر الگ ہو جاتے ہیں - اب میرے جسم میں بھی توانائی پیدا ہو چلی تھی اور زینہ پر بے تکلف آجا سکتی تھی - ایک شام جب میں زینہ سے اُتر کر دوڑتی ہوئی اپنے شوہر کے کمرہ میں چلی گئی تو وہ بے اختیار ہنس پڑا - وہ بہت خوش تھا - مگر میں نے افسردہ ہو کر کہا کہ "میرے پاؤں اب بھی مسز لیو سے بہت چھوٹے ہیں، اتنے بڑے کب ہوں گے" ۔۔۔ اس نے کہا : - "اتنے بڑے نہیں ہو سکتے، لیکن تمھارے پاؤں بھی کافی بڑے ہیں" ۔۔۔ مجھے یہ سُنکر افسوس تو ہوا، لیکن میں نے ایک ترکیب اور سوچی - میرے پُرانے زربفت کے جوتے تو اب بیکار تھے اس لئے دوسرے دن میں نوکر کو ساتھ لیکر دوکان پر گئی اور مسز لیو کی طرح چمڑے کا جوتا خریدا لیکن اپنے پاؤں سے دو انچ بڑا اور اندر نوک کی طرف میں نے روئی ٹھونس دی - ان کے پہننے کے بعد کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ میرے پاؤں کسی وقت جکڑ دئے گئے تھے ۔۔۔ اب میں مسز لیو سے ملنے کے لئے بیتاب تھی، میں نے پوچھا "ہم کب چلیں گے"- اس نے کہا "کل ہم تم دونوں ساتھ چلیں گے"۔

یہ سنکر مجھے تعجب ہوا کہ وہ گلی میں میرے ساتھ ساتھ چلے گا، لیکن میں اب اس قسم کی باتوں کی عادی ہو چلی تھی ۔۔۔ دوسرے دن ہم دونوں وہاں گئے اور بعض باتیں اس نے بہت عجیب کیں - جب میں گھر واپس آئی تو میں نے پوچھا کہ "مسز لیو کے کمرہ میں داخل ہوتے وقت تم نے مجھے آگے کیوں کر دیا تھا، کیا یہ صحیح ہے کہ مغرب میں مرد، عورتوں سے کم درجہ کے سمجھے جاتے ہیں" ۔۔۔ اس نے کہا - "یہ بات نہیں، بلکہ یہ بہت پُرانی تہذیب ہے جو قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے"۔

یہ سنکر مجھے تعجب ہوا، کیونکہ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ ہم لوگوں سے زیادہ قدیم مہذب قوم کوئی دوسری ہی نہیں - مگر اب معلوم ہوا کہ مغربی باشندے بھی اپنی تاریخ رکھتے ہیں اور بالکل وحشی نہیں ہیں -

میں جب رات کو اپنے بستر پر گئی تو بہت خوش تھی، کیونکہ میں نے زیور وغیرہ بھی نہ پہنے تھے اور بہت کچھ مسز لیو کی طرح معلوم ہوتی تھی -

اب مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے اندر نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے - میرا شوہر روز شام کو مجھ سے دوران گفتگو میں عجیب عجیب باتیں بیان کرتا اور میں سُنکر حیران رہ جاتی - ایک بار جب میں نے اہلِ مغرب کے عادات و اطوار کا حال سُنکر بہت حیرت کی تو اس نے کہا "وہ بھی ایسی حیرت کرتے ہیں - ہمارے لباس پر، ہماری غذا پر اور ہماری زندگی پر" ۔۔۔ ہر چند یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ہماری معاشرت کس پہلو سے حیرت کے قابل ہو سکتی ہے، لیکن میں یہ سُنکر خاموش ہو گئی ۔۔۔ پھر اس نے مغرب کی بہت سی ایجادات کا ذکر کیا اور میں یہ سنکر حیران رہ گئی کہ وہ سمندر کے اندر اور ہوا کے اوپر بھی آزادی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں - میں نے کہا کہ :- "یہ سب جادو کے زور سے کرتے" ۔۔۔ اس نے کہا :- "نہیں یہ جادو نہیں ہے، بلکہ اسے سائنس کہتے ہیں" ۔۔۔ یہ لفظ سنکر مجھے خیال آیا کہ میرا بھائی بھی اسی چیز کے لئے ملک سے باہر غیروں میں پڑا ہوا ہے اور میں نے کہا کہ "میں بھی سائنس کو دیکھنا چاہتی ہوں" ۔۔۔ وہ یہ سُنکر ہنس پڑا اور بولا کہ :- "وہ کوئی کھلونا نہیں ہے، جسے تم ہاتھ میں لیکر دیکھ سکو" - اور یہ کہکر وہ الماری سے کتابیں اُٹھا لایا اور تصویریں دکھا دکھا کر مجھے سمجھانے لگا - مجھے ان باتوں سے اتنی دلچسپی ہوئی کہ میں چاہتی تھی خود بھی کسی سے ایسی باتیں کروں اور چونکہ سوا کھانا پکانے والی کے اور کوئی نہ تھا جس سے میں ایسی باتیں کر سکتی اس لئے ایک دن میں نے اس سے کہا : "تمھیں معلوم ہے کہ دُنیا گول ہے اور ہمارے ملک کے سوا اور بھی بہت سے بڑے بڑے ملک دنیا میں موجود ہیں" ۔ وہ ٹوکری میں چاول دھو رہی تھی - یہ سنکر اس نے ٹوکری زمین پر رکھ دی اور بولی - "کون کہتا ہے ؟" - میں نے کہا : "تمھارا مالک کہتا ہے" ۔۔۔ وہ یہ سُنکر چپ ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد بولی کہ "ہاں، مالک تو بہت کچھ جانتے ہیں، لیکن یوں دیکھنے میں تو زمین گول نہیں معلوم ہوتی کسی پہاڑی یا منارہ پر چڑھکر دیکھو تو دور تک میدان ہی میدان نظر آتا ہے اور گولائی کا کہیں پتہ نہیں" ۔۔۔ میں نے کہا : "صرف یہی نہیں بلکہ زمین اتنی بڑی ہے کہ اس کے دوسری طرف پہونچنے کے لئے چاند کو پورا چکر لگانا پڑتا ہے اور جب یہاں اندھیرا ہوتا ہے تو زمین کے دوسرے حصہ میں روشنی ہوتی ہے"۔

اس نے کہا - "ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا، یہ بالکل غلط ہے - اگر چاند کو دوسرے ملکوں تک پہونچنے میں اتنے دن لگتے ہیں تو سورج ایک گھنٹہ میں کیونکر وہاں پہونچ سکتا ہے، جبکہ یہاں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک پہونچنے میں پورا دن صرف ہو جاتا ہے"۔

وہ تو یہ کہکر پھر چاول دھونے میں مصروف ہو گئی، لیکن میں یہ سوچ میں پڑ گئی کہ واقعی یہ کیسے ممکن ہے کہ مغرب کا بھی وہی چاند سورج ہو، جو ہمارا ہے -

(ادارۂ نگار)

سائنس کے گھریلو شعبدے

ہوا کے دباؤ سے دھماکا — یہ چیزیں فراہم کیجئے:- ایک تسلا — ایک بوتل کشادہ منھ کی — پتلا ربڑ غبارے کا — انگیٹھی یا گیس کا چولھا — ربڑ کا فیتہ یا بندھن -

بوتل میں چوتھائی انچ پانی بھر کر تسلے کے درمیان رکھ دیجیے اور تسلے میں ایک انچ پانی بھر کر انگیٹھی یا گیس کے چولھے پر رکھ کر گرم کیجئے یہاں تک کہ تسلے کا پانی اُبلنے لگے — اس کے بعد رومال یا صافی سے پکڑ کر بوتل ہٹا لیجئے اور اس کے منھ پر ربڑ کا ٹکڑا فیتہ سے باندھ کر کسی ٹھنڈی جگہ رکھ دیجئے۔ تھوڑی دیر میں ایک بلند آواز پیدا ہوگی اور ربڑ کا ٹکڑا پھٹا ہوا نظر آئے گا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ بوتل چونکہ اسٹیم یا بھاپ سے بھر گئی تھی اس لئے اس کی ہوا بھی نکل گئی تھی۔ جب اس کا منھ ربڑ سے بند کر دیا گیا تو اسٹیم ٹھنڈی ہو کر پانی میں تبدیل ہوگئی اور تھوڑا سا خلا (Vacuum) پیدا ہوگیا۔ پھر چونکہ بوتل کے اندر ہوا نہ جا سکتی تھی اس لئے ربڑ پر اس کا دباؤ پڑا اور وہ پھٹ گیا۔ ہوا کا دباؤ ہر مربع انچ پر پندرہ پونڈ ہوتا ہے!

ہوا کے دباؤ سے کنسٹر کا پچک جانا — یہ اشیا فراہم کیجئے:- دو گیلن والا ٹین کا کنسٹر — ڈاٹ — صافی — گیس کا چولھا یا انگیٹھی -

کنسٹر میں چوتھائی انچ پانی بھر دیجئے اور اسے چولھے پر رکھ دیجئے یہاں تک کہ پانی اُبلنے لگے۔ اس کے بعد اتار کر فوراً ڈاٹ لگا دیجئے لیکن ڈاٹ ایسی لگائے کہ ہوا اندر نہ جا سکے۔ اب کنسٹر کو کسی ٹھنڈی جگہ میں رکھ کر اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈالیے۔ تھوڑی دیر میں کنسٹر پچک جائے گا
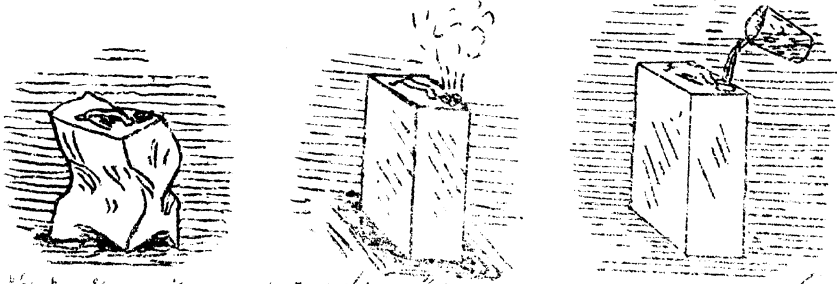
ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی وجہ بھی وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی۔ اور چونکہ کنسٹر کا رقبہ تقریباً ۳۰۰ مربع انچ تھا اس لئے اس پر ڈھائی ٹن کا دباؤ پڑ گیا اور وہ پچک گیا۔

جادو کا گلاس — یہ چیزیں فراہم کیجئے:- ایک گلاس — ایک موٹی دفتی چار انچ مربع -
گلاس کو لبالب پانی سے بھر دیجئے اور دفتی کو دونوں طرف تر کرکے گلاس کے منھ پر اس طرح رکھدیجئے کہ ہوا اندر نہ جاسکے - اس کے بعد دفتی پر ہاتھ رکھ کر گلاس کو اُلٹ دیجئے تاکہ پیندا اوپر ہو جائے اور اسے کسی برابر جگہ رکھ کر آہستہ آہستہ دفتی کھسکانے کی کوشش کیجئے - دیکھئے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے -

کیوں ؟ — پانی اور دفتی دونوں ہوا کے دباؤ سے اپنی اپنی جگہ قائم ہو جاتے ہیں - آپ کسی طرف سے پانی نہیں اُنڈیل سکتے جب تک ہوا اس کے اندر نہ جاسکے - پھر چونکہ گلاس کے اندر دفتی کی وجہ سے ہوا نہیں جاسکتی اس لئے پانی بھی بہہ کر باہر نہیں نکل سکتا -

---

ٹھنڈے پانی سے اُبال — یہ چیزیں فراہم کیجئے:- ایک بوتل — ایک ڈاٹ — ایک گلاس — ایک تسلا — پانی — گیس کا چولھا یا انگیٹھی -
نصف بوتل پانی سے بھر دیجئے اور تسلے میں ایک انچ پانی بھر کر بوتل اس کے درمیان رکھدیجئے اس کے بعد انگیٹھی پر رکھ کر گرم کیجئے، یہاں تک کہ بوتل کا پانی قریب قریب اُبلنے پر آجائے - پھر بوتل الگ کرکے فوراً ڈاٹ لگا دیجئے اور اُلٹا کرکے پیندے کی طرف ٹھنڈا پانی ڈالتے رہئے تھوڑی دیر میں بوتل کا پانی کھولنے لگے گا اور اگر ڈاٹ خوب مضبوط لگی ہے تو کئی منٹ تک کھولتا رہے گا -
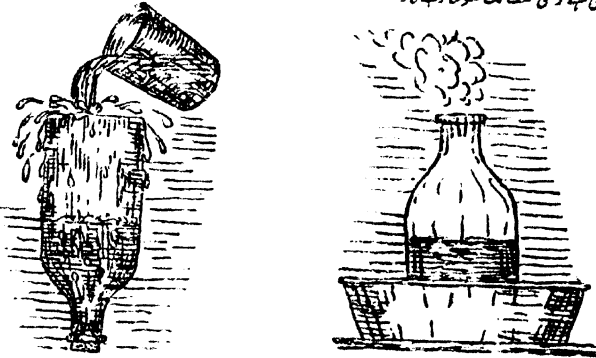
کیوں ؟ — پانی اسی وقت اُبلتا ہے جب اس کی بھاپ ہوا کے دباؤ پر غالب آجائے - اس لئے جتنا کم دباؤ ہوا کا ہوگا اتنی ہی کم بھاپ اور کم حرارت کی ضرورت ہوگی - پھر چونکہ ٹھنڈے پانی سے بوتل کے اندر کی بھاپ بھی ٹھنڈی ہوگئی تھی اور بوتل میں کچھ خلا پیدا ہوگیا تھا اس لئے ہوا کا دباؤ بھی کم ہوگیا اور پانی میں صرف اتنی حرارت باقی رہی جو ہوا کے اتنے کم دباؤ کی حالت میں اُبال لانے کی کافی تھی -

---

غوطہ خور شیشی — یہ چیزیں فراہم کیجئے:- کشادہ منھ کی بوتل — چھوٹی سی شیشی — غبارہ کا ربڑ — ربڑ کا بندھن -
بوتل کو لبالب اور شیشی کا چوتھائی حصہ پانی سے بھر دیجئے - شیشی میں ڈاٹ لگا کر منھ نیچے کی طرف کرکے بوتل میں ڈالئے - اگر وہ تیرتی ہے تو تھوڑا سا پانی زیادہ کرکے اس کو اس قابل بنا دیجئے کہ وہ بوتل کے پانی کی سطح تک تیرتی رہے - اس کے بعد آپ بوتل کے منھ پر بندھن سے ربڑ باندھ دیجئے اور ہتھیلی یا انگلی سے ربڑ کو

دبائیے تو شیشی نیچے چلی جائے گی اور جب آپ دباؤ ہٹا لیں گے تو پھر اوپر ابھر آئے گی۔ اگر آپ اس دباؤ کی کمی یا زیادتی کو اچھی طرح سمجھ لیں گے تو آپ شیشی کو جہاں چاہیں پانی کے اندر تیرتا ہوا قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ بوتل پانی سے بالکل لبریز ہونا چاہئے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ — شیشی پانی میں اس لئے تیرتی ہے کہ اس کے اندر ہوا کی جگہ ہوتی ہے۔ پھر یہ جگہ جتنی زیادہ ہو گی اتنی ہی زیادہ تیرنے کی کیفیت اس میں پیدا ہو گی اور جب یہ جگہ بہت کم رہ جائے گی تو ڈوب جائے گی۔

جب کوئی رقیق چیز کسی ظرف میں بند ہوتی ہے تو اس پر دباؤ ڈالنے سے رقیق مادہ اور ظرف دونوں پر برابر کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے جب آپ نے انگلی سے اس پر دباؤ ڈالا تو شیشی کے اندر کی ہوا پر [illegible] دباؤ پڑے گا اور شیشی ڈوب جائے گی، اسی طرح جب دباؤ ہٹا لیا جائے گا تو شیشی پھر ابھر آئے گی۔

تیرنے والی سوئی —

کیا چاہئے: سینے کی باریک سوئی ... پانی کا گلاس

سوئی کو چٹکی سے اچھی طرح [illegible] انگوٹھے اور کلمہ کی انگلی کے درمیان لیکر آہستہ سے بھرے ہوئے گلاس کی سطح پر چھوڑ دیجئے، سوئی تیرنے لگے گی۔

کیوں؟ — [illegible] سوئی [illegible] پانی [illegible] سوئی کو ڈبو دیتا، لیکن چونکہ چٹکی کی رگڑ سے اس کی سطح پر ہلکی سی چکنائی پیدا ہو گئی اس لئے پانی اس کے چاروں طرف [illegible] اور وہ تیرنے لگی۔

دفع و جذب کا تماشہ — کیا چاہئے: [illegible] موم بتی — بننے کی سلائی — [illegible] شکر کے چوپہل ٹکڑے — ابرق کا سفوف

[illegible] گرم پانی [illegible] اور موم بتی [illegible] کے باریک ذرات پانی میں چھڑک دیجئے۔ اب شکر کے ٹکڑے کو آپ پانی کے پاس لیجائیے تو آپ دیکھیں گے

الغرض دس لاکھ فوج کو بندوق، مشین گن اور ریوالور وغیرہ مہیا کرنے کے لئے کم ازکم ڈھائی کرور گنی چاہئے۔ لیکن یہ خرچ اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتا۔ کیونکہ لڑائی میں جو بندوقیں، توپیں یا دوسری چیزیں ضایع ہوجاتی ہیں ان کو پھر فراہم کیا جاتا ہے اور اس کے لئے سالانہ کم ازکم ۷۰ لاکھ گنی چاہئے۔

اب گولوں اور بموں وغیرہ کو لیجئے تو ان کے مصارف اور زیادہ حیرتناک نظر آئیں گے، کیونکہ طیارہ شکن توپ سے جو گولے سرکئے جاتے ہیں، ان پر ۹۰ گنی فی منٹ لاگت آتی ہے اور اگر بیک وقت ۵۰ توپیں سرکی جائیں تو دس منٹ میں ۴۵ ہزار گنی کے گولے پھینک جائیں گے۔

بڑی بڑی توپوں کے گولوں کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے اور ایک ایک گولے کی قیمت ۴۰ گنی سے ۱۰۰ گنی تک ہوتی ہے۔ پچھلی جنگ میں ایسی تین ہزار توپیں کام میں لائی گئی تھیں جن کے گولوں کا روزانہ خرچ ۳۰ ہزار گنی تھا اور اس جنگ میں تو کہیں زیادہ توپیں کام میں لائی جا رہی ہیں۔

الغرض اس تقسیم کے تحت ۱۰ لاکھ فوج کے سالانہ مصارف ۳۲ کرور ۵۰ لاکھ گنی تک پہونچتے ہیں۔

(۴) چونکہ اسوقت تمام فوجیں میکانکی ذرایع سے حرکت کرتی ہیں، اور اس کے لئے موٹروں، سائکلوں، موٹر سائکلوں اور ٹینکوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے مصارف کی یہ مد بھی بہت بڑی مد ہے۔

۱۰ لاکھ فوج کے لئے موٹر سائکلوں اور موٹروں کی قیمت کا اندازہ چار کرور ۴۰ لاکھ گنی کیا جاتا ہے۔ ٹینکوں کی قیمت مختلف ہوتی ہے یعنی ۲۵۰۰ گنی سے لیکر ۲۵۰۰۰ گنی تک، اس لئے ایک ہزار ٹینکوں کی قیمت (جو ۱۰ لاکھ کی سپاہ کے لئے ضروری ہیں) ۵۰ لاکھ گنی ہوتی ہے۔ ان میکانکی مرکبوں کی عمر بہ حالت امن چھ سات سال سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن لڑائی کی حالت میں ایکسال سے زیادہ یہ کام نہیں دے سکتیں، پھر بہت سے ضایع ہوجاتے ہیں، چھین جاتے ہیں اس لئے مقررہ تعداد پوری کرنے کے لئے بھی کافی روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اس مد میں پہلے سال کے مصارف کا اندازہ ۹ کرور ستر لاکھ گنی کیا جاتا ہے۔

(۵) اس لڑائی میں ہوائی جہازوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے جن کی قیمت فی جہاز ۷۵۰۰ گنی سے ۵۰ ہزار گنی تک ہوتی ہے۔ پھر اگر ہم صرف تین ہزار جہازوں کی فوج کو سامنے رکھیں جس کے لئے پندرہ ہزار ہوا باز درکار ہوں گے تو سات کرور پچاس لاکھ گنی اس مد میں رکھ لیجئے۔ لیکن اگر جہازوں کے نقصانات اور بموں کی قیمت کو بھی سامنے رکھئے تو پھر یہ مقدار ۸۷ کرور ۵۰ لاکھ گنی تک پہونچ جاتی ہے۔

(۶) اب پٹرول کے مصارف کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اوسط وزن کا ٹینک ایک گیلن میں ایک میل سے زیادہ نہیں چل سکتا اس لئے تمام چھوٹے بڑے ٹینکوں، موٹروں، موٹر سائکلوں اور رسد رسانی کی موٹروں کے لئے جن کی مجموعی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے پٹرول کی غیر معمولی مقدار درکار ہے چنانچہ اس لڑائی میں جس وقت جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا ہے تو تین ہفتوں میں ایک کرور گنی کا پٹرول صرف ہوا تھا، اس لئے ۱۰ لاکھ فوج کے لئے اوسط خرچ سالانہ اس مد میں ۷ کرور ۵۰ لاکھ گنی سے کم نہیں ہوتا۔

اس طرح اب ان تمام مدات کو یکجا کیجئے تو نتیجہ یہ نکلے گا:۔

۱۔	شہری مدافعت کے لئے	۵۰ کرور گنی
۲۔	لشکری طیاری کے لئے	۵۰ کرور گنی
۳۔	توپوں اور گولوں کے لئے	۳۰ کرور ۵۰ لاکھ گنی
۴۔	موٹروں اور ٹینکوں کے لئے	۱۹ کرور ۷۰ لاکھ گنی
۵۔	ہوائی جہازوں کے لئے	۸۷ کرور ۵۰ لاکھ گنی
۶۔	پٹرول وغیرہ کے لئے	۸ کرور گنی

یعنی یہ مجموعی مقدار دو ارب سینتالیس کرور ستر لاکھ گنی تک پہونچتی ہے اور اگر گنی کی قیمت اس کو سکۂ رائج قرار دیکر صرف تیرہ روپیہ رکھیں تو دوسرے الفاظ میں یہ رقم ۲۹ ارب سے زیادہ ہوتی ہے اور اگر سونے کے موجودہ نرخ کو سامنے رکھئے تو اس سے تگنی!

پھر لطف یہ ہے کہ ان مصارف میں بحری طیاریوں اور بحری جہازوں کے مصارف شامل نہیں ہیں جو لڑائی کی بہت بڑی مد ہے اور اگر آپ انھیں بھی شامل کرلیں تو پھر یہ رقم ۶۰ ارب تک پہونچ جاتی ہے!

باب الاستفسار

کس کا شعر ہے

(جناب عبداللطیف خانصاحب - لاہور)

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے
حُسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

مولانا - مندرجۂ بالا شعر کس کا ہے براہ نوازش مطلع فرمایئے اور یہ بھی دریافت طلب ہے کہ "پروردگار" کی دال متحرک ہے یا کیا۔؟

اگر براہ راست جواب میں تکلف ہو تو بذریعہ نگار مرحمت فرمایئے اور کیا اچھا ہو تا کہ مولانا نیاز صاحب بھی آپ استصواب رائے فرمالیتے۔

مجی مولانا نیاز - یہ کارڈ میرے نام آیا ہے لہذا جواب عرض کرتا ہوں اگر مناسب ہو تو باب الاستفسار میں شایع فرما دیجئے - امید امیٹھوی

یہ شعر رشید افتخوری کے قصیدۂ خمریہ کا ہے چنانچہ مولف خزانہ عامرہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں :-

فتحپور از توابع اکبر آباد است .... رشید چندے رفاقت خانخاناں اختیار کرد و ایامے ملازمت شہریار بن جہانگیر بادشاہ برگزید در عہد صاحبقران ثانی در ذیل بندگان بادشاہی درآمد و آخر مستعفی شدہ در کشمیر گیر گشت و ...... ہماں جا شربت ممات چشید دقیقیکہ قصیدہ خمریہ گفت کہ مطلعش اینست چیست دانی الخ — انتہی خزانۂ عامرہ صفحہ ۱۷۴ -

پروردگار بدال موقوف ، خداوند تعالےٰ کہ پرورندہ ہمہ است وبمعنی پرورندہ نیز آمدہ و اظہار حرکت دال غلط محض است

(ابو الکمال) اُمید امیٹھوی

(نگار) مولانا امید امیٹھوی نے جو جواب تحریر فرمایا ہے وہ تاریخ ولغت کے اعتبار سے بالکل درست ہے -

---

نگار کے پچھلے پرچے

(سنہ ۲۶ء) جنوری عہ ر- (سنہ ۲۷ء) اگست عہ ر- (سنہ ۳۰ء) مئی عہ ر- (سنہ ۳۱ء) جولائی ۸ ر- اگست ۸ ر- ستمبر عہ ر- اکتوبر ۸ ر- نومبر ۸ ر- دسمبر ۸ ر (سنہ ۳۲ء) فروری عہ ر- مارچ عہ ر- مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ ر فی پرچہ - نومبر عہ ر- (سنہ ۳۳ء) فروری عہ ر- (سنہ ۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر، عہ ر فی پرچہ -- (سنہ ۳۶ء) دسمبر عہ ر- (سنہ ۳۷ء) جنوری عا ر- فروری عہ ر- مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ ر فی پرچہ - اکتوبر عہ ر -- (سنہ ۳۸ء) جنوری سے ر- فروری ۸ ر- اپریل عہ ر- مئی تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ -- (سنہ ۳۹ء) جنوری عہ ر- فروری تا جولائی ۸ ر فی پرچہ ستمبر عہ ر- اکتوبر- نومبر ۸ ر فی پرچہ -- (سنہ ۴۰ء) جنوری عہ ر- فروری تا جون ۸ ر فی پرچہ، جولائی و اگست عہ ر فی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۱ء) جنوری، فروری عا ر- مارچ تا دسمبر ۸ ر فی پرچہ - (سنہ ۴۲ء) جنوری، فروری عہ ر- مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی ۸ ر فی پرچہ -

مینجر نگار - لکھنؤ

جاسوسی کے علمی طریقے

جب سے امریکہ نے ملکی مدافعت اور اتحادیوں کی مدد کے سلسلہ میں اپنی اسلحہ سازی اور جنگی طیاریوں کو وسیع کیا ہے، وہاں کے محکمۂ خفیہ کو مجرموں کے ایسے خطرناک طبقہ سے واسطہ پڑ رہا ہے جس کا وجود کھلا ہوا دشمنوں سے زیادہ اندیشہ ناک ہے!

یہ جماعت اُن جاسوسوں اور غیر ملکی ایجنٹوں کی ہے جو امریکہ کی آبادی میں ملے جلے یہاں کے تمام حالات معلوم کرتے رہتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ امریکہ کی جنگی طیاریوں کو سخت سے سخت نقصان پہونچایا جائے۔

اس جماعت کے مقابلہ کے لئے امریکہ کا محکمۂ پولیس کے علاوہ ایک اور محکمۂ تفتیش ہے جسے Federal Bureau of Investigation کہتے ہیں اور یہ دونوں محکمے اس جماعت کی جستجو کے سلسلہ میں عجیب و غریب علمی طریقے استعمال کرتے رہتے ہیں۔

اس وقت امریکہ میں نازیوں کی ہمدرد جماعت کافی پائی جاتی ہے اور نازی ایجنٹوں کے زیر اثر یہ لوگ ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ اسلحہ سازی کے کارخانوں، میگزینوں اور بحری و فضائی اڈوں کو نقصان پہونچایا جائے۔

اب پریسیڈنٹ امریکہ نے اس جماعت کے کھوج لگانے کا کام اسی بیورو کے سپرد کر دیا ہے جس کے ڈائرکٹر اڈگر ہوور ہیں۔ اس بیورو کے پاس، علاوہ انگوٹھوں کے نشانات کے علمی تجربہ گاہیں بھی ہیں، جہاں خوردبینوں، تصویر کشی کے آلات اور دوسرے کیمیاوی ذرائع سے مجرموں کا پتہ چلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ علاقہ ریڈفورڈ کے کسی مکان میں ایک چور داخل ہوا اور بہت سا مال چرا کر لے گیا، اس نے احتیاطاً گھر کے ٹیلی فون کا تار بھی چاقو سے کاٹ دیا تھا تاکہ اگر گھر والے جاگ جائیں تو فوراً پولیس کو اطلاع نہ دے سکیں۔

پولیس نے ایک شخص کو شبہ میں گرفتار کیا جس کے پاس سے ایک چاقو بھی نکلا۔ یہ چاقو محکمۂ بیورو کے پاس بھیج دیا گیا۔ یہاں کے کیمیاوی معمل میں بجلی سے اس کو گرم کیا گیا یہاں تک کہ اس کی سطح سفیدی کی حد تک پہونچ گئی اور اس سے روشنی پیدا ہونے لگی۔ اس کے بعد (Spectograph) کے ذریعہ سے اس روشنی کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ چاقو کی دھار پر کچھ ذرات اس مرکب دھات کے بھی تھے جس سے ٹیلی فون کا تار طیار کیا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے ایک باریک سا ریشہ بھی ملا جو اسی مرکب دھات کا تھا۔

ایک بار طیارہ سازی کے کارخانہ میں ایک جہاز کا پائپ جس سے پیٹرول جاتا ہے آری سے کٹا ہوا نظر آیا۔ چونکہ کارخانہ سے باہر کا کوئی آدمی اندر نہ آسکتا تھا اس لئے معلوم ہوا کہ کام کرنے والوں ہی میں سے کوئی شخص نازی جماعت سے ملا ہوا ہے، چنانچہ کارخانہ کی تمام آریاں اور پائپ کیمیاوی معمل میں جانچ کے لئے بھیجا گیا۔ وہاں بجلی اور اسپکٹوگراف کے ذریعہ سے چھ آریوں پر پائپ والی دھات کے ذرات نظر آئے اور اس طرح وہی چھ آدمی گرفتار کر لئے گئے جو ان آریوں سے کام کرتے تھے۔

حال ہی میں انھوں نے موم اور راجن سے ملا کر ایک ایسا مادہ طیار کیا ہے جس سے اُن نشانات کا بھی سانچہ طیار کیا جا سکتا ہے جو قائم نہیں رہ سکتے مثلاً برف پر نشان قدم، نرم مٹی پر موٹر کے پہیوں کے نشانات، کسی پھل پر دانت کے نشانات۔ ان سب کا سانچہ اس مادہ کے ذریعہ سے طیار ہو سکتا ہے اور پھر نشانات کے مٹ جانے کی پروا نہیں کی جاتی۔

برف پر نشان قدم کا سانچہ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ پہلے اس پر باریک چھلنی سے Talcum پاؤڈر چھڑک دیتے ہیں پھر پیرس پلاسٹر

پھیلا کر سانچہ بنا لیتے ہیں۔ پوڈر اس لئے چھڑکتے ہیں کہ پلاسٹر کی گرمی نشان تک نہ پہونچے اور سانچہ ٹھیک طیار ہو جائے۔

اگر دروازوں یا کھڑکیوں پر کسی اوزار کی خراش کا نشان پایا جاتا ہے تو اس کے قیام کے لئے ایک اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جسے (Moulage) کہتے ہیں۔ اسی ذریعہ سے مردہ انسان کے کچلے ہوئے یا کٹے ہوئے اعضا کی اصلی ساخت کا بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

ہر چند آگ کے خلاف احتیاط مشکل ہے، لیکن اب اس کا بھی خاص انتظام کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں جب امریکہ باوجود غیر جانبدار ہونے کے سامان حرب نہایت تیزی سے طیار کر رہا تھا تو ایک مقام بلیک ٹام پر بموں کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اور تمام سامان گاڑیوں میں بندرگاہ کے لئے کشتیوں پر لاد دیا گیا تھا۔ ۳۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو رات کے دو بجے دفعتاً ایک کشتی سے شعلہ بلند ہوا اور بموں کے پھٹنے کی آواز آنے لگی۔ تمام آسمان سرخ ہو گیا اور میلوں تک آتشبازی سی چھوٹتی نظر آنے لگی، یہاں تک کہ چند منٹ میں پورا بلیک ٹام خاک سیاہ ہو گیا۔

اس کے بعد کئی سال تک تفتیش جاری رہی کہ آگ لگنے کا سبب کیا تھا اور آخرکار حکومت اس نتیجہ پر پہونچی کہ یا تو کوئی Time Bomb رکھ دیا گیا تھا یا کوئی Fire Pencil۔ فائر پنسل ایک چھوٹی سی نلکی ہوتی ہے جس میں بھڑک اٹھنے والا تیزاب بھرا ہوتا ہے اور ایک خاص درجہ حرارت پر پہونچ کر اس میں آگ پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن اب اس قسم کے تمام خدشات کو سامنے رکھ کر ان کے دفعیہ کی تدابیر سوچ لی گئی ہیں اور محکمہ کی احتیاطی کارروائیوں نے اس طرح کے حادثات کو ناممکن سا نہیں تو دشوار ضرور بنا دیا ہے۔

بیورو کے دفتر میں اس وقت ایک کروڑ ۶۲ لاکھ نشانات انگشت کے کارڈ موجود ہیں اور ۶۰۰ قسم کی بندوقوں کے مختلف نمونے پائے جاتے ہیں، بعض اوقات قاتل یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی بندوق توڑ پھوڑ ڈالیں گے تو گرفتاری سے بچ رہیں گے، لیکن چونکہ یہاں ہر قسم کے نمونے موجود ہیں اسلئے ٹوٹی ہوئی بندوقوں کے اجزاء اکٹھا کر کے ان سے بندوق کی اصل ہیئت کا پتہ چل جاتا ہے اور پھر قاتل کا سراغ آسان ہو جاتا ہے۔

پچھلے دس سال کے اندر موٹروں کی لالٹین کے لئے جتنے قسم کے شیشے طیار ہوئے ان سب کے نمونے یہاں موجود ہیں اور اسی کے ساتھ یہ ریکارڈ بھی کہ کس قسم کی موٹر میں کس قسم کا شیشہ استعمال ہوا تھا۔ چنانچہ اگر جائے وقوع پر شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے مل جائیں تو وہ ان کو جوڑ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم کی موٹر میں لگا ہوا تھا۔

علاوہ ان کے اور جو کچھ اس دفتر میں موجود ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:- ۳۶۸۲۲ قسم کے واٹرمارک جو مختلف اوقات میں کاغذوں پر نقش کئے گئے ——— ۳۸۴۵ ٹائر کی قسمیں ——— ۲۰۶۹ نمونے مختلف قسم کی رسیوں کے ——— ۱۸۸۱ قسم کے کارتوسوں کے نمونے ——— ۹۰۱ قسم کی ٹائپ رائٹر مشینوں کے نمونے ——— ربڑ کے جوتوں کی ۸۸۵ قسمیں ——— اور ۳۲ قسم کی وہ فوٹوگراف مشینیں جو چک لکھنے میں استعمال ہوتی ہیں۔

"پامپور[1] اور ـــــ"

(نذرانشا)

پہلا منظر

مطرب خوشنوا سنا نغمے کچھ ایسی شان کے　　چٹکی ہو جیسے چاندنی کھیت میں زعفران کے

ہلکی اُداہٹ، اُس میں ہیں ڈورے حسین سُرخ سُرخ　　دانے الگ الگ رہیں جیسے "صدوں میں تان" کے

ان کی ادائے دلربا حشر تلک نہ پائیں گے　　رہنے دو آسمان پر تاروں کو آسمان کے

شیام کے رنگ و روپ میں رادھا براجنے لگیں　　شیام کو آگئی ہنسی، پھول تھے زعفران کے!

اور کہاں یہ چمکتیں، اتنی لطافتوں کے ساتھ　　پھول نہیں، صحیفے ہیں دیدھ کے یا پران کے

وہ جو بھری بھری کلی منھ جو اُدھر کو پھیرے ہے　　بیٹھی ہیں "روٹھی رادھا جی"، گر پیوں کو بھان کے!

دوسرا منظر

تیر نظر چلایئے شوق سے سینہ تان کے　　کھیل نہ جائے جان پر کوئی شکست مان کے

اتنے سے وہم پر انھیں دیکھ کے مسکرا دئے　　غنچوں سے سرگرانیاں، صدقے اس آن بان کے

نرگس خود فروش سے کہتی ہیں اُن کی شوخیاں　　آنکھ ملا کے بات کر، دن ہیں ابھی اُٹھان کے

آنکھیں چڑھی چڑھی سی ہیں پلکیں جھکی جھکی سی ہیں　　تم نے پی اور نشہ ور پی، بات گلوں کی مان کے

دیکھ کے طرز خواب ناز، پھولوں نے لیں جماہیاں　　باد شمال سو گئی چادر ۔ ب تان کے

چاندنی رات، پامپور، سامنے کشت زعفراں　　چاہیئے شرم کچھ اثر، شعر ہیں اسکی شان کے؟

تیسرا منظر

شاعری اک طرف رہی، میری بھی رائے اور ہے　　اس سے کہیں ہیں خوشنما بُندے کسی کے کان کے

ہائیں یہ کیا طلسم ہے، اور ہے رُت، سماں ہے اور　　پھول تھے زعفران کے، یا ہیں اب ارغوان کے!

(خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے

---

[1] پامپور، کشمیر کا وہ قطعہ جہاں زعفران کی کاشت ہوتی ہے - چاندنی رات میں زعفران زار کا سیر ایک مسحور کن نظارہ پیش کرتی ہے، عام طور پر خیال ہے کہ زعفران کا پھول سرخ ہوتا ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ ہلکے [illegible] کا سنی رنگ کا ہوتا ہے اور اندر سرخ ریشے [illegible] ہوتے ہیں [illegible] زعفران ہے - خود پھول کی پتیوں میں رنگ نہیں ہوتا -

تجدید

نغمۂ ہوش سے پھر دل مرا گھبرا ہی گیا
آج پھر تیری محبت کا خیال آ ہی گیا

پھر وہی ابرِ گہربار تمناؤں کا
کیف و مستی دلِ رنجور پہ برسا ہی گیا

تھی جو پیمانۂ ہستی میں نظر سے مستور
دیدۂ شوق مئے ناب وہ چھلکا ہی گیا

غمِ دوراں سے ذرا ہوش تو آیا تھا مگر
پھر تری مست نگاہوں کا نشہ چھا ہی گیا

شورشِ زیست سے کچھ دل نے سکوں پایا تھا
پھر تری یاد کا عالم مجھے تڑپا ہی گیا

کھو دیا تھا دلِ بے ہوش نے تجھکو لیکن
پھر تصور ترے دامن کی ہوا پا ہی گیا

دل سے ہرچند فراموش کیا تیرا خیال
ہائے پھر لب پہ مگر نام ترا آ ہی گیا

موت آجائے مجھے راس یہ ممکن ہی نہیں
میں بھلا دوں ترا احساس یہ ممکن ہی نہیں

مسعود اختر جمال

تمثیلِ شباب

جس طرح سورج کی کرنوں پہ نکھرتی ہے سحر
برق کر دے جس طرح تارِ نظر تابندہ تر

جنبشِ مضراب پر نغموں میں جیسے ارتعاش
چشمِ نم جس طرح کر دے ضبطِ دل کا راز فاش

دامنِ گلشن میں جس صورت سمٹ آئے بہار
موجِ بو نوخیز غنچوں سے ہو جیسے ہمکنار

جس طرح اٹھکھیلیاں کرتی چلے بادِ سحر
جس طرح پھولوں سے لد جائے جوانی میں شجر

دامنِ کہسار پر جس طور سے آئے بہار
جس طرح نغموں میں ڈھل جائے صدائے آبشار

موجِ دریا جس طرح ساحل سے ہم آغوش ہو
جس طرح موجِ ترنم ساز سے ہمدوش ہو

بادۂ گلرنگ میں جیسے جھلکتی ہو شراب
سینۂ دریا میں جیسے موج کھائے پیچ و تاب

جس طرح ساون کی رُت میں لے گھٹا انگڑائیاں
جس طرح سیماب میں ہوں مضطرب رعنائیاں

رنگِ برگِ گل میں بھر دے جس طرح بادِ بہار
سبزہ زاروں پہ پڑے برسات میں جیسے پھوار۔

یونہی طفلی میں سماتا ہے شبابِ زندگی،
نوجوانی یونہی وا کرتی ہے بابِ زندگی

مظفر فاروقی فتحپوری

غزل: اثر رحمانی

اب عالمِ خیال کا نقشا ہی اور ہے
دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ دُنیا ہی اور ہے

کیا دیکھے کوئی دیکھنے والا بہ چشمِ شوق
اُن بے پناہ جلووں کا منشا ہی اور ہے

وہ بے نیازِ دولتِ دیدار کیوں نہ ہو
آسودۂ خیال کی دنیا ہی اور ہے

دَورِ نگاہِ ساقی محفل کے سامنے
دیکھا تو رنگِ ساغر و مینا ہی اور ہے

میں جستجوے دوست میں کھویا ہوا سا ہوں
اب میری زندگی کا سہارا ہی اور ہے

اب دلنواز بھی ہے جو وہ حُسنِ دل فریب
میں دیکھتا ہوں اب مری دنیا ہی اور ہے

جو ماورائے سرحدِ ادراک ہے - اثرؔ
وہ دل فریب صورتِ زیبا ہی اور ہے

مطالعہ فطرت

چاند تاروں سے مجھکو اُلفت ہے
کہساروں سے مجھکو اُلفت ہے

کہکشاں کو سلام کرتا ہوں،
میں گلوں سے کلام کرتا ہوں،

تیرے چشموں کو چومتا ہوں میں،
ان کے گیتوں پہ جھومتا ہوں میں،

ٹھنڈی ٹھنڈی سفید جھیلیں ہیں،
جگمگاتی ہوئی سہیلیں ہیں،

دیو ہیں یہ ستنے کھجوروں کے
یا محافظ ہیں بن کی حوروں کے

ہائے کیا پیارے پیارے منظر ہیں
بے زباں نیچرل پیمبر ہیں

جھٹ پٹے میں صفیں پرندوں کی
جیسے پرچھائیاں فرشتوں کی

حُسنِ فطرت مطالعے میں ہے
روح گویا مراقبے میں ہے

میرے اللہ یہ کیا کرشمہ ہے
ذرّہ ذرّہ مقامِ سجدہ ہے

پاک آیات پڑھ رہا ہوں میں
بامِ عرفاں پہ چڑھ رہا ہوں میں،

جی میں آتا ہے جذب ہو جاؤں
ان مناظر میں جاکے کھو جاؤں

ابوالاسرار رمزی اٹاوی

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان : حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپیہ (عگ) علاوہ محصول

جمالستان : اڈیٹر نگار کے مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں ۲۳ افسانے ۳۰۳ صفحات تک کے درج ہیں۔ قدرت بیان، اعلیٰ تخیل اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ ان میں کا گویا مجموعۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت : حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اسکی زبان، اسکی تخییل، اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت ایکروپیہ (عہ) علاوہ محصول

مکتوبات نیاز : اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شایع ہوئے ہیں نیز وہ جو شایع نہیں ہوئے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشاء میں یہ بالکل پہلی چیز ہے۔ جس کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ معہ تصویر حضرت نیاز، ۸۰ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد : نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول آٹھ آنے (۸ر)

ترغیبات جنسی (یا) شہوانیات : اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ قیمت تین روپیہ (سے) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب ہر سہ جلد : ان تینوں جلدوں میں ۲۲ء سے لیکر ۳۵ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کی جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسائل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت ہر سہ جلد تین روپیہ (سےمہ) علاوہ محصول

جذبات بھاشا : جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲ر) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم : اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں، ۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۔۔ ۲۔ مادئین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے ۔۔ نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (عہ)

شاعر کا انجام : جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی ۔۔ قیمت دس آنے (۱۰ر) علاوہ محصول

فراست الید : مولفہ نیاز فتحپوری، جس کے مطالعہ سے ایک شخص باسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول۔

مذاکرات نیاز : یعنی حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن : یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیا تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

قیمت فی کاپی ۸ر

نگار

چندہ سالانہ صہ / اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲ — فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۴۲ء — شمار ۴

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر	سید حکیم احمد نقوی	۳
سائنس کے گورکھ دھندے		۸
نواب مرزا شوق کی مثنویاں	ساحل بلگرامی	۱۵
اُردو میں اعداد کا ناقص طرز تحریر	سید محمود نقوی ہیل	۲۰
شاعر فطرت (نظم)	خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر	۲۲
روس کی موجودہ صحافت		۲۳
سرود پس منظر (نظم)	پروفیسر شور	۲۵
چین کی خفیہ سوسائٹی		۲۶
مکتوبات نیاز		۲۸
پاتال پانی (نظم)	ادیب سہارنپوری	۳۲
باب الاستفسار		۳۳
منظومات	کاوش - نشور - قہر	۳۵
کشکول		۳۶
مطبوعات موصولہ		۳۸
بقیہ ملاحظات		۳۹

ملاحظات

جنگ لڑائی کا چوتھا سال شروع ہوچکا ہے اور شاید دُنیا توقع رکھتی ہوگی کہ یہ لڑائی کا آخری سال ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پچھلے سال بھی ہم نے یہی سمجھا تھا جو پورا نہ ہوا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اور کتنے سال ہمیں انھیں بایوسیوں میں گزارنا ہیں

واقعہ خواہ وہ کتنا ہی ہیبت ناک کیوں نہ ہو اس کے حدود انتہا کی کچھ صورتیں سمجھ میں آجاتی ہیں، لیکن موجودہ جنگ تاریخ عالم کا اتنا عجیب و غریب

نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ یقیناً ایک وقت آئے گا جب یہ خونیں ورق اُلٹا جائے گا،

سیاہ ہر

ہے کہ زمانہ کے ساتھ اس کی عمر بھی بڑھتی جارہی ہے اور یہ ... اور تاریک پہلو نئے خطرات کی صورت

لیکن اُس وقت کرۂ زمین کا جغرافیہ کیا ہوگا، نئی دنیا کی نئی تاریخ کس عنوان سے شروع کی جائے گی اور علم و حکمت کے کون کونسے

میں متعین ہو چکے ہوں گے، یہ کہنا بہت مشکل ہے

لوگ غالباً خیال کرتے ہوں گے کہ دُنیا کی تمام پچھلی لڑائیوں کی طرح موجودہ جنگ کو بھی کسی نہ کسی فریق کی فتح پر ختم ہوجانا ہے اور اسکے بعد دُنیا پھر اپنی اصلی حالت پر

آجائے گی، لیکن ایسا سمجھنا غالباً درست نہیں، کیونکہ دُنیا کی یہ پہلی لڑائی ہے جو فتح و شکست کا کوئی مفہوم نہیں رکھتی اور جو غالب و مغلوب دونوں کو یکساں تباہ کردینے والا

ہے۔ یہ جنگ دو مخالف قوموں کی جنگ نہیں بلکہ دو متضاد عناصر کی جنگ ہے، انسانوں کی لڑائی نہیں بلکہ خیال و اعتقاد کی لڑائی ہے، نیک و بد کی لڑائی ہے اور اسکا فیصلہ

اُسی وقت ہوسکے گا جب کرۂ ارض پر یزدان و اہرمن میں سے صرف ایک کی حکومت آیندہ کے لئے متعین ہوجائے اور یہ شاید اس قدر آسان نہیں

اسوقت روس کا محاذ دنیا کے بیم و رجا کا مرکز بنا ہوا ہے اور اسٹالن گراڈ کی خبروں پر ہر وقت لوگوں کے کان لگے ہوئے ہیں، لیکن کیا اسٹالن گراڈ کا فیصلہ جنگ کا فیصلہ

ہے، کیا قفقاز میں جرمن کامیابیاں اتحادیوں کی شکست کا مفہوم رکھتی ہیں اور اگر ہم فرض کریں کہ جاپان ہندوستان پر قابض ہوجاتا ہے تو کیا اس سے آتش جنگ سرد پڑ جائے گی

ہرگز نہیں۔

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹)

ایرانی لٹریچر کا تاریخی پس منظر

(بہ سلسلۂ ما سبق)

اب اصل پہلوی کی تاریخ کی طرف پھر رجوع کیا جاتا ہے - اس زبان کی یادگاریں حسب ذیل ہیں :-

(۱) پارتھیوں کے زمانے کے سکّے ---- (۲) ساسانیوں کے بعد کے زمانے کے سکّے - کتبے - اور کتابیں ---- (۳) ساسانیوں کے بعد کے زمانے کے سکّے - کتبے ---- اور کتابیں -

سکّوں اور کتبوں کی تحریر اتنی مغلق نہیں - انھیں کی مدد سے کتابوں کی عبارت بہت کچھ حل کی گئی ہے کیونکہ اُن کے حروف بہت کم مختلف الصوت ہیں - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امتداد زمانہ سے ساسانیوں کے زمانہ میں حروف کی شکلیں ایسی تبدیل ہو چلی تھیں کہ کئی حرف ایک ہی شکل کے ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ کونسا حرف استعمال کیا گیا ہے - پہلوی تحریر کے سکّوں اور کتبوں کا رواج عربی حکومت کے زمانہ میں بھی عرصہ تک رہا اور عربوں کے صیغۂ مال میں پہلوی ہندسہ اور زبان ہی استعمال میں آتے رہے -

پہلوی لفظ کا نمونہ باعتبار کتابت کے اوپر درج ہو چکا ہے - ذیل میں باعتبار تلفظ کے ایک کتبہ درج کیا جاتا ہے - یہ کتبہ اردشیر بابکان کے وقت کا نقشِ رستم سے لیا گیا ہے اور اس طرح پڑھا جاتا ہے :-

"پتکاری - زَنا - مَزْدَیَسْن - بَگی - اَرْتخشتر - ملکان ملکا - ایرانَ - منُوچِتری - منَ - یزتان - بارہ - باپکی - ملکا"

ترجمہ ---- "یہ تصویر اُس مَزد کے پجاری دیوتا ارتخشتر شہنشاہِ ایران کی ہے جو دیوتاؤں کی پاک نسل سے ہے اور جو پاپک بادشاہ کا لڑکا ہے"

پہلوی کتابوں کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں - کسی کتاب کا مسودہ ۱۳۲۳ء سے قبل کا دستیاب نہیں ہوا ہے - بالعموم یہ کتابیں اسلامی عہد کی تالیف پائی جاتی ہیں - اقسام یہ ہیں :

(۱) آوِستا کے ترجے ---- (۲) مذہبی کتابیں ---- (۳) مذہب سے غیر متعلق کتابیں -

آوستا کے پہلوی ترجے آوستا کے الفاظ اور عبارت کی ترتیب و ترکیب کے اس قدر پابند پائے جاتے ہیں کہ اُن کو پہلوی ادب کا نمونہ تصور کرنا قرینِ صحت خیال نہیں کیا جاتا -

مذہبی کتابوں کی تعداد پچپن ہے جن میں تقریباً چار لاکھ چھیالیس ہزار لفظ استعمال میں آئے ہیں - یہ کتابیں دعاؤں - تفسیروں - روایات - نصائح - احکام اتناعی - اقوالِ متبرک وغیرہ پر مشتمل ہیں - ان میں سے چند ممتاز کتابوں کے نام یہ ہیں :-

(۱) دِینْ کرْت - (احکام مذہبی) - اِس کتاب میں مذہب مزدی کے اُصول - رواج - روایات - تاریخی کیفیت کی تشریح کی گئی ہے - اس کی تالیف آذر فرن باگ سے منسوب ہے اور اُس کا زمانۂ تصنیف نویں صدی عیسوی - (مامون رشید کا زمانہ) قرار دیا گیا ہے -

(۲) بُندَاہِش - یہ مذہبی معلومات کا ذخیرہ ہے اور اُس کی تالیف گیارھویں یا بارھویں صدی عیسوی سے متعلق ہے -

(۳) دادِستانِ دِینِک - اس کتاب میں بانوے مسئلوں کے متعلق مذہبی رائے ظاہر کی گئی ہے اور اُس کا زمانۂ تالیف نویں صدی عیسوی ہے -

(۴) شِکَنْد گُمانِک وِجار ---- (ماحی شکوک مقدمہ) - اس کتاب میں مذہب زردُشت کے نقطۂ نظر سے عیسائی - یہودی اور اسلامی عقائد متعلق خیر و شر سے بحث کی گئی ہے -

(۵) دِینائے مینوئے خِرد - (روح یا فرشتۂ عقل کی رائے)۔ اس کتاب میں دینِ زردشتی کے متعلق باسٹھ سوالات کے جواب فرشتۂ عقل نے دئے ہیں۔ یہ پہلوی کی سب سے آسان کتاب سمجھی جاتی ہے -

(۶) اَردوِراف نامک - اس کتاب میں اسکندرِ ملعون کے حملہ اور حکومت سے ایرآن کی جو دینی اور دنیوی تباہی ہوئی اُس کا بیان ہے - ساسانیوں کے زمانہ میں مذہبی اور قومی معاملات کی تجدید جس طرح ہوئی اُس کی کیفیت درج کی گئی ہے اور مذہب زردشتی میں حیاتِ آیندہ کے متعلق جو عقاید ہیں اُن کا تذکرہ ہر اسی کتاب میں بہشت و دوزخ کا نظارہ کرایا گیا ہے جو اسلامی کتابوں کے بیانات سے ملتا جلتا ہے -

(۷) جاماسپ نامک) - یہ کتاب قدیم بادشاہوں کے افسانوں پر مشتمل ہے -

(۸) اَنْدَرزِ خسروِ کاوتان - اس میں شاہ نوشیرواں (انوشک رُوان یعنی غیر فانی روح یا جان) کے پند و نصائح و احکام درج ہیں -

غیر مذہبی کتابوں کی تعداد صرف گیارہ ہے اور اُن میں تقریباً چار ہزار ایکسو الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ ان کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

یادکارِ زریران - شاہنامہ گشتاسپ یا پہلوی شاہنامہ - کارنامکِ ارتخشترِ پاپکان - درخت عسوریگ - چترنگ نامک -

قیاس یہ کیا گیا ہے کہ علمائے زردشتی نے ایسی کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں لی جن کا تعلق مذہب سے نہ ہو۔ یہی وجہ خیال کی گئی ہے کہ آوستا کے وہ حصے جو علمی یا فلسفی مضامین پر مشتمل تھے علما کی لاپروائی سے ضائع ہوگئے۔ اسی طرح پہلوی علم ادب کی کتابوں کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ ایسی تصنیفات بہت زیادہ ہوں گی کیونکہ بعض کتابوں کے نام اور اُن کے مضامین کا حوالہ اسلامی عہد کی کتابوں میں پایا جاتا ہے لیکن وہ کتابیں اب دستیاب نہیں ہوتیں۔ جو کتابیں اسوقت موجود ہیں بالعموم وہ قومی روایتوں اور افسانوں سے معمور نظر آتی ہیں۔ زمانۂ حال میں بھی بعض پہلوی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں،

زرتشت نامہ - سددار - علمائے اسلام - قصۂ سنجان

قصۂ سنجان میں وہ حالات درج ہیں جو ایرآن سے ہندوستان کی طرف پارسیوں کی ہجرت سے متعلق ہیں۔ اس کتاب میں چند قدیم پہلوی عبارتوں کی تشریح بھی بزبان فارسی پائی جاتی ہے -

اسوقت تک کسی پہلوی نظم کا کھوج نہیں لگا ہے جو ساسانی یا اشکانی دور سے متعلق ہو - دل اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ ساسانی بادشاہوں کے درباروں میں گانے یا شعر پڑھنے کا چرچا نہ ہوتا ہو۔ قدیم روایات میں چند نام شاعروں یا گانے والوں کی ذیل میں درج کئے گئے ہیں - قیاس یہ چاہتا ہے کہ ایسے لوگ اُس زمانہ میں ضرور ہونگے جو سازوں پر گیت گاتے ہوں۔ ان لوگوں میں سے باربد کا نام بہت مشہور ہے جس کو عربی میں بلھبذ لکھا گیا ہے اور جو غالباً پہلوی 'پہلبت' ہے۔ روایات کی بنا پر عربی مصنفین نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ باربد کی نسبت ایک عربی شاعر نے اپنی نظم میں یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ خسرو پرویز کے دربار کا رُکن تھا اور بادشاہ کے مُنھ ایسا لگا تھا کہ جو بات اور کوئی شخص بادشاہ کے حضور میں نہ کہہ سکتا تھا وہ اُس کے ذریعہ سے کہلوائی جاتی تھی۔ قصہ یہ ہوا کہ بادشاہ کا ایک گھوڑا شبدیز نامی تھا جس کو بادشاہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ محبت کی وجہ سے اُس نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ جو شخص اُس گھوڑے کی موت کی خبر سُنائے گا وہ قتل کر دیا جائیگا اتفاق سے جب وہ گھوڑا مرا تو کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ بادشاہ کو خبر پہونچائے۔ آخر کار باربد سے رجوع کیا گیا اور اس نے پرویز کے روبرو ایسا گیت بنا کر سنایا جسکے مضمون سے بادشاہ گھبرا گیا اور بے ساختہ بول اُٹھا کہ شاید میرا گھوڑا مر گیا۔ باربد نے جواب دیا کہ حضور ہی ایسا فرما سکتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ اس طرح سے گھوڑے کے مرنے کی خبر سُنانے کا الزام کسی کے ذمہ عاید نہ ہوا -

باوجود اس کے نظم کی کوئی یادگار ساسانی یا اشکانی زمانہ کی موجود نہیں ہے -

پہلوی زبان کا رواج بند ہو جانے کے بعد وہ زبان عربی کی آمیزش سے جاری ہوئی جس کو فارسی حال کہتے ہیں۔ اس کی کتابت عربی حروف میں ہوتی ہے اور وہ عربی قواعد صرف و نحو کی بھی بڑی حد تک پابند ہے۔ لیکن اب اس زبان میں بھی تبدیلی کے آثار پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ زبان کا ڈھنگ اس اعتبار سے کہ اُس میں نئے نئے لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں۔ نئے نئے خیالات سیاسی - اقتصادی معاشرتی اور تمدنی روز بروز پیدا ہو رہے ہیں۔ طرح طرح کے محاورات کا استعمال رواج پاتا جاتا ہے اور جس کو روزمرہ کہتے ہیں وہ زبان کا عنصر خاص بن گیا ہے۔ سادہ بیانی کی طرف توجہ ہے اور مرصع نگاری اور پرپیچ خیال

آفرینی کی راہیں چھوٹتی چلی آتی ہیں - بہت کچھ بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اگر یہ تحریک جاری رہی اور اُس نے کچھ زور پکڑا کہ عربی الفاظ زبان سے کم کردئے جائیں اور حروف بھی بدل دئے جائیں تو کیا معلوم فارسی زبان کس رنگ میں دکھائی دے - اس نئے رنگ کی زبان کو جس میں کئی اصنافِ سخن مثل ناول - ڈراما وغیرہ کا اضافہ ہوتا جاتا ہے اہلِ ہند فارسی جدید کے نام سے موسوم کرتے ہیں - چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں :-

ناول موسوم بہ "عشق و سلطنت" - (ومی تواں گفت اولین زمانے ست کہ در ایران با اسلوبِ مغرب زمین تالیف شدہ) "بلے این تہیہ تہیۂ عروسی است و گماں ندارم کہ عروسی چنیں برائے کورس پادشاہِ با اقتدار پارس ودی باشد - چہ کہ امروز کسے جز او ایں قدر نزد اہالی اکبتان محبوبیت ندارد کہ مردم عروسی او را چوں عیدے بزرگ دانستہ و بازارہا را زینت کردہ و از صمیم قلب اظہار سرور و شادمانی نمایند"

ڈراما موسوم بہ "گزارشِ مردم گریز":

مونس -- (بہ پیشِ فراش میرود) - چہ ہست فرمایش ؟
بیا بہ بینم !

فراش : دارم دو حرف با سرکار،
مونس : تواں دو حرفِ خودت را کنی بلند اظہار
فراش : رئیس دیوان آں راکہ بندہ ام فراش،
مرا بدست بداد ست حکم حاضر باش،
بتو ....
مونس : بکہ ؟ بمن ؟
فراش : آرے بتو،
مونس : برائے چہ کار،
فراش : بحرفِ مفتِ (امیدی) وحضرتِ سرکار

ڈراما بطرزِ دیگر موسوم بہ "حکایت کربلا رفتنِ شاہ قلی مرزا" -- ماخوذ از تیاتر میرزا ملکم خاں (شاہ قلی مرزا مردے بود بلند قامت و ریش دراز و متکبر و مناعت طلب و درشت خوے در ۱۲۳۳ھ بعزم زیارتِ کربلا از طہران حرکت کرد در حین عبور چند روزے در کرمان شاہ نزد حاکم آنجا مہمان می شود شب اول بعد از ملاقات و صرفِ شام و صحبت ہائے متفرقہ برمیخیزد و میرود بمنزلیکہ برائے او تعین کردہ اند -)

شاہ مراد میرزا حاکم - (بہ شفیع بیگ پیشِ خدمت) - شفیع بیگ شاہزادہ مہمان ماست ایرج میرزا مواظب ست و تو مہمان دار - شش نفر فراش و یک نفر قہوہ چے بردار ببر زیر دست خود باشد درست متوجہ باشید بد نگذرد بشاہزادہ -

شفیع بیگ : بلے قربان چشم البتہ کار نوکر خدمت ست -

شاہزادہ حاکم : خیر بلے قربان تنہا کافی نیست ایرج میرزا اند ایں شاہزادہ مردیست بسیار مشکل پسند و باریک بیں اما احمق و زود رنج باید با احتیاط حرکت بکنی برادر من ست مہمان ست مبادا رنجش بہم رساند -

شفیع بیگ : قربان بیست سالست در ظلِ رافتِ سرکار نواب والا تربیت یافتہ ام امید وارم کہ ایں قسم خدمات زیں بندہ برآید انشاء اللہ در کمال خوشنودی دامنان تشریف خواہند برد خاطر جمع دارید -

شاہزادہ حاکم : خوب ست حالا مرخصی فردا صبح برو سر خدمت و درست متوجہ باش -

سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ -- (سیاحت نامہ اور ابراہیم بیگ دونوں فرضی ہیں - اس میں ایران اور ایران کے حاکموں کی حالت کا خاکہ اُڑایا گیا ہے جب ابراہیم بیگ وزیر جنگ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھتا ہے کہ ملک کی حفاظت اور فوجوں کی ترتیب کا کیا انتظام کیا گیا ہے تو وزیر ناراض ہو کر اُسے پٹواتا ہے اور

مکان سے باہر نکال دیتا ہے۔ اس واقعہ کے متعلق انتخاب ذیل قابل ملاحظہ ہے)

...... آیا با سربازان شصت سالہ و سرتیپانِ بیست سالہ جلو این ہمہ دشمنان راکہ از چہار جانب چشم بوطن ما دوختہ اند تواں گرفت ؟ این سرتیپانِ بیست سالہ کدامین خدمت نمایاں بدولت وملت کردہ اند کہ سزاوار شمشیر وحمائل سرتیپی شدہ اند ؟

چوں سخن بدیں جا رسید دیدم رنگ از رُخِ وزیر پریدہ با آواز مہیب صدا زد - اسد - اسد - اسد بیگ فراش باشی آمد - گفت ایں پدر سوختۂ فضول و یاوہ گو راکدام پدر سگ بدینجا راہ دادہ ؟ گفت قربان حاجی عثمان رقعۂ بہ بندہ نوشتہ بود - گفت گُہ خورد با پدرش بزنید این پدر سگ را بزنید ! بکشید بیرون - دیگر خود را ندانستم - ہی مشت وسیلی بود کہ بسر وصورت من از آسمان چوں قطراتِ باراں فرو می ریخت - وقتے دیدم کہ عبا دو دستی ونہ کلاہ در سر دارم، پنج شش نفر زمین نقش بستم - چند تن ہم از پائین ہجوم کردند کہ گرفتہ بہ مجلس ببرند - گفتم بابا - برضائے خدا دور شوید ! وزیر فرمود بیرونش کنید حبس نہ فرمود - گفتند ممکن نیست - مشہدی حسن خود را رسانید - بزبان انگلیسی گفت اناں برادرجاں چہ خیرست ؟ گفتم ہرچہ شدنی بود شد اما حکم حبس نداد طورے کنید کہ ازاینجا بدر رویم - گفت پول داری ؟ گفتم ہیچ ندارم - گفت ساعت را درآر ! ہرچہ خواستم ساعت را درآرم دستم میلرزید نتوانستم - مشہدی حسن جلیقہ را پارہ کردہ درآمد - بازنجیر بفراشان سپرد - دست از ما باز داشتہ مشغولِ تعیینِ قیمت ساعت وتقسیم آں شدند - ما از میان بدر شدیم -

مضمون ماخوذ از اخبار "صور اسرافیل"

چرند پرند - بعد از چندیں سال مسافرت ہندوستان ودیدن ابدال واوتاد ومہارت درکیمیا ولیمیا وسیمیا الحمد للہ بہ تجربۂ بزرگی نائل شدم وآں دوائے ترک تریاک ست - اگر ایں دوا را در ہریک از ممالک خارجہ کسے کشف میکرد تا چار صاحب امتیازی شد - انعامات می گرفت - در ہمۂ روزنامہ ہا نامش بہ بزرگی درج می شد - اما چہ کنم کہ در ایران قدرداں نیست -

عادت طبیعت ثانوی ست - ہمینکہ کسے بکارے عادت کرد دیگر بایں آسانیہا نمی تواند ترک کند - علاج منحصر بایں ست کہ بترتیب مخصوصی بروز ماں کم کند تا وقتیکہ بکلی از سرش بیفتد -

حالا من بہ تمام برادران مسلمان غیور تریاکی خود اعلان می کنم کہ ترکِ تریاک ممکن ست ...... مثلاً یک نفر کہ روزے دو مثقال تریاک می خورد روزے یک گندم از تریاک کم کردہ دو گندم مُرفین بجائے آں زیادکند وکسے کہ دہ مثقال تریاک می کشد روزے یک نخود کم کردہ دو نخود حشیش اضافہ نماید وہمیں طور مداومت کند تا وقتیکہ دو مثقال تریاک خوردنی بہ چہار مثقال مُرفین و دہ مثقال تریاک کشیدنی بہ بیست مثقال حشیش برسد - - - - - - -

- - - - - - - وہمیشہ بزرگان ومتخصصین ہم کہ می خواہند عادتِ زشتے از سرِ مردم بیندازند ہمیں طور میکنند مثلاً وقتیکہ بزرگانِ ما فکر می کنند کہ مردم فقیر اند و استطاعت نانِ گندم خوردن ندارند ورعیت ہمۂ عمرش را باید بزراعت گندم صرف کند وخودش ہمیشہ گرسنہ باشد ببینید چہ میکنند -

روز اول سال نان را با گندم خالص می پزند - روز دوم در ہر خروار یک من تلخہ - جو - سیاہ دانہ - خاک ارہ - یونجہ - مثلاً مختصر عرض می کنم معلوم ست در یک خروار گندم کہ صد من ست یک من ازیں چیزہا ہیچ معلوم نمی شود - روز دوم دو من می زنند وبعد از صد روز کہ سر ماہ و دہ روز بشود صد من گندم صد من تلخہ - جو - سیاہ دانہ - خاکِ ارہ - کاہ - یونجہ - شن شدہ است درصورتیکہ ہیچ کس ملتفت نشدہ وعادتِ نان گندم خوردن ہم از سرِ مردم افتادہ است.

برادرانِ غیور ...... ہماں طور کہ ممکن است عادت را از سرِ مردم انداخت ہماں طور ہم ممکن است عادتِ را از سرِ سنگ وکلوخ و آجر انداخت -

چراکہ میان عالم صغیر وعالم کبیر مشابہت تمام است مثلاً یک مریض خانۂ حاجی شیخ ہادی مجتہد مرحوم ساخت - موقوفات ہم برائے آں معین کرد کہ ہمیشہ یازدہ نفر مریض درانجا باشند - تا حاجی شیخ ہادی حیات داشت مریض خانہ بہ یازدہ نفر عادت کرد - ہمیں کہ حاجی شیخ ہادی مرحوم شد طلاب مدرسہ بہ پسر ارشدش گفتند ما وقتے تو را آقا می دانیم کہ موقوفاتِ مریض خانہ را خرج ما کنی - حالا ببینید ایں پسر خلف ارشد بہ قوت علم چہ کرد - ماہِ اول یک نفر از مریض ہا را کم کرد - ماہ دوم دو تا - ماہ سوم سہ تا ماہ چہارم چہار تا وہمیں طور تا حالا کہ عدۂ مریض ہا بہ پنج نفر رسیدہ وکم کم بہ حُسن تدبیر آں چند نفر ہم تا پنج ماہ دیگر از میاں خواہد رفت - پس ببینید کہ با تدبیر چہ طور می شود عادت را از سرِ ہمہ کس وہمہ چیز انداخت - حالا مریض خانہ کہ یازدہ مریض عادت داشت بدون اینکہ ملتفت بشود عادت از سرش افتاد (دخو)

(۲) کبلائے دَخو ۔ تو قدیم ہا گاہی بدر دِ مردم میخوردی۔ مشکلے بدوستانت او میداد حل میکردی۔ ایں آخر ہا کسر و صدائے از تو نبود میگفتم بلکہ تو ہم تریاکی شدہ در گوشۂ اطاق پائے منقل لم دادۂ ۔ آنا نکو کر تو ناقلائے حقہ ہماں طورکہ توی صور اسرافیل نوشتہ بودی یواشکی بے خبر نمیدانم برائے تحصیل علم کیمیا و سیمیا و سیمیا گزاشتی در رفتی بہند۔ حکما گنج نامۂ ہم پیدا کردۂ ۔ درعال اگر سوء ظنّے درحق تو بردہ ام بایدخیلے خیلے ببخشی عذر میخواہم ۔ باز الحمد للہ بسلامت آمدی جائے شکرش باقی ست چراکہ خوب سرِ قلتش رسیدی ۔ برائے اینکہ کارہا خیلے شلوق پلوق ست ۔

خدا رفتگاں ہمہ را بیامرزد خاک براش خیر نبرد۔ در تاتارزاں یک ملا اینکلی داشتیم روضہ خوان خیلے شوخ بود۔ حالا نداشتہ! شدبا سن خیلے میانہ داشت۔ وقتے کہ میرفت روضہ بخواند اول یک مقدمہ دور و دراز مے می چید۔ ہر چند بے ادبی ست میگفت مطلب ایں طور خر فہم تر میشود (مدمثل مناقشہ نیست) بنظرم می آید برائے شما ہم محض اینکہ درست بہ مطلب پے ببرید یک مقدمہ بچینم بدنیست۔

مستزاد

اے شہنشاہِ جواں ۔ شیرانِ جنگ آور نگر در نگر عالمے دیگر نگر
ملتے را راحت از مشروطہ سرتا سر نگر در نگر عالمے دیگر نگر
پادشاہی کن کہ دورانِ جہاں برکام تست رام تست شاہ احمد نام تست
در محامد خویش را ہمنام پیغمبر نگر در نگر عالمے دیگر نگر
دادخواہی کن دریں مشروطہ چوں نوشیرواں در جہاں زخشہا ہمت بر جہاں
خویش را والاتر از دارا و اسکندر نگر در نگر عالمے دیگر نگر
آخر ایں ایران کہ بودہ جائے جم پاتخت کے اہل وے غرق غفلت تا کے
باغباناً۔ باغ را بے شاخ و برگ و بر نگر در نگر عالمے دیگر نگر
پارلماں را از وکیلانِ صحیح آباد کن داد کن ملتے را شاد کن
خائنین را زد دکن اخراج بر محضر نگر در نگر عالمے دیگر نگر
مدتے با شیخ رفتی با حریفاں ساختی تاختی دیدی آخر باختی
حال و روز بعد از نیت را ازیں بدتر نگر در نگر عالمے دیگر نگر

سید حکیم احمد نقوی

سائنس کے گھریلو شعبدے

(بہ سلسلہ ماہ ستمبر ۴۲ء)

برف بنانا — فراہم کیجئے:۔ دھات کا ڈھکنا (جس میں بعض بوتلوں پر بجائے ڈاٹ کے لگا رہتا ہے) — پلیٹ — اومونیم نائٹریٹ
Amm. Nitrate

پلیٹ میں اتنا پانی ڈالئے کہ اس کا درمیانی خالی حصہ بھر جائے۔ اس کے بعد چمچ کے ذریعہ سے دھات کے ڈھکنے کو امونیم نائٹریٹ سے نصف بھر دیجئے اور اُسکو پلیٹ کے درمیان رکھدیجئے۔

پھر ڈھکنے میں آہستہ آہستہ ایک ایک قطرہ پانی ٹپکائیے، پلیٹ کا پانی جمکر برف ہو جائے گا۔
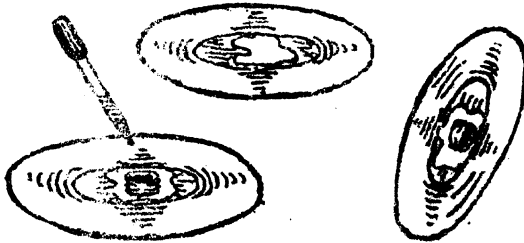
کیوں؟ جب کوئی منجمد چیز رقیق حالت میں تبدیل ہوتی ہے تو وہ چاروں طرف کی گرمی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ چونکہ امونیم نائٹریٹ گرمی کو زیادہ جذب کرتا ہے اس لئے جب پانی ڈالکر اسے رقیق کیا گیا تو اس نے پلیٹ کے پانی کی گرمی کو اس حد تک جذب کر لیا کہ وہ نقطۂ انجماد تک پہونچ گیا

شکر کے بلوری ٹکڑے — فراہم کیجئے:۔ شکر — پیالہ — دفتی — دھاگا — گرم پانی — کنکری۔

پیالہ کو گرم پانی سے بھر دیجئے اور جتنی شکر اس میں گھل سکتی ہے ڈالدیجئے۔ اس پر ایک دفتی کا ٹکڑا رکھکر بند کر دیجئے۔ ایک فٹ دھاگا لیکر اس کے کنارے چھوٹی سی کنکری باندھکر پانی میں لٹکا دیجئے۔ دفتی میں ایک سوراخ اتنا بڑا کر لینا چاہئے کہ دھاگا اس کے اندر سے گزر جائے — دو چار دن کے بعد آپ دھاگے کو نکالیں گے تو اسکے چاروں طرف شکر کے بلوری ٹکڑے نظر آئیں گے
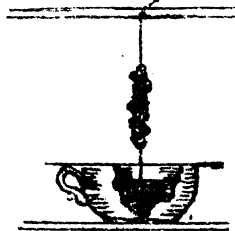
کیوں؟ تمام سیال چیزوں کا خاصہ ہے کہ جب وہ رقیق حالت سے منجمد حالت میں منتقل ہوں گی تو وہ بلوری ٹکڑوں کی صورت اختیار کر لیں گی۔

شکر سے کوئلہ — فراہم کیجئے :- شکر — گندھک کا تیزاب — پیالہ — کانچ کا ٹیوب (Test tube) -

تھوڑی سی شکر ٹیوب میں رکھ کر گیس یا اسپرٹ کے چولھے پر گرم کیجئے، تھوڑی دیر میں وہ رقیق ہو جائے گی۔ آپ گرم کرتے رہئے، یہاں تک کہ وہ بالکل سیاہ ہو جائیگی۔

دوسری ترکیب یہ ہے - چار چمچ شکر ایک چمچ پانی میں ڈال کر جوش دیجئے۔ اس سے قوام طیار ہو جائے گا۔ اس میں قطرہ قطرہ گندھک کا تیزاب ڈالئے۔ اس سے شکر کوئلہ میں تبدیل ہو جائے گی اور پیالہ کے چاروں طرف یہ مادہ باہر آ کر پھیل جائے گا۔

کیوں ؟ کاربن ہر چیز میں پایا جاتا ہے اور اس کا رنگ سیاہ ہے، لیکن دوسری چیزوں سے ملکر اس کا رنگ بدل جاتا ہے، اس لئے جب دوسرے اجزا آپ علیحدہ کر دیں گے تو اخیر میں کوئلہ رہ جائے گا۔

آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ شکر، کوئلہ اور ہیرا سب کاربن ہیں -

---

آگ سے نہ جلنے والا کپڑا — فراہم کیجئے :- ململ کے دو ٹکڑے — پیالہ — موم بتی — Amm. Phosphate

پیالہ میں چار چمچ پانی ڈالکر اس میں ایک چمچ امونیم فاسفیٹ ڈالئے - جب دونوں حل ہو جائیں تو ململ کا ایک ٹکڑا لیکر اس میں اچھی طرح ڈبو دیجئے اور پھر نکالکر بغیر نچوڑے ہوا سے خشک کر لیجئے - اب اس پر آگ اثر نہ کرے گی۔

موم بتی روشن کرکے پہلے ململ کے اس ٹکڑے کو جلایئے جس میں دوا جذب نہیں ہے اور پھر ململ کے دوسرے ٹکڑے کو - دونوں کا فرق معلوم ہو جائے گا -

چاقو پر نام کھودنا — فراہم کیجئے:۔ Hydrochloric Acid — موم بتی — شیشے کا گلاس — نوکدار لکڑی

پہلے موم بتی پگھلا کر اس کا موم چاقو کی سطح پر ٹپکائیے، جب موم ٹھنڈا ہو جائے تو کسی نوکدار لکڑی سے اپنا نام یا جو کچھ لکھنا ہو موم کی سطح پر لکھئے یہاں تک کہ اس حصہ کا موم نکل کر چاقو کی آہنی سطح نظر آنے لگے۔ اس کے بعد چاقو کو پانی کے گلاس میں ڈال دیجئے اور ہائڈروکلورک ایسڈ اس میں شامل کر دیجئے، تھوڑی دیر کے بعد نکال لیجئے اور موم صاف کر ڈالئے۔ آپ کا نام اس پر منقوش ہوگا۔

آگ کے جھاگ — فراہم کیجئے:۔ Licorice Extract (رب السوس یا ملٹھی کا ست) Aluminium Sulphate — سوڈا (کھانے والا) — گلاس۔

دو چمچے الومنیم سلفیٹ، ایک پیالی پانی میں گھول لیجئے۔ آدھی پیالی سوڈا میں ملٹھی کا ست ملائیے یہاں تک کہ گاڑھا مرہم سا طیار ہو جائے، پھر اس مرہم میں برابر کا پانی ملا کر رقیق کر لیجئے۔

ان دونوں محلولوں کو جب ایک ساتھ کسی گلاس میں ڈالیں گے تو آگ کا جھاگ پیدا ہو کر گلاس سے باہر آ جائے گا۔
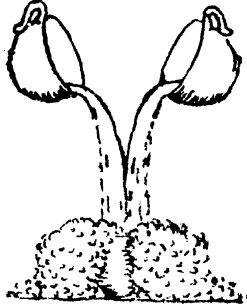
نظر نہ آنے والی سیاہی — کوبالٹ کلورائڈ Cobalt Chloride کو پانی میں حل کیجئے یہاں تک کہ وہ ہلکے زرد رنگ کا ہو جائے اس محلول سے کاغذ پر کچھ لکھئے اور خشک ہو جانے دیجئے۔ جب آپ اس کو آگ دکھائیں گے تو نیلگوں حروف ابھر آئیں گے۔
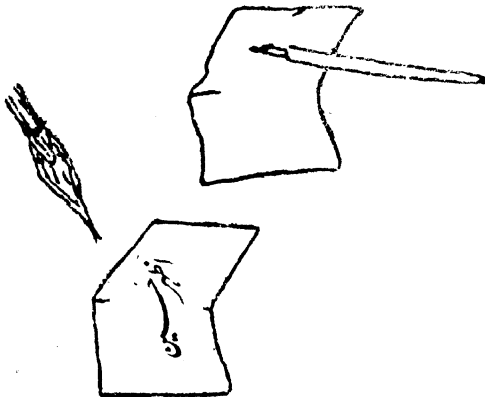
جادو کا رومال

— فراہم کیجئے:- کوبالٹ کلورائڈ — جلاٹین — رومال — طشت ۔

ایک حصہ کوبالٹ - ۱۰ حصے جلاٹین اور ۱۰۰ حصے پانی - طشت میں ملایئے، پھر طشت کو ہلکی آنچ پر رکھئے یہاں تک کہ یہ سب چیزیں یک جان ہو جائیں۔ ایک رومال اس محلول میں اچھی طرح ڈبو کر خشک کر لیجئے۔ اس کا رنگ زردی مایل نیلا ہوگا۔ لیکن اگر آپ اس رومال کو بھاپ دیں گے تو سُرخ ہو جائے گا۔ اسکے بعد آپ ہٹا کر خشک کر لیں گے تو پھر نیلا ہو جائے گا
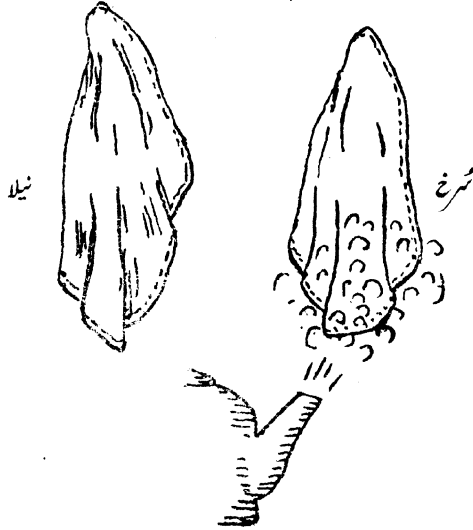
پانی شراب اور دودھ کے رنگ کا

— فراہم کیجئے: (۱) Phenolphthalein - (۲) Ammonia water - (۳) Hydrochloric Acid (۴) Silver Nitrate Solution — بوتل — تین گلاس -

نمبر (۱) کے چند قطرے ایک بوتل پانی میں ڈال دیجئے۔ تین گلاس میز پر علٰحدہ علٰحدہ رکھ کر ایک میں نمبر ۲ کے چند قطرے دوسرے میں نمبر ۳ کے چند قطرے اور تیسرے میں نمبر ۴ کے چند قطرے ڈال دیجئے — اس کے بعد بوتل کا پانی پہلے گلاس میں ڈالئے تو شراب کا سا رنگ آ جائے گا۔ اب دوسرے گلاس کا سُرخ پانی تیسرے میں ڈالئے تو سفید دودھ کا سا رنگ ہو جائے گا — اگر رنگ خاطر خواہ پیدا ہو تو دواؤں کی مقدار آپ زیادہ کر سکتے ہیں۔
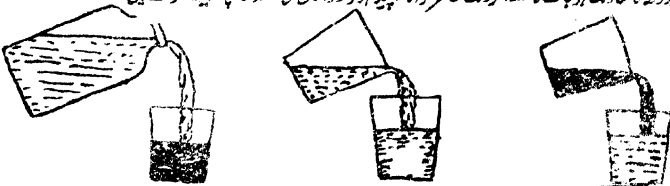
جادو کی سائنس — چونے کی ایک ڈلی لیکر اس پر پانی ڈالئے، جب چونا کھل کر حل ہو جائے تو تھوڑا سا پانی اور ڈال کر چونا تہ نشین ہو جانے دیجئے۔ اس کے بعد اوپر کا صاف پانی کسی برتن میں لے لیجئے — کسی چھوٹی شیشی میں یہ چونے کا پانی لیکر اس میں ایک قطرہ محلول Phenolphthalein کا ملا دیجئے تو اس کا رنگ سُرخ ہو جائے گا۔ لیکن جب آپ کسی ٹیوب کے ذریعہ سے اپنی سانس اس میں داخل کریں گے تو وہ پھر سفید رنگ کا ہو جائے گا۔ کیونکہ آپ کی سانس میں کاربن تھا اور اس نے رنگ بدل دیا۔
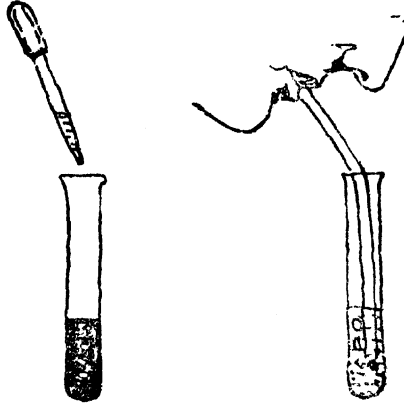
کیمیاوی درخت — جست کا ایک پتر لیکر شکل الف کی طرح قینچی سے کاٹ لیجئے اور پھر کٹے ہوئے حصوں کو موڑ کر شکل ب کی طرح گویا ایک درخت کی صورت دیجئے۔ نیچے کے حصے کو اس طرح جھکا دیجئے کہ یہ جست کا درخت زمین پر ٹھہر سکے۔ کسی چوڑے منہ کے شیشے کے برتن میں پانی بھر کر ایک چمچ Lead Acetate ملا دیجئے اور اس میں جست کے درخت کو رکھ دیجئے۔ چند گھنٹے کے بعد یہ واقعی اصلی درخت معلوم ہونے لگے گا۔
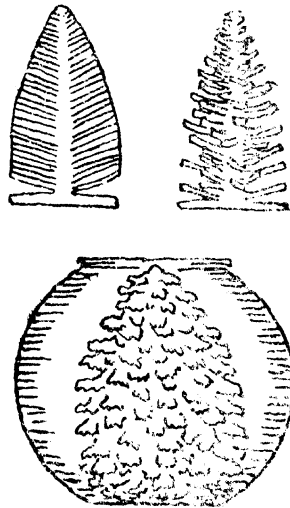
جادو کی آگ — فراہم کیجئے: — (۱) گندھک کا تیزاب — (۲) گندھک — Potassium Permanganate — اینٹ

نمبر ۳ نصف چمچ اینٹ یا سلیٹ پر رکھ کر چند قطرے پانی کے ڈال کر تر کیجئے۔ پھر چند قطرے نمبر ۱ کے ڈالئے اس کے بعد ایک چٹکی گندھک کے سفوف کی چھڑکئے تو شعلہ پیدا ہو جائے گا۔
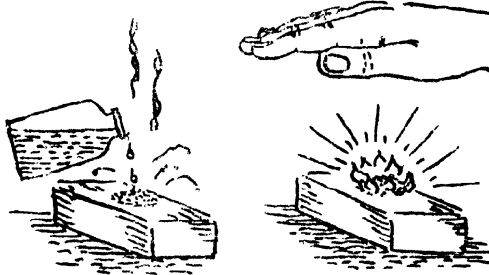
پھلجھڑی بنانا — فراہم کیجئے: — (۱) Potassium Chlorate — (۲) المونیم کا برادہ — (۳) کوئلہ — Dextrin (۴) — پتلا تار۔

دو اونس نمبر ۴ ایک بوتل پانی میں حل کر کے رکھ لیجئے۔ پھر ۱۰ اونس نمبر ۱، دو اونس نمبر ۲ اور ½ اونس نمبر ۳ ملا کر بوتل والا محلول ڈالئے یہاں تک کہ سب مل کر گاڑھی گوند کی طرح ہو جائے۔ اسے تار پر لگا کر خشک ہو جانے دیجئے۔ جب آپ اسے روشن کریں گے تو خوشنما سفید پھول پیدا ہوں گے۔

اگر آپ ½۱ اونس Stronitium nitrate کا سفوف ملا دیں گے تو پھول سرخ پیدا ہوں گے اور دو اونس Barium Nitrate ملا دیں گے تو سبز پھول نمودار ہوں گے۔
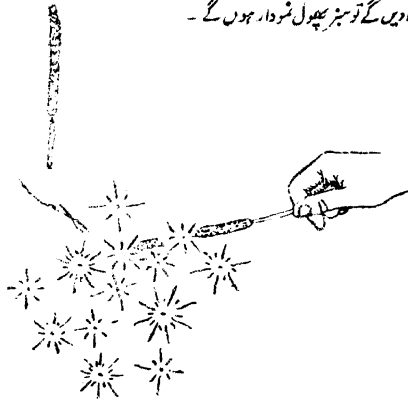
جادو کا سانپ — فراہم کیجئے: — (۱) Potassium Bichromate — (۲) Potassium Nitrate (۳) شکر — (۴) الکحل۔

ٹھیک ٹھیک وزن کر کے تین اونس نمبر ۱، ½۱ اونس نمبر ۲، اور تین اونس شکر لیجئے۔ ان کو علیحدہ علیحدہ باریک کر کے چھان لیجئے اور پھر تینوں کو ملا کر تھوڑا سا الکحل اس میں ڈالئے یہاں تک کہ وہ موم کی طرح ہو جائے۔ اس سے چھوٹی چھوٹی مخروطی شکل کی گولیاں بنا کر خشک کر لیجئے۔ ان کو جب آپ آگ

دیں گے تو سیاہ رنگ کا سانپ اس سے پیدا ہوگا۔
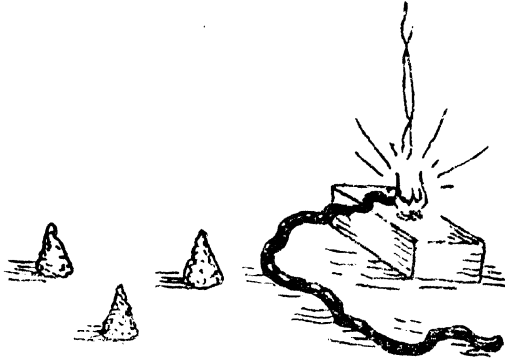
سُنہرا فوارہ — فراہم کیجیے: (۱) Potassium Nitrate (۲) گندھک (۳) کاجل۔

ٹھیک ٹھیک وزن کرکے ۹ اونس نمبر(۱) ۲/۱ اونس نمبر(۲) اور ڈھائی اونس نمبر(۳) لیجیے۔ نمبر(۱) اور نمبر(۲) کو علٰحدہ علٰحدہ باریک کرکے چھان لیجیے اور نمبر۳ کے ساتھ خوب ملا دیجیے۔ ایک چمچ کسی کاغذ پر رکھ کر کنارے آگ لگا دیجیے اور ہٹ جائیے۔

کاغذی تصویروں میں جان — شیشے کا ایک ٹکڑا آٹھ نو انچ لمبا اور ۶ انچ چوڑا لیجیے۔ دو کتابیں کم از کم دو انچ موٹی رکھ کر ان پر یہ شیشہ اس طرح رکھ دیجیے کہ گویا اس کا ایک پل سا بن گیا۔ شیشہ اور تختے کے درمیان جو جگہ ہے، اس میں مومی کاغذ کی چھوٹی چھوٹی تصویریں کاٹ کر ڈال دیجیے۔ جب آپ ریشمی رومال سے اس شیشے کو رگڑیں گے تو یہ کاغذی تصویریں اچھلنے لگیں گی۔

نواب مرزا شوق کی مثنویاں

ایک زمانہ میں جبکہ میرا دماغ صرف طالب علمانہ ذہنیت کا رہین منت تھا، مجھے مولانا حالی مرحوم کے مقدمۂ شعر و شاعری کو [illegible] زیادہ رٹنے پر مجبور ہونا اور تحقیق و تدقیق کے بجائے اس بات پر ایمان لانا پڑا تھا کہ نواب مرزا شوق کی بنیاد خواب و خیال [illegible] اشعار پر رکھی گئی [illegible] کا ذکر [illegible] اپنے بعض احباب سے سُنا تھا۔

زمانہ گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ بعد میں آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اور ان کی [illegible] ہو سکا۔ اسوقت میرے دماغ کے وہ نقوش جو محو ہونے کے قریب تھے پھر اُبھر آئے اور ان باتوں کی یاد پھر دماغ [illegible] کے "محدود مطالعہ" نے اس کے دماغ میں پیدا کر دی تھیں۔ اس وقت میں نے مقدمہ شعر و شاعری [illegible] خواب و خیال کا وہ مقام بھی دیکھا جو ہمارے محترم مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے اس مثنوی کی طباعت کے وقت [illegible] مستمرہ کے بموجب شعرائے دہلی کے مقابلہ میں شعرائے لکھنؤ کو گرانے کی سعی [illegible] عمل کی تھی۔

مولانا حالی مرحوم اور ان کی تائید میں مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے خیال میں یہ سلسلہ قائم کرنے کی سعی کی [illegible] روزمرہ کی زبان، لکھنے کی اہلیت ہی مفقود تھی اس لئے نواب مرزا شوق کو لکھنؤ چھوڑ کر دہلی کی ایک غیر مشہور اور مجہول مثنوی کو اپنا موضوع بنانا پڑا [illegible] کہ لوگ یہ ایراد کریں کہ مثنوی خواب و خیال کو مجہول کہنا درست نہیں۔ کیونکہ وہ اسوقت انجمن ترقی اُردو کی [illegible] ہندوستان [illegible] [illegible] میں موجود ہے لیکن ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں اس وقت اس کی اس سے زیادہ حیثیت نہ تھی۔ یہاں تک کہ مولانا حالی کی نظر [illegible] گزر سکی اور انھیں اپنے بعض احباب کے کہنے پر اعتماد کرنا پڑا۔ اس لئے یہ کہنا کہ نواب مرزا نے اپنی مثنویوں کی بنیاد "خواب و خیال" پر رکھی [illegible] بالکل بے بنیاد ہے۔ جن حضرات نے ادب اُردو کا وسیع مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ نواب مرزا شوق کی مثنویوں سے بہت ہی کم مدت پہلے [illegible] صاحب کی مثنویاں عالم وجود میں آچکی تھیں جن میں زبان کا وہ لطف اور چٹخارا بدرجۂ اتم موجود ہے جو میر اثر تو کیا دہلی کے کسی شاعر کو نصیب نہ ہو [illegible] ہمارے اُدبائے اُردو ان مثنویوں کے مطالعہ سے محروم رہے ہوں۔ اس وقت یہ چاروں مثنویاں ہمارے پیش نظر ہیں [illegible] واجد علی شاہ [illegible] ہو کر ہندوستان کے اکثر کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں مولانا حالی اور مولوی عبدالحق صاحب [illegible] مقدمۂ شعر و شاعری اور خواب و خیال کے مقدمہ میں یہ نہ لکھا جاتا کہ "مرزا شوق کے زمانہ میں لکھنؤ کی شاعری [illegible] تصنع و تکلف انتہا درجہ پر پہونچ گیا تھا" یہ ایک حد تک درست کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ آتش اور میر تعشق کے علاوہ [illegible] مثنوی کے مذاق میں قصیدہ گوئی کی سی شان پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام اصناف شاعری میں ایسا ہی تھا۔ [illegible] لکھنؤ ہی ہے جس نے شاعری کی بہت وسیع اور اہم صنف مرثیہ گوئی کو معراج کمال تک پہونچا دیا اور سارے ہندوستان پر ثابت کر دیا کہ اس میدان میں اہل دہلی باوجود کوشش بلیغ کے بھی محروم و ناکام رہے اور آخر کار انھیں اپنے عجز و مجبوری کا اظہار کرنا پڑا۔

اس کے بعد میں یہ کی مثنوی نگاری پر نظر ڈالئے۔ اس میں اہل لکھنؤ نے جو کمال پیدا کیا اس کا مولانا حالی کو بھی اقرار کرنا پڑا۔ صرف مثنوی سحرالبیان یک ایسی مثنوی ہے جس کو دہلی سے منسوب شاعر میر حسن کی وجہ کر اہل دہلی فخر و ناز کا علم بلند کرتے رہتے ہیں [illegible] اگر میر حسن کے سوانح حیات پر نظر ڈالی جائے [illegible] دہلوی کہنا ایسا ہی معلوم ہوگا جس طرح ہندوستان کے لوگوں کا اپنے آپ کو اکثر بخاری۔ افغانی۔ شیرازی اور نجفی وغیرہ کہنا۔ جن حضرات کی

شعرائے اُردو کے تذکروں پر نظر ہے انھیں بخوبی علم ہے کہ میر حسن ۱۲ سال کے سن میں دہلی چھوڑ کر اودھ آئے اور آخر کار یہیں پیوند خاک ہو گئے بلاشبہ دہلی کو میر حسن کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن اگر موریہ کو مولد قرار دیا جا سکتا ہے تو مرزا غالب اور میر تقی میر اکبر آبادی کہلائے جانے کے زیادہ سزاوار ہیں ۔ لیکن اگر ان دونوں کا منشا دہلی قرار دیکر وطنیت کا سہرا بھی اس کے سر پر باندھا جا سکتا ہے تو پھر میر حسن کو لکھنوی کہتے ہوئے کسی قسم کا تکلف نہیں ہونا چاہئے اور اس کے بعد بے چون وچرا یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ انھوں نے یہیں کے زمانہ قیام میں اور یہیں کے ماحول سے متاثر ہو کر وہ مثنوی لکھی جس پر اہل دہلی کو تو کیا اہل لکھنؤ کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے ۔

اب زبان لکھنے والے مثنوی نگاروں کی فہرست میں نواب و خیال کے باعث صرف میر اثر باقی رہ جاتے ہیں ۔ لیکن جنھوں نے اس مثنوی کو بغور پڑھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس میں مثنویت کی کیا شان ہے اور اس میں مثنوی نگاری کی کون کون سی خوبیاں پائی جاتی ہیں ۔ بجز اس کے کہ انھوں نے اپنی طبیعت کا زور چند بے سروپا باتوں پر صرف کر ڈالا ہے ۔

اس کے بعد ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ صرف تنہا لکھنؤ ہی ہے جس کو اردو کے مثنوی نگاروں کے مولد و منشا ہونے کا بجا طور پر فخر و امتیاز حاصل ہے اور اس خاک پاک نے ادب اُردو میں ان بے مثال مثنویوں کا اضافہ کیا ہے جن پر ادب اُردو صدیوں تک ناز کرے گا ۔ لکھنؤ کی مثنویوں میں سے مندرجۂ ذیل کو امتیازی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے : ۔

(۱) سحر البیان از میر حسن ۔ (۲) گلزار نسیم از پنڈت دیا شنکر نسیم ۔ (۳) دریائے تعشق ۔ (۴) افسانۂ عشق ۔ (۵) بحر اُلفت از واجد علی شاہ اختر ۔ (۶) لذت عشق از آغا حسن نظم لکھنوی ۔ (۷) مثنوی عالم از بادشاہ محل صاحبہ ۔ (۸) طلسم اُلفت از تعلق لکھنوی ۔ (۹) فریب عشق ۔ (۱۰) بہار عشق (۱۱) زہر عشق از نواب مرزا شوق لکھنوی ۔ ان کے بعد ۔ (۱۲) حزن اختر از واجد علی شاہ ۔ (۱۳) معراج المضامین از منیر لکھنوی (۱۴) ترانۂ شوق اور (۱۵) عالم خیال از شوق قدوائی لکھنوی وغیرہ ۔ ان میں زیادہ تر وہ مثنویاں ہیں جو ملک میں دائر و سائر ہیں ۔ صرف واجد علی شاہ اور بادشاہ محل صاحبہ کی مثنویاں کمیاب ہونے کی وجہ سے ناظرین سے جیسا کہ چاہئے خراج تحسین نہ حاصل کر سکیں اور اسی وجہ سے مولانا حالی اور مولوی عبدالحق صاحب کی نظر سے بھی نہ گزر سکیں ۔ یہ وہ مثنویاں ہیں جو مرزا شوق کی مثنویوں سے کچھ ہی مدت پہلے عالم وجود میں آئی تھیں ۔ ان میں سے ہم واجد علی شاہ کی مثنوی بحر اُلفت اور بادشاہ محل صاحبہ کی مثنوی عالم کے نمونے ذیل میں درج کرتے ہیں ۔ ان کو پڑھ کر سوچئے کہ کیا اس قسم کی زبان کے اپنے گرد و پیش ہوتے ہوئے نواب مرزا شوق کو کسی سو برس دور کی اس مثنوی (خواب و خیال) کو نمونہ بنانے کا خیال پیدا ہو سکتا تھا جو اس زمانہ میں اپنے بے سروپا مضامین کے باعث تقریباً گمنامی میں پڑی ہوئی تھی ۔

بحر الفت کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے : ۔

تیرے دیدے سے ڈریے اے رنڈی　　کیوں لئے مرتی ہے مجھے رنڈی
مجھ سے چار آنکھ کیجئے گا ذرا　　صاف دیدہ ہے دیکھنا کیسا
تم خفا ہو کے خوش مری جاں،　　اتنا ہنسئے کہ رو نہ دے انساں
اے پریرو مضائقہ کیا ہے　　آدمی آدمی پہ ہنستا ہے
تم تو صاحب ہنسی میں روتی ہو　　سیدھی باتوں میں ٹیڑھی ہوتی ہو
رمزیں سننے کی دل کو تاب نہیں　　اب مرے پاس کچھ جواب نہیں
پاس آداب پھر اُٹھا دوں گی　　لاکھوں صلواتیں پھر سُنا دوں گی
اب کہاں تک بھلا میں ضبط کروں　　آخر میں بھی پتا رکھتی ہوں،
خوب کیا مجھ میں پانی مرتا ہے　　کیا مجھے بھی وہ پیار کرتا ہے
یہی ہوتے ہیں فعل انساں میں　　منہ تو ڈالو ذرا گریباں میں
نقرے کیجے یہ یا کے اور کہیں،　　یہاں خوشامد پسند طبع نہیں،

چلو اتنی بناوٹیں نہ کرو　　ہٹو مجھ سے لگاوٹیں نہ کرو
یہ کہیں اور جا کے دم دیجے　　بس بس اب آپ کے قدم لیجے
کتنی بھولی ہیں آپ تو واللہ　　کوئی جانے کہ کچھ نہیں آگاہ،
مردوے دل میں اپنے کچھ شرما　　چل الگ ہٹ ذرا برائے خدا
ہیں یہ سب جانتی ہوں بدذاتی　　کچھ تجھے شرم بھی نہیں آتی،
مجھ سے پھر آنکھ چار کرتا ہے　　دیدہ دانستہ تو مکرتا ہے
تو بھی کیا جعل ساز ہے واللہ　　کس قدر فقرہ باز ہے واللہ
ارے او فیلسوت او بدذات　　تیرے آگے تو ہے قسم اک بات
تو بڑی چیز بھی اگرچہ اُٹھا سے　　تو بھی دل کو مرے یقیں نہ آئے
تو دبائے بغل میں ایماں ہے　　سر تو جھوٹوں کا رحل قرآں ہے
اب ترے جل میں کب میں آتی ہوں　　تجھ سے خود لاکھوں جل بتلاتی ہوں

جبکہ اس نے نہ کوئی ڈھب پایا		جان دینے پہ اپنی دھمکایا
بولی کس ناز سے وہ ماہ لقا		لو خدا راس لائے سچ کہنا
جان دینے پہ کیا دلیر ہے تو		کس قدر زندگی سے سیر ہے تو
اپنی دانست میں ڈراتے ہو		لو مرے دل کو آزماتے ہو
[illegible] دوے حواس میں آ		یہ کسی بیوقوف کو دھمکا،
[illegible] کا اس نے قصد کیا		غصے کے تیوروں سے ڈانٹ دیا
خوب کھل کھیلے تم بلانے سے		اچھے چل نکلے منہ لگانے سے
دیکھو کمبختیاں نہ آجائیں		بس زیادہ نہ آپ اترائیں
خوب آکر اودھم مچایا ہے		کیا مجھے مسخرہ بنایا ہے
اتنا کرتے نہیں چیبلا پن ،،		خبط میں مبتلا ہیں، کیا دشمن
میں بھی پھر کہنے پر جو آؤں گی		سیکڑوں بے نقط سناؤں گی
یاں سے ذلت اٹھاکے جاؤگے		بیحیا ہوگے پھر جو آؤگے
مجھ سے بھونڈے نہ اختلاط کرو		یہ کہیں اور ارتباط کرو
اور مستانیاں وہ ہوتی ہیں		آبرو جو کہ اپنی کھوتی ہیں
بندی ایسی نہیں ہے اوداتی		رال میری نہیں کہیں جاتی
اب بھلا اور تو امید کہاں		دل کے تو کچھ نکال لو ارماں
چلو [illegible] جی تو اپنا بہلا لو		کچھ گریباں نہیں تو منہ [illegible] ڈالو
میر[illegible] اس ڈھٹائی کی		اور اس دیدے کی صفائی کی
اوروں سے گرمیاں کرو صاحب		ٹھنڈی سانسیں نہ یوں بھرو صاحب
اور کہنا یہ تھا ادا کے ساتھ		ٹوٹ جاویں خدا کرے یہ ہاتھ
اور کہنا ملال سے کہ ہٹو		آگ لگ جائے ایسی باتوں کو
سر جو رکھ دیتے ہیں بہ زانو پر		وہ ہٹاتی ہے مار کر ٹھوکر
کہتی ہے کیا یہ غمزے لائے ہو		خوب کچھ تم مزے میں آئے ہو
آج کل تم کو جوشِ خوں تو نہیں،		فصد لو فصد لو جنوں تو نہیں،

مثنوی عالم کا نمونہ :-

تم نے اتنی کہاں اڑائی ہے		جس قدر میں نے بھون کھائی ہے
دونوں یہ لڑکیاں جو ہیں شتاہ		ان کے دم میں نہ آنا تم للہ،
بکتی بکتی ہوئی میں دیوانی		ان کے دیدوں کا ڈھل گیا پانی
تھگلی بادل میں یہ لگائیں گی		دیکھنا کیسے گل کھلائیں گی،
میں ادب کرتی ہوں تمھارا بس		اب یہ نخرے نہیں گوارا بس
کھل گئی جس گھڑی کہ میری زباں		کچھ اٹھا رکھوں گی نہ میں بھی ہاں
مجھ کو جو رنج ہے وہ کس سے کہوں		نوج یہ بوڑھے چونچلے میں سہوں
میں تو بچپن سے اس محل میں پلی		اور گلی کوچے میں پھری نہ چلی،
آپ کی آنکھ میں جو کھٹکی ہوں،		کیا روئے سے میں بھی اٹکی ہوں
کرتہ شنگرفی میں رنگاتی ہوں		چھری پیڑو کی میں دکھاتی ہوں
یا کہ درباری سے ہے آنکھ لڑی		یا کسی مرد پر پھسل میں پڑی
میری خاطر ہزاری روتا ہے		بوڑھے چونڈے میں وسم ہوتا ہے
سن کے انا کے یوں مرچ لگی		بولی جھلاکے کیوں ری چھتیسی
مرے جوگی ہوئی تو ناشدنی		ایسی باتوں سے کیا ہے جی میں ٹھنی
[illegible] بھتنی نہ تیری ماں دختر		تیرے بدلے نہ نکلا کیوں تھپیسم
[illegible] ابھی میں اپنے گھر کو جاؤں گی		بھتی انا کی آج کھاؤں گی
تجھ کو کھربیٹ انھیں سے بنتی ہے		جو نہ کہنا ہے ان کو کہتی ہے
بے سبب جب سے تو اکنے لگی،		میری نظروں میں تو کھٹکنے لگی،
اتنا بک بک کے مجھ کو تم نہ ستاؤ		مغز میرا نہ کھاؤ گھر جاؤ،
کانٹے گلشن کے جھاڑ کے لپٹے		بے طرح پیچھے جھاڑ کے لپٹے
اک ذرا ہٹ کے پاس سے بیٹھو		سنبھلو صاحب حواس سے بیٹھو
دیکھنا اختلاط کی خوبی،		مجھ کو یہ دلپذیر سے ڈوبی
باغ میں آکے خار میں ہوں پھنسی		میں تو کوا گھاریہ[illegible]

ان اشعار کے مطالعہ کے بعد کیا کوئی منصف مزاج یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ نواب مرزا شوق کا ثمنہ
اس سلسلہ میں یہ دلیل بھی لائی جاتی ہے کہ مرزا شوق کی مثنویوں کے بعض
نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ خواب و
جن میں سے دو ایک شعر ہم کو بھی یاد ہیں" مولانا عبدالحق
دونوں مثنویوں کے اس قسم کے اشعار برابر برابر
اسی مثنوی پر انھیں اس قسم کی زبان لکھنے کا خ

مثنویاں تک اردو میں ... سائی ہو چکی تھی -

اس کا فیصلہ کہ مرزا شوق کی اس حرکت کو توارد کا جامہ پہنایا جائے یا سرقہ کا الزام ان کے سر تھوپا جائے صاحبان بصیرت پر چھوڑتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ اب میں اس موقع پر یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر شوق کی مثنویوں کے مقابلہ میں زیر بحث مثنویاں زبان کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں - اور اگر اس کو توارد کے بجائے سرقہ قرار دیا جائے تو بھی ایسا سرقہ فن شعر میں جائز و محمود قرار دیا گیا ہے جو اپنے ماخذ سے الگ ہو کر اپنے لطف و خوبی کو زیادہ کر دے اور اس سے کون [illegible] ہے کہ مرزا شوق کی مثنویوں کی زبان سے کوئی دوسری مثنوی کی زبان لگا نہیں کھا سکتی اس لئے ہم اگر اس کو زیادہ سے زیادہ سرقہ حسنہ کہیں تو قابل اعتراض نہیں -

ساحل بلگرامی

اُردو میں اعداد کا ناقص طرزِ تحریر

دنیا کی مروجہ زبانوں میں چینی زبان کے علاوہ جس کا رسم الخط عمودی ہے بقیہ کل زبانیں دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی ہیں اور ان میں عربی فارسی اور اُردو دیگر السنۂ شرقیہ وغربیہ سے اپنے مخصوص طرزِ تحریر کے لحاظ سے ممتاز نظر آتی ہیں لیکن جہاں تک علم الحساب میں اعداد و شمار کا تعلق ہے ان سب میں قطعی طور پر یکسانیت پائی جاتی ہے اور اعداد ہمیشہ بائیں جانب سے دائیں جانب لکھے پڑھے جاتے ہیں۔ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس سلسلہ میں کونسی زبان کس زبان کی رہین منت ہے اور بالخصوص فارسی عربی کی ممنون احسان ہے یا نہیں البتہ اُردو نے جہاں اپنے حروف تہجی اور رسم الخط وغیرہ کو عربی فارسی زبانوں سے مستعار لیا وہاں اعداد و شمار کے انداز نگارش میں بھی انھیں زبانوں کی مکمل طور پر تقلید کی۔ بہرکیف اس وقت جو کچھ بھی ہوا خواہ عمداً خواہ غیر ارادی طور پر اپنے مقام پر درست و مناسب سہی لیکن اب جبکہ وہ ابتدائی دور ختم ہو چکا ہے اور اُردو اپنی فطری رواداری و ہمہ گیری کے سبب اتنی قلیل عمر کے باوصف دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش نظر آتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس باب میں زبان اپنے مخصوص قواعد و نظر ثانی مرتب کرنے میں آزاد و خود مختار رہو اور دیگر زبانوں کی کورانہ تقلید سے گریز کرکے اپنے دساتیر و قوانین خود وضع کرے۔ چنانچہ سطور ذیل میں اعداد اُردو کے ناقص طرزِ تحریر سے بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس مسئلہ کا معقول حل بھی پیش کیا گیا ہے۔

اس وقت تک تمام زبانوں کے اعداد میں اکائیاں دہائیاں وغیرہ دائیں طرف سے بائیں طرف پڑھی جاتی ہیں مثلاً ۴۳۲ میں ۲ اکائیاں دائیں طرف ہیں، تین دہائیاں ۲ اکائیوں کے بائیں جانب اور چار سیکڑے تین دہائیوں کی بائیں طرف ہیں۔ لیکن اعداد کی اکائیوں دہائیوں وغیرہ کی یہ ترتیب صرف ان کے سمجھنے تک محدود رہتی ہے اور تحریر و تقریر میں معاملہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔ چنانچہ لکھنے پڑھنے میں بھی یہی ترتیب قائم رہتی ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا عدد چار سو بتیس پڑھا جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ طریقہ بائیں جانب سے دائیں جانب لکھی جانے والی زبانوں کے طرزِ تحریر کے عین مطابق ہے لہٰذا اس معاملے میں وہ نمایاں فرق نہیں لیکن اُردو میں صورت حالات مختلف ہے جہاں تحریر کی ابتدا دائیں جانب سے ہوتی ہے۔

اعداد اگر جداگانہ طور پر لکھے یا پڑھے جائیں تو مروجہ ترتیب سے زیادہ حرج نہیں ہوتا اور ان کو کسی جانب سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں عبارت کے درمیان میں اعداد آجاتے ہیں اصل دقت وہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر لکھنے والا بالعموم آخری لفظ کے بعد کچھ جگہ چھوڑ کر بائیں جانب سے ہندسے لکھنا آغاز کرتا ہے اور عدد کو دائیں طرف ختم کرکے از سر نو اس کے بائیں جانب سے لکھنے لگتا ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل شکل سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے :-

آ سے شروع ہو کر جس وقت عبارت مقام ب پر پہونچتی ہے لکھنے والا اپنی نگاہ و توجہ کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ کو بھی مقام ج تک لے جاتا ہے اور تحریر کو مخالف سمت شروع کرکے مقام د پر ختم کرتا ہے۔ پھر دفعتاً اس کی نگاہ و توجہ مقام د سے جست کرکے مقام س تک پہونچتی ہے اور ان کے ساتھ کاتب اپنے ہاتھ کو جنبش دے کر وہاں تک لے جاتا ہے۔
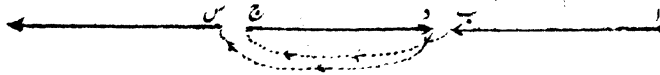
یہ طریقہ اُردو کی فطرت نگارش کے خلاف بھی ہے اور دقت طلب بھی۔ خلاف فطرت یوں ہے کہ لکھنے والے کو اپنی تمام توجہ دائیں جانب سے بائیں جانب اور بائیں جانب سے دائیں جانب دفعتاً مبذول کرنا پڑتی ہے پھر یہی نہیں بلکہ نگاہ پر بھی بار زیادہ ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے صحت دماغ پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے چنانچہ ہوتا بھی یہی ہے کہ اس قسم کی تحریر سے دماغ جلد تھک جاتا ہے اور طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ دقت طلب یوں ہے کہ اکثر اعداد کی جسامت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کے باعث خالی جگہ یا تو کم چھوٹ جاتی ہے یا زیادہ۔ چنانچہ پہلی صورت میں عدد کے آخری ہندسے مجبوراً چھوٹے کر دئے جاتے ہیں اور دوسری صورت آخری ہندسو

کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا جاتا ہے یا خلا باقی رہ جاتا ہے ۔ بہرحال تحریر دونوں طرح بدنما ہو جاتی ہے ۔

یہ تو ہیں وہ دقتیں جو الفاظ اور ہندسوں کے ساتھ ساتھ لکھے جانے سے رونما ہوتی ہیں اور جو علی العموم پیش آیا کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مختلف قسم کی دشواری جس کی اہمیت سررشتہ تعلیم سے مختص ہے اور عوام سے اس کو زیادہ تعلق نہیں ہوتا حساب کے ابتدائی قاعدوں کے سوالات میں اساتذہ و طلبہ کو اُردو مدارس میں کم اور انگریزی مدارس میں خاص طور پر محسوس ہوتی ہے ۔

جمع اور ضرب کے سوالات میں تو بہرصورت نبھ جاتی ہے لیکن تقسیم و تفریق کے موقع پر غلطی کا امکان پیدا ہوتا ہے اور بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہمارے محکمہ تعلیم کے ناخداؤں اور پیشواؤں نے انگریزی ہندسوں کو اُردو ہندی میں بھی لازمی قرار دے رکھا ہے یہ امکان واقعہ کی حد تک پہونچ کر یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ مثلاً $\frac{4}{5} \div \frac{2}{5}$ کو انگریزی ہندسوں میں لکھ کر انگریزی تحریر کے مطابق پڑھنے سے اس کا جواب ۲ آتا ہے لیکن اُردو ہندسوں میں لکھنے پڑھنے سے اس کا جواب ½ نکلتا ہے ۔ یہ مصیبت بھی اُردو پڑھنے والے بچے کے لئے کم نہ تھی کہ اس پر حساب کی درسی کتابیں لکھنے والوں نے بالعموم یہ اور قیامت ڈھائی ہے کہ اس قسم کے سوالات کو کہیں اُردو کے قاعدے سے لکھا ہے اور کہیں انگریزی طریقے سے تحریر کیا ہے اور اس پر ستم ظریفی یہ کہ ہمارے محکمۂ تعلیم نے ان کتابوں کو بچوں کے نصاب تعلیم میں منظور بھی فرما لیا ہے ۔

نفی کے سوالات میں البتہ اس غلطی کا امکان کم ہے اس لئے کہ ہمیشہ بڑے عدد میں سے چھوٹا عدد منہا کیا جاتا ہے لہذا حل کرنے والا اپنی غلطی محسوس کر سکتا ہے ۔ لیکن کسر کے طولانی سوالات میں بچے کے لئے اس قسم کا احساس دشوار ہے اور اگر ہو بھی سکتا ہے تو حل کے بالکل آخری حصے میں جبکہ وہ اپنا کافی وقت اور پوری دماغی قوت صرف کر چکتا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اپنی غلطی کا بار بچے کے سر رکھتے ہیں اور اسی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں ۔ یہ ایک صریح ظلم ہے کہ ہم اپنے ضمیر کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور دوسرے کو بھی فریب دینا روا رکھتے ہیں ۔

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ان تمام مشکلات کا ذمہ دار اعداد اُردو کا ناقص طرزِ تحریر ہے اور اس ناقص طرزِ تحریر کا تمام تر بار ہماری کورانہ تقلید قدامت پرستی اور سہل انگاری کے سر ہے اس لئے کہ ذرا سی توجہ سے یہ معاملہ بالکل طے ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ اگر ہم اعداد کو بھی الفاظ کے اندازِ نگارش کے مطابق لکھنے لگیں تو یہ دشواریاں یکقلم موقوف ہو جائیں یعنی اکائی کو دائیں طرف نہ رکھ کر بائیں جانب قایم کریں مثلاً چار سو بتیس کو بجائے ۴۳۲ کے ۲۳۴ لکھنے لگیں تو تحریر و تقریر دونوں میں سہولت پیدا ہو جائے ۔ اس طرح ہندسوں کے مقامات تبدیل کرنے سے ہماری گنتی یوں ہونا چاہئے ۔

۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۸ ، ۹ ، ۰۱ ، ۱۱ ، ۲۱ ، ۳۱ ، ۴۱ ، ۵۱ ، ۶۱ ، ۷۱ ، ۸۱ ، ۹۱ ، ۰۲ ، ۱۲ ، ۲۲ ، ۳۲ ، ۴۲ ، ۵۲ ، ۶۲ ، ۷۲ ، ۸۲ ، ۹۲ ، ۰۳ ، ۱۳ ، ۲۳ ،

۳۳ ، ۴۳ ، ۵۳ ، ۶۳ ، ۷۳ ، ۸۳ ، ۹۳ ، ۰۴ ، ۱۴ ، ۲۴ ، ۳۴ ، ۴۴ ، ۵۴ ، ۶۴ ، ۷۴ ، ۸۴ ، ۹۴ ، ۰۵ ، ۱۵ ، ۲۵ ، ۳۵ ، ۴۵ ، ۵۵ ، ۶۵ ، ۷۵ ، ۸۵ ، ۹۵ ، ۰۶ ،

۱۶ ، ۲۶ ، ۳۶ ، ۴۶ ، ۵۶ ، ۶۶ ، ۷۶ ، ۸۶ ، ۹۶ ، ۰۷ ، ۱۷ ، ۲۷ ، ۳۷ ، ۴۷ ، ۵۷ ، ۶۷ ، ۷۷ ، ۸۷ ، ۹۷ ، ۰۸ ، ۱۸ ، ۲۸ ، ۳۸ ، ۴۸ ، ۵۸ ، ۶۸ ، ۷۸ ، ۸۸ ،

۹۸ ، ۰۹ ، ۱۹ ، ۲۹ ، ۳۹ ، ۴۹ ، ۵۹ ، ۶۹ ، ۷۹ ، ۸۹ ، ۹۹ ، ۰۰۱ —

اب اگر ہم ہندسوں میں پینسٹھ لاکھ اٹھتّر ہزار نو سو باون لکھنا ہے تو یوں لکھیں گے ۔ (۲۵۹۸۷۵۶) اور اکائی دہائی سیکڑہ وغیرہ دائیں سے بائیں کے بجائے بائیں سے دائیں کو شمار کریں گے ۔ یا اگر بیالیس اعشاریہ چار تین آٹھ لکھنا ہے تو یوں لکھیں گے (۲۴ ۔ ۴۳۸) اور اعشاریہ کے مراتب کو دائیں سے بائیں ، دسواں ، سواں ، ہزارواں ، حصہ سمجھیں گے ۔ یا مثلاً پونے چار آنے کو ۳۰ ر لکھیں گے اور بڑی بڑی رقوم تو ہمیشہ سے اسی طرز پر لکھی جا رہی ہیں مثلاً ایک ہزار پانچ سو ستاون روپیہ ۔ الصامعے ر لکھے جاتے ہیں ۔

الغرض اعداد اُردو کو اس طرح لکھنے سے تمام دقتیں از خود غائب ہو جائیں گی اور تحریر میں روانی ہمواری اور سہولت پیدا ہو جائے گی ۔ علاوہ ازیں اس امتیازی طریقے سے طلبہ کی مشکلات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور وہ انگریزی ہندسوں میں لکھے ہوئے سوالات کو انگریزی قاعدے سے اور اُردو ہندسوں میں لکھے ہوئے سوالات کو اُردو قاعدے سے حل کرنے لگیں گے ۔ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب سے امید ہے کہ وہ اس باب میں ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور اپنی گرانقدر رائے سے اس تاریک پہلو پر بھی روشنی ڈالیں گے اور مجھے میری تجویز کی صحت و عدم صحت سے آگاہی بخشیں گے ۔

سید محمود نقوی سہیل

شاعرِ فطرت

فطرت تری آواز ہے، فطرت ہی تیرا ساز ہے
فطرت کا تو ہمراز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

جوہر دکھائے نطق کے، دیگر زباں جذبات کو
کیا سحرِ رنگیں انداز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

کہسار تیرے منتظر، گلشن کو تیری آرزو
آغوشِ صحرا باز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

ساحل کی ہو لب تشنگی، یا اضطرابِ موج ہو
تو دونوں کا غماز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

بالانشاط و غم سے ہے، بازیچہ گاہِ دہر میں
سب کا تو گر دمساز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

نغموں کے گل بکھرا دئے سازِ محبت چھیڑ کر
کیا نغمے ہیں، کیا ساز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

اک جنبشِ لب نے تری گمنام کو نامی کیا
آواز یا اعجاز ہے! اے شاعرِ رنگیں نوا

قربانی و ایثار ہیں زندہ ترے الفاظ ہیں
تو غیب کی آواز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

ہر نالۂ موزوں ترا، تاثیر میں ڈوبا ہوا
اک شاہدِ طناز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

تجھ سے فروغِ حسن ہے، تجھ سے ہے شہرہ عشق کا
تو نقشبندِ راز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

انجام ہر آغاز کا تجھ پر ہوا ہے آشکار
عالی تری پرواز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

وجداں ترا الہام ہے، پیغام تیرا عشق ہے
دل خوابگاہِ ناز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

شہبازِ عقل و ہوش کے جلتے ہیں پر جس اوج پر
تیرا وہ پا انداز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

سائنس اور حکمت جہاں تاریکیاں ہیں جہل کی
تو آئینہ پرداز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

وہ گیت گا، وہ سوز بھر، یا جاگ اٹھے یا جل اٹھے
دُنیا کہ محوِ آز ہے، اے شاعرِ رنگیں نوا

خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنو

روس کی موجودہ صحافت

سوویٹ یونین میں اس وقت نو ہزار اخبار، ستر زبانوں میں شایع ہو رہے ہیں، اور حملۂ جرمنی کے وقت ان اخباروں کی کاپیوں کی مجموعی تعداد تین کروڑ تیس لاکھ تھی۔ یہ اخبار تین قسم کے ہیں، ایک وہ جو حکومت کے قومی ادارہ سے شایع ہوتے ہیں اور ان کی اشاعت ایک کروڑ ہے، اور دوسرے وہ جو ماسکو سے باہر روس کی یونین ریپبلکوں کے پندرہ صدر مقاموں اور دوسرے بڑے بڑے شہروں سے شایع ہوتے ہیں، اور ان کی اشاعت ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور تیسرے وہ جو مختلف زراعتی و صنعتی اداروں سے متعلق ہیں اور ان کی اشاعت ایک کروڑ ۱۰ لاکھ ہے۔

ہر چند یہ اعداد و شمار ایسے نہیں جو یوروپ کے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں کوئی خاص اہمیت رکھتے ہوں، لیکن حکومت زار کے مقابلہ میں یقیناً بہت حیرتناک ہیں۔

زار کی حکومت میں انقلاب سے قبل (۱۹۱۳ء) یہاں صرف ۸۵۹ اخبار شایع ہوتے تھے جن کی مجموعی تعداد اشاعت پونے تین کروڑ سے زیادہ نہ تھی ان میں ۶۰۰ اخبار روسی روسی زبان میں شایع ہوتے تھے اور انھیں کی اشاعت زیادہ تھی۔ باقی ۸۴ اخبار جو غیر روسی زبان کے تھے وہ بہت کم تعداد میں چھپتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں روسی زبان کے اخباروں کی تعداد آٹھ گنی ہوگئی (یعنی ۶۲۳۲) اور غیر روسی زبان کے اخباروں کی تعداد ۲۶ گنا بڑھ گئی (یعنی ۲۱۶۸) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سوویٹ حکومت نے عام تعلیم کی طرف کتنی توجہ کی اور ملک کی غیر روسی قوموں کو روسی قوم کی سطح تک لانے میں کس قدر جد و جہد سے کام لیا۔ لیکن فرق یہ ہے کہ برطانوی اخباروں کی اس ترقی میں زیادہ تر لندن کے اخباروں کا حصہ تھا اور روس میں ماسکو سے باہر ملک کے اضلاع کو ترقی کا زیادہ موقع دیا گیا۔ اس لئے جس حد تک ملکی صحافت کا تعلق ہے، روس کو برطانیہ کے مقابلہ میں بھی درجۂ امتیاز حاصل ہے۔

اب سے ۲۵ سال پہلے روسی اخباروں کے لئے کاغذ تمام تر باہر سے آتا تھا، کیونکہ یہ صنعت وہاں بہت پیچھے تھی، لیکن جب انقلاب ہوا تو یہ سمجھ لیا گیا کہ اخباروں کے لئے کاغذ باہر سے نہ آئے گا بلکہ ملک کے اندر ہی بنایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر وہاں کے اخباروں پر پڑنا چاہئے تھا، کیونکہ کاغذ اس قدر جلد تو طیار ہو نہ سکتا تھا اور اسی لئے اخباروں کی اشاعت ایک کروڑ سے کم رہ گئی، لیکن گیارہ سال کے اندر ہی اندر کاغذ سازی کی صنعت نے وہاں اس قدر ترقی کر لی کہ ۱۹۳۰ء میں تقریباً چار کروڑ کاپیوں کا کاغذ ملک کے اندر طیار ہونے لگا۔

روسی صحافت کے اس قدر ترقی کر لینے کا خاص سبب وہاں کا نظام حکومت ہے جس نے شخصی و انفرادی ملکیت کو ختم کر دیا ہے، چنانچہ اب سے ۲۵ سال پہلے جب بالشیوک حکومت نے ذاتی ملکیت کی جگہ قومی و اجتماعی ملکیت کے اصول کو رائج کیا تو وہاں کے اخبار بھی اسی اصول پر شایع ہونے لگے اور ذاتی ملکیت سے آزاد ہو گئے۔

ماسکو میں اس وقت جتنے اخبار نکل رہے ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جنھیں حکومت کے مختلف محکمے اور تجارتی ادارے مل کر نکال رہے ہیں، بعض وہ ہیں جنھیں تنہا حکومت چلا رہی ہے، بعض اخبار محکمۂ بحریہ کے ہیں اور بعض فوج کے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:۔

۱- ازوسٹیا (Vestia) جس کی اشاعت تقریباً پانچ ۰۰ لاکھ ہے، حکومت کا اخبار ہے۔
۲- پراودا (Pravda) جس کی اشاعت ۲۲ لاکھ ہے، کمیونسٹ پارٹی کا اخبار ہے۔
۳- کامس کومولکایا (Komsocomolskaya) جس کی اشاعت سات لاکھ ہے۔ نوجوان طبقہ کا اخبار ہے۔

۴- پائنیر سکایا (Pionerskaya) جس کی اشاعت ۸ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ بچوں کا اخبار ہے جسے نوجوانوں کی کمیونسٹ لیگ شائع کرتی ہے۔
۵- ٹرڈ (Trud) تجارتی اداروں کی مرکزی کونسل کا اخبار ہے۔

ماسکو سے باہر صوبوں کے بڑے بڑے اخبار وہاں کے مختلف اداروں کے ہاتھوں میں ہیں، چنانچہ ۱۹۳۹ء میں اس قسم کے ۵۰۰ روزانہ اخبار صوبوں کی حکومتوں کی طرف سے شایع ہوتے تھے، ۳۵۰۰ اخبار زراعتی اضلاع کی طرف سے اور ۴۰۰۰ کارخانوں کی طرف سے۔

سوویٹ اخبار خواہ وہ کسی طبقہ کی نمایندگی کریں، ملک کی نہ صرف عام سیاسیات میں نمایاں حصہ لیتے ہیں بلکہ تمام اقتصادی، صنعتی، تجارتی اور سوشل مسایل میں بھی اپنی مستقل آواز رکھتے ہیں، اور یہی سبب ہے کہ ۲۵ سال کے اندر ملک کی حالت بدل گئی اور وہاں کے ایک ایک بچے میں قومی جوش و ولولہ پیدا ہوگیا ہے۔ وہاں کا ہر ہر فرد سمجھتا ہے کہ ملک اُس کا ہے اور ملک کی حفاظت و ترقی میں حصہ لینا اس کا فرض ہے۔

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے اہل ملک اور ملک کے اخباروں کی توجہ دوسرے مسایل سے ہٹ کر صرف سامان جنگ کی طیاری و فراہمی کی طرف مبذول ہوگئی ہے اور روس کے ۵۰ ہزار صحافیوں کی زندگی صرف صحافت کے لئے وقف نہیں ہے بلکہ وہ میدانِ جنگ میں جاکر لڑتے بھی ہیں، اسلحہ سازی کے کارخانوں میں بھی کام کرتے ہیں اور وہ ہر اس خدمت کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں جو اُن کے قومی وقار اور ان کی ملکی عزت کو قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

روس کی صحافت کا ایک خاص شعبہ "دیوار کی صحافت" بھی ہے، اس سے کاغذ کے وہ بڑے بڑے تختے مراد ہیں جن پر خبریں یا کارٹون وغیرہ چھاپ کر مکانوں سڑکوں، گلیوں اور کارخانوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیتے ہیں اور اسی سے وہاں کی صحافت کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس صحافت کو وہاں کے والنٹیر انجام دیتے ہیں اور اس طرح ملک کے تمام اعداد و شمار، اہم واقعات، ضروری خبریں، دلچسپ تصویریں، عام معلومات، اور دنیا کے سیاسی رجحانات پبلک کے سامنے بیک وقت آسانی کے ساتھ آجاتے ہیں۔

اس وقت روس کے جتنے بڑے بڑے صحافی ہیں، ان سب کی ابتدائی صحافتی زندگی اسی دیوار والی صحافت سے شروع ہوئی تھی اور آیندہ جو صحافی پیدا ہونے والے ہیں وہ بھی اسی طرح اُٹھیں گے۔

لینن کا قول تھا کہ "روس کے ایک ایک باورچی کو عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینا سیکھنا چاہئے" اور اس میں شک نہیں کہ روس کی صحافت نے جو عام ذہنی انقلاب ملک میں پیدا کر دیا ہے، وہ لینن کی اس خواہش کو پورا کرکے رہیگا۔

سرود پس منظر

(بلیک آوٹ)

فضا تیرہ، فضا تاریک، دُنیا سوگوار، — وقت کے سینے میں رُکتی سانس سے پیہم فشار
اک دُھواں سا چار سو اُٹھتا ہے منڈلاتا ہوا — ہر طرف ابرِ سیہ کا جل سا برساتا ہوا
تیرگی کی وادیاں، تاریکیوں کے کوہسار — ہو گیا بیدار گویا دیو انسانیت شکار
اک سیہ طوفاں میں فطرت غسل سا کرتی ہوئی — ساحلوں تک موج بھی آتی ہے اب ڈرتی ہوئی
ظلمت آلودہ نگاہیں، ظلمت آلودہ دماغ، — ہوش کے سینے میں روشن بدگمانی کے چراغ
آئینوں پر ہنس رہے ہیں بدنما چہروں کے داغ — ہیں کفِ ظلمات پر روشن تمدن کے چراغ،

جیب و دامن خاک سے، خاشاک سے بھرتے ہوئے
وہ اُٹھے کالے بگولے رقص سا کرتے ہوئے!

یہ اندھیرے، آہ یہ کالی چٹانوں کے محل — آہ، یہ خوننابہ افشاں داستانوں کے محل،
وہ محل، قوموں کی تاریخیں بدلتی ہیں جہاں، — وہ محل تاریکیاں سورج اُگلتی ہیں جہاں

وقت کی تقدیر ڈھلتی ہے اسی ظلمات میں
زندگی کروٹ بدلتی ہے انہی سکرات میں!

جن کی راتوں میں اماں لیتے ہیں بیداری کے خواب — جن کے ہاتھوں سے بدل جاتے ہیں تاریخوں کے باب
جن کے دھاروں سے بدل جاتی ہیں تقدیریں تمام — جن کے انگاروں سے گل جاتی ہیں زنجیریں تمام،
ظلمتوں میں ڈھل رہے ہیں ہم نشیں وہ آفتاب — جن کے پنجوں میں سسکتے ہیں ہزاروں انقلاب
مسکراتی ہیں خراشیں سینۂ آلام کی — خوں سے آلودہ ہیں پھر پیشانیاں ایام کی
قہقہوں کے جائزے گریانیاں لینے کو ہیں — کلفتیں ہاتھوں میں شمشیر و سناں لینے کو ہیں
اب اُتارے جائیں گے لعل و گہر کے سر سے تاج — اطلس و کمخواب سے عریانیاں لیں گی خراج

اب لگا دی جائے گی ہر ہیکلِ عشرت میں آگ،
زندگی پائے گی پھر لوٹا ہوا اپنا سہاگ!

پروفیسر شورؔ

چین کی ایک خفیہ سوسائٹی

فرانس کا کونٹ پایولا کاسلی جب ایک سیاح کی حیثیت سے چین گیا تو وہاں اسے ایک خفیہ سوسائٹی میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ اس کے دلچسپ حالات اس نے اس طرح قلمبند کئے ہیں۔

"چین میں خفیہ سوسائٹیاں بہت پائی جاتی ہیں اور اگر وہاں کی بڑی آبادی اور اس کے اُن مصائب کو سامنے رکھا جائے، جو سیلابوں، وباؤں، خانہ جنگیوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے وہاں نازل ہوتے رہتے ہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کہ وہاں اس قسم کی سوسائٹیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

چند سال اُس طرف جب میں چین میں رہتا تھا تو مجھے وہاں کی ایک خفیہ سوسائٹی کے ممبر بننے کی بھی عزت حاصل ہوئی تھی۔ یہ سوسائٹی چین کے نوجوانوں کی تھی جن کا مقصد یہ تھا کہ ملک کو جاپانی خطرہ اور سوویٹ اثرات سے محفوظ رکھا جائے۔

میں بالکل پہلا یوروپین تھا جسے یہاں کی کسی خفیہ سوسائٹی میں جگہ ملی ہو، اس کا سبب یہ نہ تھا کہ میں چین کی قومی فوج میں ایک معلم کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ صرف یہ کہ مجھے واقعی چین کے مقاصد سے بہت دلچسپی تھی اور میں نہایت ہمدردی سے ان کی اس تحریک میں شریک ہوتا تھا۔

میں نے بود و باش اور وضع و معاشرت بھی بالکل چینیوں کی سی اختیار کر لی تھی اور میں وہاں کے یوروپین عنصر سے بالکل الگ تھلگ رہتا تھا۔

میں نے چینی زبان بھی بقدر ضرورت سیکھ لی تھی اور یہی وہ تمام باتیں تھیں جو مجھے یہاں کی ایک خفیہ سوسائٹی تک پہونچانے میں کامیاب ہوئیں۔

میری ممبری کی سفارش حسب قاعدہ پہلے دو چینی ممبروں نے کی اور ابتدائی مراحل کی معلومات میں نے انھیں سے حاصل کیں۔ میں نے انکی ہدایت کے مطابق تمام ان سوالوں کے جواب یاد کر لئے جو مجھ سے پوچھے جانے والے تھے اور سوسائٹی کے بعض نشانات و اشارات اور مراسم وغیرہ بھی ذہن نشین کر لئے

ایک شام وہی دو ممبر میرے پاس آئے اور رسم داخلہ پوری کرنے کے لئے مجھے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ میں نے سوچا کہ ریوالور لے لینا زیادہ مناسب ہوگا لیکن بعد کو میں نے یہ خیال دور کر دیا اور اچھا ہی ہوا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ میری تلاشی کے وقت بعد کو یہ راز کھل جاتا۔

ایک پرانا بوسیدہ مکان اس رسم کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اس کے ایک کمرے میں جو بالکل خالی تھا مجھے لے گئے۔ یہاں مجھے اپنے سارے کپڑے اتار کر ایک سفید عبا پہننا پڑی اور جوتہ اُتار کر چپل!

اس کے بعد میں خاص کمرے کے دروازہ پر گیا جہاں ایک دربان کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سے سوال کئے اور میں نے جو جوابات دئے ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ــــ "میں بڑے دور و دراز ملک سے آیا ہوں"۔ "میں نے خشکی اور سمندر پر جاترا کے لئے بڑا سفر کیا ہے"۔ ــــ اور ــــ "میں روشنی، صداقت اور انصاف کی جستجو میں یہاں آیا ہوں"۔

اس کے بعد ایک ایسے کمرے میں پہونچا جہاں صرف چٹائی بچھی ہوئی تھی اور ایک انگیٹھی روشن تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ چٹائی پر بیٹھ جاؤں۔ اسکے بعد مجھ سے بہت سے سوال کئے گئے اور پھر مجھ سے گردن جھکانے کے لئے کہا گیا۔ جب میں نے گردن جھکا لی، تو میری گُدی سے بالوں کی ایک لٹ کاٹ لیگئی۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ رسم ادا کی جائے گی اس لئے جس وقت میری گُدی پر قینچی پہونچی تو میں بہت مطمئن تھا۔ میں نے ایک طالب علم کی طرح تمام سوالوں کے جواب کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پنسل سے لکھ لئے تھے اور ہر سوال پر کنکھیوں سے اس کاغذ کو دیکھتا جاتا تھا تاکہ کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ جب بالوں کی لٹ کاٹی جا چکی تو میں اُٹھ کر اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا اس کے بعد انگیٹھی میں کوئی سفوف ڈالا گیا جس سے

باب الاستفسار

اسلام اور قانون وراثت

(م - صاحبہ - بھوپال)

مغظمی مکرمی، آداب -

از راہ نوازش میرے اس سوال کا جواب نگار میں مرحمت فرما کر مشکور فرمائیے - مجھ کو ایک مسلمان عورت کی حیثیت سے شاید یہ سوال نہ کرنا چاہئے لیکن تسکین قلب کے لئے کر رہی ہوں اکثر اصحاب سے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر "مداخلت فی الدین" کہکر خاموش کر دیا گیا معلوم نہیں یہ چیز کس حد تک مداخلت فی الدین ہے امید ہے آپ یہ کہکر مجھ کو خاموش نہ کریں گے دوسرے یہ بھی نہ فرمائیں گے کہ کسی عالم سے دریافت کرو کیونکہ علماء کا سمجھانا میری سمجھ سے بالاتر ہوگا آپ کا جواب میرے لئے انتہائی ممنونیت کا باعث ہوگا -

(۱) زید اگر اپنے والدین کی حیات میں فوت ہو جاتا ہے تو اس کے بچوں و نیز بیوہ کو ترکۂ پدری سے کوئی حصہ نہیں دیا جاتا بلکہ محروم قرار دئے جاتے ہیں زید کے والدین پر یا بھائیوں پر شاید شرعاً ان کی پرورش کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی -

(۲) دوسرا رخ یہ کہ زید اپنی قوت بازو سے کماتا ہے اور والدین کی حیات میں فوت ہو جاتا ہے لیکن خود صاحب اولاد رہنے کی حالت میں بھی اسکے باپ (بکر) کو اسی دولت سے حصہ ملتا ہے یہ ٹھیک نہیں بتا سکتی کہ کس قدر پہونچتا ہے -

(۳) تیسرا رخ یہ کہ زید اگر اولاد ذکور نہیں چھوڑتا بلکہ ۲ - ۴ لڑکیاں ہوتی ہیں تو زید کے ترکۂ پدری سے اور خود کی دولت سے زید کے بھائیوں کو حصہ حصہ کی صورت میں ملتا ہے جو شاید روپیہ میں چار آنہ کے حساب سے ہوتا ہے لیکن پرورش کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہے -

اسلام میں ہر مسئلہ آیات قرآنی سے لیا گیا ہے تو بتائیے کہ یہ مسئلہ قرآن کریم کی کن آیات سے لیا گیا ہے اور جناب رسول خدا کے زمانہ کی کوئی ایسی مثال ہے -

قرآن کریم میں جا بجا یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی سخت تاکید ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا سخت مسئلہ کس مصلحت کی بنا پر ہے -

---

(نگار) آپ کے استفسار کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو صورتیں آپ نے پیش کی ہیں ان میں اُصول وراثت کی رو سے کس کو کتنا ملنا چاہئے دوسرے یہ کہ آیا یہ اُصول وراثت درست بھی ہے یا نہیں، تیسرے یہ کہ قرآن کی کن آیات سے یہ اُصول مرتب کئے گئے ہیں اور چوتھے یہ کہ اگر ان اُصول سے یتیموں کے حقوق پر خراب اثر پڑتا ہے، تو کیوں انھیں قابل قبول سمجھا جائے -

عہد رسالت سے قبل، عرب میں کوئی قانون وراثت نہ پایا جاتا تھا - وہاں تو استحقاق نام تھا صرف نیزہ و شمشیر کا اور اسی لئے ایک بہادر باپ کے بہادر بیٹے کے علاوہ ترکہ کا کوئی مستحق نہ سمجھا جاتا تھا اور اس طرح چھوٹے بچے اور عورتیں قطعاً محروم رہتی تھیں -

چونکہ بانیِ اسلام معاشرت کی اصلاح کے سلسلہ میں عورت کی پوزیشن کو بھی بلند کرنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ وراثت میں عورت کو بھی نمایاں جگہ دیجائے اور یہ حد درجہ ضروری، برمحل و مفید اقدام تھا -

اگر آپ سورۂ نساء کی اُن آیات کا مطالعہ کریں گی جن میں اُصول وراثت کو ظاہر کیا گیا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ ترکہ کی کوئی صورت ایسی نہیں ہے

جس میں عورت کو استفادہ کا حق نہ دیا گیا ہو۔ البتہ آپ یہ اعتراض کر سکتی ہیں کہ اولادِ نرینہ کو بہ نسبت لڑکیوں کے کیوں زیادہ حصہ ملتا ہے، لیکن یہ اعتراض صحیح نہ ہوگا کیونکہ لڑکیوں کا حق شوہروں کے ترکہ میں بھی ہوتا ہے اور اس طرح یہ کمی پوری ہوجاتی ہے۔

ہر چند میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو قانون اب سے تیرہ سو سال پہلے، عربوں کی معاشرت و زندگی کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا، وہ اس وقت بھی ہر ملک کے مسلمانوں کے لئے مفید و کارآمد ہوسکتا ہے، کیونکہ قانون کو ہمیشہ وقت و ماحول کے لحاظ سے بدلنا چاہئے اور اس میں اتنی لچک پائی جانا ضروری ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ جس زمانہ میں وراثت کا یہ قانون پیش کیا گیا تھا اُس وقت کے لئے یہ نہایت موزوں قانون تھا اور اگر ہم آیاتِ قرآنی سے مستنبط ہونے والے اس اُصول کو سامنے رکھیں کہ مسئلۂ وراثت میں عورت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں قرآن کا فیصلہ اُصول کے لحاظ سے ایسا فیصلہ ہے جس میں اب کسی تغیر کی گنجائش نہیں۔

ظاہر ہے کہ قرآن کی چند آیات میں وراثت کی تمام ممکن صورتیں پیش نہ کی جا سکتی تھیں، اس لئے بعد کو روایات و اجتہاد سے بھی کام لیا گیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل علم ہوگیا۔ اب میں آپ کی ظاہر کی ہوئی صورتوں کو سامنے رکھ کر اپنی رائے پیش کرتا ہوں :-

۱- آپ کا پہلا استفسار واضح نہیں ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ "زید اگر اپنے والدین کی حیات میں فوت ہوجاتا ہے تو اس کے بچوں و نیز بیوہ کو ترکۂ پدری میں کچھ نہیں ملتا" ترکۂ پدری سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اگر اس سے مراد فوت ہونے والے کا ترکہ ہے تو اس کا ایک حصہ یقیناً اس کی اولاد کو بھی ملے گا لیکن اگر ترکۂ پدری سے زید کے باپ کا ترکہ ہے تو بیشک اس کی اولاد محجوب الارث سمجھی جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُصول صرف اس لئے مقرر کیا گیا تھا کہ joint family system کو دور کیا جائے، اور ہر شخص میں خود اپنی قوتِ بازو سے کمانے اور اپنی اولاد کی پرورش کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اگر ایک شخص بیوی اور اولاد رکھنے کے باوجود اپنے باپ کی جایداد پر بھروسہ رکھتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے اور باپ کی ملکیت سے اس کی اولاد کو محروم رکھنے کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ یہ غلط اعتماد لوگوں کے دلوں سے دور کیا جائے۔

رہا مرنے والے کے یتیم بچّوں کی پرورش کا سوال سو اس کا تعلق ترکہ سے نہیں بلکہ یتامیٰ کی پرورش سے ہے اور اس فرض کو قوم پورا کرے گی۔

۲- اگر زید کی وفات کے بعد اس کی جایداد کا کچھ حصہ اس کے باپ کو بھی ملتا ہے تو ملنا چاہئے، کیونکہ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر جو کچھ اسکے باپ نے صرف کیا ہے اس کا معاوضہ کچھ تو ہونا چاہئے۔

۳- آپ کا تیسرا استفسار بہت مبہم ہے۔ تاہم اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ایک بھائی کے ترکہ میں دوسرے بھائی کا شریک ہونا آپ کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ اس میں فایدہ سبھی کا ہے۔ فرض کیجئے اگر زید کی جگہ اس کا دوسرا بھائی مرتا تو کیا زید اور اس کی اولاد یہ فایدہ نہ اُٹھاتی۔

آپ کے ان استفسارات سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ کوئی خاص صورت آپ کے سامنے ہے اور چونکہ اس میں کچھ حق تلفیاں ہورہی ہیں اس لئے آپ سرے سے اُصولِ وراثت ہی کو قابلِ اعتراض سمجھتی ہیں، حالانکہ اعزہ میں باہمی ہمدردی و تعاون کا مسئلہ اس سے بالکل علٰحدہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قانونِ وراثت و ترکہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اگر کوئی شخص فطرتاً ایسا ہے جو اپنے خاندان کی بیواؤں اور یتیموں سے ہمدردی نہیں رکھتا تو اس کی پاداش کے لئے قانونِ وراثت تو بدلا نہیں جا سکتا، البتہ سوسائٹی اس کو سزا دے سکتی ہے۔

یاد رکھئے کہ انفرادی غلطیوں و ناحق کوشیوں کو آج تک نہ کوئی مذہب دور کرسکا نہ کوئی قانون، اس لئے دُنیا کی یہ سوگواریاں یونہی رہیں گی اور انھیں پر شاید کارزارِ حیات کی رونق موقوف ہے۔

جنونِ محبت

امین درد ہوں مجھ کو نہ آزماؤ تم

یہ آسماں - یہ کہر - یہ نکھار - یہ جنگل، یہ چاندنی - یہ لطافت - یہ نقرئی بادل
یہ سبزہ زار - یہ پھولوں کی دلنشیں جدول یہ ہنس راج - یہ بگلے - یہ بط - یہ گنگا جل

ستا رہے ہیں مجھے ان کو اب ستاؤ تم

نشاط و رنگ میں ڈوبا ہوا گلستاں ہے ہوا نہیں ہے یہ - مطرب کوئی غزلخواں ہے،
پہاڑیوں پہ خمِ زلفِ ماہِ تاباں ہے یہ کہکشاں ہے کہ اک موجِ آبِ حیواں ہے

برس رہی ہے محبت چلے بھی آؤ تم،

کبھی ہواؤں کا جھونکا جو چھیڑ کرتا ہے مزاجِ عشق پہ اک حادثہ گزرتا ہے
دلِ شکستہ مرا سسکیاں سی بھرتا ہے یہ نامراد، نہ جیتا ہے اور نہ مرتا ہے،

حجابِ ناز میں چھپ کر نہ مسکراؤ تم

غرض ہو صبحِ طرب یا ہو شامِ میخانہ سرودِ ہوش ہو یا ہاؤ ہوئے دیوانہ
چمن کا شور ہو یا ہو سکوتِ ویرانہ نواحِ صومعہ ہو یا جوارِ بت خانہ

کہیں قرار نہیں ہے اب آ بھی جاؤ تم

ستم نصیب ہوں غم سے نباہ کر لوں گا ہر ایک سانس کو میں اپنی آہ کر لوں گا
یہ ننگِ عشق ہے لیکن گناہ کر لوں گا تمھارے دھیان میں سب کچھ تباہ کر لوں گا

یہ دل ہے - درد کی دنیا یہاں بساؤ تم

کاوش حیدرآبادی

تمثیل

دنیا کی بہاروں سے آنکھیں یوں پھیر لیں جانے والوں نے جیسے کوئی لمبے قصے کو پڑھتے پڑھتے اکتا جائے
جب دل ہی نہ کوئی تھام سکا پھر عشق کا رونا کون سنے کس نے یہ کہا تھا تنکے سے وہ بجلی سے ٹکرا جائے
اک آس جو دل کی ٹوٹ گئی پھر دل کی خوشی باقی نہ رہی جیسے کہ اندھیرے گھر کا دیا گل ہو تو اندھیرا چھا جائے
بچپن کے نرالے کھیلوں میں اس طرح جوانی آتی ہے جیسے کہ اچانک البم کا رنگین ورق الٹا جائے
امید کی جانب جب انساں بڑھتا ہے تو یوں سہما سہما جیسے کہ پہاڑی پر کوئی چڑھتا جائے ڈرتا جائے
کنگھے سے گھنیری زلفوں میں یوں لہریں اٹھتی جاتی ہیں جیسے کہ دھندلکا سا دن کا بڑھتا جائے بڑھتا جائے
آنکھوں کی سفیدی میں ایسے ہلکے سے گلابی ڈورے ہیں جیسے کوئی دودھ اور سرخ لکیر اور پیالوں میں ٹپکا جائے

دل ہے کہ نشور اک باجا ہے سینے کے اندر تاروں کا
جب چوٹ پڑے جھنکار اٹھے جب ٹھیس لگے تھرا جائے

نشور واحدی

غزل

جہاں بجلیاں گر رہی ہوں وہیں پر نشیمن بنانے کو جی چاہتا ہے
یہ پُر پیچ راہیں! یہ منزل کی وسعت! قدم اب بڑھانے کو جی چاہتا ہے
جہاں صرف دو دل دھڑکتے ہوں پیہم وہ گوشہ بسانے کو جی چاہتا ہے

علی سجاد قہر

کشکول

انسان خدا

انسان کوشش سے خدا بن سکے یا نہ بن سکے، لیکن اس کے پیدائشی خدا ہونے کی مثال ہمیں اس دُنیا میں ملجاتی ہیں، چنانچہ جاپان کا بادشاہ اسی قسم کا خدا ہے اور کروروں جاپانی اس کی عظمت و پرستش یہی سمجھ کر کرتے ہیں۔

جاپانی فوجیں جس وقت سنگاپور، ملایا اور فلپائن میں مصروف جنگ تھیں، اس وقت بھی وہ صبح شام دو منٹ کے لئے اپنا سر جاپان کی طرف رُخ کرکے جھکا دیتی تھیں تاکہ بادشاہ کی پرستش ناغہ نہ ہو۔

موجودہ جاپانی بادشاہ کا نام ہیروہٹو (Hirohito) ہے، اس کی عمر ۴۰ سال کی ہے اور ہر وقت محل کے اندر رہتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ دنیا اور اس کے حالات سے بے خبر ہے۔ اس نے یوروپ کی سیاحت کی ہے اور وہ مغربی سیاست کا بھی ماہر ہے۔

جو کچھ حکومت کی طرف سے اسے ملتا ہے، اس کے علاوہ اس کے ذاتی ذرایع آمدنی اتنے وسیع ہیں کہ شاید ہی دُنیا کا کوئی شخص اس کا مقابلہ کرسکے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپان کے شاہی خاندان امریکہ کے بڑے بڑے دولتمند لوگوں سے زیادہ مالدار ہے۔ جاپان کا بادشاہ، ملک کے تمام جنگل کا مالک ہے اور اس کی تمام آمدنی اسی کو ملتی ہے، علاوہ اس کے اس کی ذاتی ملکیت کی قیمت کا اندازہ ساڑھے چھ کرور پونڈ کیا جاتا ہے۔ سوا کرور پونڈ کے قریب سرمایہ کاروبار میں بھی لگا ہوا ہے اور اس وقت جاپان کا کوئی بڑا کاروبار ایسا نہیں جس میں بادشاہ کا روپیہ نہ لگا ہو۔

یہ شووا (Showa) خاندان کا ایک سو چوبیسواں بادشاہ ہے۔ جاپان کے بادشاہوں کا اصلی نام مشہور نہیں ہوتا، بلکہ جو تخت نشینی کے بعد وہ خود ایک نام اختیار کرتا ہے اور اسی کے نام سے وہ مشہور ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ بادشاہ بھی اپنے اصلی نام سے نہیں بلکہ شووا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے عادات بالکل امریکن ہیں۔ یہ پہلے مغربی لباس میں رہتا تھا اور گاف بھی کھیلتا تھا، لیکن یہاں کے مدبرین نے اس کو سمجھایا کہ وہ اپنا قومی لباس ہی اختیار کرے کیونکہ دیوتاؤں کے لئے وہی مناسب ہے۔

ناشتہ میں وہ نارنگی کا عرق، قہوہ اور سُور کا گوشت جو امریکہ کا طیار کیا ہوا ہوتا ہے، استعمال کرتا ہے۔ لیکن کھانا وہی مچھلی چاول ہے جس کی طیاری اس کی ملکہ کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ شاہی خاندان بہت بڑا ہے اور ولی عہد کی عمر ۹ سال کی ہے جو انگریزی بھی بول سکتا ہے۔ وہاں کا قاعدہ ہے کہ ولی عہد تین سال کی عمر ہی میں والدین سے علحدہ کرکے دوسرے مکان میں رکھا جاتا ہے، چنانچہ یہ بھی اپنے تمام اسٹاف کے ساتھ ٹوکیو کے ایک قصر رومیا میں ماں باپ سے علحدہ رہتا ہے۔

جاپان کا موجودہ بادشاہ انگریزی بھی خوب جانتا ہے اور ادبی ذوق بھی رکھتا ہے، چنانچہ اس کی نظموں کا ایک مجموعہ ہے جو چھاپا تو نہیں جاسکتا کیونکہ خدا کے الفاظ کو چھاپنا اس کی توہین ہے، لیکن لوگوں کو زبانی یاد ہے اور اس سے رجز خوانی کا کام لیا جاتا ہے۔

جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے اس نے مغربی لباس بالکل ترک کردیا ہے، قومی لباس پہنتا ہے جو روز کے روز اُتار دیا جاتا ہے اور درباریوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ آغاز جنگ سے وہ باہر پبلک میں بھی نہیں آیا، اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ بادشاہ کے چہرہ کی طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے اور اس صورت میں باہر نکلنا نہ نکلنا برابر ہے۔ جب کبھی وہ باہر نکلتا ہے تو پہلے وہاں کی پولیس تمام راستوں پر یہ انتظام کرتی ہے کہ لوگوں کی آمد و رفت روک دیجائے اور مکانوں کی کھڑکیاں تک بند کردیجائیں۔ وہاں فوجی پولیس کے ہیڈ کوارٹر کے لئے ایک بلند تعمیر تجویز ہوئی جس میں ایک بہت اونچا برج بھی بننا تھا تاکہ وہاں سے سرچ لائٹ سارے شہر پر ڈالی جاسکے۔ لیکن یہ عمارت ناتمام رہی صرف اس وجہ سے کہ اس برج سے

شاہی محلات کے اندر کا بھی نظارہ ممکن تھا۔

پانچ منٹ میں خاک سے پاک

۱۷۱۵ء کی بات ہے۔ پیٹر اعظم روس کا حکمراں ہے اور سنٹ پیٹرسبرگ کے قصر شاہی کے دروازہ پر ایک سنتری پہرا دے رہا ہے۔ دفعتاً وزیر اعظم شاہزادہ منسچکوف آتا ہے اور اندر جانا چاہتا ہے سنتری عرض کرتا ہے کہ "جہاں پناہ کا حکم نہیں ہے کہ کوئی شخص اندر جائے، اس لئے میں مجبور ہوں اور آپ کے لئے دروازہ نہیں کھول سکتا"

منسچکوف : "بیوقوف، کیا تجھے نہیں معلوم کہ میں بادشاہ کا وزیر اعظم ہوں اور میرے لئے کوئی ممانعت نہیں ہے"۔

سنتری : "میں جانتا ہوں کہ جناب وزیر اعظم ہیں، لیکن مجھے جو حکم دیا گیا ہے وہ عام ہے اور میں اس کی تعمیل کروں گا"

وزیر اعظم کو غصہ آگیا اور اس نے سنتری کے چہرہ پر کوڑا مارتے ہوئے کہا کہ "ہٹ سامنے سے"

سنتری بولا کہ "آپ جتنا چاہے مارئے، لیکن میں نہ جانے دوں گا"

اس پر وزیر نے لگاتار اس کے چہرہ پر کوڑے مارنے شروع کئے، یہاں تک کہ خود بادشاہ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ دیکھا کہ وزیر غصہ سے بھرا ہوا کوڑے مار رہا ہے اور سنتری کا چہرہ لہولہان ہے۔

بادشاہ نے سنتری کا نام پوچھکر حکم دیا کہ "تم کسی اور سپاہی کو چارج دیکر اپنا منھ پانی سے صاف کرو" اور وزیر کو اندر بلا کرلے گیا۔

اسی دن شام کو وہ سنتری زار کے حضور میں طلب کیا گیا جہاں وزیر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ نے سنتری سے کہا "آج صبح اس آدمی نے تمھیں کوڑے سے مارا ہے اس حال میں کہ تم اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ اس لئے یہ کوڑا لو اور تم بھی مارو"

وزیر بولا کہ: "لیکن یہ معمولی سپاہی مجھے کیونکر مار سکتا ہے"

بادشاہ نے کہا کہ "میں اس کو کپتان کا عہدہ دیتا ہوں"

وزیر : "لیکن میں تو شاہی محافظ فوج کا بھی افسر ہوں"

بادشاہ : "اگر ایسا ہے تو میں اسے باڈی گارڈ میں کرنل کے عہدہ پر ترقی دیتا ہوں"

وزیر : "لیکن میرا عہدہ تو جنرل کا ہے"

بادشاہ : "تو میں اسے بھی جنرل بنائے دیتا ہوں، تاکہ تمھیں یہ شکایت نہ ہو کہ کسی ادنیٰ آدمی نے تمھیں مارا"

یہ کہکر بادشاہ نے سنتری سے مخاطب ہوکر کہا کہ "اے جنرل کونٹ اور بہادر، یہ کوڑا لو اور اپنا کام کرو"

اس نے تعمیل حکم کی اور دوسرے دن وہ کونٹ بنا دیا گیا اور روس کے ایک بڑے ذی اثر خاندان کا سورث اعلیٰ ثابت ہوا۔

لوہے کا دل

انسانی تعمیر میں، دل و دماغ دو ہی چیزیں ایسی ہیں جو بہت زیادہ نازک سمجھی جاتی ہیں اور جن کی تکالیف کا علاج واقعی بہت مشکل ہے۔ جراحی نے اس حد تک تو ترقی کر لی ہے کہ اگر دل یا اس کی جھلی کو زخم پہونچ جائے تو ٹانکہ دیکر اسے درست کر لیتے ہیں، لیکن دل کے اندر اس کے valves میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کا علاج دشوار ہے، کیونکہ یہ ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں اور اگر ان کی حرکت کو بند کرکے عمل جراحی کیا جائے تو انسان ختم ہو جاتا ہے۔ اس دشواری کو دیکھ کر امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے سوچا کہ اگر کوئی مصنوعی دل ایسا بنایا جاسکے جو کچھ دیر کے لئے اصلی دل کا کام دے سکے تو جراحی کے لئے کافی وقت مل سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اس غرض کے لئے لوہے کا دل اور پھیپھڑا طیار کیا ہے جو بیس منٹ تک خون کے دوران کو جسم میں قائم رکھ سکتا ہے۔

اس مصنوعی دل کے لگانے سے اصلی دل تھوڑی دیر کے لئے معطل ہو جاتا ہے اور اس عرصہ میں عمل جراحی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ایک بیماری ہے جس میں خون کا ذرہ عروق میں کسی جگہ پھنسکر رہ جاتا ہے اور دوران خون بند ہو جانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس بیماری کے علاج کے لئے یہ مصنوعی دل اور پھیپھڑا بہت مفید ثابت ہوگا، کیونکہ جب اس قسم کی شکایت پیدا ہوگی تو فوراً یہ مصنوعی دل لگا کر اصلی دل کو ساکن کر دیا جائیگا اور جراحی ہو جائے گی۔

مطبوعات موصولہ

قرآن مجید و نظام شمسی

میاں محمد اسماعیل صاحب نے اس ایک جزو کے رسالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ ہیئت کا نظام شمسی، قرآن کی بعض صراحتوں سے باہر نہیں ہے — اول تو نظام شمسی ایسی بسیط بحث پر صرف ایک جزو کے رسالہ کو کافی سمجھنا یہی بڑی غلطی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ قرآن سے بھی اسے ثابت کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی غلطی اکثر ان حضرات سے صادر ہوتی ہے جو مذہب و عقل کی تطبیق میں حد سے گزر جاتے ہیں۔

اول تو قرآن کوئی ہیئت کی کتاب نہیں کہ ہم اس میں نظام شمسی کی بحث تلاش کریں اور اگر کہیں کہیں بعض مبہم اشارات اس میں پائے جاتے ہیں تو ان کو علمی حیثیت دینا درست نہیں۔ کیونکہ ہیئت ہو یا کوئی اور علم ابھی تک تکمیل کو نہیں پہونچے اور کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی آئندہ کاوش و جستجو موجودہ نظریوں کے خلاف اور کیا کیا نظریئے پیش کرنے والی ہے۔ پھر کیا اس وقت قرآن کی آیتوں کی دوبارہ توجیہ کی جائے گی — قرآن صرف اخلاق و معاشرت کی اصلاح کے لئے نازل ہوا تھا اور ہمیں اخلاقی تعلیم ہی کی جستجو کرنا چاہئے علمی بحثوں سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ رسالہ ۳ر میں بیت الکریم چوک مرینہ باغبان پورہ لاہور سے ملسکتا ہے۔

انسان اور تورات

یہ بھی میاں محمد اسماعیل صاحب کا رسالہ ہے جس میں انھوں نے قرآن سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ تخلیق کی ابتدا ایک عورت سے ہوئی اس کے بطن سے ایک مرد پیدا ہوا اور پھر نسل انسان کا یہ سلسلہ عرصہ تک ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا حضرت آدم تک پہونچا جن کی اولاد کو خلیفۃ اللہ فی الارض کہتے ہیں۔ گویا تورات کی اس روایت سے اختلاف کیا گیا ہے جو تخلیق آدم سے متعلق ہے اور جسے مسلم مفسرین نے بھی بیان کیا ہے — میاں صاحب کو اس کوشش کے سلسلہ میں قرآن کی بعض آیتوں کے ترجمے بھی کچھ اور کرنے پڑے ہیں جو کہیں کہیں نامناسب تاویل کی حد تک پہونچ گئے ہیں۔ یہ کوشش بھی مذہب و علم کی تطبیق کے سلسلہ کی چیز ہے۔ یہ رسالہ صرف ایک آنہ میں ملسکتا ہے۔

لالہ زار

جناب محمودہ رضویہ کے بعض ادبی مقالات کا مجموعہ ہے جسے آصف جاہ درانی ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ اس سے قبل ان کے پہلے مجموعۂ "دُردانہ" پر جو اظہار خیال کر چکا ہوں وہ "لالہ زار" کے مقالات پر بھی صادق آتا ہے۔ اس پر صحیح نقد تو اس وقت ہو سکتا تھا جب ان مقالات کے مطالعہ کے بعد فاضل ادیبہ کی ادبی زندگی کے اصلی سررشتہ کو ڈھونڈھا جاتا، لیکن چونکہ اس جسارت کے لئے وقت و اجازت دونوں کی ضرورت ہے، اس لئے سوائے اس کے کہ ایک مشاعرہ کی غزل کی طرح اسکی داد دیکر سکوت اختیار کیا جائے اور کیا ہو سکتا ہے۔ تاہم اگر کبھی موقعہ ملا تو میں ان سے پوچھوں گا کہ یہ مقالے انھوں نے کیوں اور کس تحریک سے متاثر ہو کر لکھے اور مشورہ دوں گا کہ دوسرے اڈیشن میں وہ اس بیان کو بھی شامل کر دیں۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو کراچی۔

تاریخ ادب ہندی

سید ظہیر الدین احمد علوی ایم۔ اے (شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کی تالیف ہے۔ اس میں ہندی ادب کے مختلف دور قایم کر کے ہر دور کی تاریخ لکھی گئی ہے اور مشہور ہندی ادیبوں، شاعروں کے کلام کے نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ اخیر میں موجودہ ہندی اداروں کا بھی حال درج کیا ہے۔

کتاب بہ لحاظ معلومات اچھی ہے اور خاصکر ان طلبہ کے لئے جو اُردو میں ایم۔ اے کرنا چاہتے ہیں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ انھیں ایک پرچہ ہندی کا بھی کرنا پڑتا ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: لالہ رام نرائن لال کتب فروش الہ آباد

چراغ لالہ

پنجاب کے ایک بست سالہ نوجوان صائب عاصمی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے، ابتدا میں اس نوجوان شاعر نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حد درجہ نامساعد حالات میں ان کی شاعری کی ابتدا ہوئی لیکن میں دیکھتا ہوں کہ شاید یہی نامساعدت اسکی ترقی کا باعث ہوئی — یقیناً کلام میں وہ پختگی نہیں ہے جو کافی مشق کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن پھر بھی جو کچھ اس مجموعہ میں نظر آتا ہے وہ اتنے کمسن شاعر کی طرف سے یقیناً حیرتناک ہے — یقین ہے کہ سرزمین پنجاب اپنے اس جوہر کی قدر کرے گی اور اگر عاصمی صاحب برا نہ مانیں تو میں انھیں مشورہ دوں گا کہ وہ فنی حیثیت سے بھی اپنے اکتسابات کو جاری رکھیں — خیال کے حُسن کے ساتھ اگر ذریعۂ اظہار بھی بے عیب ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

یہ مجموعہ ایک روپیہ آٹھ آنہ میں مصنف سے معرفت عطر چند کپور چند میکلوڈ روڈ لاہور سے ملسکتا ہے۔

(بہ سلسلۂ صفحہ نمبر ۲) روس نے اسوقت تک جس جرأت و پامردی کے ساتھ نازی فوجوں کا مقابلہ کیا ہے، اس نے یہ بات اصولاً طے کردی ہے کہ اگر روس کو جرمنی کے خلاف کامیابی نہیں ہوسکتی تو جرمنی بھی روس کو فتح نہیں کرسکتا، اور روسی آبادی کی ہلاکت سے روسی روح فنا نہیں ہوسکتی، اور جب تک رعایا کی روح راضی کے ساتھ نہ ہو، ابکسی کی حکمرانی دنیا میں قایم نہیں رہ سکتی۔ یہ تو ہوا جنگ کا اخلاقی پہلو جو نہ صرف جرمنی بلکہ ہر اس قوم و حکومت کی مخالفت میں پیش کیا جا سکتا ہے جو جرمنی ہی کی طرح تسلط قایم رکھنا چاہے۔ اب رہا مادی پہلو سو اسکا توازن البتہ عارضی طور سے ناکامی و کامیابی پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور وہ فی الحال بالکل مساوی نظر آتا ہے۔

جرمنی کا تسلط اسوقت ناروے سے لیکر یونان تک اور سواحل فرانس سے لیکر سواحل بحر کاسپین تک کم و بیش ہر جگہ نظر آتا ہے اور یہ حصۂ زمین اپنی زرعی، صناعتی اور معدنی پیداوار کے لحاظ سے اتنا بڑا اور اہم حصہ ہے کہ اگر خود جرمنی کے اندر کوئی انقلاب نہ پیدا ہو تو وہ عرصہ تک ان ذرایع کی مدد سے لڑائی جاری رکھنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ دوسری طرف برطانیہ و امریکہ کی طیاریوں کو دیکھئے تو ان کی وسعت و ترقی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور جو اعداد و شمار اس وقت تک معلوم ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سال آیندہ تک وہ غالباً اس قابل ہو جائیں گے کہ نازیوں کے خلاف جارحانہ اقدام عمل میں لاسکیں، اس لئے مادی نقطۂ نظر سے بھی فی الحال اس جنگ کے اختتام کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی۔ اب رہا اس دوران میں بعض ایسی پیچیدگیوں کا پیدا ہو جانا جو فریقین میں سے کسی ایک کو جنگ ختم کر دینے پر مجبور کردیں، سو ان کا امکان البتہ ہر وقت پایا جاتا ہے اور اگر اس لڑائی کی عمر کو کسی چیز نے مختصر کیا تو وہ یہی پیچیدگیاں ہوں گی جن کا تعلق ملکوں کی داخلی و خارجی سیاست دونوں سے ہوسکتا ہے۔ اگر جرمنی اسٹالن گراڈ، قفقاز اور بحر اسود کے تمام ساحلی مقامات فتح کرنے میں کامیاب ہوگیا جو بعید از امکان نہیں، تو ایک بڑی الجھن روس کی اس بحری قوت سے متعلق ہوگی جو بحر اسود میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ روس کے بحری جہاز بحر اسود میں قیام نہ کرسکیں گے اور سمندر چھوڑ کر انھیں باہر جانا پڑے گا۔ پھر چونکہ ان کے باہر جانے کا راستہ سوائے آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال کے کوئی اور نہیں ہوسکتا، اس لئے جرمنی، ترکی کو مجبور کرے گا کہ وہ یہ راستہ روسی جہازوں کے لئے بند کردے اور ہوسکتا ہے کہ اس وقت ترکی کو بھی کسی نہ کسی فریق کے ساتھ ہوکر میدان میں آنا پڑے۔ فی الحال یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ترکی کس فریق کا ساتھ دے گا، کیونکہ اسے دونوں ہی سے ڈر ہے۔ اگر وہ جرمنی کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو بلغاریا کی طرف سے جرمن فوجیں آسانی کے ساتھ اس پر حملہ کرسکتی ہیں جن کا مقابلہ اسکے لئے ممکن نہیں اور اگر وہ برطانیہ کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تو اس کی جنوبی سرحد اور مشرق ادنیٰ میں پھیلی ہوئی اتحادی فوجیں اسپر حملہ کردیں گی اور ظاہر ہے کہ وہ ان کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ کے ساتھ اس وقت تک ترکی کے تعلقات بہت دوستانہ ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اسکا رجحان اتحادیوں کی طرف ہو، لیکن محض خواہش یا رجحان سے کچھ نہیں ہوتا اور بسا اوقات جان بوجھکر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا پڑتا ہے اس لئے اگر یہ پیچیدگی پیدا ہوگئی تو اس کے نتیجے کے متعلق فی الحال کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ ایسی صورت میں لڑائی کا سارا زور مشرق قریب میں ہو جائے گا اور پھر ہم اسکی آگ سے نزدیک تر ہو جائیں گے۔ دوسری پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہمیں جاپان کی طرف سے ہے۔ یعنی اگر اسنے اس موسم سرما میں سائبیریا یا ہندوستان پر حملہ کردیا تو پھر یورپ میں دوسرا محاذ قایم کرنا ۱۹۴۳ء میں بھی اتحادیوں کے لئے آسان نہ ہوگا اور نازی حکومت کو طیاریاں کرنے اور مفتوحہ علاقوں پر تسلط مضبوط کرنے کا زیادہ موقعہ مل جائے گا۔ جاپان کو جزائر سلیمان میں جو ناکامیاں ہوئی ہیں انھوں نے آسٹریلیا کے خلاف اسکے اقدام کو ضرور دھیما بنادیا ہے، لیکن سائبیریا اور ہندوستان پر حملہ کرنے کے امکانات بدستور باقی رہتے ہیں۔ اس طرف منچوریا میں جاپانی فوجوں کا زبردست اجتماع اور اس طرف برما و سنگاپور پر اسکے تسلط سے دونوں کا امکان باقی رہتا ہے۔ سائبیریا پر حملہ ہونے کی صورت میں، امریکہ یہ ضرور کرسکتا ہے کہ ولاڈی واسٹک کی روسی بندرگاہ سے روس کو کمک پہونچاتا رہے اور ٹوکیو پر بھی فضائی تاخت کرتا رہے، لیکن منچوریا کی طرف سے [illegible] کرنے والی جاپانی فوج کو اس طرح روکنا آسان نہ ہوگا، چین البتہ پشت کی طرف سے حملہ کرکے اس اقدام کو روک سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا کیونکہ اس صورت میں اسکا اصل محاذ کمزور ہو جائے گا اور برما کی طرف سے جاپانی فوجیں اسپر زیادہ کامیاب حملہ کرسکیں گی۔ رہ گیا ہندوستان سو اسپر اگر جاپان نے حملہ کیا تو اسکی ابتدا ہوائی حملوں سے ہوگی کیونکہ برما کے تمام ہوائی مرکز اسی کے قبضہ میں ہیں اور اسکے جہاز آسانی سے مشرق ہند پر حملہ کرکے واپس جاسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جاپان کی ہوائی طاقت اچھی نہیں ہے، لیکن برطانیہ کو مغرب کی طرف سے مشرق کی طرف متوجہ کرنے کے لئے یہ چھیڑ چھاڑ کافی ہوگی۔ یہ ہیں وہ تمام پیچیدگیاں جنکا نازی محور کے حق میں پیدا ہونا ممکن ہے، لیکن ان امکانات کے مقابلہ میں ایک یقینی بات اتحادیوں کے حق میں بڑی زبردست پائی جاتی ہے اور وہ قوت صبر و تحمل ہے یعنی لڑائی کے بار کو درستگی سے برداشت کرنے اور تمام ناموافق حالات میں بھی مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہنے کی اہلیت ان میں بہت زیادہ ہے اور اس کا تعلق کیرکٹر کے علاوہ مادی اسباب سے بھی ہے۔ چین نے جاپان کے مقابلہ میں اور روس نے جرمنی کے خلاف جس قوت برداشت کا ثبوت دیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، رہ گئے برطانیہ و امریکہ، سو انھوں نے اگر نازی قوت کو دنیا سے محو کرنے کا اخلاقی عہد نہ کیا ہوتا، تو بھی ان کی وسیع طیاریاں مادی حیثیت سے نازی قوت کے لئے اتنا زبردست خطرہ ہیں کہ سارا یورپ و ایشیا لے لینے کے بعد بھی محوری قوتوں کے پاس اسکا کوئی علاج نہیں۔ بہر حال جو صورتیں اسوقت پیدا ہیں ان کو دیکھکر لڑائی کے جلد ختم ہو جانے کی توقع کسی طرح قایم نہیں کی جا سکتی اور ہم سمجھتے ہیں کہ آیندہ زمانہ اس سے بھی زیادہ سخت آنے والا ہے جسکو وہی قوم جھیل سکتی ہے جو اخلاق و اصول پر جان دینے کے لئے طیار ہو!

آیندہ جنوری کا نگار ریاض نمبر ہوگا

بزم اسیر و امیر کے آخری یادگار، ریاض خیرآبادی (مرحوم) کی شاعری سے کون واقف نہیں، لیکن اس زندہ دل ہستی کے ادب اُردو پر اور کتنے احسانات ہیں، اس سے کم لوگ آگاہ ہوں گے۔ نگار کے اس خاص نمبر میں آپ کو ریاض مرحوم کے لطایف شعر و سخن، ان کے خود نوشت سوانح حیات، نثر نگاری کے معیاری نمونے، ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بسیط تبصرہ اور انتخاب کلام بھی کچھ نظر آئے گا۔ ریاض مرحوم کی زندگی کا وہ زمانہ جب ان کے ریاض الاخبار اور فتنہ کی دھوم مچی ہوئی تھی، اب بالکل بُھلایا جا چکا ہے، لیکن نگار کے اس نمبر میں اس کو پھر سامنے لایا جائے گا اور اُن لطیف صحبتوں کی یاد پھر تازہ کی جائے گی جو ریاض اور اُن کے زمانہ کے لئے مخصوص تھیں۔

اس نمبر میں ریاض کی تمام تصانیف کے سلسلہ میں ناول نظارہ کا بھی اقتباس دیا جائے گا جو اس وقت تک شایع نہیں ہوسکا۔ الغرض یہ نمبر ادبی دلچسپیوں کا نہایت عجیب و غریب مجموعہ ہوگا اور اس کی ضخامت نگار کی موجودہ ضخامت سے کم از کم تگنی ہوگی اور اگر کاغذ میسر آگیا تو شاید اس سے بھی زیادہ۔ حضرت ریاض کی تصویر بھی دیجائے گی اور سرورق بھی نفیس کاغذ کا ہوگا۔

غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول ڈاک ڈیڑھ روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن خریداران نگار کو حسب دستور یہ نمبر ان کے سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا۔

منیجر

کچھ "نگار" کے متعلق

نگار کا موجودہ حجم اور اس کا باریک خط صرف اسی وقت تک قایم رہے گا جب تک کاغذ نہیں مل رہا، لیکن جب یہ دشواری جاتی رہے گی تو نگار پھر اُسی کاغذ اور اسی سطر پر شایع ہوگا جو جنگ سے پہلے تھا اور سرورق بھی بہترین کاغذ کا علحدہ لگایا جائے گا اور ضخامت بھی بڑھ جائے گی۔

ہر چند مضامین کے لحاظ سے اب بھی نگار میں ۸۰ صفحات سے زیادہ کا مواد دیا جاتا ہے، لیکن خط باریک ہونے کی وجہ سے بعض حضرات کو دقت ہوتی ہے، جس کا ہمیں احساس ہے۔

[illegible] اس میں کاغذ کی [illegible] نایابی کی حد تک بڑھ جائے گی، لیکن آپ مطمئن رہئے، نگار بہرحال جاری رہے گا اور مضامین کے لحاظ سے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی، گو ظاہری شکل و صورت اس کی اچھی نظر نہ آئے۔

نگار اہل نظر کا پرچہ ہے نہ کہ تماشائیوں کا، اس لئے ہمیں امید ہے کہ قارئین نگار اس کی عارضی بدنمائی کی پروا نہ کریں گے۔

منیجر "نگار"

رجسٹرڈ نمبر ۲۶۶ ل

قیمت فی کاپی ۸ر

آیندہ جنوری کا "نگار" ریاض خیر آبادی نمبر ہوگا۔ مفصل اشتہار صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیے

نگار

ایڈیٹر: نیاز فتحپوری

چندہ سالانہ صہ

شمار ۵	فہرست مضامین نومبر سنہ ۴۲ء	جلد ۴۲

ملاحظات ۲

بعض عربی اور انگریزی الفاظ کی مماثلت! ۳

جسونت کنور (فسانہ) .... کشن پرشاد کول ۷

مثنوی "خواب و خیال" .... حبیب احمد صدیقی ۱۳

مکتوبات نیاز ۲۵

باب الاستفسار ۲۹

وقت کی باتیں ۳۳

معمائے ہستی (نظم) .... مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے ۳۵

"نگار" میں کچھ تبدیلیاں آیندہ ماہ دسمبر سے

کاغذ کی گرانی و کمیابی کی داستان آپ کہاں تک سنیں گے اور میں کب تک دہراؤں گا یہ بوجھ تو کسی نہ کسی طرح اٹھانا ہی ہے۔ ہم نے شروع سال سے نگار کا مسطر ۳۱ سطر کا کر دیا تھا تاکہ صفحات کی کمی کا اثر مقالات پر نہ پڑے، لیکن چونکہ لکھنؤ طباعت کے لحاظ سے بہت بدقسمت واقع ہوا ہے اور باریک کتابت خصوصیت کے ساتھ اچھی نہیں چھپتی، اس لئے آیندہ ماہ دسمبر سے نگار بجائے ۳۱ سطر کے ۲۸ سطر کے مسطر پر چھپے گا اور حجم میں بھی کچھ اضافہ کر دیا جائے گا، اسی کے ساتھ سرورق کے صفحات بھی علٰحدہ ہوں گے۔ اس طرح مقالات کے لئے زیادہ گنجایش نکل آئے گی اور خط بھی کچھ واضح ہو جائے گا۔

رفتار جنگ

عرصہ ہوا میں نے ایک غزل لکھی تھی جس کا ایک شعر تھا:

من کہ بندم صد تمنایم بہ بہر فردائے تو ۔۔۔ تو کہ بہر فردا ز عہد خود گسستن آمدی

معلوم نہیں اُس وقت مخاطب کون تھا، لیکن اب تو یہ خطاب جنگ کی دیوی ہی کے لئے موزوں ہے۔ بہت سی وہ توقعات جو گرمیوں میں پوری ہوتی نظر آتی ہیں، جاڑوں پر مل جاتی ہیں اور جاڑوں میں پوری ہونے والی امیدیں پھر گرمی تک ملتوی ہو جاتی ہیں، جو صورت کل تھی وہ آج نہیں اور جو آج ہے اسے کل تک قیام نہیں۔ الغرض

جنگ پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب ۔۔۔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

اسٹالن گراڈ جس پر ہٹلر کو اپنے پروگرام کے مطابق ۳۰ ستمبر کی صبح تک قابض ہو جانا چاہئے تھا، آج ۳۰ اکتوبر کی شام تک بھی اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ کیا ہونا ہے۔ جرمنی نے اس شہر کو ختم کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ لاکھوں سپاہی، ہزاروں ہوائی جہاز، سیکڑوں دبابے، اس نے اس آگ میں جھونک دئے، لیکن تیس چالیس میل کا یہ قطعۂ زمین اب تک سر نہ ہو سکا

حقیقت یہ ہے کہ جو جرأت و پامردی روسی آبادی نے اس محاذ میں پیش کی ہے، اسکی مثال نہ دُنیا کی پچھلی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ شاید آیندہ مل سکے!

"تل اوٹ پہاڑ" اُردو کی مشہور مثل ہے، لیکن اس کا صحیح تجربہ جنگ کے دوران ہی میں ہوتا ہے، جب ایک ایک گھڑی بلکہ ایک ایک پل میں زمانہ کا دھارا بدل دینے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس ایک ایک پل سے فایدہ اُٹھانے یا نہ اُٹھانے کا نام فتح و شکست ہوتا ہے۔

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹)

بعض عربی اور انگریزی الفاظ کی مماثلت!

علم الانسان (Ethnology) میں شعبۂ لسانیات (Philology) ہمیشہ بہت دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، کیونکہ مختلف قوموں کی جسمانی و ذہنی مماثلت و مشارکت کے مطالعہ میں اس شعبہ سے بڑی مدد ملتی ہے، لیکن چونکہ انسان کی کوئی ایسی مکمل تاریخ موجود نہیں ہے جو ہمیں یقینی طور پر یہ سمجھنے میں مدد دے سکے کہ آفرینش کے بعد اس کے اندر کیا کیا اجتماعی و تمدنی انقلابات رونما ہوئے، اُس کی مختلف جماعتیں اپنے اولین مرکز سے کب، کہاں کہاں اور کن حالات میں منتقل ہوئیں اور اُن کی زبانوں میں کیونکر تدریجی اختلاف پیدا ہوا، اس لئے "لسانیات" کا مطالعہ شاید کبھی مکمل نہیں ہو سکتا اور آئے دن کے جدید انکشافات اور اکتشافات سے زیادہ انسانی قیاس آرائیاں کبھی اسے ایک علم محکم (Positiue Seience) کی حیثیت نہیں دے سکتیں۔

ماہرین نے انسان کی دو بڑی تقسیمیں کی ہیں ایک ایرین۔ دوسرے سامی اور اول الذکر کو بھی دو شاخوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک مغربی، دوسرے مشرقی۔ مغربی شاخ میں تمام یوروپ کے باشندے (باستثناء ترک، ہنگریوں کی قوم magyar ، Pyrenees کے Basques اور لاپ لینڈ کے فنیوں کے) شامل ہیں اور مشرقی شاخ میں آرمینیا، افغانستان، ایران اور شمالی ہند کے باشندے ان دونوں شاخوں کا ایک ہی تنہ سے متعلق ہونا ان کی لسانی خصوصیات سے ثابت کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ سنسکرت، ژند (قدیم ایرانی زبان) یونانی، لاطینی (جو فرانسیسی، اطالوی، اسپینی، پرتگالی اور رومانوی زبانوں کی مادر اصلی ہے) کلٹک Celtic (جو ویلس، اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کی زبان ہے) گاتھک Gothic (جسے قدیم ٹیوٹانک زبان سمجھنا چاہئے اور جس سے انگریزی، جرمنی اور سویڈن و ناروے کی زبانیں نکلی ہیں) اور سلافی زبانیں (جو آسٹریا اور تمام مغربی روس میں رائج ہے) سب ایک ہی تنہ کی شاخیں ہیں یعنی اصل زبان جس سے یہ سب زبانیں نکلی ہیں وہ تو اب مفقود ہو گئی ہے، لیکن ان کی ایک دوسرے سے مماثلت یہ بات ضرور ظاہر کرتی ہے کہ ان سب کا ماخذ ایک ہی ہے۔

طبقات الارض اور آثار قدیمہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں اس کا بھی علم حاصل ہو چکا ہے کہ وہ اصل قوم جس کی دو شاخیں مشرق و مغرب میں پھیل کر اختلاف زبان کا باعث ہوئیں، وسط ایشیا میں رہتی تھی اور اسی کی زبان کی یہ تمام شاخیں ہیں جو ایرین زبان سے موسوم ہیں۔

دوسری انسانی تقسیم سامی کہلاتی ہے۔ یہ سام بن نوح کی نسل سے بتائی جاتی ہے اور اس میں حبشہ، فنیقیا، عرب، فلسطین، شام اور ممالک دجلہ و فرات کے باشندے شامل ہیں۔

ان اقوام کے متعلق جدید ترین نظریہ یہ قایم کیا گیا ہے کہ ۔۔۔۴ سال قبل مسیح جب ایک وحشی خانہ بدوش قوم عرب سے عراق کی طرف آئی تو یہاں تورانی[1] آبادی پائی جاتی تھی۔ جو بہت زیادہ مہذب و شایستہ تھی۔ اور خط میخی استعمال کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ دو صدی کے اندر عرب کی اس وحشی قوم نے تمام تورانی علاقہ پر اپنی حکومت قایم کر لی اور اس طرح سامی قوم کے ان وحشی افراد کو چاروں طرف پھیل جانے کا موقعہ ملا۔

کہا جاتا ہے کہ سامی اقوام کی زبان (جس میں عبرانی، ارامی، فنیقی، آشوری، بابلی، عربی اور حبشی زبانیں شامل ہیں) ایرین زبان سے بالکل مختلف ہے اور ان میں کوئی ایسی مماثلت نظر نہیں آتی جس کی بنا پر ان دونوں کا رشتہ جوڑا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ سامی اور ایرین زبانوں کی نوعیت میں واقعی بڑا اختلاف

---

[1] تورانی کے اصل معنے غیر ایرانی کے ہیں اور جس طرح عرب اپنے سوا سب کو عجمی کہتے ہیں اسی طرح ساسانی شاہان ایران کے زمانہ میں اہل ایران اپنے سوا سب کو تورانی کہتے تھے اور اسی بنا پر لسانیات میں تورانی سے ہر وہ قوم مراد لی جاتی ہے جو ایرین نہیں ہے۔

پایا جاتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان میں کوئی ایک زبان دوسری زبان سے متاثر نہیں ہوئی غالباً صحیح نہیں۔

اگر سامی اور ایرین اقوام ایک دوسرے سے اس لئے متمایز سمجھی جاتی ہیں کہ ایرین وسط ایشیا کے باشندے تھے اور سامی عربستان کے تو بھی ان دونوں کا ایک دوسرے سے اس حد تک جدا رہنا کہ ایک کی زبان کا اثر دوسرے کی زبان پر نہ پڑے سمجھ میں نہیں آتا۔

اس زمانہ کو چھوڑئے جب عربوں کی ترقی کا اثر سارے یوروپ پر چھایا ہوا تھا اور یوروپین زبان، یوروپین کلچر عربی زبان اور عربی تہذیب سے متاثر ہو رہا تھا، اس سے بہت پہلے بھی سامی و ایرین قوموں کے میل جول کی شہادتیں ہم کو تاریخ سے ملتی ہیں چنانچہ Lenormant کا یہ نظریہ قریب قریب تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جس وقت سامی نسل کے لوگ ریگزار عرب سے نکل کر دجلہ و فرات کی وادیوں میں پہونچے تو وہاں Hamitic قوم پہلے سے موجود تھی - یہ قوم وسط ایشیا سے آئی تھی اور اس کی زبان اور اس کی تہذیب و معاشرت کا اثر سامی زبان و تہذیب پر بہت کچھ اثر پڑا — پھر اگر یہ صحیح ہے تو سامی اور ایرین زبانوں کا امتزاج عہد قدیم میں بھی مستبعد نہیں تھا اور ہو سکتا ہے کہ ایرین اور سامی زبانوں میں جستجو سے ہمیں بہت سے مشترک الفاظ مل جائیں۔

میرا یہ خیال اس وقت قایم ہوا جب انگریزی فرہنگوں اور خصوصیت کے ساتھ ویبسٹر کے مطالعہ سے انگریزی اور عربی زبان کے بہت سے الفاظ میں کھلی ہوئی مماثلت نظر آئی۔ یقیناً ان میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جو بعد کو عربوں اور مغربی اقوام کے میل جول سے ایک دوسرے کی زبان میں منتقل ہوئے لیکن ہو سکتا ہے کہ بعض الفاظ کی مماثلت کی تاریخ زیادہ قدیم ہو - بہرحال یہ چیز غور کرنے کی ہے۔

میں فی الحال ایک فہرست اُن الفاظ کی درج کرتا ہوں جو عربی اور انگریزی میں مماثل نظر آتے ہیں اور چونکہ سامی زبانوں کی یہ خصوصیت کہ وہ دوسری زبانوں سے متاثر ہونے کی اہلیت بہت کم رکھتی ہے، تسلیم کر لی گئی ہے، اس لئے خیال غالب یہی ہے کہ انگریزی میں یہ الفاظ عربی زبان سے آئے ہوں گے - فارسی و انگریزی کے مماثل الفاظ میں نے ترک کر دئے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایرین زبانیں ہیں اور ان میں مماثلت پایا جانا حیرت انگیز نہیں۔

۱- Arise (ارائس یا ارائز) انگریزی میں اس لفظ کے متعدد معنے ہیں لیکن ہر معنی میں اُٹھنے، بلند یا نمایاں ہونے کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے - عربی میں اسی کے قریب المخرج لفظ راس ہے، جس کے معنے سر کے ہیں اور مفہوم و تلفظ دونوں طرح ان کی مماثلت ظاہر ہے۔

۲- Arouse (ارادس یا اراوز) اس کا صحیح مفہوم کسی جذبہ کو حرکت میں لے آنا ہے اور یہی مفہوم قریب قریب عربی میں حرّش کا ہے جس کی مماثلت انگریزی لفظ سے ظاہر ہے۔

۳- Asperse (ایسپرس) اس کا مفہوم ہے پھیلانا، منتشر کرنا، اور بالکل یہی مفہوم عربی میں "فرج" کا ہے - انگریزی لفظ کا آخری حصہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔

۴- Athel (ایتھل یا ایسل) انگریزی میں شریف النسل کو کہتے ہیں، اور عربی میں لفظ اَثل بھی اسی معنے کا حامل ہے - سیکسن ناموں میں لفظ Ethel کی شمولیت اکثر پائی جاتی ہے جیسے Etheling (شریف نوجوان) Ethelard (شریف ذہین)، Ethelwald (شریف حکومت)

۵- Avail (اویل) اس کے معنی ہیں کسی فایدہ کے قابل ہونا - عربی میں لفظ اَبلّ ہے جس کا مفہوم بھی یہی ہے، چنانچہ جس وقت درخت پھل لے آتا ہے تو کہتے ہیں "ابلّ الشجر" اور ان دونوں کا قریب المخرج ہونا ظاہر ہے۔

۶- Assassin (اسیسن) مار ڈالنا اور Assault (اسالٹ) حملہ کرنا، عربی میں ایک لفظ حزّ ہے جس کے معنے کاٹ ڈالنے کے ہیں ان تینوں کی مماثلت مفہوم و تلفظ کے لحاظ سے قابل غور ہے۔

۷- Azimuth (ازمتھ) فلکیات کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ قوس فلک ہے جو سمت الراس سے نقطہ تک پائی جاتی ہے اور افق کو زاویہ قایمہ بناتی ہے - یہ لفظ عربی سمت یا السمت سے نکلا ہے جس کے اصطلاحی معنی بھی یہی ہیں۔

۸- Babe (بیب) بچہ کو کہتے ہیں - عربی میں جس وقت باپ باپ پکارنے لگتا ہے تو کہتے ہیں "بابا" اور بُوبُو آنکھ کی پتلی کو کہتے ہیں - ان سب کی مماثلت ظاہر ہے۔

۹- Bad (بیڈ) بمعنی خراب و ذلیل۔ فارسی کا بَد بھی یہی ہے، لیکن آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ عربی میں بَادَ کے معنے میں بھی ہلاکت و خرابی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

۱۰- Bank (بینک) بمعنی کنارا۔ عربی میں بھی بنک بنج یا اُٹھے ہوئے حصۂ زمین کے معنے میں مستعمل ہے۔

۱۱- Fatten - Batten (بیٹن۔ فیٹن) موٹا کرنا۔ اب عربی کے دو لفظ ملاحظہ کیجئے "بَدُنَ" (موٹا ہو گیا) اور "فَدَنَ" (موٹا کیا)

۱۲- Beat (بیٹ) مارنا۔ عربی میں "کبت" کے معنے بھی ذلیل کرنے اور ہلاک کرنے کے ہیں۔ اردو میں پیٹنا کی مماثلت پہ بھی غور کیجئے۔

۱۳- Bigami (بائی گامی) دو شادیاں کرنا۔ اس لفظ کا دوسرا ٹکڑا عربی لفظ "جمع" سے ماخوذ ملتا ہے "Bi" بمعنی دو اور گامی بمعنی جمع یہ دو بیویوں کو جمع کرنا۔

۱۴- Blank (بلینک) صاف و سادہ۔ Bleach (بلیچ) صاف کرنا، سفید کرنا۔ Blanch (بلینچ) سفید کرنا = ان الفاظ کے ساتھ عربی کے لفظ بلق اور بلج کو ملاحظہ کیجئے، بلج کے معنے ہیں "صاف ہونا۔ ظاہر ہو جانا" اور بلق اس وقت کہیں گے جب سیاہ میں سفید رنگ مل جائے۔ ابلق اسی سے مشتق ہے۔
عربی و انگریزی الفاظ کی مماثلت پر غور کیجئے۔

۱۵- Booze (بوس) باڑا جس میں جانور بند کئے جاتے ہیں اسی کے ساتھ عربی لفظ حبس پر غور کیجئے جس کے معنے بند کرنے یا قید کرنے کے ہیں۔

۱۶- Borax (نوسادر) کو کہتے ہیں جو عربی لفظ بورق کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

۱۷- Borough (تلفظ بُرُد) ۔ فصیل دار شہر یا قلعہ کو کہتے ہیں۔ عربی میں لفظ برج کو ملاحظہ کیجئے جو اس کے ہم معنی ہے[1]۔

۱۸- Bottle (باٹل) بوتل۔ اول اول بوتل چرمی تھیلے کو کہتے تھے جو پھولا رہتا تھا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ بَطّ سے نکلا ہو جس کی شکل بالکل چرمی تھیلے ہی سی ہوتی ہے۔

۱۹- Break (برک) بحالت اسم اس کے معنے ٹھہراؤ، وقفہ اور انقطاع کے ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ فرق کی بگڑی ہوئی صورت ہو۔

۲۰- Brigade (بریگیڈ) فوج کا ایک حصہ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ فرقہ سے لیا گیا ہو اور اسپینی زبان کی وساطت سے یورپ میں رائج ہوا ہو چونکہ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت عرصہ تک رہی ہے اس لئے وہاں کی زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ کا پتہ چلتا ہے۔

۲۱- Bud (بڈ) کلی یا کوپل کو کہتے ہوں جو حال ہی میں اُگی یا پھوٹی ہو۔ عربی میں "نبت" کا استعمال بھی اسی معنی میں ہوتا ہے اور نبت و بڈ میں مماثلت ظاہر ہے۔

۲۲- Buss (بَس) بوسہ دینا۔ عربی میں باس کے معنے بھی یہی ہیں اور بس اور باس میں کوئی فرق نہیں۔

۲۳- Calamus (کلمس) ڈنٹھل، ڈنڈی یا نرکل کے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور عربی کا قلم بھی بالکل یہی چیز ہے۔

۲۴- Calamity (کلیمٹی) ہر سخت مصیبت و تباہی کو کہتے ہیں۔ عربی میں کلم کے معنے جراحت پہونچانے کے ہیں اور ان دونوں کی مماثلت ظاہر ہے۔

۲۵- Callow (کیلو) جس کے پر و بال نہ ہوں، بے سر و سامان۔ عربی میں لفظ کَلّ کا استعمال بھی یتیم، غریب، کمزور اور ناکارہ کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں اس حقیقت کا اظہار غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مغرب کی دوسری زبانوں میں یہی لفظ مختلف صورتوں سے پایا جاتا ہے، مثلاً Bourg - Burg - Borg وغیرہ اور ہر جگہ قلعہ بندی کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے جیسے Edinburgh اور Hamburg اس لئے معلوم ہوا کہ Borough, Borg, Polis, Pole پور - پوری اور برج سب کا ماخذ ایک ہی ہے۔ ہندوستان میں بھی بہت سے شہروں کا نام جو فصیل رکھتے تھے پور یا پوری پر ختم ہوتا ہے، جیسے سلطانپور - رامپور، فتحپور اور مغربی زبان میں بھی بعض قلعہ بند شہروں کا نام Pole پر ختم ہوتا ہے جیسے Constantinople - Trichnopoli - Tripoli

۲۶- Camel کیمل) بمعنی "اونٹ" عربی لفظ جمل کی دوسری صورت ہے -

۲۷- Can کین) انگریزی کا مشہور لفظ ہے جو امدادی فعل کی حیثیت سے ہر فعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور جس کا ترجمہ عام طور پر "سکنا" بتایا جاتا ہے۔ عربی میں لفظ "کان" بھی امدادی فعل ہے اور اس کا محل استعمال بھی انگریزی لفظ " Can " سے بہت ملتا جلتا ہے -

۲۸- Cat (کیٹ) بلی کو کہتے ہیں - عربی میں بھی قطّ کا لفظ نر بلی کے لئے استعمال ہوتا ہے -

۲۹ Cave (کیو) غار یا ہر اس حصۂ زمین کو جو کھود کر غار کی طرح بنا لیا جائے عربی میں اس سے مماثل قاب ہے جس کے معنے کھودنے کے ہیں -

۳۰ Chap (چیپ) کاٹنا - عربی میں "جبّ" کے معنی بھی کاٹنے کے ہیں اور دونوں کی مماثلت ظاہر ہے -

۳۱ Char (چارک) جلانا - عربی میں لفظ "حرق" جس کے معنے جلانے کے ہیں اس سے کس قدر ملتا جلتا ہے -

۳۲- Check (چیک) روکنا - ملامت کرنا، دو تحریروں میں مقابلہ کرنا - عربی میں لفظ "شک" کے معانی پر غور کیجئے: چبھونا، ڈنک مارنا، دھکا دینا، شبہ کرنا - ان تمام معانی پر چیک کا لفظ حاوی ہے -

۳۳- Chemise (شمیز) - اندر کا کپڑا یا ملبوس جو بنیان کی طرح عورتیں پہنتی ہیں - اسی کے ساتھ عربی کے لفظ قمیص کو ملاحظہ کیجئے -

۳۴- Chimney (چمنی) دُودکش، عمارت کا وہ حصہ جہاں سے دھواں باہر کی طرف جاتا ہے - یہ لفظ عربی لفظ "قمین" کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے معنے بھٹی یا گلخن کے ہیں -

۳۵- Chouse (کاوس) دھوکا دینا - عربی میں لفظ "غاسس" کے معنے بھی یہی ہیں -

۳۶- Chronicle Chronic (کرانک - کرانکل) یہ دونوں عربی لفظ قرن سے لئے گئے ہیں -

۳۷- Coffer (کافر) صندوق یا بکس - یہ لفظ بھی عربی قفیر سے لیا گیا ہے جس کے معنے تھیلے یا صندوق کے ہیں - چنانچہ شہد کے چھتے کو بھی عربی میں "قفیر النحل" کہتے ہیں -

۳۸- Canal (کینال) نہر - عربی میں "قنات" نہر کو کہتے ہیں اور قنّی کے معنے کھودنے کے ہیں -

۳۹- Come (کم) آنا - لیکن اس لفظ کا استعمال انگریزی میں کھڑے ہونے یا نمایاں ہو جانے کے مفہوم میں بھی ہوتا ہے جیسے : The butter Comes The Corn Comes. اور ہو سکتا ہے کہ یہ عربی لفظ قام سے لیا گیا ہو -

۴۰ Cope (کوپ) برابر ہونے کی کوشش کرنا، مقابلہ کرنا = عربی میں کافی کے معنے بدلہ دینے کے ہیں - "مکافات" اور "کفو" کا مادہ بھی یہی ہے اور ان سب کے مفہوم میں جو مماثلت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے -

۴۱- Content (کنٹنٹ) قانع اور قناعت کرنا - عربی کا لفظ "قناعت" اس سے بہت مماثل ہے -

۴۲- Copy (کاپی) نقل = عربی میں لفظ کافی اور کفو کا مفہوم بہت کچھ اس پر حاوی ہے -

۴۳ Corban (کربان) ہر وہ چیز جو خدا کے لئے نامزد ہو - یہ عربی لفظ قربان کی تبدیل شدہ صورت ہے -

۴۴- Cost (کاسٹ) قیمت، لاگت - عربی میں قسط کے معنے برابر تقسیم کرنے کے ہیں اور ترازو کو بھی قسط کہتے ہیں - چونکہ قیمت بھی برابر کا لین دین یا تقسیم مال ہے اس لئے انگریزی لفظ کاسٹ یہاں قسط سے لیا گیا ہے -

۴۵- Cotton (کاٹن) روئی - عربی لفظ قطن سے لیا گیا ہے -

۴۶- Counsel (کونسل) مشورہ کرنا، دریافت کرنا - ہو سکتا ہے کہ عربی لفظ سوال سے لیا گیا ہو، جس کے معنے بھی پوچھنے کے ہیں -

۴۷- Covin (کووِن) دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاہدہ جس سے تیسرے کو نقصان پہنچے - عربی میں لفظ غبن اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے

۴۸- Cradle (کریڈل) پالنا، جھولا - عربی میں ہدّ کے معنے بھی ہلا دینے کے ہیں -

(باقی)

جسونت کنور

(۱)

شہر میں افواہیں گرم تھیں۔ محلوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ گھر گھر یہی چرچا تھا کہ پانچ پانچ، سات سات برس کے بچے غائب کئے جا رہے ہیں، بھگائے جا رہے ہیں۔ ایک کہتا کہ بیراگی دوپہر کے سناٹے میں یا سرِ شام جہاں کہیں گلی کوچے میں بچوں کو اکیلا کھیلتے دیکھتے ہیں پکڑے جاتے ہیں اور انھیں بیراگیوں اور سادھوؤں کے غول میں شامل کر لیتے ہیں۔ دوسرا کہتا کہ کٹنیاں چھوٹی ہوئی ہیں جو لڑکیوں کو پھسلا بہلا کر اپنے ساتھ لیجاتی ہیں اور کسبیوں کے ہاتھ بیچ دیتی ہیں۔ تیسرا کہتا کہ یہ سب حرکتیں گھروں کے نوکر ہی کرتے ہیں۔ جہاں کہیں بچوں کو سونے چاندی کا زیور پہنے دیکھا لے اڑے۔ بچوں کو مار ڈالا۔ زیور کے کوڑے کئے۔ غرضیکہ جتنے منھ اتنی باتیں۔ اگر کوئی ان خبروں کو بے بنیاد ثابت کرتا تو اسے یوں قائل کیا جاتا کہ تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ میرے ایک عزیز اپنی بیوی اور بال بچوں کے ساتھ ہردوار کمبھی نہانے گئے تھے۔ بھیڑ میں ان کی سات برس کی بچی غائب ہو گئی۔ برسوں پتہ نہ چلا۔ اتفاق سے تھوڑے دن ہوئے ایک شادی کے سلسلہ میں وہ گانے والی کی حیثیت سے آئی اور پہچانی گئی۔ ماں کا سامنا ہوا، اُسے بھی کچھ یاد آیا۔ روئی، ماں کی تشفی کی۔ لیکن گھر واپس آنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا، دونوں کلیجہ مسوس کے رہ گئیں، اُس کے گانے کے ریکارڈ بہت مشہور ہیں۔ اصلی واقعہ ہے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے، سب کہتے ہیں کہ افواہیں ہیں۔ دوسرے صاحب کہتے کہ چشم دید واقعہ ہے کہ میرے دوست کا ایک لڑکا آٹھ برس کی عمر میں گھر کے دروازے سے کھیلتے کھیلتے غائب ہو گیا مجھ سے بہت مانوس تھا۔ ہر طرح تحقیقات کی گئی لیکن پتہ نہ چلا۔ پار سال کا ذکر ہے کہ میں نے خود اُسے ایک بیراگی کے ساتھ دیکھا اور پہچانا بھی۔ گھر واپس چلنے کی بہت کوشش کی لیکن اُس بیراگی کا نہ معلوم کیا اور کیسا جادو اُس پر تھا کہ وہ کسی طرح گھر واپس چلنے کو راضی نہ ہوا آنکھوں دیکھی بات ہے میں کیسے مان لوں کہ افواہیں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ گلی کوچوں میں۔ سڑکوں پر ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی ایسا ہنگامہ برپا ہو جاتا کہ جس کی بنا پر افواہیں اور گرم ہوتیں۔ ماؤں کے کلیجے دہلنے لگتے اور ہر صاحب اولاد غیر معلوم خطرے کے اندیشہ سے پریشان رہتا۔

ایک بڑھیا عورت قوم کی مسلمان۔ میلے کپڑے پہنے۔ کمر جھکائے لکڑی کے سہارے چلتی۔ امین آباد کی سڑک سے گزر رہی تھی۔ اُس کی جھولی میں کچھ شلغم اور ساگ تھا اور اُس کی انگلی پکڑے ایک چھ سات برس کی خوبصورت سی بچی جو کسی ہندو کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ روتی چلی جا رہی تھی لوگوں کو شبہ ہوا۔ دوڑ پڑے۔ پہلے دو چار نے بڑھیا سے باز پرس شروع کی۔ بڑھیا ڈر گئی تھی۔ اُلجھ پڑی۔ پھر جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ پولیس نے دست اندازی کی۔ بالآخر تحقیقات سے ثابت ہوا کہ کسی شریف ہندو گھرانے کی بچی ہے۔ اپنی ... کے ساتھ بازار گئی تھی۔ راستہ میں مچل گئی اور بات کا بتنگڑ ہو گیا۔

ایک دن تانگہ ہنڈولہ کی سڑک سے ایک یکہ دو سواریاں بٹھائے تیزی سے جا رہا تھا۔ ایک بوڑھے پجاری نس گیروے رنگ کا پشمینہ کرتا پہنے اُس پر بیٹھے تھے اور ان کی گود میں سات آٹھ برس کا ایک لڑکا تھا۔ گیروے رنگ کے کپڑے۔ بچہ کا رونا۔ اور یکہ کا تیزی سے جانا کافی تھا۔ کچھ لوگ "دوڑنا۔ پکڑنا" چیختے ہوئے یکہ کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اس کیفیت نے ہیجان پیدا کیا۔ یکہ رکا گیا تو خلقت جمع ہو گئی بچے کی چھینا جھپٹی ہونے لگی۔ بالآخر پولیس نے آ کر رفع دفع کیا اور بات صرف اتنی تھی کہ دادا میاں پوتے کو ساتھ لئے اسٹیشن جا رہے تھے۔ وقت تنگ تھا۔ یکہ کو دوڑایا گیا۔ بچہ خوف سے سہم گیا۔ رونے لگا۔ بس ہنگامہ برپا ہو گیا، ایسی وارداتیں آئے دن ہوتی تھیں، بات بے بنیاد ہوتی تھی لیکن خلقت کی زبانوں پر بتنگڑ ابن جاتی تھی۔

کئی برس ہوئے کہ شک و شبہ۔ وحشت و ہنگامہ کی یہ فضا تھی شہر لکھنؤ میں، جس سے عوام میں ہر وقت اندیشہ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ایسی افواہوں کی ابتدا آگرہ سے ہوئی، پھر کانپور اور فیض آباد کی خبریں اخباروں میں شایع ہوئیں اور اب دو ماہ سے ان افواہوں نے لکھنؤ میں ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ کچھ اصلیت بھی تھی۔ کانپور آگرہ اور فیض آباد میں دو چار واقعے بچوں کے غائب ہو جانے کے ہو چکے تھے لیکن پولیس پتہ چلانے میں کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ اس سب کا مجموعی اثر یہ تھا کہ بڑے بڑے شہروں میں خوف و اندیشہ سے فضا بگڑی ہوئی تھی۔ گو اس وقت تک خاص لکھنؤ میں کسی ایسے حادثہ کا پتہ نہ چلا تھا۔ تاہم سب سے زیادہ شور یہیں تھا۔

(۲)

گو شہر کی فضا بگڑی ہوئی تھی پر دُنیا کے کام کاج اور مشغلے سب ویسے ہی جاری تھے منگل کا دن تھا۔ شام کا وقت۔ امین آباد پارک میں مہابیر جی کے مندر میں آرتی ہو رہی تھی۔ مندر کے اندر اور ارد گرد ہندو عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا۔ مرد بھی کافی تھے۔ عقیدت مند خال خال اور تماشائی بکثرت تھے۔ علاوہ بریں پارک کی سڑکوں پر بھی بھیڑ تھی۔ مٹھائی کی دوکانیں خوب سجی تھیں۔ خریداروں کے ٹھٹ لگے تھے۔ گھنٹے۔ گھڑیال، سنکھ کے شور اور خوانچے والوں کی آوازوں سے کان پڑی بات سنائی نہ دیتی تھی، اچھا خاصہ میلا لگا ہوا تھا۔ دفعتاً کھلبلی مچی کہ کسی کا بچہ غائب ہو گیا، ماں کہتی تھی کہ نوکر دوکان پر مٹھائی لینے بھیجا لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ نوکر کہتا تھا کہ مٹھائی والے نے جلدی میں پیسے اس لاپروائی سے واپس کئے کہ تمام ریزگاری نالی میں جا پڑی۔ میں بٹورنے لگا۔ اتنے میں لڑکی غائب ہو گئی۔ میلا بھربھنڈ ہو گیا۔ چاروں طرف دوڑ بھاگ ہونے لگی۔ کسی نے کہا کہ ایک ہندو لڑکی کسی مسلمان عورت کے ساتھ لاٹوش روڈ پر جاتے دیکھی گئی ہے، لڑکی رو رہی تھی۔ لڑکی کے ماں باپ اور بھائی سب اُدھر ہی دوڑے۔ خلقت نے بھی پیچھا کیا۔ عورت اور لڑکی دکھائی دی۔ بھیڑ اُس پر ٹوٹ پڑی وہ لڑکی کو گھسیٹتی ہوئی بیرونی خندق میں گھس گئی لیکن بچ نہ سکی۔ لڑکی کو تو باپ نے اُٹھا کر ماں کی گود میں ڈالا اور اُدھر خلقت عورت کے پیچھے پڑ گئی۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اُس کی چھیچھالیدر کر دی، قریب تھا کہ اُس کے گوشت پوست اور ہڈی پسلی کے تکے تکے کر دئے جائیں کہ پولیس آگئی لوگوں کو سمجھایا بجھایا۔ لڑکی کے رشتہ داروں کا نام پتہ پوچھا اور عورت کو حراست میں لے کر تھانہ روانہ کیا۔ خلقت لوٹی تو ایسی مسرور و مست گویا بڑا گڑھ جیتا، کوئی سنگین مورچہ فتح کیا۔ دوسرے روز گھر گھر اسی کا چرچا تھا۔ ایک کہتا تھا کہ عورت نے اقبال کیا ہے۔ بہت بڑی سازش ہے۔ اس میں نہ معلوم کس کس شہر کے اور کتنے لوگ شامل ہیں مقدمہ کی پیروی کے لئے دور دور سے وکیل اور بیرسٹر آ رہے ہیں، دوسرا کہتا کہ جی نہیں وہ محض ایک کٹنی ہے۔ اُس کا یہی پیشہ ہے اس دفعہ دھر لی گئی۔ سزا ہو جائے گی۔ البتہ سزا سخت ہونی چاہئے۔ غرضکہ مقدمہ کی تاریخ کا بےچینی سے انتظار تھا۔ دو چار روز بعد جب تاریخ مقررہ آئی تو خلقت سٹی مجسٹریٹ کی عدالت پر اُمنڈ پڑی۔ باہر ہزاروں کا مجمع تھا ہر طبقہ اور فرقہ کے لوگ جمع تھے۔ پولیس کا انتظام تھا۔ جن صاحب کی لڑکی کو غائب کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ ایک کھتری تعلقہ دار تھے اس لئے علاوہ اوروں کے کئی تعلقہ دار بھی عدالت میں از راہ ہمدردی موجود تھے۔ ٹھیک ½ ۱ بجے عدالت کی کارروائی شروع ہوئی۔ کورٹ انسپکٹر نے مقدمہ کی نوعیت بیان کی۔ شہادت پیش کی۔ گواہوں کے بیان ہوئے اور عدالت نے ملزمہ کی طرف جو کٹہرے میں کھڑی تھی رُخ کیا اور پوچھا: "تمھیں کیا کہنا ہے"

ملزمہ :- "میں اپنی صفائی پیش کروں گی۔ البتہ میرا بیان کسی قدر طویل ہوگا امید کہ عدالت جو کچھ کہوں گی سننے کو طیار ہوگی"۔

عدالت :- "تمھیں اختیار ہے۔ جو کچھ بھی کہو گی عدالت سنے گی"

ملزمہ کی عمر تقریباً چالیس اکتالیس سال کی ہوگی۔ لانبا قد۔ گٹھا ہوا بدن۔ گورا تو نہیں لیکن رنگ اُجلا تھا، کتابی چہرہ۔ چوڑی پیشانی۔ ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں۔ جن کی پتلیاں نیلی تھیں۔ چکنے رخسار، بھرے ہوئے ہونٹ۔ سڈول گردن۔ بدن پر سُرخ گلبدن کا تنگ مہری کا پائجامہ باریک ململ کا کُرتہ اُس پر نیلے ریشم کا شلوکہ سر پر پیازی رنگ کی ادھی کا دوپٹہ اور پاؤں میں سرخ مخمل کی زیرپائی۔ شباب ڈھل چکا تھا اور "کاروانِ عمر رفتہ" نے جا بجا اپنے "نشان" چھوڑ دئے تھے۔ اُس کے ریشم سے ملائم بالوں کا رنگ اب کھچڑی ہو گیا تھا۔ چہرے پر بجائے سرخی جھلکنے کے زردی سی چھائی معلوم ہوتی تھی۔ آنکھوں کے حلقوں اور ہونٹوں کے قریب کچھ جھائیاں سی تھیں جن سے جھریوں کا شبہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کے خداداد حُسن کی کشش میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ آنکھوں کی وہ چمک اور اُس کا شوخ انداز جو روزِ ازل سے آج تک مرد کو عورت کا گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔ ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم جس سے صنفِ نازک ہمیشہ سخت سے سخت دل کو موم کر دیتی ہے آج بھی اپنا کام کر رہا تھا۔ مگر اس مجمع میں یہاں ہر شخص اُس کے خون کا پیاسا ہو کر آیا تھا۔ اُس کے جادو کا اقرار کرنے والے تو کم تھے۔ لیکن اُس کی چڑھی ہوئی چتون۔ تنی ہوئی گردن۔ متین لہجہ اور اُس کی شخصیت کا رعب ہر شخص پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ جسوقت اُس نے اس مجمع پر ایک حقارت آمیز نگاہ ڈالکر عدالت کو مخاطب کیا اور زبان کھولی تو کسی میں دم مارنے کی تاب نہ تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام مجمع کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ملزمہ نے اپنا بیان یوں شروع کیا:۔

(۳)

عرصہ ہوا میں اپنے ناز برداروں اور خریداروں کے حلقے میں "ملکہ" کے نام سے مشہور تھی۔ اب کئی سال سے لوگ مجھے 'وحیدن' کہکر پکارتے ہیں۔ مگر میں ذات کی ٹھکرانی ہوں اور میرا نام جسونت کنور ہے۔ میں بڑے گھرانے کی بیٹی ہوں، میرے باپ ریاست قروَلی کے جاگیردار تھے۔ میری ماں مجھے چار برس کا چھوڑ کر مر گئی۔ میرے باپ نے شادی کر لی لیکن مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ زمانہ کی افتاد سے دولت و ثروت نے اب ہم سے مُنہ موڑ لیا تھا لیکن آن بان پہلی ہی سی تھی

میرے باپ چاہتے تھے کہ مجھے کسی بڑے امیر گھرانے میں بیاہیں لیکن یہ بات آسان نہ تھی اس لئے میری شادی بدیر ۱۶ برس کی عمر میں ہوئی۔ میرے شوہر ریاست بھرت پور کے ایک جاگیر دار تھے۔ روپیہ اور دولت کی کمی نہیں تھی لیکن میں سوا سال کی تھی اور وہ پینتالیس کے۔ میرے باپ کی مرضی تھی، شادی ہو گئی اور میں آرام سے رہنے لگی۔ میرے دیور دیورانی اور دوسرے رشتہ دار سب ہی میری خاطر کرتے تھے۔ مجھے لڑکے کا بڑا ارمان تھا لیکن پانچ برس تک کوئی بچہ نہ ہوا۔ چھٹے سال میرے شوہر قضا کر گئے میں اُس وقت ۲۲ سال کی تھی۔ رنج تو ہوا لیکن شباب کا زمانہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ میں اُسے چند مہینوں میں بھول گئی۔ میرے دیور بلھدر سنگھ جن کی عمر تقریباً ۳۵ سال کی ہوگی خوش رو جوان تھے یوں تو وہ پہلے ہی سے اچھی طرح پیش آتے تھے لیکن میرے شوہر کے مرنے کے بعد سے اُن کی توجہ اور بڑھتی گئی۔ ان کے دو بچے تھے ایک چھ سات برس کا لڑکا اور دوسرے ۴ یا ۵ برس کی بچی۔ مجھے یہ بہت پیارے معلوم ہوتے تھے اور میں ان کے ساتھ اپنا بہت سا وقت صرف کرتی اور ان کو پیار کیا کرتی تھی۔ اسی بہانہ سے بلھدر سنگھ کا وقت رفتہ رفتہ میرے ساتھ زیادہ گزرنے لگا۔ میری دیورانی کو یہ ناگوار گزرتا۔ پہلے تو میں کچھ سمجھی نہیں لیکن رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آیا کہ بلھدر سنگھ کا اور میرا جب سامنا ہوتا تھا تو ان کی نگاہوں کا انداز اور ان کی بات چیت کا لہجہ طلبگار کا سا ہوتا تھا۔ میں تنہائی میں اُکتایا کرتی تھی پھر جوانی دیوانی تو ہوتی ہی ہے۔ مرد کے کہنے سننے میں آ گئی۔ اب گھر والوں کا برتاؤ میرے ساتھ بدلنے لگا۔ بات بات پر طعن تشنیع اور چپقلش ہوتی تھی۔ مگر چونکہ بلھدر سنگھ میری ناز برداری خوشی خوشی کرتے تھے میں کسی کی پروا نہ کرتی تھی۔ جب کچھ اور آثار نمایاں ہوئے تب بھی میں بلھدر سنگھ کی باتوں میں آ کر اس کے خمیازے سے لاپروا رہتی بلکہ اپنے بچے کے خیال سے خوش خوش رہتی۔ رفتہ رفتہ میرے کانوں میں یہ آواز آنے لگی کہ ٹھاکروں کی پنچایت ہوگی۔ مجھے برادری سے خارج کیا جائے گا۔ میں گھر سے نکالی جاؤں گی۔ یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوئے۔ اُسی کے ساتھ بلھدر سنگھ بھی مجھ سے اب کچھ دور دور رہنے لگے اور میں ان کو معمول سے زیادہ خاموش دیکھتی تھی ایک دن بلھدر سنگھ نے آ کر اور کچھ منہ بنا کر مجھ سے کہا کہ کچھ دنوں کے لئے اپنے میکے چلی جاؤ۔ مجھے بہت بُرا معلوم ہوا اور میں نے صاف انکار کر دیا۔ اُس روز سے اُن کے تیور چڑھ گئے اور اب میری آنکھیں کھلیں۔ تاہم میری ہمت جواں تھی۔ البتہ بچہ ہونے کا زمانہ قریب ہونے اور اپنی حالت کے نازک ہونے سے میری طبیعت گری رہتی تھی اُس پر گھر میں ہر روز کچھ نہ کچھ چپقلش۔ میرا مزاج بھی چڑچڑا ہونے لگا۔ ایک دن سرِ شام بلھدر سنگھ کا لڑکا میرے پاس بیٹھا ہوا کسی بات پر ضد کر رہا تھا۔ میں منع کرتی تھی دفعتاً مچل گیا۔ میں نے ڈانٹا وہ روتا چیختا ماں کے پاس چلا گیا وہ رسوئی میں تھی۔ سمجھی کہ میں نے مارا۔ وہاں سے غیظ و غضب کی حالت میں بُرا بھلا کہتی چولھے کی لکڑی اُٹھا میری طرف دوڑی اور مجھے مارا۔ میں لکڑی کی چوٹ سے سہم کر رونے لگی۔ اتنے میں بلھدر سنگھ آئے اور یہ کہہ کر "کس کے منہ لگتی ہو" بیوی کو میرے کمرے سے باہر لے گئے۔ لکڑی کی چوٹ سے مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی کہ جس قدر اُن کے اس فقرے سے ہوئی۔ جیسے تیور چڑھا کر اور جس لہجہ میں انھوں نے یہ فقرہ کہا تھا اُس نے میرے دل میں اور بھی ٹھیس لگائی۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب تھک کر شل ہو گئی تو بے حس ہو کر پڑ گئی۔ گھنٹہ بھر بعد ہی مجھے دردِ زہ کی تکلیف شروع ہو گئی اور میں کرب کی حالت میں پڑی لوٹتی رہی۔ دو گھنٹے اور گزرے۔ میری پرانی نوکرانی میرے پاس تھی۔ مجبور ہو کر میں نے اُسے بلھدر سنگھ کو بلانے بھیجا۔ وہ اپنے پلنگ پر تھے آنے میں دیر لگی اتنے میں بچہ ہو پڑا — جب بلھدر سنگھ آئے تو جھنجھلائے ہوئے تھے۔ بچہ رو رہا تھا۔ انھوں نے کرخت لہجہ میں پوچھا۔

بلھدر سنگھ : کیا ہے ؟ - کیا ہوا ؟

میں : لڑکی ہوئی ؟

بلھدر سنگھ : اس کا رونا بند کراؤ - کیا فضیحت کراؤ گی۔

اتنے میں بلھدر سنگھ کی بیوی بہن سامنے آ کھڑی ہوئیں - بچہ اور زیادہ رونے لگا۔

بلھدر سنگھ : مجھے دو - میں اسے کہیں دفع کروں۔

میں : یہ نہیں ہو سکتا۔

بلھدر سنگھ کی بیوی : کھڑے دیکھتے کیا ہو، کمبخت کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے

بلھدر سنگھ : کھیل ہو گیا - بس اسے میرے حوالہ کرو

یہ کہہ کر وہ میری طرف بڑھے، میرے جسم میں گویا آگ سی لگ گئی تھی۔ وحشت اور جنون میرے سر پر سوار تھا۔ میں نے تڑپتی لہجہ میں کہا۔ خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا ہوگا یہ کہہ کر میں نے تھوکا اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔ بلھدر سنگھ کی بیوی نے بڑی حقارت کی نگاہ سے ہم دونوں کو دیکھا اور یہ کہہ کر "اچھا جواب لا بس منہ کالا کرو" میرے

کمرے سے باہر چلی گئی۔ بلبندر سنگھ تاؤ میں آکر میری طرف بڑھے، بیٹی نے انھیں زور سے دھکا دیا وہ لڑکھڑائے اور دیوار سے جا کر ٹکرائے۔ میں موقع کو غنیمت سمجھ کر لڑکی کو چپٹائے دروازے سے باہر نکل گئی۔ آدھی رات کا وقت ہوگا سب سوئے پڑے تھے۔ میں گلی کوچوں اور سڑک پر بے اختیار بھاگ رہی تھی۔ بلبندر سنگھ غصہ میں بھرے کچھ بڑبڑاتے برا بھلا کہتے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ جب میں چار فرلانگ کے بعد میں بیدم ہو کر گر پڑی تو انھوں نے آکر مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ اور لڑکی کو میری گود سے چھیننا مجھے اور تو کچھ بن نہ پڑا میں نے ان کی کلائی پر اپنے دانت گڑا دئے۔ ایک دفعہ چیخ تو اٹھے لیکن دوسرے ہاتھ سے لڑکی کا گلا گھونٹ دیا۔ ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور میری آنکھوں کے سامنے میری بچی کی جان نکل گئی۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ دم پھول رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ مجھے بڑی زور سے چھاتی پر گھونسا لگا۔ میں گری اور بیہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو تڑکا تھا۔ میں کھیت کی مینڈ پر خستہ حال پڑی تھی۔ اور ایک لانبے قد کا بوڑھا جس کی سفید ڈاڑھی اس کی ناف تک پہونچتی تھی اور ایک سفید تہمد باندھے۔ گھٹنے سے نیچا سفید کرتا پہنے۔ اور ہاتھ میں موٹا سا موٹا لئے اپنے کمنڈل میں سے پانی لے کر میرے منہ میں ڈال رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اس زندگی کے فرشتے کو سامنے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس نے میرا نام پتہ اور حال پوچھا میں نے صرف اتنا بتایا کہ میں ایک بیکس عورت ہوں جسے گھر والوں نے زد و کوب کر کے گھر سے نکال دیا ہے اور اب میرا کوئی نہیں۔ اس سائیں بابا نے مجھے تسلی دی اور اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔ میں وہیں خستہ حال دن بھر پڑی رہی۔ اس نے مجھ سے پوچھا: "تو بیٹی اب کیا ارادہ ہے کہاں جاؤ گی؟"

میں: "مجھے تو آپ ہی کا سہارا ہے۔ جہاں کہو گے چلی جاؤں گی"

سائیں: "اگر تم مسلمان ہونے پر راضی ہو تو کسی بھلے مانس سے تمہارا نکاح پڑھوا کر ٹھکانا کر دیں۔ اچھی اور خوش رہوگی"

میں: "مجھے انکار نہیں"۔

دوسرے روز وہی سائیں بابا مجھے سہارا دیکر کسی طرح آگرہ لے گئے۔ اور وہاں ایک سرائے میں ٹکا دی گئی۔ دوسرے روز ایک مولوی صاحب ایک حکیم صاحب کو ساتھ لئے ہوئے سائیں جی کے ہمراہ وہاں آئے۔ مولوی صاحب نے تو مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا اور حکیم صاحب نے علاج کی فکر کی۔ تین روز تک میں خراب و خستہ سرائے میں پڑی رہی۔ مجھے اپنے تن بدن کا کچھ ہوش نہ تھا۔ میرے منھ میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا مجھے اپنی تکلیفوں کا بھی احساس نہ تھا نہ بھوک پیاس ہی کا کچھ ہوش۔ البتہ میرا دماغ اپنا کام کر رہا تھا۔ جب سوچتے سوچتے تھک جاتی تو آنکھ لگ جاتی جب جاگتی تو پھر سوچنے لگتی۔ تین روز بعد جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ میری تو کایا ہی پلٹ ہو گئی۔ مجھے تین روز پیشتر والی جسونت کنور اور اپنے میں زمین اور آسمان کا فرق معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے راز کا پردہ میری آنکھوں سے اٹھ گیا تھا۔ دنیا کس کو کہتے ہیں میں اب سمجھنے لگی تھی۔ شباب کا رومان۔ حسن کی لطافتیں اور نزاکتیں۔ محبت کے راز و نیاز۔ شائستگی کے تکلفات اب میری نگاہ میں محض ڈھکوسلا معلوم ہوتے تھے۔ میں اب ان سے دھوکہ کھانے کو طیار نہ تھی۔ دریا دلی۔ دردمندی اور رحم میرے خیال میں ایسی کمزوریاں تھیں کہ جن سے انسان بعض اوقات مجبور تو ہو جاتا ہے لیکن ان سے ہمیشہ اذیت ہی اٹھاتا ہے۔ اب میں سمجھنے لگی تھی کہ زندگی کی کٹھن لیکن دلچسپ منزل طے کرنے میں انسانی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ صرف دو تین باتیں کارآمد ہوتی ہیں۔ اول خود غرضی۔ دوسرے ہمت و حوصلہ۔ تیسرے قدرتی انصاف کا احساس۔ زندگی کے حقیقت حال کا یہ سبق جو شخص یاد نہیں رکھ سکتا وہ اس دنیا کی کشاکش میں کبھی اپنے قدم ثابت جمائے نہیں رہ سکتا۔ اس لئے میں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اور کیا نہ کرنا چاہئے۔ تین روز بعد جب میں نے غسل صحت کیا تو میں تین باتوں کا عہد کر کے اٹھی۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب تک میرا بل بوتا اور ہمت کام دے گی ان ٹھاکروں کی ذات بلکہ تمام ہندو قوم کو نیچا دکھانے اور ٹھکرانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھوں گی۔ دوسرے جس طرح میری جوانی و زندگی برباد ہوئی میں ان کی بہو بیٹیوں کی زندگیاں تباہ کر کے چھوڑوں گی۔ تیسرے مرد کی ذات سے مجھے اب کچھ ایسی نفرت اور چڑ ہو گئی تھی کہ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں ان سے کسی قسم کے التفات کا رشتہ جوڑ کر اب ان کی پابند نہ ہوں گی انصاف میرے کانوں میں پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اٹھ اور زندگی کا مقصد پورا کر انھیں کے سہارے میں کمربستہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ ہمت میری جوان تھی۔ شباب میرا رفیق تھا۔ حسن میری پونجی تھی۔ یوں تو میں تن تنہا تھی لیکن مجھے کسی کا ڈر نہ تھا۔ مولوی صاحب نے کلمہ پڑھاتے ہی میرے اوپر ڈورے ڈالنے شروع کئے، نکاح کا پیغام بھی دیا، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ سائیں بابا نے جب کہا کہ بیٹی تو پھر کیا کرو گی۔ میں نے کہا کہ ملو الفن کا پیشہ۔ صوفی منش آدمی تھے۔ پہلے تو لمحہ بھر سوچا، پھر مسکرا کر کہنے لگے کہ جیسی تمہاری مرضی۔ جو کچھ مدد ہو سکے گی کروں گا۔ ایک ہفتہ کے اندر میں کوٹھے پر بیٹھ گئی اور شہر میں میرا چرچا ہونے لگا۔

محمد شریف: "اب تو ہندوستان میں بھی تقریباً ہر شہر میں ایسے آشرم کھل گئے ہیں جہاں بیوہ۔ بیکس اور مظلوم عورتوں کی خبر گیری کی جاتی ہے اور ان کی زندگی بہتر بنانے اور سدھارنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں تو پھر تم نے اسلام کیوں قبول کیا۔ کیا تمھیں اس پر عقیدہ تھا۔

ملزمہ : جی نہیں ۔ میں تو ہر مذہب کو خواہ ہندو ہو یا اسلام سوسائٹی کا محض ایک ڈھکوسلا سمجھتی ہوں ۔ مجھے کسی مذہب پر کوئی عقیدہ نہیں ۔ علاوہ اسکے یہ آشرم نہیں بلکہ بدمعاشوں اور اُٹھائی گیروں کے اڈے ہیں جہاں بیکس عورتیں بھگا کر لے جائی جاتی ہیں اور پنجابیوں کے ہاتھوں بیچی جاتی ہیں ان میں سے جو بعض شرافت کا دم بھرتے ہیں وہاں ان عورتوں کی شادی کر دی جاتی ہے اور معاوضہ میں آشرم کے چندے کے بہانہ سے نقد دام لے جاتے ہیں ۔ عورت ذات کی کسی کو پروا نہیں یہاں تو ہندوؤں کی مردم شماری گھٹنے نہ پائے صرف اس کی کوشش ہے ۔ میں وہاں کیا کرنے اور کیوں جاتی ؟

مجسٹریٹ : تو مولوی صاحب کے ساتھ نکاح ہی کر لیتیں ۔ اس سے تو بہتر تھا ۔

ملزمہ : ہاں بہتر ہوگا لیکن اس کی حالت بھی یہ تھی کہ گھر میں دو عورتیں بٹھائے تھا ۔ تیسری پر ڈورے ڈال رہا تھا اور قبر میں جانے سے پیشتر چوتھی کا ارمان رکھتا تھا ۔ میں اپنے تئیں اُس کا تختۂ مشق بنا کر عورت کی ذات کی توہین کیوں کرتی ؟ مجسٹریٹ صاحب شاید آپ کو میرا یہ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات معلوم ہوتی ہوگی اور جو میں کہونگی وہ بھی انوکھا معلوم ہوگا مگر اصلیت یہ ہے کہ عورت کی ذات میں طوائف ہی وہ جنس ہے کہ جسنے مردوں کی ظالم قوم سے مقابلہ کرنے میں اپنی ذات کی شان کو گری : ہوشمندی سے عورتوں کی ہستی کا پلڑا بھاری رکھا ورنہ یہ گھر کی بیٹھنے والی گھر والیاں تو اپنی عصمت و حرمت ہمیشہ بڑے سستے داموں بیچتی رہتی ہیں ۔ میں تو یہ خیال کرتے ہی شرم سے گڑ جاتی ہوں خیر میری داستان سنئے ۔ عرصہ ہوا آگرہ میں مُنّی جان نامی ایک طوائف تھی جس کا شمار اپنے زمانہ کی مشہور گانے والیوں میں تھا ۔ صاحب دولت تھی اور اونچے درجے کی اور معقول مجرا لیجاتی تھی ۔ اب بڑھیا ہو چلی تھی محفل اور مجروں میں بہت کم جاتی تھی ۔ خدا بھلا کرے سائیں بابا کا اُنھوں نے مجھے اُس تک پہونچایا ۔ نہ معلوم میری کونسی بات اُسے پسند آئی ۔ مجھے اپنے یہاں رکھ لیا اور بیٹی کی طرح سمجھنے لگی ۔ اُٹھنے بیٹھنے کا شعور ۔ بات چیت کرنے کا سلیقہ ، شعر و سخن کا ذوق اور پڑھنے لکھنے کا مشغلہ میں نے اُسی کی صحبت میں حاصل کیا ۔ یہ تو آسان تھا لیکن ناچنے گانے کی تعلیم سچ کہتی ہوں کہ لوہے کے چنے چبانے سے کم نہ تھی ۔ دو برس میں اس کی بھی مہارت حاصل کر لی ۔ میں نے کیا سیکھا اور مجھے کیا آیا اس کا اندازہ تو مجھے کبھی ٹھیک ٹھیک ہوا نہیں ۔ لیکن مجروں اور محفلوں میں میرا رنگ جمنے لگا ۔ غالباً میری آواز میں کشش تھی تین ہی چار برس میں میری قدر و قیمت بڑھنے لگی اور میرا نام چمکنے لگا ۔ اس طرح میری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا اس عرصہ میں منی جان قضا کر گئی تھیں اور ان کی وارث میں سمجھی جاتی تھی ۔ کچھ تو منی جان کے رشتہ کے طفیل میں کچھ اپنے بھی طور طریقوں کی بدولت میرا مرتبہ شہر کی طوائفوں میں سب سے اونچا تھا ۔ میرے یہاں ہر کس و ناکس کا گزر ممکن نہیں تھا ۔ میں بڑی بڑی محفلوں اور مجروں ہی میں جاتی تھی ۔ یوں تو اکثر رئیس زادے اور نواب زادے گانا سننے کے شوق میں میرے یہاں آیا کرتے تھے ۔ لیکن اپنے ناز برداروں میں زیادہ تر راجپوت ۔ ٹھاکر ، کھتری اور سیٹھ ساہوکاروں کے منچلے نوجوانوں کو منتخب کرتی تھی ۔ اور جب وہ گھل گھل کر ہو جاتے تو آنکھیں پھیر لیتی اور بیدردی سے ٹھکرا دیتی ۔ جو حیادار ہوتے یا تو زہر کھا کے سو جاتے یا شہر چھوڑ کر چلے جاتے ۔ بیحیا جوتیاں چٹخاتے گلی کوچوں میں چکر لگائے پھرا کرتے ۔ جب مجھے یہ خبریں ملتیں تو مجھے ایسی دلی مسرت ہوتی کہ میں باغ باغ ہو جاتی ۔ میرا دوسرا مشغلہ یہ بھی تھا اور اس میں مجھے سب سے زیادہ لطف آتا تھا کہ اونچے ہندو گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو کٹنیوں کے ذریعہ سے آوارگی پر آمادہ کر کے گھروں سے نکلواتی ، اور پھر جب میں ان کو پھٹے حالوں کوچہ گردی کرتے دیکھتی تو میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا اور اپنی کامیابی پر خوش ہوتی ۔ میری زندگی کے ۱۵ سال اسی طرح گزرے ۔ دولت کا کروفر اور کمال کی شہرت اور حسن و شباب کے ناز برداروں کا خراج تحسین ۔ الغرض زندگی بڑے آرام سے گزرتی تھی لیکن بلھندر سنگھ نے جس طرح میری بچی کا گلا میری آنکھوں کے سامنے گھونٹا تھا اس کی یاد مجھے نہیں بھولتی تھی تاہم انتقام کی آگ کے شعلے اب پہلے کی طرح نہیں بھڑکتے تھے ۔ شاید اس لئے کہ عیش و آرام کی زندگی انسانی جذبات کی آبدار تلوار کی دھار کو کند کر دیا کرتی ہے ۔ ایک دن غسل کے بعد جب میں آئینہ کے سامنے بیٹھی اپنے سنگار میں مشغول تھی اور میری خادمہ میرے ریشم سے ملائم اور بھونرا سے کالے بالوں کو کنگھی اور برش سے آراستہ کر رہی تھی دفعتاً میرے سر پر ایک سپید بال چمک گیا اور میں اُسے دیکھتے ہی چونک گئی اور اُس روز سے میں یہ اکثر سوچا کرتی کہ حسن و شباب کے ڈھلنے کے بعد یہ طویل زندگی کیونکر بسر ہوگی ہر چند میرا اثاثہ اتنا تھا کہ میری زندگی اچھی طرح کٹ جاتی لیکن میں نے سوچا کہ کیوں نہ موسیقی میں کمال حاصل کرنے کی طرف توجہ کروں ، اس خیال سے میری تسکین ہوئی اور میں نے اب اپنا وقت اور دھیان اس طرف دینا شروع کیا ۔ لیکن اسی کے ساتھ اتفاق سے میری زندگی کا ایک اور ورق پلٹا ۔ میری ہی کٹنیوں میں سے ایک کٹنی جو کمبخت کام چور اور اُسی کے ساتھ بے وقوف بھی تھی ، ایک دن کسی اچھے گھرانے کی دس گیارہ برس کی بچی کو کسی طرح بہلا پھسلا کر گھر سے نکال لائی اور اُسے کسی طوائف کے ہاتھوں بیچ دیا ۔ سوء اتفاق وہ کوتوال شہر کے کسی قریبی رشتہ دار کی بچی تھی ۔ پولیس نے جان توڑ کوشش کی پہلے تو کمبخت اُس کٹنی کو گرفتار کیا ۔ اور میں بھی اس میں پھنس گئی ۔ مقدمہ چلا اور مجھے بھی دو برس کی سزا ہو گئی ۔ اور جیل خانہ میں میری زندگی کا تیسرا اور آخری دور شروع ہوا ۔

میرے جیل جانے پر تمام بنا بنایا کارخانہ دم زدن میں ملیامیٹ ہوگیا اور میں مصیبت و عسرت کے دن جیل میں کاٹنے لگی۔ محل کی رہنے والی۔ جو پھولوں کی سیج پر سوتی ہو۔ جس کے دسترخوان پر دُنیا کی نعمتیں سجائی جاتی ہوں۔ جس کے ہر اشارۂ ابرو پر بیسوں ناز بردار اور خادم کٹ پتلیوں کی طرح ناچتے ہوں اُس کو اگر چشم زدن میں جیل کی زندگی کا سامنا ہو کہ جہاں نان جویں کے لئے بھی ذلیل ترین مخلوق کا محتاج ہونا پڑے، تو اُس کا کیا حال ہوگا آپ مشکل سے اندازہ کرسکتے ہیں۔ جسمانی اذیتوں کے علاوہ جن کا برداشت کرنا آسان کام نہ تھا جیل کی فضا میں مجھے روحانی کوفت بھی تھی۔ میری سی گنہ گار وہاں بہت سی تھیں جو میری آؤ بھگت کرنے کو طیار تھیں لیکن کچھ ایسا اجتناب تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ مجھے ان کی ہوا بھی لگے۔ سوائے دماغ کے پرخچے اور دھجیاں اُڑنے کے صبح سے شام اور شام سے صبح تک میرا کوئی دوسرا شغل نہ تھا۔ بیٹھے بیٹھے سوچا کرتی۔ جب سوچتے سوچتے تھک جاتی تو سو جاتی۔ جاگتی تو پھر سوچنے لگتی۔ زندگی کے اُتار اور چڑھاؤ کے مختلف دوروں اور ہر دور کے یادگار حادثوں کی تصویریں نگاہ کے سامنے آتیں اور جاتیں۔ ان حادثوں کی ایک ایک بات بعض اوقات ایک ایک فقرہ کی یاد گھنٹوں ستاتی اور میں سر دُھنا کرتی۔ اسی دماغی کوفت اور ہیجان کی کیفیت میں یہ بات میرے ذہن نشین ہوتی کہ عورت کی ذات کی وہ زندگی اور ہستی کہ جس کو ہندو سماج نے اُس کے لئے تخلیق کیا ہے وہ مقدر ہے کہ مٹائے نہیں مٹایا جاسکتا۔ قدرتی جذبات و احساسات دبا کر پست کئے جاسکتے ہیں۔ ہم اپنی فطرت و بشریت اگر چاہیں تو بدل سکتے ہیں۔ قدرت کا قانون بھی توڑا جاسکتا ہے۔ لیکن ہندو عورت اپنے اس مقدر سے انحراف نہیں کرسکتی یہ اٹل ہے۔ اس کے خلاف سرکشی اور بغاوت ایسی ہی عبث ہے جیسے پتھر سے سر پھوڑنا۔ اس کی سیکڑوں مثالیں میری نظر سے پہلے بھی گزر چکی تھیں اور بیسیوں اس وقت جیل میں بھی میرے سامنے موجود تھیں۔ اپنی تباہی و بربادی کا حادثہ بھی میرے لئے کم سبق آموز نہ تھا۔ پر نہ معلوم میری ساخت ہی میں کوئی صورت ایسی خرابی کی تھی یا میرا خمیر ہی کچھ ایسے بغاوت کے عنصر سے گوندھا گیا تھا کہ میں اس مقدر کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو طیار نہ تھی۔ جس وقت مجھے وہ لمحہ یاد آتا تھا اور اب کوئی دن ایسا خالی نہ جاتا کہ مجھے اس لمحہ کی یاد نہ ستاتی ہو، جب بلھدر سنگھ نے میری نوزائیدہ بچی کو میرے ہاتھ سے چھین کر اُس کا گلا دبایا اور وہ ننھی سی جان سسکیاں بھر کر میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئی تو انتقام کی آگ میرے تن بدن میں از سرِ نو بھڑکنے لگتی۔ قدرت کے انصاف کا احساس میری سرکشی اور بغاوت کو اُبھارتا اور بھڑکاتا۔ بلھدر سنگھ کا وہ فقرہ جو اُس نے اپنی بیوی کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ "تم کس کے مُنھ لگتی ہو" میری ہمت و حوصلے کو جگاتا اور میں چاہتی کہ کسی طرح پر لگا کر اُڑ جاتی۔ بلھدر سنگھ کی حویلی پر پہونچتی۔ رات کے سناٹے میں اندھیرے میں چور کی طرح دبے پاؤں اندر گھستی۔ بے خبر سوتے ہوئے بچوں کو گود میں اُٹھاتی بلھدر سنگھ کو ایک ٹھوکر مار کر جگاتی اور پیشتر اس کے کہ وہ گھبرا کر اُٹھے۔ ان ہاتھوں سے انھیں اُنگلیوں سے اس کے بچے کا گلا اُس کی آنکھوں کے سامنے دبا دیتی اور اسی امید پر میں زندہ تھی۔ اب میری رہائی کا زمانہ قریب آرہا تھا۔ میں خوش خوش اُس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ بالآخر وہ دن آیا اور میں جیل کے باہر آئی۔ لیکن باہر نکل کر معلوم ہوا کہ میرا کوئی یار و مددگار نہیں۔ کیا کرتی تیسرے ہی دن ایک خوبصورت سی کم عمر بچی کو جو گھر کے دروازے پر کھیل رہی تھی اُٹھا کر ایک طوایف کے ہاتھ بیچ دیا۔ کچھ دام ہاتھ آئے تو تن بدن کی فکر کی۔ فطرتی بات ہے کہ جب انسان تھکا ماندہ ہوتا ہے تو جسم تھوڑا آرام چاہتا ہے۔ جیل سے نکل کر میں ذرا سا آرام چاہتی تھی، ابھی کچھ دن آزادی کی تازی ہوا میں رہنا چاہتی تھی۔ بس اتنی سی غفلت ہوئی اور مجھے یہ دن پھر دیکھنا پڑا کہ آج عدالت کے سامنے کٹہرے میں کھڑی ہوں۔

(ملزمہ چند لمحے رُکی اور اس نے ایک لمبی سانس بھری۔ پھر عدالت سے مخاطب ہوکر بولی)

میں جانتی ہوں کہ سزا سے نہیں بچ سکتی، لیکن اس سے پہلے بس اتنی مہلت چاہتی ہوں کہ بلھدر سنگھ کی حویلی تک پہونچ کر اپنا کام کر آؤں اس کے بعد یقین مانئے وہاں سے سیدھی یہیں واپس آؤں گی، بھاگ کر کہاں جاسکتی ہوں۔

مجسٹریٹ نے کہا کہ عدالت تمھیں کس اجازت دے سکتی ہے کہ تم ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کرو۔ اور اسے دو سال قید کا حکم سُنا دیا۔

ملزمہ نے یہ حکم سُن کر کہا کہ میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی کہ مردوں کی عدالت کے سامنے عورت ذات کے دُکھ درد کا دُکھڑا رونا عبث ہے۔ یہ کہکر پہلے کٹہرہ پر اس نے دونوں باہیں رکھیں اور پھر سر نیچا کرکے مُنھ چھپا لیا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر سر اونچا کیا اور بولی کہ "بہتر ہے دو برس اور سہی، اس کے بعد تو شاید آپ سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

کشن پرشاد کول

باب الاستفسار

عربی کے ایرانی و افغانی شعراء

(جناب محمد خلیل اللہ خانصاحب - بریلی)

عربی شاعری کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کی فتوحات عجم کی طرف وسیع ہوئیں تو وہ ایرانی لٹریچر سے بھی متاثر ہوئی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تاثر صرف اسی حد تک تھا کہ عربی شاعری میں ایرانی انداز بیان کی جھلک پیدا ہوگئی، یا یہ کہ خود ایرانیوں اور افغانیوں میں بھی کوئی قابل ذکر شاعر عربی کا پیدا ہوا۔

اگر ایسا ہوا تو ازراہ کرم دو چار کا نام معہ مختصر حالات اور نمونۂ کلام کے سپرد قلم فرمایئے۔

(نگار) استفسار کا موضوع بہت دلچسپ ہے، لیکن افسوس ہے کہ میں خاطر خواہ اس کا تفصیلی جواب پیش نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے کافی وقت اور پوری چھان بین کی ضرورت ہے "عربی شاعری پر عجم کا اثر" خود ایک مستقل تصنیف کا محتاج ہے اور ایرآن و افغانستآن کے عربی شعراء کا تذکرہ بھی خاص کاوش چاہتا ہے۔

میری نگاہ سے اس وقت تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جو صرف ان مباحث کے لئے مخصوص ہو۔ اگر آپ نے یہ استفسار اس لئے کیا ہے کہ آپ کوئی کتاب اس موضوع پر لکھ رہے ہیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ اسے ضرور پورا کیجئے۔ اس وقت ابن خلکآن سامنے ہے اور یہ چند نام پیش کرتا ہوں:

(۱) ابراہیم بن العباس صولی - یہ خاندان دراصل ترکی النسل تھا، لیکن بعد کو جرجآن میں آباد ہوگیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کے مورث خراسان کے تھے۔ صولؔ اس کے دادا کا نام تھا جو یزید بن المہلب کے زمانہ میں مسلمان ہوگیا تھا۔

ابراہیم، بعد کو وزیر فضل بن سہل کا ملازم ہوگیا اور ۲۴۳ھ میں بمقام سُرّمن رأے اس نے انتقال کیا۔ شعر و شاعری کے لحاظ سے یہ بڑے رتبہ کا شخص تھا۔ اس کے بعض اشعار جو ابن خلکآن نے نقل کئے ہیں ملاحظہ ہوں:

دَنَتْ بِأُنَاسٍ عن تناءٍ زیارۃٌ   وشطّ بلیلیٰ عن دُنُوّ مزارہا

(قاعدہ ہے کہ کشیدگی کے بعد لوگوں سے ملئے تو اس میں کمی ہوجاتی ہے، لیکن لیلیٰ کا یہ حال ہے کہ اس سے جتنا قریب ہوجئے دوری بڑھتی جاتی ہے)

اولی البریّۃ طُرّاً ان تواسیہ   عندالسرور اللذی واساک فی الحزن

ان الکرام اذا ما اسہلوا ذکروا   من کان یالفہم فی المنزل الخشن

(خوشی کے وقت تمہارے شریک ہونے والوں میں بہتر وہ ہے جو رنج کے وقت بھی تمہارا شریک ہو۔ کیونکہ اچھے لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ہموار زمین پر پہنچکر وہ اپنے اُن ساتھیوں بیٹے یا کسی کو ضرور یاد کرتے ہیں جنھوں نے ناہموار اُن کا منزل میں ساتھ دیا تھا)

کسی عزیز ہستی کی وفات پر لکھتا ہے:-

منزل ہموار

کنت السواد لمقلتی　　　فبکی علیک الناظر
من شاء بعدک فلیمت　　　فعلیک کنت احاذر

تو میری آنکھ کی پتلی تھا، اور اب تجھی پر رو رہا ہوں - اب تیرے بعد جو چاہے مرجائے مجھے پروا نہیں، کیونکہ دنیا میں مجھے صرف ایک تیری ہی موت کا ڈر تھا -

تغزل کے رنگ کے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

ونبئتُ لیلیٰ ارسلت بشفاعة　　　الیّ فہلاّ نفسُ لیلیٰ شفیعہا
اکرم من لیلیٰ علیّ فتبتغی ،　　　بہ الجاہ ام کنت امرأ لا اطیعہا

(مجھے معلوم ہوا ہے کہ لیلیٰ نے کسی کو اپنا سفارشی بنا کر بھیجا ہے - حیرت ہے کہ اس نے خود اپنی سفارش کیوں نہیں کی - کیا کوئی شخص لیلیٰ سے زیادہ معزز ہے جس کی سفارش سے وہ اپنا رتبہ بڑھانا چاہتی ہے یا یہ کہ میں ایسا شخص ہوں جو اسکی بات نہ مانوں گا)

یہ شاعر بھی بہت بڑا تھا اور بڑے بڑے عربی شعراء نے اس کی شاعری کی تعریف کی ہے -

(۲) صدر الدین ابو طاہر احمد سلفة الاصفہانی - شافعی مذہب کا بڑا محدث تھا - جب یہ مصر پہونچا (۵۱۱ھ) تو جوق در جوق حدیث کے طلبہ اس کے پاس آکر استفادہ کرتے - معلوم ہوتا ہے کہ پھر یہیں رہ پڑا کیونکہ ۵۴۶ھ میں والی مصر نے اس کے لئے ایک مدرسہ حدیث تعمیر کرادیا - یہ ۴۷۲ھ میں بمقام اصفہان پیدا ہوا اور ۵۷۶ھ میں بمقام اسکندریہ انتقال کیا -

یہ شاعر بھی تھا لیکن کوئی مجموعہ اس کے کلام کا دستیاب نہیں ہوا - اس کے مرنے کے بعد کاغذات میں سے جو اشعار ملے ان میں سے بعض یہ ہیں:

"جمیل و بُثینہ" کے واقعات عشق و محبت عربی لٹریچر میں کافی شہرت رکھتے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر شاید ابو طاہر نے بھی کوئی نظم لکھی تھی - ذیل کے دو شعر اُس وقت کے ہیں جب جمیل کے مرنے کے بعد بُثینہ نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا - ابو طاہر نے بُثینہ کی زبان اور اپنے قلم سے اسے یوں ظاہر کیا ہے:

وان سلوی عن جمیل لساعة　　　من الدہر ما جاءت ولا حان حینہا
سواء علینا یا جمیل بن معمر　　　اذا مت باساء الحیاة ولینہا

(جمیل کے مرنے کے بعد زمانہ میں سکون و تسلی کی کوئی ساعت میرے لئے باقی نہیں رہی، لیکن اے جمیل، جب تو ہی نہیں، تو پھر زندگی سختی سے گزرے یا نرمی سے، ایک ہی بات ہے)

تغزل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

قالوا نفوس الدار سکانہا　　　وانتم عندی نفوس النفوس

(گھر کے رہنے والوں کو لوگ گھر کی جان کہتے ہیں، مگر میرے لئے تم جان جاں ہو)

(۳) ابو الحسین احمد بن فارس رازی - رَے کا باشندہ تھا اور وہیں ۳۹۵ھ میں اس نے انتقال کیا - یہ بڑا فاضل شخص تھا اور فقہ و لغت کا ماہر - بدیع الزماں ہمدانی اسی کا شاگرد تھا -

اس کے اشعار بڑے پاکیزہ ہوتے تھے - بعض ملاحظہ ہوں :

مرت بنا ہیفاء مجدولة　　　ترکیة تنمی لترکی
ترنو بطرف فاتر فاتن　　　اضعف من حجة نحوی

(ایک ترکی نسل کی پتلی کمر والی نازنین میرے پاس سے گزری جو فتنہ انگیز نگاہوں سے دیکھتی جاتی تھی اور دلیل نحوی سے زیادہ نازک تھی) -
نحو سے مراد گرامر ہے - چونکہ نحو یا قواعد کے دلایل زیادہ تر سماعی ہوتے ہیں اس کے لئے عقلی دلایل کے سامنے ان کی نزاکت یا کمزوری ظاہر ہے -

معلوم ہوتاہے کہ معاش کی طرف سے یہ ہمیشہ فکرمند رہا، چنانچہ لکھتا ہے :

سقی ہمدان الغیث لست بقایل — سوی ذا وفی الاحشاء نار تضرم
ومالی لا اصفی الدعاء لبلدۃ — افدت بہا نسیان ماکنت اعلم
نسیت اللذی احسنتہ غیر اننی — مدین ومافی جوف بیتی درہم

(ہمدان پر خدا باران رحمت برسائے۔ اس کے سوا اور کیا کہوں کہ آنتوں میں آگ لگ رہی ہے اور میں صفائی قلب سے اس شہر کے لئے دعا کرتا ہوں جس سے مجھے یہ فایدہ ہوا کہ جو کچھ جانتا تھا سب بھول گیا۔ اب تو صرف قرض لینا یاد رہ گیا ہے اور گھر میں ایک درہم بھی نہیں)

وقالوا کیف حالک قلت خیر — تقضی حاجۃ وتفوت حاج
اذا ازدحمت ہموم الصدر قلنا — عسیٰ یوما یکون لہا انفراج

(لوگ پوچھتے ہیں کیا حال ہے۔ کہتا ہوں، اچھا ہے، بعض ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں اور بعض نہیں، جب سینہ پر غموں کا بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے تو یہ کہکر تسلی کر لیتا ہوں کہ یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے)

(۴) بدیع الزمان ہمدانی — یہ ہرات کا رہنے والا تھا اور پٹھانوں کے لئے انتہائی فخر کی بات ہے کہ ان کی جماعت میں بدیع الزماں ایسا زبردست شاعر و انشا پرداز پیدا ہوا کہ عربی کے بڑے بڑے اہل زبان شعراء نے اسکی فصاحت و بلاغت کی بے انتہا تعریف کی اور نظم و نثر میں اس کا تتبع کیا۔ ۳۹۸ھ میں اس کا انتقال ہوا اور ہرات میں دفن کیا گیا۔

اس کے ایک مدحیہ قصیدے کے دو شعر سنئے :

وکاد یحکیک صوب الغیث منسکبا — لوکان طلق المحیا یمطر الذہبا
والدہر لولم یخن والشمس لونطقت — واللیث لولم یصد والبحر لوعذ با

(اگر بارش کی جھڑی بجائے پانی کے سونا برساتی تو فیض رسانی میں وہ تیرے مماثل ہو سکتی، اسی طرح اگر زمانہ خائن نہ ہوتا، سورج گفتگو کر سکتا شیر شکار نہ کرتا اور سمندر شیریں ہوتا تو تیرے مشابہ ہو سکتا تھا)

(۵) ابوالحسن احمد بن جعفر بن موسیٰ بن یحییٰ بن خالد برمکی - یہ آل برمک میں سے تھا اور بڑا جامع کمالات انسان تھا۔ ۳۲۴ھ میں اس نے وفات پائی اور واسط میں مدفون ہوا۔ شاعری میں بھی اس کا بڑا مرتبہ تھا، رنگ تغزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

فقلت لہا بخلت علیّ یقظی — فجودی فی المنام لمستہام
فقالت لی وصرت تنام ایضاً — وتطمع ان ازورک فی المنام

میں نے اس سے کہا کہ تو بیداری میں تو مجھ سے ملتی نہیں، کبھی خواب ہی میں دیدار کا موقعہ دے۔ یہ سنکر وہ بولی کہ کیا تو کبھی سو بھی جاتا ہے اور پھر اوپر یہ تمنا بھی رکھتا ہے کہ میں خواب میں آکر تجھ سے ملوں !

(۶) صاحب ابوالقاسم اسماعیل طالقانی — بویہ خاندان میں پہلے موید الدولہ کا وزیر رہا پھر ابوالفتح علی بن ابی الفضل کا۔ بڑا فاضل و فاضل نواز انسان تھا۔

عربی لغت کا اتنا بڑا ماہر تھا کہ اس نے ایک لغت المحیط سات جلدوں میں مرتب کیا۔ علاوہ لغت کے وہ دیگر فنون کا بھی ماہر تھا اور ادب و انشاء میں بھی خاص مرتبہ رکھتا تھا اور نزاکت خیال و بداعت اسلوب کے لحاظ سے اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ شراب کے ذکر میں اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

رق الزجاج ورقت الخمر — وتشابہا فتشاکل الامر
فکانما خمر ولا قدح — وکانما قدح ولا خمر

(یعنی ساغر اور شراب دونوں اس قدر صاف و شفاف ہیں کہ کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب ہے شیشہ نہیں اور کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ شیشہ ہے اور شراب نہیں)

یہ ۳۴۱ھ میں پیدا ہوا اور ۳۸۴ھ میں مرگیا۔

افسوس ہے کہ قلت وقت کی وجہ سے میں ابن خلکان کا بھی پورا استقصاء نہیں کرسکا۔ آپ خود جستجو کیجئے اور علاوہ ابن خلکان کے الاغانی، عقد الفرید، مروج الذہب، طبری، ابن اثیر وغیرہ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔ کام آسان نہیں ہے اور برسوں کی محنت چاہتا ہے۔

وقت کی باتیں

جہنم میں ریل

ریگزار افریقہ روئے زمین کا وہ حصہ ہے جسے دنیا کی جہنم کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس جگہ آفتاب کی جبروت و جلال کا یہ عالم ہے کہ سایہ میں بھی پارہ ۱۳۰ درجہ تک چڑھا رہتا ہے، لیکن آپ یہ سنکر حیرت کریں گے کہ اس جہنم میں بھی اب ریل کی پٹریاں بچھائی جا رہی ہیں۔

اس ریلوے لائن سے مقصود یہ ہے کہ شمالی افریقہ کو فرانس کے افریقی مقبوضات سے ملا دیا جائے۔ اس کا طول ۲۲۰۰ میل ہے اور اسوقت ہزاروں لوگ جو ہٹلر کے مقبوضات یوروپ سے بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں، اس لائن پر کام کر رہے ہیں۔

سرکاری طور پر یہ ریلوے فرانس کی ہے اور وشی حکومت نے پانچ ارب فرانک اس کی تعمیر کے لئے منظور کئے ہیں، لیکن درحقیقت یہ سب کچھ ہٹلر کے اشارہ و ایماسے ہو رہا ہے، کیونکہ اس لائن کے مکمل ہونے کے بعد ہٹلر ہی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

اگر یہ ریلوے لائن مکمل ہو گئی تو خشکی کے راستہ سے نازی فوجیں ڈکر تک پہونچ سکیں گی جو جنوبی اٹلانٹک میں مغربی افریقہ کا مشہور بندرگاہ ہے یہاں سے نازی ہوائی جہاز چھ گھنٹے سے کم میں برازیل تک پہونچ جائیں گے اور گوڈ ہوپ کی طرف سے برطانیہ کا بحری راستہ بھی خطرناک ہو جائے گا۔

اب آپ افریقہ کا نقشہ سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ اس ریلوے کی صحیح پوزیشن کیا ہوگی۔ یہاں پہلے سے ایک ریلوے لائن موجود ہے جو بحر روم کے ساحل سے شروع ہوتی ہے اور فرانس کے افریقی مقبوضات (الجزائر) سے گزرتی ہوئی اٹیلس پہاڑ کے جنوبی دامن میں (شہر کولمب بچار) تک چلی گئی ہے۔ دوسری لائن ڈکر سے مقام سیگو تک پائی جاتی ہے اور انھیں دونوں لائنوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے لئے یہ نئی لائن بنائی جا رہی ہے چونکہ ریت پر پٹری نہیں بچھائی جا سکتی، اس لئے یہ لائن گھما پھرا کر صحرا کے اس راستے پر بنا رہے ہیں جو پتھریلا ہے اور اس طرح انجینروں کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ ہاں پانی اور ایندھن کا سوال البتہ مشکل ہے، لیکن اسے یوں حل کیا گیا ہے کہ اس لائن پر ڈیزل انجن استعمال کئے جائیں گے جن میں پانی کا صرف بہت کم ہے اور ایندھن کا کام Pea nuts کے تیل سے لیا جائے گا جو اس حصۂ ملک میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

گاڑی کی رفتار کا اوسط چالیس میل فی گھنٹہ ہوگا گو ضرورت کے وقت وہ ستر میل فی گھنٹہ تک چل سکے گی اور اس طرح بحر روم سے Niger تک دو دن میں پہونچ جائیں گے۔ ہر چند اس لائن کی مستقل تعمیر کے لئے تین سال چاہئے، لیکن عارضی طور پر کام نکالنے کے لئے چھ مہینے کافی ہوں گے اس وقت علاوہ بیس ہزار ہسپانوی باشندوں کے جو پچھلی جنگ اسپین میں یہاں نظر بند کر دئے گئے تھے بہت بڑی تعداد یوروپ کے دوسرے ممالک کے باشندوں کی ہے، جو نازی مظالم سے گھبرا کر یہاں چلے آئے تھے۔

اس لائن کا مرکز اس وقت Bou ہے جو بحر روم سے ۲۰۰ میل جنوب میں واقع ہے۔ یہ ایک گاؤں ہے جہاں بدوی عربوں کے صرف ۸۰ جھونپڑے ہیں، لیکن اب یہ ریلوے مزدوروں کی بہت بڑی کالونی بن گیا ہے۔

یہاں کا حال ایک جرمن باشندے نے (جو ہٹلر کا مخالف ہے) نہایت دردناک الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ مقام اس قدر گرم ہے کہ اس سے پہلے کسی یوروپین سے کام لینا یہاں قانوناً ممنوع تھا، لیکن اب فرانسیسی حکومت تمام ہسپانوی وغیر ہسپانوی پناہ گزینوں سے یہاں سخت محنت لے رہی ہے۔ روزانہ مزدوری ایک فرانک سے کچھ زیادہ ہے، لیکن چیزیں اس قدر گراں ہیں کہ اس رقم سے سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا خوراک کا انتظام بیشک حکومت کی طرف سے ہے، لیکن وہ بھی اتنا بدمزہ ہوتا ہے کہ کوئی کھا نہیں سکتا۔ کام کا اوسط اتنا زیادہ ہے کہ انتہائی محنت کے بعد بھی اسے پورا نہیں کیا جا سکتا اور سزائیں اتنی سخت ہیں کہ معاذاللہ۔ مثلاً ایک سزا یہ ہے کہ پتھر اٹھانے کے تھیلوں کے دونوں سروں سے چمڑا نکال کر تار لگا دیا جاتا ہے تاکہ یہ شانوں میں چبھتا رہے، چنانچہ یہاں کی گرمی میں بسا اوقات تار گوشت کے اندر پیوست ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی جوتا بھی چھین لیا جاتا ہے، تاکہ پاؤں میں چھالے پڑ جائیں۔

لباس کی کمی اتنی ہے کہ بدن پر کپڑے کے تاروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور بیماریوں کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے، کیونکہ افریقہ کے اُس صحرا میں تمام وہ بیماریاں پائی جاتی ہیں، جن سے جانبر ہونا محال ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیکڑوں کی تعداد میں یہاں موتیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن کام بند نہیں ہوتا اور ہٹلر کی یہ ریل، فرانس کے روپیہ اور انسانوں کے خون سے برابر طیار ہوتی چلی جا رہی ہے۔

لڑائی اور ریاضی

لڑائی میں اس وقت جتنے آلات استعمال ہو رہے ہیں ان سب کا تعلق ریاضی سے ہے کیونکہ اُن کی ساخت اتنی نازک و پیچیدہ ہے کہ بغیر ریاضی کی ناپ تول کے وہ مکمل ہو ہی نہیں سکتی، لیکن ریاضی کی ایک شاخ یعنی حساب و اعداد و شمار کا زیادہ عجیب تعلق جنگ کے مصارف سے ہے۔ آلات و مشینری کی ریاضی تو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، لیکن روپیہ آنا پائی کا سمجھنا مشکل نہیں۔

اس سے قبل کسی اشاعت میں ہم موجودہ جنگ کے حیرتناک مصارف کا ذکر کر چکے ہیں، لیکن آج اس مسئلہ کو دوسرے زاویۂ نگاہ سے ملاحظہ کیجئے:

یہ آپ نے بارہا سُنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ کا صرفۂ جنگ ۱۶ ملین پونڈ روزانہ ہے۔ لیکن شاید سولہ ملین کہدینے سے آپ اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے لیکن اگر ہم اسے اعداد میں یوں ظاہر کریں:- (۱۶۰۰۰۰۰۰ پونڈ) تو شاید آپ بہتر طریقہ پر اس رقم کی عظمت کا تصور کر سکیں۔ یہ تو جنگ کے روزانہ مصارف کے اعداد ہیں، لیکن اگر فوجی مالیات کو آپ سامنے رکھیں گے تو اس سے زیادہ طویل اعداد و شمار سے آپ کو واسطہ پڑے گا۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ جنگ زیادہ سے زیادہ چار سال جاری رہے گی اور روز کے مصارف بھی یہی رہیں گے تو اختتام جنگ پر یہ میزان ۲۳۳۶۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ تک پہونچ جائے گی۔ لیکن اس وقت سات حکومتیں برسرِ پیکار ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا صرف اوسطاً وہی ہے جو برطانیہ کا، اس لئے اگر ہم ان تمام حکومتوں کے چار سال کے مصارف کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ دنیا کو ۱۶۳۵۰۰۰۰۰۰۰۰ پونڈ کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

یہ رقم اتنی بڑی ہے کہ ایک ایک پونڈ کے نوٹ بچھا کر آپ ۸۰۰ مربع میل کا فرش طیار کر سکتے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر آپ ہر قدم پر ایک اشرفی پھینکتے جائیں تو آفتاب تک پہونچتے پہونچتے بھی یہ رقم ختم نہ ہو اور اگر ہر منٹ پر ایک اشرفی ڈھالی جائے تو اتنی رقم پوری کرنے کے لئے تین لاکھ سال درکار ہوں گے۔

اس بیان سے تو جنگ کے چار سال کے مصارف بہت معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ حیرتناک ریاضی یہ ہے کہ اگر آپ اس وقت صرف ایک پنی سود در سود کے حساب سے کسی کو قرض دیدیں تو ۶۰۰ سال کے بعد وہ ایک پنی اتنی ہی رقم میں تبدیل ہو جائے گی۔

تعمیر لینن گراڈ کی حیرتناک داستان

اگر لینن گراڈ اسوقت تک جرمنی کے قبضہ میں نہیں آیا تو حیرت نہ کرنا چاہئے، کیونکہ جن مصائب جھیلنے کے بعد یہ شہر تعمیر ہوا ہے وہ جرمن حملہ سے کہیں زیادہ سخت تھے۔ جب ۱۷۰۳ء میں پیٹر اعظم نے ایک شہر بسانے کا ارادہ کیا تو اسنے Neva کے غیر آباد، صحرائی جزیرہ میں ایک ایسے حصّہ کو منتخب کیا جو حد سے زیادہ سیلاب زدہ تھا۔ گرمیوں میں یہاں کیڑے مکوڑوں سے بھری ہوئی کیچڑ کی دلدل ہو جاتی تھی اور جاڑوں میں چاروں طرف چار چار فٹ موٹی تہ برف کی جم جاتی تھی۔ چونکہ یہاں شہر کی بنیاد ڈالنے کے لئے کوئی چیز میسر نہ آسکتی تھی اس لئے پیٹر نے حکم دیا کہ روس کے دوسرے مقامات سے سامان لایا جائے اور اس کے لئے بے شمار مزدور متعین کئے گئے لیکن یہ سامان کہاں سے آتا؟ مجبوراً ایک دوسرے شہر کو جو اس سے قریب واقع تھا، مسمار کیا گیا اور وہاں کا نہ صرف سامان بلکہ وہاں کی آبادی بھی یہاں لائی گئی — یہاں کا قلعہ پانچ مہینے میں طیار ہوا جسکے لئے مٹی دوسرے مقامات سے لائی جاتی تھی۔ جب قلعہ کی تعمیر کے بعد یہاں کچھ آبادی بس گئی تو پیٹر نے حکم دیا کہ شہر آرک انجل کی تمام تجارت یہاں منتقل کیجائے۔ اسی کے ساتھ ماسکو کے تمام بڑے بڑے آدمی، تجار، صناع اور پیشہ ور زبردستی یہاں لائے گئے اس شہر کی قلعہ بندی کا بھی انتظام کیا گیا اور اس قدر انہماک کے ساتھ کہ پیٹر خود نگرانی کرتا تھا اور اسی کے بنائے ہوئے نقشہ کے مطابق تمام استحکامات طیار ہوئے یہانتک کہ آج مضبوط سے مضبوط مشینیں بھی ان استحکامات کو سر کرنے میں آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ پیٹر نے نظام کلیسا میں بھی اصلاح کی۔ پیٹریارک کا عہدہ منسوخ کیا اور خود ہی اسکی جگہ لیلی۔ اسنے روس میں ایک نئی تقویم بھی جاری کی اور بجائے یکم ستمبر کے یکم جنوری کو نوروز مقرر کیا۔ اسنے یہاں چھاپے خانے بھی قایم کئے اور اپنی اڈیٹری میں اخبار بھی جاری کئے، اس نے علوم و فنون کے کالج بھی وہاں قایم کئے اور نظام معاشرت کے ہر ہر پہلو کو سامنے رکھ کر اس میں تبدیلیاں پیدا کیں — یہی وہ بادشاہ تھا جسنے روس میں سب سے پہلے بحری بیڑا قایم کیا اور خود بھی بحری جنگ کی مشق میں حصہ لیا۔ جسوقت پیٹر مرا ہے، لینن گراڈ کی آبادی ۸۰ ہزار تھی، لیکن اب ۳۰ لاکھ سے زیادہ ہے اور یہاں کے [illegible] ۰ ہے۔ جرمانی [illegible] جو کسی وقت پیٹر اعظم نے پیدا کی تھی۔

معمائے ہستی

اثر خامہ: جناب اثر لکھنوی

(حاجی ابو علی الیزدی کی ایک عربی نظم سے متاثر ہو کر)

وہ وقت آیا قریب آخر، کہ ہو گی معزول شب کی ملکہ
بس اب تصرف میں رہ گیا ہے اخیر شب کا اخیر حصہ
بجائے دیہیم اک کرہ ہے کہ جس پہ چھائی ہے تیرگی سی
سیاہ انجم نے کھایا گھونگھٹ، ہوا وہ ظلمت کا چاک پردا
وہ کھولی کرنوں نے اپنی چوٹی، پہاڑ کی چوٹیوں سے اٹکی
سپند وار آسماں کی جانب کہر بھی انگڑائی لے کے ابھرا
وہ پاسکے بو راکیوں کی گھوڑوں کا ہو کے بیتاب ہنہنانا
وہ ہمہمہ ہے وہ غلغلہ ہے کہ جس سے شور نشور پیا
نقیب مشرق نے وا کئے ہیں سنہرے ایوان کے دریچے
وہ اٹھا طوفاں تجلیوں کا، وہ ہو گیا ختم خواب شبنم
حسین و نوخیز روز روشن ترانۂ صبح گا رہا تھا
عجیب دشوار منزلیں ہیں، عجیب پُر ہول مرحلے ہیں
کہیں یہ ویراں پہاڑیاں ہیں کہیں پہ سنسان وادیاں ہیں
اور ان سے بڑھکر مہیب و وحشی کمیں ہیں انساں بطرز حیواں
کہیں کہیں سنسناتے میداں ہیں نخل، جیسے ہو مست بادہ
ہواؤں میں پتوں کا سرسرانا، ابلتے چشمے کی یاد جیسے
کہیں کہیں سبز گھاٹیاں ہیں ہوائیں ہیں جن کو گدگداتی

وہ مملکت ہے نہ دبدبہ ہے، نڈھال ہے چال، زرد چہرہ
ستارہ اک جھلملا رہا ہے نشاں گزشتہ شہنشہی کا
اُدھر بڑھا تاجدار مشرق، اُدھر ردا شب کے سر سے سرکی
وہ کھولا سورج نے اپنا پرچم، پڑھا صبا نے سحر کا کڑکا
ابھی دھند لکا تھا گھاٹیوں میں کہ ان پہ بھی اک لٹک سے لٹکی
ابھر کے سمٹا، سمٹ کے پھیلا، بنے گا غازہ رخ سحر کا
قریب جب تک وہ آئیں آئیں، زمیں ٹاپوں سے کھوندے جانا
ادھر تو کڑکی زمیں کی چھاتی، اُدھر کلیجا فلک کا دھڑکا
وہ دیکھا خورشید خاوری نے فصیل سے چرخ چارمیں کے
نہائے نورانیت کے چشمے میں برگ و بار و بہار باہم
کمر کو باندھا جو کارواں نے روانہ ہونے کو سوئے صحرا
جو اس جگہ زمہریری خطے تو اس جگہ گرم منطقے ہیں
کہیں جو ہیں گھات میں درندے تو غول صحرائیاں رواں ہیں
لہو کا پیاسا، حریص و جابر، کہ جس سے ہو گرگ بھی پشیماں
لچکتے قامت کا لہلہانا کہ جیسے لہلوٹ خود ہے سایہ
برستے پانی کی جھم جھماہٹ، دل حزیں بھی ہو شاد جیسے
وہ بہتی زلفیں، وہ نرم پہلو، کہ بحر کو جھرجھری ہے آئے

قریب ساحل کے سینہ تانے، غریب مانجھی کا دل لُبھانے
تسلیاں دیکے غم بٹانے، غموں کی پھر یاد بھی بھلانے

مگر یہ اُن کے لئے ہے ساماں، امید ہے دستگیر جن کی
وہ جنگی روحوں کا ہے نشیمن، بہشت کی خوشگوار خنکی

اور ایک ہم ہیں کہ اپنا مرکز بجائے فردا کے حال ٹھہرا
یہ سوچ رہتا ہے لحظہ لحظہ کہ زیست کا کیا مآل ٹھہرا

جو وقت کی رہگزر میں ملنے کا جز جدائی نہیں نتیجہ
تو ایسے ملنے کا مدعا کیا، فراق ہے جس کا پیش خیمہ

جدا جو ہونے کو ہم ملے ہیں تو کیا جدا ہو کے پھر ملیں گے
جو پھول مرجھا چکے ہیں اکبار کیا وہ مرجھا کے پھر کھلیں گے

نہ ہوگا ایسا کہ ہوگا ایسا یہ شبہ ہوتا ہے دل میں پیدا
وہ غیب دانی (کہ منکر بہت ہے) یہ کہہ رہی ہو کہ ہوگا ایسا

یہ بات ڈالی ہے کس نے دل میں، کھُلا نہ انساں پہ راز اسکا
نہ کھُل سکا ہے نہ کھُل سکے گا، نہ جانے کتنوں نے سر کھپایا

ملیں تو کیوں اور مل گئے تو جدا پھر اک دوسرے سے کیوں ہوں
یہ ناگزیری، یہ تلخ کامی، کہیں اگر کچھ تو سرنگوں ہوں

مجاز ہم ہیں نہ دخل ہم کو، کبھی لیا عندیہ کسی نے ؟
سپرد تقدیر کر دیا ہے، خدا نے یا اپنی بے بسی نے

کہاں سہانی وہ شام عشرت، تمام نغمہ، تمام راحت
کہاں یہ غمگیں سحر الٰہی، عذاب یکسر، کمال زحمت !

سیاق میں زندگی کے لیکن شمار یہ بھی ہے اور وہ بھی
نہیں ہے تفریق یکسر مو، اگرچہ ہے فرق اور بدیہی

شکستہ دل ہوں، فسردہ خاطر، دماغ جیسے چراغ کشتہ
"نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" مثال حرف غلط نوشتہ

حواس مختل، نظر پریشاں، رگوں میں اک تھرتھری بھری ہو
گزشتنی ہے جہان فانی، جو ہے تو پائندہ ابتری ہے

جسے بھی دیکھو اُسے تغیر، جو شے ہے بیزار کرنے والی
یہاں کا جینا بھی ہے خیالی، یہاں کا مرنا بھی ہے خیالی

شباب کے دوستوں کو پہونچے سلام آخر مری طرف سے
یہ مانا ہم پھر کبھی ملیں گے، مگر نہ اس طرح پھر ملیں گے

یہ وقت کا پاپلٹنے والا، کرے گا طیار اور خاکہ
ہمیں وہ ہوں گے مگر نہ ہوں گے، فساد ایسے کھڑے کریگا

جو صبح کی ٹھنڈی روشنی تھی، ہوئی تمازت جب اُس میں پیدا
تو دن ڈھلا اور شام آئی، اور اُس کا انجام کار ہے تڑکا!

وداع ہوتا ہوں اب میں تم سے، یہی تھا انجام آشنائی
صدا جرس کی ہو سر بصحرا، یہ دل کی دھڑکن پیام لائی

یہ ہو کے بن اور یہ تپتے میداں کہ ذرہ ذرہ ہو شعلہ ساماں
خدا کی اک ذات کے سوا ہے یہاں کسے زندگی کا امکاں

خیال ماضی کے عود کرتے ہیں اس خرابے میں آہ کیا کیا
تغیرات اور اُن کے اسباب کرتے ہیں انتباہ کیا کیا

نہ جانے کھو جاتی پھر کہاں ہیں اُفق سے ہو ہو کے پار نظریں
تلاش کس کی ہے، آرزو کیا، جو اُٹھتی ہیں بار بار نظریں

نگاہ مغموم کو ستاتی ہیں کیوں یہ پرچھائیاں اُبھر کے
نکل پڑے ہیں کہاں سے یارب یہ قبر کے تیرہ تام سائے

سوالوں کا ایک سلسلہ ہے، کہاں سے آئے کدھر ہے جانا
اگر ہے جانا تو کب ہے جانا، قضا نے ڈھونڈا ہے کیا بہانا

خیال میں انتشار تاہم شدید و بے سود یہ تمنا
کہ پڑھ رہے انسان کلک قدرت نے جو ہے اُسکی جبیں پہ لکھا

دوام دو اور اُنکے مابین ایک نقطے پہ ہم ٹکے ہیں
وہ خوفناک اُنکے بھید جنکے ہجوم شگون میں ہم گھرے ہیں

وہ سوگوار اُنکی ظلمتیں ہیں ستم جو آنکھوں پہ توڑتی ہیں
یہ گھُپ اندھیرا یہ وحشی موجیں، یہ رقصِ گرداب، یہ ہوائیں
جنھیں میسر ہے امن ساحل ہماری اُن کو خبر ہو کیونکر
شراب اور عشق کے مغنّی کا گیت تھا جو ابھی سُنایا
مگر وہ کمبخت جس کی عمر طبیعی ٹھہری ہے تین بیسی
مرے حواسوں کو باختہ کرتی ہیں نہ خوش کرنے والی خوشیاں
کبھی تو اک ساتھ سب کا حملہ، کبھی مقابل ہر ایک تنہا
عجیب خوش فہم تھا وہ داناکہ جس نے یوں حل کیا معمّا
انیس خلوت جو دخت رز ہو تو اُٹھے کچھ لُطف زندگی کا
لگائی صوفی نے ہانک بڑھکر کہ "خاک ہے جزو خاک ہوگا"
تجھے ملی روح کی جو دولت تو فرض ہے یہ پتا لگانا،
مگر یہ تھا جستجو کا ثمرہ، ندامتیں، رونا، کڑھنا، مرنا
یہ اُس کا نغمہ تھا جو فنا و بقا کے چکّر میں پڑ گیا ہے
گناہوں پر اشکبار ہوکر، کہا یہ ہم سے مسیحیت نے
یہ لفظ کچھ کم ہیں یا زیادہ، الٰہی اک آن کو دکھا دے
یہ قول ہے ایک ناستک کا، "خودی کو پوجو، خدا تمھیں ہو"
مجھی میں جلوہ ہے نور حق کا، میں ہی حقیقت، میں ہی صداقت
اگر تھا منصور مرد دانا، تو اُس سے بڑھ چڑھکے تھے وہ دانا
یہ مانا ہر قطرے سے لہو کے صدائیں "حق حق" کی آرہی تھیں
"جو چاہو وہ کھاؤ اور پیو تم، مگن رہو، چھوڑو فکر کل کی
یہ قول اک بادشاہ کا ہے، بجا گیا چین کی جو بنسی،
یہ آدمی ننگ آدمیت جو گھاس سمجھا ہے زندگی کو
نہاد اسکی ہے چونکہ خاکی، یہ پستیوں کی طرف ہے مائل
مگر بتائیں وہ جنکی پرداخت اچھے ماحول میں ہوئی ہے
خواص تم میں کہاں سے پیدا ہوئے ہیں گھوڑوں اور گدھوں کے

کبھی جو مٹتے نہیں مٹائے، نقوش وہ گہرے چھوڑتی ہیں
وہ چیخ کے بعد کی خموشی، وہ چڑھتے طوفاں کی سائیں سائیں
خبر ہو لیکن نہ آنکھ نم ہو، خبر نہ ہونا ہی اس سے بہتر
" بہشت اور حور عین و کوثر کے خواب جو دیکھتا رہا تھا!
جو اک طرف مختصر ہے کتنی تو اک طرف ہے طویل کیسی
شراب، حوریں، محبت اور اُن سے جو ہیں منسوب ساز و ساماں
پناہ مانگو، پناہ مانگو، کہ ہوگا مشکل چھُڑانا پیچھا
خرد ہوئی خشک اور کہنہ، اسے ہے لازم طلاق دینا
نکاح ثانی اسی سے کیجئے... کوئی ٹھکانا ہے ابلہی کا!
مراد اس سے فنائے تن ہے، نہیں ہے کچھ روح سے علاقہ
کہ اصل مقصود اس کا کیا ہے، کہاں ہے اس چشمے کا خزانہ
تذبذب اچھا ہے چشم بینا کہ راہ یہ اختیار کرنا؟
شکار اپنے فریب کا ہے، شکار کرنے چلا تھا "لاشے"!
طمانیت وہ سنی نہ دیکھی جو بخشتی ہے میری "سلطنت" نے
وہ خلد جلوے سے جس کے کھُل جائیں دیدہ و گوش آدمی کے
خدا نہیں ہو تو کیا ہو پھر تم، اگر خدا سے جدا نہیں ہو؟
خدا نہیں ماسوا "انا" کے یہی ہے روشن بس ایک آیت
کہ جن کے سنگ و سناں کا آخر غرور اُس کا ہوا نشانا
وہ ہڈیاں چور چور ہوکر کسی کے بھی جوڑے جُڑ سکی تھیں؟
گراں بغیر اس کے زندگی ہے شراب کے ایک جرعہ سے بھی"
زبان ملتی جو خوک کو بھی تو کہتا "یہ تو ہے میری بیتی!"
یہ مر کے بنتا ہے گھاس پھر خود، مویشی چرتے ہیں پھر اسی کو
ذلیل خوشیوں کو ڈھونڈتا ہے جو اسکے حق میں ہیں سم قاتل
بلندیوں پر ہے جنکا مسکن، تمھاری مت کیوں پلٹ گئی ہے
تمھاری غیرت کو کیا ہوا ہے، یہ کیسے اطوار تمنے سیکھے

جب ایک زاہد سے میں نے پوچھا، یہ بڑبڑاتا ہوا وہ گزرا
حیات بعد الممات سب کچھ، نہیں ہے دُنیا کا کچھ بھروسا

یہ کہہ کے بیت الحزن کی جانب چلا وہ کرنے کو آہ و زاری
بیادِ عصیاں، بخوفِ دوزخ، بہ بیمِ پرسش، بہ ترس خواری!

یہ زیرکی تیری اللہ اللہ حیات مابعد پر تو ایقاں
مگر فسانہ جو عہدِ ماضی، تو حال اک خواب ہے پریشاں!

بتا تو کچھ راز زندگی سے بھی تجھ کو اے شخص آگہی ہے
کہ عیش جنت، عذاب دوزخ ہی کی فقط رٹ لگی ہوئی ہے

جوان تو، پیرزال دنیا، عظیم وہ ہے، حقیر تو ہے
مثال ذرہ گریز پا ہے، خودی کا اپنی اسیر تو ہے

سمجھنا اپنے کو حاصلِ کُل تری دنائت ہے گمرہی ہے
وہ تو کہ اک خواب ہے خراماں، خبر نہ سر کی نہ پیر کی ہے

نہ تجھ کو قدرت، نہ تجھ میں طاقت، ہما ہمی دیکھنے ہی کی ہے
ابد کی بنیاد اور تجھ پر، چلا چلی جب لگی ہوئی ہے!

تو اک دقیقہ کی بے ثباتی وہ جبکہ ہو سانس آتی جاتی
یہ طبقہ اسفل، یہ تیری حالت، مگر یہ دعوے، خودی کے ماتی!

یہ تیری ہستی کہ جیسے طائر قفس میں ہو دور آشیاں سے
قفس بھی وہ سخت گیر مرضی، ٹلے نہ جو آسماں کے ٹالے

مگر یہ پھر بھی، یہ تجھ کو حیرت، یہ کیوں ہے، کب سے ہے، وجہ کیا ہے
کہاں سے آئے، کہاں ہے جانا... پھر ایک حیرت! یہ قصہ کیا ہے؟

تو اس ارادے کی کیا جنوں ہے، خبر ہے آیا جہاں میں کیونکر
دو پائے دو جانور ملے تھے.... اور آگے اک شرمناک منظر!

ترا وجود اس کا ہے نتیجہ مہیا تھا اک دو خواہشوں کا
یہ تیرا نقشہ اور اُس پہ غرّہ کہ تیری خاطر ہے سب تماشا!

وہ تو کہ بچوں کی طرح حیران ہو کے ہر شے کو دیکھتا ہے
نکل کے ظلمت سے اول اول دو چار انوار سے ہوا ہے

فنا کے جھونکوں میں ڈر رہا ہے کہ جیسے آندھی میں خشک پتا
پھوار بوندوں کی پا ہو جیسے، ہوا نے پیہم جسے نچوڑا

تجھے نہ تھا اس سے پہلے بہرہ تمیز سے کچھ نہ ہوش سے کچھ
نہ تجھ کو فردا کی آگہی تھی، نہ واقفیت تھی دوش سے کچھ

ہزار خطروں میں تو گھرا ہے، ہمیشہ گریاں ہے شاد خنداں
کبھی ہے سینہ تنور سوزاں، کبھی ہے آہوں کا گرم طوفاں

یہ تیری برخود غلط پسندی، یہ کس مپرسی کا اسپ عالم
کبھی ہے بازیچہ گاہ حرماں، کبھی ہے پامال غصہ و غم

تجھے نہیں علم کیوں تو آیا، کہاں سے آیا، کہاں ہے جانا
نہ وقت جانے کا تجھ کو معلوم، پھر بھی بنتا ہے تو سیانا

تجھے ہے لیکن گھمنڈ پھر بھی کہ بہترین شاہکار تو ہے
یہ خواب بیداریوں میں احمق، بڑا بنا ہوشیار تو ہے

حریص عیش دوام، غفلت میں تیرے لیل و نہار گزرے
بہت ہی ناکامیاب گزرے، بہت ہی ناخوشگوار گزرے

یہ زرد چہرہ، یہ سرد اعضا، یہ جسم لاغر، یہ بیٹھی قسمت
مگر یہ کاوش فسانہ کہہ دل... جو دے بھی مہلت زباں کی لکنت

(**نگار**) جناب اثر نے یہ نظم عربی کی ایک نظم سے متاثر ہو کر لکھی ہے جو انگریزی زبان میں منتقل کی گئی تھی - ہم نہیں کہہ سکتے کہ عربی کی اصل نظم کتنے تصرف کے بعد انگریزی میں پہونچی لیکن جناب اثر نے جس انداز سے اسے اردو میں پیش کیا ہے اسے دیکھ کر ـــــ برتنش پیراہن گُل تنگ بود ـ کا سماں سامنے آجاتا ہے ـ

ایسا مشکل موضوع، ایسے عمیق خیالات اور یہ سلجھا ہوا اسلوب بیان! ایسے "ملکۂ شعر" کا مالک یقیناً "ملک الشعراء" ہے ـ

(بہ سلسلۂ صفحہ نمبر ۲) اس لئے اب اگر اسٹالن گراڈ پر جرمن قبضہ ہو بھی جائے تو یہ اس کی کامیابی نہ ہوگی، بلکہ اسے روس کی کامیابی خیال کیا جائے گا جس نے ہٹلر کے پروگرام کو درہم برہم کر دیا اور امسال قفقاز میں اس کے کامیاب اقدام کو دشوار بنا دیا۔ اگر اسٹالن گراڈ پر ہٹلر کے پروگرام کے مطابق ستمبر میں قبضہ ہو جاتا تو آج جنگ کی صورت غالباً مختلف ہوتی، یعنی بہت ممکن تھا کہ بحر اسود کی طرف باطوم تک نازی فوجیں پہونچ گئی ہوتیں، اور بحر اخضر میں استراخان تک اس کا قبضہ ہو گیا ہوتا اور اگر وہ باکو کے چشموں تک نہ پہونچ سکتیں تو بھی قفقاز اور شمالی روس کا تعلق منقطع ہو جانا یقینی تھا۔ اسی کے ساتھ ممکن تھا کہ مصر کے محاذ پر بھی جرمن اقدام بدستور جاری رہتا، لیکن اب یہ سب کچھ دشوار ہو گیا ہے اور اگر فی الحال جاڑوں میں نازی فوجوں کو اسٹالن گراڈ میں سر چھپانے کی فرصت مل بھی جائے تو وہ روس کی ان طیاریوں کو کسی طرح نہیں روک سکتیں، جن سے پھر آیندہ گرمیوں میں اسے مقابلہ کرنا ہے اور جو پھر ہٹلر کے بنے بنائے پروگرام کو درہم برہم کر سکتی ہیں ——— بہرحال وقت سے جو فایدہ جرمنی کو پہونچ سکتا تھا وہ اسے حاصل نہ ہو سکا اور معرکۂ اسٹالن گراڈ کو جو اہمیت پہلے حاصل بھی اب وہ باقی نہیں رہی

اکتوبر میں بحر الکاہل (پاسفک) کے اندر بھی ہلچل پیدا ہوئی، اور جزایر سلیمان کے لئے جو مقابلہ جاپان و امریکہ میں شروع ہوا تھا، وہ بدستور جاری ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس وقت تک جو کچھ ہوا ہے، وہ اتحادیوں ہی کے حق میں ہوا ہے، لیکن اسی کے ساتھ جاپان کو بھی اب اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ پچھلے سال جن حالات میں اس نے جنگ شروع کی تھی وہ اب بدل گئے ہیں، اور سنگاپور و برما کی سی آسان کامیابیاں اب بہت دشوار ہیں۔ جاپان نے آسام کے بعض مقامات پر ہلکی سی ہوائی تاخت کر کے، ہندوستان اور خصوصیت کے ساتھ بنگال میں بھی بے چینی پیدا کرنا چاہی، لیکن اس کا یہ وار ادچھا ثابت ہوا اور جب تک بحر الکاہل اور چین میں اس کا دامن الجھا ہوا ہے، ہندوستان کا گریبان محفوظ نظر آتا ہے

مصر کے محاذ پر، طبروق کے سقوط کے بعد، بالکل پہلی مرتبہ اتحادی فوجوں نے جارحانہ اقدام شروع کر دیا ہے اور محوری فوجیں مدافعت پر مجبور ہو گئی ہیں۔ نتیجہ جو کچھ ہو، لیکن اس سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ مصر پر خطرات کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹ چلے ہیں، اور جب تک کوئی دوسری صورتِ حال نہ پیدا ہو، موجودہ حالات اطمینان بخش ہیں

اس دوران میں برطانیہ نے جرمنی کے بعض اہم مقامات پر ہوائی حملے بھی کئے اور ان حملوں کی نوعیت بھی مختلف تھی، یعنی ان سے معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ جو کچھ کر رہا ہے کافی اعتماد کے ساتھ کر رہا ہے اور جرمنی کو فضائی جنگ میں پوری قوت کے ساتھ چیلنج دینے پر آمادہ ہے

بحر روم میں جزیرۂ مالٹا پر شروع ہی سے محوری حملے ہو رہے ہیں اور اس دوران میں ان کی شدت بہت زیادہ ہو گئی ہے، لیکن اس مختصر سے جزیرہ کا اب تک باقی رہنا اس کا ثبوت ہے کہ برطانیہ کی قوت مدافعت نے فضا میں بہت ترقی کر لی ہے اور چونکہ مالٹا اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے مصر و مشرق قریب کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے بحر روم میں محوری خطرات کا مشرق کی طرف پھیلنا بھی فی الحال ممکن نہیں۔ بہرحال یہ بات اب روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ جہاں تک وقت کا تعلق ہے اس سے اتحادی فایدہ اُٹھا رہے ہیں اور لڑائی کی مدت جتنی زیادہ بڑھتی جا رہی ہے، محوری کامیابیوں کا امکان بھی اتنا ہی ضعیف ہوتا جا رہا ہے

اس لڑائی میں وقت کا عنصر امریکہ کی شرکت کی وجہ سے اتحادیوں کے حق میں زیادہ مفید ہو گیا ہے، کیونکہ ہر آنے والے دن کے ساتھ امریکی طیاریاں بڑھتی جا رہی ہیں اور امریکہ کی زمین نے وہ سونا جس سے وہاں کے تہ خانے دھنسے جا رہے تھے، اب بحری و ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور بموں کی طیاری کے لئے اُگل دیا ہے، چنانچہ جو اعداد و شمار وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۳ء کے آخر تک دُنیا کے تمام سمندروں میں ہر جگہ اسی کے جنگی جہاز بکھرے ہوئے نظر آئیں گے اور دُنیا کی فضا کا کوئی حصہ ایسا نہ ہوگا جو اس کے طیاروں کی پرواز سے بچ رہا ہو

بہرحال جو حالات اس وقت پیش نظر ہیں وہ نہایت ہولناک مستقبل کا پتہ دے رہے ہیں اور جیسا کہ ہم پچھلے مہینے ظاہر کر چکے ہیں اس جنگ کے جلد ختم ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور کسے خبر ہے کہ جب یہ آگ سرد ہونے پر آئے گی تو روئے زمین کا کتنا حصہ خاک سیاہ ہو چکا ہوگا۔

آئندہ جنوری کا نگار "ریاض نمبر" ہوگا

بزم امیر و اسیر کے آخری یادگار ریاض خیرآبادی (مرحوم) کی شاعری سے کون واقف نہیں لیکن اس زندہ دل ہستی کے ادب اردو پر اور کتنے احسانات ہیں، اس سے کم لوگ آگاہ ہوں گے۔ نگار کے اس خاص نمبر میں آپ کو ریاض مرحوم کے لطائف شعر و سخن، ان کے خود نوشت سوانح حیات، نثر نگاری کے معیاری نمونے، ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بسیط تبصرہ اور انتخاب کلام سبھی کچھ نظر آئے گا۔ ریاض مرحوم کی زندگی کا وہ زمانہ جب ان کے ریاض الاخبار اور فتنہ کی دھوم مچی ہوئی تھی، اب بالکل بھلایا جا چکا ہے، لیکن نگار کے اس نمبر میں اس کو پھر سامنے لایا جائے گا اور اُن لطیف صحبتوں کی یاد پھر تازہ کی جائے گی جو ریاض اور اُن کے زمانہ کے لئے مخصوص تھیں۔

اس نمبر میں ریاض کی تمام تصانیف کے سلسلہ میں ناول نظارہ کا بھی اقتباس دیا جائے گا جو اسوقت تک شایع نہیں ہو سکا۔ الغرض یہ نمبر ادبی دلچسپیوں کا نہایت عجیب و غریب مجموعہ ہوگا اور اس کی ضخامت نگار کی موجودہ ضخامت سے کم از کم تگنی ہوگی اور اگر کاغذ میسر آگیا تو شاید اس سے بھی زیادہ — حضرت ریاض کی تصویر بھی دیجائے گی اور سرورق بھی نفیس کاغذ کا ہوگا۔

غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت علاوہ محصول ڈاک ڈیڑھ روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ لیکن خریداران نگار کو حسب دستور یہ نمبر ان کے سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا۔

منیجر

"نگار" کے متعلق

آئندہ ماہ دسمبر سے نگار کا موجودہ حجم کچھ بڑھ جائے گا اور خط بھی کچھ واضح ہو جائے گا، لیکن یہ تمام کتر بیونت اسی وقت تک ہے، جب تک کاغذ نہیں مل رہا، لیکن جب یہ دشواری جاتی رہے گی تو نگار پھر اُسی کاغذ اور اُسی مسطر پر شایع ہوگا جو جنگ سے پہلے تھا اور سرورق بھی بہترین کاغذ کا علحدہ لگایا جائے گا اور ضخامت بھی بڑھ جائے گی۔

ہر چند مضامین کے لحاظ سے اب بھی نگار میں ۸۰ صفحات سے زیادہ کا مواد دیا جاتا ہے، لیکن خط باریک ہونے کی وجہ سے بعض حضرات کو دقت ہوتی ہے، جس کا ہمیں احساس ہے۔

ہر چند جو زمانہ آنے والا ہے اس میں کاغذ کی کمیابی، نایابی کی حد تک بڑھ جائے گی لیکن آپ مطمئن رہئے، نگار بہر حال جاری رہے گا اور مضامین کے لحاظ سے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی، گو ظاہری شکل و صورت اس کی اچھی نظر نہ آئے۔

نگار اہل نظر کا پرچہ ہے نہ کہ تماشائیوں کا اس لئے ہمیں امید ہے کہ قارئین نگار اسکی عارضی بدنمائی کی پروانہ کریں گے۔

"منیجر نگار"

نگار

چندہ سالانہ صہ ر — اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۲ — فہرست مضامین دسمبر ۱۹۴۲ء — شمار ۶

ملاحظات ---------- ۱

بعض عربی اور انگریزی الفاظ کی مماثلت ---------- ۴

لکھنؤ کی زبان ----- محمد باقر شمس لکھنوی ---- ۸

داستان انقلاب چین ---- محمد عتیق صدیقی ---- ۱۷

مکتوبات نیاز ---------- ۲۶

باب الاستفسار ---------- ۲۹

کشکول ---------- ۳۲

منظومات ----- مرزا جعفر علی خاں اثر بی-اے --

----- علی سجاد قہر - نبی احمد ----- ۳۵

انتخاب کلام حسرت ترمذی ---------- ۳۷

مطبوعات موصولہ ---------- ۳۸

قصۃ الجودی والقرآن ---- مولانا مقبول احمد صمدنی --- ۱

ملاحظات

طلوعِ اُمید

خدا خدا کرکے پورے تین سال کے بعد، جنگ نے اب وہ صورت اختیار کی ہے، جسے ہم طلوعِ امید کہہ سکتے ہیں۔ نومبر کے آغاز کیا بلکہ وسط تک اسٹالن گراڈ کی حالت ایسی نازک تھی کہ ہر وقت اس کے سقوط کی خبریں سننے کا انتظار کیا جا رہا تھا اور سرما کا موسم جتنا زیادہ قریب ہوتا جا رہا تھا، نازی فوجوں کی کوششیں اتنی ہی زیادہ سنگین ہوتی جا رہی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ اگر وسط نومبر تک روسی افواج اس دباؤ کو جھیل گئیں تو پھر یہاں کی شدید برفباری اور سُرخ افواج کی عدیم النظیر مقاومت کے سامنے ہٹلر کو کسی طرح کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اور آخرکار یہ خیال پورا ہو کر رہا۔ چنانچہ اسوقت جو خبریں روس کے محاذ سے آرہی ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اسٹالن گراڈ، بلکہ بندرگاہ ٹواپسے، گروزنی کا پٹرولی علاقہ، لینن گراڈ اور ایلمن جھیل، ہر جگہ روسی فوجوں نے جارحانہ اقدام شروع کر دیا ہے اور نازی فوجیں اب اپنا سر چھپانے کی فکر میں برابر پیچھے ہٹتی جا رہی ہیں۔

دفعتاً نقشۂ جنگ میں یہ انقلاب کیوں پیدا ہوا؟ اس کے کئی سبب ہیں، سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ روسی فوجوں نے آخر دم تک ہمت نہیں ہاری اور نازی ذرایع جنگ کو اتنا تنگ و محدود کر دیا کہ وہ انسے کوئی مزید قوت حاصل نہ کر سکتا تھا، ہٹلر کو

یقین تھا کہ وہ جاڑے شروع ہونے سے پہلے پہلے ایک طرف اسٹالن گراڈ اور دوسری طرف گروزنی کے علاقہ پر قبضہ کر کے اپنی فوجوں کے لئے جائے پناہ بھی پیدا کر لیگا اور پٹرول حاصل کر کے وہ مستقبل کو بھی زیادہ امید افزا بنا سکے گا، لیکن چونکہ لاکھوں سپاہیوں کی قربانی چڑھانے کے بعد بھی ہٹلر اس میں کامیاب نہیں ہوا، اس لئے قدرتاً اس کی فوج کو مایوس ہونا چاہئے تھا اور جب کوئی فوج مایوس ہو جاتی ہے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ وہی ہوا کرتا ہے جو اس وقت روس کے محاذ پر نظر آ رہا ہے

دوسرا بڑا سبب اتحادیوں کی وہ زبردست شاطرانہ چال تھی جس نے جرمنی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی توجہ روس کی طرف سے ہٹا کر افریقہ کی طرف مبذول کرے۔ کچھ دن قبل جب جنرل رومل کی فوجیں اتحادی فوجوں کو تبروک سے نکال کر اسکندریہ کے حدود تک ڈھکیل چکی تھیں اور مصر کے محاذ پر دفعتاً سناٹا سا چھا گیا تھا، تو لوگوں نے یہی قیاس کیا تھا کہ جنرل رومل مصر پر حملہ کرنے کی زبردست طیاریوں میں مصروف ہے اور جب یہ طیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو حملہ شروع ہو جائے گا لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ جسے نہ صرف اتحادی بلکہ ہٹلر بھی اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور وہ حقیقت وہ تھی جسے اب امریکی افواج نے الجیریا پر قبضہ کر کے دفعتاً بے نقاب کر دیا ہے

ہٹلر، اتحادیوں کی اس چال سے بےخبر نہ تھا وہ جانتا تھا کہ الجیریا کی طرف امریکی فوجیں آہستہ آہستہ بڑھتی آ رہی ہیں، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جس وقت الجیریا پر امریکی حملہ ہوگا اسی وقت برطانیہ کی آٹھویں فوج بھی مشرق کی طرف سے حملہ کر دے گی اور وہ اسی لئے چاہتا تھا کہ اسٹالن گراڈ کا فیصلہ کر کے جلد سے جلد افریقہ کے اس جدید محاذ پر اپنی پوری قوت لے آئے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوا اور آخرکار اُسے لیبیائی سرزمین کو چھوڑنا پڑا

جب صورتِ حال یہ پیدا ہوئی اور ہٹلر نے سمجھ لیا کہ اب بحرِ روم بالکل ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو اس نے فوراً فرانس کے اُس جنوبی حصہ پر بھی قبضہ کر لیا جو وشی حکومت کے پاس تھا اور تیونسیا میں بھی فوجیں اُتار دیں، تاکہ وہ بحرِ روم پر اتحادی قبضہ کے راہ میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کر سکے

چونکہ اب اتحادیوں کے لئے یوروپ میں دوسرا محاذ پیدا کرنے کے لئے آسان صورت یہی ہے کہ اٹلی پر حملہ کر دیا جائے اور اس حملہ کے لئے پہلے شمالی افریقہ کے تمام ساحلی مقامات پر قبضہ ہو جانا ضروری ہے اس لئے اصل معرکہ کی جگہ اب تیونسیا ہے اور یہیں مستقبل کی جنگ کا فیصلہ ہونا ہے

اگر آپ نقشہ اُٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ تیونسیا، افریقہ کا وہ حصہ ہے جو اٹلی اور اس کے جزیرۂ سسلی سے اتنا قریب واقع ہے، کہ بغیر اس پر قبضہ کئے ہوئے نہ بحرِ روم پر اتحادی اقتدار قایم ہو سکتا ہے اور نہ اٹلی میں فوجیں اُتاری جا سکتی ہیں اس لئے مصر و لیبیا کی لڑائی تو یقیناً ختم ہو گئی ہے، لیکن بحرِ روم کی حقیقی جنگ اب شروع ہوئی ہے

خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیونسیا اور اٹلی دونوں جگہ جرمن فوجیں کافی تعداد میں پہونچ چکی ہیں اور اگر ہٹلر وشی حکومت سے اس کا بیڑا حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا جو تولون میں پڑا ہوا ہے تو پھر اس لڑائی کے فیصلہ کی جلد توقع نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بزرٹا کی طرف جو تیونسیا کی نہایت محفوظ بندرگاہ ہے امریکی فوجیں الجیریا کی طرف سے بڑھ رہی ہیں اور برطانوی فوجیں لیبیا کی طرف سے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں اچھا رن پڑے گا۔ لیکن اگر جنگ میں کچھ اور پیچیدگی پیدا نہ ہوئی تو اتحادیوں کی کامیابی کا بہت قوی امکان ہے

پیچیدگی پیدا ہونے کی دو صورتیں ہیں ۔۔۔۔ ایک یہ کہ وشی حکومت بھی اتحادیوں کے خلاف اعلان جنگ کردے یا اپنا بیڑا جرمنی کے حوالہ کردے، دوسری پیچیدگی اسپین سے متعلق ہے ۔یعنی بالکل ممکن ہے کہ جرمن فوجیں جو جنوبی فرانس میں اسپین کی سرحد تک پہونچ گئی ہیں، اسپین کے اندر داخل ہو جائیں اور خشکی کی طرف سے جبرالٹر پر حملہ کردیں ۔ ہرچند اسپین ابھی تک اپنی غیر جانبداری پر قایم ہے ۔لیکن اس کی یہ حالت غالباً اب عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتی ۔ اتحادیوں نے تو اسے اطمینان دلا دیا ہے کہ وہ اس کی غیر جانبداری کا پورا احترام کریں گے، لیکن ہٹلر کی طرف سے (جس کی فوجیں اس کے سر پر کھڑی ہیں) وہ غیر مطمئن ہے، اس لئے افریقہ اور بحرِ روم کی جنگ کے نتیجہ کے متعلق ابھی سے کوئی فیصلہ کرلینا مناسب نہیں ہے، کیونکہ ہٹلر کی حالت اسوقت ایک باؤلے کتے کی سی ہے جس کے سامنے اب دوست و دشمن کا سوال نہیں، بلکہ صرف کاٹنے اور حملہ کرنے کا ہے اور اس صورت میں ایک شخص ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار ہوجاتا ہے

اس دوران میں دوسری اتحادی کامیابی بحرِ پاسفک میں ہوئی ہے، جو بہ لحاظ نتائج بہت زیادہ اہم ہے ۔جزائر سلیمان کا علاقہ کچھ عرصہ سے جاپان و امریکہ کے درمیان استخوان جنگ بنا ہوا تھا اور جائے وقوع کے لحاظ سے اس کی اہمیت ایسی نہ تھی کہ فریقین میں سے کوئی اسے نظر انداز کردے ۔ لیکن اب اس کا بھی قریب قریب فیصلہ ہوچکا ہے اور جاپان کو اس دوران میں اتنا شدید نقصان پہونچا ہے کہ اس کی تلافی فی الحال ممکن نہیں، الغرض مشرق و مغرب دونوں طرف اب حالات سازگار ہوتے نظر آتے ہیں اور امید ہے کہ آیندہ سال کے آغاز تک جنگ کا نقشہ زیادہ امید افزا صورت اختیار کرلے گا

ممالک اسلامی میں ایران کی حالت بدستور ہے اور جب تک روس اور مشرقِ ادنیٰ کی طرف سے نازی خطرہ بالکل دور نہ ہوجائے، وہاں کی سیاست میں کوئی تغیر پیدا ہوتا نظر نہیں آتا

مصر بھی اپنی اسی پالیسی پر قایم ہے جس کا اعلان وہ اس سے قبل کرچکا ہے اور چونکہ نازی خطرہ اب اس سے دور ہوچکا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اتحادیوں کے ساتھ اس کے تعلقات میں کوئی تبدیلی پیدا ہو

ترکی ہنوز غیر جانبدار ہے، لیکن کچھ عرصہ سے اس کا میلان اتحادیوں کی طرف بہت زیادہ ہوگیا ہے اور انقرہ ریڈیو سے جو خبریں نشر کی جارہی ہیں ان میں کھُلم کھُلا نازیوں کی مخالفت کا پہلو پایا جاتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کی حکومت نتیجۂ جنگ کی طرف سے مطمئن ہے اور اب کہ نازی سیلاب بجائے بحرِ اسود کے بحرِ روم کی طرف منتقل ہوتا نظر آرہا ہے، ترکی کو اور زیادہ اطمینان ہوگیا ہے

بہرحال بساطِ جنگ کا رنگ بہت بدل چلا ہے، اور آیندہ کچھ اور تبدیلیاں پیدا ہونے کا امکان ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جنگ اختتام پر ہے صحیح نہیں ۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ برابر کی لڑائی اب شروع ہوئی ہے اور ابھی خدا جانے کتنی کٹھن منزلوں سے دُنیا کو گزرنا ہے

جن حضرات کا چندہ دسمبر ۱۹۴۲ء میں ختم ہورہا ہے

وہ منی آرڈر کے ذریعہ سے اپنا چندہ بھیجدیں گے تو انھیں ۱۲ کی بچت ہوگی ورنہ جنوری کا وی۔پی انھیں پانچ روپیہ چھ آنے دیکر وصول کرنا پڑے گا۔

منیجر نگار

بعض عربی اور انگریزی الفاظ کی مماثلت!

(بہ سلسلۂ ماسبق)

۴۹- Cribble (کربل) موٹی چھلنی - عربی لفظ غربال (چھلنی) سے نکلا ہے -

۵۰- Crone (کرُون) بڑھیا، اس کے مقابلہ میں عربی لفظ قرن (بمعنی زمانۂ طویل) ملاحظہ کیجئے -

۵۱- Crush (کرش) کچلنا، عربی لفظ جرش سے لیا گیا ہے جس کے معنے بھی یہی ہیں -

۵۲- Crystal (کرسٹل) بلور، یعنی وہ مادہ جو جمکر یا سکڑ کر پہل دار صورت اختیار کرے - عربی میں لفظ قرس کے معنے بھی سردی سے جم جانے یا سکڑ جانے کے ہیں -

۵۳- Cube (کیوب) عربی لفظ مکعب سے لیا گیا ہے -

۵۴ Cup (کپ) پیالہ - عربی لفظ کوب سے لیا گیا ہے -

۵۵- Cusion (کشن) گدا، تکیہ، مسند - عربی کا لفظ کساء (پوشش) اس سے بہت مماثل ہے -

۵۶- Cylinder (سلنڈر) گھومنے والا اسطوانہ - عربی میں جال کے معنے گھومنے کے ہیں جو آلہ سے نکلا ہے -

۵۷- Deal (ڈیل) تقسیم کرنا، چاروں طرف منتشر کرنا - اسی کے ساتھ عربی کے بدل (ایک چیز کی عوض میں دوسری چیز دینا) اور بذل (فضول بخشش) کو ملاحظہ کیجئے -

۵۸- Diminish (ڈمنش) کم کرنا، گھٹانا - عربی میں لفظ منّ کے معنے بھی گھٹانے اور کمزور کرنے کے ہیں -

۵۹- Dragoman (ڈریگومین) عربی لفظ ترجمان سے لیا گیا ہے -

۶۰- Drule (ڈرُول) لُعاب، عربی لفظ رُوال کے بھی یہی معنے ہیں جسے اُردو میں رال کہتے ہیں -

۶۱- Drip (ڈرپ) ٹپکنا، بہنا - عربی میں لفظ ذرق بھی اسی کے ہم معنی ہے -

۶۲- Drive (ڈرایو) آگے ہنکانا، بڑھنا - عربی میں لفظ طرد کے معنے بھی الگ ہٹانے کے ہیں -

۶۳- Earth (ارتھ) زمین - عربی لفظ ارض سے لیا گیا ہے

۶۴- Emerald (امیرلڈ) زمرد کی دوسری صورت ہے -

۶۵- Fade (فیڈ) مرجھا جانا، غائب ہو جانا - عربی میں نفد کے معنے بھی یہی ہیں -

۶۶- Fervent (فرونٹ) گرم، اُبلتا ہوا، پُرجوش عربی میں فاد کا مفہوم بھی یہی ہے -

۶۷- Frank (فرینک) آزاد، صاف گو، فیاض، اسی کے ساتھ عربی لفظ فارغ کو ملاحظہ کیجئے جو اس مفہوم کو ظاہر کرتا ہے

۵۸- Gape (گیپ) خلا، کشادہ دہانہ۔ یہ عربی لفظ جاب سے لیا گیا ہے اور جیب وگیپ کی مماثلت لفظاً ومعناً ظاہر ہے۔

۶۹- Gleam (گلیم) چمک - عربی میں لفظ لمع کے بھی یہی معنے ہیں۔

۶۰- Gloom (گلوم) تاریکی - غالباً عربی لفظ ظلام سے لیا گیا ہے۔

۶۱- Glass (گلاس) شیشہ، کانچ - عربی لفظ جلا اس سے بہت مماثل ہے۔

۶۲- Good (گوڈ) اچھا، شریف - عربی میں لفظ جید کا بھی یہی مفہوم ہے۔

۶۳- Grief (گریف) رنج، تکلیف - عربی لفظ کرب سے اس کی مماثلت غور طلب ہے

۶۴- Groan (گروَن) Grunt (گرنٹ) کراہنا، چیخ اٹھنا - عربی میں لفظ رنّ کا بھی یہی مفہوم ہے۔

۶۵- Guess (گیس) قیاس کرنا - عربی لفظ قیاس تلفظ میں اس سے بہت ملتا جلتا ہے

۶۶- Guide (گائیڈ) رہنما - غالباً عربی لفظ قاید سے لیا گیا ہے

۶۷- Guilt (گلٹ) گناہ - عربی لفظ غلط سے لیا گیا ہے۔

۶۸- Gurgle (گرگل) بہتے ہوئے پانی کی آواز - یہ لفظ عربی غرغر یا قلقل سے نکلا ہے جن کا مفہوم بھی یہی ہے۔

۶۹- Halo (ہیلو) چاند یا سورج کے گرد حلقہ - اسی کے ساتھ عربی لفظ ہالہ ملاحظہ ہو۔

۸۰- Heir (ایر) وارث - عربی کا لفظ ارث بہ معنے وراثت ملاحظہ ہو۔

۸۱- Hire (ہایر) معاوضہ - مزدوری غالباً عربی لفظ اجرت واجر کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

۸۲- Hole (ہول) سوراخ Hallow (ہالو) کھوکھلا - عربی کا لفظ خلا اس سے کتنا ملتا جلتا ہے۔

۸۳- Horse (ہارس) گھوڑا - عربی لفظ فرس کا قریب المخرج ہے۔

۸۴- Jasmine (جاسمن) چنبیلی - عربی میں یاسمین کہتے ہیں

۸۵- Jasper (جیسپر) ایک قیمتی پتھر جسے عربی میں یشب کہتے ہیں۔

۸۶- Kid (کِڈ) بکری کا بچہ - عربی میں اسے جدی کہتے ہیں۔

۸۷- Lad (لیڈ) اور عربی ولد کی مماثلت ظاہر ہے۔

۸۸- Lactate (لیکٹیٹ) دودھ چلانا - عربی میں اسے لکتات کہتے ہیں۔

۸۹- Lap (لیپ) تہ کرنا، لپٹنا - عربی میں اسے لفّ کہتے ہیں اور دونوں کی مماثلت ظاہر ہے۔

۹۰- Lenient (لینینٹ) نرم - عربی میں لین اور لیونت کے بھی یہی معنے ہیں۔

۹۱- Leprous (لپرس) سفید کوڑھ - عربی لفظ برص یا البرص سے لیا گیا ہے۔

۹۲- Lick (لِک) مارنا - عربی میں بھی لکّ کے یہی معنی ہیں۔

۹۳- Live (لیو) رہنا - عربی میں لبث کے بھی یہی معنے ہیں۔

۹۴- Locate (لوکیٹ) ڈھونڈھ نکالنا، جگہ متعین کرنا - عربی میں التقاط کے معنے جمع یا فراہم کرنے کے آتے ہیں اور

لقیط اس بچے کو کہتے ہیں جو کہیں پڑا ہوا مل جائے ۔

۹۵- Malady (ملاڈی) بیماری ، عربی کا لفظ مرض اس سے بہت ملتا جلتا ہے ۔

۹۶- Mask (ماسک) مصنوعی چہرہ - عربی کا لفظ مسخ ملاحظہ ہو ۔

۹۷- Mate (میٹ) رفیق ، ہمدم ، ہمسفر - عربی میں لفظ مطا کے معنے تیز چلنے کے ہیں جو فی المعنی میٹ کے مفہوم سے قریب تر ہے ۔

۹۸- Matter (میٹر) عربی کا لفظ مادہ ملاحظہ ہو ۔

۹۹- Measure (میرز) پیمانہ ، کسوٹی - عربی کا لفظ معیار اس سے کس قدر مماثل ہے ۔

۱۰۰- Metal (مٹل) دھات - عربی میں لفظ مطل کے معنے کسی دھات کو پیٹ کر بڑھانے کے ہیں ۔

۱۰۱- Mirth (خوشی) اور ——— Merry (مری) خوش - عربی میں لفظ مرح کا بھی یہی مفہوم ہے ۔

۱۰۲- Mew (میو) بلی کی آواز - اسے عربی میں مُواء کہتے ہیں ۔

۱۰۳- Mix (مکس) ملانا - عربی میں مزج کے معنے یہی ہیں ۔

۱۰۴- Murmur (مرمر) غصہ میں بڑبڑانا - عربی میں لفظ مرمر کے معنے غصہ کرنے کے ہیں ۔

۱۰۵- Navel (نیول) عربی میں ناف ہے ۔

۱۰۶- Neck (نک) گردن - عربی میں عنق کے معنے بھی یہی ہیں ۔

۱۰۷- Neeze - Sneeze (نیز - اسنیز) چھینکنا - عربی میں نشع کے معنے ہیں "زور سے کسی چیز کو نکالنا" ، مفہوم کے لحاظ سے دونوں کی مماثلت ظاہر ہے ۔

۱۰۸- Nod (نابو) سر کو جنبش دینا - عربی میں نود کے معنے بھی جنبش دینے کے ہیں ۔

۱۰۹- Ocean (اوشن) سمندر - عربی ، اوقیانوس ۔

۱۱۰- Odour (اوڈر) خوشبو - عربی عطر

۱۱۱- Ogle (اوگل) آنکھ مارنا - عربی میں لفظ عجل کے معنے بھی یہی ہیں ۔

۱۱۲- Over (اوور) اور عبور کی لفظی و معنوی مماثلت ملاحظہ کیجئے ۔

۱۱۳- Plough (پلو) کھیت جوتنا - عربی میں فلح کے معنے بھی یہی ہیں ۔

۱۱۴- Prink (پرنک) چمکانا - Prank (پرینک) آراستہ کرنا ، چمکانا - عربی میں برق کے معنے بھی چمکنے کے ہیں ۔

۱۱۵- Quarry (کویری) کھدان - عربی میں کرو کے معنے کھودنے کے ہیں ۔

۱۱۶- Rack (ریک) صاف کرنا - عربی میں راق کے معنے بھی یہی ہیں ۔

۱۱۷- Rag (ریگ) گدڑی - عربی میں لفظ خرقہ اس سے بہت مماثل ہے ۔

۱۱۸- Ram (ریم) ہنکانا ، بھگانا ، عربی لفظ رمی کے معنے بھی پھینکنے اور نشانہ لگانے کے ہیں اور رامی نشانہ باز کو کہتے ہیں ۔

۱۱۹- Rice (رائس) چاول - عربی میں ارز چاول کو کہتے ہیں۔

۱۲۰- Rob (راب) گاڑھا ہونا۔ اسی کے ساتھ عربی لفظ رُبّ (مربّہ) کو ملاحظہ کیجئے۔

۱۲۱- Saffron (سیفرن)۔ زعفران۔ یہ عربی لفظ صفراء (زرد) سے ماخوذ ہے۔

۱۲۲- Same (سیم) ایک ہی قسم کا۔ ویسا ہی۔ عربی میں لفظ ضم ملا دینے کے معنے میں آتا ہے اور دونوں کا مفہوم ایک ہے۔

۱۲۳- Scarlet (اسکارلٹ) ارغوانی عربی لفظ اشقر سے لیا گیا ہے۔

۱۲۴- Senate (سینٹ) قانون ساز یا انتظامی جماعت۔ یہ لفظ سنّت (قانون، قاعدہ) سے لیا گیا ہے۔ یا "سنہ" سے جس کے معنے سال کے ہیں۔ اور ایسی مجلس میں ہمیشہ معمر آدمی ہوتے ہیں۔

۱۲۵ Seven (سیون) سات جسے عربی میں سبع کہتے ہیں۔

۱۲۶- Shackle (شیکل) قید کر دینا، باندھ دینا۔ عربی میں لفظ شکال کے بھی یہی معنے ہیں۔

۱۲۷- Shaver (شیور) نوجوان لڑکا جسے عربی میں شاب کہتے ہیں۔

۱۲۸- Soak (سُوک) رقیق چیز کو جذب کرنا۔ عربی میں سقی پلانے کو کہتے ہیں

۱۲۹- Sole (سُول) تنہا۔ عربی میں زول شخص واحد کو کہتے ہیں

۱۳۰- Tall (ٹال) لمبا۔ عربی میں طال کے معنے لمبا ہونے کے ہیں اور دونوں کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں۔

۱۳۱- Tour (ٹور) گشت لگانا۔ دورہ کرنا۔ عربی میں دَور کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اس فہرست میں بعض الفاظ تو ایسے پائیں گے جن کی لفظی و معنوی مماثلت بالکل واضح ہے، جیسے Camel اور جمل، Cat اور قط، Coffer اور قفیر، Drip اور ذرت، Frank اور فارغ، Gloom اور ظلام وغیرہ، لیکن بعض الفاظ ایسے بھی ملیں گے، جن میں ذرا دور کی نسبت پائی جاتی ہے، لیکن غور کرنے کے بعد تو مفہوم اور تلفظ کی یکسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ عربی کے بعض الفاظ عبرانی الاصل ہیں اور مغربی زبانوں میں بھی عبرانی کے بہت سے الفاظ پہونچے ہیں۔ اس لئے ایسے الفاظ کی مماثلت انگریزی عربی میں بظاہر کم ہوگئی ہے، لیکن چونکہ دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے، اس لئے غور کرنے سے یہ پتہ ضرور چل جاتا ہے کہ دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔

انگریزی میں عربی کے بہت سے الفاظ، اسپینی زبان کی وساطت سے بھی پہونچے ہیں، کیونکہ اسپین میں عربوں کی حکومت عرصہ تک رہی تھی اور وہاں کی زبان میں بہت سے عربی الفاظ شامل ہوگئے تھے۔

ہم نے ان الفاظ کی فہرست نہیں دی جو علوم و فنون سے متعلق رکھتے ہیں، ورنہ یہ فہرست بہت طویل ہو جاتی، کیونکہ فلکیات، ریاضی علم العقاقیر اور علم الکیمیا وغیرہ کے عربی الفاظ و مصطلحات بکثرت انگریزی میں پائے جاتے ہیں۔

لکھنؤ کی زبان

سال گزشتہ لکھنؤ کی زبان پر میرا ایک مضمون نگار میں شایع ہوا تھا اُسی زمانہ میں ایک صاحب نے چند اعتراض لکھ کے بھیجے تھے جنکا جواب میں اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے نہ دے سکا اب نگار کے ذریعہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ فقط شمس

عام طور سے لکھنؤ کی زبان پر فارسیت کے غلبہ کا اعتراض کیا جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے لکھنؤ میں دہلی ہی کی زبان بولی جاتی تھی ناسخ کی اصلاحوں نے دہلی سے الگ کر کے لکھنؤ کی ایک خاص زبان بنا دی جس کو ٹکسالی کہنا درست نہیں کیونکہ انھوں نے اصلاح کی دھن میں بہت سی لفظیں ترک کر دیں اور ان کی جگہ دوسری زبان کی لفظیں اختیار کیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصلی لفظوں کے نکل جانے سے ٹکسالی زبان کا دائرہ تنگ ہو گیا اور بیرونی لفظوں کے بکثرت داخل ہو جانے سے زبان ٹکسال باہر ہو گئی۔ اس دعوے پر دو گواہ بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) آتش اور انیس و دبیر نے ناسخ کی اصلاحوں کو قبول نہیں کیا پُرانے محاورے اور ترکیبیں نہیں چھوڑیں اس لئے اُن کی زبان وہی رہی جو دہلی کی تھی چنانچہ میر انیس اکثر فرمایا کرتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے، حضرات لکھنؤیوں نہیں بولتے اور ان کا گھرانا دہلوی تھا۔

(۲) علامہ سید علی بلگرامی نے تمدن عرب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کی زبان علمی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ ہندیت کم اور فارسیت زیادہ ہے ــــ اس سے معترض حسب ذیل فائدے اُٹھانا چاہتا ہے :-

الف : لکھنؤ کی دستار فخر سے آتش اور انیس و دبیر کی شاعری کا طرہ نکل جائے۔

ب : لکھنؤ کی زبان کی وسعت اور ٹکسالی ہونے کے ثبوت میں آتش اور انیس و دبیر کا کلام پیش کرنے والے کی زبان پہلے ہی سے بند کر دی جائے۔

ج : اُسوقت کے اساتذۂ فن کے طرز عمل سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ لکھنؤ کی زبان کو ٹکسالی نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن بُرا ہو ناواقفیت فن کا جس نے ناکامی سے ہم آغوش کر دیا پانسا پلٹ گیا اور لکھنؤ کی زبان کی وسعت ثابت ہو گئی اس لئے کہ آتش اور انیس و دبیر اور ان کے تلامذہ کہاں تھے لکھنؤ میں اس وجہ سے ان کی زبان لکھنؤ کی زبان کا جزو بن گئی اور ان کے خاص محاورے (اگر کچھ ہوں) عام گفتگو میں آ گئے۔ نواب سید محمد خاں رند، میر دوست علی خلیل، میر وزیر علی صبا، ہدایت علی جلیل، مرزا استاد، آغا حجو اشرف وغیرہ سب آتش کے شاگرد تھے اور ان سب کی زبان لکھنؤ میں مستند مانی جاتی تھی۔ مولوی عبد السلام ندوی نے تو ناسخ کے شاگردوں کو بھی اس میں شریک کیا ہے وہ کہتے ہیں :-

"ناسخ اور آتش کے تلامذہ نے بے شبہ الفاظ کی روانی اور برجستگی پر زیادہ توجہ کی اور توسیع زبان کے لئے زیادہ تر اُردو ہی کے الفاظ استعمال کئے" [1]

انیس و دبیر کے خاندان کی زبان آج بھی لکھنؤ میں مستند سمجھی جاتی ہے اس لئے جو وسعت انیس و دبیر اور آتش کی زبان میں وہ بھی لکھنؤ کی

[1] شعر الہند جلد اول صفحہ ۳۰۴ -

زبان میں موجود ہے مولانا حکیم عبدالحی مرحوم لکھتے ہیں :-

اس دور (ناسخ و آتش) میں کچھ لوگ (انیس و دبیر) ایسے بھی ہوئے جنھوں نے ایک دوسرے میدان (مرثیہ) میں طبع آزمائی کرکے زبان میں زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت و صفائی پیدا کر دی ہے[1]

اعتراض کی زبان بند کر دینے کے لئے اتنا ہی جواب کافی تھا لیکن تحقیقی اور تفصیلی جواب بھی پیش کیا جاتا ہے :

(۱) ناسخ اور انکی اصلاحیں

اب تک جو کچھ کہا گیا وہ اس فرض کی بنا پر کہ ناسخ کی اصلاحوں نے زبان کو تنگ اور ٹکسال باہر کر دیا لیکن اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حقیقت میں یہ جرم ناسخ پر عائد ہوتا ہے یا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ناسخ نے جو لفظیں اور ترکیبیں ناپسند کیں انہیں ترک کر دیا اُن کی جگہ کوئی لفظ اختیار نہیں کی، جو لفظیں ان کی جگہ استعمال ہوئیں وہ پہلے ہی سے زبان میں موجود اور مستعمل تھیں ناسخ نے کوئی جدید اضافہ نہیں کیا اگر ان لفظوں کے وجود سے زبان ٹکسالی نہیں رہتی تو (وہ) پہلے ہی سے ٹکسال باہر تھی، رہ گئے متروکات تو کچھ لفظوں کے ترک سے زبان کا دائرہ تنگ نہیں ہوتا اور صفائی آجاتی ہے ہر زبان میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے ہمارا ذوق آج بھی متروکات اور مستعملات کی لطافت میں فرق محسوس کرتا ہے، لکھنؤ والوں سے پہلے دہلی والے بھی یہی کر چکے تھے مولانا عبدالحی مرحوم شعرائے دہلی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

دور اول — "سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعراء کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی اور بہت سے الفاظ و روابط جنھیں ولی اور انکے ہم عصر بے تکلف کام میں لاتے تھے، نکال ڈالے تاہم کچھ الفاظ ایسے رہ گئے جو ان کے زمانہ میں فصیح سمجھے جاتے ہوں، مگر آج ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، مثلاً کیا کیا بجائے کس کس، اون نے جن نے بجائے اس نے جس نے، بھر نظر بجائے نظر بھر کے، دل اپنے بجائے اپنے دل، مجھ آنسو بجائے مرے آنسو، جس تس نے بجائے جس کسی نے، ایدھر اودھر بجائے ادھر اُدھر، کہنے لاگا بجائے کہنے لگا۔

دور دوم — سب سے نمایاں کارنامہ اس دور کے شعراء کا یہ ہے کہ انھوں نے زبان کی صحت اور صفائی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور وہ ناگوار الفاظ و روابط جن کو دور اول کے شعراء نے قدماء سے ترکہ پایا تھا انھوں نے نکال ڈالے اور وہ ایک حد تک صاف و شستہ ہو گئی۔ تاہم انکھڑیاں، جھمکھڑا، ٹکھڑا، ٹک، نت، زور، آتیاں جاتیاں، جاؤں ہوں، آؤں ہوں، کھینچوں ہوں — اور اسی قسم کے الفاظ باقی رہ گئے

دور سوم — ان لوگوں کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے اُن کو انھوں نے دور کرکے اور محاوروں کے ساتھ فارسی ترکیبوں کی نہایت لطیف اور خوشنما ترکیبوں سے اُردو میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر دی جو دیکھنے کے قابل ہے — ان لوگوں کے کلام میں کسو، کبھو، تیئں، آن کے، سمیت، مت، آئے ہے، جائے ہے، دیکھیو، کیجیو، درے، پرے ———— بہت بے تکلفی سے کام میں لائے گئے ہیں۔"

طبقۂ متاخرین میں شعرائے لکھنؤ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

"اس طبقہ کو میں نے تین دور پر تقسیم کیا ہے دور اول ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کا۔

دور اول — دور اول کے شعراء کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان میں تراش خراش کرکے بدمزہ اور ناگوار الفاظ کو نکال دیا جو مذاق سلیم میں گراں اور ثقیل معلوم ہوتے تھے، مثلاً آئے ہے، جائے ہے، کہے ہے، کہوے ہے، کسو، تئیں، آن کے، سمیت، مت، زور بمعنی بہت یا عجیب یا جمع مؤنث کے معنوں کو الف نون کے ساتھ آتیاں، جاتیاں اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی

---

[1] گل رعنا

مناسبت سے صفت کو جمع بولنا جیسے بیماریاں ہے۔[1]

یہ ہیں وہ اصلاحی صورتیں جو پہلے دہلی والوں نے پھر لکھنؤ والوں نے اختیار کیں اگر یہ عمل زبان کو معیار سے گرا دیتا ہے تو اُردو پہلے ہی سے معیاری نہیں تھی اس لئے کہ بالکل ویسی ہی تبدیلیاں اہلِ لکھنؤ نے کیں جیسی اُن سے پہلے دہلی والے کر چکے تھے۔ مثلاً نین اور چشم دونوں لفظیں دہلی میں مستعمل تھیں، نین کو غیر فصیح سمجھ کے ترک کر دیا، چشم کو باقی رکھا اسی طرح مَن، طرح۔ بھیتر، اندر۔ پگ، پگڑی۔ باٹ، رستہ۔ کدھیں، کبھو وغیرہ ہم معنی لفظیں مستعمل تھیں۔ اصلاح میں مَن، بھیتر، پگ، باٹ، کدھیں، خارج ہو گیا اور طرح، اندر، پگڑی، رستہ، کبھو رہ گیا۔

ترکیبی اصلاحیں یہ ہیں:

اصل ترکیب	اصلاحی صورت
نغمہ بولنا	نغمہ کرنا
جالے	جلائے
اون سوا	اُن کے سوا
جنھوں آگے	جنھوں کے آگے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی والوں نے اپنے ذوق کے فتوے سے بھونڈی لفظ بھدی ترکیب ترک کر کے خوشنما لفظ سبک ترکیب اختیار کی یہی اُصول اہلِ لکھنؤ کے پیشِ نظر تھا یعنی جو بھونڈی لفظیں بھدی ترکیبیں دہلی والوں کی زبان پر باقی رہ گئیں تھیں اُنھیں یا ترک کر دیا، یا خوشنما بنا دیا مثلاً "جنھوں آگے"، کو دہلی والوں نے غیر فصیح سمجھ کے جنھوں کے آگے بنایا لکھنؤ والوں نے اس میں بھی بھدا پن محسوس کر کے جن کے آگے بنایا انکی یہ اصلاح بجا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ہم ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہیں اگرچہ صرف اسی ایک مثال سے زبان کی تدریجی ترقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم چند مثالیں اور پیش کرتے ہیں:

دہلی کی ترکیبیں	لکھنؤ کی اصلاحیں
پھرے ہے، کرے ہے، آئے ہے، جائے ہے وغیرہ	پھرتا ہے، کرتا ہے، آتا ہے، جاتا ہے وغیرہ
انکھڑیاں ملیاں، آتیاں ہیں، جاتیاں ہیں وغیرہ	آنکھیں ملیں، آتی ہیں، جاتی ہیں وغیرہ
بدلا کرنا — پون بھی — تجھ تیغ — اون نے — بغل بیچ۔	بدلا لینا — ہوا چلی — تیری تیغ — اُس نے — بغل میں۔
بہتیاں ہیں — دخت تاک — دل ڈھائے کر — اُس کنے۔	بہتی ہیں — دخت رز — دل ڈھا کر — اُس کے یہاں۔
قاصد چلانا — سر کو فرو لا — کسو — لوہو — ماٹی — جاگہ —	قاصد بھیجنا — سر کو فرو کرنا — کسی — لہو — مٹی — جگہ۔
پگاہ کا نالہ — اس کے گئے — وہ جدی چیز ہے —	نالۂ سحر — اس کے جانے کے بعد — وہ جدا چیز ہے۔
انتہا لانا — ہلاکی کو پہونچنا — پلک ماروں ہوں —	انتہا کو پہونچانا — ہلاکت کو پہونچنا — پلک جھپکاتا ہوں —

ان اصلاحوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ولی کے زمانہ سے میر و سودا کے زمانہ تک اصلاحِ زبان کا جو اُصول دہلی والوں کے پیشِ نظر تھا وہی میرزا کی زبان میں اصلاح کرتے وقت ناسخ کے پیشِ نظر تھا، یہ خیال بھی غلط اور بالکل غلط ہے کہ ناسخ نے جب کوئی لفظ ترک کی تو اسکی جگہ غیر زبان کی لفظ اختیار کی، متروکات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لفظ ان کے ذوق پر گراں تھی اس کی قایم مقام جو لفظ فصیح زبان میں مستعمل تھی اسکو

[1] گلِ رعنا از صفحہ ۳۱۴ تا ۳۲۳

وجوہ اختیار کر لیا خواہ وہ کسی زبان کی ہو لیکن ہم معترض کے کلیہ کو باطل کرنے کے لئے چند مثالیں ایسی پیش کرتے ہیں جن میں غیر زبان کی لفظیں استعمال نہیں ہوئیں۔

متروکات ناسخ	مستعملات ناسخ	متروکات ناسخ	مستعملات ناسخ
پرے	الگ	پون بہی	ہوا چلی
رپٹے ہے	پھسلتا ہے	دامن چلنا	دامن سکنا
بیچ	میں	اس کے کنے	اس کے یہاں
قاصد چلانا	قاصد بھیجنا	تدھر	ادھر
جہاں تہاں	کہیں کہیں	تد	جب
نہوانا	جھکانا	نپٹ	بہت

اس میں شک نہیں کہ متروکات کے سلسلہ میں بعض لفظیں ایسی بھی ترک ہوگئیں جو قابل استعمال تھیں لیکن اس غلطی میں اہل لکھنؤ اور دہلی دونوں برابر کے شریک ہیں اگر یہ غلطی نہ ہوتی تو وہ صحت بھی عالم وجود میں نہ آتی جس کی بدولت آج زبان لطافت و شیرینی میں قند پارس کا مزہ دیتی ہے، عہد بہ عہد کی زبان اور اس کی تدریجی ترقی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ متروکات کی بدولت زبان صاف ہوتی رہی مثالاً ملاحظہ ہو دور اول کی ادبی زبان یہ تھی :۔

اے ساجن بن تیرے مجکوں یہ گھر بار کیا کرنا ــــ اگر تو مجھ کن نا اچھے تو یہ سنسار کیا کرنا ــــ تمنا کے من میں اول جب سوں آنے کی نشانہ تھی تو بھر مجھ سین دکھ بھرے سون چھٹا اقرار کیا کرنا۔ مجھ دل کن اچھے اس ساجن ستے دوجا ظالم جگ بھیتر نا اچھے کدھیں مجھ انکھیاں کا اچھوان نا تھے۔

دور متوسطین عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے پہلا میر و سودا، دوسرا مصحفی و انشا کا میر و سودا کے زمانہ کی ادبی زبان یہ ہے:

"جب سے اون نے انکھڑیاں مجھ سے ملائیاں مجھ دل اوپر ایک تیر لاگا ــ نے صبح تا شام دل کے تئیں چین نہیں آئے ہے"

مصحفی و انشا، کے دور شباب میں زبان کی یہ صورت تھی :۔

میں دم بدم کیونکہ نہ روؤں دل سے نت لہو بہتا رہتا ہے ــ میں اس کو دل دیدیا تسپر بھی وہ زخم لگائے جاتا ہے۔ میں اس کی خاطر کوہ تک چیرا ہوں تسپر بھی وہ ہوا خواہوں میں نہیں گنے ہے ــ سُن سُن میری زاریاں اس کا دل سہے ہے"[1]

یہ ہے دہلی کی انتہائی ترقی یافتہ زبان کا نمونہ جو میر و سودا اور مصحفی و انشا سے لکھنؤ والوں کو ملی اس کو انھوں نے یوں درست کیا:

"میں ہر وقت کیونکر نہ روؤں دل سے ہمیشہ لہو بہتا رہتا ہے .... میں نے اس کو دل دیدیا اس پر بھی وہ زخم لگائے جاتا ہے۔ میں نے اس کے لئے پہاڑ تک کاٹا اس پر بھی وہ ہوا خواہوں میں نہیں گنتا"

ہم نے دونوں جگہ کی زبان کو سامنے رکھدیا اب لکھنؤ والوں نے ترقی دی یا نہیں اس کا فیصلہ اہل ذوق کے لئے آسان ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عام لفظیں جو اردو میں موجود تھیں ان کی جگہ عام طور سے عربی فارسی لفظیں استعمال کی گئیں

---

[1] نثر کے یہ تینوں نمونے ولی، میر اور مصحفی کے اشعار کے ہیں۔

لیکن اس سے یہ کب ثابت ہوسکتا ہے کہ ان کی مترادف اُردو لفظیں خارج ہوگئیں جو اس طرزِ عمل کا مخالف ہو وہ اپنی زبان کی لفظیں استعمال کرے اور ماہرینِ زبان نے ایسا کیا بھی ہے۔ حضرت آرزو کی خالص اُردو اس کی زندہ مثال ہے۔ لیکن لکھنؤ کی زبان میں فارسیت کا عنصر غالب بتانا بھی حقیقت پر مبنی نہیں اُردو نثر کی وہ کتابیں جو دہلی اور لکھنؤ میں ایک ہی زمانہ میں لکھی گئی ہیں ان کا مقابلہ میرے بیان کی تائید کرے گا اور اگر نظم کے سرمایہ کو بھی لے لیا جائے تو فارسیت کے غلبہ میں دہلی کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور ناسخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تصرف الفاظ میں ایسا کمال دکھایا جس کی تعریف نہیں ہوسکتی اور لکھنؤ کے تمام شعراء نے اُن کی تقلید کی یعنی انھوں نے اُردو، فارسی اور عربی لفظوں کی باہمی ترکیب اور ان کی ہیئت مجموعی سے اُردویت پیدا کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوئے بخلاف اس کے شعرائے دہلی کے کلام سے فارسیت ٹپکتی ہے۔ شمس العلما مولوی امداد امام اثر لکھتے ہیں :-

"شیخ امام بخش ناسخ زبان اُردو کے مصلح گزرے ہیں اس اعتبار سے ان کا تخلص نہایت حسب حال ہے۔ شیخ نے اُردو کو خراش تراش کے ایسا درست کیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ذوق نے صرف مضمون آوری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی اور اصلاح زبان پر مطلق مائل نہ ہوئے مومن کو بھی اس جانب کچھ میلان نہ ہوا اور غالب نے تو فارسی کی اس قدر آمیزش کر دی کہ اُردو پر فارسی کا شبہ ہونے لگا حضرت نے (یعنی غالب نے) فارسی زبان یا فارسی جملوں کو اس طرح باندھا کہ اُردو فارسی نما ہوگئی اس کے برخلاف شیخ نے گو الفاظ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اُردو، اُردو رہ گئی بلکہ اگر فارسی جملہ کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی کو اُردو کر دکھایا مثلاً شیخ فرماتے ہیں ؎

سوال وصل پر ہلنا پریرو تیرے ابرو کا اشارہ ہے برات عاشقاں بر شاخ آہو کا

لاریب زبان اُردو شیخ کی کوششوں کی تمام تر ممنون ہے اگر جناب شیخ کو اصلاح زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبان حال کی صورت پیدا نہ ہوتی"[1]

معترضین کی یہ ستم ظریفی بھی داد کے قابل ہے کہ دہلی جہاں کی زبان میں فارسی لفظیں اور ترکیبیں اس کثرت سے اور اس طرح استعمال کی گئیں کہ اُردو فارسی نما ہوگئی وہاں کی زبان خالص اور ٹکسالی ہے لیکن جہاں فارسی اُردو بن گئی وہاں کی زبان ٹکسال باہر ہے۔

(۲) آتش اور انیس و دبیر کی زبان

کہا جاتا ہے کہ آتش اور انیس و دبیر کے کلام میں ایسے محاورے اور لفظیں موجود ہیں جو دہلی میں مستعمل اور لکھنؤ میں متروک ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دہلی کی زبان بولتے تھے۔ اس کا جواب سننے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اہل لکھنؤ کو زبان کے ایجاد کا دعویٰ نہیں بلکہ وہ بھی اس کو دہلی اصل جانتے ہیں ہاں تصرف و اصلاح سے ترقی دینے کے صلہ میں اپنے کو اس کا مالک سمجھتے ہیں اور تصرف و اصلاح کے معنی ہیں بھونڈی لفظوں بھدی ترکیبوں کو ترک کر دینا یا خوشنما بنا دینا۔

کسی زبان کی تمام لفظیں نہ متروک ہوئی ہیں نہ ہوسکتی ہیں اس لئے اگر کوئی لکھنوی ایسی لفظیں بولے جو دہلی میں بھی بولی جاتی ہوں تو اس سے اس کی زبان دہلوی نہیں کہی جا سکتی بخلاف اس کے اگر ایک لفظ بھی وہ تصرف و اصلاح کی غرض دہلی کے استعمال کے خلاف بولے تو یہ اُس کی زبان کے دہلوی نہ ہونے کے لئے کافی ہے اس کا یہ طرزِ عمل بتاتا ہے کہ وہ اپنے کو خود زبان کا مالک سمجھتا ہے ورنہ اس کو اہلِ زبان کے استعمال کے خلاف بولنے کا کوئی حق نہیں۔

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ آتش اور انیس و دبیر نے دہلی کے بہت سے محاورے ترک کر دئے جو اُن کے بعد تک دہلی کے خاص و عام کی زبان پر تھے اور بہت سے آج بھی ہیں ان کی جگہ وہ لکھنؤ کی درست کی ہوئی لفظیں اور محاورے بولتے تھے

---

[1] کاشف الحقایق صفحہ ۱۳۸

اتنا ان کی زبان کے لکھنوی ہونے کے لئے کافی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اپنے کو خود اہل زبان اور ناسخ کا ہم پلہ سمجھ کے اُن کی رائے سے اختلاف کیا اور اُن کے تمام تصرفات کو قبول نہیں کیا تو اس سے ان کی زبان دہلوی نہیں کہی جا سکتی۔

یہ بات بھی نظرانداز کر دینے کے لائق نہیں ہے کہ لکھنؤ میں متروک لفظیں رفتہ رفتہ ترک ہوئیں سب اکٹھا نہ ترک ہوئیں نہ ہو سکتی تھیں ممکن ہے کہ کسی کے کلام میں ایسی کوئی لفظ مل جائے جو ترک ہونے سے پہلے استعمال ہوئی ہو جیسے ناسخ کا یہ شعر

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پینا ہے شراب　　　اب تو ناسخ زور رندلاؤ بالی ہو گیا

زور کا لفظ بہت کے معنی میں ناسخ نے متروک قرار دیا اور خود انھیں کے یہاں موجود ہے مگر ایک ہی جگہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا ابتدائی کلام ہے بعد میں انھوں نے اس کو ترک کر دیا انیس و دبیر کے یہاں بھی ایسی مثالیں بہت ملیں گی۔ مولانا اثر یہ لکھتے ہیں:

"میر صاحب آج کے شاعر نہیں میر صاحب کی شاعری کا زمانہ ناسخ و آتش کے وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ کتنے الفاظ اور ترکیبیں زمانہ میر و سودا کی باقی تھیں اس لئے بعض الفاظ میر صاحب کے کلام میں بھی اس وقت کے نظر آجاتے ہیں جو قابل گرفت ہیں"[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ناسخ و آتش کے ابتدائی عہد میں میر و سودا کے زمانہ کے بہت سے الفاظ مستعمل تھے جو بعد کو متروک قرار پائے ایسی لفظیں کسی کے کلام سے چاہے ناسخ ہوں یا آتش انیس ہوں یا دبیر سند میں پیش نہیں کی جا سکتیں مولوی امیر احمد صاحب بی۔ اے لکھتے ہیں:۔

"انیس کا کلام تقریباً نصف صدی کی زبان کا مجموعہ ہے بعض الفاظ و محاورات جو ان کی نوعمری میں مستعمل تھے پختہ مشقی کے دور تک باقی نہیں رہے تھے اور ان کی پیرانہ سالی میں زبان اُردو بہت صاف اور شستہ ہو چکی تھی ابتدائی کلام میں بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کو آخر زمانہ میں انھوں نے ترک کر دیا تھا علاوہ اس کے ان کے مطبوعہ کلیات میں اغلاط و تحریفات کو بھی کافی دخل ہے اسلئے جب تک کوئی انوکھا محاورہ کلیات میں متعدد مقامات پر نہ دیکھا جائے اور آخر زمانہ کے کلام میں نہ پایا جائے بطور سند کے نہیں پیش کیا جا سکتا"[2]

مولانا شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

"میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اُن کی ابتدائی مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے اور شعراء ان کو بکثرت استعمال کرتے تھے ——— اس قسم کے الفاظ میر انیس کے ہاں بھی ہیں اور کثرت سے ہیں، لیکن وہ ابتدائے مشق کے ہیں ورنہ شیخ ناسخ کے اثر یا خود مذاق بدلنے سے جس قدر زمانہ گزرتا گیا میر صاحب قدیم مخصوص الفاظ اور تراکیب چھوڑتے گئے"[3]

سید نظیر الحسن صاحب فوقؔ لکھتے ہیں:

"میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کلام میں جس قدر ابتدائی زمانہ کا کلام ہے، اسی قدر اوسط زمانہ اور اسی قدر کہنہ مشقی کا ہے دونوں صاحبوں نے اُردو زبان کی پستی اور بلندی کے زمانے دیکھے ہیں پس ابتدائی کلام میں آج کل کے محاورے کے خلاف کوئی لفظ آگیا ہو تو ہرگز قابل اعتراض نہیں خیال کرنا چاہئے کہ مرثیہ گوئی ابتدا میں کیا تھی اور انتہا میں کیا ہو گئی ——— دونوں صاحبوں کی آغاز شاعری کا کنارہ مصحفی، انشا، جرأت سے ملا ہوا تھا اور چونکہ مرزا صاحب میر صاحب سے بہت پہلے کے شاعر ہیں اس لئے پرانے محاورات کا میر صاحب کے کلام سے زیادہ ان کے کلام میں پایا جانا قرین قیاس ہے مرزا صاحب جس زمانہ سے مرثیہ کہتے تھے اس زمانہ میں اکثر الفاظ جو آجکل متروک ہیں، مروج تھے اور بہت سے ثقیل الفاظ جائز سمجھے جاتے تھے مثلاً ادھر اُدھر کی جگہ "ایدھر اودھر" ان کو کے عوض "اونکوں" ان سے کے بدلے

---

[1] حیات انیس صفحہ ۲۶۶ ——— [2] یادگار انیس صفحہ ۲۴۴ ——— [3] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۲۶۔

اُن ستے زور کا لفظ بہت کے معنوں میں آئے ہے، جائے ہنگ، بل بے موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی مطابقت سے لئے صفت کو جمع بولنا جیسے ع " بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو ہم نے بھاریاں" فارسی جمع کو بے اضافت یا صفت کے لانا جیسے ع

" رفتگاں کا بھی خیال اے اہل عالم چاہئے" چنانچہ مرزا صاحب کے ابتدائی کلام میں بھی اس قسم کے الفاظ موجود ہیں"[۱]

میر افضل علی صاحب ضو تحریر فرماتے ہیں :-

" مرزا صاحب کے طولانی اور مختصر مرثیہ شاید دو ہزار سے زیادہ ہوں ان میں اُس زمانہ کا کلام بھی ہے جبکہ ادھر اِدھر اون کون ادن تھے بولتے تھے اُدھر اِدھر اُن کو اُن سے کی جگہ پر چنانچہ مثل سودائے مرحوم مرزا صاحب مرحوم کا ایک مرثیہ چو مصرع ہے یعنی ہر بند کے چار مصرع کیونکہ مرزا صاحب مصحفی کے زمانہ سے مرثیہ کہتے تھے اور اُس وقت جملہ اغلاط بالتمعد جایز سمجھے جاتے تھے، پس مشق کے اوائل زمانہ کی تصنیفات کو اواسط و آواخر مشق کے زمانہ سے ضرور فرق ہونا چاہئے سو ہے افسوس اہلِ مطبع نے اپنے فائدہ فروخت کی جہت سے وہ سب کلام غلط کر دیا"[۲]

جب انیس و دبیر کے کلام کی یہ حالت ہے تو آتش (جو ان سے بھی مقدم تھے) اپنے کلام کو ایسی لفظوں اور ترکیبوں سے کب پاک رکھ سکتے تھے مولوی حکیم عبدالحی صاحب کہتے ہیں :

" آتش کے ہاں بعض بعض موقعوں پر رقیباں، خوباں، انکھڑیاں، زور، بل بے، بن، بجائے بغیر مرے، شامل بجائے مرے ساتھ، پساوے بجائے پھیلائے، شراکت بجائے شرکت، فی الواقعی بجائے فی الواقع ایک آدھ جگہ موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بھی کر دیا ہے شلاً ع

بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو ہیں نے بھاریاں

اسی قسم کے اور بھی الفاظ پائے جاتے ہیں جس میں بعضے پرانے روزمرہ کے جُرم میں نکالے جا چکے اور بعضے غلط ہیں کچھ عجب نہیں کہ یہ اُن کا ابتدائی کلام ہو"[۳]

یہیں سے ناسخ کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسی لفظیں شاذ استعمال کیں اور جن کو ترک کر دیا وہ حقیقت میں لائق ترک تھیں، جن لوگوں نے ناسخ کی پیروی نہیں کی اُن کو بھی چند روز کے بعد اپنی رائے کی غلطی تسلیم کرنا پڑی تاہم بعض اساتذہ جو ناسخ سے ہمسری کا دعویٰ رکھتے تھے اگر کچھ لفظوں میں اختلاف کر کے پُرانی لفظیں استعمال کرتے ہوں تو اس سے ان کی زبان دہلوی نہیں کہی جا سکتی جبکہ دہلی کی بہت سی لفظیں ترک کر کے پُرانی لفظیں اور ترکیبیں اختیار بھی کر چکے ہوں۔

آتش کے کلام میں تو ایسے محاورے بھی ملجائیں گے جو مصحفی و انشاء ہی کے آخری زمانہ میں ترک ہو چکے تھے اور دہلی والے بھی اُن کو استعمال کرتے تھے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ زبان کے معاملہ میں اساتذۂ دہلی یا ناسخ کے مقلد نہ تھے بلکہ خود صاحب رائے تھے ہر لفظ کے ترک و اختیار میں اپنی رائے سے کام لیتے تھے اور ممکن ہے کہ وہ کوئی رائے ہی نہ رکھتے ہوں وقت نظم جو لفظ ذہن میں آگئی نظم کر دی ان کی وارفتہ مزاجی اور طبعی آزادی کا تقاضا بھی یہی ہے اسی سے اہل فن کے نزدیک ان کا کلام سند میں پیش کئے جانے کے لائق نہیں ہے۔ لکھنؤ کے مشہور ادیب شیخ ممتاز حسین مرحوم لکھتے ہیں :-

" لکھنؤ کے تمام شعراء ناسخ کو مستند سمجھتے ہیں اور آتش کو مستند نہیں خیال کرتے، آتش کا طرز مرغوب ہے لیکن اسے محقق فن کا مرتبہ کبھی حاصل نہیں ہوا جو شخص غلط العام سے زیادہ مستفید ہوتا ہے وہ محقق و مستند شاعر نہیں ہو سکتا"[۴]

انیس کا قول اور عمدۃ الملک کی انجمن

کہا جاتا ہے کہ میر انیس بعض محاوروں کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ حضرات لکھنؤیوں نہیں بولتے یہ میرے گھر کی زبان ہے اور اس کے متعلق حسب ذیل روایت بھی بیان

[۱] المیزان صفحہ ۵۲۰ — [۲] رد المعازنہ صفحہ ۳۴۶ — [۳] گل رعنا صفحہ ۲۴۳ تا ۲۴۴ — [۴] اودھ پنچ بابتہ ۱۵ اپریل یوم جمعہ سنہ ۸۲ء

کی جاتی ہے ۔

عمدۃ الملک نواب محمد امیر خاں انجام نے دہلی میں ایک انجمن قایم کی تھی جس کا کام زبان کی اصلاح لفظوں اور محاوروں کی تحقیق تھا جو لوگ اس کے رکن تھے ان کی زبان پاکیزگی اور صفائی میں خاص درجہ رکھتی تھی ۔

میر انیس کے دادا (میر ضاحک) اس انجمن کے ممبر تھے اس وجہ سے ان کے گھر کی زبان مخصوص درجہ رکھتی تھی اسی وجہ سے وہ اس پر فخر کرتے تھے ۔ معترضین اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انیس لکھنؤ کی زبان کے مقابلہ میں دہلی کی زبان پر فخر کرتے تھے لہذا لکھنؤ کی زبان پست اور انیس کی زبان دہلوی ہے ۔

عمدۃ الملکی انجمن کا ذکر سب سے پہلے لکھنؤ کے مشہور ڈراما نویس جناب احسن نے واقعات انیس میں کیا ہے اُن سے پہلے کے تمام مصنفین اس اہم واقعہ کا پتہ نہ دے سکے اور بعد کے تمام مصنفین کا ماخذ یہی کتاب ہے ۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس کے بعد جناب احسن کو اس راز سربستہ کا علم کیونکر ہوا اس کا کوئی ذکر انھوں نے نہیں کیا لہذا یہ روایت صرف اس لئے معتبر مان لی جائے کہ اس کے راوی جناب احسن ہیں میرے لئے ممکن نہیں مگر فرض کر لیجئے کہ جناب احسن کی رکھی ہوئی یہ خشت اول درست ہے تو اس پر جو دیوار کھڑی کی گئی ہے وہ کج نہ ہونا چاہئے لیکن عجب لطف ہے کہ خشت اول کی درستی مان لینے کے بعد بھی دیوار فلک بے مدار کی طرح سرنگوں ہے کیونکہ خود جناب احسن نے اسی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میر صاحب کے ایک دوست دہلی جانے لگے اُن سے فرمایا تم دہلی جاتے تو ہو تمھاری زبان بگڑ جائے گی پھر وہی درسے پرسے بولنے لگو گے اسی بنا پر مولوی امیر احمد صاحب بی ۔ اے یادگار انیس میں لکھتے ہیں :

" میر صاحب کو اپنی زبان پر ناز تھا اور وہ بعض محاورات میں اہل لکھنؤ کی تقلید نہیں کرتے تھے ، تاہم یہاں کی زبان کو دہلی کی مروجہ اُردو سے بہتر سمجھتے تھے ۔"

اس کے ثبوت میں انھوں نے یہ واقعہ بھی لکھدیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال کا ماخذ بھی یہی روایت ہے اب ہر روایت کو صحیح مانتے جایئے تو یہاں تک ثابت ہو گیا کہ میر صاحب لکھنؤ کی زبان کو دہلی کی زبان پر ترجیح دیتے تھے اس صورت میں ان کی زبان اگر دہلوی تھی تو لکھنؤ کی زبان کے مقابلہ میں کوئی فخر کا موقع نہیں رہ جاتا اور انداز کلام بتاتا ہے کہ یہ وہ بفخر کہہ رہے ہیں تو سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ان کی زبان نہ لکھنؤ کی تھی نہ دہلی اور ان کے قول کے تیوروں سے یہی ٹپکتا ہے کہ ان کے گھر کی کوئی مخصوص زبان تھی اس معمہ کو جناب احسن نے ایک اور تازہ روایت سے حل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ " فیض آباد میں ایک ادبی دفتر محاورات و ضرب الامثال کی تدوین کا قایم تھا ، میر حسن مرحوم اس کے میر منشی تھے ، ان کے بعد یہ خدمت خلیق کے سپرد ہوئی ، جب کوئی جدید محاورہ محلات شاہی سے ترش کے نکلتا دفتر میں قلمبند ہوتا [1]"

اگر جناب احسن کا یہ بیان بھی صحیح فرض کر لیا جائے تو میر انیس کے گھر میں تین پشت سے اصلاح زبان کا کام ہو رہا تھا جب ان کا گھرانا دہلی میں تھا اُسوقت اس کی اصلاحی قوت دہلی کی زبان پر صرف ہو کے اس کی ملکیت بنتی رہی اور جب اس نے وہاں سے نکل کر یہ کام انجام دیا اسوقت سے دہلی کی زبان میں فرق پیدا ہوتا رہا کیونکہ وہ اصلاحیں دہلی کی زبان کا جزو نہیں بنیں اس طرح ان کے گھر کی ایک مخصوص زبان ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اعتراض اور وہ تمام روایتیں جن سے ہم نے استدلال کیا ہے غلط ہیں

---

[1] اس روایت کی غلطی اسی سے ظاہر ہے کہ محاورہ ایسی چیز نہیں ہے جو کل بنے اور آج دفتر میں لکھ لیا جائے ۔

.... ورنہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک مدت سے انیس کا خاندان دہلی کو چھوڑ چکا تھا اور اس زمانہ میں جو تغیر ہوا اس نے دہلی کی زبان سے اس کو الگ کر دیا اس طرح ان کے گھر کی ایک خاص زبان بن گئی جو نہ دہلی کی تھی نہ لکھنؤ کی یعنی اس میں چند امتیازی خصوصیات پائے جاتے تھے جو نہ یہاں تھے نہ وہاں، دوسرا مطلب اس کا یہ نکلتا ہے کہ جن چیزوں میں دہلی اور لکھنؤ میں اختلاف تھا ان میں ترک و اختیار وہ اپنے ذوق کے مطابق رکھتے تھے کسی چیز کو وہ دہلی یا لکھنؤ کا سمجھ کے اختیار نہیں کرتے اس صورت سے ان کی ایک مخصوص زبان بن گئی تھی، کچھ دنوں کے بعد انیس لکھنؤ چلے آئے یہاں ناسخ زبان کی اصلاح کر چکے تھے انیس کی زبان اور لکھنؤ کی زبان میں ضرور فرق تھا جس کو وہ یہ کہکے ظاہر کر دیا کرتے تھے کہ میرے گھر کی زبان ہے اور ممکن ہے کہ یہ میر صاحب کے ابتدائی زمانہ کا قول ہوا اور اُن لفظوں اور محاوروں سے متعلق ہو جو زمانہ میر و سودا کے ان کی زبان پر باقی رہ گئے تھے اور اسوقت تک وہ ان کو ناقابل ترک سمجھ کر یہ کہدیا کرتے ہوں اور بعد میں وہ خود علامہ شبلی کے بقول ناسخ کے اثر سے یا مذاق بدلنے سے جس قدر زمانہ گزرتا گیا ہو ترک کرتے گئے ہوں۔ اور اگر اس کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ کچھ لفظیں اور محاورے خاص ان کے گھر کے تھے جو عام اہل لکھنؤ کی زبان پر نہ تھے تو جب لکھنؤ والوں نے ان کی زبان کو مستند مان لیا تو وہ محاورے بھی لکھنؤ کی زبان کا جزو بن گئے جناب فوق رضوی لکھتے ہیں :۔

"ان کی بلکہ ان کے گھر کی زبان اُردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں مستند مانی جاتی تھی"[۱۱]

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انیس نے کچھ لفظیں اپنی زبان کی ترک کر کے لکھنؤ کی درست کردہ لفظیں اور ترکیبیں اختیار کیں اور کچھ محاورے اہل لکھنؤ نے انیس سے لئے اور اس طرح لکھنؤ اور انیس کی زبان ایک ہو گئی جب یہ ثابت ہو گیا کہ انیس کی زبان اور لکھنؤ کی زبان دو الگ چیزیں نہیں ہیں تو انیس نے زبان کی جو کچھ خدمت کی وہ لکھنؤ کی زبان کی خدمت بھی اسی بنا پر حضرت اثر عظیم آبادی لکھتے ہیں :

"رزمی شاعری میں میر انیس، ہومر، ورجل، ملٹن اور فردوسی سب پر غالب ہیں —— کوئی شک نہیں کہ اُردو کی رزمی شاعری درجۂ کمال کو لکھنؤ میں پہونچی اور الحق یہ امر حضرات اہل لکھنؤ کے لئے ایک بڑا سرمایہ ناز ہے۔ اسی طرح مرزا دبیر نے شاعری کا رتبہ ایسا بلند کر دیا کہ اور زبانوں کی شاعری اسے دیدہ حیرت نگراں ہے۔ ارباب حقیقت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری اس درجہ کمال کو پہونچ گئی ہے کہ خود کمال شاعری ہو رہی ہے"[۱۲]

مولانا حالی نے خوب کہا ہے :۔

اُردو کو راج چار سو تیرا ہے — شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی — تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

علامۂ بلگرامی اور تمدن کا دیباچہ

معترضین کا قول ہے کہ علامہ سید علی بلگرامی نے تمدن عرب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ لکھنؤ کی زبان علمی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ اس میں ہندیت کم اور فارسیت زیادہ ہے۔

تمدن عرب میرے پیش نظر نہیں ہے اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ علامہ نے کیا لکھا ہے حسن ظن کہتا ہے کہ ان کا ایسا شخص ایسی غیر علمی بات نہیں لکھ سکتا کیونکہ لکھنؤ کی زبان جس میں بقول معترضین اور بقول علامہ عربی فارسی یعنی علمی زبانوں کی لفظیں زیادہ ہیں وہ تو علمی زبان بننے کی صلاحیت نہ رکھے اور دہلی کی زبان جس میں ہندیت کا غلبہ ہے علمی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہو باوجودیکہ خود ہندی آج تک علمی زبان نہ بن سکی یہ منطق ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی۔

محمد باقر شمس لکھنوی

داستان انقلاب چین

چین کا رقبہ ۴۲۷۸۰۰۰ مربع میل ہے اور آبادی ۴۵۸۰۰۰۰۰۰ ہے۔ چین کی تاریخ اور چینی تمدن کا شمار دنیا کی قدیم ترین تاریخ و تمدن میں ہوتا ہے روس میں سویٹ حکومت کے قیام سے ایک ہزار سال پہلے چین میں اشتراکی طرز کی حکومت قایم تھی۔ ہڑتالیں جن کو بیسویں صدی میں احتجاج کا موثر طریقہ سمجھا جاتا ہے، چینی آج سے بہت پہلے اس حربے کے استعمال سے واقف تھے اور بہت ممکن ہے کہ یہ انھیں کی ایجاد ہو۔ حکومت کے جن قوانین اور فیصلوں کو عوام نامناسب سمجھتے، اُن پر وہ سختی کے ساتھ تنقید کرتے، بلکہ ملک میں پیشہ ور ناقدین بھی پائے جاتے تھے جو بادشاہ وقت کے سامنے باشندگان ملک کے نمایندے کی حیثیت سے جاتے اور بڑی بیباکی کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں خود اُس کے فیصلوں پر نکتہ چینی کرتے۔ دنیا کا پہلا اخبار بھی شاید چین ہی سے نکلا تھا۔ اور طباعت کے فن سے چینی آج سے تیرہ سو برس پہلے صرف واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس فن میں اُن کو پوری مہارت حاصل تھی۔

سیاسی اعتبار سے ایشیا کے اور ملکوں کی طرح چین نے بھی اَن گنت حکمران خاندانوں کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ایک جنگجو قبیلہ اُٹھتا اور باشندگان ملک کی اقتصادی زبوں حالی سے فایدہ اُٹھا کر حکمران وقت کا تختہ اُلٹ دیا اور اپنی حکومت قایم کر لیتا۔ کچھ دنوں کے بعد کوئی دوسرا جنگجو قبیلہ اُٹھ کھڑا ہوتا، وہ بھی اپنے پیش رو کے نقش قدم پر چل کر اُس کا خاتمہ کر دیتا۔ چین کا آخری فاتح مانچو خاندان تھا جو سترھویں صدی میں (۱۶۴۴ء میں) برسر اقتدار آیا۔ اُنیسویں صدی میں مغربی طاقتوں نے چین کے اندر در خور حاصل کرنا شروع کیا اور یہی زمانہ چین کی موجودہ تاریخ کا بنیادی دور ہے۔

مغربی حکومتیں بقول شخصے "ایک ہاتھ میں انجیل اور دوسرے ہاتھ میں افیون" لئے ہوئے سرزمین چین میں داخل ہوئیں اور تھوڑے عرصہ کے بعد چین کے بازاروں پر بھی یورپ کا تسلط قایم ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ چینی صنعتوں کا خاتمہ تھا۔ لاتعداد مزدور اور کاریگر بیکار ہو گئے جس نے ملک کی اندرونی بے اطمینانی میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ مانچو حکمرانوں کو غیر ملکی طاقتوں نے کثیر رقمیں بطور رشوت دی تھیں جس کی وجہ سے وہ خاموش تھے مگر ملک کی اقتصادی تباہ حالی نے جب اُن کی زندگی بھی خطرہ میں ڈال دی تو وہ بیدار ہوئے اور انھوں نے افیون کی تجارت کی مخالفت شروع کی۔ اس مخالفت کا نتیجہ "افیون کی جنگ" کی شکل میں برآمد ہوا۔ یہ لڑائیاں ۱۸۴۲ء اور ۱۸۵۸ء میں ہوئیں لیکن یورپ کے جدید اسلحوں کا مقابلہ چین کی قدیم تلوار نہیں کر سکی۔ بالآخر چین کو شکست ہوئی، تاوان جنگ کے علاوہ چینیوں کو اپنے کئی بندرگاہوں سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔

یورپ کے بعد امریکہ کی باری آئی۔ اُس نے افیون کی جگہ سگریٹ اور تمباکو کا جال پھیلایا۔ امریکہ چونکہ بعد میں آیا اس لئے وہ اپنے ساتھ پروپیگنڈے کے جدید آلات بھی لایا۔ چنانچہ امریکہ نے ایک چینی پروفیسر کی خدمات حاصل کیں جس نے چینی عوام کو تمباکو نوشی کے فواید بتلائے اور اس کا بھی اُن کو یقین دلایا کہ پندرھویں صدی میں اُن کے آبا و اجداد کثرت کے ساتھ تمباکو کا استعمال کرتے تھے

اور اُن کی کامیابی کا راز بھی تمباکو نوشی میں مضمر تھا۔

زمانہ جوں جوں گزرتا گیا ملک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اندرون ملک میں حکومت اور غیر ملکی دونوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اُنیسویں صدی کا درمیانی زمانہ چینیوں کے لئے بڑا ابرا زمانہ تھا۔ قحط، طغیانی، اور طاعون کی مصیبت سب پر بالا رہی۔ یہاں تک کہ ان ارضی و سماوی مصائب نے چینیوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ مگر یہ بغاوت کامیاب نہ ہو سکی، کیونکہ یہ کوئی منظم تحریک نہ تھی۔ پہلی منظم بغاوت ۱۸۵۲ء میں شروع ہوئی جو چینی تاریخ میں تحریک ٹیپنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک میں چین کے پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے۔ اُسی زمانہ میں شمالی حصۂ ملک کے مسلمانوں نے بھی بغاوت کی۔ ان حالات نے مانچو خاندان کی بنیادیں متزلزل کردیں ٹیپنگ فوجوں نے شمالی صوبہ میں اپنی حکومت بھی قایم کر لی۔ لیکن یہ تحریک آپس کی پھوٹ کی وجہ سے نہ چل سکی اور مانچو خاندان کی گرتی ہوئی دیواریں پھر سنبھل گئیں گو اندر ہی اندر جو گھن لگ گیا تھا اُس کا علاج نہ ہو سکا۔ روس، جرمنی، فرانس اور برطانیہ سب ہی نے مانچو حکومت کی کمزوری سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہا۔ جاپان نے ۱۸۹۵ء میں کوریا پر حملہ کر دیا۔ چین کو شکست ہوئی۔ اس شکست کا عوام پر بہت برا اثر پڑا اب انھوں نے اصلاحات کا مطالبہ شروع کیا۔ ملک کے اندرونی حصوں میں کثرت کے ساتھ خفیہ انجمنیں قایم ہونے لگیں۔

۱۹۰۵ء میں کیومنٹانگ (عوام کی قومی پارٹی) قائم ہوئی۔ اس پارٹی میں پڑھے لکھے لوگ اور چینی متوسط طبقہ کے افراد شامل تھے اس کا مقصد ملک کے فوجی نوابوں (war lords) کی مدد سے مانچو خاندان کا تختہ اُلٹ کر قومی حکومت کا قیام تھا۔ یہ فوجی نواب خود اسی فکر میں تھے اور انھوں نے موقعہ سے فائدہ اُٹھایا۔ مانچو حکومت اندرونی اعتبار سے قطعاً دیوالیہ ہو چکی تھی اور ہوا کا ایک ادنیٰ سا ادنیٰ جھونکا اُس کا چراغ گل کر سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں کیومنٹانگ نے فوجی نوابوں کی مدد سے مانچو خاندان کی شہنشاہیت کا خاتمہ کر کے چینی جمہوریت قائم کی۔ یہ تھا چین کا پہلا سیاسی انقلاب۔

چینی جمہوریت کے پہلے صدر کیومنٹانگ کے سب سے بڑے لیڈر ڈاکٹر سن یاٹ سون تھے۔ ملک میں جمہوریت کا قیام تو عمل میں آگیا لیکن طاقت کا اصل منبع فوجی نوابوں کے ہاتھ میں رہا جو اب اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر سن یاٹ سون کی صدارت ایک مہینہ بھی مشکل سے چل سکی اور اُن کو بالآخر صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ ان کی جگہ سب سے بڑے فوجی نواب یوآن Yuan نے لی۔ اُس نے برسر اقتدار آتے ہی انقلابی عناصر کا خاتمہ کر دیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عوام کو کیومنٹانگ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی کیونکہ عوام یہ محسوس کر رہے تھے کہ خود کیومنٹانگ کو اُن کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے اور اس انقلاب کا مقصد عوام کی جمہوریت کا قیام نہیں ہے .... خود کیومنٹانگ والے بھی اب اپنی غلطی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن بجائے اصلاح کے اُنھوں نے اپنی غلطی نباہنے کی کوشش کی۔ چنانچہ پہلی غلطی کے بعد دوسری غلطی یہ کی گئی کہ فوجی نوابوں کی طاقت کم کرنے کے لئے قوم پروروں نے اُن کو ایک دوسرے کے خلاف لڑانا شروع کیا۔ اور ایسے وقت میں جبکہ ملک اقتصادی اعتبار سے دیوالیہ پن کی حد تک پہونچ چکا تھا، ان خانہ جنگیوں نے صورت حال بد سے بدتر کر دی

ڈاکٹر سن یاٹ سون حقیقی معنوں میں قطعاً انقلابی نہیں تھے۔ اُن کی پالیسی بالکل وہی تھی جو ہندوستان میں گاندھی جی کی پالیسی ہے۔ اگر ہم گاندھی جی کے فلسفہ سے عدم تشدد کا حصہ علیحدہ کر دیں تو اُن دونوں کے فلسفۂ سیاست میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ڈاکٹر سن یاٹ سون نے کبھی بھی کسی ایسی بغاوت کی طیاری نہیں کی جس کو ہم عوام کی بغاوت کہہ سکیں۔ اُن کو عوام سے کوئی خاص ہمدردی بھی نہ تھی اور نہ وہ چین میں کسی ایسی جمہوریت کا قیام چاہتے تھے جو چینی عوام کی حکومت، چینی عوام کی بھلائی و بہبودی کے لئے ہو

بلکہ اُن کا مقصد ایک ایسی حکومت کا قیام تھا جس پر چینی دولتمند طبقہ کا تسلط ہو اور یہی اصل وجہ تھی کہ انھوں نے عوام کے اندر کبھی بھی انقلابی بیداری پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حصول مقصد کے لئے وہ عوام کی امداد بھی نہیں چاہتے تھے بلکہ غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ اتحاد کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔

ایشیا کے اور ملکوں کی طرح چین میں بھی انقلابی ذہنیت دراصل گزشتہ جنگ عظیم نے پیدا کی۔ بیس لاکھ سے زاید چینی مزدور جنگ کے زمانہ میں مغربی ممالک میں گئے تھے اور واپسی میں وہ اپنے ساتھ جدید مغربی خیالات لائے۔ دوسری طرف چین کے پڑوسی ملک روس میں انھیں دنوں انقلاب ہوا تھا، جہاں مزدوروں نے زار کا خاتمہ کرکے مزدور حکومت قایم کی تھی۔ روسی یہ چاہتے تھے کہ ان کا ہمسایہ چین بھی اُن کے نقش قدم پر چل کر دیسی اور بدیسی دونوں غلامیوں سے نجات حاصل کرے۔ چنانچہ سویٹ روس نے اپنے کچھ نمایندے بھی چین بھیجے۔ یہاں ساحلی شہروں میں جہاں صنعتی کارخانے قایم تھے مزدوروں کی انجمنیں پہلے ہی سے قایم تھیں۔ اور اندرون ملک میں کسانوں کے اندر بھی انقلاب کی آگ سلگ رہی تھی کیونکہ فوجی نوابوں کا تشدد اب ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ اس موقعہ پر غیر ملکی طاقتوں نے کیومنٹانگ کا ساتھ دیا اور ڈاکٹر سن یاٹ سون نے ننکنگ میں قومی حکومت قایم کی — اس سلسلہ میں سویٹ یونین کی امداد بھی قابل ذکر ہے ننکنگ میں حکومت قایم کرنے کے بعد ڈاکٹر سن یاٹ سون نے کیومنٹانگ کی از سر نو تنظیم شروع کی۔ ان کی خواہش تھی کہ چین کے دوسرے حصّوں میں بھی فوجی نوابوں کا اقتدار ختم ہو جائے لیکن یہ کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس کام کے لئے انھوں نے سوویٹ یونین سے اشتراک عمل چاہا۔

سوویٹ حکومت نے اپنے قیام کے ساتھ ہی اس کا اعلان کر دیا تھا کہ زار کی حکومت نے چین سے ناجایز فایدہ اُٹھانے کے لئے جو سامراجی معاہدات کئے تھے اور اُن معاہدات کی رو سے روس کو جو سامراجی حقوق حاصل ہیں وہ اُن سب حقوق سے دستبردار ہوتا ہے اور چین کے ساتھ مساوات کا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ اس اعلان کا چینی عوام پر بہت اچھا اثر پڑا اور چینیوں کو جلد ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ صرف لفاظی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں خلوص اور نیک نیتی ہے، اس احساس نے چینیوں کی نظروں میں سوویٹ حکومت کی وقعت اور بھی بڑھا دی — ڈاکٹر سن یاٹ سون اپنے کو سوشلسٹ کہتے تو تھے، جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس طرح سے سوویٹ حکومت کو بھی وہ خوش رکھنا چاہتے تھے، مگر دراصل اُن کو سوشلزم کی ہوا بھی نہیں لگی تھی بلکہ وہ سوویٹ یونین اور عوام کی انقلابی تحریک سے خائف تھے۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جو شخص عوام سے خائف ہو وہ کبھی بھی سوشلسٹ نہیں ہو سکتا کیونکہ سوشلزم تو عوام ہی کی چیز ہے۔ روس کے اعلان کے بعد ڈاکٹر سن یاٹ سون کو امید تھی کہ یورپ اور امریکہ کی حکومتیں بھی اپنے مفاد سے دستبردار ہو جائیں گی اور چین کے ساتھ برابری کا سلوک کریں گی .... لیکن ۲۱-۲۲ء کی واشنگٹن کانفرنس نے یہ بات ثابت کر دی کہ یہ طاقتیں نہ تو اپنے چینی مفاد سے دستکش ہونا چاہتی ہیں اور نہ اُس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کسی حال میں کرنے کے لئے طیار ہیں، بلکہ روس جن چیزوں سے دستبردار ہوا ہے، وہ اُس کو اپنے تصرف میں لانا چاہتی ہیں۔ دوسری طرف ان طاقتوں نے یہ کوشش شروع کی کہ چین اور سوویٹ روس کے درمیان دوستانہ تعلقات نہ پیدا ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے چین کے فوجی نوابوں کو اپنا آلۂ کار بنایا، چونکہ خود ڈاکٹر سون کو اشتراکیت کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی اس لئے وہ بہ آسانی طاقتوں کی چالوں کا شکار بن گئے...... لیکن کسی حال میں وہ سوویٹ حکومت سے ناتا بھی نہیں توڑنا چاہتے تھے کیونکہ اب اگر کوئی سہارا تھا تو [illegible] صرف سوویٹ روس ہی کا سہارا تھا۔

چین اِس وقت چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں تھا۔ اشتراکیت اور سامراجیت۔ ڈاکٹر سن یات سون اور کمیونسٹ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے ناگزیر تھے۔ ڈاکٹر سن یات سون کمیونسٹوں کے ارادوں سے بخوبی واقف تھے اور کمیونسٹوں کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن اِس سلسلہ میں کمیونسٹوں کو ڈاکٹر سن یات سون کی جتنی ضرورت تھی اُس سے کہیں زیادہ خود کمیونسٹ اُن کے لئے ضروری تھے۔ اس صورت حال نے اُن کو مجبور کیا کہ کیومنٹینگ میں وہ اشتراکی عنصر کو بھی داخل ہونے دیں۔ ڈاکٹر سن یاٹ سون نے اپنے شاگرد رشید چینگ کائی شیک کو "انقلاب اور جنگ" کے مطالعہ کے لئے ماسکو روانہ کیا اور اس کے جواب میں سوویٹ یونین نے مائکل بورو ڈن کو اپنے نمایندہ کی حیثیت سے چین بھیجا۔ اس وقت چین کی قومی فوج کے افسر پرانے فوجی نوابوں کے آدمی تھے، اُن کی جگہ پر ڈاکٹر سن یاٹ سون نے سُرخ فوج کے کچھ سپاہی بھی مقرر کئے اور "وہامپو ملٹری اکیڈمی" بھی سوویٹ روس ہی کی کوششوں سے قایم ہوئی اس اکیڈمی میں تقریبًا سارے کے سارے اُستاد روسی ہی تھے اور اُنھوں نے جلد ہی چینی فوج کی اصلاح کر کے، ایک عظیم الشان قومی فوج طیار کی اس فوج میں مزدور اور کسان بھی تھے۔ دوسری طرف اندرون ملک میں انقلابی عناصر تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے تھے۔

۱۹۲۵ء میں ملک نے انقلابی رنگ اختیار کرنا شروع کیا اور اس کی ابتدا ہڑتالوں کی شکل میں شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اس کا پہلا حملہ ہانگ کانگ پر ہوا جو چین میں برطانوی طاقت کا سب سے بڑا گڑھ تھا تمام چینی اور برطانوی کارخانے یکایک بند ہوگئے۔ ساحلی مزدوروں نے بھی اپنا کام روک دیا۔ اس کے ساتھ ہی برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تحریک بھی پورے زوروں کے ساتھ شروع ہوئی ــ ہانگ کانگ میں تقریبًا ایک لاکھ مزدور تھے اُن لوگوں نے اب کینٹن کی طرف مارچ کرنا شروع کیا۔ غیر ملکی سامراجی طاقتوں نے چین کے فوجی نوابوں کے ساتھ اشتراک عمل شروع کیا، کیونکہ انقلاب نے دونوں کی زندگی خطرہ میں ڈالدی تھی۔ دوسری طرف کیومنٹینگ اور کمیونسٹ تھے اور ان دونوں کی متحدہ قوت کے مقابلہ میں سامراج کی طاقتیں نہیں کھڑی ہوسکتی تھیں۔ دونوں نے جم کر ایک دوسرے کا مقابلہ کیا۔

چین کے سب سے بڑے لیڈر اور کیومنٹینگ کے روح رواں ڈاکٹر سن یاٹ سون ۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء کو اس دُنیا سے گزر گئے۔ اُن کی موت نے چینی سیاست میں جو جگہ خالی کی تھی اُس کے امیدوار بہت تھے۔ ان میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک تو وانگ چنگ وی جو اسوقت فوجی حکومت کا افسر اعلیٰ تھا، اور دوسرا حریف چنگ کائی شیک تھا۔ ان دونوں کی پالیسی میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ وانگ اشتراکی رجحان کا آدمی تھا اور اس کے برعکس چینگ کائی شیک اپنے اُستاد کی طرح دولتمند طبقہ کے خیال کا تھا۔ لیکن وانگ کی پوزیشن چینگ سے زیادہ مضبوط تھی، کیونکہ اس وقت حکومت کی تمام اہم جگہیں اُس کے قبضہ میں تھیں اور چینگ صرف "وہامپو ملٹری اکاڈیمی" کا افسر اعلیٰ اور پہلی فوج کا کمانڈر تھا۔

اِس وقت کیومنٹینگ بھی واضح طور پر داہنے اور بائیں بازوؤں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ داہنا بازو کمیونسٹوں کے خلاف اور سامراجی طاقتوں کے زیر اثر تھا۔ لیکن خود چینگ کائی شیک نے اس موقعہ پر کمیونسٹوں کا ساتھ دینا اپنے لئے مناسب سمجھا اور وہ پکا کمیونسٹ بن بیٹھا اگرچہ دل میں وہ اُن کا پکا دشمن تھا۔ خود کمیونسٹ چنگ کی اس دوہری پالیسی کو سمجھ رہے تھے مگر اس کے باوجود انھوں نے اُسکا ساتھ دیا۔ اس چیز نے چینگ کائی شیک کی پوزیشن مضبوط کردی۔

کیومنٹینگ کے داہنے بازو والوں نے یکایک یہ خبر مشہور کی کہ کمیونسٹ خفیہ طور پر انقلاب کی طیاری کر رہے ہیں، اس افواہ سے فایدہ اُٹھا کر چینگ کائی شیک نے تمام کمیونسٹوں کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا، اس حکم کی تعمیل برقی سرعت کے ساتھ کی گئی اور اس واقعہ

کے دوسرے دن وہ کنیٹن کا مالک تھا۔ یہ قصہ ۲۰ مارچ ۱۹۲۶ء کا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی کیومنتنگ کا ایک جلسہ بھی چینگ نے طلب کیا جس نے اُس کی لیڈرشپ منظور کرلی۔ اب وہ جنرل ازمو چینگ کائی شیک تھا۔ اس کانفرنس نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ کمیونسٹوں اور اُن کی سرگرمیوں پر بہت سی پابندیاں لگا دیں۔ اب کیومنتنگ کے ممبر کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں ہوسکتے تھے۔ سرکاری دفاتر میں جتنے کمیونسٹ خیال کے لوگ تھے اُن کو بھی علٰحدہ کردیا گیا۔ جب یہ سب انتظامات مکمل ہوگئے اور کسی قسم کا خطرہ نہ رہا تو کمیونسٹوں کی رہائی کا حکم جنرل ازمو نے صادر کیا۔

رہا ہونے کے بعد کمیونسٹوں نے صورت حال بالکل بدلی ہوئی پائی۔ اُن کے لئے ایک کھلی ہوئی صورت یہ تھی کہ وہ چینگ کائی شیک کے خلاف عام بغاوت کرتے، لیکن اس کا نتیجہ سوا اس کے اور کیا ہوسکتا تھا کہ سارا ملک پھر فوجی نوابوں کے زیر اقتدار آجائے اور انقلاب کا سرے سے خاتمہ ہوجائے۔ کومنٹرن (بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی) کا بھی یہی خیال تھا۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ اس وقت کمیونسٹ خاموشی کے ساتھ چینگ کائی شیک کا ساتھ دیں بلکہ سارے ملک میں قومی حکومت قایم ہوجائے اور پھر جب فوجی نوابوں کے اقتدار کا کوئی سوال باقی نہ رہے تو اس وقت چینگ کائی شیک کے خلاف بغاوت کی جائے۔ یعنی جو کھیل اب تک خود چینگ کائی شیک نے کھیلا تھا، اب اُسی کھیل کو کمیونسٹوں نے شروع کیا۔

چینگ کائی شیک اس وقت چین کا سب سے بڑا "ہیرو" تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پوری قوم کی قسمت تھی۔ وہ اگر چاہتا تو ملک غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرسکتا اور اگر وہ چاہتا تو ایک پل میں سارا کیا دھرا خاک میں مل سکتا۔ چین کے کمیونسٹوں اور سوویٹ یونین دونوں کو اس کا یقین تھا اور وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ چینگ کائی شیک کمیونسٹوں کا جانی دشمن بھی ہے، لیکن ان کو اس کا بھی یقین تھا کہ وہ کمیونسٹوں کے خلاف کھلا اعلان جنگ بھی کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔

اِس وقت کیومنتنگ کے زیر اقتدار کانگ ٹنگ کا صوبہ تھا۔ یہاں جب چینگ کائی شیک کا پورا تسلط ہوگیا اور اُس نے اپنی طاقت بھی منظم کرلی تو اُس نے شمالی حصہ ملک کی طرف نظریں دوڑائیں جہاں پرانے فوجی نوابوں کا اقتدار تھا۔ جنوبی حصہ ملک (کانگ ٹنگ) میں کیومنتنگ کو جو کامیابی نصیب ہوئی تھی، اُس نے سارے ملک کے کسانوں مزدوروں اور دوسرے مظلوموں کے دلوں میں بھی امید کی کرن پیدا کی۔ وہ سب کے سب بغاوت کے لئے بالکل تیار تھے۔ کمیونسٹوں نے بھی وہاں پوری طاقت کے ساتھ پروپیگنڈا کیا تھا۔ گویا چین اب ایک تودۂ بارود تھا جو ایک ادنیٰ چنگاری سے بھڑک سکتا تھا۔

چینگ کائی شیک کی فوجیں کانگ ٹنگ سے طوفان کی طرح اُٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے شمالی حصہ ملک پر کیومنتنگ کے سپاہی چھاگئے۔ ہر جگہ کسانوں اور کمیونسٹوں نے اس مظفر و منصور فوج کا استقبال کیا۔ بلکہ اکثر شہروں میں تو کیومنتنگ کی فوجوں کے پہونچنے سے پہلے مقامی کمیونسٹوں نے تسلط قایم کرلیا تھا۔ اس طرح سے چند ہفتوں کے اندر کیومنتنگ کی فوجوں کا تسلط ہونان کے صوبہ پر بھی قایم ہوگیا، جس کا دارالسلطنت چنگا سا تھا۔ اُس کے بعد صوبہ ہوپی کا نمبر آیا اور وہاں بھی کم و بیش یہی ہوا۔ چینگ کائی شیک اب یہ محسوس کررہا تھا کہ اس وقت کمیونسٹوں کی مدد سے وہ پورے چین پر تسلط حاصل کرسکتا ہے لیکن اُس کا یہ تسلط خود اُس کے خواب کی تعبیر نہ ہوگا اور کمیونسٹ اُس پر متسلط ہوں گے۔ یقیناً وہ اگر چاہتا تو وہ عوام کی حکومت قایم کرکے ڈکٹیٹر بن سکتا تھا۔ .... لیکن وہ تو فوجی ڈکٹیٹر بن جانے کا آرزومند تھا تاکہ دولتمند طبقہ کے مفاد کا بچاؤ کرسکے اور یہیں سے چین کی انقلابی تاریخ کے دھارے نے پلٹا کھایا ہے۔

چینگ کائی شیک اس وقت کینیا گسی میں تھا اور اب شنگھائی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا جو چین میں غیر ملکی طاقتوں کا مرکز تھا۔ لیکن کمیونسٹوں نے اور کیومنتانگ کے دوسرے انتہا پسندوں نے جن کو چینگ کے خیالات اور اس کی جھجک کا احساس ہوگیا تھا انھوں نے کیومنتانگ کا ایک جلسہ طلب کیا اور اس جلسہ میں یہ طے پایا کہ انقلاب کی دشمنی کے دھاروں کو پوری قوت کے ساتھ روکا جائے اور ایک فرد واحد کے ہاتھ میں ملک کی پوری فوجی طاقت نہ ہونی چاہئے یعنی ایک سال قبل جو اختیارات چینگ کائی شیک کو دئے گئے تھے اب کیومنتانگ نے وہ اختیارات واپس لے لئے۔ چنانچہ چینگ کائی شیک نے سنٹرل اگزیکیٹیو کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دیدیا۔ ایک دوسری تجویز میں "حقیقی قومی حکومت" کا قیام طے پایا۔ چینگ کائی شیک نے اب تک بڑی احتیاط کے ساتھ چھوٹے چھوٹے دفتری عہدوں پر کمیونسٹوں کو رکھا تھا اور بڑی جگہیں اپنے معتمدوں سے پر کی تھیں۔ لیکن اس تجویز نے پوری صورت حال بدلدی اور اب جو نئی حکومت مرتب ہوئی وہ صحیح معنوں میں قومی حکومت تھی جس میں ہر پارٹی کے نمایندے شامل کئے گئے۔

ان حالات نے چینگ کائی شیک کو مجبور کیا کہ کمیونسٹ دوستی کی جو نقاب اس نے اب تک ڈال رکھی تھی اس کو وہ اتار پھینکے۔ اس نے اب پھر ملک کے انقلاب دشمن پرانے فوجی عناصر سے اپنا ناتا جوڑنا شروع کیا اور کمیونسٹوں کی کھلم کھلا دشمنی پر کمر باندھی۔ شنگھائی میں جب چینگ کائی شیک پہونچا تو حسب معمول وہاں پہلے ہی سے ہڑتالیں تھیں۔ لاکھوں مزدور اس "قومی فوج" کے استقبال کے لئے صف بستہ تھے، لیکن ان کی آن میں ان کی ساری مسرتوں کا صرف خون ہی نہیں ہوا بلکہ خود ان کا بھی خون کرنا شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ شنگھائی کی سڑکوں پر لاتعداد مزدوروں، کمیونسٹوں اور طالبعلموں کا خون بہایا گیا۔ اس وقت چینگ کائی شیک نے شنگھائی کے سامراج پرست جہانجو غیر ملکی طاقتوں اور پرانے فوجی لوگوں کے ساتھ دوستی کر لی۔ شہر کے اندر جو انقلابی عناصر تھے اول تو ان کا بیشتر حصہ وہیں دفن ہوگیا اور جو بچ رہے تھے وہ بھاگ نکلے۔ شنگھائی کی سڑکوں پر سفاکی و بربریت کا جو مظاہرہ کیا گیا اس نے لوگوں کے دلوں میں ہلاکو و چنگیز خاں کی یاد تازہ کر دی۔

طویل مارچ

طویل مارچ (Long March) چین کی تاریخ کا نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ کا عجیب وغریب و حیرتناک باب ہے جو عزم وہمت اور سفاکی و بربریت کے لاتعداد افسانے اپنے اندر لئے ہوئے ہے، مسٹر فرینک اوون (Frank Owen) جو ایک سامراجی مصنف ہیں انھوں نے ایک کتابچہ "ہمارا ساتھی چین" (Our Ally China) کے نام سے لکھا ہے۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر ولنگٹن کو نے لکھا ہے جو "کورٹ آف سینٹ جمیس میں پہلے چینی سفیر ہیں" یعنی جنرل ازمو چینگ کائی شیک کے نمایندے ہیں۔ مسٹر فرینک اوون لکھتے ہیں کہ[1] "یہ ایک ایسی داستان ہے جو ساری کی ساری چینگ کائی شیک کے خلاف ہے۔ کم از کم چینی بہادری کی اس رزم گاہ میں وہ دوسری صف میں تھا۔ اس وقت ہیرو، اس آدم خور میں تبدیل ہوگیا جو دوسرے ہیروؤں کو کھا جانا چاہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی، اور آج وہی ہیرو (جن کو وہ کھا جانا چاہتا تھا) اسکی فوج کے سپاہی اور جنرل ہیں اور آج وہ اس لڑائی سے کہیں بڑھی چڑھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔

جنرل ازمو چینگ کائی شیک نے چین کے فاتحانہ انقلاب کو دریائے یانگ ٹسی کے کناروں تک پہونچا دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سرخ ساتھیوں (کمیونسٹوں) اور فوجی نوابوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ چین کی یہ دس سالہ (۱۹۲۷ء-۳۷ء) تاریخ خونریزی، غداری، قساوت اور دنائت کا باب ہے ....

۱؎ Our Ally China pp. 38.

کمیونسٹ چنگ سا کے قریب ایک پہاڑی قلعہ کی طرف چلے گئے تھے۔ وہاں اُن لوگوں نے ایک سوویٹ جمہوریت قایم کی اور سُرخ فوج کی تنظیم کا کام شروع کیا .... وہاں اُن لوگوں نے اپنے سکّے چلائے، اپنی عدالتیں قایم کیں، ٹیکس تشخیص کئے اور اپنی فوج مرتب کی۔ ان لوگوں نے وہاں کے پُرانے تمام قرضے منسوخ کر دئے، زمین ازسرِ نو تقسیم کی اور اسکول قایم کئے۔ اس حکومت میں تقریباً دو کرور افراد ہیں"۔

چیانگ کائی شیک نے اس سوویٹ جمہوریت کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور اس سلسلہ میں اُس نے اس پہاڑی سوویٹ پر پانچ حملے کئے اور آخری حملے کے وقت اُس کے ساتھ ٹینک ہوائی جہاز اور توپوں سے مسلح دس لاکھ فوج تھی۔ اور فریقِ مخالف کے پاس ایک لاکھ رائفلیں تو تھیں مگر اس کے علاوہ اور دوسرے کوئی میکانیکی اسلحات نہ تھے سوا نصف درجن ہوا بازوں اور چند جنگی توپوں کے۔ ہاں گوریلا لڑائی کے فن سے وہ دُنیا میں سب سے زیادہ ماہر تھے .... کہا جاتا ہے کہ ہر سُرخ سپاہی جو مارا گیا، اُس کو مارنے کے لئے چیانگ کو سولہ ہزار پونڈ صرف کرنے پڑے"۔

سات سال تک مقابلہ کرنے کے بعد کمیونسٹوں نے بالآخر اس "چینی عوامی جمہوریت کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ ہے طویل مارچ کی ابتداء ـــــ چھ ہزار میل کی طویل مسافت ـ یہ قافلہ نوے ہزار فوج پر مشتمل تھا اور اس کا سالار قافلہ "چین کا لینن" ماؤزے تنگ ( ) تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر تقریباً پچاس برس سے اوپر تھی۔ راہ میں دریا بھی حائل تھے اور بلند پہاڑ بھی تھے، ان میں بعض پہاڑوں کی بلندی سولہ ہزار فٹ ہے۔ راہ کے خطروں اور دشواریوں سے قطع نظر خود اُن کے پیچھے پیچھے دشمن کی اُن سے دس گنی زیادہ تعداد اُن کا تعاقب کرتی آرہی تھی۔ راہ میں اُن کو پندرہ لڑائیاں لڑنی پڑیں بالآخر ۲۳۵ دن و رات سفر کرنے کے بعد وہ اپنی منزلِ مقصود کو پہونچے۔ یہ سفر انھوں نے تقریباً ۲۴ میل روزانہ کے اوسط سے کیا۔

اب اُن لوگوں نے شنشی میں "چینی سوویٹ حکومت" قایم کی۔ اس علاقہ کی سرحد تقریباً سوویٹ روس سے مل جاتی ہے۔

جنرلِ ازمو چیانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں کے خلاف ...وں کا جو سلسلہ جاری کر رکھا تھا، اُس نے ایک طرف اقتصادی اعتبار سے چین کی حالت تباہ کر دی اور دوسری طرف چین میں جاپان کا اقتدار بڑھنے لگا اور اس صورت حال نے چینی عوام اور کمیونسٹ دونوں کو پریشان کر دیا۔ عوام کے اندر یہ خیال اب راسخ ہونے لگا تھا کہ جنرلِ ازمو جاپان کی طرف سے ارادتاً لاپرواہی برت رہا ہے۔ کمیونسٹوں نے تو اس موقعہ پر جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور اُس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک اپیل شایع کی جس میں اس کا اعلان کیا کہ جاپان کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اپنے انقلابی پروگرام سے بھی فی الحال دستبردار ہونے کے لئے طیار ہیں۔ لیکن چیانگ کائی شیک نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور اس اپیل کو مسترد کر دیا عین اُسی زمانہ میں جاپان نے چین کے شمالی و مغربی حصہ میں دست درازیاں شروع کیں۔ ملک کے مختلف حصوں سے جنرلِ ازمو سے لوگ اپیل کر رہے تھے کہ وہ اس وقت کمیونسٹوں سے اور سوویٹ یونین سے صلح کر کے جاپان کا متحدہ مقابلہ کرے۔ جا بجا اسی مقصد کے لئے انجمنیں بھی بن رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم انجمن وہ تھی جو جنرلِ ازمو کے اُستاد ڈاکٹر سن یاٹ سون کی بیوہ (میڈم سن یاٹ سون، جنرلِ ازمو کی سالی) نے "قومی نجات کی انجمن" کے نام سے قایم کی تھی۔

جنرلِ ازمو نے اِن حالات کی کوئی پروا نہ کی اور اُس کے سر میں کمیونسٹوں کے کچلنے کی جو دھن سمائی وہ بدستور قایم رہی۔ اب وہ کمیونسٹوں کے خلاف اپنی چھٹی مہم کی طیاریوں میں مصروف تھا۔ مارشل چیانگ جو شمالی حصۂ ملک کی فوجوں کا کمانڈر انچیف تھا اُس نے جنرلِ ازمو کو تنبیہ بھی کیا کہ اگر اس وقت جاپان کے مقابلہ کی تیاری نہ کی گئی تو ملک میں عام بغاوت ہو جانے کا امکان ہے۔ "اور اگر حکومت نے عوام کے جذبات کو ٹھکرایا تو وہ قایم نہ رہ سکے گا" مارشل جنگ، جنرلِ ازمو کا نائب تھا۔ اُس نے اس کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ اگر

جاپان کی طرف توجہ نہ کی گئی اور کمیونسٹوں کا معاملہ امن وصلح کے ساتھ نہ طے کیا گیا تو ممکن ہے کہ فوج کے سپاہی بھی ہمارا ساتھ نہ دیں۔ کچھ عرصہ کے بعد جب جنرل ازمو، نوجوان مارشل جنگ کی فوجوں کے معائنہ کے لئے گیا تو یہ حقیقت اس پر اچھی طرح روشن ہوگئی۔ اس موقعہ پر بھی مارشل جنگ نے کمیونسٹوں کے ساتھ مصالحت کی تجویز پیش کی، لیکن جنرل ازمو نے جواب دیا کہ " میں ان لوگوں سے اُسوقت تک بات بھی نہ کروں گا جب تک کہ یا تو ہر کمیونسٹ مار نہ ڈالا جائے یا گرفتار نہ ہو جائے "

ملک میں ہر طرف احتجاج کے شعلے بلند ہو رہے تھے، ہڑتالیں ہو رہی تھیں اور طرح طرح سے لوگ اپنے جذبات کے مظاہرے کر رہے تھے کہ جنرل ازمو نے ان تمام مظاہروں کا خاتمہ کرنے اور " قومی نجات کی انجمن " کے ہر ممبر کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ اور خود شمالی حصہ ملک کی طرف روانہ ہوا تاکہ نوجوان مارشل جینگ کے افسروں کو سمجھائے۔ جسوقت کہ وہ سیان کے ہوائی اسٹیشن پر اُترا تو کئی سو افسروں نے استقبال کیا اور اُس کے ساتھ ہی جاپان کے مقابلہ کرنے کا مطالبہ بھی کیا۔ جنرل ازمو کو اس پر سخت غصہ آیا اور درشتی کے ساتھ اُسنے کہا: " تم کو جو کچھ کہنا ہے اپنے کمانڈر کی وساطت سے کہو۔" سیان میں ۹ دسمبر ۳۶ء کو طلباء نے ایک عظیم الشان مظاہرہ کیا جس میں کئی ہزار طلباء شریک تھے۔ یہ مظاہرہ بھی جاپان کے خلاف تھا۔ اب وہ لوگ جلوس کی شکل میں جنرل ازمو کی جائے قیام کی طرف بڑھ رہے تھے پولیس نے مزاحمت کی اور وہاں کے گورنر نے اُن لوگوں کو منتشر ہونے کا حکم دیا۔ لیکن وہ کہاں کسی کی سننے والے تھے۔ بالآخر پولیس نے گولی چلائی۔ جو لڑکے مارے گئے اُن میں ایک بڑے افسر کا لڑکا بھی تھا۔ اس حادثہ نے ساری فوج کو مشتعل کر دیا۔

۱۲ دسمبر کی صبح کو بندوقوں کی آواز نے جنرل ازمو کو بیدار کیا۔ سپاہی سیان کے سارے شہر کا احاطہ کر چکے تھے۔ ریلوے اسٹیشن ڈاکخانہ اور دوسرے سرکاری دفاتر سب پر اُن کا قبضہ تھا اور وہاں گورنر اپنے مکان میں مقید تھا۔ جب سپاہی جنرل ازمو کی جائے قیام کے قریب پہونچے، جو شہر سے دس میل کے فاصلہ پر تھا تو گارڈ کے سپاہیوں نے مدافعت کی مگر یہ کوئی قابل ذکر مدافعت نہ تھی۔ جنرل ازمو نے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی۔ بھاگتے وقت ایک جگہ اُس نے ٹھوکر کھائی اور اپنے ایک دانت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ سپاہیوں نے جب محل خالی پایا تو وہ جنرل ازمو کی تلاش میں نکلے اور جلد ہی اُن کو معلوم ہو گیا کہ وہ کہاں ہے۔ اُس وقت جنرل ازمو شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اُس نے لوگوں کو قریب آتے دیکھ کر کہا:

" میں جنرل ازمو ہوں۔ اگر تم مارنا چاہتے ہو تو مجھے مار ڈالو، لیکن میری توہین نہ کرو "

کیپٹن نے جواب دیا: " نہیں ہم آپ کو مارنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہماری خواہش ہے کہ جاپان کے خلاف آپ ہم لوگوں کی رہنمائی فرمائیں "

جنرل ازمو یہ سُن کر کھڑا ہو گیا اور غار کے باہر آیا۔ کیپٹن فوراً اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر جھک گیا اور کہا:

" جنرل ازمو یہاں اسوقت گھوڑا نہیں ہے۔ اور پیادہ پا چلنے میں آپ کے پیر مجروح ہو جائیں گے اس لئے آپ میری پیٹھ پر بیٹھ جائیے میں آپ کو لے چلوں گا "

چین کا فوجی ڈکٹیٹر اس طرح سے پھر اپنی جائے قیام پر واپس آیا اور یہ خبر سارے چین میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔ مارشل جینگ اور کمیونسٹ دونوں بڑی پریشانی میں مبتلا تھے۔ کیونکہ سپاہی اس کا مطالبہ کر رہے تھے کہ جنرل ازمو کا خاتمہ کر دیا جائے اور کمیونسٹ یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہی ایک ایسا شخص ہے جو سارے چین کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ بڑی دشواریوں کے ساتھ اُن لوگوں نے سپاہیوں کو سمجھا بجھا کر راضی کیا۔ مگر جینگ کائی شیک اپنی جگہ پر اڑا رہا۔ اُن لوگوں کے تمام مطالبات کے جواب میں وہ کہتا:

" اگر میں جنرل ازمو ہوں تو تم سب میرے ماتحت ہو۔ مجھے تم فوراً میرے دارالسلطنت میں پہونچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم باغی ہو

باب الاستفسار

ترکی زبان کی خصوصیات

(جناب مرزا افضل بیگ صاحب - حیدرآباد دکن)

ترکی رسم الخط اب رومن حروف میں ہے اور اس سے پہلے عربی حروف میں تھا، لیکن معلوم نہیں اس تغیر کا اثر وہاں کی زبان و گرامر پر بھی پڑا ہے یا نہیں - اگر نہیں تو اب بھی غالباً وہی اُصول و قواعد ہوں گے جو پہلے پائے جاتے تھے اور رسم خط کی تبدیلی سے کوئی نئی دقت اس کے سیکھنے میں نہ پیدا ہوئی ہوگی -

دوسری بات اس سلسلہ میں مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ ترکی قواعد بہت کچھ اُردو سے ملتے جلتے ہیں اور اگر ایسا ہے تو مماثلت کس حد تک پائی جاتی ہے - آج کل انقرہ ریڈیو سے رات کو جو خبریں اُردو زبان میں سنائی جاتی ہیں وہ غالباً آپ نے بھی سنی ہوں گی - اس میں عربی و فارسی کے الفاظ تو خیر کثرت سے ہوتے ہی ہیں، لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ ہر جملہ بے انتہا پیچیدہ اور طویل ہوتا ہے - میں نے اول اول سمجھا کہ شاید یہ فارسی انداز بیان ہوگا، لیکن فارسی زبان میں جو خبریں آتی ہیں وہ اتنی پیچیدہ نہیں ہوتیں اور نہ اس کے جملے اتنے طویل ہوتے ہیں - اس کا کیا سبب ہے - میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ انقرہ سے جو صاحب خبریں سناتے ہیں وہ کوئی ترک ہیں، جنھوں نے ٹوٹی پھوٹی اُردو سیکھ لی ہے اور پہلے وہ ترکی زبان میں خبریں لکھتے ہیں، پھر اُن کا ترجمہ وہ اُردو میں بالکل اس انداز کا کر دیتے ہیں جیسے پہلے ہمارے یہاں فارسی کے ترجمہ میں بیچ اور تیئں وغیرہ سے مدد لیکر مکھی پر مکھی مار دیتے تھے، یا جیسا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے کلام مجید کا کیا ہے کہ وہ ترجمہ تو ہے، لیکن سے اُردو نہیں کہہ سکتے -

اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ترکی انداز بیان بہت اُلجھا ہوا ہے اور اس صورت میں کیوں اس کی تعریف کی جاتی ہے -

مجھے اس زبان کے سیکھنے کا عرصہ سے شوق ہے، اس لئے یہ چند معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں -

---

(نگار) آپ کا جواب بہت تفصیل چاہتا ہے، تاہم مختصراً عرض کرتا ہوں :-

۱- جدید ترکی رسم الخط سے اصل زبان و گرامر میں کوئی تغیر نہیں ہوا اور بدستور اپنی جگہ قایم ہیں - البتہ یہ ضرور ہوا کہ پہلے عربی و فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال ہوتے تھے اور اب ان کی جگہ خالص ترکی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال ہو رہا ہے، لیکن جس طرح ایران اب تک اپنی زبان سے عربی الفاظ نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا، اسی طرح ترکی کو بھی کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ انقرہ ریڈیو سے جو خبریں اُردو میں سنائی جاتی ہیں، اُن میں سوائے افعال کے باقی سب الفاظ عربی و فارسی کے ہوتے ہیں -

یہ آپ نے بالکل صحیح سمجھا ہے کہ النقرہ کا اُردو خبریں سنانے والا کوئی ترک ہے اور وہ پہلے ترکی زبان میں خبریں لکھ کر اُردو میں اس کا ترجمہ کر دیتا ہے لیکن بالکل اسی قسم کا جیسا آپ نے فرمایا اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے فقرے بہت لمبے اور اُلجھے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ترکی زبان بھی بہت اُلجھی ہوئی ہوگی درست نہیں۔

ہر زبان کی خصوصیات علحدہ ہوا کرتی ہیں اور ترکی زبان کی خصوصیت اس کا اختصار و آہنگ ہے۔ اختصار سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر بات کو کم سے کم الفاظ میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور آہنگ سے مراد یہ کہ تلفظ میں وہ مخارج کی سہولت کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ اور ان دو باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں Complex جملے زیادہ استعمال ہونے لگے اور تلفظ میں موسیقی پیدا ہو گئی۔ یقیناً ترکی عبارت ہمارے نقطۂ نظر سے بہت پیچیدہ ہے، لیکن ترکی زبان جاننے کے بعد یہ پیچیدگی بالکل محسوس نہیں ہوتی۔

ترکی زبان کی انشاء عالیہ میں اس پیچیدگی یا اغلاق کا یہ عالم ہے کہ بعض جملے نصف صفحہ میں جا کر ختم ہوتے ہیں اور فعل و فاعل کی جستجو دشوار ہو جاتی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ زحمت و دقت اسی وقت تک ہے جب تک ہم اس زبان کے اندازِ بیان سے عادی نہ ہوں، ورنہ اس کے بعد یہی چیز بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کی لچھے دار عبارت، زیادہ تر صفت موصوف اور مضاف مضاف الیہ کی صورتوں سے پیدا ہوتی ہے جن کو ترکی زبان میں عجیب عجیب طریقوں سے ظاہر کرتے ہیں اور اس کا نام ان کے یہاں "تعلیقات" ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا، ترکی زبان میں اختصار کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے اور اس چیز نے ان کی زبان کو تراکیب کے لحاظ سے بہت وسیع بنا دیا ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ اُردو زبان کی گرامر سے ترکی گرامر کچھ ملتی جلتی ہے، لیکن حرف اسماء اور صفت موصوف میں افعال یا مشتقات افعال سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

میں ایک آدھ مثال سے آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ ترکی میں تعلیقات کسے کہتے ہیں اور ان سے جملوں میں کیوں اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ ترکی زبان میں یہ وسعت زیادہ تر افعال کی مختلف صورتوں سے پیدا ہوئی ہے اور "صلۂ حکایت" سے ——— "صلۂ حکایت" سے مراد وہ جملے ہیں جو کسی اسم کی صفت یا حالت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ماضی کی قسمیں ہماری زبان میں چار ہیں، مطلق و قریب، بعید، تمنائی۔ ترکی میں ایک اور قسم نئی ہے جسے "نقلی" کہتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اگر آپ کو کسی شخص کے آنے کا علم کسی طرح ہو گیا ہے تو آپ کہیں گے کہ "آ گیا" لیکن ترکی میں اسکی دو صورتیں علحدہ پیدا کر دی ہیں، یعنی اگر آپ نے اس کا آنا خود دیکھا ہے تو اسے "ماضی شہودی" میں ظاہر کریں گے اور کسی اور سے سُنا ہے تو یہ "ماضی نقلی" ہوگی۔ مثلاً گلمک مصدر ہے جس کے معنے ہیں آنا۔ اس سے ماضی شہودی کا صیغۂ واحد غائب گلدی ہوگا اور ماضی نقلی کا صیغۂ واحد غائب گلمِش، یعنی اگر ہم نے خود احمد کو آتے ہوئے دیکھا ہے تو کہیں گے احمد گلدی ——— لیکن اگر ہم نے یہ خبر کسی اور سے سنی ہے تو کہیں گے "احمد گلمش"۔

یہ تقسیم بالکل نئی ہے، لیکن اس سے عبارت میں جتنا اختصار پیدا ہو جاتا ہے وہ مخفی نہیں۔

دوسری چیز جس نے اس وسعت میں بہت زیادہ مدد کی ہے وہ افعال کا تعدیہ ہے۔ ترکی زبان میں تعدیہ کی صورتیں ساری دنیا کی زبانوں سے علحدہ ہیں۔ مثلاً آپ اُردو کا ایک فعل "جاننا" لیجئے۔ اس کو جب ہم متعدی بنائیں گے تو بتلانا یا معلوم کرانا کہیں گے اور یہ تعدیہ یہیں پہ ختم ہو جائے گا، لیکن ترکی زبان میں اس سے آگے بھی یہ سلسلہ چلے گا۔ مثلاً:۔

بیلمک = (جاننا)

بلدیرمک = (بتانا) - پہلا تعدیہ ہے۔

بیلدیرتمک = (کسی اور کے ذریعہ سے علم کرانا) دوسرا تعدیہ ہے۔ اُردو میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں۔

بیلدیرتدیرمک = (دو واسطوں سے علم کرانا) تیسرا تعدیہ ہے۔ اُردو میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ یعنی اگر اُردو میں ہم ان دو واسطوں کو ظاہر کرنا چاہیں گے تو اس کے لئے پورا جملہ لکھنا پڑیگا کہ ہم نے فلاں شخص سے کہا کہ فلاں شخص کے ذریعہ سے فلاں شخص کو یہ اطلاع کردے، لیکن ترکی میں اسے صرف ایک لفظ سے ظاہر کرسکیں گے۔

اب یہ تعدیہ مجہولی صورت میں بھی ہوتا ہے ماضی نقلی میں بھی ہوتا ہے اور نفی میں بھی۔ اس لئے ان سب کو ملاکر اتنی صورتیں وسعت بیان کی پیدا ہوجاتی ہیں کہ یوں آسانی سے نہ میں بیان کرسکتا ہوں، نہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔

میں نے اس سے قبل "صلۂ حکایت" کا بھی ذکر کیا تھا، اسے بھی سمجھ لیجئے۔ مثلاً اُردو کا ایک جملہ ہے: "ہم جانتے ہیں کہ احمد کل گھر میں تھا" — ترکی میں اسے یوں کہیں گے: "احمدکٗ دون خانہ سندہ اولدیغی معلومدر"۔ یعنی احمد کا کل گھر میں ہونا معلوم ہے۔ یعنی اُردو کی طرح ترکی میں اس کے دو ٹکڑے نہ کریں گے بلکہ پورے فقرہ "احمد کے گھر میں رہنے" کو فاعل قرار دیدیں گے۔

اُردو کا ایک اور جملہ ملاحظہ ہو: "وہ خط جو کل تم لکھ رہے تھے کہاں گیا" — ترکی میں اسے یوں کہیں گے: "تمہارا کل کا لکھا جاتا ہوا خط کہاں گیا" — ایک اور تیسرا جملہ ملاحظہ: "چونکہ میں تمہیں نہ دیکھ سکا اس لئے گمان کیا کہ تم چلے گئے ہو" — ترکی میں اسے یوں ظاہر کریں گے: تمہارے نظر نہ آنے کی وجہ سے میں نے تمہارا چلا جانا گمان کیا"۔ اس قسم کے فقروں کو صلۂ حکایت کہتے ہیں جن سے بظاہر پیچیدگی پیدا ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

اُردو سے اسکی مماثلت صفت موصوف، مضاف و مضاف الیہ اور جملوں کی ترتیب میں ہے۔ یعنی اُردو کی طرح صفت مضاف الیہ، اور فاعل اس میں بھی پہلے آتے ہیں۔ مثلاً:

اچھا آدمی = ایؔ آدم

احمد کا قلم = احمدکٗ قلمی

احمد آیا = احمد گلدی

اس میں شک نہیں کہ ترکی زبان بھی اول اول ہر غیر زبان کی طرح بہت مشکل معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر اُردو فارسی جاننے والے چھ مہینے بھی اس پر محنت کریں تو آسانی سے سیکھ سکتے ہیں، کیونکہ اسماء وغیرہ اس میں بکثرت فارسی و عربی کے ہیں اور اس لئے ہم بہت جلد اس زبان سے آشنا ہوجاتے ہیں۔

کشکول

عطایائے فطرت اوہیو (Ohio) امریکہ میں ایک لڑکا ہے جس کی عمر دس سال کی ہے اور اسی عمر میں وہ علم الکیمیا کی ڈگری لے رہا ہے۔ اس کی تفریح صرف یہ ہے کہ پروفیسروں کے ساتھ وہ کیمیائی، تشریحی اور ریاضی کے مشکل مسایل پر گفتگو کرتا رہے وہ پیانو بجانے میں بھی کافی مشق رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کا ذہنی نشوونما اسی طرح ترقی کرتا رہا تو جوانی تک پہونچتے پہونچتے وہ دُنیا کا بے مثل سائنس داں اور فلسفی ہوجائے گا۔ اس کا نام کینتھ وولف ہے۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز ذہانت کا ایک لڑکا سن ۱۷۲۱ء میں جرمنی کی سرزمین نے بھی پیدا کیا تھا جس کا نام ہنری ہنکن تھا دس مہینے کی عمر میں یہ خوب باتیں کرنے لگا تھا۔ ایک سال کی عمر میں توریت کا وہ حصہ جو (Pentaleauch) کہلاتا ہے اسنے ازبر کرلیا تھا اور چودہ مہینے کی عمر میں پوری توریت پر اس کو عبور حاصل ہوگیا تھا۔ دو سال کی عمر میں وہ قدیم تاریخ اور قدیم وجدید زبان کا ماہر ہوگیا، لیکن چار سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے اس کا انتقال ہوگیا۔

اسی طرح اٹلی کے مشہور مصنف کوئن ٹی لین کے دو لڑکے بہت ذہین پیدا ہوئے تھے اور دونوں دس سال کی عمر میں چل بسے ایک اور لڑکا لیسکل نامے تھا، دس سال کی عمر میں اس کے بھی قوائے ذہنیہ ملک ہوگئے تھے لیکن ۳۲ سال کی عمر میں یہ بھی مرگیا۔ ایک اور لڑکا جانش سکنڈس تھا جو پندرہ سال کی عمر میں یونانی اور اطالوی زبان کا بے مثل شاعر ہوگیا تھا اور ادب وقانون کا ماہر تھا۔ یہ بھی ۲۵ سال سے زیادہ نہ جیا۔

ہرموجنس جو ۱۵ سال کی عمر میں فن شعر وعروض پر بڑے بڑے لوگوں کو لکچر دیا کرتا تھا، یونان کا بڑا زبردست خطیب مانا جاتا تھا، لیکن ۲۵ سال کی عمر میں اس کا دماغ خراب ہوگیا اور جو کچھ اسے یاد تھا سب بھول گیا۔

ایک اور لڑکا روڈلگر تھا جو تین سال کی عمر میں پیانو پر ہر دُھن جو اس نے ایک بار سن لی تھی، بجا سکتا تھا۔ پیرس اور امریکہ کی تماشہ گاہوں میں اُس کو دو سو پونڈ معاوضہ ہر مجلس کا دیا جاتا تھا۔

جرمنی کا ایک لڑکا ہاف مین دس سال کی عمر میں موسیقی کا اتنا بڑا ماہر ہوگیا تھا کہ تین ہزار پونڈ سالانہ اس کی آمدنی تھی۔ وہ تمام یورپ کا سفر کرکے اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ امریکہ میں اُسے ۵۲ مظاہروں کا معاوضہ بارہ ہزار پونڈ ملا۔

ایک اور لڑکا آٹو گنز تھا جس نے موسیقی میں اتنا کمال حاصل کیا کہ بیس سال کی عمر تک اس نے تیس ہزار پونڈ کمائے اور پھر اس نے موسیقی کی تعلیم دینا شروع کی جس کی فیس سے اسے دس ہزار پونڈ سالانہ ملتا تھا۔

ایک لڑکا کولبرن قدرت کی طرف سے حساب داں پیدا ہوا تھا۔ چھ سال کی عمر میں اس کی حساب دانی کا یہ حال تھا کہ ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ دو ہزار سال میں کتنے سکنڈ ہوتے ہیں تو اس نے چند منٹ کے اندر سوچکر اس کا صحیح جواب بتا دیا۔

ایک لڑکا ولیم جیمس سڈس حال ہی میں پیدا ہوا تھا۔ جس وقت اس نے گیارہ سال کی عمر میں بُعد چہارم (Fourth Dimension) پر لکھچر دیا تو لوگ حیران رہ گئے۔ اس نے ایک بورڈ پر جن نقشوں سے اس مسئلہ کو سمجھایا وہ بڑے بڑے فلاسفروں کے لئے بھی بالکل نئے تھے۔

ایک عجیب و غریب کلب

یوروپ میں ایک کلب ہے جس کا نام "ڈاکٹروں کی غلطیوں کا کلب" ہے اس وقت اس کے ممبروں کی تعداد صرف پندرہ ہے جو مختلف ذوق اور مختلف مشاغل کے ہیں۔ ان کی عمر ۲۰ سال سے ۳۰ سال تک ہے اور ان میں مرد عورت دونوں شامل ہیں۔

اس بحث کے تمام ممبر وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق ڈاکٹروں نے حکم لگا دیا تھا کہ وہ سال کے اندر مر جائیں گے لیکن چھ سال بعد تک بھی ڈاکٹروں کی پیش گوئی پوری نہ ہوئی۔ اس کلب کی بانی ایک خاتون مسز جیسی گرین ہے اور ۱۹۳۶ء میں اس کلب کی بنیاد پڑی۔ ابتدا یوں ہوئی کہ اس خاتون کے متعلق ڈاکٹروں نے بالاتفاق حکم لگا دیا تھا کہ وہ سال کے اندر مر جائیگی اتفاق سے اسی زمانہ میں خاتون کو معلوم ہوا کہ اس کے ایک دوست مسٹر ٹامس کے متعلق بھی ڈاکٹر اسی قسم کا حکم لگا چکے ہیں، چنانچہ یہ اس کے پاس گئی معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق صرف دو ہفتے اس کی زندگی کے اور باقی ہیں اور سوائے دودھ کے کوئی غذا اسے نہیں ملتی۔

یہ خاتون چونکہ گاؤں کی رہنے والی تھی اور گائے بھینس بھی رکھتی تھی اس لئے وہ دوست کو اپنے گھر لے گئی تاکہ دودھ اُسے اچھا مل سکے۔ یہاں پہونچنے کے بعد جب اسے تازہ گائے کا دودھ میسر آیا تو اس کی تندرستی بہتر ہونے لگی اور دو ہفتے کیا مہینوں گزرنے کے بعد بھی وہ نہ صرف زندہ رہا بلکہ اچھی طرح چلنے پھرنے لگا۔

اس کے بعد مسز گرین کو اور دوسرے ایسے ہی لوگوں کا حال معلوم ہوا، اور اس نے ایک کلب قایم کر دیا۔ اس کلب کا ممبر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو ڈاکٹروں کے مقرر کردہ زمانۂ موت کے بعد نوے دن تک زندہ رہے۔

جگانے والی گھڑیوں سے پہلے

وہ لوگ جو بہت صبح اُٹھنے کے عادی ہیں اُن کے سامنے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک مقررہ وقت پر اُن کی آنکھ کھُل جائے۔ اب تو خیر الارم کی گھڑیاں اس خدمت کو اچھی طرح انجام دیتی ہیں، لیکن ان گھڑیوں کے ایجاد سے پہلے یہ مسئلہ بڑا اہم سمجھا جاتا تھا اور بعض لوگوں نے عجیب و غریب طریقے مقررہ وقت پر اُٹھنے کے لئے اختیار کئے تھے۔

اٹھارویں صدی میں ایک شخص جان کران (آئرستان کا باشندہ) تھا۔ اس کا پیشہ وکالت تھا اور یہ بہت صبح مقررہ وقت پر اُٹھکر کام کرنے کا عادی تھا۔ اس نے ٹھیک وقت پر جاگ اُٹھنے کے لئے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا تھا۔ یہ اپنی چارپائی کے سرہانے کسی اونچی جگہ دو پیالے اوپر نیچے تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے رکھدیتا تھا۔ اوپر کے پیالے میں پانی بھر دیتا تھا جو ایک سوراخ سے ٹپک، ٹپک کر ٹھیک ساڑھے چار بجے صبح تک نیچے کے پیالہ کو اتنا بھر دیتا تھا کہ پانی اس سے بہکر جان کران کے سر پر گرنے لگتا تھا اور وہ جاگ اُٹھتا تھا۔ اس طریقہ میں سب سے زیادہ مشکل بات یہ تھی کہ جان کران کا سر ٹھیک اسی جگہ رہے جہاں پانی کو بہکر گرنا چاہئے اور اس کوشش میں وہ کبھی ناکام نہیں رہا۔

امریکہ کے ایک سیاست داں، جان جے، گرمیوں میں ٹھیک اس وقت اُٹھنا چاہتا تھا جب سورج نکلنا شروع ہو،

اس مقصد کے لئے اس شخص نے یہ ترکیب کی کہ اپنی خوابگاہ کی کھڑکی میں جو سورج کے سامنے تھی ایک سوراخ اپنے اندازہ سے بنایا کہ سورج کی پہلی کرن اس کے چہرہ پر پڑے اور وہ جاگ اٹھے۔ لیکن اس ترکیب میں یہ مشکل تھی کہ سورج روز کچھ نہ کچھ ہٹ کر طلوع ہوتا ہے اور وہ سوراخ روز کام نہ دے سکتا تھا۔ اس مشکل کو اس نے یوں دور کیا کہ روزانہ اپنے پلنگ کو کچھ سرکا لیتا تھا تاکہ سورج کی کرن کھڑکی کے سوراخ سے گزر کر اس کے چہرہ پر پڑ سکے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب طریقہ اندھیرے میں وقت معلوم کرنے کا فرانس کے ایک سائنس داں وآیر نے اختیار کیا اس نے ایک بڑا کرونومیٹر (وقت پیما) طیار کیا جس کے ڈائل میں ہر گھنٹہ کے نشان پر اس نے گڑھے سے بنا دئے تھے۔ ان گڑھوں کو وہ مختلف قسم کی مٹھائیوں سے بھر دیتا تھا اور یاد رکھتا تھا کہ کونسی مٹھائی کس گڑھے میں رکھی گئی ہے۔ رات کو جب اس کی آنکھ کھلتی اور وہ صحیح وقت معلوم کرنا چاہتا تو گھنٹہ کی سوئی سے قریب تر جو گڑھا تھا اس پر زبان پھیر کر مٹھائی کا مزہ چکھتا اور صحیح وقت معلوم کر لیتا۔

چین کا ایک قارون وزیر

کوئی ڈیڑھ سو سال اُدھر کی بات ہے کہ چین کو ایک دولتمند ترین شخص رکھنے کی عزت حاصل تھی۔ اس کا نام ہوشن تھا اور شاہ چین (شین لنگ؟) کا وزیر تھا۔ جس وقت اس کے مرنے کے بعد اس کی جایداد کا جایزہ لیا گیا تو اس کی قیمت کا اندازہ تیس کرور پونڈ کیا گیا تھا۔ اس کے مکان واقع پیکن میں ۱۴ پلنگ ایسے تھے جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اور منھ دھونے کے برتن سب کے سب ٹھوس سونے کے تھے۔ تہ خانے میں ایک کرور پونڈ قیمت کی طلائی اینٹیں موجود تھیں اور ۲۸ ہزار مختلف قسم کے جواہرات تھے۔

یہ لین دین بھی کرتا تھا اور نایاب اشیاء کی تجارت بھی۔ ان دو کانوں میں اس کے مرنے کے بعد ۲ کرور پونڈ کی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ لیکن قابل فخر چیز اس کے پاس صرف ایک تھی اور وہ موتیوں کا ایک ہار تھا جس میں ۳۰۰ موتی چڑیا کے انڈے کے برابر پروئے ہوئے تھے۔

اتنی دولت اس کے پاس کہاں سے آئی؟ یہ کوئی پوشیدہ راز نہیں، بلکہ چین کا ہر وہ شخص جو بادشاہ کا معتمد ہو جاتا تھا اتنی دولت حاصل کر سکتا تھا، کیونکہ چین کا بادشاہ عجیب وغریب چیز ہوا کرتا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتا تھا۔

جس بادشاہ کا یہ وزیر تھا اس کا یہ حال تھا کہ ایک جوڑ جوتے کی قیمت اس سے ۱۰۰ پونڈ وصول کی جاتی تھی اور ایک مرتبہ سے زیادہ وہ کسی جوتے کو استعمال نہ کرتا تھا۔ اس کے سامنے جو انڈے آتے تھے اُن کی قیمت اُسے تین پونڈ فی درجن کے حساب سے ادا کرنا پڑتی تھی۔

چین کے بادشاہ جس معیار کی زندگی بسر کرتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہو سکتا ہے۔ وہاں ایک بادشاہ تھا جس کا نام ٹاؤ کوانگ تھا جو بے انتہا خسیس مشہور تھا۔ اس نے تمام فضول مصارف کم کر دئے تھے یہاں تک کہ اس کے کھانے کا خرچ صرف ۶۰ ہزار پونڈ سالانہ رکھا تھا۔ نوکر پریشان تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ کیونکر اس سے روپیہ وصول کریں ۔۔۔ اتفاق سے ایک دن بادشاہ نے ایک خاص قسم کے شوربے کا ذکر کر کے اس کی فراہمی وطیاری کا حکم دیا۔ یہ سنکر نوکروں نے عرض کیا کہ یہ شوربا تو بڑی مہنگی چیز ہے اور اسکی طیاری کے لئے علاوہ پانچ ہزار پونڈ سالانہ کے دو لاکھ پونڈ تو ابتداءً میں چاہئے۔ یعنی اگر بادشاہ نے یہ شوربا ہفتہ میں ایک بار بھی استعمال کیا اور چھ مہینہ تک یہ سلسلہ جاری رہا تو فی پیالہ دس ہزار پونڈ صرف کرنا پڑے گا ۔۔۔ بادشاہ نے اس کو منظور کیا یا نہیں، اس کا حال معلوم نہیں، لیکن اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آج سے ڈیڑھ دو صدی پہلے کا چینی بادشاہ کیا چیز ہوا کرتا تھا اور جس ملک کا فرمانروا ایسا ہو ۔ وہاں کی خوش انتظامی کا عالم

آغاز و انجام

وہ ہنسی جیسے دم رقص کہیں مندر میں — توڑا لینے میں کسی "داسی" کی پازیب بجے
پاچنک اُٹھیں سب اکبار مہکتی کلیاں — اُن سے جب کوئی حسیں اپنے شبستاں کو سجے
مدبھری آنکھیں چھلکتے ہوئے ساغر ہیں، مگر — پینا چاہو تو گریباں میں اُنڈل جائے شراب
جھک کے جب اُٹھیں، گماں دیکھنے والے کو ہو — بجلیاں کوندتی ہیں پیش نظر جائے شراب
گفتگو ایسی کہ سادہ بھی ہے رنگین بھی ہے — طفل معصوم کے تتلانے کا سارا انداز
گدگدی سی دل پرشوق میں جس سے اُٹھے — جس طرح مست ہوا چھیڑتی ہو پردۂ ساز
سہم کر بھاگنا، اٹھلا کے پلٹ بھی آنا — آہ دوشیزگی حسن کا وہ بھولا پن
یوں جو پامال کرے اور پھر احساں جتلائے — ہائے وہ فن کہ بظاہر جو ہے بیگانۂ فن
موت دم بھر میں یہاں چھاؤنی چھائے ہوگی — حیف تاراج خزاں ہوگا یہ شاداب چمن

ایسے آغاز کا انجام تباہی کیوں ہے؟
کچھ تو ہی شبنم ناشاد ہو سرگرم سخن!

مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے

جھوٹی پیت

اُن کی آواز بغیر اور جو آتی آواز — اُنگلیاں کانوں میں دے لیتی کہ میں سُن نہ سکوں
وہ مدھر بول تھے اور لہجے میں تھا لوچ ایسا
وہ گئے اور سنی میں نے خبر جانے کی — پردے کانوں کے پھٹے اور نہ سننا ہوا بند
بلکہ آہٹ پہ لگے رہتے ہیں، کیا ان کو ہوا؟
آنکھیں جلتی ہیں، دھواں دل سے اُٹھا کرتا ہے — پھر بھی گھونگھٹ کو اُلٹ سکتی نہیں چہرے سے
سال بھر اُن کو گئے بیتا۔ یہی ساون تھا...
دل، ارے دل، تری امید بندھی ہے اب تک — جھوٹی چاہت تھی، یقیں تجھ کو دلاؤں کیونکر
تیری مرضی ہے، تڑپ... اور تڑپ! دیکھ لیا؟

مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے

غزل

بسر کی ہے فراقِ دوست میں یوں زندگی اپنی
کہ مرتے مرتے اُس کی یاد تھی اور بیخودی اپنی

کہو اُن سے نہ دیں تکلیف اب اپنے تبسم کو
کہ رفتہ رفتہ مجھ کو ہو چلی ہے آگہی اپنی

خیالِ دوست بھی آتا ہوا دل میں جھجکتا ہے
اب اس منزل پہ آ پہونچی ہے دورافتادگی اپنی

حیاتِ عشق میں آئے ہیں کچھ لمحات ایسے بھی
کہ تجھ کو بھی نہ پہچانا - یہ تھی وارفتگی اپنی

یہ مانا ضبطِ غم سے ہے سکونِ حسن میں ہلچل
مگر ڈر ہے نہ بن جائے فسانہ خامشی اپنی

نظر یوں ڈالتا پھرتا ہوں میں ایوانِ فطرت پر
کہ جیسے پا رہا ہوں میں ہر اک شے میں کمی اپنی

سید علی سجاد مہر اکبرآبادی بی۔ اے

آرزو

آجاؤ ، عیدِ وصل کے ساماں کئے ہوئے
چہرے کو اپنے صبحِ درخشاں کئے ہوئے

بالوں میں اپنے مُشک کے نافے بھرے ہوئے
صندل بھری جبیں کو پُرافشاں کئے ہوئے

اپنی جھلک جھلک کو بنائے ہوئے چمن
اپنی نظر نظر کو گلستاں کئے ہوئے

پیہم خموشیٔ لبِ رنگین و شوخ میں
سامانِ صد تبسمِ پنہاں کئے ہوئے

اک احمریں سا قشقۂ شب تاب کھینچکر
ماتھے پہ شمعِ طور فروزاں کئے ہوئے

تاریک و ہولناک محبت کی راہ کو
اپنی تجلیوں سے چراغاں کئے ہوئے

آجاؤ بن کے رونقِ کاشانہ ایک دن
مدت گزر گئی تمھیں مہماں کئے ہوئے

نبی احمد بریلوی

انتخاب کلام

حسرت ترمذی

(شمالی ہند کا ایک نوجوان شاعر سرزمین دکن میں)

نہیں کہ اب ہے محبت میں اضطراب مجھے
تری نگاہ سے پہلے تھا یہ عذاب مجھے

نگاہ عشق سناتی رہی فسانۂ شوق
ادائے حُسن سے ملتا رہا جواب مجھے

زندگی میں کبھی اک وقت وہ آجاتا ہے
لطف آتا ہے جب انسان کو غم کھانے میں

نگہ حُسن سے تا چشم تماشائے جمال
ایک ہی سلسلۂ انجمن آرائی ہے

دل کی بے تابیوں کا قصہ کیا!
بس کوئی مُسکرا دیا ہوگا،

تو نے ہم سے نگاہ پھیر ہی لی!
اب محبت کا حشر کیا ہوگا،

مآلِ خندۂ گُل جو کبھی بُھلا نہ سکا
تری ہنسی پہ وہ خوش ہو کے مسکرا نہ سکا

ترے خیال سے جس کو سکون دل نہ ملا
کسی خیال سے اُس کو قرار آ نہ سکا

تمام شرحِ محبت ہے اِس فسانے میں
وہ مجھ کو بھول گئے میں انھیں بُھلا نہ سکا

اور ہم دل کا حال کیا کہتے،
لب پہ جب ان کا نام آہی گیا

چاہتے ہیں کہ کچھ کہوں میں بھی
کچھ نہ کہنا بھی کام آہی گیا

جس کے آگے قدم نہیں اُٹھتے
عشق کا وہ مقام آہی گیا

آنکھوں کے سامنے تری تصویر پھر گئی
لب پر جہاں کسی کے ترا نام آگیا

اب یہ بھی نہیں ہے کہ کوئی برق گرائے
مشتاق نظر کو یہ تماشا ہی بہت تھا،

ساحل نظر آتا رہا گرداب میں ہم کو
طوفان میں یہ ایک سہارا ہی بہت تھا

ہر چند کہ ہر پھول میں نشتر بھی نہاں تھے
اس عالم رنگیں کا تماشا ہی بہت تھا

قیامت تھا کسی کا بے رخی سے مسکرا دینا
اب اس کے بعد کیا کہیئے کہ ہے اس دل کی حالت کیا

نہ آہ بے صدا ممکن، نہ عرضِ مُدعا ممکن
سکھائے ہیں تری نظروں نے آدابِ محبت کیا

جس کو ساحل پہ اُترنا ہوگا،
اُس کو موجوں سے گزرنا ہوگا،

خامشی پر ہے گمانِ پندار
ان سے کچھ عرض بھی کرنا ہوگا،

کہتے ہیں جسے عشق، عجب راز ہے دل کا
محسوس تو ہوتا ہے، بیاں ہو نہیں سکتا

مختاری اس کو کہتے ہیں، مجبوری نام اسی کا ہے
جو تم نے چاہا ہو کے رہا، جو ہم نے چاہا ہو نہ سکا

پوچھ مت کشمکش زندگی اہلِ وفا
غم اُٹھایا نہ گیا، اُس کو بھلایا نہ گیا

مطبوعات موصولہ

مضامین مالک مولانا عبدالمالک آروی کے چھ علمی و تاریخی مقالات کا مجموعہ ہے۔ پہلا مقالہ نجوم کے بعض تاریخی وعلمی مباحث سے متعلق ہے جو تقریباً ۸۰ صفحات کو محیط ہے اور جس میں خاقانی کے منجمانہ اشارات کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

دوسرے مقالہ کا موضوع مصوری ہے جس پر فنی، تاریخی حیثیت سے نہایت جامع بحث کی گئی ہے، تیسرا مقالہ "مسئلہ نسب وحسب" پر ہے اور اُن مسلمانوں کے لئے جو اخلاق کے مقابلہ میں افتخار "نسب" کو ترجیح دیتے ہیں ایک زبردست تازیانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چوتھا مقالہ لسانیات سے متعلق ہے جس میں زبان اُردو کی ارتقائی تاریخ پر بحث کی گئی ہے، پانچواں مقالہ فلسفۂ تصوف پر ہے جس میں رومی وعراقی وغیرہ کے صوفیانہ تاثرات پر علمی بحث کی گئی ہے چھٹا مقالہ امام غزالی کی زندگی اور ان کے فلسفہ سے متعلق ہے۔

مولانا عبدالمالک اُن اہل قلم میں سے ہیں ——————— جو قدرت کی طرف سے عالمانہ بصیرت لیکر آئے ہیں اور جن کے ایک ایک فقرہ سے "شیوۂ کار آگہی" ظاہر ہوتا ہے اسلئے ملک کو شکرگزار ہونا چاہیئے "ادارۂ طاق بستان آرہ" کا جس نے یہ مقالات کتابی صورت میں شایع کرکے گویا جواہر ریزوں کو ملک عام کردیا۔

نگار سے مولانا عبدالمالک کا دیرینہ تعلق ملک سے مخفی نہیں اور نگار کی زندگی کا ایک قابل فخر کارنامہ یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے اسی نے اس جوہر قابل کا انکشاف کیا۔

اس مجموعہ کا حجم ۳۲۸ صفحات ہے اور کتابت و طباعت نہایت نفیس۔ قیمت تین روپیہ اور ملنے کا پتہ ادارہ طاق بستان آرہ

مشاعرہ گورکھپور حال ہی میں گورکھپور کے سول ڈیفنس مجسٹریٹ، حبیب احمد صاحب صدیقی نے پبلسٹی کے سلسلہ میں ہندی اُردو کا ایک عظیم الشان مشاعرہ وہاں منعقد کیا تھا یہ انھیں نظموں کا مجموعہ ہے جو مشاعرہ میں پڑھی گئی تھیں۔ ہر شاعر کے کلام کے ساتھ جناب مجنوں گورکھپوری کا ایک انتقادی نوٹ بھی شامل کیا گیا ہے اور بزم شعر پر جو اسکے اثرات رونما ہوئے انھیں بھی ظاہر کردیا گیا ہے۔

ہندی کا حصّہ بھی اتنا ہی مکمل ہے جتنا اُردو کا اور وہ لوگ جو ایک ہی وقت کے اُردو ہندی شاعری کا بیک وقت مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ مجموعہ بہت کارآمد ہے۔

کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت نفیس اور قیمت شاید کچھ نہیں۔

سیر کائنات "سرجیمس جینس" کی ایک بہت مشہور تصنیف کا ترجمہ ہے جس میں کائنات کی علمی سیر کرائی گئی ہے کتاب آٹھ ابواب پر منقسم ہے جن میں زمین، ہوا، آسمان، ماہتاب، سیارے، سورج، ستارے

اور سدیم سے بحث کی گئی ہے۔

سرجمیس کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک ناواقف فن بھی لطف و فایدہ حاصل کرسکتا ہے اور یہ خصوصیت ترجمہ میں بھی پائی جاتی ہے۔

ترجمہ حفیظ احمد خاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ عثمان آباد (دکن) نے کیا ہے اور مکتبۂ جامعہ دہلی نے اشاعت کی ہے۔ دو درجن سے زیادہ ہاف ٹون بلاک کی تصویریں بھی شامل ہیں، جنھوں نے کتاب کی اہمیت و افادیت کو اور زیادہ کردیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔

ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ دہلی۔

جگ بیتی پنڈت جواہرلال نہرو نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک نینی جیل سے چند خطوط اپنی لڑکی کے نام روانہ کئے تھے۔ انھیں کا ترجمہ اب مکتبۂ جامعہ نے "جگ بیتی" کے نام سے شایع کیا ہے۔ یہ خطوط حقیقتاً تاریخی، سیاسی و انتقادی لکچر ہیں جن میں، یوروپ و ایشیا کی تہذیب اور قوموں کے عروج و زوال پر نہایت لطیف و مفید تبصرہ کیا گیا ہے۔

ترجمہ نہایت صاف و سلیس ہے اور کہیں کہیں نقشوں سے مطالب کو اور زیادہ واضح کردیا گیا ہے۔ حجم ۵۵۲ صفحات قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جامعہ دہلی

افکارِ نو جمیل احمد صاحب ام - اے کندھا پوری کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے ناول، ڈراما اور مختصر افسانہ نگاری پر فنی حیثیت سے گفتگو کی ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ یہ فن عام ہوگیا ہے اور ہماری زبان میں کثرت سے ڈراما نگار و افسانہ نویس پیدا ہوتے جارہے ہیں، ایسی کتابوں کا لکھا جانا بھی ضروری ہے جن میں فنی حیثیت نوجوانوں کی رہنمائی کی جائے۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب سے اس ضرورت کو بوجہ احسن پورا کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ: نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ - لاہور۔

تنگے اور دیگر افسانے جناب محمد امین شرقپوری کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ محمد امین صاحب ابھی نوجوان ہیں اور انکی افسانہ نگاری کی عمر زیادہ نہیں۔ لیکن کامیابی کے لحاظ سے ان کا شمار اچھا لکھنے والوں میں کیا جانا چاہئے ان کے افسانے ان کے ذاتی احساسات کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اسی لئے ان میں درد اثر بھی ہے اور کردار نگاری بھی، تجزیۂ جذبات بھی ہے اور پلاٹ کی خوبی بھی۔ اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ: شمع بک ڈپو - پھاٹک حبش خاں - دہلی۔

ان داتا میرزا ادیب بی - اے کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ میرزا صاحب اس وقت کے معروف افسانہ نگاروں میں ہیں آپ کے افسانوں کے اور کئی مجموعے شایع ہوکر ملک میں مقبول ہوچکے ہیں۔ قیمت دو روپیہ۔

ملنے کا پتہ: نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔

مجنوں کے خطوط عطاء الرحمن خاں ام - اے (علیگ) ہیڈ ماسٹر عثمانیہ اسکول ٹلارم نے ان خطوط میں ایک پیشہ ور عورت کی زندگی کو سامنے رکھ کر نسوانی اخلاق کی تعمیر کے مسئلہ کو نہایت خوبی سے سمجھایا ہے۔ ادب انشا کے لحاظ سے بھی خوب ہیں، لیکن پروفیسر زور نے اپنی تقریظ میں یہ مشورہ صحیح دیا ہے کہ اگر اس کی زبان زیادہ سہل و سادہ ہوتی تو اسکی افادی حیثیت زیادہ بڑھ جاتی۔

قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ: سید عبدالرزاق تاجر کتب - عابد روڈ، حیدرآباد (دکن)

کلام حرماں خیرآبادی حرماں صاحب ہیں تو خیرآباد کے رہنے والے، لیکن اب عرصہ سے لاہور میں مقیم ہیں۔ ابتدا میں انھوں نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود حالات کے نامساعد ہونے کے انھوں نے اپنی کوشش سے شعرگوئی کی اہلیت حاصل کی۔

اس مجموعہ میں غزلیں زیادہ، نظمیں کم اور رباعیاں اس سے بھی کم ہیں، کلام صاف اور جذبات سے خالی نہیں۔ قدیم و جدید دونوں رنگ ملے جلے ہیں اور شاعری کے موجودہ دور میں ان کے کلام پر بھی کبھی کبھی نظر پڑ سکتی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔

ملنے کا پتہ :- دفتر مجلس اُردو نمبر ۴۷، جی بلاک - ماڈل ٹاؤن - لاہور۔

شاعر کے سو شعر آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم کے سو شعروں کا انتخاب ہے جسے ان کے صاحبزادے مسرور آغا شاعر نے شایع کیا ہے۔

مرحوم داغ کے ان تلامذہ میں سے تھے کہ اگر وہ داغ کے شاگرد نہ ہوتے تو خود داغ بن جاتے، لیکن افسوس ہے کہ قسمت وہ داغ کی سی نہ رکھتے تھے۔

آغا شاعر، نہ صرف اپنی شاعری بلکہ اخلاق کے لحاظ سے بھی نہایت دلچسپ انسان تھے اور اپنی گفتگو کی نرمی و شیرینی سے ہر شخص کا دل موہ لیتے تھے۔

آغا شاعر جس عہد کے شاعر تھے، اُس عہد میں اخلاقی حیثیت سے اُن کا اور ریاض کا ایک ہی مرتبہ تھا کہ اگر ان کی شاعری کو نظرانداز کر دیا جائے تو بھی وہ دلوں میں جگہ پانے کے قابل تھے۔

آغا شاعر کے رنگِ تغزل کے متعلق اظہار خیال کی ضرورت نہیں، کیونکہ داغ کا جو رنگ ان کے بہترین دیوان 'گلزار داغ' میں پایا جاتا ہے بالکل وہی رنگ ان کا بھی ہے :-

چند اشعار ملاحظہ ہوں :

آدمی آدمی سے ملتا ہے ۔۔۔ بات کرنی تو کچھ گناہ نہیں
پھر مرے سر کی قسم کھا کر چلے ۔۔۔ پھر مجھے سرکار نے فقرہ دیا
مرا اصرار کہ اک شخص تمنائی ہے ۔۔۔ ان کا اٹھلا کے یہ کہنا کہ ہمیں نیند آئی ہے
کوستے ہیں ستانے والے کو ۔۔۔ آپ سے تو کوئی خطاب نہیں

اس انتخاب میں ہمیں بعض اشعار ایسے بھی نظر آتے ہیں جن میں داغ سے قبل کا دہلوی رنگ نمایاں ہے اور یہ رنگ وہ ہے جس پر ہمیشہ سر دھنا جائے گا۔

مثالاً چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :

محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا ۔۔۔ ادھر بات کی چشم تر ہو گئی،
لو ہم بتائیں غنچہ و گل میں ہے فرق کیا ۔۔۔ اک بات ہے کہی ہوئی اک بے کہی ہوئی

یہ انتخاب نگارستان ایجنسی کشمیری دروازہ دہلی سے مل سکتا ہے۔

قصۃ الجودی والقرآن

از

مولانا مقبول احمد صمدنی

مولانا مقبول احمد صمدنی ملک کے ان اکابر اہل قلم میں سے ہیں، جن کی زندگی کا مقصود خاموشی کے ساتھ علم کی خدمت کرنا ہے اور جن حضرات نے ان کی تصنیف "حیات علامہ عبلیل بلگرامی" دیکھی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا کا مرتبہ ارباب تحقیق وتصنیف میں کتنا بلند ہے۔

اس مقالہ کا موضوع بحث جودی پہاڑ ہے جہاں حضرت نوحؑ کی کشتی کا ٹھہرنا کلام مجید میں ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا نام توراۃ میں "اراراط" بتایا گیا ہے۔

مولانا کا یہ مقالہ ان کی عالمانہ موشگافیوں کی بدولت اور بہت سے ذیلی مباحث پر "ریسرچ" کا عجیب و غریب مجموعہ ہو گیا ہے ہم اس مقالہ کو شکریہ کے ساتھ "نگار" میں بالاقساط اس طرح شایع کر رہے ہیں کہ اخیر میں ان تمام اوراق کی شیرازہ بندی کتابی صورت میں ہو سکے — اختتام مقالہ پر ہم اپنی رائے بھی اس مسئلہ پر پیش کریں گے۔

"نیاز"

قصۃ الجُودی والقرآن

یاد از شام غم بزم خوشاں کردیم   مشتے از سُرمہ گرفتیم و پریشاں کردیم

مصر، بلکہ "کل الناطق بالضاد"[1] عالم اسلامی کا شیریں نوا، مسیح نفس، سخن سنج حافظ ابراہیم ہم کو بیدار کرتا ہے۔ ندا دیتا ہے:

ارىٰ طوفان اہل الغرب یطغو   واہل الشرق ساوتھم نیام

فان لم یاتنا نوح بفلک   علی الاسلام والشرق السّلام

اُس کی درد بھری صدا مُستجابِ ملاءِ اعلےٰ کی بارگاہِ والا تک پہونچتی ہے۔ استجابتِ فریاد و قبولِ تمنا کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔

جودی مجھ ضعیف و معذور سراپا عجز و قصور مقبول سے ملہمانِ غیب کا ارشاد ہوتا ہے کہ آج کی با برکت اور فیض رساں صحبت سے فایدہ اُٹھا کر حضرت جودی[2] پر کچھ گزارش کروں۔ وہ جودی! طوفان والی جودی!! جس کا نام اور ذکر کلام اللہ المجید میں آیا ہے۔ لیکن جائے وقوع کے بارہ میں اب بعض ادیان مختلفہ کے رہنمایان و پیشوایان میں باہم ناموافقت و اختلاف ہے۔ حتےٰ کہ قرآن حکیم میں اس کا نام آجانے پر ایراد کیا جاتا ہے[3]۔ اَحبار و رہبانِ[4] یہود[5] اپنی آسمانی کتاب کے حوالہ سے کشتی نوح علیہ السلام کا قرارگاہ اراراط کو بتاتے ہیں۔ حکمائے ہنود کو یہ شرف اپنی متبرک پرستش گاہ اجودھیا کو دئے جانے پر اصرار ہے۔

---

[1] چار دانگِ عالم کی تمام زبانوں میں سے، جن کا علمائے لسانیات کو علم ہے، اور احصا فرما سکے ہیں، عربی کے سوا کسی میں "ضاد" نہیں بولا جاتا ہے۔ حتےٰ کہ عبری بھی اس حرف سے خالی ہے (ارض القرآن، جلد اول، صفحہ ۲۳۱ و حقائق دعبر، از اسکندر الجوزی، قدس شریف، سنہ ۱۹۱۳ء، صفحہ ۱۵۸) یاقوت حموی نے معجم البلدان، مجلد ثالث میں صفحہ ۵۷۴ پر لکھا ہے کہ اسی طرح "طا" (مُطبقہ) بھی نہیں آتی ہے۔

[2] جودی کے متعلق اوراق آیندہ پر مقالۂ ہذا میں مفصل بحث کی جائے گی۔ کلم القرآن (صفحہ ۵۲ مصری) میں محمود شکری پاشا لکھتے ہیں کہ جودی بہ تشدید یا و بہ تخفیف دونوں طرح درست ہے جو موصل میں ایک پہاڑ کا نام ہے ۔۔ سید شیخ مصطفےٰ آفندی الحسینی ہدیۃ الاخوان میں فرماتے ہیں "اور ٹھہر گئی کشتی پہاڑ پر، جس کا نام جودی ہے۔ اور جو موصل کے قریب ہے (صفحہ ۳۹، طبع ثانی، بیروت)

[3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی پندرھویں جلد میں قرآن حکیم پر ایک طویل مقالہ نو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، جس میں دنیا بھر کے بے بنیاد اور نا معقول اعتراضات بھی کر ڈالے ہیں (صفحات ۸۹۸ لغایتہ ۹۰۶)۔ ان خوش فہم، منصف مزاج، حاملانِ مذہب، حامیانِ دین سے اس کے سوا توقع ہی کیا کی جا سکتی تھی! مولانا سید سلیمان ندوی کا یہ قول بھی پیش نظر رہے کہ "نصرانی پادری جو بزرگانِ تورات کی تاریخی ہستی کے اثبات کے لئے کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے روایاتِ عرب اور قصصِ قرآن کا نام عام طور سے اُن کی زبان میں افسانہ ہے۔ لیکن اگر خود اُن کو ضرورت پڑے تو وہ تاریخ کی بلند ترین شہادت ہے" (ارض القرآن جلد اول، صفحہ ۱۹۰) ۔۔ ڈاکٹر محمد توفیق صدقی اپنی کتاب نظرۃ فی کتب العہد الجدید و عقائد النصرانیہ میں لکھتے ہیں کہ ان انجیلیوں (اہل انجیل) کی اس رغبت نے کہ یہودی کی نبوتوں کو مسیح پر منطبق کر دیں، ان کے دل سے اور تمام باتوں کو بھلا دیا اور خیال سے دور کر دیا ہے۔ جس کی متعدد تحریری مثالیں موصوف نے پیش کی ہیں۔ (صفحہ ۴۶، مصری) (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

متحیر ہوں کہ اس کارِ سترگ و مقابلۂ بزرگ سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکوں گا۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ　　اے اسیرانِ چمن میں نو گرفتاروں میں ہوں

(بہ سلسلۂ صفحہ ۲) اس کے خلاف بھی تحریرات موجود ہیں۔ فرانس کی بڑی انسائیکلوپیڈیا اور بہت سی کتابیں منصف مزاج اور محتاط علمائے یورپ نے حوالۂ قلم فرمائی ہیں۔ سید رشید رضا نے حقیقتِ توراۃ و انجیل پر بحث کرتے وقت ان کا ذکر کیا ہے۔ (صفحہ ۲، شبہات النصاریٰ و حجج الاسلام، طبع اول، مصری)۔

سے کلام پاک میں وارد ہوا ہے: "اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ج (پارۂ دہم، سورۂ توبہ ع ۵/۱۱)۔ ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور اپنے مشایخوں اور مریم کے بیٹے مسیح کو خدا بنا کھڑا کیا۔

کہ اَحبار جمع ہے حِبر و حَبر کی۔ دانشمند جہودان و عالم و نکوکار۔ مگر "احبار الیہود" مخصوص علمائے یہود کے لئے استعمال کیا جاتا ہو۔ عالم کے معنے کے اعتبار سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ "حبر الامۃ" کہلاتے ہیں یا امام حنبل (احمد بن محمد بن حنبل ابو عبداللہ الشیبانی المروزی کی شان میں یحییٰ بن سعید القطان کا قول ہے "احمد حبر من احبار ہذہ الامۃ" (ہدیۃ الزجاج صفحہ ۱۹)
کلیات ابوالبقا میں ہے " الحبر العالم" پھر تحریر ہے " والاحبار مختص بعلماء الیہود من ولد ہارون"۔ اسی طرح نہایۃ اور مجمع بحار الانوار وغیرہا میں بھی یہی معنے لکھے ہیں۔ مادۂ اشتقاق حَبرؔ و حُبورؔ ہے۔ (مصباح الفرقان فی لغات القرآن، از سید عنایت علی، مطبوعہ دہلی، ۱۳۵۷ھ۔ و۔ الفوز الکبیر مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی، علی ہامش سفر السعادۃ، صفحات ۲۲ و ۴۲)۔ کلم القرآن میں لکھا ہے بالکسر و بالفتح دونوں آتا ہے۔ تحبیر بمعنی تحسین سے ماخوذ ہے۔ (صفحات ۳۰، ۴۵، ۱۲۴)

عصر حاضر میں طائفہ اسرائیلیہ کے نام سے پہلے "حضرت الحبر" تعظیماً ضرور لکھا جاتا ہے (صفحہ ۱۹۳، جزو ثالث مرآۃ العصر فی تاریخ و رسوم اکابر الرجال بمصر، از الیاس حوزہ، ۱۸۹۶ء، قاہرہ)۔

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں کہ "علمائے یہود نے تورات خوانی کو پیشہ بنا لیا تھا۔ معاوضہ لے لے کر سناتے تھے" (ترجمان قرآن، جلد دوم، صفحہ ۱۲۶)۔

ھ احبار کے سوا یہ لفظ ربی بھی پیشوایان و مقتدایان یہود کے لئے مستعمل ہے۔ افرنگی لغت نویس اس (Rabbi) کو عبرانی کے رَبِّیْ (میرے پروردگار آقا) سے ماخوذ، اور یہودی علما و مفتیانِ شریعت اور حکمائے دین و ملت کے واسطے تعظیم کا خطاب مختص لکھتے ہیں۔ یہی لفظ فرانسیسی میں رَبِّین (Rabbin) بن گیا اور اس کے مشتقات میں ربینک، ربنی کل شمار ہوتے ہیں۔ ان سے اس طبقہ کی آرا، علوم اور لسان کے متعلق باتیں بھی مراد ہوتی ہیں۔ بعد کی یعنی متاخرین کی غیر سماوی اور غیر شرعی عبری تحریرات بھی اسی کے ذیل میں داخل ہیں۔ یہودیوں میں ربی نسٹ (Rabbinist) اور ربی نٹ (Rabbinite) وہ کہلاتے ہیں جو تلمود اور ربیین کی روایات پر عامل اور ان کے متبع ہوں۔

محمود شکری پاشا لکھتے ہیں کہ ربیون، رِبّی (بالکسر) کی جمع سے نسبت ہے طرف رِبّہ بمعنی جماعت کے یا طرف رب کے۔ (کلم القرآن، صفحہ ۱۹)

قرآنِ پاک کی آیۃ شریفہ " وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَہٗ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ ج" (پارۂ چہارم، سورۂ آل عمران، ع ۱۵ - ۶ - اور بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں، جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ (دشمنوں سے) لڑے) میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ لغاتِ عرب رِبّی کو واحد اور ربیین کو جمع اور اس کے معنے "اُلُوْفٌ مِّنَ النَّاسِ" بتاتے ہیں۔ ہمارے مفسرین قدسیین نے ان سے مقصود "خدا کے لوگ، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے سپاہی" لکھا ہے۔ اُن کی تحقیق بھی یہی ہے کہ دراصل یہ رِبّی کی جمع ہے۔ اور رِبّی اور رُبّی جمع ہے رِبوہ کی، بمعنی بلندی۔ یہ الفاظ رِباء اور رُبُوٌّ سے مشتق ہیں۔ سید شیخ مصطفےٰ آفندی نے ہدیۃ الاخوان میں تحریر کیا ہے کہ یہ رِبّی کی جمع ہے بمعنی علما و اتقیا۔ (صفحہ ۱۵)

فرقانِ حکیم میں رَبّٰنِیّٖنَ کا لفظ بھی آیا ہے کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ (پارۂ سوم، سورۃ آل عمران، رکوع ۱۶ - ۸) یعنی خدا پرست ہو کر رہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ربّانی کی جمع ہے۔ اور ربانی ربّ کی طرف منسوب ہے۔ جس کے معنے خدا پرست اور عارف ہوتے ہیں۔ الف نون، اس صفت کے کمال پر دلالت کرنے کی غرض سے زیادہ کیا گیا ہے، جیسے لحیانی، شعرانی، رُقبانی (غرائب القرآن نذیریہ)۔ مولانا ابوالکلام نے ترجمان القرآن میں ربانیون کے معنی بتائے ہیں علمائے حق، فقہا، فقرا، درویش۔ یاء اضافت کی ہے۔ ہدیۃ الاخوان میں لکھا ہے کہ علمائے عاملین سے مراد ہے۔ ربانی رب کی طرف منسوب ہے (صفحہ ۱۴)۔ (سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۴)

تنقیحات مبادی مباحث میں تین امر تنقیح طلب نظر آتے ہیں۔ (۱) جودی کیا ہے؟ (۲) کہاں ہے؟ (۳) کس زبان کا لفظ ہے۔ پہلی دونوں باتیں یا شقیں ایک ہی، یا ایک ہی سی ہیں۔ ایک دوسرے سے وابستہ۔ اُن کے لئے یکجائی تحقیق و تحیص کافی ہوگی عجب نہیں کہ ان کے متعلق روایات و منقولات کا سرمایہ، امر اول کی بعض مرتفق روایات و منقولات کے اعادہ و تکرار سے بے نیاز و محفوظ کردے۔ ایجاز و اختصار سے کام نکل جائے۔

جودی کا ذکر یہ نام فرقان[1] حکیم کے بارھویں پارے، سورۂ ہود کی چوالیسویں آیۃ میں یوں وارد ہوا ہے۔ " وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي[2] وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ " ترجمہ[3]: اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی جذب کرلے اور اے آسمان تھم جا، اور پانی (کا چڑھاؤ) اتر گیا اور (قوم کا) کام تمام کر دیا گیا۔ اور کشتی جودی پر (جا کر) ٹھہر گئی۔

الفاظ تنزیلی کی شان اے چھوٹے چھوٹے، پیارے پیارے لفظو! اے ربانی کلام!! اے صمدانی تنزیل!!! میں تمہاری ہستی، تمہاری لطافتِ زبان، تمہاری بلاغت و فصاحت کو بوسہ دیتا ہوں۔ وہ کون سی بات ہے جو تم چند خدا فرست کلموں سے باہر رہ جاتی ہے۔ تم میں امر بھی ہے۔ نہی بھی ہے۔ خبر بھی ہے۔ ندا بھی ہے۔ نعت بھی ہے۔ ہلاکی کا خوف بھی دلایا جاتا ہے۔ بقا کی بشارت بھی دی جاتی ہے۔ شقاوت کا انجام بتایا جاتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ سعادت کا مژدہ بھی پہونچایا جاتا ہے۔ اے معاشر جن و انس آؤ اور

(بسلسلۂ صفحہ ۳) [4] یہود۔ وہ قبیلہ جو یہودا ابن یعقوب کی نسل سے تھا۔ لیکن اصطلاحاً بنی اسرائیل کے بارہ قبائل ہی کا یہ قومی نام پڑ گیا ہے۔ مشہور محدث ابو محمد عبداللہ اہوازی جوالیقی (متوفی سنہ ۵۴۰ھ) فرماتے ہیں کہ ہود اور یہود اعجمی الفاظ ہیں، جو یہوذ بن یعقوب کی طرف منسوب ہیں۔ معرب کرتے وقت ذال کا نقطہ دور کر کے دال مہملہ کے ساتھ یہود بنا لیا۔ (الاتقان، جزو اول صفحات ۱۴۱ و ۱۴۲)۔ محمود شکری پاشا کلم القرآن میں لکھتے ہیں کہ ہود ہائد کی جمع ہے بروزن عُود، یعنی یہودی (صفحات ۸ و ۱۵۱)۔ یہی لفظ سید مصطفےٰ افندی کے ہیں۔ (صفحہ ۶ ہدیۃ الاخوان)۔

سورۂ نساء کے " اصحاب السبت " سے یہی قوم مراد ہے۔ (کلم القرآن صفحہ ۴۲)۔

[1] قرآن مجید کا ایک نام ہے۔ جو حق و باطل کے درمیان فرق کرتا، جدا کرتا ہے۔ (کلم القرآن، صفحہ ۴)

[2] اَبْلَعِي = اشربي = اَقْلِعِي۔ امسکی۔ از فتح الخبیر بما لا بد من حفظہ فی علم التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلوی، صفحہ ۱۲، مصری)۔ محمود شکری پاشا کلم القرآن (صفحہ ۵۲) میں ان الفاظ کے معانی و مطالب یہ لکھتے ہیں:۔ ابلعی (بلع فرو خوردن نگلنا، چوسنا) کھانے یا اسی قسم کی چیز کے نگل لینے کے لئے پھٹ جا۔ اقلعی۔ رُک جا، تھم جا۔ (قلع، باز ایستادن)۔ عرب کا محاورہ ہے اقلعت السماء۔ آسمان تھم گیا۔ جب کہ بارش منقطع ہو جائے۔ اقلاع، کسی کام سے باز رہنا بولا کرتے ہیں، " اقلع الرجل عن عملہ اذا کف عنہ "۔ وہ شخص اپنے کام سے باز رہا۔ جب کام سے جدا ہو جائے۔

وغیض الماء۔ غیض، پانی کا کم ہو جانا۔ زمین میں جذب ہو جانا۔ قلّت۔ بمعنی نقص۔ جس وقت کہ کم ہو جائے۔ یا بمعنی غار فی الارض جب زمین کے اندر پانی چلا جائے۔ سید شیخ مصطفےٰ افندی الحسینی، ہدیۃ الاخوان فی تفسیر ما ابہم علی العامۃ من الفاظ القرآن میں اقلعی کے معنی " برسنے سے رک جا " اور غیض الماء کے نقص یعنی " گھٹ گیا " لکھتے ہیں (صفحہ ۲۹، مطبوعہ بیروت طبع ثانی)

علامہ جلال الدین سیوطی ابن ابی حاتم تمیمی محدث و مفسر اور وہب بن منبہ صنعانی محدث تابعی کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اُبْلَعِي مَاءَكِ میں ابلعی کا لفظ حبشی زبان کا ہے بمعنی اندر بیھد (اتقان فی علوم القرآن۔ جزء اول، صفحہ ۱۳۸۔ النوع الثامن والثلثون)۔ اگر متاخرین اہل لغت اور عصر حاضر کے فضلاء کو اس کے صحیح ماننے میں تردد ہے (عرب و ہند کے تعلقات، از مولانا سید سلیمان ندوی، صفحہ ۱۷) تو متقدمین و فضلاء سابقین کو بھی اس سے قطعاً اختلاف تھا۔ اسی اتقان کی اسی نوع ۳۸ میں شروع ہی میں اس کی مخالفت امام شافعی، ابن جریر، ابو عبیدہ، قاضی ابوبکر وغیرہم سے مذکور ہے۔ اگرچہ بعد میں ایسے اقوال کی مختلف تاویلیں بھی تحریر ہیں۔ سلف صالح کی نا سپاسی ہوتی اگر اس موقع پر اُن کے اختلاف کا ذکر نہ کر دیا جاتا۔

[3] حافظ سیوطی نے ترجمہ کی تعریف کی ہے " ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے بدل دینا جو اس کی جگہ پر ٹھیک آجائے (اتقان، صفحہ ۱۱)

میرے اس دلیرانہ دعوے کو سُن لو اور یاد رکھو کہ اس چھوٹے سے جملے میں، قصہ کے پیرایہ میں جو خبریں پہونچائی گئی ہیں اگر اُن کی تشریح کی جسارت کی جائے - ان لفظوں کے بدائع، بلاغت، ایجاز اور حُسن بیان کے اظہار کا نام بھی لیا جائے تو کاغذ ختم ہو جائے گا۔ سیاہی خشک ہو جائے گی۔ قلم پھٹ جائے گا۔ اے خدائے لایزال ولم یزل کے نیک بندو! قسم کھاتا ہوں کہ بلاغت کے اعتبار سے اس اچھوتی آیت کی تالیف فرد و بے مثل ہے اے ثقلین کی کائنات! تو بھی گواہ رہنا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں!

محدث و فقیہ کرمانی بغدادی نے العجائب میں تحریر فرمایا ہے کہ تمام معاندین و اعدائے دین و ملت نے بالاتفاق اقرار کیا ہے کہ بشری طاقتیں اس آیۃ کے مثل لانے سے قاصر ہیں (میں کہوں گا کہ عاجز) یہ اقبال یوں ہی لاابالیانہ نہ تھا، بلکہ وہ مقدور بھر کوشش کر چکے تھے۔ عرب و عجم کے سارے کلاموں کو پرتال چکے اور ڈھونڈھ چکے تھے۔ زبان کی سلاست، اسالیب کی فصاحت، تنسیق کی جودت، الفاظ کی بزرگی، تنظیم و ترتیب کی عظمت، معانی کی بلندی و خوبی کے لحاظ سے باوصف ہمہ اختصار و ایجاز اور پوری اور بے خلل صورت کشی کے، اس کے مقابل نہ سہی کوئی ادنے سے ادنے مماثل بھی پیش نہ کر سکے[1] "والفضل ما شہدت بہ اعداء"

آپ بیتی ہو چکی - اب کچھ بڑے بڑوں کی کہتا ہوں -

مجمع النوادر کی روایت

ملا نظامی عروضی سمرقندی اپنے چہار مقالہ موسوم بہ مجمع النوادر[2] میں تحریر فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان نے ولید بن مغیرہ[3] کے روبرو آیۃ شریفۂ مذکورۂ بالا کو پڑھا تو ولید پر اس کی فصاحت و بلاغت سے ایک حالت رقت طاری ہو گئی - اعجاز قرآنی سے متاثر ہو کے بے اختیار چلا اٹھا۔ "واللہ اِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً وَاِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَمَا هُوَ قَوْلُ الْبَشَرِ"[4] علامہ محمد الحسین نجفی نے بھی اس روایت کو الدین والاسلام میں نقل کیا ہے[5]

---

[1] تفسیر الاتقان، الجزو الثانی، صفحہ ۵۵، النوع السادس والخمسون -

[2] مطبوعہ لائیڈن - برلن، سنہ ۱۹۰۹ء - و لاہور سنہ ۱۹۲۶ء، صفحہ ۴۸ -

[3] کلام پاک کے اس اعجاز سے اس درجہ متاثر ہو جانے کے باوجود یہ شخص (ولید بن مغیرہ) مسلمان نہیں ہوا - جنگ بدر کے پیشتر ہی حالت کفر میں عذاب الٰہی میں مبتلا ہو کر مر گیا - جو درحقیقت رسول مقبول صلعم کی بددعا کا اثر اور وعدۂ خداوندی کا ایفاء تھا - حافظ جلال الدین سیوطی نے آیات ذیل کے نزول کو اسی شمامت زدہ کے کفر، تباہی اور عتاب الٰہی کے متعلق بتایا ہے اور ہر ایک آیت کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی اختصاص و توضیح کے ساتھ [illegible] بھی لیا ہے - یا کسی کا قول نقل کیا ہے - یہاں اس کے اعادہ و تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا - (تفسیر اتقان حسب ذیل [illegible])

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِئِيْنَ
پارہ ۱۴ - سورۃ الحجر، آیۃ ۹۶
وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ
پارہ ۱۶ سورۂ مریم آیۃ ۶۶
رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ
پارہ ۲۵ - سورۃ زخرف، آیۃ ۳۲
اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى
پارہ ۲۷، سورۃ النجم، آیۃ ۳۴

یہ لوگ جو ہنستے ہیں تمہاری طرف سے ہم انکو بس کرتے ہیں
(الاتقان جزو الثانی، صفحہ ۱۴۷، نوع اسباب نزول
نیز الدین والاسلام، جزو ثانی، صفحہ ۱۰۱)
اور آدمی پوچھا کرتا ہے
(الاتقان، جزو ثانی، صفحہ ۱۴۸ -
دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی
(ایضاً، صفحہ ۱۴۷)
بھلا تم نے اس شخص پر نظر کی جس نے (تمہاری نصیحت سے) روگردانی کی - (ایضاً صفحہ ۱۴۸)

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ
پارہ ۲۹، سورۃ القلم، آیۃ ۱۱
ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا
پارہ ۲۹، سورۃ المدثر آیۃ ۱۱
قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَا اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ
پارہ ۸ سورۃ الانعام، آیۃ ۱۲۵
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا - پارہ ۲۰ سورۃ العنکبوت آیۃ ۱۲

[illegible]
کھاتا ہے - (ایضاً، صفحہ ۱۴۸)
ہم کو اور اُسکو، جسے ہم نے اکیلا پیدا کیا - (ایضاً، صفحہ ۱۴۸)
کہتے ہیں جیسی (نبوت) پیغمبران خدا کو دی گئی ہے جب تک (اُسی طرح کی نبوت) ہمکو نہ دیجائے ہم تو ایمان لانے والے ہی نہیں (ایضاً، صفحہ ۱۴۹)
جو لوگ کہ کافر ہوئے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں کہتے ہیں کہ ہمارے راستے پر چلو (ایضاً صفحہ ۱۵۰)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۶)

اعجاز آیات

متکلم و حکیم عراق شیخ محمد الحسین، آل کاشف غطاء نجفی نے اپنے زمانۂ شباب میں اپنی زور دار بے نظیر تصنیف الدین والاسلام میں بعض آیات قرآنی پر نظر ڈالتے ہوئے اور اُن کے وجوہ اعجاز کو دکھاتے ہوئے فرمایا تھا:

ناظراً فی قولہ تعالیٰ (وقیل یا ارضُ ابلعی ماءکِ ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی وقیل بعداً للقوم الظالمین) انظرها وهی فی مقامها - واختبرها فی عقد نظامها - ثم استقصها اثرا، وتعرفها خبراً وخبرا. ثم انظر ماذا تسمع وما ذا تری -

(صفحہ ۵۸، جزو ثانی، مطبوعہ صیدا، ۱۳۳۰ھ)

اللہ جل شانہ کے اس قول پر نگاہ رکھئے۔ (ترجمہ: اور پھر خدا کا حکم ہوا "اے زمین! اپنا پانی پی لے! اور اے آسمان! تھم جا!" اور پانی کا چڑھاؤ اُتر گیا اور حادثہ انجام پاگیا۔ اور کشتی جودی پر ٹھہر گئی اور کہا گیا "نامرادی اُس گروہ کے لئے ہے کہ ظلم کرنے والا گروہ تھا!")۔ اس پر نظر ڈالئے۔ اور یہ اپنی ہی جگہ پر ہے اس کو نشۂ تربیت و نظام میں لے آیئے۔ آزمایئے۔ اس کے بعد اس کے اثر و نقل کے پیچھے پیچھے چلئے۔ اور اس کی آگاہی و دانائی سے شناخت کیجئے۔ پھر دیکھئے۔ کہ آپ کیا کیا سنتے ہیں۔ اور کیا کیا دیکھتے ہیں

آگے چل کر پھر اسی آیۂ پاک کی تلاوت فرماتے ہوئے، اسکے لفظوں کے ایجاز، معانی کی کثرت، عبارت کے دیباچے، حروف کے حسن تالیف کلمات کے جوڑ توڑ کا پوری شرح و بسط سے بیان فرمایا، معجزۂ قرآنی کی بلندی و برتری کو دکھایا ہے۔ ان پر توجہ دلائی ہے[۱]۔

گوہر مراد

ملا عبدالرزاق ملقب بہ فیاض، بن علی بن حسین لاہیجی قمی، صاحب مشارق الالہام شرح تجرید الافہام وغیرہ، جو گیارھویں صدی ہجری میں امامیہ مشرب کے بڑے محقق، حجم کے یگانہ[۲] دانشمند و متکلم گزرے ہیں اور صدر المتألہین ملا صدرا کے شاگرد اور داماد تھے اپنی علمی ہدایت نامۂ گوہر مراد میں فرماتے ہیں:

واگر فلاسفۂ اقدمین را استماع ایں کلام مقدس ممکن می شد ہر آئینہ اقرار می نمودند۔

بمعجزہ بودن ایں کلام قدسی نظام کہ جان تشنہ را اند قیمت آب[۳]

ابن مقفع

دانائے یگانہ شیخ خبریت قاضی ابوبکر باقلانی (متوفی ۴۰۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ ابن المقفع[۴] (بغدادی، متوفی ۱۵۱ھ) اپنے وقت کا فصیح ترین شخص تھا۔ اس نے قرآن کے معارضہ پر کمر باندھی۔ خارجی طور پر کوئی بات پا نہ سکا۔ لوگوں نے زیادہ پوچھ گچھ کی اور بہت

(بہ سلسلہ صفحہ نمبر ۵) "قل یا ایها الکافرون"۔ (اے پیغمبر ان کافروں سے) کہو کہ اے کافرو (ایضاً صفحہ ۱۵۰) پارہ ۳۰ سورۃ الکافرون، آیت ۱ (بعض قلمی نسخوں میں ولید ابن الاعصم کے بارہ میں اس کا نازل ہونا درج ہے)۔ تفسیر کشاف میں (پارۂ چہار دہم، سورۂ حجر، آیت ۹۵) انا کفیناک المستہزئین کے ذیل میں یہ عبارت ملاحظہ طلب ہے "عن عروۃ بن الزبیر فی المستہزئین، ہم خمسۃ نفر ذوو اسنان وشرف - الولید بن المغیرۃ والعاص بن وائل والاسود بن عبد یغوث والاسود بن عبد المطلب والحرث بن الطلاطلۃ وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ ماتوا کلہم قبل بدر"۔ (جلد اول، صفحہ ۵۲۰ مصری)۔ اس کے بعد امام زمخشری نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ کون کون شخص کس طرح ہلاک ہوا ۔ یہی واقعات تقریباً تمام تفسیرات اور کتب تاریخ و سیر میں بھی ملتے ہیں (مثالاً کامل ابن اثیر، جزو دوم، صفحہ ۲۶، مصری) ملا حسین واعظ کاشفی نے ولید کی موت کو ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ "ولید بہ دکان تیر تراشے بگزشت - و پیکانے در دامن او آویخت - از عظمت و کبر سر زیرنہ کرد کہ از جامہ باز کند۔ آں پیکان ساق وے را مجروح ساخت، ورگ شریانے ازآں بریدہ گشت و بہ دوزخ رفت"۔ (تفسیر حسینی، بذیل آیۂ مذکورہ، سورۂ حجر) [۵] طلاوۃ بالفتح والضم، خوبی و پذیرائی دل طَلَاوَۃ (مصدر) شیرینی - مثمر، بار آور، میوہ آفریں - معذق، خوشۂ خرما، شاخہائے خرما کا کانٹا۔

[۵] صفحہ ۱۴۳۔ جزو ثانی ——— [۱] صفحہ ۱۰۷، جزو ثانی - [۲] وفات ۱۰۵۱ھ - [۳] الدین والاسلام، جزو ثانی، صفحہ ۱۹ - ان شوارق الالہام

[۴] ابن المقفع بغدادی، اصل میں مجوسی تھا۔ پھر مسلمان ہو گیا۔ پہلے اس کا نام روزبہ ابن دادویہ تھا۔ بعد از اسلام عبداللہ رکھا گیا۔ اس کا باپ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں عراق اور فارس کے ٹیکس وصول کرنے پر مامور تھا۔ (سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۷)

چھیڑا، تو جواب دیا کہ میں نے کیا تو سب کچھ تھا۔ لیکن جب اُس کا قرآن سے مقابلہ کیا تو مجھے خود اپنے سے شرم آئی۔ قبل اس کے کہ کوئی دوسرا دیکھ پائے میں نے اپنے نوشتوں کو چاک کر ڈالا۔ کتاب شفا میں یہ حکایت مرقوم ہے کہ ابن مقفع نے جب لکھنا شروع کیا تھا، کسی لڑکے کے قریب ہو کر گزرا جو "قیل یا ارض ابلعی" والی آیت پڑھ رہا تھا۔ ابن مقفع اُلٹے پاؤں لوٹا اور جو کچھ کیا اور لکھا تھا سب مٹا ڈالا اور کہا کہ اس کا معارضہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بشر کا قول ہی نہیں ہے[1]

کچھ اور واقعات

دفاترِ عالم ایسے طباع و ذہین لوگوں کے ذکر سے فارغ و غافل نہیں، جنھوں نے فرقانِ حمید کا جواب لکھنے کی ہمت کی تھی۔ اپنے اپنے کمالات و جوہر دکھانے چاہے تھے۔ ہر ایک مَن چلا مدعی تھا۔ جوہرے دارم و صاحب نظرے می جویم مگر اُن کا مقابلہ، اُن کی طیاری و آمادگی عبث ثابت ہوئی۔ ناکام رہے۔ بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑ گئے۔ گنجایش سے مجبور ہوں۔ تاہم اپنی اسلامی تاریخوں سے نکال کر اور دو ایک خیرہ سر و سبکپا شخصوں کا نام لے دینا ضروری ہے۔ یہ زباں دراز و لسان بھی بالآخر سرمہ درگلو ہو کر بیٹھ رہے تھے۔

اور ایسی روایتیں متعدد و متواتر، ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ ایک مصری شاعر[2] اور امام ادب ابن ابی الاصبع وعبدالعظیم بن عبدالواحد بن ظافر، متوفی ۶۵۴ھ) کے حوالہ سے حافظ جلال الدین سیوطی ناقل ہیں کہ جب ایک عرب نے یہ چھوٹی سی آیت سنی "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" (پارہ ۱۴، سورۃ الحجر، آیۃ ۹۵) تو سجدہ میں گر پڑا۔ اور کہا کہ میں اس کی فصاحت پر سجدہ کرتا ہوں[3]۔ مولانا عبدالحق حقانی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جب لبید بن مغیرہ نے یہ آیت سنی "اِنَّ اللّٰہَ یَامُرُ بِالعدلِ والاحسان" (پارہ ۱۴، سورۃ النحل، آیۃ ۹۱) تو کہا "واللہ ان لہ لحلاوۃً وان علیہ لطلاوۃ[4]"

بقول احمد، حسان بن ثابت کی طرح لبید بھی ایام جاہلیت کے چوٹی کے شاعروں میں تھے۔ پھر مسلمان ہو گئے تھے ۔۔۔۔ امام فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں ایک دلچسپ، باریک نکتہ حوالۂ قلم کیا ہے کہ شرفِ اسلام حاصل کرنے کے بعد ان حضرات نے کذب و مبالغہ چھوڑ دیا تھا۔ لاجرم[5]، ان کی شاعری پر اس کا بڑا اثر پڑا۔ وہ چٹخارہ بھی باقی نہ رہا جو شاعری و نازک خیالی کی جان ہے۔ جب کلام کی بلندی اور زور میں فرق آیا تو وہ بات ہی رخصت ہو گئی جو زمانۂ جاہلیت میں ان کا طرۂ امتیاز تھی۔

لاریب۔ کہ سب تو کلام اللہ العزیز کی بولتی ہوئی زندہ کرامت تھی۔ مجھے اس آیۃ پاک کے صرف ایک ٹکڑے بلکہ ایک کلمے یا ایک نام کے بارہ میں کچھ تحقیق کرنا اور پتہ چلانا ہے۔ یعنی " واستوت علی الجودی" کی جودی۔ یہی جودی چند در چند و مختلف النوع تعبیروں کا آماج گاہ بنا ہوا ہے۔

(بہ سلسلۂ صفحہ نمبر ۶) ۔ کسی سے بہ جبر روپیہ وصول کرنے کی پاداش میں اس کو سخت سزا دی گئی، جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ لہذا اُسکو المقفع کہنے لگے۔ ابن المقفع بصرہ میں ۱۴۵ھ میں قتل کیا گیا۔ الدرۃ الیتیمہ اور کئی ترجمے یونانی اور فارسی کے اس کی یادگار ہیں۔ (منقول از قاضی اختر، بر ترجمہ طبقات الامم، صفحہ ۸۴۔ بحوالہ الفہرست صفحہ ۱۱۸۔ دوفیات الاعیان از ابن خلکان، ج اول، صفحات ۹۴ تا ۱۵۱) زبدۃ الکلام فی مشاہیر الاسلام صفحہ ۳۲ میں سال وفات ۱۵۸ لکھا ہے۔

[1] الدین والاسلام، جزء ثانی، صفحہ ۱۴۶ — [2] شاعر، شعر کہنے والا۔ اب تو شعر اور اُس کی تعریف میں ہماری زبان اُردو میں بھی دفتر کے دفتر طیار ہو گئے ہیں، ورنہ میری طالب علمی کے زمانہ تک صرف ایک ہی قول جاحظ (متوفی بصرہ ۲۵۵ھ) کا ہم لوگوں کو معلوم تھا اور وہ بھی علامہ تفتازانی (م ۷۹۲ھ) کے "مطول" میں نقل کر دینے کے بدولت۔ وہو' الشعر صناعۃ وضربٌ من التصویر، یعنی صناعۃ شعر ایک قسم کی مصوری ہے۔ اس کو یوں پھیلا لیتے تھے کہ مصوری محاکاۃ کی ایک قسم ہے، اور محاکاۃ ایک قسم کی تخیل ہے — [3] الاتقان، جزء ثانی، صفحہ ۵۵ — [4] صفحہ ۱۲۳، حاشیہ اول۔

[5] لاجرم، بمعنی حقا ہے۔ اس میں لا نافیہ ہے اور جرم کے معنی کسب و قطع میں۔ فراء کہتا ہے کہ یہ دراصل لابد اور لامحالۃ کے معنی میں تھا۔ پھر بدل کر قسم کے معنے میں آگیا۔ اور بمنزلہ حقا کے قرار پایا۔ (کلم القرآن، صفحہ ۱۵۱)

زمانہ طوفان بروایت مسلمانان اس جگہ یہ گزارش کر دینا بھی مناسب ہے کہ مسلمانوں کے حساب و شمار سے ہجرت جلیلہ نبویہ صلعم سے حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کا زمانہ قریب چار ہزار برس کے یا صحیح وقطعی اعداد کے لحاظ سے تین ہزار نو سو چوہتر سال قبل قرار دیا گیا ہے۔ (صفحہ ۷، ولایت حلب کا ترکی سالنامہ، مطبوعہ ۱۳۱۰ھ، ذکر وقائع مشہورہ)۔

روایات زبور زبور[1] شریف کی ورق گردانی، طوفان نوح کے سلسلہ میں تو شاید بیکار ثابت ہو۔ امام المفسرین شیخ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ اس میں ایک سو پچاس سورتیں ہیں۔ اور یہ سب کی سب موعظت وثنا و محمدت سے مالا مال ہیں۔ ان میں نہ حلال و حرام کا ذکر ہے نہ فرائض و حدود کا[2]۔ اس لئے عرض ادب کا قدم آگے بڑھتا ہے۔

تورات کا بیان عہد نامۂ قدیم، سفر تکوین کی اصحاح سادس کی آیت ۱۴ میں وارد ہوا ہے "فقال اللہ لنوح .... اصنع لنفسک فلکاً من خشب جفر"۔ اور آٹھویں اصحاح کی پانچویں آیت میں آیا ہے" واستقرا لفلک.... علی جبال ارارط"۔

ان کا اردو ترجمہ بالترتیب حسب ذیل ہے جو بائبل سوسائٹی کی طرف سے منظور اور شائع ہوا ہے[3]

"اور خدا نے نوح سے کہا.... تو گوپھر[4] کی لکڑی کی ایک کشتی اپنے لئے بنا...." "اور کشتی... ارارط کے پہاڑوں پر ٹک گئی"۔

ان آیات کے حصۂ محذوف، منقوط پر وہ چند الفاظ یا مضامین تھے جن کو میں نے اپنے حدود تحقیق کے باہر یا غیر متعلق سا سمجھ کر نے کی جرأت کی [illegible] نے کتاب مقدس کے عربی ترجمہ سے لئے ہیں، جو لغات اصلی یعنی عبرانی[5]، کلدانی اور یونانی[6] سے کیا گیا اور بڑے [illegible] اہتمام و احتیاط کے ساتھ ۱۸۶۹ء میں چھپا تھا۔ اور یشوع[7] کی دنیا کا سرمایۂ نازش و مباہات چلا آتا ہے۔

---

[1] زبور، بالفتح، بشستہ یعنی لکھا ہوا۔ وہ آسمانی کتاب جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی (لغات) وہ کتاب جو دانائی اور نصیحت کی باتوں کی متضمن ہے (کلم القرآن، صفحات ۲۰ و ۸۵ و ۹۲ و ۲۲۴)۔

[2] کتاب الاتقان فی علوم القرآن، جزو اول، صفحہ ۶۸، میمینہ، مصری۔

[3] منجانب برٹش و فارین بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور، مطبوعہ انڈین پریس لاہور، ۱۹۴۰ء۔ پیدائش۔

[4] اہل تورات اس سے صنوبر کی لکڑی مراد لیتے ہیں۔ مسلمان مفسرین بھی اپنی اپنی زبانوں میں صنوبر کی لکڑی بتاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ کشتی سال کی لکڑی سے طیار ہوئی تھی۔ روایات کے اختلاف سے صحیح پتہ نہیں چلتا ہے۔

[5] قاضی ابوالقاسم صاعد اندلسی، صاحب طبقات الامم لکھتے ہیں کہ سُریانی قدیم زبان تھی۔ اس کو حضرت آدمؑ کی زبان کہہ دینا تو مبالغہ سے خالی نہیں۔ مگر اس قدر مان لیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ وغیرہ انبیاء علیہم السلام اسی میں بات چیت کرتے تھے۔ اسی سریانی سے دو اور زبانیں پیدا ہوئیں یعنی عبرانی و عربی (صفحہ ۲ ترجمہ) —— [6] اہل عرب یونان والوں کی زبان کو اغریقیہ (گریک Greek) کہتے ہیں۔ یہ بہت وسیع زبان تھی۔ (ترجمہ مذکور صفحہ ۱۵) یہ اب بھی ہے اور دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک قدیم۔ دوسری جدید۔ اہل وقوت و بصیرت کا نتیجہ ہے کہ شاعری کے میدان میں یونانی زبان اور زندہ دل یونانیوں نے وہ کام کئے تھے جو کسی اور قوم سے نہ بن پڑے۔ نہ کوئی ان کی تقلید و پیروی کر سکا۔ اس پر خوبی یہ تھی کہ بڑے سے بڑے مضمون اور نازک و پیچیدہ باتوں کو آسان عبارت اور چند سطروں میں لکھ دیتے تھے۔ طبیعیات کے مسائل مثلاً ہوا، پانی، شبنم، بارش وغیرہ پر جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں، اُن ہی کا حصہ اور اُن ہی کا کمال تھا۔ بقول ڈاکٹر سراج الحسن ڈائرکٹر یونان کی شاعری نے تو رزم و بزم پر وہ اثر ڈالا تھا جو یونان کا خراج خرچ کر دینے پر بھی ممکن نہ ہوتا۔

[7] یشوع ہی سے عیسیٰ کی نسبت ہے اکثر الفاظ جو عبری میں شین معجمہ سے ہوتے تھے عربی میں منتقل کرتے وقت با صلہ نہیں رہنے پائے بلکہ سین مہملہ سے مذکور ہوئے ہیں۔ آپ دیکھتے ہوں گے کہ اہل یورپ بھی جن الفاظ کو اپنی زبانوں میں لے لیتے ہیں ان میں کتنی تحریف کر ڈالتے ہیں، اُلٹ پلٹ کر دیتے اور نمایاں تغیرات پیدا کر لیتے ہیں۔ (الدین فی نظر العقل الصحیح، صفحہ ۱۱۵)۔ البتہ کتاب مقدس کے عربی ترجموں میں نام کی حیثیت سے یسوع اور یشوع دونوں ملتے ہیں۔ (مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۶۹ء) یشوع، یسوع او عیسیٰ - (نظرۃ۔ لدکتور صدقی، صفحہ ۲۳۰ حاشیہ اول)

تصانیف نیاز فتحپوری

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ترغیبات جنسی (یا)

شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

قیمت تین روپیہ (عہ) علاوہ محصول

مجموعہ استفسار و جواب سہ جلد

ان تینوں جلدوں میں ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان تینوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلو پیڈیا کی ہے۔

قیمت فیجلد تین روپیہ (عہ) علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ (۱۲/) علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

۲- مادئین کا مذہب

۳- حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ، حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

قیمت دس آنے (۱۰/)

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری، جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری، جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کا تازہ اڈیشن حال ہی میں خاص اہتمام سے شایع ہوا ہے۔

قیمت ایک روپیہ (عہ)

علاوہ محصول

گہوارۂ تمدن

یہ وہ معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا اور دنیائے تہذیب و شایستگی اس کی کس قدر ممنون ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مصنف کو اس کتاب پر ریاست بھوپال سے ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔

قیمت دو روپیہ (عہ) علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر ال ۴۶۶